فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سرور

مرتب
رشید حسن خاں

انجمن ترقی اردو ہند

فسانۂ عجائب

فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سرور

مرتّب

رشید حسن خاں

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن اُردو (ہند) ۱۴۵۸ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق میموریل سیریز کی
پہلی کتاب

اشاعتِ اوّل : ——— ۱۹۹۰ء

اشاعتِ دوم : ——— ۱۹۹۶ء

قیمت : ——— ۱۷۵ روپے

بہ اہتمام : ——— اختر زماں رماں

طباعت : ——— ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

ISBN-81-7160-079-4

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR : 212 ROUSE AVENUE
NEW DELHI-110002

لکھنؤ کے ایک فدائی

جناب صباح الدین عمر

کی نذر

فہرست

پیش لفظ

شعبۂ اُردو نے شروع ہی سے، یعنی جب سے یہ شعبہ مستقل حیثیت سے قائم ہوا ہے، اپنے مقاصد میں اِس اہم کام کو بھی شامل رکھا ہے کہ قدیم متنوں کو نئے آدابِ ترتیب کے مطابق مرتّب کرایا جائے اور شائع کیا جائے۔ اِس سلسلے میں شعبے کا ایک اہم کام میر امّن کی کتاب گنجِ خوبی کی اشاعت بھی ہے، جس کا مخطوطہ خود میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا یورپ میں موجود ہے۔ اُسی مخطوطے کو بنیاد بنا کر اِس کتاب کو مرتّب کیا گیا۔ اِس متن کی ترتیب کے فرائض رشید حسن خاں صاحب نے انجام دیے تھے۔ یہ کتاب خواجہ احمد فاروقی صاحب کے مقدّمے کے ساتھ شعبے کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ رشید صاحب نے اِس کام کو بہت دل لگا کر انجام دیا تھا۔ عام طور پر اہلِ نظر نے اِس کتاب کو پسند کیا۔ اِس کے علاوہ اور بھی کئی قدیم کتابوں کے متن شعبے سے شائع ہوئے۔

موجودہ کتاب فسانۂ عجائب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں یہاں یہ بات خاص طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کے جبر نے اب ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ اب عام طلبہ اور نئے اساتذہ، دونوں کے لیے کلاسکی متنوں کو صحیح طور پر پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ فارسی کی تعلیم گویا ختم ہو چکی ہے اور اُردو زبان کی تعلیم بھی اب پہلے کی طرح نہیں ہو پاتی۔ اِن حالات نے اِس بات کو ضروری بنا دیا ہے کہ وہ کلاسکی متن، جو شاملِ نصاب بھی ہیں، اُن کو اب اِس طرح مرتّب کیا جائے کہ طالبِ علم کچھ آسانی کے ساتھ اُن کو پڑھ لیں۔ متن کا صحیح ہونا تو خیر بنیادی بات ہے؛ مگر اب اِسی قدر ضروری یہ بات بھی ہے کہ مشکل لفظوں پر حرکات ضرور لگی ہوئی ہوں، پنکچوئیشن (PUNCTUATION) سے ضرور کام لیا گیا ہو، معروف و مجہول آوازوں کے لیے ایسی علامتوں کو بھی ضروری مقامات پر استعمال کیا گیا ہو جن کی مدد سے اجنبی یا کم مستعمل لفظوں کے تلفظ کے تعیّن میں آسانی پیدا ہو جائے۔

اِس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ ایسے ہر متن کے ساتھ ایسے ضمیمے بھی شامل ہوں جن میں ایسے مشکل مقامات کی مناسب طور پر تشریح کی گئی ہو جن کے سمجھنے میں مشکل پیش آ سکتی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ

ے طالب علم شاملِ نصاب کلاسکی متنوں کو بہ خوشی خاطر پڑھ سکیں اور سمجھ بھی سکیں، تو یہ سارے ہمام ملحوظ رکھنا ہی ہوں گے۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ کام بے بہت مشکل اور بڑی ذمّے داری کا ہے۔ عام طور پر اب کام کرنے والے کم سے کم ذمّے داری کو قبول کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اِن سب ضروری باتوں کا اہتمام کرنے سے کام جلدی نہیں ہو پاتا، اور اب ہر کام کو جلدی نپٹانے کی عادت سی پڑتی جا رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسے کاموں کو انجام دینے کے لیے جن علوم سے واقفیت ضروری ہے اور جس قدر استعداد درکار ہوتی ہے، وہ کم یاب ہے۔

رشید حسن خاں میں ایک خوبی (جسے بعض لوگ خامی قرار دیتے ہیں) یہ ہے کہ وہ کام کو نادِ عجلت کے ساتھ کرنے کے قائل نہیں، کتنی ہی دیر ہو جائے؛ جب تک مرضی کے مطابق اور اصول کے مطابق کام نہ ہو، وہ اُسے مکمل نہیں سمجھتے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ فارسی سے خوب واقف ہیں۔ لُغت، املا، تلفظ اور قواعدِ زبان کے مسائل پر اُن کی نظر بہت گہری ہے اور ادبی تحقیق سے اُن کی طبیعت کو خاص طور پر مناسبت حاصل ہے، جس میں انھوں نے بہت شہرت پائی ہے۔ وہ ہمارے زمانے کے بہت معروف اور ممتاز محقق ہیں۔ اِس مشکل متن کو انھوں نے اِس طرح مرتّب کیا ہے کہ اِسے بلا مبالغہ اور بلا تکلّف مثالی کتاب کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ کلاسکی متن جو شاملِ نصاب بھی ہیں، اُن کو اب کس طرح مرتّب ہونا چاہیے؛ یہ کتاب اِس کی پہلی مثال ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اِس میں انھوں نے ضروری مقامات پر زبر زیر پیش لگائے ہیں اور پھر ایک مستقل ضمیمے میں یہ بتایا ہے کہ جن لفظوں پر اعراب لگائے گئے ہیں، اُن پر وہ اعراب کیوں لگائے گئے ہیں۔ ایک ضمیمے میں مشکل مقامات کی تشریح کی گئی ہے۔ غرض کہ ایسے سات ضمیمے اِس کتاب میں شامل ہیں۔ فرہنگ بھی بہت مفصّل ہے۔

اِس کام کو کس طرح کیا گیا ہے، اِس کا اندازہ اِس ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کام مکمل ہو چکا تھا، متن کی کتابت بھی ہو چکی تھی کہ اچانک اُن کو اِس کتاب کا ایک ایسا نسخہ ملا جس پر مصنف نے آخری بار نظرِ ثانی کی تھی۔ رشید صاحب نے بلا تکلّف پچھلے پانچ سال کے سارے کام کو کالعدم قرار دے دیا اور اب اُس نئے نسخے کی بنیاد پر متن کو نئے سرے سے مرتّب کیا۔ غرض کہ اِس کتاب کی تکمیل میں اِس طرح کم و بیش آٹھ سال صرف ہوئے ہیں۔

یہ کام جب مکمل ہوا، تو یقیناً اِڈیٹنگ کے لحاظ سے اعلا درجے کا کام تھا، مگر دوسری طرف ایک مشکل یہ سامنے آئی کہ اِس کی ضخامت بہت ہوگئی تھی، یعنی سات سو صفحوں کے قریب، اِس لیے اِس کے چھاپنے کا مسئلہ پریشان کُن ہوگیا۔ افسوس ہے کہ شعبۂ اُردو یا دہلی یونی ورسٹی کے پاس ایسا کوئی فنڈ نہیں، جس سے یہ ضخیم کتاب شائع ہوسکتی۔ مجھے بڑی فکر تھی کہ اِس قدر اچھا کام جس طرح بھی ہو، جلد سے جلد چھپ جائے، تاکہ طالبِ علم اور اساتذہ اِس سے فائدہ اُٹھا سکیں اور اِس سلسلے میں شعبے کی اعلا روایت بھی برقرار رہے، بلکہ زندہ ہوجائے۔ حُسنِ اتّفاق سے انجمن ترقیِ اُردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک خط میرے نام آیا جس میں مرقوم تھا کہ انجمن کی یہ روایت رہی ہے کہ اُس نے قدیم متنوں کو ہمیشہ اہتمام سے شائع کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے شعبے میں فسانۂ عجائب کا متن مرتب ہوا ہے مگر اُس کی اشاعت میں کچھ مشکل پیش آرہی ہے؛ اگر شعبۂ اُردو مناسب سمجھے، تو انجمن یہ پیش کش کرتی ہے کہ وہ اِس کتاب کو اپنے سلسلۂ مطبوعات میں شامل کرلے گی اور جلد شائع کردے گی۔

میں نے اِس خط کو شعبے کی جنرل کاؤنسل کے سامنے پیش کیا۔ سارے اساتذہ نے متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ اِس پیش کش کو قبول کرلینا چاہیے، تاکہ یہ اہم اور مفید کتاب جلد سے جلد سامنے آسکے اور طالبِ علم اِس سے استفادہ کرسکیں۔ ڈپارٹ منٹل کونسل کے اِس فیصلے کے پیشِ نظر میں نے انجمن کی اِس پیش کش کو منظور کرلیا اور اب یہ کتاب انجمن کے زیرِ اہتمام شائع ہورہی ہے۔ اِس سلسلے میں میں نے وائس چانسلر پروفیسر مونس رضا سے بھی مشورہ کیا۔ اُنھوں نے بھی رائے دی کہ ایسی ضخیم علمی کتابیں ترقیِ اُردو بورڈ یا انجمن ترقیِ اردو ہند کے زیرِ اہتمام شائع کرائی جائیں۔ مجھے توقع ہے کہ اِس بہت اچھے کام کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور یہ کتاب تدوین اور تحقیق کا ایک نیا معیار اور نیا انداز قائم کرے گی اور اِس سے شعبۂ اُردو کی نیک نامی میں مزید اضافہ ہوگا۔

میں اِس کتاب کے مرتب رشید حسن خاں صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنے معمول کے مطابق بہت دل لگاکر، بہت محنت، دیدہ ریزی اور دیدہ وری کے ساتھ اِس کام کو مکمل کیا ہے۔ اپنی طرف سے اور شعبے کی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں انجمن کے جنرل سکریٹری خلیق انجم صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اِس کتاب کو شائع کرنے کی پیش کش کی۔ مجھے

یقین ہے کہ اِس کتاب سے متن کی اِڈیٹنگ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا اور یہ بات سامنے آئے گی کہ نصابی متنوں کو اب کس طرح مرتّب کیا جانا چاہیے۔

میں اِس طرف خاص طور پر اہلِ نظر کو متوجّہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پُرانے اساتذہ اور اہلِ علم طالب علموں کے لیے ایسی آسانیاں پیدا کرنے کو ضروری سمجھتے رہے ہیں۔ یہ زمانہ تو خیر زوال کا ہے؛ جب علم و ادب اور فارسی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، اُس زمانے میں بڑے بڑے جیّد اساتذہ فارسی کی اُن کتابوں کی شرحیں لکھتے رہے ہیں جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ خاقانی اور سعدی جیسے اساتذہ کے کلام کی کیسی کیسی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ آخر یہ عالم کیوں ضروری سمجھتے تھے کہ درسی کتابوں پر حاشیے لکھے جائیں اور شرحیں لکھی جائیں۔ وجہ یہی تھی کہ وہ اساتذہ کا فرض سمجھے تھے کہ نصابی متنوں کو ممکن حد تک آسان بنا کر پیش کیا جائے اور ایسے معاون حاشیے اور ضمیمے شامل کیے جائیں جن کی مدد سے وہ مشکل متنوں کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

قمر رئیس
صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی
۱۵ ستمبر ۱۹۸۹ء

حرفِ آغاز

جدید اُردو تنقید، ادبی تحقیق اور متنی تنقید نے مغرب سے اپنے چراغ روشن کیے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جدید اُردو تنقید، مغربی اندازِ فکر کو مختلف انداز میں دُہراتی رہی ہے؛ لیکن ادبی تحقیق اور متنی تنقید مغرب کے اثر سے آزاد ہو کر ترقی کی راہ پر گام زن رہی ہے۔ ادب کے اِن دونوں شعبوں میں ہمارے کارناموں کی تعداد زیادہ تو نہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہمیں اپنی تہی دامنی پر شرمندہ ہونا پڑے۔

ہمارے یہاں غالباً پہلی بار متنی تنقید کی طرف سر سیّد احمد خاں نے توجہ کی تھی۔ اُن کی مرتّب کی ہوئی کتابوں میں فارسی کی مشہور کتاب آئینِ اکبری کا تنقیدی اڈیشن اُس زمانے میں بھی متنی تنقید کا اعلا نمونہ تھا اور آج بھی وہ اپنے انداز کا منفرد کارنامہ ہے۔

بیسویں صدی میں متنی تنقید کے جدید اصولوں کے مطابق اُردو میں پہلا تنقیدی اڈیشن مکاتیبِ غالب ہے، جسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم) نے مرتّب کر کے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کا تنقیدی اڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔ اِن دونوں کتابوں نے اُردو میں ترتیبِ متن کا معیار قائم کیا۔

حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی اُردو تحقیق کی آبرو ہیں۔ اِن حضرات کے تحقیقی کارناموں پر ہمیں فخر ہے۔ ہمارے زمانے میں تحقیق کی اِس روایت میں سب سے نمایاں نام رشید حسن خاں صاحب کا ہے۔ اِن حضرات نے اپنی ذہانت، لگن اور دیدہ وری سے عہدِ وسطا کی علمی روایت کو زندہ کیا ہے، اور اُردو میں تحقیق اور تدوین کا معیار قائم کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے تحقیق اور متنی تنقید دونوں میدانوں میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔

کلاسکی متن کے تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کے اصول و ضوابط پر تو بہت گفتگو کی گئی، لیکن ایسے کلاسکی متنوں کے تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کے طریقۂ کار پر ہم نے غور نہیں کیا جو ہماری اعلا درس گاہوں میں شاملِ نصاب ہیں اور رہیں گے۔ ہمارے زمانے میں طلبہ تو کیا خود اساتذہ فارسی سے ناواقف ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ ہمارے بیش تر کلاسکی متن فارسی کے اچھے علم کے بغیر صحیح معنی میں نہیں سمجھے جا سکتے۔

پھر اب تک جو متون شائع ہوئے ہیں، اُن میں صحت اور التزام کے ساتھ رموز و اوقاف کا استعمال نہیں کیا گیا اور مختلف آوازوں کے تعین کے لیے علامتوں کو بھی شاملِ عبارت نہیں کیا گیا، جو بے حد ضروری چیز ہے۔ بہت سے متنوں میں عبارت کے جملے تین تین، چار چار چھوٹے چھوٹے جملوں سے اِس طرح مرکب ہوتے ہیں کہ بہت سے اساتذہ اور طلبہ کے لیے اُن کا صحیح طور پر پڑھنا اور اجزائے جملہ کا الگ الگ تعین بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ کا تلفظ ہمارے زمانے سے مختلف ہوتا ہے۔ اِسی طرح بہت سے الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں یا اجنبی بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے اکثر اساتذہ بھی کلاسکی متن صحیح طور پر نہیں پڑھ پاتے۔

فسانۂ عجائب کا زیرِ نظر اڈیشن رشید حسن خاں صاحب کے تقریباً تیس سالہ تجربے اور اُن کی سات آٹھ سالہ غیر معمولی محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے پہلی بار طلبہ اور اُن کے اساتذہ کے لیے ایسا متن تیار کیا ہے جو کلاسکی نصابی متنوں کی ترتیب کے نئے انداز سے ہمیں روشناس کراتا ہے اور مثال اور معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس میں مشکل الفاظ کا صحیح تلفظ نظروں کے سامنے آجاتا ہے، فارسی ترکیبوں کو صحیح طور پر پڑھا جا سکتا ہے اور پیچیدہ جملوں کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ضمیموں میں جو تشریحات ہیں، اُن کی مدد سے اِس کتاب کے مشکل مقامات واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ میں اِس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُستاد اور طالبِ علم اِس مشکل متن کو اب آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے اور سمجھ سکیں گے۔ انجمن ترقیِ اُردو (ہند) فخر کے ساتھ رشید حسن خاں صاحب کا یہ غیر معمولی اور قابلِ تقلید کارنامہ پیش کر رہی ہے۔

یہ کام دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو نے رشید حسن خاں صاحب سے کرایا تھا۔ اِس کی کتابت بھی مکمل ہو گئی تھی، لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے شعبۂ اُردو کے لیے ایسی ضخیم کتاب شائع کرنا ممکن نہیں تھا۔ میری فرمایش پر پروفیسر قمر رئیس اور دلّی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مُونِس رضا نے انجمن کو یہ کتاب شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ میں اِن دونوں حضرات کا خاص کر پروفیسر قمر رئیس کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

خلیق انجم
جنرل سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو (ہند)

مقدّمہ

مرزا رجب علی بیگ[1] سرورؔ کی کتاب فسانۂ عجائب، مختصر داستانوں کے سلسلے کی مشہور کتاب ہے۔ یہ ہمارے کلاسکی ادب کا حصّہ بن چکی ہے۔ آج اِس کتاب کے متعلق [تاریخی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کرکے] بعض حضرات جو رائے بھی ظاہر کریں اور اِس پر جس قدر اعتراضات کریں؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتاب سامنے آئی تھی، اُس زمانے میں اِس کی یکتائی کی دھوم مچ گئی تھی اور بہت جلد اِس کو دبستانِ لکھنؤ کی نمایندہ تصنیف کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا۔

صرف داستان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اِس میں بہت سی خامیاں نکالی جاسکتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہی بات کہ داستان کا ہیرو اُن صفات سے بڑی حد تک محروم ہے جو کسی مرکزی کردار میں دل کشی کی چمک پیدا کیا کرتی ہیں۔ کئی ضمنی کہانیوں کے جوڑ پیوند لگی ہوئی اِس داستان کے بوجھ کو سہارنے کی سکت اُس میں نظر نہیں آتی۔ سادہ لوحی میں بھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جانِ عالم کی تخصیص نہیں، ضمنی کہانیوں کے نمایاں افراد بھی ایسے ہی ہیں۔ مثلاً وہ بادشاہ، جو ادنا تامّل کے بغیر، اپنی بیوی کو ایک اَن جان سوداگر کے ساتھ بھیج دیتا ہے، جس نے یہ جھوٹ بولا ہے کہ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور وہ سوداگر اُسے اپنے

---

[1] فسانۂ عجائب کی اشاعتِ اوّل (۱۲۵۹ھ) اور اشاعتِ ثانی (۱۲۶۳ھ) (یعنی نسخۂ ح اور نسخۂ ض) میں "بیانِ لکھنؤ" کے آغاز میں مصنّف نے اپنا نام "رجب علی بیگ" لکھا ہے۔ اشاعتِ ۱۲۶۷ھ (نسخۂ ک) اور اشاعتِ ۱۲۸۰ھ (نسخۂ ل) میں "مرزا رجب علی" ملتا ہے۔ اِسی لیے میں نے مکمل نام "مرزا رجب علی بیگ" لکھا ہے۔

ساتھ اپنے ملک لے جاتا ہے۔ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی اس قدر کم فہمی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اُس کے لیے تو خود سُرورؔ نے لکھا ہے کہ "یہ بے چارے اللہ کے ولی"۔ یا مثلاً وہ سوداگر، جن نے بندر کی صورت میں جانِ عالم کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ بادشاہ بندروں کو پکڑوا رہا ہے اور مروا رہا ہے، اس کے باوجود وہ آنے جانے والوں کو بندر کی باتیں سُنواتا ہے۔ "اتنا بڑا سوداگر اور اس قدر سادہ لوح"! یا مثلاً محسنؔ کا لڑکا، کہ وہ بھی جانِ عالم کی طرح سادہ لوحی کا مارا ہوا ہے۔ اُسے بھی سُرورؔ نے خود ہی "بڑھاپے کی اولاد" کہا ہے۔ یا وہ بادشاہ، جس سے آخر میں جانِ عالم کی لڑائی ہوتی ہے۔ وہ تو اس قدر احمق ہے کہ اُس کی فوج جانِ عالم سے مل گئی ہے، اکیلا رہ گیا ہے، لیکن لڑنے چلا آتا ہے، تلوار چلاتا ہے اور قید کر لیا جاتا ہے۔ غرض کہ نمایاں کردار کے مرد تقریباً سب کے سب جانِ عالم ہی جیسے ہیں۔ یہ بات اگر نظر کے سامنے ہو کہ اودھ کی حکومت میں آصف الدولہ کے زمانے سے مجہولیت نے جس طرح چھاؤنی چھائی تھی، اور "شہزادگانِ کرام" جس طرح حکم رانی کی صلاحیت اور صفات سے تہی دامن تھے، تو پھر اس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ سُرورؔ نے کہانی کسی بھی خیالی دنیا کی کہی ہو، داستان کی فضا اور اُس کے کردار اُنھی کے زمانے کے ہیں، اور اُن کے زمانے میں اکثر اُمرا اور ولی عہد صاحبان کا احوال یہی تھا۔[1] [البتہ یہ دل چسپ بات ہے کہ اکثر عورتیں سوجھ بوجھ سے اس طرح خالی نہیں، بل کہ نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں کی فعّال اور طرّار خواتین کی طرح ہیں۔ وجہ اس کی بھی اُسی معاشرے کے احوال و کردار میں بہ آسانی تلاش کی جاسکتی ہے]۔

زبان کے لحاظ سے بھی اس میں بہت سے جھول تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اکھڑے اکھڑے سے جملے تو اچھی خاصی تعداد میں مل جائیں گے۔ حسنِ بیان کا رنگ بھی کئی جگہ اُڑا ہوا

---

[1] دلّی میں بھی مغلوں کی حکومت کے آخری زمانے میں یہی احوال تھا، بس فرق یہ تھا کہ پچھلی شان دار روایت کا عکس وہاں آنکھوں میں بسا ہوا اور دلوں میں سمایا ہوا تھا، جس کے اثر سے بیرونی سطح پر کچھ نہ کچھ بھرم رہ گیا تھا۔ لکھنؤ میں یہ بڑی کمی تھی کہ یہاں ایسی کوئی روایت سایہ فگن نہیں تھی۔ اس کے اثرات کئی صورتوں میں نمایاں ہوئے۔

دکھائی دے گا۔ لفظوں کا بے محل صرف بھی ملے گا اور ایسا پیرایۂ بیان بھی ملے گا جس کو بے کمالی کی نشانی کہا جاسکتا ہے۔ یہ سب مسلّم اور برحق؛ مگر بات وہی ہے کہ یہ کتاب محض ایک داستان نہیں، صرف زبان کا نگارخانہ نہیں؛ یہ دراصل ایک اسلوب کا دوسرا نام ہے، اور اصل حیثیت اُس اسلوب کی تھی اور ہے۔ آج ہم اپنے زمانے اور ذہن کے لحاظ سے جو بھی کہیں؛ لیکن حقیقت ہے کہ لکھنؤ کا وہ معاشرہ اِسی انداز کا پرستار اور اِسی اسلوب کا دل دادہ تھا۔ چکبست کے الفاظ میں: "اودھ پنج کے پہلے رجب علی بیگ سُرور کے طرزِ تحریر کی پرستش ہوتی تھی" [مضامینِ چکبست، انڈین پریس الہ آباد، سالِ طبع: ۱۹۴۰ء، ص ۲۲۹]۔

زمانہ بدل گیا، ذہن بدل گئے، اندازِ نظر بدل گیا؛ اِن بہت سی تبدیلیوں کے باوصف یہ کتاب اپنی حیثیت کو اب بھی برقرار رکھے ہوئے ہے [کلاسکی ادب کی شاید یہ سب سے بڑی پہچان ہوتی ہے] اب بھی یہ چھپتی رہتی ہے اور پچھلی تین دہائیوں میں تو اِس کے متن کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کئی قابلِ ذکر کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ مصنّف کے زمانے سے اب تک یہ کتاب اِتنی بار اور اِتنے اہتمام کے ساتھ چھپی ہے کہ داستانی سلسلے کی کم کتابیں اِس باب میں اِس کی برابری کا دعوا کرسکتی ہیں۔ باغ و بہار سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں، رُخِ روشن کے آگے شمع کون رکھے گا؛ اُس کو چھوڑکر، اِس انداز کے باقی سبھی داستانی قصّوں کو ادبی حیثیت سے بھی اِس کے برابر شاید ہی رکھا جاسکے۔

اِس کتاب کو [ایسے باقی قصّوں کے مقابلے میں] ایک اور افضلیت بھی حاصل ہے، کہ اِس کی حیثیت صرف ادبی نہیں، تاریخی بھی ہے اور یہ تاریخی حیثیت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی دبستانی بحث کے فروغ میں اِس کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ سُرور نے دیباچے میں میرامّن اور دہلی، دونوں کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اُس نے باضابطہ اعلانِ جنگ کا کام کیا۔ دنوں تک یہ بحث چلتی رہی اور اب بھی اُس کی بازگشت سُنائی دے جاتی ہے [مثلاً جوشؔ ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی میں پچھلے دنوں جو بحث چلی تھی، اُس میں اِس پُرانے جھگڑے کا بھی حوالہ موجود ہے۔ رسالہ نقوش (لاہور) کے "ادبی معرکے نمبر" میں اِسے دیکھا جاسکتا ہے]۔

یہاں ضمنی طور پر [اور بہ طورِ جملۂ معترضہ] یہ وضاحت ضروری ہے کہ دہلی و لکھنؤ کا جھگڑا فسانۂ عجائب سے شروع نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہ یہ کتاب نہ لکھی جاتی، تب بھی اختلافات اُبھر کر سامنے آتے ضرور۔ اصلاً یہ سیاسی قضیہ تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے زمانے ہی سے اختلافات کی بنیاد گہری ہونے لگی تھی۔ پھر جب نواب غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے پر بادشاہت کا اعلان کیا، اُس وقت سے وہ جو ایک ظاہری پردہ سا تھا، وہ بھی اُٹھ گیا۔ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اختلافات کی نمود شدت اور وسعت کے ساتھ تہذیبی اور ادبی سطح پر ہوئی۔ چوں کہ سیاسی سطح پر مقامی حکومت اگرچہ نام کی خود مختار تھی، لیکن عملی طور پر وہ بے اختیاری کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف وہ نیا معاشرہ اپنے امتیاز اور اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کا بے طرح آرزو مند تھا؛ اِس لیے تہذیبی اور ادبی سطحوں ہی پر ایسے اختلافات کی نشو و نما ہونا تھی، اور یہی ہوا۔ ادبی سطح پر اختلافات نے زیادہ شہرت پائی [دریائے لطافت میں سیّد انشا نے جہاں دہلی و لکھنؤ کا موازنہ کیا ہے، وہاں بین السطور بہت کچھ پڑھا جا سکتا ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ذہنوں میں کس طرح کے خیالات نشو و نما پا رہے تھے]۔

دہلی والوں کو اپنی زبان اور اپنی ادبی روایت پر بہت ناز تھا۔ اُس وقت تک سند بھی وہیں سے لی جاتی تھی۔ اگرچہ اُجڑی ہوئی دہلی سے ترکِ وطن کر کے اِس شاد و آباد مملکت میں بہت سے دہلی والوں کو پناہ لینا پڑی تھی؛ اِس کے باوجود وہ "مہاجرین" یہاں والوں کو "پورب والے" کہتے تھے، اُن کی نظر میں نہ یہاں کی تہذیبی روایت کی کوئی حیثیت تھی اور نہ یہاں کی زبان کی۔ وہ اب تک اِس مملکت کو اُسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے ایک خود مختار سلطنت اپنے کسی زیرِ نگیں علاقے والوں کو دیکھا کرتی تھی۔ مرزا غالب نے اپنی پنشن کے قضیے میں کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں بھی قیام کیا تھا۔ اُس وقت غازی الدین حیدر "نواب وزیر" نہیں، اودھ کے بادشاہ تھے اور معتمد الدولہ آغا میر اُن کے وزیرِ اعظم اور نائب السلطنت تھے۔ مرزا صاحب اُن سے ملاقات کے خواہش مند ضرور تھے، اُن کی مدح میں قصیدہ بھی کہہ رہے تھے، ایک فارسی نثر بھی لکھی تھی، اور ایک

غزل میں تین شعر بھی مدحیہ انداز کے کہے تھے، جن کے دو شعر یہ تھے :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی ‏ ‏ ‏ ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید[1] ‏ ‏ ‏ جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

غرض ملاقات طے ہوگئی، لیکن ہو نہیں پائی۔ وجہ یہ ہوئی کہ "مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں، جو منظور نہ ہوئیں : ایک تو یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے" [یادگارِ غالب، طبعِ اوّل، ص ۲۷] یہ در اصل اُسی روایتی احساسِ برتری کا مظاہرہ تھا۔ آپ دیکھیے تو مرزا صاحب مالی امداد کے متمنی ہیں، چاہتے ہیں کہ صلہ ملے؛ ضرورت مند بھی ہیں، لیکن "ملاقات" کے لیے اپنی طرف سے یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ وزیرِ اعظم اُن کی تعظیم کریں۔ اور وہ وزیرِ اعظم کی خدمت میں دستور کے مطابق نذر پیش نہیں کریں گے۔ نذر پیش کرنے کا مطلب ہوتا ہے بالادستی اور برتری کا اعتراف اور اظہار؛ مرزا صاحب اِس کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ تھی نا عجیب، بل کہ عجیب تر بات ! بات وہی تھی کہ دہلی والے آخر تک یہی سمجھتے رہے کہ بادشاہت تو دہلی میں تھی اور وہیں ہے[2]۔ یہاں والوں کو تو سندِ حکومت اُسی دربار سے ملتی رہی ہے۔

بادشاہت کی طرح زبان کا مرکز بھی دہلی کو مانا جاتا تھا، سند بھی دہلی والوں سے لی جاتی تھی۔ اِس کا ردِّ عمل تو ہونا تھا۔ سرورؔ نے دہلی اور میر امّن کے متعلق جو کچھ لکھا، اُس کو اِس ردِّ عمل کے فروغ میں بڑا حصّہ مل گیا اور اِسی نسبت سے شہرت ملی۔ یہ واقعہ ہے کہ سرورؔ سے پہلے لکھنؤ کے کسی ادیب اور شاعر نے [اور اِس میں ناسخؔ بھی شامل ہیں] دہلی اور اہلِ دہلی کی لسانی بالادستی اور وہاں کی یکتائی اور استناد سے اِس طرح علی الاعلان انکار نہیں کیا تھا[3]۔ احتشام صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

---

[1] بعد میں مرزا صاحب نے اِس مصرعے کو اِس طرح بدل دیا : لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ۔ متداول دیوان میں یہ اِسی طرح ہے۔ [2] میر مہدی مجروحؔ نے مرزا غالب کو جو یہ لکھا تھا کہ: "اگر شرم آئے تو رجب علی سرور کو آئے ..... اُن سے کہنا چاہیے کہ اے بندۂ خدا، خدا سے ڈر ! لکھنؤ کس بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے؟" ——— [رجب علی بیگ سرورؔ، ص ۲۵۴] تو یہ اِسی طرف اشارہ تھا۔

[3] "عہدِ دولتِ بابر شاہ سے تا سلطنتِ اکبر ثانی، کہ مثل مشہور ہے : نہ چولھے آگ، نہ گھڑے میں پانی، دہلی،

"تاریخی اعتبار سے سرور کی ادبی زندگی لکھنؤ کے اُس عہد سے تعلق رکھتی ہے جب وہاں برائے نام ہی، ایک خود مختار بادشاہت قائم ہو چکی تھی اور وہ اپنی زبان، ادب، معاشرت اور طرزِ فکر میں دہلی سے آزادی حاصل کر رہا تھا۔ لسانی اور ادبی خود مختاری کی خواہش نے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر، لکھنؤ اور دہلی کے اُس فرق کو اور زیادہ نمایاں کر دیا جس کے ہلکے نقوش اُس سے پہلے ہی اُبھرنے لگے تھے۔ رجب علی بیگ سرور کو اس حیثیت سے نئے لکھنوی ادب کا پہلا اہم نمایندہ کہا جا سکتا ہے، جس نے نہ صرف ایک مخصوص اسلوب پیش کر کے اُس تفریق اور خود مختاری پر مُہر لگا دی،

پچھلے صفحے کے حاشیے کا بقیہ :

کی آبادی ویران تھی .... یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی؛ نہ اب تک وہاں ہے" (ص ۱۸)۔ یعنی قصہ ہی ختم کر دیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

اِس سلسلے میں عام طور پر وہ عبارت نظر میں رہتی ہے جس میں میر امّن کا نام آیا ہے: "اِس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویِ اُردو زبان پر لائے .... اپنے منہ سے دھنّا بائی" (ص ۳) لیکن واقعہ یہ ہے کہ پورا "بیانِ لکھنؤ" اِسی جذبے سے بھرا ہوا ہے۔ جگہ جگہ یہ جذبہ، جذبۂ بے اختیار بن کر سطح پر اُبھر آیا ہے اور بین السطور سے اُبھر کر شاملِ سطور ہو گیا ہے۔ مثلاً جب وہ لکھنؤ کی تعریف میں یہ لکھتے ہیں کہ: "جو گفتگو لکھنؤ میں کو بہ کو ہے، کسی نے کبھی سُنی ہو، سنائے۔ لکھی دیکھی ہو، دکھائے"۔ "لکھی دیکھی ہو" سے بھی صاف اشارہ میر امّن کی طرف ہے۔ یا مثلاً: "اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں، کسی شہر کے ایسے ہفت ہزاری ہیں" (ص ۱۹) "کسی شہر" سے صاف صاف دہلی مراد ہے کہ ہفت ہزاری کا منصب وہیں سے ملا کرتا تھا۔ یا مثلاً ص ۸ پر "گومتی میں غوطہ لگایا، دیہاتی پن کے دھبّے دھو گئے، آدمی ہو گئے" میں بھی کنایہ موجود ہے۔ یہاں "گومتی" "جمنا" سے بڑھ گئی ہے۔ "بیانِ لکھنؤ" کا اصل مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ لباس، کھانے وغیرہ معاشرت کے جملہ مظاہر میں لکھنؤ کی افضلیت اور یکتائی کو اِس طرح بیان کیا جائے کہ یہ صاف صاف معلوم ہو جائے کہ اب یہ شہر دہلی پر افضلیت رکھتا ہے اور یہ بھی کہ فصاحت و بلاغت کی ٹکسال بھی اب یہیں ہے۔ ناسخ کے لیے انھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ "شیخ امام بخش ناسخ نے .... روزمرّے کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلامِ سابقین منسوخ ہوا" (ص ۱۲) تو مطلب اِس کا یہی ہے کہ وہ دَور ختم ہوا جب زبان و شعر میں سند دہلی والوں سے لی جاتی تھی۔

بلکہ واضح طور پر دہلی کے ادبی انداز کو سخن گسترانہ چشمک کا موضوع بھی بنایا۔ اِس حیثیت سے بھی سرورؔ کا مطالعہ بڑی تنقیدی اہمیت رکھتا ہے۔"

[رجب علی بیگ سرورؔ، ص ۱۳۴]

جس طرح ناسخؔ کی شاعری کی اندرونی فضا اور اُس کا مزاج لکھنؤ کی اُس نئی معاشرت کا آئینہ دار ہے؛ اُسی طرح سرورؔ کی نثر، آرائش پسندی کے وسیلے سے اُس معاشرت کے انداز و اطوار کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ناسخؔ اور سرورؔ دونوں اپنے اسالیبِ بیان کے واسطے سے دبستانِ لکھنؤ کے نمایندہ افراد ہیں۔ ایک کی شاعری، لکھنؤ کی نئی شعری روایت کا نقطۂ آغاز بنی اور دوسرے کی نثر [فسانۂ عجائب کی صورت میں] وہاں کے خاص انداز کا پہلا نقش بن کر سامنے آئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شعری روایت نے بہت فروغ پایا اور وہ ایک زمانے تک مثال اور معیار بنی رہی۔ ناسخؔ نے کبھی اِس کا باضابطہ اعلان نہیں کیا؛ لیکن اُس مملکت کے لیے، جسے نئی نئی بادشاہت ملی تھی، نئی شعری روایت اور نئے لسانی تصوّر کی بنیاد رکھی۔ نئی حکومت کے لیے جس طرح نیا سکّہ ضروری ہوتا تھا، اُسی طرح اُس نئے معاشرے کو نئی ادبی روایت کی بھی ضرورت تھی؛ جو اُس کی پہچان بھی ہو اور جو اُس علاقے کو، ایک دوسرے علاقے کی ادبی بالادستی سے بھی چھٹکارا دلاکر مستقل لسانی مرکز کی حیثیت دلاسکے۔ یہ تاریخ ساز کام تھا۔ اِس میں ناسخؔ اور سرورؔ دونوں شریک تھے، البتّہ ناسخؔ کی حیثیت شریکِ غالب کی تھی۔

فسانۂ عجائب سے جس نثری روایت کا آغاز ہوا تھا، اُس نے شہرت تو بہت پائی، صحیح معنی میں قبولِ عام بھی پایا، وہ بھی مثال اور معیار بن کر ذہنوں کو متاثر کرتی رہی؛ لیکن شعری روایت کے مقابلے میں اُس کے اثرات کی حکم رانی کی مدّت کم رہی۔ اِس فرق کے باوجود تاریخِ ادب میں اِن دونوں روایتوں کے اثرات ہمیشہ کے لیے اِس طرح محفوظ ہو گئے ہیں کہ اُن کو معلوم کیے بغیر، اُن کو سمجھے بغیر اور اُن کا جائزہ لیے بغیر تاریخِ ادب کے اُس پورے باب کو نہیں سمجھا جاسکتا جو دبستانِ لکھنؤ سے متعلّق ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ فسانۂ عجائب کی اہمیت اپنی جگہ پر برقرار ہے اور رہے گی، اور ادب کے اچھے

طالب علموں کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ بھی ناگزیر قرار پائے گا۔

باغ و بہار کی طرح یہ کتاب بھی اعلا نصابی ادب کا حصّہ رہی ہے اور رہنا چاہیے تاکہ طالبِ علم اُس عہد کی نثری روایتوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ یہ بات خاص کر ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ صرف ایک قصّہ یا ایک مختصر داستان نہیں، یہ ایک روایت کا نقطۂ آغاز ہے اور یہ دہلی و لکھنؤ کے لسانی جھگڑے کا بھی پہلا باب ہے۔ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب صرف دو کتابیں نہیں، یہ دو مختلف اور مستقل اسلوب ہیں اور تقابلی مطالعے کے بغیر اِن دو اہم اسالیب کو اور اِن کے پس منظر کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اِسی اہمیت کے پیشِ نظر اِس کتاب کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا، اُس کا مقصد یہ نہیں کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی اِس کتاب کا جائزہ لیا جائے۔ تنقیدی جائزہ ایک مختلف چیز ہے۔ تدوین میں اصل بات متن کی صحت اور متعلقاتِ متن کی وضاحت ہوتی ہے۔ مقصود اِس مختصر سی گفتگو سے صرف یہ ہے کہ اِس کتاب کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا جائے، یہ واضح کرنے کے لیے کہ کلاسکی متنوں کی تدوین کے اِس خاص سلسلے میں اِس کتاب کو کیوں شامل کیا گیا اور کیوں ترجیح کا مستحق سمجھا گیا۔

اِس کتاب کے متن کو کس طرح پیش کیا گیا ہے، تصحیحِ متن میں کن نسخوں سے کام لیا گیا ہے، اُن نسخوں کا احوال کیا ہے؛ اِن سب ضروری مباحث سے پہلے، یہ ضروری ہے کہ اِس کام کی حدود کا تعین کر لیا جائے اور اِس کی وضاحت کر دی جائے کہ اِس کتاب [اور اِس سلسلے کی دوسری کتابوں] کی تدوین میں کس اندازِ نظر سے کام لیا گیا ہے۔

تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشاے مصنّف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اِس میں بنیادی حیثیت صحّتِ متن کی ہوتی ہے۔ مصنّف نے آخری بار عبارت کس طرح لکھی تھی، یہ سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بنیادی بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ عبارت ہو یا ایک جملہ یا جملے کا ایک ٹکڑا؛ یہ سب الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں، اِس اعتبار سے ہر لفظ کا تعین مرتب کی ذمّے داری ہے۔ لفظ مجموعہ ہوتا ہے

حرفوں کا، اور یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر حرف کا تعیّن اِس ذمّے داری میں شامل ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے تعیّن اور اُن کی صورت نگاری کی صحّتِ متن میں اصل حیثیت ہوتی ہے۔

کسی کتاب کے مختلف نسخوں کو [اگر وہ موجود ہوں] سامنے رکھنا از بس ضروری، بل کہ لازم ہے۔ جب بھی مختلف نسخوں کو پیشِ نظر رکھ کر [منشاے مصنّف کے مطابق پیش کرنے کے لیے] عبارت کی تصحیح کی جائے گی، اور اِس سلسلے میں لفظوں کا تعیّن کیا جائے گا اور لفظوں کی شکل صورت کا تعیّن کیا جائے گا [یعنی کس لفظ کو کس طرح لکھا جائے] تو بہت سے مسائل پیدا ہونے لگیں گے۔ یوں یہ ضروری ہوگا کہ حواشی میں ایسے ہر لفظ سے متعلق ضروری تفصیلات درج کی جائیں۔ بہت سے جملوں کی ترتیب اور معنویت بھی وضاحت کی محتاج نظر آئے گی؛ حواشی میں اُن سے متعلق وضاحتوں کا پیش کرنا بھی ضروری قرار پائے گا۔

وہ متن اگر شاملِ نصاب بھی ہے، تو ایک اور مسئلہ بھی سامنے آئے گا؛ تدوین سے جس کا حقیقی طور پر تعلّق تو نہیں، مگر صحّتِ متن کی تکمیل اور خواندگی کی آسانی کے لحاظ سے اُس کی حیثیت اب کچھ کم نہیں۔ "اب" کی تخصیص یوں کی گئی کہ ہمارے زمانے میں حالات کے اثر سے زبان کی تعلیم کا معیار پست ہو چکا ہے، فارسی سے عام طور پر ناواقفیت پائی جاتی ہے اور اب یہ بہت مشکل [اور بہت سی صورتوں میں ناممکن] معلوم ہوتا ہے کہ طالبِ علم [اور بہت سے اساتذہ بھی] بہت سے لفظوں کے تلفّظ سے واقف ہوں۔ یہی احوال اضافت اور تشدید کا ہے۔ قواعدِ زبان سے ناواقفیت عام ہے اور مشکل متنوں کو پڑھنے کا سلیقہ گویا اُٹھتا جا رہا ہے اور صلاحیت مرحوم ہوتی جا رہی ہے۔ جملے میں ذرا سا اُلجھاوا ہو، تو طالبِ علم بہت زیادہ اُلجھتا ہے [اور بجا طور پر، یہ اُس کی مجبوری ہے اور حالات کا جبر]۔ اِس صورتِ حال میں مشکل کلاسکی متنوں کو، جو شاملِ نصاب بھی ہوں، بہتر طور پر اور مفید طور پر پیش کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ منتخب لفظوں پر اعراب ضرور لگائے جائیں، اضافت کے زیر لازماً لگائے جائیں، تشدید ضرور لگائی جائے۔ معروف و مجہول اور غنّہ آوازوں کے تعیّن کے لیے علامات سے کام لیا جائے۔ اِسی کے ساتھ توقیف نگاری

[پنکچویشن] کا اہتمام بھی بہ طورِ خاص ملحوظ رکھا جائے؛ تاکہ اجزائے جملہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا جاسکے اور معنویت روشن ہوسکے ـــــ جب یہ ساری باتیں ملحوظ رکھی جائیں گی، تو مرتب کے سامنے اور بہت سی اُلجھنیں آکھڑی ہوں گی، اور بالآخر یہ ضروری قرار پائے گا کہ حواشی میں وسعت پیدا کی جائے تاکہ تلفظ، اضافت، تشدید، تذکیر و تانیث، اور اجزائے جملہ کے تعین سے متعلق ضروری وضاحتیں پیش کی جاسکیں اور حسبِ ضرورت اُلجھے ہوئے جملوں کی معنویت پر بھی کچھ گفتگو کی جائے۔ یہ سب کچھ اِس لیے ضروری ہے کہ ایسی وضاحتوں کے بغیر وہ کام ادھورا اور غیر مفید معلوم ہوگا۔ پڑھنے والوں کی نظر جگہ جگہ رُکے گی، ذہن میں اُلجھن بھی پیدا ہوسکتی ہے اور ایک اچھے طالبِ علم کے نقطۂ نظر سے جو معلومات ازبس ضروری ہوسکتی ہے، وہ موجود نہیں ہوگی۔

ایسے مفصل حواشی کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ بہت سے لفظ متروک ہوجاتے ہیں اور کچھ لفظوں کی شکل صورت میں کسی طور پر تبدیلی راہ پالیتی ہے۔ افعال کی کچھ شکلیں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ تذکیر و تانیث میں بھی تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ پھر دبستانی اختلافات ہیں کہ ایک لفظ کو دِلّی والے ایک طرح بولتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ اُس لفظ کا تلفظ ایک اور طرح کرتے ہیں۔ یہی اختلاف بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث میں بھی ہے۔ کچھ جملوں کی ترتیب اور ترکیب میں بھی اب اجنبی پن محسوس ہوتا ہے۔ یہ ساری مشکلیں حل طلب ہوتی ہیں۔ مرتب کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ [ممکن حد تک] ہر مصنف کے مختارات اور اُس عہد کے چلن سے خوب واقف ہو اور اُس واقفیت کے بل پر اُس خاص متن میں امکان بھر صحیح صورتوں کا تعین کرے، اور اُن کی وضاحت کے لیے حواشی میں ضروری تفصیلات درج کرے۔

میں صرف ایک مثال سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا: اِس کتاب میں ص: ۱ پر ایک جملہ یوں ہے: "باغ میں کوئل، پپیہے، مور کا شور۔ جھولے پر گھٹا رہی اَدبھی گھنگھور" اِس جملے میں "اَدبھی" ایسا لفظ ہے جو عام اُردو والوں کے لیے اب اجنبی ہے۔ نہ اِس کے تلفظ کا صحیح طور پر علم ہے [یعنی یہ کہ اِس میں واو معروف ہے یا مجہول] اور نہ اِس کے معنی

معلوم ہیں۔ فرہنگ میں اٹکل سے صرف اِس کے معنی لکھ دینا کافی نہیں، یہ لازم ہوگا کہ حاشیے میں اِس لفظ کے جملہ متعلّقات کو بیان کیا جائے۔ اِس کے بغیر طالب علم اِس لفظ کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا [اور ہاں، اِس جملے میں "گھٹا رہی" بھی بحث طلب ہے]۔

اِس سلسلے میں ایک اور پہلو بھی قابلِ توجّہ ہے۔ یہ کہا گیا ہے [اور بجا طور پر] کہ جو کتابیں بہت مقبول ہوتی ہیں اور بار بار چھپتی ہیں [یا اُن کے خطّی نسخے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں] اُن کے مختلف نسخوں میں بہت سے اختلافات ملتے ہیں۔ فسانۂ عجائب بھی بار بار چھپی ہے، اِتنی بار چھپی ہے کہ اِس کی سب اشاعتوں کا گوشوارہ تیار کرنا مشکل ہے۔ اِس کتاب کے متن کے سلسلے میں صورتِ حال کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ مصنّف نے اپنے زمانے کے مطبوعہ نسخوں کے متعلّق لکھا ہے: "یہ نسخہ اور بزرگواروں نے بھی طبع کیا، اِلّا یہ طرزِ زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا، کم و بیش ہو گیا۔ جو فقرہ نہ پڑھا گیا، وہ اپنے طور پر گڑھا گیا۔" یہ عبارت اُس "نثرِ خاتمہ" میں ہے جو سُرور نے نسخۂ مطبوعۂ مطبعِ میر حسن رضوی [سالِ طبع ۱۲۶۳ھ] کے لیے لکھی تھی۔ ۱۲۵۹ھ میں یہ کتاب پہلی بار چھپی تھی؛ ۱۲۵۹ سے ۱۲۶۳ تک کم و بیش پانچ برس کی مدّت ہے، مصنّف زندہ موجود ہے اور اُس کو یہ شکایت ہے کہ چھاپنے والوں نے فقرے گڑھ لیے ہیں، یعنی متن میں تغیّرات نے راہ پالی ہے۔

یہ تو ہوئی عام بات؛ اِس کتاب کے ساتھ ایک مشکل اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ سُرور نے پہلی اشاعت [۱۲۵۹ھ] کے بعد کئی بار اِس پر نظرِ ثانی کی ہے اور ہر بار بہت سے لفظوں کو، فقروں کو اور بہت سی عبارتوں کو بدل دیا ہے۔ اُنھوں نے خود ہی لکھا ہے: "جب مصنّف کی نظر سے یہ کتاب گزر جاتی ہے، زیورِ بیانِ تازہ کی چمک سے دونی رونق پاتی ہے۔" [نثرِ خاتمۂ نسخۂ مطبوعہ ۱۲۸۰ھ]۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایسی تبدیلیوں کا کوئی ایک انداز نہیں۔ اِس کو یوں دیکھیے کہ "حاجیِ حرمین مولوی محمّد حسین" کی فرمایش پر جب اِس کتاب پر نظرِ ثانی کی، تو گویا پوری کتاب کو بدل دیا۔ اِس قدر تبدیلیاں کیں اور اِتنی زیادہ عبارتیں بدلیں کہ یہ ایک نیا نسخہ بن گیا۔ ۱۲۶۷ھ میں یہ نسخہ مطبعِ محمّدی کان پور میں چھپا؛ مگر اِس کے بعد

مولوی محمد یعقوب انصاری کی فرمایش پر سُرور نے جب پھر اِس پر نظرِ ثانی کی، تو اس ۱۲۷۶ھ والے نسخے کو گویا سرے سے کالعدم قرار دے دیا اور اب جو متن طباعت کے لیے دیا، وہ اشاعتِ ثانی (۱۲۶۳ھ) کے مطابق تھا [بعض ضمنی تبدیلیوں کے ساتھ]۔ یہ نسخہ ۱۲۷۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ اِنھی مولوی محمد یعقوب انصاری کی فرمایش پر ایک بار پھر اِس اشاعت پر نظرِ ثانی کی گئی، اِس بار بعض ایسی عبارتوں کا اضافہ کیا گیا جو اِس سے پہلے کسی نسخے میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ نسخہ ۱۲۸۰ھ میں چھپا [یہ مصنّف کا نظرِ ثانی کیا ہوا آخری اڈیشن ہے، مگر اِس کی کم یابی کا احوال یہ ہے کہ عام طور پر سُرور اور فسانۂ عجائب سے متعلق تحقیقی کام کرنے والے اِس نسخے کے وجود سے بے خبر رہے ہیں۔ اِس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اصولِ تدوین کے مطابق مصنّف کے آخری نظرکردہ متن کو ترتیبِ نو کی بنیاد نہیں بنایا جاسکا، اُس سے پہلے کے نسخوں سے کام لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اِس صورت میں منشاے مصنّف کے مطابق اِس کتاب کے متن کو پیش نہیں کیا جاسکا۔ یہ اُسی وقت ہوسکتا تھا جب ۱۲۸۰ھ کے نسخے کو بنیاد بنایا جاتا، کہ وہ مصنّف کا نظرِ ثانی کیا ہوا آخری نسخہ ہے]۔

یہ اُلجھن کی بات تو تھی ہی، اِس میں مزید اضافہ اِس طرح ہوا کہ منشی نول کشور نے سُرور سے اِس کا حقِ اشاعت باضابطہ خرید لیا تھا۔ اِس کے بعد ۱۸۶۳ء میں اِس کا پہلا اڈیشن وہاں سے شائع ہوا [اِس سے پہلے بھی یہ کتاب اِس مطبعے سے چھپ چکی تھی، اخذِ حقوق کے بعد یہ گویا پہلا باضابطہ اڈیشن تھا]۔ اِس کے بعد سے تو نول کشوری نسخوں سے بازار گویا بھر گیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اِس باضابطہ نول کشوری اشاعتِ اوّل پر سُرور نے نظرِ ثانی نہیں کی تھی؛ لیکن صاحبانِ مطبع نے نثرِ خاتمۃ الطبع میں ایسا مبہم اندازِ بیان اختیار کیا، جس سے یہ خیال بہ آسانی پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ نظرِ ثانی شدہ اڈیشن ہے۔ یوں یہ خیال کچھ لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گیا کہ یہ اِس کتاب کا آخری مستند اڈیشن ہے، یعنی سُرور نے اِس خاص اشاعت کے لیے اِس کتاب پر [اپنے معمول کے مطابق] نظرِ ثانی کی تھی؛ حالاں کہ یہ محض مفروضہ ہے۔ سُرور نے حقوقِ اشاعت ضرور فروخت کیے تھے،

لیکن اُس اشاعت کے لیے متن پر نظرِ ثانی نہیں کی تھی [اِس کی ضروری تفصیل اِس اشاعت کے تعارف کے ذیل میں آگے آئے گی] - اِس غلط فہمی کو یوں بھی فروغ ملا کہ وہ خاص اشاعتِ اوّل اِس قدر کم یاب ہے کہ آٹھ دس سال کی مسلسل تلاش کے بعد، جب مَیں گویا مایوس ہو چکا تھا، اچانک یہ نسخہ مل گیا اور یہ محض اتفاق تھا۔ اِس مدّتِ تلاش میں مجھے ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو یہ کہ سکے کہ اُس نے اِس اشاعت کو دیکھا ہے۔ اِس اشاعتِ اوّل کی تفصیلات جن لوگوں نے لکھی ہیں، بیش تر نے دراصل مؤخر اشاعت کو دیکھا ہے، جس میں اُس اشاعتِ اوّل کی ایسی تفصیلات کو لکھ دیا گیا ہے اور وہیں سے اُن کو نقل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر نیّر مسعود کی کتاب رجب علی بیگ سرور میں بھی اشاعتِ اوّل کی تفصیلات مندرج ہیں اور اُنھوں نے مجھے خود بتایا کہ یہ تفصیلات دراصل مؤخر اشاعت سے منقول ہیں، اشاعتِ اوّل اُن کی نظر سے بھی نہیں گزری۔

بعد کی اکثر نول کشوری اشاعتوں کا احوال یہ ہے کہ اُن میں اختلافاتِ متن پیدا ہوتے گئے ہیں اور تحریفات بھی ملتی ہیں۔ مَیں اِس مقام پر ایسی صرف ایک مثال پیش کروں گا، جس سے صورتِ حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ـــــــ عہدِ مصنّف کے جس قدر مطبوعہ نسخے میری نظر سے گزرے ہیں، اُن میں "بیانِ لکھنؤ" کے آغاز میں "مرزا رجب علی تخلّص سرور متوطّن خطّۂ بے نظیر دل پذیر" ملتا ہے۔ اُس نول کشوری اشاعتِ اوّل [اور اشاعتِ ثانی] میں بھی یہ ٹکڑا اِسی طرح ہے؛ لیکن ۱۸۸۲ء کی ایک نول کشوری اشاعت میرے سامنے ہے، اُس میں یہ فقرہ یوں چھپا ہوا ہے: "رجب علی بیگ تخلّص سرور متوطّن حال خطّۂ بے نظیر دل پذیر"؛ یعنی اُس میں لفظِ "حال" کا اضافہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلی ہوئی تحریف ہے اور بہ ظاہر مطبعے کے کسی کارکُن کی کارگزاری ہے۔ ہاں ڈاکٹر گیان چند جین نے مئی ۱۹۱۲ء کے ایک نول کشوری اِڈیشن کا حوالہ دیا ہے کہ اُس میں بھی لفظِ "حال" موجود ہے [اُردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اُردو اکیڈمی اِڈیشن، ص ۵۰۶] - اِس سلسلے میں یہ دل چسپ بات سامنے آئی کہ میرے پاس ۱۸۶۲ء کی ایک نول کشوری اشاعت ہے، اُس میں لفظِ "حال" موجود نہیں۔ اِس سے یہ ظاہر نتیجہ

نکالا جاسکتا ہے کہ لفظ "حال" کا اضافہ اُس خاص اشاعتِ اوّل کے بعد[۵] سے شروع ہوتا ہے کس نول کشوری اشاعت سے شروع ہوتا ہے؛ اِس سلسلے میں یقین کے ساتھ اُسی وقت کچھ کہا جاسکتا ہے جب اُس زمانے کی، یعنی ۱۹۰۰ء سے پہلے کی سب، یا کم از کم بیش تر اشاعتیں سامنے ہوں۔

کہنے کو یہ ایک لفظ کا اضافہ ہے، لیکن اِس تحریف نے سرور کی وطنیت کا مسئلہ خواہ مخواہ پیدا کر دیا۔ جناب محمود اکبر آبادی کا مرتّب کیا ہوا نسخۂ فسانۂ عجائب، جو الٰہ آباد سے شائع[۶] ہوا تھا، اُس نسخے میں اِس مقام پر "متوطّنِ حال" ہی ہے۔ محمود صاحب نے اپنے مقدّمے میں لکھا ہے: "سرور کی تصانیف میں اس قسم کی شہادت موجود ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے نہیں تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ اُن کا آبائی وطن اکبر آباد تھا" (ص ۴)۔ بہ ظاہر اِس غلط دعوے کی بنیاد اِسی تحریف "متوطّنِ حال" پر معلوم ہوتی ہے[۷]۔

[۱] خاتمۃ الطبع کی جو عبارت ۱۸۶۲ء کے نسخے کے آخر میں ہے، اُس کی آخری دو سطریں یہ ہیں:
"غرض یہ شاہدِ معنی شہر لکھنؤ محلہ رکاب گنج مہاراجہ مان سنگھ کے مکان میں زیورِ طبع سے محلّی ہوا۔ ۲۰ رنومبر ۱۸۶۲ء کو کارگزاران مطبع نول کشور کی آرایش سے مطبوع طبائع ہو کر جلوہ نما ہوا۔" آخر میں اصغر علی خان نسیم کا قطعۂ تاریخِ طبع ہے، جس کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اِس مطبعے سے چوتھی بار چھپی ہے، شعر یہ ہے:
"بسکہ چارم بار حکمت طبعِ افسانہ نمود ٭ بہر سالش ہر کسے بابِ سخن را در کشود"
یعنی ۱۸۶۲ء کی اِس اشاعت سے پہلے یہ کتاب تین بار اور اِسی مطبعے سے چھپ چکی تھی۔

[۲] ناشر: رام نرائن لال بینی مادھو۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے، وہ ۱۹۲۷ء کا چھپا ہوا ہے اور اِس پر "بارِ دوم" لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے اِسی نسخے کی اشاعتِ ۱۹۲۸ء کا حوالہ دیا ہے [رجب علی بیگ سرور، ص ۷۷] غالباً یہی پہلی اشاعت ہوگی۔ [۳] اِس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی غیر معتبر اشاعت، اغلباً کسی موخّر نول کشوری اشاعت پر یہ نسخہ مبنی ہے۔ [۴] جین صاحب نے لکھا ہے کہ "مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی نے بھی "بیگماتِ اودھ کے خطوط" کے دیباچے میں سرور کو اکبر آبادی قرار دیا ہے" [ص ۵۰۵] مفتی صاحب کے متعلق تو اب یہ بات عام طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ روایتیں گڑھنے اور بے بنیاد دعوے کرنے میں اُن کو درجۂ کمال حاصل تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ کلاسکی متنوں کے اِس سلسلے میں اِس کتاب کو شامل کرنا کیوں ضروری تھا، اور یہ کیوں ضروری تھا کہ اِس کتاب کے اُس نسخے کو تلاش کیا جائے جس پر مصنّف نے آخری بار نظرِ ثانی کی تھی؛ اور اُس نسخے کو بنیاد بنا کر، اور دوسرے اہم نسخوں کو سامنے رکھ کر، اِس کتاب کا متن اُس طرح تیار کیا جائے جس طرح آخری بار مصنّف نے اُسے پیش کیا تھا اور مفصّل حواشی کو بھی شاملِ کتاب کیا جائے۔

متن کی کما حقّہٗ تصحیح اور متعلّقاتِ متن کی ترتیب کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ تنقیدی مباحث کو شاملِ کتاب نہ کیا جائے۔ ویسے بھی تنقید اور تدوین، دو الگ موضوع ہیں۔ متضاد تو نہیں، لیکن مختلف ضرور ہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور دونوں کے مباحث بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اِن دو نوں مختلف الاحوال موضوعات کا حق ادا کر سکے اور اِس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں موضوعات دو مختلف اندازِ نظر، طریقِ کار اور طرزِ فکر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ عام طور پر اِس خلطِ مبحث سے، یعنی مقدمۂ کتاب میں طویل تنقیدی مباحث کو شامل کرنے سے یہ نقصان ضرور ہوتا ہے کہ دونوں موضوعات کا حق ادا نہیں ہو پاتا، اور سب سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ متعلّقاتِ متن کی ضروری تفصیلات زیرِ بحث نہیں آپاتیں۔ مرتّب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ متن کو صحیح طور پر پیش کر دے اور اُس متن سے متعلق بحثوں کو مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے، جس میں قابلِ ذکر حصّہ لسانی مباحث کا ہو گا۔ اُس کے فرائض میں یہ شامل نہیں کہ وہ تنقیدی رائے بھی دے۔ اِسی لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اِس سلسلے کی زیرِ ترتیب کتابوں کے مقدّمے میں تنقیدی مباحث کو شامل نہ کیا جائے۔

تحقیق اور تدوین کا چولی دامن کا ساتھ ہے؛ مگر اِس سلسلے میں ایک بات خاص کر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کسی متن کی تدوین کے سلسلے میں، اور کسی مصنّف پر مستقل طور پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے سلسلے میں جو تحقیقی بحثیں کی جائیں گی، اُن کی وسعت کا دائرہ مختلف ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اِسی طرح جو تحقیقی بحثیں اُس سے پہلے کی جا چکی ہوں، اور وہ قابلِ قبول بھی ہوں، اور اُن پر اضافہ بھی نہ کیا جا سکتا ہو؛ تو یہ ضروری نہیں [بل کہ مناسب بھی نہیں]

کہ اُن سب بحثوں کو شاملِ مقدمہ مرتب کیا جائے۔ اُن کا حوالہ دینا کافی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اسی کتاب کے مصنف کے حالات کی تحقیق ضروری ہے، زمانۂ تصنیف کی بحث بھی ضروری ہے، اِس کتاب کے مختلف نسخوں کی نشان دہی اور اُن کا تعارف بھی ضروری ہے [وغیرہ]۔ یہ سب وسیع الذیل عنوان ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کے تحقیقی مقالے رجب علی بیگ سرور میں حیاتِ مصنف سے متعلق تفصیلات موجود ہیں اور ابھی تک [بعض ضمنی باتوں سے قطع نظر] اُن پر قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی طرح فسانۂ عجائب کی داستان کے مآخذ پر گیان چند جین صاحب نے اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں مناسب بحث کی ہے۔ اب اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ صرف نہایت ضروری باتوں کو اختصار کے ساتھ لکھا جائے اور تفصیلات کے لیے اصل مآخذ کا حوالہ دے دیا جائے، تو یہ طریقۂ کار بالکل درست ہوگا۔ اِس کتاب کے مقدمے میں یہی طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے۔ اُنھی اُمور پر بحث کی گئی ہے جن پر بحث کرنا ضروری تھا۔ مثلاً مصنف کے حالاتِ زندگی کے مقابلے میں، اِس کتاب کے اُن نسخوں کے تعارف کو زیادہ توجہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے جن سے اِس متن کی تصحیح میں مدد لی گئی ہے۔ [ہاں اگر کوئی شخص مثلاً فسانۂ عجائب کی داستان کے مآخذ پر، یا مصنف کے حالاتِ زندگی پر، یا ایسے ہی کسی دوسرے موضوع پر مستقل طور پر تحقیقی کام کرے، تو پھر صورتِ حال مختلف ہوگی، کیوں کہ وہاں اصل مقصد دوسرا ہوگا۔ یہاں اصل مقصد تصحیحِ متن ہے]۔ اِسی طرح متعلقاتِ متن کو، تصحیحِ متن کی نسبت سے، خاص طور پر گفتگو کا موضوع بنایا گیا ہے۔

ولادت، وطن، وفات اور مدفن

فسانۂ عجائب کے مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور کے سالِ ولادت کا علم نہیں۔ نیر مسعود صاحب نے قیاساً[1] ۱۲۰۰ھ لکھا ہے۔ اُن کے وطن کا جہاں تک تعلق ہے، تو "بیانِ لکھنؤ"

---

[1] سرور کا سالِ پیدائش معلوم کرنے کا صرف ایک قرینہ فسانۂ عجائب کے دیباچے کا یہ فقرہ ہے: "چالیس سال

کے شروع ہی میں اُنھوں نے اپنے آپ کو "متوطّنِ خطّۂ بے نظیرِ دل پذیر" لکھا ہے۔ "خطّۂ بے نظیر" سے قطعی طور پر لکھنؤ مراد ہے؛ اِس لیے میری نظر میں وہ لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے۔[۱]
اُن کو جو "اکبر آبادی" اور "کان پوری" لکھا گیا ہے، تو یہ بجائے خود درست نہیں۔ "اکبر آبادی" سے متعلق ضروری تفصیل اِس تحریر میں اِس سے پہلے آچکی ہے۔ کان پور کا حوالہ دتاسی نے اپنے پانچویں خطبے میں دیا ہے؛ مگر اُسے غالباً یہ غلط فہمی [بہ قولِ نیّر مسعود صاحب] اِس بنا پر ہوئی کہ یہ کتاب سُرورؔ نے بہ زمانۂ قیام کان پور لکھی تھی [رجب علی بیگ سرور، ص ۷۷]۔

نیّر مسعود صاحب نے اُن کے سالِ وفات کی مختلف تاریخوں پر بحث کرتے ہوئے، آخر میں لکھا ہے: "اِس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ سُرورؔ نے محرم ۱۲۸۶ھ میں ۱۴ اپریل اور ۱۴ مئی ۱۸۶۹ء کے درمیان کسی تاریخ کو انتقال کیا" [ایضاً، ص ۴۰]۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے ایک مضمون بہ عنوانِ "مرزا رجب علی بیگ سرورؔ اور بنارس" [مشمولہ غالب نامہ، دہلی، شمارۂ جولائی ۱۹۸۳ء] میں اِس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اِس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ... تقویم ہجری کے مطابق دس سال چند یوم...کے

جہان کی دیکھ بھال کی...." اِس فقرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کی تحریر کے وقت سُرورؔ کی عمر چالیس سال تھی۔ دیباچہ... کا مندرجۂ بالا مقام بہ ظاہر ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا ہے؛ اِس لیے قدرے کم و بیش اندازمیں کہا جاسکتا ہے کہ سُرورؔ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے" [رجب علی بیگ سرور، ص ۷۵]۔ اِس سلسلے میں اب تک اور کچھ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ اِس قیاسی تعیّن کو تسلیم کرنے میں بہ ظاہر کوئی بات مانع نظر نہیں آتی اور یوں اِس سنہ کو قرینِ قیاس کہا جاسکتا ہے۔ ۱۲۰۰ھ مطابق ہے ۸۶-۱۷۸۵ء کے۔ فسانۂ عجائب کے ایک مرتب ڈاکٹر سلیمان حسین نے بھی اپنے دیباچے میں یہی بات لکھی ہے: "اُن کا سالِ پیدایش ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء کے لگ بھگ ہونا چاہیے" (ص ۱۲)۔

[۱] گیان چند جین صاحب نے اُن کے لکھنوی ہونے کے سلسلے میں کچھ اور باتیں بھی لکھی ہیں، من جملہ اُن کے: "شگوفۂ محبت کے اختتام پر سُرورؔ خود لکھتے ہیں: 'اِس قصّے کا کہنے والا، لکھنؤ کا رہنے والا....' اِس طرح تمام شہادتیں سُرورؔ کے متوطّنِ لکھنؤ ہونے کے حق میں ہیں" [اُردو کی نثری داستانیں، ص ۵۰۲]۔

قریب دربارِ بنارس سے وابستہ رہنے کے بعد ذی الحجّہ ۱۲۸۵ھ کے اواخر میں [۱۵ر مارچ تا ۱۲ر اپریل ۱۸۶۹ء] رام نگر ہی میں، تقریباً بیاسی سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔"

میرے نزدیک یہ قول مرجّح ہے ـــــ اُن کے مدفن کے سلسلے میں نیّر مسعود صاحب نے اپنی کتاب میں تاج الدّین اشعر رام نگری کا یہ قول نقل کیا ہے: "قصبے (یعنی رام نگر) کے مشرق میں پنج بٹی کے مقام پر واقع گورستان میں سپردِ خاک کیے گئے" (ص ۱۴۱)۔ حنیف نقوی نے بھی (محوّلۂ بالا مضمون میں) اِسی قول کو تسلیم کیا ہے، اور بہ ظاہر اِس سے اختلاف کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اُس قبرستان میں سُرورؔ کی قبر کا نشان اب موجود ہے یا نہیں، اِس کے متعلق کوئی بات اُسی وقت کہی جاسکتی ہے جب کوئی شخص وہاں جاکر بہ چشمِ خود دیکھے۔ کوشش کے باوجود میں اِس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا۔

تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت

سُرورؔ کے سوانح میں یہ صراحت ملتی ہے کہ فنونِ سپہ گری، خطّاطی اور موسیقی میں بھی اُن کو دخل تھا۔ شاعر تو وہ تھے ہی اور اِس فن میں وہ آغا نوازش حسین خاں نوازشؔ عرف مرزا خانی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ نوازشؔ شاگرد تھے میر سوزؔ کے۔ سُرورؔ کے اشعار پڑھ کر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمولی درجے کے شاعر تھے اور یہ اچھا ہی ہوا کہ اُنھوں نے شاعری کی طرف زیادہ توجّہ نہیں کی۔ دیگر فنون [خطّاطی، سپہ گری، موسیقی] میں اُن کی حیثیت کیا تھی، اِس کے متعلق فی الوقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اُس زمانے کی روِش اور چلن کے لحاظ سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اِن فنون میں درجۂ کمال نہ ہی، مہارت ضرور رکھتے ہوں گے۔ کئی باتوں کی بنا پر یہ مانا جاسکتا ہے کہ فنِّ داستان گوئی میں بھی [کچھ نہ کچھ] دسترس ضرور رکھتے تھے۔ اِس قصّے کو اُنھوں نے جس طرح دوستوں کی محفل میں بیان کرنے کا حال لکھا ہے، اُس سے بھی اِس خیال کی تائید کا پہلو نکلتا ہے۔ اِس کتاب میں کئی جگہ ایسا اندازِ بیان اختیار کر گئے ہیں جس سے بہ ظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ

وہ داستان گوئی سے ربط ضرور رکھتے تھے۔مثلاً ایک جگہ لکھا ہے : "یہاں سے دو کلمے یہ سنیے، مُسبّبُ الاسباب کی کارسازی کے سامان دیکھیے" [ص ۳۰۵]۔ یا جیسے : "صبح سے پہر دن باقی رہا، کوئی دقیقہ طرفین سے نہ باقی رہا۔ طول اِس مقام کا بے جا ہے، اِسی کلمے پر تمام کیا" [ص ۲۵۱]۔ ایسی متعدّد مثالیں اِس کتاب سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اُن کے دہلوی حریف سیّد فخر الدّین حسین سخن نے اپنی [جوابی] کتاب سروشِ سخن میں جو یہ لکھا ہے کہ "یوں تو کہنے کو بہت سے داستان گو دہلی اور لکھنؤ میں مارے مارے پھرتے ہیں، وہ بھی چاہیں تو فسانہ لکھ ڈالیں" [بہ حوالۂ رجب علی بیگ سرور، ص ۸۰] تو بہ قولِ نیّر مسعود صاحب : "یہ فقرے بھی سُرورؔ کے داستان گو ہونے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں [ایضاً]۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو اُنھوں نے اپنی کتاب شگوفۂ محبت کے دیباچے میں لکھا ہے : "نامساعدتِ بخت اور نیرنگیِ زمانہ سے نہ عربی میں دخل ہوا نہ فارسی میں کامل ہوا .... پست ہمّتی سے اُردو کے لکھنے میں اوقات بسر کی .... کچھ دن نظم کا اہتمام رہا، شعر کہنے کا خیالِ خام رہا۔ جب وہ بھی نہ ہوسکا، نثر کی طرف خیال آیا" [اور یہ اچھا ہی ہوا کہ نثر کی طرف خیال آیا]۔ بہ قولِ نیّر مسعود : "سرورؔ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی سے بہ خوبی اور کم سے کم کام چلانے بھر عربی سے واقف تھے .... مگر فارسی لکھنا سرورؔ کو نہ آسکا۔ انشائے سرور میں اُن کے جو فارسی خط شامل ہیں، وہ عجب بے کسانہ اندازِ تحریر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کی عبارت کے الفاظ و مصادر تو فارسی ہیں، لیکن حقیقتاً اُن کو فارسی میں لکھی ہوئی اُردو کہا جاسکتا ہے .... اُردو زبان میں سرورؔ نے واقعی دستگاہ بہم پہنچائی تھی" [رجب علی بیگ سرور، ص ۸۷] اُنھوں نے باضابطہ تعلیم کس قدر پائی تھی اور کہاں پائی تھی، اِس کا احوال نہیں معلوم ؛ لیکن یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ فارسی زبان اور ادب سے وہ خوب واقف تھے اور فارسی سے اُردو میں اچھا ترجمہ کرنے پر بھی قادر تھے۔ اُن کے حالاتِ زندگی سے متعلق بعض ضروری باتیں اِس کتاب کی تصنیف اور اِس کے مختلف نسخوں کے تعارف کے ذیل میں آگئی ہیں۔ مفصّل حالات اور تصنیفات کے لیے ڈاکٹر نیّر مسعود کی کتاب رجب علی بیگ سرور کو دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب کا نام

فسانۂ عجائب کے اُن سب مطبوعہ نسخوں میں، جو میری نظر سے گزرے ہیں، اِس کتاب کا نام "فسانۂ عجائب" ملتا ہے۔ مصنف نے اپنے دیباچے کے آخر میں خود ہی صراحتاً لکھا ہے: "دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجائب اِس کا نام رکھا" [ص ۳۱]۔ اِس میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ ہے اِس کتاب کا وہ مطبوعہ نسخہ، جو مطبعِ حیدری لکھنؤ میں چھپا تھا [نسخۂ د]۔ اِس نسخے میں منقولۂ بالا جملہ اِس طرح ہے: "دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجیب اِس کا نام رکھا" [ص ۱۲]؛ مگر اِس نسخے کے سرورق پر اِس کو "فسانۂ عجائب" لکھا گیا ہے: "محشّی بہ نسخۂ عجائب و غرائب جانِ عالم شاہزادہ ... مسمّی بفسانۂ عجائب"۔

ڈاکٹر محمود الٰہی نے فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے نام سے اِس کتاب کی جو روایت شائع کی ہے، اُس میں نام سے متعلق اپنے مقدمے میں لکھا ہے: "خطّی نسخے کے متن میں کتاب کے نام کی صراحت نہیں۔ ہاں جہاں کتاب ختم ہوتی ہے، اُس کے معاً بعد اور ترقیمے سے پہلے "تمام شد کتاب فسانۂ عجیب" ملتا ہے۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ مصنف نے پہلے کتاب کا نام "فسانۂ عجیب" رکھا ہو اور اصلاح کے بعد "فسانۂ عجائب" کر دیا ہو" [ص ۴]

جس روایت کو محمود الٰہی صاحب نے "بنیادی متن" کے عنوان سے شائع کیا ہے، اُس روایت کا ایک اور خطّی نسخہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے پاس تھا [دونوں روایتوں میں بعض اہم اختلافات ہیں]۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ہاشمی صاحب کے خط کی بنیاد پر اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "اِس کے ترقیمے میں قصّے کا نام "قصّۂ انجمن آرا" دیا ہے"۔ [اردو کی نثری داستانیں، ص ۵۱۱]۔ یوں تین نام ہوئے: فسانۂ عجائب، فسانۂ عجیب، قصّۂ انجمن آرا۔

جیسا کہ محمود الٰہی صاحب نے صراحتاً لکھا ہے کہ "فسانۂ عجیب" شاملِ متن نہیں۔ اِس روایت کے متن میں وہ جملہ ہی موجود نہیں جس میں [دیگر نسخوں میں] کتاب کا نام آیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اِس نام کا مصنف سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ بہ ظاہر ناقلِ کتاب کا اضافہ ہے،

اِس لیے لازماً قابلِ قبول نہیں۔ اِس کی دوسری روایت ہیں جو "قصّۂ انجمن آرا" مرقوم ہے، تو اِس کو بھی کتاب کا حقیقی نام مان لینا درست نہیں ہوگا۔ یہ تو ویسا ہی صفاتی نام ہے جیسے اِس قصّے کو "قصّۂ جانِ عالم" کہا جائے [اور یہ کہا گیا ہے]۔ اِس طرح کے صفاتی ٹکڑے لازماً حقیقی نام نہیں ہوتے۔ یہ بھی ناقلِ کتاب کا اضافہ ہے۔ اصل مسئلہ نسخۂ مطبعِ حیدری کا ہے۔ اِس نسخے سے جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے، اُس میں جملے کا دوسرا ٹکڑا نا تمام ہے، یعنی "نام" کے بعد فعل موجود نہیں۔ دوسرے یہ کہ سرورق پر اِس کا نام "فسانۂ عجائب" ہی لکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اُس وقت تک، یعنی مطبعِ حیدری کے اِس نسخے کی اشاعت کے وقت تک، یہ کتاب کئی بار چھپ چکی تھی اور "فسانۂ عجائب" کے نام سے شہرت پا چکی تھی۔ اِن وجوہ سے میری راے میں "فسانۂ عجیب" کسی طرح قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا۔ سُرورؔ نے مختلف اشاعتوں کے لیے عبارت میں تبدیلیاں کی ہیں، نام کبھی نہیں بدلا اور بہ ظاہر نام کو بدلنے کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اِس کا امکان ہے کہ کسی نے اِسے "فسانۂ عجیب" کہا ہو اور مطبعے میں اِس مقام پر یہی نام زیرِ کتابت آگیا ہو۔ اِس اشاعت کے دو نسخے میرے سامنے ہیں۔ ایک تو ناقص الآخر ہے، دوسرے میں یہ نقص تو نہیں، مگر اُس آخری صفحے کے حاشیے کے کونے کا کچھ حصّہ غائب ہے جہاں خاتمۃ الطبع کی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ اُس عبارت میں "نسخۂ عجیبہ و قصّۂ غریبۂ جانِ عالم شاہزادہ بزبانِ اُردو" تو صاف صاف پڑھنے میں آتا ہے، اور "مسمی بفسانۂ عجائب" کے بعض اجزا پڑھنے میں آتے ہیں، مگر غور کرنے پر قطعی طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ "مسمی بفسانۂ عجائب" لکھا ہوا تھا۔ اِس سے اور سرورق کے اندراج سے اِس کے حقیقی نام "فسانۂ عجائب" ہی کی توثیق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نیرّ مسعود نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں نام کے سلسلے میں ایک اور بات لکھی ہے۔ ۱۲۶۲ھ میں مطبعِ مصطفائی سے اِس کتاب کا جو اڈیشن شائع ہوا تھا، اُس کے آخر میں کئی قطعاتِ تاریخِ طبع شامل ہیں؛ ایک قطعے کا پہلا مصرع یہ ہے: چھپی پھر جانِ عالم لکھنؤ میں۔ اِس مصرعے کو نقل کرکے، اُنھوں نے لکھا ہے: "فسانۂ عجائب

کے کئی پرانے قطعاتِ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب "جانِ عالم" یا "قصّہٴ جانِ عالم" کے نام سے بھی مشہور تھی" [حاشیہ، ص ۱۲۴]۔ نیّر صاحب نے اگرچہ یہ نہیں لکھا کہ "جانِ عالم" یا "قصّہٴ جانِ عالم" اِس کا اصلی نام تھا، صرف یہ لکھا کہ اِن ناموں سے بھی مشہور تھی؛ مگر اِس سے غلط فہمی کے لیے اچھی خاصی گنجایش پیدا ہوگئی ہے ——— یہ بات واضح کر دینا تھی کہ ایسے سب نام، دراصل صفاتی نام ہیں۔ اگر سب یا بیش تر مطبوعہ نسخوں کے آخر میں شامل قطعاتِ تاریخِ طبع اور عباراتِ خاتمۃ الطبع کو یک جا کیا جائے، تو ایسے متعدد صفاتی نام سامنے آئیں گے، مثلاً: این کتابِ جانِ عالم چوں حسن فرمود طبع [اشاعتِ اوّل]۔ یا یہ فقرہ: "داستانِ سرور افزا ہے، جانِ عالم انجمن آرا ہے" [اشاعتِ ۱۲۶۷ھ]۔ یا یہ شعر: فکر کی عاصی نے جو تاریخ کی؛ جانِ عالم نے کہا مرغوب ہے [طبع ۱۲۶۳ھ]۔ ع: افسانہٴ عجائب مرزا رجب علی [اشاعتِ ۱۲۶۲ھ]۔ سرورِ جانِ عالم انجمن آرا یہ قصّہ ہے [ایضاً]۔ ع: جانِ عالم کا یہ قصّہ خوش بیان [ایضاً]۔ سرور نے اپنی کتاب شگوفہٴ محبّت میں خود بھی اِسی انداز کا ایک جملہ لکھا ہے: "فسانہٴ عجائب، کہ قصّہٴ جانِ عالم ہے، بہت مطبوعِ ساکنانِ عالم ہے" [بہ حوالہٴ فسانہٴ عبرت، ص ۵]۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "قصّہٴ جانِ عالم" نام نہیں، بیانیہ صفت ہے؛ نام "فسانہٴ عجائب" ہے ——— غرض کہ اِس کتاب کا نام فسانہٴ عجائب ہے۔ باقی ایسے سب ٹکڑے، جن پر نام کا دھوکا ہو سکتا ہے [یا ہوا ہے] بیانیہ ٹکڑے ہیں؛ جو بہ طورِ صفت آئے ہیں، ہیرو یا ہیروئن کی مناسبت سے، یا کسی اور نسبت سے۔

وجہِ تصنیف اور زمانہٴ تصنیف

اِن دونوں سے متعلق مصنّف کا بیان موجود ہے۔ اِسی کتاب کے دیباچے میں "وجہِ تالیف اِس قصّہٴ بے نظیر کی" کے ذیل میں سرور نے لکھا ہے کہ "ایک روز چند دوستِ صادق ... باہم بیٹھے تھے" اور ہر شخص زمانے کی شکایت کر رہا تھا۔ "اُس زُمرے میں

ایک آشنائے بامزہ بندے کے تھے، اُنھوں نے فرمایا: اِس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رفعِ کدورت ہو ... فرماں بردار نے بجز اقرار' انکار مناسب نہ جانا، چند کلمے گوش گزار کیے" [ص ۲۷]۔

یہاں سُرورؔ نے قصہ گوئی کی رعایت سے "چند کلمے" لکھا ہے [داستان سرایوں اور قصہ گویوں کا یہ خاص محاورہ تھا] کسی نہ کسی شکل میں پوری کہانی کہی ہوگی؛ ہاں وہ ویسی مربوط اور مفصل یقیناً نہیں ہوگی، جیسی کتابی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ اپنے بیان کو "پراگندہ تقریر" کہہ کر، یہ وضاحت اُنھوں نے خود ہی کردی ہے، لکھا ہے: "وہ باتیں[1] اُنھیں بہت پسند آئیں، کہا: اگر بہ دل جمعی تمام تو اِس پراگندہ تقریر کو، از آغاز تا انجام، قصّے کے طور پر زبانِ اُردو میں فراہم اور تحریر کرے، تو نہایت منظورِ نظرِ اہلِ بصر ہو" [ص ۲۸]۔ ساتھ ہی دوست نے یہ بھی فرمایش کی کہ زبان مشکل نہ ہو: "لیکن تقصیر معاف ہو، لُغت سے صاف ہو"۔ سُرورؔ نے وعدہ کرلیا، مگر یہ کہا کہ "جلدی نہ کرنا، بہ وقتِ فرصت لکھوں گا" [ص ۲۸]۔ سُرورؔ نے اگرچہ صراحت نہیں کی، لیکن سارے قرائن اِس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لکھنؤ کا واقعہ ہے۔ اب مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے پہل یہ داستان لکھنؤ میں، دوستوں کے اجتماع میں، ایک خاص دوست کی فرمایش پر، قصّہ گویوں کے طرز پر زبانی بیان کی گئی تھی۔ البتّہ دو باتیں وضاحت طلب رہ جاتی ہیں: ① یہ کس زمانے کا واقعہ ہے۔ ② وہ آشنائے بامزہ [اور ایک نسخے کے مطابق "آشنائے پُرمزہ"] کون تھے جن کی فرمایش پر یہ داستان سُنائی گئی تھی۔

پہلی بات کے متعلق قیاساً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ غازی الدّین حیدر کی حکومت کا ہوگا۔ اِس کا تعیّن فی الوقت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اُن کے اعلانِ[2] بادشاہت سے

---

[1] پہلے کے نسخوں، یعنی ح، م، ض، د (اور ن) میں یہ جملہ یوں ہے: "یہ فسانہ اُنھیں بہت پسند آیا"۔ اِسی طرح اگلے جملے میں "پراگندہ تقریر" کی جگہ "قصّۂ پراگندہ" ہے۔

[2] ۱۸ ذی الحجّہ ۱۲۳۴ھ۔ مطابق ۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء [نجم الغنی خاں۔ تاریخِ اودھ، جہارم، ص ۱۳۲]۔

←

پہلے کا واقعہ ہے یا اُس کے بعد کا۔ ہاں یہ مسلّم ہے کہ یہ واقعہ اُن کے سفرِ کان پور [ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ [نومبر۔ دسمبر ۱۸۲۴ء] سے پہلے کا ہے۔[۵]

اب رہی دوسری بات، سو اُس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سُرور نے بہ طورِ خود صراحت نہیں کی، اور اِس وقت تک جو معلومات سامنے آئی ہے اُس کی مدد سے بھی اُن "آشنائے بامزہ" کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ سُرور نے اُن کے لیے جو لفظ استعمال کیے ہیں، اُن سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ اُن کے عام حلقۂ احباب سے الگ، وہ کوئی خاص دوست تھے۔ اِس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اِس کتاب کی اشاعتِ اوّل [نسخۂ ح] میں وجہِ تصنیف کے حصّے کا عنوان اِس طرح قائم کیا گیا تھا:

"باعثِ تحریر اجزائے پریشان و سرگزشت مجمعِ دوستان، مکلّف ہونا محبوب کا، بیان داستان مرغوب کا" [نسخۂ ح، ص ۱۷]۔

اِس میں "مکلّف ہونا محبوب کا" توجّہ طلب نظر آتا ہے۔ پہلی بار نظرِ ثانی کردہ اشاعتِ دوم [نسخۂ ص۔ ۱۲۶۳ھ] میں بھی یہ عبارت اِسی طرح باقی رہی۔ جب دوسری بار سُرور نے اِس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور یہ نسخہ ۱۲۶۷ھ میں چھپا [نسخۂ ک] تو سُرور نے عنوان کی عبارت میں تبدیلی کی اور "محبوب" کو "صاحبِ فرمائش" سے بدل دیا۔ اِس کے بعد جب تیسری بار اِس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور یہ نسخہ ۱۲۷۶ھ میں چھپا [نسخۂ ف] تو اِس نسخے میں اشاعتِ اوّل والی عبارت کو برقرار رکھا، یعنی "مکلّف ہونا محبوب کا" برقرار رہا۔ آخری بار جب

ناسخ کے اِس مصرعے سے بھی یہی سنہ نکلتا ہے: بگو ناسخ کہ "ظلّ اللہ گردید" [ایضاً۔ نیز کلیاتِ ناسخ، طبع اوّل، ص ۴۷۹] تاریخِ اودھ میں صاحب رائے کا بھی قطعۂ تاریخ مندرج ہے، جس کے آخری مصرعے سے دن، تاریخ، مہینا اور سال معلوم ہوتا ہے: "ماہِ ذی الحجّہ شنبہ یا بیز دہم" [تاریخِ اودھ میں اِس مصرعے میں "ذی حجہ" چھپا ہوا ہے، مگر یہ واضح طور پر غلطیِ کتابت ہے۔ "ذی الحجّہ" سے صحیح سال برآمد ہوگا، اِسی لیے میں نے "ذی الحجّہ" لکھا ہے]۔ [۵] یہ مہینا اور سنہ خود سُرور نے اِسی کتاب میں سببِ تصنیف کے ذیل میں لکھا ہے [ص ۲۹]۔

نظرِ ثانی کی اور یہ نسخہ ۱۲۸۰ھ میں چھپا [نسخۂ ل] تو اِس نسخے میں ۱۲۶۷ھ والی عبارت کو واپس لے آیا گیا آخری ٹکڑے کی تبدیلی کے ساتھ، یعنی اِس میں "محبوب" کی جگہ پھر "صاحبِ فرمایش" نے لے لی۔

یہ تو تھا عنوان کی تبدیلیوں کا احوال۔ عنوان کے تحت اُن "محبوب" یا "آشنائے بامزہ" سے متعلق جو عبارت ہے، اُس میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ح، م، ض، ف میں "آشنائے باصفا پُرمزہ" ہے۔ ک میں "باصفا" موجود نہیں اور "پُرمزہ" کو "بامزہ" سے بدل دیا گیا ہے۔ زیادہ توجہ طلب وہ عبارت ہے جو اُس نسخے میں ہے جسے ڈاکٹر محمود الٰہی نے "فسانۂ عجائب کا بنیادی متن" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اُس نسخے میں اِس موقعے پر یہ عبارت ہے:

"اُس زُمرے میں ایک دوستِ باصفا، محبِّ بے ریا ایسے تھے، بندہ جن کا تابعِ فرمان بدل و جان، ممنونِ عنایات و احسان، باعثِ زیستِ جگرِ فگار، تسکینِ خاطرِ بے قرار ....." [ص ۴۴]۔

آخری دونوں ٹکڑے قابلِ غور ہیں۔ ہر دوستِ باصفا اور محبِّ بے ریا کو "باعثِ زیستِ جگرِ فگار" اور "تسکینِ خاطرِ بے قرار" نہیں کہا جاتا۔ پھر جب اشاعتِ اوّل کے عنوان میں موجود "مکلّف ہونا محبوب کا" کے ساتھ اِن ٹکڑوں کو دیکھا جائے اور "آشنائے پُرمزہ" اور پھر "آشنائے بامزہ" پر بھی نگاہ رکھی جائے ["آشنائے پُرمزہ" یا "بامزہ" بھی عام دوستوں کو نہیں کہتے] تو ذہن میں اِس خیال کا پیدا ہونا قدرتی سا ہے کہ یہ صاحب، جن کی فرمایش پر یہ قصّہ سُنایا گیا تھا، اُس جلسے میں موجود دیگر احباب کی طرح محض محبِّ باصفا اور دوستِ بے ریا نہیں تھے؛ یہ "تسکینِ خاطرِ بے قرار" تھے اور اِن کو جو سُرورؔ نے "محبوب" لکھا تھا، تو وہ محض رسمی اندازِ خطاب نہیں تھا۔ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ سُرورؔ اِس قدر بدذوق اور کم نظر تھے کہ اِن لفظوں کے معنی مفہوم سے ناواقف تھے۔ اور ہاں، اِسی ذیل میں سُرورؔ کے اُن اشعار کو بھی ذہن میں رہنا چاہیے جو اُنھوں نے داستان کے آخر میں لکھے ہیں، جب کہانی کے بچھڑے ہوئے تو سب مل جاتے ہیں، مگر سُرورؔ اپنے

"مطلوب" سے اب بھی جدا ہیں [یعنی کان پور میں ہیں] :

وہ بچھڑے تو سب ہو گئے ایک جا ‏ ‏ ہوئے اپنے مطلوب سے ہم جُدا

رہی شرحِ جورِ فلک نا تمام ‏ ‏ سرورِ حزیں! توسنِ خامہ تھام [ص ۳۲]

سرور نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "اُسی دن سے ہمیشہ اِس کا خیال رہتا تھا، عدمِ فرصت سے نہ کہتا تھا" ["نہ کہتا تھا" یہاں "نہ لکھتا تھا" کے مفہوم میں آیا ہے۔ اِس طرح کی خامیاں سرور کی عبارت میں اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں] ۔ یہاں تک کہ ماہِ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں اُن کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور کان پور جانا پڑا ۔ یہ بستی اُن کو "ویران، پوچ و لچر" نظر آئی۔ " اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں، مگر چھوٹی اُمّت کی بڑی کثرت دیکھی ۔ یہ طور جو نظر آیا، دلِ وحشت منزل سخت گھبرایا، قریب تھا جنون ہو جائے" [ص ۲۹] لیکن اُن کے ایک کرم فرما حکیم سیّد[1] اسد علی کی عنایت و شفقت سے "طبعِ سودا خیز و سر جنوں انگیز کو آرام و تسکیں حاصل ہوئی "۔

ایک دن سرور نے حکیم صاحب سے اپنے اُن "دوست" کا احوال بیان کیا جنھوں نے اِس کہانی کو لکھنے کی فرمایش کی تھی: "بعدِ اظہارِ حالِ مکلّفِ فسانۂ دوستانہ، یہ بھی کہا کہ حسبِ وعدہ ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں" [ایضاً] ۔ حکیم صاحب نے ہمّت افزائی اور تاکید کی۔ حکیم صاحب کا کہنا "توسنِ طبع کو تازیانہ ہوا، تحریر کا بہانہ ہوا" [ایضاً] اور یوں وہ سنائی ہوئی کہانی، ایک مکمّل داستانی قصّے کی شکل میں کتابی صورت میں مرتّب ہوئی۔

سرور نے یہ لکھا ہے کہ "تلاشِ معاش کے حیلے میں" اُنھیں کان پور جانا پڑا، مگر یہ بات ماننے کی نہیں ۔ اِسے کون مانے گا کہ لکھنؤ، جہاں سب کچھ تھا، وہاں کوئی کام نہ ملے۔ اور کان پور جو "کور دِہ" تھا، وہاں مرزا رجب علی بیگ سرور تلاشِ معاش میں جائیں! ہاں فسانۂ عجائب کا بنیادی متن میں اِس مقام پر "تلاشِ معاش کے حیلے" کی جگہ یہ لکھا ہے کہ "اتّفاق آنے کا بہ طرزِ نامعقول و وجہِ مجہول کور دہ کان پور میں ہوا" [ص ۴۵] ۔ یہ "وجہِ مجہول" اور "طرزِ نامعقول" بہت معنی خیز ہے ۔ نیّر مسعود صاحب نے اپنی کتاب میں

---

[1] اِن کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۲؛ ص ۴۱۸ ۔

اِس پر مفصل بحث کی ہے اور آخر میں یہ راے ظاہر کی ہے کہ غالباً کسی جرم کے سلسلے میں شاہی عتاب کی بنا پر انھیں گنگا پار یعنی کان پور جانا پڑا تھا۔ "اُس زمانے میں کان پور، کالے پانی کی حیثیت رکھتا تھا، اور اکثر شاہی معتوبین اور مجرموں کو جلاوطنی کی سزا دے کر دریاے گنگا کے پار اُتار دیا جاتا تھا" [ص ۸۶] اور یہی بات مرجّح معلوم ہوتی ہے [یہ دل چسپ بات ہے (اور شاید معنی خیز بھی) کہ سرور کے اُستاد نوازش کو بھی اُن دنوں ایسے ہی مشکوک حالات میں کان پور میں رہنا پڑا تھا۔ اِس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی]۔

کتاب کے آخر میں خود سرور کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں یہ کتاب مکمل ہوگئی تھی۔ ۱۲۴۰ھ مشتمل ہے دو عیسوی سنین ۲۵-۱۸۲۴ پر۔ اگر اِس پر نظر رکھی جائے کہ سرور اپنے قول کے مطابق ۱۲۴۰ھ میں ربیع الثانی کے مہینے میں کان پور پہنچے تھے، جو نومبر۔ دسمبر ۱۸۲۴ء کے مطابق ہے [انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی شائع کی ہوئی تقویم کے مطابق یکم ربیع الثانی (۱۲۴۰ھ) کو نومبر (۱۸۲۴ء) کی ۲۳ تاریخ تھی] تو پھر بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ تکمیلِ کتاب کا عیسوی سال ۱۸۲۵ء ہوگا۔ کان پور پہنچتے ہی تو وہ لکھنے میں لگ نہیں گئے تھے۔ خود اُن کا بیان موجود ہے؛ جس سے دنوں کا قطعی طور پر تعین تو نہیں ہوتا، لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کان پور پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی حکیم صاحب سے لکھنے کا ذکر آیا تھا اور حکیم صاحب نے تاکید کی تھی۔ پھر اِس کے لکھنے میں بھی کم سے کم دو ڈھائی مہینے تو لگے ہی ہوں گے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں ربیع الثانی کے بعد، اور ۱۸۲۵ء میں وسطِ اگست سے پہلے کسی وقت یہ کتاب مکمل ہوئی ہوگی [اگست کے وسط سے ۱۲۴۱ھ شروع ہوجاتا ہے]۔

نوازش اور اصلاح

سرور نے یہ بھی لکھا ہے کہ تکمیل کے بعد اِس کتاب کو [سعادت مند شاگرد کی طرح] اپنے اُستاد نوازش کے سامنے بہ غرضِ اصلاح پیش کیا [ص ۲۴۴]۔ نوازش نے کیا اصلاح دی، اِس کا حال تو معلوم نہیں؛ ہاں اُن کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ شاملِ کتاب ہے۔

نوازش شاعر تھے، یوں بہ ظاہر خیال کیا جاسکتا ہے کہ محض اُستاد کا احترام مدِ نظر ہوگا جو سرور نے اِس نثری تصنیف کو بھی اُن کے سامنے پیش کیا؛ لیکن اِس سلسلے میں ایک بات ضرور قابلِ توجہ ہے۔ نوازش کے بہت زیادہ اشعار اِس داستان میں شامل کیے گئے ہیں اور کئی مقامات پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوازش نے خاص کر اُس موقعے کی مناسبت سے وہ شعر کہا ہے یا وہ اشعار لکھے ہیں۔ مثلاً جب جانِ عالم، ملکہ مہرنگار سے رخصت ہوکر عازمِ سفر ہوتا ہے؛ اُس جگہ پانچ اشعار کی ایک غزل ملتی ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں :

آغاز ہی دیکھا نہ کچھ انجام سفر کا | میں مرگئی سُن اُس کے سرانجام سفر کا
کرتی چلوں گی ساتھ ترے کام سفر کا | مت جان نکما مجھے اے جان، لیے چل [ص ۹۹]

اِن میں صیغۂ تانیث جس طرح لایا گیا ہے، اُس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل خاص کر اِسی مقام کے لیے کہی گئی تھی۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں نوازش کے دیوان کا خطی نسخہ موجود ہے [یہ دیوان اب تک چھپا نہیں] اور اُس میں یہ غزل موجود نہیں۔ یہی نہیں، اِس کتاب میں ایسے بہت سے شعر ہیں جو اُس دیوان میں نہیں ملتے۔ یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ سب یا کم از کم اکثر اشعار اِسی کتاب کے لیے کہے گئے تھے۔ اِسی طرح اِس کتاب میں ایسے اشعار بھی ہیں، جو اُس نسخۂ دیوان میں موجود ہیں، لیکن متن بدلا ہوا ہے۔ ایسے سب اشعار جب میں نے یک جا کیے اور متن کے اختلاف کا گوشوارہ تیار کیا، تو میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ اِس کتاب کے مختلف مقامات کی نسبت اور ضرورت سے اشعار کے متن میں تبدیلی کی گئی ہے۔ میں یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ آغازِ داستان میں نوازش کا یہ شعر مرقوم ہے :

ہر اک فقرہ کہانی کا، گواہِ بے مثالی ہے | مثل ہی سے نہ الفاظِ تلازم سے یہ خالی ہے

لیکن دیوان میں یہ اِس طرح ملتا ہے :

مرا ہر شعر بے مثل، اِن زمانے میں مثالی ہے | مثل ہی سے نہ الفاظِ تلازم سے یہ خالی ہے

[ورق ۱۹۵ ب]

صاف ظاہر ہے کہ دوسرے مصرعے کو اِس کتاب کی نسبت سے بدلا گیا ہے۔ [انتسابِ اشعار

کا جو ضمیمہ اِس کتاب میں شامل ہے، اُس میں متن کے ایسے اختلافات کو دیکھا جا سکتا ہے]۔ میں صرف ایک مثال اور پیش کروں گا۔ دیوان میں ایک شعر یوں مرقوم ہے:

وعدۂ قتل ہے کل، رات کی نیّت ہو حرام   دیں اگر طالعِ برگشتہ نہ تدبیر اُلٹ

اِس کتاب میں پہلا مصرع اِس طرح ملتا ہے: مژدۂ وصل ہے کل، رات کی نیّت ہو حرام [ص ۵۱]۔ یہ وہ مقام ہے جہاں توتے کے کہنے کے مطابق کل صبح جانِ عالم تلاشِ محبوب میں روانہ ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں "وعدۂ قتل" کا کوئی محل نہیں تھا؛ ہاں "مژدۂ وصل" کا محل ہے اور اِسی نسبت سے شعر میں تبدیلی کی گئی ہے۔ اشعار کے متن میں ایسی تبدیلیاں ظاہر ہے کہ خود نوازش نے کی ہوں گی، شاگرد اِس کی جرات نہیں کر سکتا، خاص کر اُس وقت جب کہ اُستادِ محترم وہیں موجود تھے۔ اِس سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال بیٹھ سا گیا ہے کہ اِس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں سُرور اپنے اُستاد نوازش سے برابر مشورہ کرتے رہے ہیں۔ یا اِسی بات کو یوں کہہ لیجیے کہ نوازش مشورہ دیتے رہے ہیں۔ اور اِسی دوران مختلف موقعوں کی نسبت سے نئے اشعار کہہ کر، یا پُرانے اشعار میں مناسبِ موقع تبدیلی کر کے اُنھیں شاملِ داستان کراتے گئے ہیں۔

میں کوئی شہادت تو پیش نہیں کر سکتا، لیکن سارے قرائن دلالت اِسی پر کرتے ہیں کہ اِس داستان کی نقش بندی میں نوازش کے مشورے شامل رہے ہیں۔ اشعار کے اضافوں کے علاوہ نثر میں بھی اُنھوں نے مشورے دیے تھے، یا یوں کہیے کہ اصلاح کی تھی؛ اِس کے متعلق کوئی شہادت تو موجود نہیں، لیکن مجھے ایسی اصلاحوں کا شامل ہونا بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے مقدّمے میں جو یہ لکھا ہے:

> "یہاں اِس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ فسانۂ عجائب کے متداول نسخوں کے آخر میں سرور کے اُستاد نوازش کا ذکر ملتا ہے، جس میں یہ اقرار کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے اِس کتاب کو بہ نظرِ اصلاح دیکھا تھا؛ خطّی نسخے میں یہ بیان نہیں ہے۔ اِس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ فسانۂ عجائب میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، اُن میں نوازش

کے اصلاحی مشوروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔" [ص ۱۴]
تو یہ بات دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ "بڑا ہاتھ" نہ سہی، کچھ نہ کچھ دخل تو ضرور ہوگا۔
یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ اِس کتاب میں نوازشؔ کے جتنے زیادہ اشعار ملتے ہیں، سرورؔ کی کسی اور کتاب میں یہ صورت دکھائی نہیں دیتی۔ وجہ اِس کی صاف ہے کہ جس وقت یہ کتاب لکھی گئی ہے، اُس وقت نوازشؔ اور سرورؔ دونوں کان پور میں تھے؛ سرورؔ کو اُس وقت تک بہ حیثیتِ مصنف شہرت حاصل نہیں تھی [اُس وقت تک اُنھوں نے کوئی کتاب ہی نہیں لکھی تھی] نوازشؔ شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور تھے؛ اِس کے علاوہ دنیاوی حیثیت سے بھی قابلِ ذکر حیثیت رکھتے تھے؛ سرورؔ کی طرح تنگ دست نہیں تھے اور

لہ "خدیوِ ملکِ سخن رانی نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی، شخصِ باتجمّل، خلف الصّدق حسین علی خاں ابنِ نوّاب ناصر خاں صوبہ دارِ کابل" [تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ] اِس تذکرے کا مولف اُن سے اچھی طرح واقف تھا۔ جس وقت سرورؔ کان پور میں تھے، نوازشؔ بھی اُس زمانے میں وہیں تھے۔ اُن کے قیام کان پور کے متعلق خوش معرکۂ زیبا کے مولف نے یہ لکھا ہے کہ "چند روز سے بہ غرض خرید دیہات نیلام کے کان پور میں تشریف رکھتے ہیں۔ گاہے گاہے لکھنؤ بھی آجاتے ہیں"۔ حاشیے میں اِس تذکرے کے ایک اور نسخے سے آخری جملہ اِس طرح نقل کیا گیا ہے: "لکھنؤ میں آمد و رفت بہت کم"۔ نیّر مسعود صاحب نے بھی اپنی کتاب میں یہی بات لکھی ہے [ص ۸۹]۔ پٹنے میں نوازشؔ کے دیوان کا جو خطی نسخہ محفوظ ہے، اُس میں یہ شعر بھی ہے:

یاں بھی اک بُت سے بڑھایا (کذا) دل نے لیے سیرِ خدا!
لکھنؤ سے تھا ہوا حکم اِس پہ گنگا پار کا

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل سرورؔ کی طرح نوازشؔ کو بھی کسی "جرم" میں لکھنؤ بدر کر دیا گیا تھا۔ یہ شعر بھی اِسی سلسلے کا ہے:

شکلِ وطن نہ دیکھی نوازشؔ جواب تلک
کس وقت نحس میں نے کیا تھا وہاں سے کوچ

یعنی وہ کان پور میں اُس جرم کی بنا پر رہنے پر مجبور تھے۔ دیوان میں موجود یہ دو شعر بھی توجّہ طلب ہیں:

ہو مستعدِ قتل نہ کوئی حق و ناحق ۔۔۔ یاں رہیو خبردار، یہ منصور نگر ہے

سُرور کے اُستاد تو تھے ہی! اِن سب وجوہ سے سُرور کی نیازمندی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔
اِس تفصیل سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں سُرور کے ذہن میں کتاب لکھنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ دوستوں کی محفل میں، محض وقت گزاری کے لیے، ایک دوست کی فرمایش پر اُنھوں نے ایک قصہ سنایا تھا۔ اُسے بہت پسند کیا گیا اور اُسے لکھنے کی فرمایش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اُس بیان میں اُس وقت نہ حاکمِ وقت کا ذکر ہوگا اور نہ میر امن کا اور

←

وہ محلّہ تو مرا دارِ شفا تھا الحق　　　یار کا پھرتا ہے منصور نگر آنکھوں میں

[فسانۂ عجائب میں سُرور نے بھی ایک جگہ لفظی رعایت کے ساتھ منصور نگر کا نام لیا ہے: "کلمۂ حق کہنے والے کا مدار دار پر ہوتا ہے، منصور نگر اُس کا محلّہ ہے" (ص ۱۹)]۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سُرور پر قتل کا ایک مقدمہ بھی چلا تھا، جس میں سزا یا نا یقینی سا تھا، مگر بہ قولِ خود وہ بچ گئے تھے [تفصیل نیّر مسعود کی کتاب میں، ص ۸۴-۸۵]۔ اِن سب باتوں کو نظر میں رکھا جائے تو اِس خیال کا پیدا ہونا قدرتی سا ہے کہ اُستاد شاگرد دونوں ایک ہی یا ایک ہی طرح کے جرم میں ملوث تھے، اور دونوں کو اِسی بنا پر کان پور جانا پڑا تھا، یعنی لکھنؤ بدر ہونا پڑا تھا اور یوں زمانۂ قیام کان پور میں سُرور کا اپنے اُستاد کے کچھ زیادہ زیرِ اثر رہنا معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔

مؤلفِ خوش معرکۂ زیبا نے نوازش کے تذکرے میں یہ بھی لکھا ہے: "ایک دن مؤلف سے کہنے لگے کہ ایک خدمت گار کہ ذرا صورت دار ہو، نوکر رکھوا دو"۔ اُن کے دیوان میں موجود اِس شعر کو بھی دیکھیے:

واں بھی ہیں غلمان ہم امرد پرستوں کے لیے
واسطے گر شیخ کے خلدِ بریں میں حور ہے　　　[ورق ۲۱۰ ب]

لکھنؤ میں اُس زمانے میں امرد پرستی کی وبا کچھ کم نہیں تھی۔ ناسخ کا نام تو خاص طور پر اِس سلسلے میں آیا ہے۔ سُرور نے وجہِ تصنیف کے ذیل میں جو "ممکن ہونا محبوب کا" لکھا ہے اور پھر اُسے "آشنائے پُرمزہ" اور "آشنائے بامزہ" سے تعبیر کیا ہے؛ اِن سب باتوں کی بنا پر بہ قولِ محمد حسین آزاد بدگمانی گنہ گار ضرور کرتی ہے۔ ہاں قطعی طور پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

اُن کی دہلی کا یعنی "بیانِ لکھنؤ" نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ انھیں [بہ خیالِ غالب] شاہی عتاب کی بنا پر لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور گنگا پار، یعنی کان پور جانا پڑا [جو انگریزی عمل داری میں تھا] اور وہیں رہنا پڑا۔ سرور کے لیے یہ "کالے پانی کی سزا" بہت تکلیف دہ تھی اور اذیت رساں۔ وہاں اُن کو اُس فرمائش کو پورا کرنے کا خیال آیا اور اُس کے نتیجے میں اُنھوں نے کان پور میں چند مہینوں کے اندر اُس کہانی کو کتابی صورت میں مکمل کرلیا۔ یہ ۱۲۴۰ھ کی بات ہے، جب لکھنؤ میں غازی الدین حیدر بادشاہِ اودھ تھے، جن کے حکم پر [قرائن کے مطابق] اُنھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔

سرور کو لکھنؤ واپس آنے کی شدید تر تمنا ہوگی، لیکن اجازت کے بغیر وہ واپس نہیں آسکتے تھے؛ اِس لیے یہ قطعی طور پر قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ وہ اِس کتاب کو وسیلہ بنا کر لکھنؤ واپس آنے کی سبیل نکالیں۔ اِس کے لیے یہ ضروری تھا کہ شاہِ وقت کی مدح و ستایش کی جائے۔ لیکن شاہِ وقت کی مدح تو بہت سی کتابوں میں کی ہی جاتی تھی؛ اِس لیے اِس کا قوی امکان ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ اِس کتاب میں کوئی ایسا بیان بھی ہو جو شاہِ اودھ کو خاص طور پر متوجہ کرسکے اور خوش کرسکے۔ اِس سلسلے میں غازی الدین حیدر کا اعلانِ بادشاہت گویا سامنے کی بات تھی: نئی حکومت کو دہلی کی پُرانی بادشاہت پر ترجیح دینا اور لکھنؤ کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی، یہاں کی عمارتوں کی اور یہاں کے اہلِ کمال کی اِس طرح تعریف کرنا کہ یہ بات سامنے آجائے کہ لکھنؤ کی سرزمین اب ہر لحاظ سے دہلی پر فوقیت رکھتی ہے؛ یہ ایک ایسی خاص بات ہو سکتی تھی جو جذبۂ پسندیدگی کو اُبھار دے۔ اِس خیال کے زیرِ اثر اُنھوں نے اِس کتاب کی جو روایت تیار کی ہو، اُس میں "بیانِ لکھنؤ" نے کسی شکل میں جگہ پائی ہو۔

اِس سلسلے میں دو باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق فی الوقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک بات تو یہ کہ کیا یہ بات اُن کے ذہن میں شروع ہی میں آگئی تھی کہ ایک کتاب لکھ کر اُسے "وسیلۂ نجات" بنایا جاسکتا ہے اور پھر اُسے ایفائے وعدہ کا عنوان دیا گیا۔ یا پھر یوں ہوا تھا کہ دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لیے اُنھیں کچھ کرنا ہی تھا؛ ایسے میں ایفائے وعدہ

کا خیال شدّت سے پیدا ہوا اور انھوں نے اُس کہانی کو کتابی صورت میں لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کے دوران یا تکمیل کے بعد اچانک یہ خیال اُن کے ذہن میں آیا کہ اِس کتاب سے تو ایک اور کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ غرض جو بھی صورت ہوئی ہو، خیال یہی ہے کہ اِس کتاب کو وسیلۂ واپسیِ لکھنؤ بنانے کا خیال کسی وقت اُن کے ذہن میں آیا ہوگا اور اُسی کے تحت مبالغہ آمیز انداز سے مدحِ شاہِ وقت اور "بیانِ لکھنؤ" [کا کچھ حصّہ] لکھا گیا ہوگا۔

سُرورؔ نے اپنی کتاب کسی وسیلے سے غازی الدّین حیدر کی خدمت میں پیش کی تھی یا نہیں، اِس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہاں قیاس یہ کہتا ہے کہ پیش کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ اِس کی شہادت بہ ہر حال موجود ہے کہ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں جب غازی الدّین حیدر مَرے تھے اور اُن کے بیٹے نصیر الدّین حیدر تختِ نشیں ہوئے تھے، تو اُس وقت وہ کان پور ہی میں تھے اور اُس وقت تک اُن کو لکھنؤ آنے کی مسرّت حاصل نہیں ہو سکی تھی [یعنی اجازت نہیں ملی تھی]۔ اِس کی سب سے بڑی شہادت وہ غزل ہے جو اُنھوں نے [بادشاہ بننے کے بعد] نصیر الدّین حیدر کی مدح کے ذیل میں شاملِ "بیانِ لکھنؤ" کی ہے اور جس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس وقت لکھنؤ میں نہیں تھے، دیارِ غربت [یعنی کان پور] میں تھے۔ اِس غزل کے تین شعر یہ ہیں:

رشک کھا کھا کو فلک مجھ سے چھُڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں، دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

یا تو ہم پھرتے تھے اُن میں، یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

دشتِ غربت میں کیا برباد وحشت نے، تو کیا
دل سے اُڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ

[ص ۲۲]

اِس غزل کے بعد چند دعائیہ فقرے ہیں اور اُن کے بعد یہ شعر ہے:

الٰہی! لکھنؤ بستا رہے دورِ قیامت تک
سُرورِ دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا [ص ۲۲]

ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ [۱۸۲۷ء] میں "نصیر الدّین حیدر نے بعد پدر... جلوسِ میمنت مانوس

لہ فسانۂ عبرت، مرتّبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، ص ۹۔

سرِ یرِ سلطنت پر کیا۔" "بیانِ لکھنؤ" میں اُن کی مدح بھی شامل ہے اور غازی الدین حیدر کی مدح کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ متنِ کتاب میں بھی اُن کا نام ضمناً داخل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سُرور نے خاتمۂ کتاب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہو گئی تھی؛ اِس صورت میں نصیر الدین حیدر کی مدح بہ ظاہر شاملِ کتاب نہیں ہو سکتی؛ لیکن یہاں بھی وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ سُرور نے ایک بار پھر اِس کتاب کو وسیلۂ واپسیِ لکھنؤ بنانا چاہا ہوگا۔ اِس کے لیے لازم تھا کہ نئے بادشاہ کی مدح کتاب میں شامل ہو۔ اِس کے لیے اُنھوں نے یہ کیا کہ "بیانِ لکھنؤ" میں عبارت کا اِس طرح جوڑ لگایا: "اچھے آغاز کا انجام بہ خیر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مشقّت کسی کی بے کار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ شروع زمانۂ غازی الدین حیدر بادشاہ میں ہوا تھا اور تمام عصرِ سلطان بن سلطان ابو النّصر نصیر الدین حیدر دام ملکہ کے ہوا" [ص ۱۹]۔ یہ جوڑ اِس بُری طرح لگایا گیا ہے کہ دور ہی سے اکھڑا ہوا نظر آتا ہے، اچھی طرح شاملِ عبارت نہیں ہو پایا ہے۔

اِس نئی اضافہ کردہ عبارت میں سُرور نے اپنے پچھلے بیان کو [کہ یہ فسانہ ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہوا تھا] بدل دیا، اور اب یہ کہا کہ یہ فسانہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوا تھا، ختم اب اِس نئے بادشاہ کے زمانے میں ہوا ہے۔ نئے بادشاہ کے لیے "دام ملکہ" لکھا، مگر مرحوم بادشاہ کے لیے جو "خلّد اللہ ملکہ" لکھا تھا، اُسے بھی باقی رہنے دیا۔ خیر، اِس کی تو کسی طرح تاویل کی جا سکتی ہے؛ لیکن اُنھوں نے غضب یہ کیا کہ آخرِ کتاب میں شامل پُرانے قطعاتِ تاریخِ تکمیلِ تصنیف کو بھی باقی رہنے دیا۔ اُن کا کوئی حریف تو اِس کے لیے یہی کہتا کہ دروغ گورا حافظہ نباشد؛ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ محض فروگذاشت ہے۔

نیر مسعود نے اپنی کتاب میں سُرور کی ایک عرضداشت کا ذکر کیا ہے جو ایک "جواں بخت و جواں دولت، جواں سال" بادشاہ کے نام ہے، جس کی خدمت میں فسانۂ عجائب کا ایک نسخہ پیش کیا تھا۔ سُرور نے "اپنی پریشانی و بے سروسامانی کا ذکر کر کے، ملازمت کی درخواست کی ہے" اور قرینۂ قوی کی بنیاد پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ بادشاہ نصیر الدین حیدر تھے، جو

ﻠﻪ "کنٹروں میں عطرِ سہاگ، نہک پری ایجادِ نصیر الدین حیدری" [ص ۳۱۷]۔

نوجوانی کے عالم میں تخت نشیں ہوئے تھے" [ص ۸۹] - اِس کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا۔ اِس کی دستاویزی شہادت تو موجود نہیں کہ اُن کو لکھنؤ آنے کی اجازت مل گئی تھی، لیکن یہاں بھی سارے قرائن اِسی پر دلالت کرتے ہیں کہ اُن کو واپس آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ فسانۂ عبرت میں سُرور نے نصیر الدّین حیدر کے حالات کے تحت جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے، وہ سراسر تعریفی ہے [جب کہ بعض دوسرے بادشاہوں کے لیے سخت ترین کلمات استعمال کیے ہیں] - اِسی طرح نصیر الدّین حیدر کے مرنے کے بعد کے بعض حالات جہاں لکھے ہیں، وہاں واضح طور پر لکھنؤ میں اُن کی موجودگی معلوم ہوتی ہے [فسانۂ عبرت، ص۲۱]۔ اِسی طرح جہاں امجد علی شاہ کے جنازے کا حال لکھا ہے، وہاں بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدّین حیدر کے مرنے کے وقت وہ لکھنؤ میں موجود تھے [ایضاً، ص ۷۶]۔ اِس طرح ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب نصیر الدّین حیدر کی خدمت میں پیش کی گئی تھی [لیکن فی الوقت اِس کا تعیّن ممکن نظر نہیں آتا کہ کس سنہ میں اِسے پیش کیا گیا تھا— یہ قیاس شاید بے جا نہ ہو کہ یہ شروعِ حکومت کا زمانہ ہوگا] اور [بہ خیالِ غالب] اِسی کے نتیجے میں اُن کو لکھنؤ واپس آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ البتّہ یہ معلوم نہیں کہ "ملازمت کی درخواست" جو اُنھوں نے کی تھی، اُس کا کیا ہوا۔ نصیر الدّین حیدر کے زمانۂ حکومت [تخت نشینی: " ربیع الاولیٰ ۱۲۴۳ھ/ اکتوبر ۱۸۲۷ء"۔ انتقال: " ربیع الآخری ۱۲۵۳ھ/ جولائی ۱۸۳۷ء" - ایضاً ص ۹ - ص ۱۷] میں سُرور کیا کرتے رہے تھے، اِس کا احوال معلوم نہیں۔

"بیانِ لکھنؤ" کے اختلافات

اِس بات کو ماننے میں ذرا سی بھی قباحت نظر نہیں آتی کہ مصنّفین کی عام روش کے مطابق اِس کتاب کا دیباچہ، کتاب کی تکمیل کے بعد لکھا گیا [بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ دیباچے کا مطالعہ اِس خیال کی پوری طرح تائید کرتا ہے] خاص کر دیباچے کا یہ آخری جملہ: "عنایتِ ایزدی سے تمام ہوئی کتاب" قطعی طور پر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ دیباچہ، کتاب کی تکمیل کے بعد لکھا گیا ہے۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ دیباچے کے بعض حصّے مختلف زمانوں میں لکھے گئے ہیں

اور عبارت میں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ ان سب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
وہ تبدیلیاں جو اشاعتِ اوّل [۱۲۵۹ھ - ۱۸۴۳ء] کے بعد اور نظرِ ثانی کردہ اشاعتِ آخر [۱۲۸۰ھ - ۱۸۶۴ء] کے درمیانی زمانے میں کی گئیں۔ اِن میں لفظی تبدیلیاں بھی ہیں اور عبارتوں کی کمی بیشی بھی ہے۔ محض بہ طورِ مثال ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

① ص ۸، س ۱: "بہ راچیوں کی گلی کی کھجور..... ہم خرما ہم ثواب" یہ پورا ٹکڑا اشاعتِ اوّل [۱۲۵۹ھ] میں موجود نہیں، البتہ نسخۂ ض [۱۲۶۳ھ] میں ہے۔ یعنی پہلی بار نظرِ ثانی کے وقت اِسے بڑھایا گیا ہے۔ ② ص ۸، س ۳: "نورا کی دکان کی بالائی....."۔ اشاعتِ اوّل میں نورا کا نام موجود نہیں۔ اُس میں جملہ یوں ہے: "بالائی جس دکان پر نظر آئی"۔ ض میں نورا کا نام موجود ہے۔ یعنی یہ بھی اُسی زمانے کا اضافہ ہے۔ ③ ص ۱۶، س ۵: "چناں چہ میاں محمد اشرف..... امیر نہ ہوں گے جیسے تھے" یہ پیراگراف نسخۂ ل [۱۲۸۰ھ] کے سوا کسی نسخے میں نہیں ملتا۔ یعنی اِسے نسخۂ ف کے سالِ اشاعت ۱۲۷۶ھ کے بعد کسی وقت بڑھایا گیا ہے۔ ص ۱۶، س ۳: "پانچ اشرفی دھنیا کہاری نے دے کر جوتا سجوایا" [ببر علی کفش ساز کی ہنر مندی کا بیان ہو رہا ہے] یہ جملہ پہلی بار نسخۂ ک [۱۲۶۷ھ] میں ملتا ہے، اُس سے پہلے کے نسخوں میں موجود نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اضافہ نسخۂ ض [۱۲۶۳ھ] کے بعد کا ہے۔ [ک میں "آدنا کہاری دھنیا نے" ہے۔ ل میں "ادنا" موجود نہیں، "دھنیا کہاری نے" ہے]۔ ص ۸، س ۸: "آغا باقر کے امام باڑے سے متصل جو تنبا کو کی دکان ہے..... خاص و عام ہے" یہ عبارت ل کے سوا کسی نسخے میں موجود نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِسے نسخۂ ف کی اشاعت [۱۲۷۶ھ] کے بعد بڑھایا گیا ہے۔ ص ۸، س ۱۶: "گومتی میں غوطہ لگایا، دیہاتی پن کے دھبے دھو گئے، آدمی ہو گئے" یہ عبارت ح اور ض میں موجود نہیں، اِس کا مطلب یہی ہے کہ ۱۲۶۳ھ کے بعد کسی وقت اِس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ [یہ عبارت ک اور ل میں ہے اختلافِ الفاظ کے ساتھ]۔ ④ ص ۲۳، س ۱۶: "فقیر حسب الطلب مہاراج ایسری پرشاد..... عدل گستر پایا" یہ عبارت نسخۂ ف [۱۲۷۶ھ] میں ہے۔ ح، م، ک میں

موجود نہیں، یعنی اسے ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کے بعد بڑھایا گیا ہے جب وہ بنارس گئے تھے۔ [ضمیمۂ اختلافِ نسخ میں دیباچے کے ایسے اختلافات کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے]۔

ایسی سب تبدیلیوں کا زمانہ کسی نہ کسی حد تک بہ آسانی متعین کیا جاسکتا ہے۔ اختلافِ نسخ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ سب چھوٹی بڑی تبدیلیاں بجائے خود اہمیت رکھتی ہیں، لیکن معنوی طور پر ایسی بیش تر تبدیلیاں معمولی ہیں اور ایسی اہمیت نہیں رکھتیں کہ کسی بحث کا نقطۂ آغاز بن سکیں۔

دوسری تبدیلیاں وہ ہیں جو روایتِ اوّل [۱۲۴۰ھ] کے بعد اور اشاعتِ اوّل [۱۲۵۹ھ] سے پہلے کی گئیں۔ اہم تبدیلیاں دراصل یہی ہیں۔ زمانی ترتیب کے ساتھ یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ دیباچے کا کون سا حصّہ کب لکھا گیا، قطعی طور پر یہ طے کرنا بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ روایتِ اوّل میں دیباچہ کن اجزا پر مشتمل تھا؛ لیکن بعض حصّوں کے زمانے کا تعیّن ضرور کیا جاسکتا ہے۔ ایسے تعیّنات کو چند مقامات پر خود سُرور کی غیر ماہرانہ پیوندکاری نے بھی آسان بنا دیا ہے؛ یعنی ایک نیا بیان اِس طرح شروع ہو جاتا ہے کہ پچھلی عبارت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نئی عبارت کا جوڑ لگایا گیا ہے، مگر وہ عبارت میں اچھی طرح پیوست نہیں ہو پایا ہے۔ اِس کی سب سے اچھی مثال وہاں ملتی ہے جہاں نصیر الدّین حیدر کی مدح شامل کی گئی ہے [ص ۱۹] کہ وہ اچانک اِس طرح شروع ہو گئی ہے کہ پچھلی عبارت سے مکمّل ربط پیدا نہیں ہو پایا ہے۔ ایک دوسری مثال بھی اِسی بیان کے ساتھ وابستہ ہے — جہاں یہ مدحیہ بیان ختم ہوتا ہے، وہاں اچانک ایک نیا بیان اِس جملے سے شروع ہو جاتا ہے: "اور مقلّد یہاں کے، موجد سے بہتر ہوتے ہیں" [ص ۲۲]۔ یہ بیان یہاں قطعی طور پر بے جوڑ نظر آتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ پُرانی عبارت کے درمیان ایک نئے بیان کو داخل کیا گیا ہے، مگر وہ عبارت کا جز نہیں بن سکا ہے، الگ معلوم ہوتا ہے — اِس کو یوں بھی دیکھیے کہ عہدِ غازی الدّین حیدر میں لکھی گئی عبارت میں [جو ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ میں ختم ہوتا ہے] عہدِ حکومتِ نصیر الدّین حیدر [۱۲۴۳ھ سے

ربیع الثّانی ۱۲۵۳ھ تک] میں اضافہ کی گئی طویل عبارت کا جوڑ لگایا ہے اور پھر اِس عبارت کو اُس عبارت سے ملا دیا گیا ہے جو اِس کتاب کی اشاعتِ اوّل [۱۲۵۹ھ] کے وقت، مطبعِ میر حسن کی تعریف میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں جب مولوی محمد یعقوب انصاری نے اِسے ۱۲۸۰ھ میں [سُرور کی نظرِ ثانی کے بعد] چھاپا تو اِس عبارت کا ایک حصّہ نکال دیا اور اُس کی جگہ نیا جز شامل کیا جس میں یعقوب انصاری کا نام تھا، یہ تبدیلی اور ترمیم ۱۲۷۸ھ یا ۱۲۷۹ھ میں عمل میں آئی ہوگی۔ طویل زمانی فصل تو ہے ہی، اِن مذکورہ مقامات پر نئی عبارت کا آغاز اِس طرح ہوا ہے کہ وہ پچھلی عبارت سے الگ نظر آتی ہے۔

مطبعے کا یہ بیان جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ص ۲۵ کے وسط تک جاری رہتا ہے۔ اُس کے بعد ایک نیا پیراگراف اِن لفظوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے: "بندہ کم ترینِ تلامذہ...." اِس میں سُرور نے اپنے اُستاد نوازش کی تعریف کی ہے اور اِس کے فوراً بعد "وجہِ تالیف" کا عنوان آتا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ مطبعے کی تعریف کا بیان اُسی وقت لکھا گیا ہوگا جب اُس مطبعے میں اِس کتاب کے چھپنے کا فیصلہ کیا گیا ہوگا۔ یہ تحریر ہر صورت میں ۱۲۵۹ھ کے اختتام سے پہلے کی ہے۔ وجہِ تالیف اُس وقت لکھی ہوگی جب داستان کی تکمیل کے بعد اُس کا دیباچہ لکھا جا رہا ہوگا۔ یہ بات ہوئی ۱۲۴۰ھ کے اختتام سے پہلے کی، اور نوازش کی شاگردی اور اِس کتاب پر اُن کی اصلاح کا ذکر بھی اِسی سلسلے کی چیز ہے، اِسے بھی بہ خیالِ غالب اُسی وقت لکھا ہوگا۔ اِن سنین کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عبارتوں کے اضافے میں زمانی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اور اِس طرح بھی متعدد مقامات پر عبارتوں کے ایسے اضافے اُکھڑے اُکھڑے سے لگتے ہیں۔

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ اِس کتاب کا دیباچہ [جس کا بڑا حصّہ "بیانِ لکھنؤ" پر مشتمل ہے] اُس طرح کا مربوط اور مسلسل دیباچہ نہیں جیسے عموماً مصنّفین اپنی کتابوں پر لکھا کرتے ہیں۔ اِس کے مختلف حصّے مختلف زمانوں میں لکھے گئے ہیں [اور ایسے ہر اضافے کی الگ ایک وجہ ہے]۔ عبارت میں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور یہ کام بھی مختلف اوقات میں ہوا ہے۔ اِن میں سے کچھ اضافوں اور تبدیلیوں کا زمانہ متعیّن کیا جا سکتا ہے۔

قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلی بار [۱۲۴۰ھ میں] یہ دیباچہ لکھا گیا تھا، تو یہ کن اجزا پر مشتمل تھا اور پھر جب ۱۲۵۹ھ میں یہ کتاب پہلی بار چھپی ہے تو اس درمیانی مدت میں اس میں کیا کیا اضافے کیے گئے اور تبدیلیاں کی گئیں۔ ہاں ایسے کچھ اجزا کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

یہ بات کہ دیباچہ کتاب کے ساتھ ہی لکھا گیا تھا، یہ شک سے بری ہے، اس کے کئی شواہد موجود ہیں۔ سب سے بڑی شہادت ہے ص ۱۰ کی وہ عبارت جو اس جملے سے شروع ہوتی ہے: "دشتِ غربت میں یہ جلسہ جو یاد آتا ہے...." [ص ۱۰] اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصّہ کان پور کے زمانۂ قیام میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح اسی عبارت کے تسلسل میں کان پور کی برسات کا ذکر، جو اس شعر پر ختم ہوتا ہے: دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں.... [ص ۱۱]۔ پہلے صفحے سے ص ۱۶ کی شروع کی تین سطروں تک کی عبارت بہ ظاہر مسلسل معلوم ہوتی ہے [لفظوں اور جملوں کی تبدیلیوں اور اضافوں سے قطعِ نظر] اسی صفحے کی پانچویں سطر میں "چناں چہ میاں محمّد اشرف نواب معتمد الدولہ بہادر کے زمانے میں باورچی خانے کے داروغہ تھے" سے جو عبارت شروع ہوتی ہے اور جو اسی صفحے کی چودھویں سطر پر ختم ہوتی ہے، یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اس کے بعد "اور تو اور، شُہدا پیر بخارا کا" سے جو عبارت شروع ہوئی ہے، وہ پچھلی عبارت "چالیس سال جہان کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے" سے مربوط معلوم ہوتی ہے اور ص ۱۷ پر جو شعر ہے "کارِ دُنیا کسے تمام نکرد......" وہاں تک بہ ظاہر مسلسل نظر آتی ہے۔ محض قیاساً میں کہتا ہوں کہ شروعِ دیباچہ سے یہاں تک [یعنی ص ۱۷ تک] کی عبارت [ص ۱۰ کے ایک دس سطری اضافے سے قطعِ نظر] شروع ہی میں لکھی گئی ہوگی۔ ص ۱۷ پر سطر ۱۳ سے جو عبارت شروع ہوتی ہے اور ص ۱۹ کی گیارھویں سطر تک چلی گئی ہے، یہ کئی ٹکڑوں پر مشتمل ہے اور یہ سب ٹکڑے بعد کا اضافہ معلوم ہوتے ہیں، اس قوی امکان کے ساتھ کہ مختلف ٹکڑے مختلف اوقات میں لکھے گئے ہوں گے۔ ص ۱۹ کی بارھویں سطر سے نصیر الدّین حیدر کی مدح کا بیان شروع ہوا ہے اور یہ لازماً بعد کا اضافہ ہے، جو ص ۲۲ کی بارھویں سطر پر ختم ہوتا ہے۔

تیرھویں سطر سے مطبعوں کا بیان شروع ہوتا ہے جو دراصل اشاعتِ اوّل کے ناشر میر حسن رضوی کی تعریف کی خاطر لکھا گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ اضافہ بھی بعد میں کیا گیا۔ یہ بیان ص ۲۵ کی ساتویں سطر پر ختم ہوتا ہے۔ آٹھویں سطر سے نوازش کا ذکر شروع ہوتا ہے "بندہ کم ترین تلامذہ ...." اور اس کے متعلق میرا قطعی طور پر خیال ہے کہ یہ دیباچے کی روایتِ اوّل میں شامل تھا، یعنی اُس عبارت کا جُز تھا جو ص ۷ کی بارھویں سطر میں ایک فارسی شعر پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بیان ص ۲۶ کی چھٹی سطر تک ہے۔ اس کے بعد "وجہِ تالیف" کا بیان شروع ہوتا ہے اور اس کے متعلق بھی میرا خیال یہی ہے کہ یہ بھی دیباچے کی روایتِ اوّل کا حصّہ تھا [لفظی ترمیموں سے یہاں بحث نہیں]۔ یہ بیان ص ۳۰ کی پہلی سطر میں "تحریر کا بہانہ ہوا" پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد میر امّن کا قضیہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حصّہ، جو چودہ سطروں پر مشتمل ہے، کب لکھا گیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ روایتِ اوّل کا جُز ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اُس وقت شامل کیا گیا ہو جب نصیرالدین حیدر کی مدح کا اضافہ کیا گیا۔ [عبارت کے اس ٹکڑے میں سرور نے کئی بار تبدیلیاں کی ہیں۔ اختلافِ نسخ کے ضمیمے میں اُن کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے]۔ اس عبارت کے بعد ص ۳۰ کی سولھویں سطر سے لے کر ص ۳۱ کی آخری سطر تک جو عبارت ہے، اُس کے متعلق قطعی طور پر میری رائے ہے کہ وہ اُسی وقت لکھی گئی ہوگی جب پہلی بار یہ دیباچہ لکھا گیا ہے۔

آسان کہنے کی فرمایش، میر امّن، باغ و بہار

ص ۳۰ پر پہلی سطر سے یہ عبارت شروع ہوتی ہے: "اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اُردو زبان پر لائے .... "۔ اسی عبارت میں میر امّن کے لیے یہ لکھا گیا ہے کہ انھوں نے "محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں"۔ اس سے پہلے ص ۷، اہلِ دہلی کا بھرپور معاندانہ تذکرہ ہے لیکن وہاں میر امّن اور باغ و بہار کا نام نہیں آیا ہے۔ اُس عبارت کے متعلق تو میرا خیال یہ ہے کہ وہ حصّہ بعد کا اضافہ ہے؛ زیادہ امکان اس کا ہے کہ

نصیر الدین حیدر کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے جب اِس کتاب میں اضافے کیے گئے تھے، اُسی وقت یہ عبارت بھی بڑھائی گئی ہوگی، بات کو زیادہ پُر زور اور پُرجوش بنانے کے لیے۔ لیکن زیرِ بحث عبارت جس سیاق و سباق میں ملتی ہے، اُس کے پیشِ نظر اِس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ عبارت شروع ہی میں لکھی گئی ہوگی۔

مگر پہلے غور طلب یہ بات ہے کہ فرمایش کرنے والے نے سُرورؔ سے یہ کیوں کہا تھا کہ "جو روزمرّہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیِ عبارت کے واسطے دِقّت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں" [ص ۲۸]۔ سُرورؔ نے یہ کہانی اُس وقت تو زبانی سُنائی تھی اور زبانی داستان ایسی مشکل زبان میں نہیں سُنائی جاتی کہ جس کے فقروں کے معنی پوچھنے کے لیے فرنگی محل کی گلیوں کی خاک چھاننا پڑے ـــــ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اُس وقت تک سُرورؔ کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی تھی [فسانۂ عجائب اُن کی پہلی کتاب ہے] جو یہ خیال ہوتا کہ وہ مشکل عبارت لکھتے ہیں ـــــ اِس کے علاوہ، اُس وقت تک قصّے کہانیوں کی جو کتابیں تھیں، اُن میں ایک نوطرزِ مرصّع کو چھوڑ کر، اور کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو مشکل زبان میں لکھی گئی ہو۔ بل کہ صورتِ حال اِس کے برعکس تھی یعنی فورٹ ولیم کالج کی چھاپی ہوئی قصّے کہانیوں کی کتابیں جو سامنے آئی تھیں، اُن سب میں زبان سادہ و صاف تھی۔

سُرورؔ نے جس وقت یہ کتاب لکھی ہے [۱۲۴۰ھ میں] اُس وقت تک زبانِ دہلی کی استنادی حیثیت مسلّمہ تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اُس وقت تک میر امّن کی کتاب باغ و بہار شہرت حاصل کر چکی تھی، وہ بھی داستانی سلسلے کی کتاب ہے۔ سُرورؔ نے اپنی کتاب میں جو زبان لکھی اور جو پیرایۂ بیان اختیار کیا، اُس زمانے کے لحاظ سے لکھنؤ میں اُسے حقیقی معنی میں مشکل نہیں کہا جا سکتا؛ اِس کے باوجود محاورۂ اہلِ زبان اور روزمرّۂ اہلِ زبان کا جو لطف باغ و بہار میں ہے، وہ فسانۂ عجائب میں نہیں۔ سُرورؔ کو بھی اِس کا احساس تو ہوگا؛ اِس کے لیے یہ واضح کرنا گویا ضروری تھا کہ یہ کتاب اپنے انداز میں باغ و بہار سے الگ ہی نہیں،

برتر بھی ہے، اُس میں تو محاوروں کے ہاتھ پانو توڑے گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مطلب یہ تھا کہ دراصل یہ کتاب زبان اور بیان کے حقیقی معیار کی آئینہ داری کرتی ہے۔

گویا سُرور نے اِس عبارت سے بہ یک وقت دو کام لیے۔ ایک طرف تو زبان اور بیان کے اُس بامحاورہ اور سادہ و صاف انداز کو غیر معیاری ٹھہرایا، جسے میر امّن سے اور اُن کے واسطے سے دہلی سے نسبتِ خاص حاصل ہو گئی تھی اور باغ و بہار جس کا مظہر تھی [اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اُس کی کام یاب تقلید سُرور کے بس کی بات نہیں تھی]۔ جس کتاب میں محاوروں کے ہاتھ پانو توڑے گئے ہوں، بھلا وہ اِس قابل کیسے ہو سکتی ہے کہ اُسے نشانِ امتیاز قرار دیا جائے اور اُس کے انداز کو اپنایا جائے! تقلید در کنار، معیاری اُسلوب کے سلسلے میں اُس کا تو نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ اِس طرح دہلی، میر امّن اور باغ و بہار، آسانی کے ساتھ سب پر خطِ نسخ کھینچ دیا گیا۔

دوسری طرف یہ بھی واضح کر دیا کہ "نیاز مند کو اِس تحریر سے نمودِ نظم و نثر، جودتِ طبع کا خیال نہ تھا.... بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دقّت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا؛ اپنے نزدیک اُسے دور کیا اور جو کلمہ سہلِ ممتنع محاورے کا تھا، رہنے دیا" [ص۳]۔ اصل بات وہ ہے جو آخری جملے میں کہی گئی ہے؛ یعنی یہ کتاب بامحاورہ زبان اور سہلِ ممتنع انداز میں لکھی گئی ہے۔ بین السطور مطلب یہ تھا کہ اب اُردو زبان کا معیاری انداز و اُسلوب وہی ہے جو اِس کتاب میں ہے۔ گویا دہلوی زبان اور محاورے کی دھوم اور باغ و بہار کی شہرت، یہ باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں، کیوں کہ "جو گفتگو لکھنؤ میں کو بہ کو ہے، کسی نے کبھی سُنی ہو، سنائے، لکھی دیکھی ہو، دکھائے" [ص، ا] اور یہ کہ لطافتِ زبان و فصاحتِ بیان کا جو انداز لکھنؤ میں ہے، دہلی والے نہ پہلے اُس سے آشنا تھے اور نہ اب اُسے جانتے ہیں: "یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی اور نہ اب تک وہاں ہے" [ص۷]۔

یہاں پر ایک اور سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ کیا "صاحبِ فرمایش" نے واقعتاً وہ کہا تھا، جسے سُرور نے اُن سے منسوب کیا ہے؛ یا اِس کی حیثیت محض اندازِ بیان

کی ہے۔یعنی میرامّن اور باغ و بہار کی "مصنوعی یکتائی" اور "جھوٹی شہرت" کا پردہ فاش کرنے اور اپنے انداز کو اعلا اور معیاری ثابت کرنے کے لیے ایسے "موضوعِ سخن" کی تشکیل کی گئی جس کو بنیاد بنا کر بات کہی جاسکے۔ قطعی طور پر تو اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دونوں باتیں ممکن ہیں۔ صاحبِ فرمایش نے کوئی معمولی سا جملہ کہا ہو، اور سُرور نے اُسے اپنے انداز میں ڈھال کر چمکا دیا [اور بات کا بتنگڑ بنا دیا] یا پھر اُن کے افسانہ تراش اور داستان سرا ذہن نے بات کہنے کے لیے ایک اچھّا پیرایہ تراشا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے آخری بات کچھ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

ضمنی داستانیں

اِس کتاب کے پہلے مطبوعہ اڈیشن [۱۲۵۹ھ] میں جو ضمنی کہانیاں شاملِ داستان ہیں، بعد کے اڈیشنوں میں بھی وہی سب ملتی ہیں۔ یعنی ضمنی کہانیوں کی تعداد کے لحاظ سے مختلف اشاعتوں میں کمی بیشی نہیں پائی جاتی؛ البتہ مختلف نسخوں میں لفظی تبدیلیاں ملتی ہیں اور عبارتوں کی کچھ کمی بیشی بھی ہے؛ مگر یہ سب تبدیلیاں اُسی طرح کی ہیں، جیسی بطورِ عموم اِس کتاب کے مختلف نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔

یہ تو احوال ہے مطبوعہ نسخوں کا۔ سوال یہ ہے کہ جب پہلی بار [۱۲۴۰ھ میں] یہ کہانی لکھی گئی تھی، تو اُس وقت روایتِ اوّل میں بھی یہ سب ضمنی کہانیاں موجود تھیں اور اِسی ترتیب کے ساتھ؟ قطعیّت کے ساتھ اِس سوال کا جواب دینا تو میرے لیے ممکن نہیں؛ البتہ قیاس یہ کہتا ہے کہ پہلی روایت میں بھی یہ سب کہانیاں اِسی طرح موجود ہوں گی۔ اِس قیاس کی بنیاد اِس کتاب کی اُس روایت پر ہے جسے محمود الٰہی صاحب نے فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے نام سے شائع کیا ہے۔ [اُن کی صراحت کے مطابق اِس روایت کے خطّی نسخے کے ترقیمے میں سالِ کتابت ۱۲۵۵ھ لکھا ہوا ہے]۔ اُس میں بھی یہ سب کہانیاں اِسی طرح ملتی ہیں، بس اختصار اور تفصیل کا فرق ہے؛ یعنی اُس میں بھی یہ سب کہانیاں مختصر صورت میں ہیں۔ یہ قطعی دلیل تو نہیں، مگر قیاس کی حد تک

اِس سے مدد ضرور مل سکتی ہے، خاص کر اُس صورت میں جب کہ کوئی اور ذریعۂ معلومات اِس وقت تک سامنے نہیں آیا ہے۔ چوں کہ اِس قیاس میں بہ ظاہر کسی طرح کا اشکال نظر نہیں آتا، اِس لیے اِس سے کام لینے میں قباحت نہیں سمجھی گئی۔

بندر کی تقریر

اِس داستان کے ہیرو شاہ زادہ جانِ عالم کو اُس کے وزیر زادے نے ایک خاص عمل کے ذریعے بندر کے قالب میں تبدیل کر دیا تھا اور خود جانِ عالم بن کر اُس کی جگہ لے لی تھی۔ جانِ عالم جو بندر کی شکل میں ہے، ایک سوداگر کے پاس تھا؛ وزیر زادے کو پتا چل گیا اور اُس نے اُس سوداگر کو بندر سمیت طلب کیا ہے۔ اُس موقعے پر رستے میں لوگوں کے سامنے بندر [یعنی جانِ عالم] ایک پُر زور اور پُر درد تقریر کرتا ہے جو ص ۲۲۶ کی نویں سطر سے ص ۲۳۵ کی چوتھی سطر تک مرقوم ہے۔ معمولی اختلافاتِ عبارت کے ساتھ یہ تقریر طبعِ اوّل میں بھی موجود ہے۔ فسانۂ عجائب کا بنیادی متن میں بھی یہ موجود ہے، لیکن بہت مختصر صورت میں، یعنی ڈیڑھ صفحے سے بھی کچھ کم میں آگئی ہے۔ مطلب صاف ہے کہ یہ تقریر شروع میں، یعنی جب پہلی بار [۱۲۴۰ھ میں] اِس داستان کو لکھا گیا ہے، اُس وقت اِس قدر مفصل نہیں تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ اِس تقریر میں جن واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں، وہ سب ۱۲۴۰ھ کے بعد ظہور میں آئے ہیں۔ نصیر الدین حیدر کا مرنا ["تیسری ربیع الآخری ۱۲۵۳ھ [فسانۂ عبرت ص ۱۷]] جس کو "شب کو گور میسّر نہ ہوئی، تنہا نعش پڑی رہی" [ایضاً ص ۱۷]، ——— نصیر الدین حیدر کی موت کے بعد کا جو حال فسانۂ عبرت میں سرور نے لکھا ہے [یہ نو مطبوعہ صفحوں پر مشتمل ہے] اُسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ بندر کی تقریر کے بعض اجزا یہاں لفظی صورت بدل کر نمودار ہو رہے ہیں۔ اِس کے بعد محمد علی شاہ [متوفی ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ] کے جنازے کا جو حال لکھا ہے [فسانۂ عبرت ص ۵۵ سے ص ۵۷ تک] اُس میں بہت سے جملے اور عبارت کے ٹکڑے تقریباً وہی ہیں جو بندر کی تقریر کا

حصّہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقریر کے ایسے حصّے اِس کے بعد ہی لکھے گئے ہوں گے۔ اِس طرح بندر کی تقریر کے بیش تر اجزا ۱۲۴۳ھ سے لے کر ۱۲۵۸ھ کے ربعِ اوّل کی مدت میں لکھے گئے ہوں گے۔

میرے عزیز دوست اطہر پرویز مرحوم نے اپنے مرتبہ فسانۂ عجائب کے مقدّمے میں اِس ذیل میں لکھا ہے کہ: "بندر کی تقریر کا پورا حصّہ غور سے پڑھنے کے بعد" احوالِ محمّد علی شاہ" کا وہ حصّہ پڑھا جائے جہاں محمّد علی شاہ کے جنازے کے جلوس کا ذکر ہے۔ یہ بیان تقریباً اُسی لب و لہجے میں ہے جس میں سرورؔ نے بندر کی تقریر لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فسانۂ عجائب سے منقول نہ ہوگا؛ بلکہ یہاں فسانۂ عبرت میں لکھنے کے بعد سرورؔ کو اپنے فلسفیانہ خیالات کو پیش کرنے کا خیال آیا کہ اِسے فسانۂ عجائب جیسی شہرۂ آفاق کتاب میں استعمال کیا جائے" [ص ۳۵]۔

فسانۂ عبرت کے مختلف اجزا بھی مختلف زمانوں کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً شرف الدولہ کی جیسی مدح اِس میں کی گئی ہے [ص ۱۵ سے ص ۴۵ تک] اُس کو پڑھ کر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُسی زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن دونوں کتابوں کے بہت سے اجزا کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کون سا بیان کب لکھا گیا۔ بہ ہر حال، اِس تقریر کے ذیل میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ پورا بیان اِس کتاب کی اشاعتِ اوّل [۱۲۵۹ھ] میں شامل ہے، اور فسانۂ عبرت اِس کے بعد کی تصنیف ہے، جس میں ۱۲۷۲ھ تک کا احوال موجود ہے[1] [ص ۱۱۰]۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں سرورؔ

---

[1] "شگوفۂ محبت" کے سببِ تالیف کے ذیل میں سرورؔ لکھتے ہیں:

"فسانۂ عجائب کہ قصّۂ جانِ عالم ہے ..... اور تحریرِ ثانی ... سرورِ سلطانی ہے"

اِس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرورؔ نے فسانۂ عجائب کے بعد سرورِ سلطانی لکھی اور اِس کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۴ھ میں واجد علی شاہ کے حکم سے سرورؔ نے شمشیر خانی کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا .... اپنی کتاب کا نام "سرورِ سلطانی" رکھا" [مسعود حسن رضوی، مقدمۂ فسانۂ عبرت، ص ۵]
←

نے اِس تقریر کو مختصراً لکھا تھا؛ نصیر الدّین حیدر کی موت نے اُن کو پریشان حال کر دیا [اُنھوں نے ہر جگہ اِس بادشاہ کی تعریف کی ہے] یوں اُنھیں بعد کے حالات سے سخت تکلیف پہنچی اور اُنھوں نے اُس تقریر میں بے ثباتیِ دنیا اور بے وفائیِ اربابِ دنیا کے ایسے اجزا شامل کر دیے جن سے اُن کے دل کی کچھ بھڑاس نکل سکتی تھی۔ پھر محمد علی شاہ کے زمانے میں سُرور کے دن پھرے تھے؛ مگر اُن کے مرتے ہی، نئے بادشاہ امجد علی شاہ کے زمانے میں وہ بے کاری کا شکار ہوئے اور پریشانیوں میں بے طرح مبتلا رہے؛ یوں امجد علی شاہ سے وہ بہت ناخوش تھے۔ فسانۂ عبرت میں جہاں اُن کا حال لکھا ہے، وہاں اُن کے عہد کو تاریک ترین دور بتایا ہے اور ہر طرح کی خرابیوں کی تفصیل لکھی ہے۔ اِس روشنی میں دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ محمد علی شاہ کے جنازے کا احوال اُنھوں نے ابتدائے عہدِ امجد علی شاہ میں لکھا ہوگا اور یوں اِس بیان میں نااہلیِ اربابِ دنیا کا پُرشور تذکرہ ملتا ہے۔ جب اُنھوں نے فسانۂ عبرت لکھی، تو اُس میں اِن دونوں بادشاہوں کے حالات کے ذیل میں کچھ اجزا اُس تقریر کے بھی شامل کر لیے۔

اِس کی تائید کا ایک اور قرینہ بھی موجود ہے۔ فسانۂ عجائب کی اشاعتِ اوّل کے آخر میں شرف الدّولہ کی مدح میں ایک طویل مدحیہ نثر شامل ہے [جو نظرِ ثانی میں بعد کی اشاعتوں سے نکال[1] دی گئی] ۔ فسانۂ عبرت میں بھی شرف الدّولہ کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے [ص ۱۵ سے ص ۴۵ تک] یہاں بھی فسانۂ عجائب اور فسانۂ عبرت دونوں میں

← یہ کتاب بہ قولِ سُرور "ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں" تیار ہوگئی تھی۔ شمشیر خانی، فردوسی کے شاہ نامے کا خلاصہ ہے۔ اِس کا مؤلف توکّل بیگ حسینی عہدِ شاہ جہاں میں تھا [رجب علی بیگ سرور، ص ۲۶۱] ۔ فسانۂ عجائب ۱۲۴۰ھ میں مکمّل ہوا اور اِس کے بعد دوسری تصنیف سرورِ سلطانی ۱۲۶۴ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ فسانۂ عبرت تو بہت بعد کی تصنیف ہے [اور یہ چھپی بھی ہے اُن کے مرنے کے بعد] ۔

[1] یہ نثر بعض اور نسخوں میں بھی موجود ہے۔ مطبوعہ نسخوں کے تعارف کے ذیل میں اِس کی تفصیل آگے آئے گی۔

شامل اِس مدحیہ نثر میں بہت سے اجزا مشترک ہیں۔ سُرورؔ کو شرف الدّولہ کی وزارت کے زمانے میں ملازمت ملی تھی اور یوں اُن کی پریشانیوں کا خاتمہ ہوا تھا۔ اُسی زمانے میں اُن کی کتاب کی شہرت بھی بہت پھیلی اور اُسی زمانے میں اُس کے چھپنے کے انتظامات شروع ہوئے۔ اِن وجوہ سے یہ ظاہر یہی مرجّح نظر آتا ہے کہ شرف الدّولہ کی مدح پہلے پہل اُنھوں نے اپنی پہلی تصنیف میں لکھی ہوگی۔ اُس سے پہلے تو اُنھوں نے کوئی کتاب لکھی ہی نہیں تھی۔ جب یہ واضح ہوجائے کہ شرف الدّولہ کی مدح اُنھوں نے پہلے فسانۂ عجائب میں شامل کی تھی، اور اُس مدحیہ نثر کے بہت سے اجزا فسانۂ عبرت کے مدحیہ بیان میں بھی پائے جائیں؛ تو اِس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ فسانۂ عجائب کی نثر کے بعض اجزا فسانۂ عبرت کے نثری بیان میں شامل کیے گئے۔ اِسی قیاس پر مبنی میرا خیال یہ ہے کہ بندر کی تقریر کے جو اجزا فسانۂ عبرت میں بھی ہیں، وہ فسانۂ عجائب سے منقول ہیں، یا یوں کہیے کہ اُس کا نقشِ ثانی ہیں۔

زبان و بیان

اِس عنوان کے تحت کچھ کہنے سے پہلے، یہ لکھنا ضروری ہے کہ فسانۂ عجائب سُرورؔ کی پہلی تصنیف ہے [اُن کی دوسری کتاب سرورِ سلطانی اِس کے تقریباً ۲۴ سال بعد ۱۲۶۴ھ میں معرضِ وجود میں آئی تھی] یعنی یہ نقشِ اوّل ہے۔ اگر زبان و بیان کے لحاظ سے اِس میں خامیاں اور خرابیاں ہوں [اور وہ ہیں] تو اِس کی ایک بڑی وجہ "ناتجربے کاری" یا "کم مشقی" کو بھی سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعہ ہے کہ اِس کتاب میں زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت سی خامیاں اور خرابیاں ہیں اور بعض مقامات پر تو کچھ ایسی صورتِ حال ہے کہ اُسے "پھوہڑپن" کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ باتیں خاص کر یوں محلِّ نظر معلوم ہوتی ہیں کہ سُرورؔ کی اصل حیثیت ایک صاحبِ طرز مصنّف کی ہے اور اِس کتاب کی بھی اصل قدر و قیمت اِس کے اسلوب میں پنہاں ہے۔ لیکن اِس سلسلے میں کچھ کہنے سے پہلے ایک اور پہلو پر نظر ڈال لینا بہتر ہوگا۔

معلوم نہیں یہ خیال ذہنوں میں کیسے سما گیا اور دلوں میں بیٹھ گیا ہے کہ فسانۂ عجائب کی نثر بہت مشکل ہے۔ مشکل نثر کا معیار اگر توطرزِ مرصّع کو مانا جائے، تو پھر اس کتاب کو تو آسان تر کہا جائے گا۔ مشکل نثر کی مثال میں اکثر اِس کتاب کے وہ مقامات پیش کیے جاتے ہیں جہاں سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے، یا ضمنی کہانیاں یا نئے بیانات شروع ہوتے ہیں یعنی تمہیدی مقامات؛ اور یہ بڑی ناانصافی ہے۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی، اُس زمانے میں قصّوں کی تمہید بہت پُرتکلّف انداز کی ہوا کرتی تھی۔ طلسمِ ہوش رُبا کی زبان کی کون مشکل کہے گا، لیکن تمہیدی مقامات اُس میں بھی پُرتکلّف اندازِ بیان سے خالی نہیں۔

تمہیدی حصّوں سے قطعِ نظر کو روا رکھا جائے، تو پھر یہ معلوم ہوگا کہ اِس کتاب میں زبان اور بیان کے بہ طورِ عموم دو رنگ پائے جاتے ہیں۔ کہیں تو ایسا صاف شفاف بیان ہے کہ آج کے اوسط درجے کی استعداد رکھنے والے قاری کو بھی اُس کے پڑھنے میں دقّت نہیں ہوگی۔ خاص کر جہاں مکالمات ہیں، وہ مقامات تو بیان کی شگفتگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ دوسرا انداز وہ ہے جہاں علمیت کا رنگ ذرا گہرا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے مقامات پر بیان کا انداز وہی ہے جو متاخر ہندستانی فارسی نثر نگاروں کے اثر سے رواج پا گیا تھا۔ ایسے مقامات اگر آج ہمیں کچھ مشکل نظر آتے ہیں، تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں کہ یہ بجائے خود مشکل ہیں؛ اِس کی اصل وجہ ہے ہمارے دَور کی عمومی کم استعدادی، فارسی زبان سے ناواقفیت اور کلاسیکی اسالیب سے کم آشنائی۔ مصنّف جس معاشرے کا فرد تھا، اُس معاشرے کے اُن لوگوں کے لیے جو لکھنے پڑھنے سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے، یہ طرزِ ادا غیر معمولی نہیں تھا۔ مصنّف نے اپنے زمانے کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، اِس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی اِسی سلسلے میں کہنے کی ہے کہ سرور نے جہاں شادی بیاہ کا یا شاہی جلوس کا احوال لکھا ہے، یا ایسے ہی اور بیانات لکھے ہیں جن میں مختلف اشیا کے نام آتے ہیں، تو ایسے مقامات بھی آج ہم کو مشکل نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی اصل وجہ یہ نہیں ہوتی کہ بیان میں کسی طرح کی پیچیدگی ہے یا زبان مغلق ہے؛ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ آج ہم اُن بہت سی اشیا سے

واقف نہیں جن کے نام لکھے گئے ہیں اور جن سے متعلق تفصیلات لکھی گئی ہیں۔ یعنی یہ بھی حقیقی مشکل نہیں، اِس میں ہماری ناواقفیت کا عمل دخل ہے۔

یہ تو بالکل درست ہے کہ زبان کے لحاظ سے باغ و بہار کو اگر معیار مان لیا جائے تو پھر یہ کتاب اُس معیار پر پوری نہیں اُترے گی؛ لیکن یہ عمل بجائے خود سراسر مصنوعی ہوگا۔ دو بالکل مختلف چیزوں کو مقابل رکھ کر، ایک کو برتر بتانا قرینِ انصاف نہیں ہو سکتا۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح باغ و بہار نے ایک اسلوب کی تشکیل کی تھی، اُسی طرح فسانۂ عجائب نے بھی ایک مختلف اسلوب کی تشکیل کی تھی۔ اپنے اپنے دائرے میں یہ دونوں اسالیب مستقل حیثیت کے مالک ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سُرور کے زمانے میں لکھنؤ کے اُس معاشرے میں معیاری حیثیت اُسی اسلوب کو حاصل تھی جسے سُرور نے اختیار کیا۔ یہاں محض ضمنی طور پر عرض کردوں کہ سُرور نے جن مقامات پر شاہی جلوس کا احوال لکھا ہے، یا شادی بیاہ کا ذکر کیا ہے، اور اُس کے ذیل میں رسموں اور ٹوٹکوں کا بیان آگیا ہے، یا جیسے ابتدائے داستان میں جوتش کی اصطلاحوں کا مفصّل تذکرہ آیا ہے جوتشیوں ہی کی زبان میں، یا مثلاً چڑیمار اور اُس کی بیوی کی گفتگو لکھی ہے، جس میں اِس پیشے کے بہت سے اصطلاحی لفظ بھی آگئے ہیں، یا جہاں کوہِ مطلب برآر کے جوگی کا بیان کیا ہے؛ تو ایسے سارے مقامات پر دو تین باتیں بہ طورِ خاص توجّہ طلب ہیں: مثلاً جہاں شاہی جلوس کا بیان ہے، تو وہاں مختلف پوشاکوں، ہتھیاروں، عہدے داروں کے اِس قدر نام آئے ہیں اور اِن سے متعلق اِس قدر تفصیلات معرضِ بیان میں آئی ہیں کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اِس شخص نے واقعتاً شاہی جلوس دیکھے تھے اور اُن کی تفصیلات کے عکس اِس کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ اِن تفصیلات اور اِن کے داستانی بیان میں مرقّع نگاری کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جلوس کا وسیع و عریض مرقّع وجود میں آجاتا ہے، ہم جلوس کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں؛ یہ معمولی کمال نہیں۔ پھر یہ بات کہ ایسے مقامات پر ہر جگہ زبان صاف اور بیان شفّاف ہے۔ اغلاق اور اشکال کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ

آج ہماری ناواقفیت، بل کہ آسان پسندی اور اس سے بھی بڑھ کر وہ جو کم فرصتی سے زیادہ عجلت پسندی کا رجحان ہمارے ذہنوں میں سما گیا ہے؛ یہ سب مل کر ہمیں اس مغالطے میں مبتلا کر سکتے ہیں کہ یہ تو بہت مشکل بیان ہے۔ عورتوں کے مکالمے تو ایسی شفاف زبان میں لکھے گئے ہیں کہ نواب مرزا شوق کی مثنوی کے کچھ شعر یاد آجاتے ہیں۔ جوگی کی کٹیا کا حال اور "بیانِ لکھنؤ" میں لکھنؤ کے فن کاروں اور پیشہ وروں کا بیان؛ ایسے سارے مقامات پر اندازِ بیان میں علمیت کا رنگ تو ہے، مگر گہرا نہیں، ایسا نہیں کہ اوسط درجے کی استعداد والا اُن کو نہ سمجھ سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مشکل مقامات اس میں ہیں ہی نہیں، ہیں اور ضرور ہیں؛ لیکن اُن کی تعداد زیادہ نہیں۔

تیسری خاص بات جو ہمہ وقت نظر میں رکھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ سرور نے داستان لکھی تھی، ناول نہیں لکھا تھا؛ اور وہ داستان، فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کے جدید ذہن اور نئے اندازِ نظر کے بنائے ہوئے خاکے کے تحت نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ داستان لکھنؤ کے اُس معاشرے کے لیے لکھی گئی تھی جہاں داستان سرائی کی روایت کو پسندیدگی کی سند حاصل ہو رہی تھی اور جہاں مرصع سازی کو کمالِ فن سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ جو مثلاً سردی کے بیان میں بہت سی تشبیہیں آگئی ہیں یا استعارے آگئے ہیں، یا مثلاً کھانوں وغیرہ کے بیان میں بہت سے نام پے در پے آتے ہی چلے جاتے ہیں تو یہ داستان سرائی کا خاص انداز ہے۔ اِس کو سمجھے بغیر ایسے مقامات کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔

یہاں چوں کہ لسانی تجزیہ مقصود نہیں، اس لیے اِنھی اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ضرورت اِس کی ہے کہ ایک مستقل موضوع کے طور پر کوئی واقف کار اِس کتاب کی نثر کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے اور "عیب و ہنر" دونوں کی تفصیلات مرتب کرے۔ [میں یہ بات اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اُس "ہنر" کا پلہ بھاری نکلے گا جو (اِس زمانے میں نہیں) اُس زمانے میں کمال کی نشانی تھا اور جسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور جس کے تجزیے سے آج ہم میں سے بہت سے لوگ شاید صحیح طور پر عہدہ برآ بھی نہ ہو سکیں] یہ ضمنی گفتگو ختم ہونے کو آئی؛ لیکن اِسے ختم کرنے سے پہلے، اِسی سلسلے میں عزیز احمد کا

ایک اقتباس ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں :

"طلسماتی داستانوں کے دور میں اور اس کی پیداوار کے طور پر کم سے کم ایک کتاب ایسی ظہور میں آئی جو ناول سے بہت قریب ہے، یہ مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب ہے۔ تین خصوصیتیں اِسے طلسم ہوش رُبا اور بوستانِ خیال جیسی داستانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ پہلی تو اس کا اختصار..... دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ گرد و پیش کے ماحول سے بھی متاثر ہے..... تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنف قصّے سے زیادہ زبان و اسلوب پر توجّہ دیتا ہے اور زبان کی داد چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت بہت ہی اہم ہے کہ مصنّف نے اسلوب کو کتاب کی دل چسپی کی جان بنانا چاہا ہے اور اس طرح رتن ناتھ سرشار کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے..... سرشار کے یہاں بھی ... اصل دل چسپی قصّے سے زیادہ زبان میں، واقعات سے زیادہ بیان میں اور عمل سے زیادہ مکالمے میں ہے۔" [ترقی پسند ادب، بہ حوالۂ رجب علی بیگ سرور، ص ۲۳۱]

فسانۂ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعایتوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اِس میں اُن کی "کم مشقی" کا دخل کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی دوسری کتاب ترجمۂ الف لیلہ کو دیکھیے، جس کا نام شبستانِ سرور ہے؛ اُس میں ایسی خامیاں اور اِس طرح کا کچّا پن نہ ہونے کے برابر ہے۔

رعایتِ لفظی سرور کی نثر کا عام جوہر ہے اور قافیہ بند جملے لکھنا اُن کا خاص انداز ہے۔ اِس میں بجائے خود کچھ ایسی خرابی نہ تھی؛ مگر لفظی رعایت کے شوقِ بے حد اور قافیہ بندی کے شوقِ بے نہایت نے کچھ مقامات پر عبارت میں خرابی بھی پیدا کر دی ہے۔ داستانی انداز یوں ہی تفصیل بل کہ طوالت کا طلب گار رہا ہے۔ داستان میں ایجاز اور اختصار کو دخل حاصل نہیں ہوتا، اُس کے بیان کا بڑا حصّہ بے مزہ بن کر رہ جائے اگر اُس میں مختلف مناظر، اشیا، جذبات وغیرہ کے سلسلے میں تفصیل نگاری اور آرائش پسندی سے کام نہ لیا جائے؛ لیکن سرور کے یہاں تفصیل نگاری کے ذیل میں بعض اوقات لفظی رعایت

کے ایسے بھدّے ٹکڑے بھی آجاتے ہیں جو عبارت کو بے کیف بنا دیتے ہیں۔ مثالوں کی تو یہاں گنجایش کم سے کم ہے، آپ صرف بہ طورِ مثال اُس حصّے کو دیکھیے جہاں جانِ عالم انجمن آرا کو ساتھ لے کر بادشاہ سے رخصت لیتا ہے اور عازمِ وطن ہوتا ہے [ص ۱۷۸ سے ص ۱۸۵ تک]۔ رعایتِ لفظی اور قافیہ بندی کے شوقِ فضول نے کئی جگہ بدمزگی پیدا کر دی ہے۔ صرف ایک مثال: "پھر شکار کا سامان میرشکار لائے۔۔۔ چیتے باجود دشمنوں کا بُرا چیتے، بلکہ لہو پیتے۔ سیاہ گوش در آغوش۔ ہرن لڑنے والے، خانہ زاد، گھر کے پالے" [ص ۱۸۱] ایسے کئی جملے اِس بیان میں مل سکتے ہیں [اِس کے باوجود اِس بیان میں شاہی ساز و سامان کا جیسا بیان ہے، مختلف شاہی کارخانوں کا جیسا احوال سامنے آتا ہے اور سامانِ سفر کا جس طرح بیان ہوا ہے؛ یہ سب بھی اپنی جگہ پر حیرت آفریں اور ہوش رُبا ہیں۔ شاہی سامان کا تو کیا ذکر، معمولی اشیا اور افراد کا تذکرہ آج ہمارے لیے معلومات بخش بھی ہے اور حیرت آفریں بھی۔ مثلاً سقّوں کا بیان: "ان کے بعد ہزارہا سقّا، خواجہ خضر کا دم بھرتا، پھڑکا دکرتا۔ کمر میں کھاروے کی لنگیاں، شانوں پر بادلے کی جھنڈیاں، مشکوں میں بیدمشک بھرا، دہانے میں ہزارے کا فوّارہ چڑھا۔۔۔"]

یا مثلاً سردی کے بیان کو دیکھیے، جو ص ۳۲۶ سے ص ۳۲۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس بیان کے متعدد ٹکڑوں کو غیر ضروری اور غیر متناسب لفظی رعایتوں اور قافیہ بندی کے غلو نے بے مزہ بل کہ بدمزہ بنا دیا ہے۔ صرف دو جملے بہ طورِ نمونہ کافی ہوں گے: "اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا، پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا"۔ "بندوق میں لاگ نہ تھی، جانپ کے پتھروں میں آگ نہ تھی، توڑا ہر ایک گُل تھا، توتے کی جگہ شورِ بلبل تھا۔"

ایسے ہی غیر ضروری جملوں نے اِس بیان کے کچھ حصّوں کو [اور ایسے ہی بعض دوسرے بیانات کے اجزا کو] طوالت بخشی ہے اور بے کیفی سے گراں بار کیا ہے۔ [یہ سب برحق، مگر اِسی سردی کے بیان میں ایسے جملے بھی ہیں: "اَدس برگ و بار کی، صنعت پروردگار

کی دکھاتی تھی، مرصّع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم، خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے برگ و بار میں الماس اور موتیوں کے سبک آویزے تھے۔" ایسے ترشے ہوئے مرکّب جملوں اور مرصّع اجزا کی بھی اِس کتاب میں کمی نہیں]۔ یا مثلاً توشۂ سفر کی افراط کے بیان میں لکھتے ہیں: "کھجوریں جو بٹ نہ سکیں، راہ میں پھینک دیں۔ وہ اُگیں؛ اُس کے درخت آگے کم تھے، اُس دن سے جنگل ہو گئے" [ص ۱۸۴] آخری ٹکڑے خوش ذوقی پر گراں گزرتے ہیں؛ مگر اسی بیان میں، اسی صفحے پر، اِس سے پہلے یہ ٹکڑا بھی ہے: "اِن کے بعد پچھے سات سے پالکی، نالکی، چنڈول، مُحافہ امیرزادیوں کا۔ اور انیسوں جلیسوں کی تین چار سے کھڑکھڑیا اور فنس، قیمت کا بڑھیا۔ آتو اور محل داروں کے جو پہلے سے پہلے مُغلانیوں کی مَنجھولیاں۔ خاص خواصوں کے پیچھے پیش خدمتوں کا دو تین سو میانہ۔ ہزار نو سے رتھ اکبر آبادی، دو بُرجے، سایبان دار، نئے مغرق پردے چمکتے، ناگوری بیل، جو ثورِ فلک نے نہ دیکھے تھے، جُتے، مخمل کی جھولیں پڑیں؛ لونڈیاں، باندیاں، انّا، چھوچھو، چھٹی نویس، باری دارنیاں اُن پر چڑھیں۔"

یہاں خواتین کے مرتبے اور درجے کے لحاظ سے سواریوں کی تفصیل اپنی جگہ پر نظر طلب اور تحسین طلب ہے۔ ہمیں اِن خوبیوں کا بھی اعتراف کرنا چاہیے؛ لیکن اِس پیرایۂ بیان سے لطف اندوز ہونے کے لیے کلاسکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق کی بھی ضرورت ہے اور اُس معاشرے کے آداب و اطوار سے واقفیت بھی ضروری ہے جہاں اِس نثر نے فروغ پاکر، معیار اور مثال کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور جہاں اِس کتاب کی تصنیف پر تقریباً ساٹھ سال گزرنے کے بعد طلسمِ ہوش رُبا کی داغ بیل پڑی تھی، جس میں قافیہ بندی، مرصّع سازی اور آرایش پسندی کی کمی نہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ وہ نقشِ ثانی ہے، اور یہ بھی کہ ہوش رُبا کے لکھنے والے سرور سے بہتر نثر نگار تھے۔ اِس کتاب میں ایسے لفظ بھی ملیں گے جن کو بعد میں متروک قرار دیا گیا جیسے "زور" بہ معنی عجیب، بہت: "ہَوا کا زُور زُور رنگ دکھاتا تھا" [ص ۴۷]۔ "زُور چیز ہو" [ص ۸۲]

یعنی خوب آدمی ہو، عجیب آدمی ہو ــــــ یا جیسے جمع کی یہ صورت : "ایک طرف مغلانیاں غم کی ماریاں[1]" [ص ۲۴۷] "رنگتیں نرالیاں" [ص ۹] "ہزار بان سے کہانیاں، پیاری پیاریاں" [ص ۱۸۲] "نشۂ حسن میں متوالیاں" [ص ۱۸۳] "رنڈی" عورت کے معنی میں : "سیکڑوں مرد و رنڈی بے کہے ہمراہ ہوئے" [ص ۱۸۴] ــــــ یا مثلاً "نے" کا استعمال، صرف ایک مثال : "شہزادۂ عالی تبار نے آب و طعام دیکھ کر رُو دیا" [ص ۲۶۸] ــــــ ترکیبِ مُہنّد کی مثالیں بھی ملتی ہیں، جیسے : "اسے زمرۂ کنیزوں میں سرفراز کرو" [ص ۱۹۰] "مردہ رنڈی" [ص ۱۸۴]۔

متعدد لفظ جس مفہوم میں سرور نے استعمال کیے ہیں، عموماً اُن کو اُس طرح استعمال نہیں کیا جاتا، مثلاً "سانحہ" عام واقعے کے معنی میں [ص ۲۸۸] یا جیسے چند عرصہ : "چند عرصے میں ... وہ ہاتھ پاؤں نکالے" [ص ۳۶]، "چند عرصے میں پھر اُسی دشتِ ادبار ... وارد ہوا" [ص ۲۴۳] ــــــ "خبرداروں نے اِس حال کا ... چرچا مچایا" [ص ۱۷۶] "چرچا مچانا" میں نے کہیں اور نہیں دیکھا ــــــ "نکتہ چینی" بمعنیِ نکتہ آفرینی : "آپ رنگینیِ عبارت کے واسطے دقّت طلبی اور نکتہ چینی کریں" [ص ۲۸] ــــــ "ایک دھما کا پیدا ہوا" [ص ۱۶۳] "دھما کا پیدا ہونا" میں نے کسی دوسری تحریر میں نہیں دیکھا۔ [ایسی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں] ــــــ "اِس عرصے میں شہزادہ وہ وادیِ پُرخطر، میدانِ سراسر ضرر کو طے کر" [ص ۱۲۰]۔ اِس جملے میں "وہ" اور "کو" کا اجتماع نظر طلب ہے۔ یا مثلاً : "چند عرصے میں پھر اُسی دشتِ ادبار و صحرا خار خار، جہاں حوض میں کود پڑا تھا، وارد ہوا" [ص ۲۴۳]۔ جمع الجمع، جیسے: اُمورات۔ کلمۂ جمع کے ساتھ واحد فعل، جیسے : "سو سو جہاز ... جاتا تھا"۔ اسم کی رعایت سے علامتِ مصدر (نا) کو بدل دینا، جیسے: "آفت ..... لانی نہ تھی" (وغیرہ)۔

---

[1] جانصاحب کے دیوان [مطبعِ حیدری لکھنؤ] میں ص ۲۰۸ پر ایک غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے :

جو جو نہیں اُٹھائی تھیں میں نے اُٹھالیاں　　　بس بس زبان روکو، نہ دو مجھ کو گالیاں

اُس میں "بکالیاں" اور "کالیاں" ("کالی" کی جمع) بھی ہیں۔ مقطع میں "کھالیاں" بھی آیا ہے :

اے جان! تجھ سے کیا کہوں، کروا کے رات کو　　　جھوٹی ہزار قسمیں نگوڑی نے کھالیاں

تذکیر و تانیث کے لحاظ سے بھی متعدد لفظ قابلِ توجہ ہیں، مثلاً "گذرگاہ" کو مذکر بھی لکھا ہے [ص ۱۱] اور مونث بھی [ص ۲۲۵]۔ اسی طرح "طرز" مذکر بھی ملتا ہے اور مونث بھی [ص ۱۲۔ ص ۱۹۱]۔ "خلش" کو بہ تذکیر باندھا ہے [ص ۱۷۱] اور "کشمیر" کو بہ تانیث [ص ۳۲۶]۔ "محلسرا" اور "پسند" دونوں مذکر ملتے ہیں [ص ۲۰۲۔ ص ۱۵۸]۔ "زین" کو بہ تذکیر لکھا ہے: "کسی پر جڑاؤ زین باندھا تھا" [ص ۱۰۰]۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ الفاظ اور طریقِ استعمال۔

متعدد مقامات پر بیان میں ایسا بھدا پن ہے کہ اُسے بے اختیار "پھوہڑ پن" کہنے کو جی چاہتا ہے، مثلاً شاہ زادہ جانِ عالم اپنے ارادے کی پختگی اور کردار کی بلندی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "للّٰہ الحمد کہ شیشۂ عصمت سنگِ ہوا و ہوس سے سالم رہا" [ص ۱۱۷]۔ کسی مرد کے لیے یہ کہنا کہ اُس کا شیشۂ عصمت محفوظ رہا، عجیب تر بات ہے۔ "وزیر زادے کو باوجودِ خود فراموشی یاد فرمایا۔ لڑکپن سے تا زمانۂ عشقِ انجمن آرا، اُس سے بھی اُلفت رکھتا تھا" [ص ۵۱]۔ "تا زمانۂ عشقِ انجمن آرا" کی تحدید سے اِس بیان میں امرد پرستانہ طرزِ گفتار کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔ مطبعِ حسنی کے مالک میر حسن رضوی کی تعریف میں لکھا تھا: "ایک ہمارے عنایت فرما ہیں جناب میر حسن صاحب، صاحبِ حُسن و جمال، خوش رو .... بیت ابرو کا کلِ مشک بو، صفحۂ رخسار گلِ بے خار [ح ص ۱۵]۔ معلوم ہوتا ہے کسی محبوبِ خوش ادا کی تعریف کی جا رہی ہے ——— وزیرِ اعظم شرف الدولہ کی مدح میں بھی ایسے جملے لکھے تھے: "از سر تا پا صاحبِ جمال ہے، حُسنِ خداداد کامل ہے، مہِ نو خمِ ابرو ہے، سُنبلیں گیسو ہے، مژہ آبدار ہے، سینۂ عدو کے پار ہے، چشم وہ کہ جس کا ہم چشم عنقا ہے، غزالِ رعنا چکارا ہے۔" اِس بیان میں ایسے متعدد ٹکڑے ہیں۔

فقرے بازی کے ذوقِ بے محابا نے بھی کئی جگہ اپنا رنگ جمایا ہے اور عبارت کو بے رنگ بل کہ بدرنگ بنایا ہے، مثلاً: چلتا دھندا کیجیے [ص ۱۲۵] "کچھ ہو یا نہ ہو، زبان کا مزہ نکالو [ص ایضاً]۔ یہ مبتذل جملے بازی ایک ایسی خاتون کر رہی ہے جو شہ زادی ہے اور ایک اجنبی سے پہلی بار ہم کلام ہوئی ہے۔ ایسی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔

برمحل اور بے محل کا امتیاز ملحوظ نہ رکھنا سرور کا خاصا کمزور پہلو ہے۔[1] اور اس بے امتیازی نے بھی کئی جگہ بے لطفی کو شاملِ عبارت کیا ہے۔ صرف ایک مثال: جانِ عالم سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے بچا ہے اور کئی دن کے بعد ساحل پر آ لگا ہے، نقاہت کا وفور ہے؛ لیکن ماہی گیروں کے استفسار پر وہ اُن اَن پڑھ مچھیاروں کے سامنے اُس عالم میں جب کہ بولنا مشکل تھا، مرصّع تقریر شروع کرتا ہے، جو "ایّہا النّاس" سے شروع ہوتی ہے

---

[1] "بیانِ لکھنؤ" میں جہاں نصیر الدّین حیدر کی تعریف شامل کی ہے، وہاں متعدد جملے ایسے لکھے ہیں جن کے متعلق یہ خیال کیا جاسکتا ہے [اور خیال کیا گیا ہے] کہ یہ تحسین نہیں تعریض ہے اور مدح نہیں، ہجوِ ملیح ہے۔ مثلاً: "ایک ایک ادنیٰ کُنجڑن، ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ شہ زادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا، خواصوں کو صاحبِ نوبت کیا.... پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کیے ...." [ص ۲۰] لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہاں وہی بے امتیازی کارفرما ہے جو اس کتاب میں سرور کی تحریر میں کئی اور مقامات پر بھی شامل نظر آتی ہے۔ سرور کسی بھی عنوان سے نصیر الدّین حیدر سے ناخوش نہیں تھے؛ جہاں بھی اُن کا ذکر کیا ہے، اچھے الفاظ میں اُنھیں یاد کیا ہے اور ہر جگہ مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ قدسیہ محل [اور ملکۂ زمانی] سے متعلق جن جملوں کو طنزیہ مانا گیا ہے؛ بہ ظاہر وہ سرتاسر طنزیہ معلوم ہوتے ہیں، مگر مصنف کا یہ مقصود نہیں ہوگا۔ اُس نے تو تعریف کی ہے اور اپنے خیال میں بات کو بہتر بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ اُس کے طرزِ ادا کی خامی ہے کہ مفہوم میں ایسی پہلوداری جھلک اُٹھی ہے جس نے تعریض کو نمایاں کر دیا ہے۔ اِس کو یوں بھی دیکھیے کہ فسانۂ عبرت میں نصیر الدّین حیدر کے مرنے کے بعد ویرانی کا جو احوال لکھا ہے [ص ۱۸ سے ص ۲۲ تک] اُس میں بھی بعض جملوں پر یہ شک ہوسکتا ہے کہ یہ طنزیہ ہیں، لیکن ایسا ہے نہیں۔ یہ ساری عبارت تو اُن کی تعریف کو نمایاں کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ چوں کہ سرور کی اِس تحریر میں متعدد مقامات پر ایسی مثالیں موجود ہیں، اِس لیے یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ ہاں اگر نصیر الدّین حیدر کا کسی ایک جگہ بھی اُنھوں نے ذرا بھی بُرائی کے ساتھ ذکر کیا ہوتا، یا فسانۂ عبرت میں، جس میں اُن کے مرنے کے بعد اُن کا حال لکھا گیا ہے، ذرا بھی بُرائی کے ساتھ کچھ لکھا جاتا، تب بے شک یہ خیال قابلِ تسلیم ہوسکتا تھا۔

اور جس میں فارسی کی ایک رباعی بھی شامل ہے؛ اِس کو پڑھ ہنسی آتی ہے۔

یہ بھی اِسی قبیل کی بے امتیازی کا اثر ہے کہ دلّی کی شدید مخالفت کے باوجود کئی جگہ وہاں کی بعض خاص اشیا کا نام لینے لگتے ہیں، مثلاً: "تختِ طاؤس پر بیٹھا نذریں دیں" [ص ۲۱۳]۔ "تختِ طاؤس" دلّی کی خاص چیز ہے۔ یا جیسے نصیر الدین حیدر کی مدح کے آخر میں جو دعائیہ کلمات لکھے ہیں، اُن میں یہ جملہ بھی ہے: "جب تک گنگا جمنا میں پانی بہے، یہ خطۂ دل چسپ، فرح افزا آباد رہے"۔ یعنی وہ گومتی کو بھول گئے اور گنگا جمنا کو لے آئے۔ یہاں میر امّن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، جنھوں نے باغ و بہار میں گل کرسٹ کے لیے لکھا تھا: "ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے"۔ [میر امّن نے "گنگا جمنا بہے" لکھا ہے اور سرور نے "گنگا جمنا میں پانی بہے"۔ اِسی ایک جملے سے میر امّن کی "ہُنر مندی" کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سچ ہے: جائے اُستاد خالیست] - یا جیسے "ارجۂ محمّد شاہی" [ص ۱۳۷] جانِ عالم جو بندر کے قالب میں ہے، ایک جگہ کہتا ہے: "تیرھویں صدی ہے، نیکی کا بدلا بدی ہے" [ص ۲۳۶]۔ گویا پُرانے زمانے کی داستان کو اپنے زمانے میں کھینچ لائے ہیں۔

لفظی رعایت اور قافیہ بندی کے التزام نے بھی بہت سے مقامات پر عبارت کو بے کیف بنایا ہے۔ قافیہ بندی سرور کا ہُنر بھی ہے اور عیب بھی۔ جہاں جہاں سلیقے کے ساتھ وہ اِسے برت گئے ہیں، وہاں جملہ چمک اُٹھا ہے۔ جہاں حُسنِ تناسب اور سلیقہ کار فرما نہیں رہا ہے، وہاں بھدّا پن آ گیا ہے؛ میں اِس "بے ہُنری" کی صرف تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا:

① "دانتوں کی آب سے گوہرِ غلطاں بے آب ہو جاتا ہے۔ معشوقوں کا آن پر دانت ہے، دل و جان وارتے ہیں۔ جب نظر سے پنہاں ہوں، ڈاڑھیں مارتے ہیں" [ص ۱۷۲]۔ اگر صرف پہلے ٹکڑے (دانتوں کی آب سے گوہرِ غلطاں بے آب ہو جاتا ہے) پر قناعت کر لیتے تو جملہ اُن کے خاص انداز کی اچھی ترجمانی کرتا۔ ② "اگرچاہ کسی کو چاہے کی ہوئی، دودھ پیتے بچّے تک شیر چاہے موجود کر دی" [ص ۸۱]۔ ③ "موسم کی تاک میں، تاک کا، مستوں کی روش جھومنا؛ غنچۂ سربستہ کا منہ تاک تاک کے چومنا"۔ لفظی تکرار نے بیان کے حُسن کو ختم کر دیا ہے۔

سُرورؔ کا خاص انداز

جیسا کہ میں نے کہا ہے، قافیہ بندی سُرورؔ کی تحریر کا خاص جوہر ہے۔ اُن کا پسندیدہ انداز تو یہ ہے کہ کبھی ایک ٹکڑے اور کبھی دو یا زیادہ ٹکڑوں کے بعد وہ ٹکڑا آتا ہے جس پر قافیے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ایک ہی جملے میں [وہ چھوٹا ہو یا بڑا] قافیہ بندی کا حُسن موجود ہے، یا کئی جملے کسی فصل کے بغیر قافیہ بندی کی بہار دکھاتے ہیں۔ زیادہ مثالوں کی تو گنجایش نہیں، میں پہلے عبارت کا ایسا ٹکڑا پیش کرتا ہوں، جس میں یہ تینوں انداز موجود ہیں :

"یہاں نیند کہاں۔ جی سینے میں بے قرار، پہلو میں وہ خار۔ ہر دم آہِ سرد دلِ پُر درد سے بلند۔ چشمہ چشم جاری، فریاد و زاری دو چند۔ جگر میں سوزِ فراق نہاں، لب سے دودِ پنہاں عیاں، سینہ مجمر، دل و جگر سپند۔ یہ رباعی برزباں" [ص ۲۵]

پہلا ٹکڑا مسجّع بھی ہے اور مقفّا بھی اور خوب ہے۔ یہی ٹکڑا قافیہ بندی کی بنیاد بنتا ہے، یعنی آخری لفظ بنیادی قافیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد دو ٹکڑے آتے ہیں جو "بے قرار" اور "خار" کے واسطے سے ہم قافیہ ہیں، اِن درمیانی دو ٹکڑوں کے بعد تیسرا ٹکڑا آتا ہے جس میں پہلے ٹکڑے کی رعایت سے "بلند" قافیہ بندی کا حُسن چمکا رہا ہے۔ پھر دو ٹکڑے آتے ہیں، جن میں سے پہلے ٹکڑے میں بیان کا توازن "جاری" اور "زاری" کے واسطے سے برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک ٹکڑا آتا ہے جو "دو چند" پر ختم ہوتا ہے اور اِس طرح "بلند" سے قافیہ بندی کا پہلو روشن ہو اُٹھتا ہے۔ اِس کے بعد دو ٹکڑوں کے آخر میں "نہاں" اور "عیاں" آتے ہیں، جو بنیادی قافیے کی طرف سے توجہ کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ یہ بھی دیکھیے کہ اِس عبارت کے پہلے ٹکڑے "یہاں نیند کہاں" کی رعایت سے اِس ٹکڑے میں بھی وہی انداز موجود ہے "دودِ پنہاں عیاں" یعنی دونوں لفظ ہم قافیہ ہیں۔ یہ گویا وزن کو سنبھالنے اور بیان کے تناسب کو برقرار رکھنے کی نہایت کامیاب اور فن کارانہ کوشش ہے۔ اِن کے بعد پھر دو ٹکڑے آتے ہیں، یہ دونوں ہم قافیہ نہیں، مگر دوسرا ٹکڑا "سپند" پر ختم ہوتا ہے، جو عبارت کے چوتھے ٹکڑے کے "بلند" اور چھٹے ٹکڑے

"دوچند" کا ہم قافیہ ہے اور اس طرح بنیادی قافیے کا آہنگ ذہن کو تناسب اور توازن کے احساس سے خالی نہیں ہونے دیتا اور توجہ کو پوری طرح منعطف رکھتا ہے۔ اس عبارت کا اختتام جس ٹکڑے پر ہوتا ہے، وہ پہلے ٹکڑوں کی طرح دو اجزا کا مجموعہ نہیں، یہاں ایک ہی جز ہے، مگر اس کے آخر میں "برزباں" آتا ہے، جو پہلے ٹکڑے کے بنیادی لفظ "کہاں" کے آہنگ کو دہراتا ہے۔ اس ٹکڑے میں ایک ہی جز کا ہونا فن کارانہ اندازِ نگارش کا اچھا نمونہ ہے، کیوں کہ اس طرح ذہن میں ابتدائی اور بنیادی آہنگ کی جھنکار اچانک اور پورے دباو کے ساتھ گونج اٹھتی ہے۔ اگر یہاں بھی دو ٹکڑے ہوتے، تو یہ جھنکار اس قدر پُرشور نہ ہو پاتی، آہنگ تقسیم ہو کر کچھ ہلکا ہو جاتا۔

(۲) ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھیے: "اور تو اور شہدا پیر بخارا کا، ہُما سا سید الشہدا کا شیدا" [ص ۱۶]۔ "شُہدا"، "شُہدا"، "شیدا" میں صنعتِ تجنیس نے بیان کا جو حُسن پیدا کیا ہے، اُسے صحیح معنی میں اُسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب پڑھنے والا اس طرزِ ادا سے واقف ہو اور اُس کا ذہن اس کے پیدا کیے ہوئے حُسن اور لطف کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہو۔ یہ تبھی ہوگا جب کلاسیکی اسالیب سے واقفیت ہو۔ اس ایک ٹکڑے میں تجنیس کے تین روپ نمایاں ہیں، انھیں معلوم اور محسوس کیے بغیر اِس کو نہ تو پورے طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اِس سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ یہ احوال ہے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا، اِس سے صورتِ حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سرور کی نثر کا حُسن۔ مزید مثالوں کی یوں ضرورت نہیں کہ ایک تو یہاں گنجایش نہیں، دوسرے یہ کہ اِس اشارے کی روشنی میں پڑھنے والا خود ہی ایسے اجزا کو منتخب کرتا چلا جائے گا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اِس کتاب میں ایسے اجزا کی کمی نہیں جن میں مرصّع سازی کا کمال نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے، مگر بات وہی ہے کہ نگارش کے اِس انداز اور ترصیع کے اِس فن اور حُسن کو سمجھنے کے لیے ذہن کا تربیت یافتہ ہونا اور کلاسکی اسالیب سے واقفیت ضروری ہے؛ ورنہ یہ سب بے جان لفظوں کا کھیل نظر آئے گا۔

قافیۂ مکتوبی

اِس کتاب میں کئی مقامات پر یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ قافیہ بندی میں تقفیے کی بنیاد، معمول کے مطابق تلفّظ پر نہیں، کتابت پر نظر آتی ہے۔ اُردو میں ایک زمانے تک؛ بل کہ یوں کہیے کہ اِس صدی کے اوائل تک آخرِ لفظ میں واقع یائے معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا، یہی احوال سرور کے زمانے میں تھا۔ سرور نے ایسے الفاظ سے بھی قافیہ بندی کا فائدہ حاصل کیا ہے جو تلفّظ میں مختلف ہیں، مگر کتابت میں وہ اختلاف قطعیّت کے ساتھ نمایاں نہیں ہوتا۔ مثلاً اِس جملے کو دیکھیے: "شب کو نالہ تھا، دن کو زاری تھی؛ دن رات اُس پر سخت بھاری تھے" [ص ۱۵۴]۔ اِس میں "زاری تھی" اور "بھاری تھے" پر قافیہ بندی کی بنیاد ہے؛ تلفّظ دونوں جگہ مختلف ہے [تھی۔ تھے] مگر [پُرانے چلن کے مطابق] کتابت دونوں جگہ یکساں رہ سکتی ہے اور اِسی بنا پر اِن ٹکڑوں کو قافیہ بند کیا گیا ہے۔

یا جیسے یہ ٹکڑا: "پیڑی لذیذ، دبیز، بسی بسائی؛ پستہ و بادام کی ہلوائی؛ ہونٹ سے چبائے، دانت کا اُس پر تمام عمر دانت رہے، لگانے کی نوبت نہ آئے" [ص ۶]۔ یہاں بھی "ہوائی" اور "چبائے" اور "نہ آئے" میں یہی انداز کارفرما ہے۔ ایک اور جملہ: "ہر قدم پر کبکِ دری چال بھول کر جبینِ نیاز رگڑتے، شاخِ سرو شمشاد قامتوں کے روبہ رو نہ اکڑتی" [ص ۱۰]۔ یہاں بھی "رگڑتے" اور "اکڑتی" میں یہی صورت ہے۔ [پُرانی کتابت میں "رگڑتے، اکڑتے" یا "رگڑتی، اکڑتی" لکھا جاسکتا تھا اور لکھا جاتا تھا؛ اِسی پر تقفیے کی بنیاد ہے]۔

تقفیے کے علاوہ رعایتِ لفظی کے کام بھی یہ صورت آسکتی تھی، اِس کی مثال بھی موجود ہے۔ مطبعِ میر حسن کی تعریف میں سرور نے لکھا تھا: "ہر پتھر ہم سنگِ کوہِ طور ہے، کسی پر جلی لکھا، کوئی قلمِ موسے مسطور ہے[1]" [ح ص ۱۵]۔ یہاں "طور" کی رعایت سے "موسی" لایا گیا ہے۔ اِسے "قلمِ موسے"

---

[1] بعد میں سرور نے اِس جملے کو اِس طرح بدل دیا: "یہ صفا اگر بہ غور دیکھو تو قلمِ مو سے یہ لکھا ہے کہ ہر پتھر پر طور کا جلوہ ہے" [ص ۲۳]۔

یا "قلم موسیٰ" لکھا جائے، تو "موسیٰ" بھی پڑھنے میں آئے گا اور اسے "موسے" بھی پڑھا جاسکتا ہے [جس طرح پڑھنا چاہیے] یوں لفظی رعایت کا فائدہ حاصل ہوجائے گا اور بنا اِس رعایت کی اُسی اندازِ کتابت پر ہے۔ ضمیمۂ تشریحات میں ایسے مقامات کی نشان دہی کردی گئی ہے۔

خطّی نسخے

یہ عجیب بات ہے کہ مکمل کتاب کا کوئی ایسا خطّی نسخہ اب تک علم میں نہیں آسکا ہے جو عہدِ مصنّف کا لکھا ہوا ہو۔ اطہر پرویز مرحوم نے اپنے مرتبہ فسانۂ عجائب کے مقدّمے میں ایک خطّی نسخے کا حوالہ دیا ہے جو علی گڑھ یونی ورسٹی لائبریری میں ہے؛ لیکن بہ قولِ مرحوم: "اُس پر نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ سن [کذا] تحریر موجود ہے، جس سے اُس نسخے کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوسکیں" [ص ۴۸] اِس بنا پر اِس کو شمار میں نہیں لایا گیا۔[1]

اِس نایابی کی بہ ظاہر ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ سرور نے شرف الدّولہ کی مدح میں جو نثر لکھی ہے، اُس کے آخر میں یہ بھی لکھا ہے: "بندہ بھی خوش طالعی سے ملازمت کا شرف اندوز ہوا ... اِس کہانی کی بھی آبرو ہوئی۔ ہر ایک کو خواہش ہوئی، جست وجو ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لکھی نہ گئی، چھپنے کی صلاح ٹھہری" [ص ۳۵۲]۔ یعنی شرف الدّولہ سے وابستگی

---

[1] مرحوم نے اِسی ذیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ اِس نسخے کے "بیانِ لکھنؤ" میں "تقریباً پانچ چھے صفحے زیادہ ہیں، جو کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتے"۔ مرحوم نے اُن زائد صفحات کو اپنے نسخے میں شامل کرلیا ہے، لیکن میں نے ایک مجہول الاحوال نسخے کی بنیاد پر اِس اضافے کو قبول کرنا احتیاط کے منافی خیال کیا۔ مصنّف نے کئی بار اِس کتاب پر نظرِ ثانی کی ہے اور کسی نسخے میں ایسے کسی اضافے کا پتا نشان نہیں ملتا۔ مجھے ایسا کوئی قرینہ نظر نہیں آیا جس کی بنا پر میں اُس زائد حصّے کو شاملِ متن کرسکتا۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو [حیدرآباد] میں فسانۂ عجائب کا ایک خطّی نسخہ ہے، مگر وہ مطبوعہ نسخے کی نقل ہے [رجب علی بیگ سرور، ص ۱۴۰]۔

کے بعد اُن کی اِس کتاب کو شہرت ملی۔ اِسی نثر میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "برسوں یہ فسانہ کساد بازاریِ زمانہ سے تہ رہا، مشہور نہ ہوا" اور اِس سے بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شہرت کے ساتھ ہی جلد چھپنے کی صلاح ٹھہر گئی؛ یوں گویا اِس کی نقلیں تیار کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اِس کے باوجود، چند خطّی نسخے تو بہ ہر حال تیار کیے ہی گئے ہوں گے۔ ایک تو وہی نسخہ ہوگا جسے پہلی بار چھپنے کے لیے مطبع میں دیا گیا ہوگا۔ خیالِ غالب یہ ہے کہ یہ کتاب اُنھوں نے غازی الدّین حیدر اور نصیر الدّین حیدر کی خدمت میں بھی پیش کی ہوگی؛ [2] دو نسخے وہ ہو سکتے ہیں۔ پھر جب ۱۲۶۷ھ میں اُنھوں نے مطبعِ محمّدی کان پور میں چھپنے کے لیے اِس کتاب پر اِس طرح نظرِ ثانی کی کہ ایک نیا نسخہ بن گیا، تو ظاہر ہے کہ اُسے بھی مستقل اور مکمّل مسوّدے کی شکل میں دیا گیا ہوگا؛ کیوں کہ عبارتیں اِس طرح بدلی ہیں اور اِس قدر اضافے کیے ہیں کہ پچھلے مطبوعہ نسخے پر وہ سارا عمل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہ ہر صورت، یہ واقعہ ہے کہ اب تک اِس کتاب کے کسی ایسے خطّی نسخے کا پتا نہیں چل سکا ہے جو مکمّل کتاب پر حاوی ہو، عہدِ مصنّف کا مکتوبہ ہو اور جس سے متن کی تصحیح و ترتیب میں مدد لی جا سکے۔

مطبوعہ نسخے

یہ حصّہ چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں اُن نسخوں پر گفتگو کی جائے گی جن کو تصحیحِ متن کے سلسلے میں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ دوسری فصل میں اُن چند نسخوں کا مختصراً ذکر کیا جائے گا جو محض قدامت کی وجہ سے کسی حد تک قابلِ ذکر ہیں۔ تیسری فصل میں ایک جعلی نسخے کا ذکر آئے گا اور ایک ایسے نسخے کا، جسے سرور کا نظرِ ثانی کردہ نسخہ فرض کر لیا گیا ہے اور چوتھی فصل میں: "فسانۂ عجائب کا بنیادی متن"، پر مختصر سی گفتگو کی جائے گی۔

پہلی فصل ـــــ مصنّف کی زندگی میں یہ کتاب بارہا چھپی ہے، مگر ایسے سب نسخے ہمارے کام کے نہیں۔ سرور نے اشاعتِ اوّل کے بعد چار نسخوں پر باقاعدہ نظرِ ثانی کی ہے اور اِس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ اِس لحاظ سے اشاعتِ اوّل اور وہ چار نسخے جن پر نظرِ ثانی کی گئی ہے [کُل پانچ نسخے] یہ حیثیت رکھتے ہیں کہ متن اور اختلافِ متن کی بحث میں اُن کو لازماً پیشِ نظر

رکّھا جائے [ایک نسخہ یعنی نسخۂ د بحث طلب ہے، اِس لیے اُس کو اِس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔ تعارف اُس کا ضرور کرایا گیا ہے اور تعارف کے ذیل میں بحث طلب پہلو پر گفتگو کی گئی ہے]۔ دو نسخے اور ایسے ہیں جو بعض دیگر وجوہ سے [جن کی صراحت کی جائے گی] مرتّب کی نظر میں اِس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اُن کو بھی پیشِ نظر رکّھا جائے۔ اِس لحاظ سے کُل آٹھ نسخے ایسے ہوتے ہیں جن کا اصولی طور پر تعارف کرانا ضروری ہے۔

(ا) اب تک کی معلومات کے مطابق اِس کتاب کا پہلا مطبوعہ اڈیشن وہ ہے جو میر حسن رضوی کے مطبعِ حسنی سے ۱۲۵۹ھ میں شائع ہوا تھا۔ اِس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے: "اُفَوِّضُ امری اِلَی اللہِ اِنَّ اللہَ بَصیرٌ بالعبادِ / قصہ زبانِ اردو از تصنیفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بسرور مسمی / بفسانہ عجائب / دربیت السلطنت لکھنؤ بمحلۂ محمود نگر در ۱۲۵۹ھ / بمطبع حسنی میر حسن رضوی طبع گردید"۔ اِس کے آخر میں [سرور کی منظوم تاریخ کے بعد] شرف الدّولہ کی مدح میں ایک نثر[1] ہے جو صفحۂ آخر کی تیسری سطر تک ہے۔ اُس کے بعد خاتمۃ الطّبع کی یہ عبارت ہے: "للہ الحمد والمنۃ کہ نسخۂ عجیبہ و قصّۂ غریبہ جان عالم شاہزادہ بزبان اردو مسمّیٰ بفسانۂ عجائب از مصنّفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بسرور کہ بیک واسطہ سلسلۂ تلمّذ را[2] بجرات می رسانند در ماہ جمادی الثانیہ روز شنبہ تاریخ نہم ۱۲۵۹ ہجری در عہد دولت مہد امجد علی شاہ بادشاہ خلّد اللہ ملکہٗ و سلطانہ در مطبع حسنی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل در بیت السلطنت لکھنؤ بمحلۂ محمود نگر طبع نمود"۔ اِس کے بعد شیخ کرامت علی اظہر کا دو اشعار کا قطعۂ تاریخ طبع ہے۔ اُس کے نیچے جلی قلم سے "تمام شد" لکھا ہوا ہے۔ کُل صفحات ۲۱۰ ہیں۔ مسطر اُنیس ۱۹ سطری ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے اِسے بہت اچّھا اڈیشن کہا جا سکتا ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور رنگین جدول کشی کی گئی ہے۔ اغلاطِ

---

[1] یہ نثر اِس کتاب کے پہلے ضمیمے میں شامل کر لی گئی ہے۔ یہ نثر ح کے علاوہ، م، د اور نسخۂ مطبوعۂ مطبعِ کریم الدّین میں بھی موجود ہے۔ [2] کذا۔ لیکن م، د اور نسخۂ کریم الدّین میں یہاں "میر سوز" ہے۔

کتابت ہیں، لیکن کم۔

اِس اڈیشن کے سلسلے میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کہیں نہیں لکھا ہوا ہے کہ یہ اِس کتاب کا پہلا اڈیشن ہے؛ لیکن ۱۲۶۳ھ میں جب اِسی مطبعے سے یہ دوبارہ شائع ہوا، تو اُس پر "بارِ دوم" لکھا ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ ۱۲۵۹ھ والا یہ اڈیشن اِس مطبعے کا پہلا اڈیشن ہے۔ چوں کہ اِس سے پہلے کا کہیں کا چھپا ہوا کوئی اڈیشن اب تک سامنے نہیں آیا ہے، اِس لیے یہ مان لیا گیا ہے کہ اِس کتاب کا یہی پہلا اڈیشن[1] ہے۔ شرف الدّولہ کی مدح کی شمولیت بھی ایک قرینے کا حکم رکھتی ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ نسخہ چھپا ہے ۱۲۵۹ھ میں، یعنی عہدِ امجد علی شاہ میں۔ امجد علی شاہ ۵ ربیع الثّانی ۱۲۵۸ھ کو تخت نشین[2] ہوئے تھے، تو اِس لحاظ سے اِس میں شرف الدّولہ کی مدح شامل نہیں ہونا چاہیے تھی؛ کیوں کہ امجد علی شاہ اُن سے خوش نہیں تھے۔ تخت نشینی کے کم و بیش تین ماہ بعد امجد علی شاہ نے اُن کو وزارت کے عہدے سے الگ کر دیا تھا[3]۔ لیکن حقیقتاً اِس میں کچھ اشکال نہیں۔ عہدِ شرف الدّولہ میں بہ قولِ سرور اِس کتاب کے چھپنے کی صلاح ٹھہری تھی۔ جب یہ کتاب چھپنے کے لیے گئی ہوگی تو عہدِ محمد علی شاہ ہوگا اور اُس وقت شرف الدّولہ با اختیار تھے۔ کتابت اور طباعت میں وقت تو لگتا ہی ہے۔ چھپ کر آئی امجد علی شاہ کے عہد میں۔ یوں یہ مدحیہ نثر اِس نسخے میں[4] موجود رہی لیکن بعد کے نسخوں سے سرور نے اِس کو خارج کر دیا اور اِس کی اصل وجہ یہی ہوگی کہ وہ معتوب ہو چکے تھے اور بے اختیار؛ اور اب سرور اپنے کو اُن کے متوسّلین اور مدح طرازوں میں شمار کرانا نہیں چاہتے تھے کہ اِس سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ [مگر اِس احتیاط کے باوجود

---

[1] ل میں شامل عنایت حسین کے قطعے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی پہلا اڈیشن تھا۔ دیکھیے نسخۂ ل کا تعارف۔

[2] فسانۂ عبرت، ص ۵۵۔ [3] سرور نے فسانۂ عبرت میں ۱۲۵۸ھ کے بعض واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "نویں رجب پنجشنبے کا روز تھا کہ نواب شرف الدّولہ بہادر خانہ نشین۔۔۔ ہوئے" [ص ۶۰]۔ [4] یہ نثر [اب تک کی معلومات کے مطابق] چار نسخوں کے آخر میں شامل ہے: ایک تو یہی نسخہ، دوسرا مطبع مصطفائی [۱۲۶۲ھ] کا نسخہ، تیسرا مطبع حیدری [۱۲۶۲ھ] کا نسخہ اور چوتھا وہ نسخہ جسے مولوی کریم الدّین نے چھپایا تھا۔

(غالباً اِسی وجہ سے) نقصان پہنچا، اور وہ امجد علی شاہ کے زمانے میں پریشان حال رہے۔ بہ ظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ فسانۂ عبرت میں سرور نے امجد علی شاہ اور عہدِ امجد علی شاہ کی سخت مذمّت کی ہے]۔

املا کے لحاظ سے اِس نسخے میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جو پُرانی کتابوں میں بالعموم پائی جاتی ہیں، یعنی یاے معروف و مجہول اور ہاے ملفوظ و مخلوط میں عدمِ امتیاز، آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنّہ پر بھی ہر جگہ نقطے کا موجود ہونا، پیراگرافوں کا نہ ہونا (وغیرہ)۔ البتّہ ایک قابلِ ذکر بات اِس سلسلے کی یہ ضرور ہے کہ اِس نسخے میں ڈال اور ڑے کو اُسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح ہم آج کل لکھتے ہیں [یعنی ڈ، ڑ] مگر ٹ کی دو صورتیں ملتی ہیں: اکثر مقامات پر دو نقطوں پر ط ملتی ہے، جیسے: ٹپّہ، بیٹھہ کر؛ اور بعض جگہ صرف ط ملتی ہے، جیسے: کاٹی [ص ۲۷]۔ اِس نسخے کا نشان ح ہے۔

(۲) زمانی ترتیب کے لحاظ سے دوسرا قابلِ ذکر نسخہ وہ ہے جسے محمّد مصطفا خاں نے اپنے مطبعِ مصطفائی میں چھاپا تھا۔ اِس کے آخر میں جو عبارتِ خاتمتُ الطّبع ہے، اُس میں مرقوم ہے کہ: "اہتمام بندۂ خیر اندیش.... محمّد مصطفیٰ خاں ولد حاجی محمّد روشن خاں مرحوم سے بہ تصحیح عبد الغنی مطبع مصطفائی واقع محلّۂ محمود نگر زیر اکبری دروازہ من محلات بیت السلطنت لکھنؤ میں بیچ اکیسویں محرم ۱۲۶۲ھ ہجری کے حلّۂ انطباع پہنا"۔

اِس نسخے پر سرور نے نظرِ ثانی نہیں کی ہے اور ناشر نے اِس کا دعوا بھی نہیں کیا ہے[1]۔ شرفُ الدّولہ کی مدح اِس کے آخر میں شامل ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اِس اشاعت میں بَینَ السّطور بعض لفظوں کے اور عربی کی عبارتوں کے معنی لکھے گئے ہیں۔ بہ ظاہر یہ اضافہ

---

[1] اطہر پرویز مرحوم نے اپنے مرتّبہ نسخے کے مقدّمے میں لکھا ہے کہ مطبعِ مصطفائی کے نسخے پر بھی سرور نے نظرِ ثانی کی تھی [ص ۴۸]۔ اُن کی یہ راے مبنی ہے خاتمتُ الطّبع کی اُس عبارت پر جس کو اُنھوں نے اِس کے بعد نقل کیا ہے۔ [ص ۴۹ پر بھی اُنھوں نے یہی راے ظاہر کی ہے۔] مرحوم کو غلط فہمی ہوئی، جس عبارت کو اُنھوں نے مطبعِ مصطفائی کے حوالے سے نقل کیا ہے، وہ دراصل نسخۂ محمّدی کان پور کی ہے۔

اربابِ مطبع کی کارگزاری سے تعلق رکھتا ہے، اشاعتِ اوّل میں یہ چیز موجود نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ "بیانِ لکھنؤ" میں جہاں سرور نے لکھنؤ کے مطبعوں کا ذکر کیا ہے، وہاں اشاعتِ اوّل [ح] میں میر حسن رضوی اور اُن کے مطبع کی تعریف لکھی ہے؛ اِس نسخے میں اُس عبارت سے میر حسن کا اور اُن کے مطبع کا نام نکال دیا گیا ہے۔ یہ احتیاط ضرور کی ہے کہ اُس کی جگہ اپنے مطبع کا نام شامل نہیں کیا؛ بل کہ اُس عبارت کو اِس طرح بنا دیا ہے کہ لکھنؤ کے عام مطبعوں کی تعریف کا انداز آگیا ہے۔ اِسے تصرف کہا جائے گا۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ نسخۂ م کس نسخے پر مبنی ہے۔ میں نے نسخۂ ح سے جو تقابل کیا [یوں کہ اُس سے پہلے کا کوئی مطبوعہ یا خطّی نسخہ ہمارے سامنے موجود نہیں] تو یہ بات سامنے آئی کہ یہ طورِ عموم تو اِس کا متن ح سے مطابقت رکھتا ہے [اور غالباً اِسی بنا پر مدحِ شرف الدولہ بھی اِس میں شامل ہے] لیکن بعض مقامات پر اِس کا متن ح سے مختلف ہے اور اِس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناشر کے سامنے طبعِ اوّل [ح] کے علاوہ کوئی اور نسخہ بھی تھا [ایک سے زیادہ نسخے بھی ہو سکتے ہیں] مختلف مقامات پر اختلافِ متن کا احوال ایک جیسا نہیں، مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مصحح نے بہ طورِ خود تصحیح کی ہے۔ کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی دوسرے نسخے کے متن کو ترجیح دی گئی ہے؛ اور کئی مقامات پر یہ دل چسپ صورت سامنے آتی ہے کہ اِس نسخے میں جو متن ہے، وہ ح سے مختلف ہے، لیکن بعد کی اُن اشاعتوں سے مطابقت رکھتا ہے جن پر مصنف نے نظرِ ثانی کی تھی؛ اور اِس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ ناشر کے سامنے کوئی ایسا نسخہ بھی تھا جس پر مصنف نے کچھ مقامات پر تصحیح و ترمیم کی تھی، اور یہ بہت اہم بات ہے۔ بعض مثالوں سے اِن صورتوں کی وضاحت ہو سکے گی۔ صفحات نمبر زیرِ بحث نسخۂ مصطفائی کے ہیں:

① ص ۶۶، س ۵: "تاجِ خسروی بر سر۔" اِس میں "خسروی" پر ن لکھ کر حاشیے میں "خسروانہ" لکھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دو نسخے سامنے ہیں، ایک میں خسروی ہے اور ایک میں خسروانہ۔ ح میں "خسروانہ" ہے، یعنی یہاں ح کے متن کو قبول نہیں کیا گیا [بعد کے نسخوں کا متن ح کے مطابق ہے، یعنی اُن میں "خسروانہ" ہی ہے، ہمارے نسخے میں بھی یہی ہے (ص ۱۱۲)]

② ص ۱۷، س ۸ : "تیر سے چھد کر جہنّم واصل وہ حواصل ہوگیا ہے۔" ح میں "وہ حواصل" موجود نہیں، اُس میں یوں ہے : "جہنّم واصل ہوگیا ہے" [ح ص ۷۶]۔ ض اور ف میں "جہنّم واصل وہ حواصل ہوگیا ہے" ہے [ض ص ۷۶۔ ف ص ۷۴]۔ یعنی اِس مقام پر م میں جو متن اختیار کیا گیا ہے، وہ وہی ہے جو بعد کے اُن دو نسخوں میں ہے جن پر مصنّف نے نظرِ ثانی کی تھی [ک میں سرور نے اِس کو یوں بنایا تھا: جہنّم واصل وہ الّو کا پٹّھا حواصل ہوگیا ہے" (ص ۴۹) اِسی کو ل میں برقرار رکھا۔ ہمارے نسخے میں یہ ص ۱۲۰ پر ہے]۔ ③ ہمارے نسخے میں ص ۱۲۹ کے آخر سے ایک غزل شروع ہوتی ہے، جس کے شروع میں "شاعر" کے نام کی جگہ "مؤلّف" لکھا ہوا ہے۔ ض [یعنی مصنّف کے نظرِ ثانی کیے ہوئے پہلے نسخے] میں بھی یہاں "مؤلّف" موجود ہے، مگر ح میں اِس مقام پر کوئی لفظ نہیں [ص ۸۲] اِس کے برخلاف م میں "مؤلّف" لکھا ہوا ہے [ص ۷۷]۔ مطلب یہی نکلا کہ ناشر کے سامنے کوئی ایسا نسخہ بھی تھا جس کا متن اِس مقام پر ح سے مختلف تھا اور اُن نسخوں سے مطابقت رکھتا تھا جن پر مصنّف نے نظرِ ثانی کی ہے۔
④ غازی الدّین حیدر کی مدح میں ح میں ایک ٹکڑا یہ ہے : "بلّی کی جبلّی یہ کہ کبوتر سے ہراساں۔" م میں بھی اِسی طرح ہے، جب کہ بعد کے نظرِ ثانی شدہ نسخوں [بہ شمولِ ل] میں "بلّی کی عادتِ جبلّی" ہے۔ یعنی اِس مقام پر م کا متن ح کے عین مطابق ہے۔ ⑤ اِسی بیان میں ح میں ایک جملہ یوں ہے : "دودِ دلِ اندوہ ناک روزنِ ہر خانے سے مسدود۔" م میں بھی "ہر خانے سے" ہے، جب کہ بعد کے نسخوں میں "ہر خانہ" سے" ہے۔ یہاں بھی ح اور م میں مطابقت ہے، جیسے ح کے متن کی نقل کی گئی ہو۔ ⑥ ہمارے نسخے میں ص ۱۷۱ پر "مؤلّف" کا ایک شعر یوں ہے :

مر کے حاصل کیا فرقت ہی میں تو نامِ وصال — جان دی ہم نے، مٹایا ہے خلش ہجراں کا

اِس کتاب کے اور سب نسخوں [ح، ض، ف، ک، ل، ن] میں یہ شعر اِسی طرح ہے؛ مگر م میں آخری جُز یوں ہے : "مٹایا خلشِ ہجراں کو" [ص ۱۰۰] اور صاف ظاہر ہے کہ اِس مقام پر مصحّح نے، یہ خیال کر کے کہ لفظِ "خلش" تو مونث ہے، تصحیح سے کام لیا اور

آخری ٹکڑے کو اس طرح بدل دیا کہ تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ یہ کھلی ہوئی تحریف ہے۔ ⑦ ہمارے نسخے میں ص ۸۰،۳۰ پر عربی کا ایک ٹکڑا یوں ہے: القلیل کالمعدوم۔ اور سب نسخوں میں بھی یہی ہے، جب کہ م میں "النادر کالمعدوم" ہے [ص ۱۷۳]۔ یہاں بھی مصحح کے قلم کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ اصلاً مثل اسی طرح ہے۔ یعنی مصحح نے ایک غلطی کی بہ طورِ خود تصحیح کی ہے۔ ⑧ ہمارے نسخے میں ص ۹۱ پر ایک شعر ہے:

لطفِ شبِ مہ اے دل اُس دم تجھے حاصل ہو — اک چاند بغل میں ہو، اک چاند مقابل ہو

ح میں بھی اور ض، ف اور ل میں [یعنی مصنف کے آخری نظرِ ثانی کردہ نسخے میں بھی] یہ شعر "بقا" سے منسوب ہے۔ ک میں "بقا" کی جگہ "لااعلم" لکھا ہوا ہے۔ صرف م میں "ہوس" لکھا گیا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ یہ شعر ہوس کا ہے۔ یہاں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصحح نے ح میں منقول "بقا" کو قبول نہیں کیا، بل کہ اپنی طرف سے اُس شاعر کا نام لکھا ہے، واقعتاً یہ شعر جس کا ہے[1]۔ [اب اسے آپ تصحیح کہہ لیجیے یا تحریف]۔ ⑨ آخرِ کتاب میں نوازش کا جو قطعۂ تاریخ ہے، ح میں اُس کا دوسرا شعر یوں ہے: سرورِ این مثنوی چوں کرد ایجاد۔ [ظاہر ہے کہ "مثنوی" یہاں قطعاً بے محل ہے] نسخۂ مصطفائی میں یہ مصرع اِس طرح ملتا ہے: سرورِ این داستاں چوں کرد ایجاد[2]۔ [یہ غالباً اصلاح ہے]۔

---

[1] چوں کہ اور نسخوں کے ساتھ ساتھ نسخۂ ل میں بھی "بقا" ہے، اِس لیے ہم نے بھی [اصولِ تدوین کے مطابق] متن میں اِسی کو برقرار رکھا ہے، مگر ضمیمۂ انتسابِ اشعار میں [ص ۱۸۱ پر] یہ صراحت کر دی ہے کہ یہ شعر دراصل ہوس کا ہے۔

[2] اِس مصرعے کا اختلاف درج کیا جاتا ہے۔ ح، د، ک: سرورِ این مثنوی چوں کرد ایجاد۔ م: سرورِ این داستاں چوں کرد ایجاد۔ ض، ف، ل، ن: سرورِ این قصہ را چوں کرد ایجاد۔
اِس قطعے کا آخری مصرع بھی توجہ طلب ہے، جس میں مادۂ تاریخ نظم کیا گیا ہے، پورا شعر یوں ہے:

بجستم سالِ تاریخش نوازش — فلک این گلستانِ بے خزاں داد

میرا خیال ہے کہ اِنھی چند مثالوں سے صورتِ حال کی وضاحت ہوگئی ہوگی۔ میری جمع کی ہوئی ابھی اور دس بارہ ایسی مثالیں باقی ہیں، لیکن طوالت کے خیال سے انھیں شاملِ بحث نہیں کیا گیا ـــــ کُل صفحات ۱۹۸ ہیں مسطر اکیس[۲۱] سطری ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ کے لحاظ سے اِسے بلا تکلّف اعلا درجے کا اڈیشن کہا جا سکتا ہے۔ املا کے لحاظ سے وہی احوال ہے جس کی وضاحت نسخۂ ح کے ذیل میں کی جا چکی ہے، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ اِس میں ٹ کو ہر جگہ ٹ لکھا گیا ہے ـــــ جو تفصیل پیش کی گئی، اُس کے لحاظ سے یہ نسخہ بجاے خود اہمیّت رکھتا ہے اور اسی لیے اِسے قابلِ ذکر نسخوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔

(۳) ۱۲۶۲ھ کا چھپا ہوا ایک مجموعہ ہے دو کتابوں پر مشتمل : حوض میں دیوانِ جانصاحب ہے اور حاشیے پر فسانۂ عجائب۔ دیوانِ جانصاحب کے اختتام پر مطبعے کی طرف سے جو نثرِ خاتمہ لکھی گئی ہے، اُس میں یہ مرقوم ہے کہ جانصاحب کے دیوان کا یہ نسخہ "سید علی الزماں صاحب" کی کوشش سے ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۶۲ھ کو "در رکاب گنج جدید باہتمام کارپردازان مطبع حیدری" چھاپا گیا۔

اِس کتاب کے دو نسخے میرے سامنے ہیں۔ اِن میں سے ایک نسخہ [جو عزیز مسعود صاحب کا عطیّہ ہے] ناقص الاوّل بھی ہے اور ناقص الآخر بھی۔ دوسرا نسخہ [جو پروفیسر محمود الٰہی کے توسّط سے حاصل ہوا ہے] مکمّل ہے، مگر ذرا سی خرابی اُس میں یہ ہے کہ آخری صفحے کے حاشیے کا بایاں گوشہ تھوڑا سا غائب ہے، اور اُسی جگہ عبارتِ خاتمۃ الطبع مرقوم تھی؛ مگر اِس عبارت کے بعض ٹکڑے پڑھنے میں آجاتے ہیں۔ البتّہ تاریخ کی جگہ صرف "ربیع ۱۱"

← اِس میں مادّۂ تاریخ "گلستانِ بے خزاں داد" ہے۔ بہ قولِ ڈاکٹر گیان چند جین : "جملے کے ایک جزو کو تاریخ کا مادّہ بنانا نہایت خام کارانہ ہے۔ یا تو پورا مصرع مادّۂ تاریخ ہو، یا محض گلستانِ بے خزاں"۔ [اُردو کی نثری داستانیں، ص ۵۹] اور یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ زبان، بیان، تاریخ؛ ہر لحاظ سے یہ قطعۂ تاریخ "بغایت پست" کے ذیل میں آتا ہے۔

باقی رہ گیا ہے۔ اِسے "ربیع الثّانی" مانا جا سکتا ہے؛ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ جس قدر عبارت پڑھنے میں آتی ہے، وہ "ربیع ا" کے سوا، وہی ہے جو نسخۂ ح میں ہے۔

اِس نسخے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں غازی الدّین حیدر کا نام موجود نہیں؛ اِن کے بجائے "ابوالظفر مصلح الدّین ثریا جاہ سلطان عادل محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی" لکھا گیا ہے۔ مدحیہ عبارت کچھ نئی ہے، کچھ وہی ہے جو ح میں ہے۔ اُن کی مدح میں یہ ذیلِ دین داری وعدالت یہ بھی لکھا گیا ہے: "اکل حلال کا ہر دم خیال ہے .... عدل مزاج میں ایسا ہے کہ کسی اور کا اعتبار نہ کیا، مجتہد کو عدالت کا مختار کر دیا"۔ یہ بیان امجد علی شاہ کے حالات سے مطابقت رکھتا ہے [کہ اُنھیں مذہبیّت میں غلو تھا] ۔ شروعِ کتاب میں جہاں بادشاہِ وقت کی مدح تھی، وہاں سے تو غازی الدّین حیدر کا نام نکال دیا گیا، لیکن آگے چل کر وہ عبارت بلفظہٖ موجود ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ "یہ فسانہ بہ عہدِ دولتِ شاہ غازی الدّین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بعصر سلطان ابن سلطان ابوالنّصر نصیر الدّین حیدر دام ملکہ ہوا"۔ نصیر الدّین حیدر کی مدح میں اِس مقام پر جو عبارت ح میں ہے، وہ سب اِس میں بھی بعینہٖ موجود ہے [اور نصیر الدّین حیدر کے لیے "دام ملکہ" بھی موجود ہے!] ۔ اور ہاں، اِس نسخے کے سرورق پر یہ بھی مرقوم ہے کہ یہ کتاب "بہ تصحیحِ مصنّفان" چھپی ہے؛ یعنی سرورؔ نے اِس پر نظرِ ثانی کی ہے۔

امجد علی شاہ سے متعلق عبارت دیکھ کر تو یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اِس نسخے پر مصنّف نے نظرِ ثانی کی ہے اور یہ تبدیلی کی ہے کہ پچھلے بادشاہ، یعنی غازی الدّین حیدر کا نام نکال کر اپنے زمانے میں موجود بادشاہ کا نام شامل کر دیا۔ بہ ظاہر اِس میں کوئی اُلجھن نظر نہیں آتی؛ لیکن میرے ذہن میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: ① مدحِ امجد علی شاہ شامل کرنے کا بہ ظاہر مطلب تو یہ ہوا کہ مصنّف اِسے نئے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہ خیال درست ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ اِس میں مدحِ شرف الدّولہ کیوں شامل کی گئی؛ جب کہ یہ بات معلوم ہے [اور معلوم تھی] کہ امجد علی شاہ اُن سے زمانۂ ولی عہدی ہی سے خوش نہیں تھے اور بادشاہ ہوتے ہی تین ماہ کے اندر اُن کو وزارت سے الگ

کر دیا تھا۔ کتاب چھپی ہے ۱۲۶۲ھ کے وسط میں، جب کہ شرف الدّولہ اس سے بہت پہلے، یعنی رجب ۱۲۵۸ھ میں وزارت سے الگ کیے جاچکے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کتاب اُس مجلّد کے حاشیے پر چھپی ہے۔ [حوض میں دیوانِ جانصاحب ہے، اور ظاہری نظر میں وہ اصل چیز ٹھہرتا ہے] جو کتاب بادشاہِ وقت کی خدمت میں پیش کرنے کی خاطر مرتب کی جائے، اُس کو چھاپا جائے ایک دوسری کتاب کے حاشیے پر! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ حاشیے پر کتابیں چھپتی رہی ہیں، لیکن یہاں صورتِ حال اُس عمومی روش سے مختلف ہے، کہ اِس کتاب میں بادشاہِ وقت کی مدح خاص طور پر شامل کی گئی ہے؛ یوں اصل کتاب تو یہ تھی، مگر اُس کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔ ایسی کتاب بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت سرور تو کیا، کوئی اُن سے بڑا شخص بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اور پھر یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ سرور کی روش یہ رہی ہے کہ جب اُنھوں نے نظرِ ثانی کی ہے؛ تو جس مطبع میں اُسے چھپنا تھا، نثرِ خاتمہ میں اُس کا نام ضرور شامل کیا ہے، اور اُسی نثر میں اِس کی بھی صراحت کی ہے کہ میں نے اس نسخے پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اِس نسخے میں اِن میں سے کوئی چیز موجود نہیں۔ نسخۂ ح [نیز دیگر نسخوں] میں جہاں لکھنؤ کے مطبعوں کا بیان ہے اور اُس کے ذیل میں میر حسن رضوی کا اور اُن کے مطبع کا بیان ہے، یہ پورا حصّہ اِس نسخے میں موجود نہیں۔ حد یہ ہے کہ مطبع کی طرف سے جو نثرِ خاتمۃ الطبع لکھی جاتی ہے، وہ بھی تاریخ کے ایک دو لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ اصلاً وہی ہے جو نسخۂ ح میں ہے۔

یہ ساری باتیں ذہن میں شدّت کے ساتھ یہ خیال پیدا کرتی ہیں کہ یہ نسخہ سرور کا مرتب کیا ہوا اور تصحیح کیا ہوا نہیں۔ بس ایک تاویل ذہن میں آتی ہے۔ جو عبارتیں ح کے مقابلے میں بدلی ہوئی ہیں یا زائد ہیں، وہ لکھی ہوئی تو سرور کی معلوم ہوتی ہیں؛ شاید یہ ہوا ہو کہ محمد علی شاہ کے مرتے ہی سرور کو اپنے مستقبل کا خیال آیا ہو؛ اس بنا پر خاص کر کہ وہ شرف الدّولہ کے متوسّلین میں تھے، جن سے نیا بادشاہ خوش نہیں تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی اُنھوں نے نسخۂ ح میں جلدی جلدی بعض تبدیلیاں کی ہوں اور نئے بادشاہ کی

مدح شامل کی ہو۔ ابھی یہ نسخہ چھپنے کی منزل سے گزرا نہ ہوگا کہ شرف الدّولہ کا ستارہ گردش میں آگیا اور سرورؔ بھی اُس کی لپیٹ میں آگئے۔ ظاہر ہے کہ اب اُس نئے نسخے کی گنجایش باقی نہیں رہی تھی، اِس لیے سرورؔ نے اُس کے چھپوانے کا ارادہ ملتوی کر دیا یا یوں کہیے کہ ختم کر دیا۔ مسودہ پریس میں رہ گیا، اور یوں دو تین سال کے بعد مطبع نے اپنی تجارتی اغراض کے تحت بہ طورِ خود اُس مسوّدے کو چھاپ لیا۔ یہ محض قیاس ہے لیکن بعید از امکان نہیں اور اِس نسخے کو غیر مشکوک ماننے کے لیے ایسے ہی کسی امکان کو ماننا لازم ہے۔ یہ بات بہ ہر حال کہی جا سکتی ہے کہ سرورؔ نے اِس پر (دوسرے نسخوں کی طرح) باضابطہ نظرِ ثانی نہیں کی ہے۔ برق کے ذکر میں بعض الفاظ کا اضافہ ملتا ہے جو توجہ طلب ہے۔ اختلافِ نسخ کے ضمیمے میں ساری تبدیلیوں اور اضافوں کو دیکھا جا سکتا ہے ــــــــــــ

اِس نسخے کا نشان د ہے۔

(۴) زمانی ترتیب کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر وہ نسخہ آتا ہے جس پر سرورؔ نے باضابطہ نظرِ ثانی کی تھی۔ سالِ طبع: ۱۲۶۳ھ۔ یہ نسخہ میر حسن رضوی کے مطبعِ حسنی ہی کا چھپا ہوا ہے۔ سرورق پر "بار دوم" لکھا ہوا ہے [یہ پہلی بار ۱۲۵۹ھ میں وہیں سے شائع ہوا تھا]۔ اِس کے آخر میں ص ۲۰۷ پر سرورؔ کی لکھی ہوئی نثر موجود ہے، جس میں نظرِ ثانی کی صراحت کی گئی ہے [یہ نثر ضمیمہ ۱ میں شامل ہے]۔ اِس نثر کے آخر میں سرورؔ کی ۱۲۲۶ (ھ) کی مُہر بھی ہے جس پر "مرزا رجب علی" لکھا ہوا ہے۔ آخری صفحے پر غلط نامہ ہے۔ کُل صفحات ۲۰۸۔ مسطر انیس ۱۹ سطری۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔ یہ کتاب مضبوط بانسی کاغذ پر چھپی ہے، جس میں اب تک کرارا پن موجود ہے اور سیاہی کی چمک اب تک ماند نہیں پڑی ہے۔ اِس میں شرف الدّولہ کی مدح شامل نہیں۔ ح کے مقابلے میں لفظی اصلاح اور ترمیم جگہ جگہ ملتی ہے۔ یہ اڈیشن اِس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ بعد کے اکثر مطبوعہ اڈیشن اِسی نسخے پر مبنی ہیں۔ آخر میں دو قطعاتِ تاریخِ طبع [مولوی کرامت علی اور مولوی قدرت احمد کے] شامل ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۲۶۲ھ میں شائع ہوا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اِس نسخے کے سرورق پر سالِ طبع ۱۲۶۲ھ مرقوم ہے۔ دو صورتیں

ہیں: یا تو یہ مان لیا جائے کہ ۱۲۶۲ غلطیِ کتابت ہے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ ۱۲۶۲ھ میں کتابت اور طباعت کا کام شروع ہوا ہوگا۔ سرورق کی کتابت شروع ہی میں ہوگئی اور یوں اُس پر ۱۲۶۲ھ مرقوم ہوا۔ طباعت ختم ہوئی ۱۲۶۳ھ میں، اور یوں قطعاتِ تاریخ طبع ۱۲۶۳ھ کے ہیں۔ یہی آخری صورت میرے نزدیک مرجّح حیثیت رکھتی ہے [اِس لیے کہ اِس قسم کی بہت سی مثالیں اور بھی ملتی ہیں، مثلاً اِسی کتاب کا وہ نسخہ جو ۱۲۸۰ھ کا چھپا ہوا ہے اور جس کو ہم نے بنیاد بنایا ہے۔ تفصیل اِس نسخے کے تعارف کے ذیل میں۔ یا مثلاً باغ و بہار کا نسخۂ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، کہ اُس کے سرورق پر سالِ طبع ۱۸۰۲ء مندرج ہے اور آخری صفحے پر ۱۸۰۴ء مرقوم ہے]۔

ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اِس نسخے میں ص ۱۷۵ پر ایک جملہ یوں ہے: "قمری کی کوکو متجسّس کی جان کھوتی ہے"۔ متن میں "متجسّس" پر ن لکھ کر، حاشیے میں اُس کا بدل "جویا" لکھا گیا ہے۔ ح، ف، م میں اِس کی جگہ "متلاشی" ہے اور ک میں "تلاشی" ہے۔ یعنی "جویا" اِن میں سے کسی نسخے میں نہیں۔ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ نکلا کہ پریس میں اِس کتاب کا کوئی ایسا نسخہ بھی موجود تھا جس میں اِس مقام پر "جویا" لکھا ہوا تھا۔ مصنف نے تو اِس اختلافِ نسخ کی نشان دہی کی نہیں ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ کام پریس کے مصحح کا ہے۔ بہرحال، اِس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مطبعِ حسنی میں اِس کتاب کا کوئی ایسا نسخہ بھی موجود تھا جو اِن مذکورہ نسخوں سے مختلف تھا۔

اِس نسخے میں املا کی وہی سب خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کا اِس سے پہلے ح کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے، البتہ اِس نسخے میں [ڈ اور ڑ کی طرح] ٹ کو بھی ہر جگہ اُسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح آج ہم لکھتے ہیں، جیسے: بیٹھا، ٹوٹا۔

(۵) ترتیب میں اِس کے بعد وہ نسخہ آتا ہے جو ۱۲۶۷ھ میں مطبع محمدی کان پور میں چھپا تھا۔ اِس کے آخر میں سرور کی لکھی ہوئی نثر شامل ہے جس میں اُنھوں نے یہ صراحت کی ہے کہ مولوی محمد حسین کی فرمایش پر "نیاز مندِ قدیم نے کوششِ عظیم سے ملاحظہ کرکے جہاں موقع پایا کچھ بڑھایا" [یہ نثر ضمیمہ ۱ میں شامل ہے]۔ آخر میں پریس کی طرف سے خاتمۃ الطبع

کی عبارت ہے: "..... ربیع الآخر کی بائیسویں ۱۲۶۷ھ ہجری کو سرمۂ سواد طبع آنکھوں میں لگایا اور شہر کان پور بھیر محال سیتا رام ٹھٹھیرے کے گھر میں نیا جلوہ دکھایا۔" کل صفحات: ۱۳۸۔ مسطر تیئیس[۲۳] سطری ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے اور کاغذ باریک اور مضبوط ہے۔

اِس نسخے میں سرور نے اتنی زیادہ ترمیمیں اور تبدیلیاں کی ہیں کہ یہ ایک طرح سے نیا نسخہ بن گیا ہے۔ خاص کر مقفا جملوں اور ٹکڑوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ انگریز سوداگر کی ضمنی کہانی میں بہت زیادہ تبدیلیاں ہیں، لیکن یہ دل چسپ بات ہے کہ اِس نسخے نے قبولِ عام نہیں پایا۔ انتہا یہ ہے کہ خود سرور نے بعد میں اِسے نظر انداز کر دیا اور بعد کے نسخوں پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے نسخۂ ض کو بنیاد بنایا۔ ک میں بہت سے لفظوں کے معنی مرقوم ہیں۔ دوسرے نسخوں میں تو لفظوں کے معنی بین السطور ہیں، مگر اِس نسخے میں حاشیے پر ہیں اور ان کی تعداد دوسرے نسخوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض لفظوں کے ذیل میں حرکات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ اہم بات ہے۔ میں بعض مثالیں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں:

ص ۴: "سنکرنیں بالضم تمرہ فروش" — "مگہیا شہر کا نام ہے عظیم آباد کے قریب اور دھوبا بندیل کھنڈ میں ہے پان خوب ہوتے ہیں۔" ص ۸: "با ہر بندو مردمان دیہ" — "منجی اصلاح قمار بازاں خالی رفتن۔"

ص ۱۲۳ کے حاشیے پر "گلِ پیادہ" کے معنی غیاث اللّغات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ اِس نسخے میں لکھنؤ کے مطبعوں کا بیان شامل نہیں، وہ پورا حصّہ نکال دیا گیا ہے۔ اُس کی جگہ پر یہ کیا ہے کہ آخرِ کتاب میں جو نثرِ خاتمہ لکھی ہے، اُس میں مطبعے کا اور صاحبِ مطبع کا ذکر کر دیا ہے ——— اِس نسخے کا نشان ک ہے۔

(۶) ۱۲۷۶ھ میں مولوی محمد یعقوب انصاری کے مطبعِ افضل المطابع محمدی کان پور سے اِس کتاب کا ایک اڈیشن شائع ہوا، جو سرور کا نظرِ ثانی کردہ تھا۔ اِس کے آخر میں سرور کی لکھی ہوئی نثر شامل ہے جس میں اِس کی صراحت کی گئی کہ مولوی یعقوب انصاری کی فرمایش پر اُنھوں نے اِس پر مکمل نظرِ ثانی کی ہے [یہ نثر ضمیمہ ۱ میں شامل ہے]۔

کُل صفحات ۱۳۰ مسطر پچیس ۲۵ سطری۔ کتابت، طباعت، کاغذ ہر چیز معمولی ہے۔ املا کے لحاظ سے اِس کا وہی احوال ہے جس کا حوالہ نسخۂ ک کے ذیل میں دیا گیا ہے [یعنی اِس میں بھی "ٹ" کے بجائے صرف ٹ ملتی ہے] ۔ اِس اشاعت میں لکھنؤ کے مطبعوں کی تعریف کے ذیل میں مطبع محمد یعقوب انصاری کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ یہ اشاعت اُن کے کان پور والے مطبعے میں چھپی ہے۔ اِس کو اِس طرح نباہا کہ "سابق ازیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا" لکھا اور پھر "العاقل تکفیہ الاشارہ" لکھ کر گویا یہ کہا کہ اب کان پور میں ہے تو کیا، پہلے تو لکھنؤ میں تھا۔ دراصل اِس جگہ پہلے [نسخۂ ح اور نسخۂ ض میں] مطبع میر حسن رضوی کی تعریف تھی اور وہ واقعتاً لکھنؤ میں تھا۔ اِس اشاعت میں عبارت تو وہی رہنے دی، صرف نام بدل دیے اور اِس سے جو اُلجھن پیدا ہو سکتی تھی، اُس کو دفع کرنے کے لیے "سابق ازیں" اور "العاقل ...." کے پیوند لگائے گئے ———
اِس نسخے کا نشان ف ہے۔

(۷) سرور کا آخری بار نظرِ ثانی کیا ہوا نسخہ وہ ہے جسے مولوی محمد یعقوب انصاری ہی نے ۱۲۸۰ھ میں اپنے مطبع میں چھاپا تھا۔ اِس نسخے کے آخر میں سرور کی لکھی ہوئی نثرِ خاتمہ ہے، جس میں اُنھوں نے یہ صراحت کی ہے کہ میں نے اِس نسخے پر نظرِ ثانی کی ہے۔ عبارت کے خاتمے پر سرور کی مُہر ہے، جس پر "مرزا رجب علی بیگ" مرقوم ہے۔ [یہ نثرِ خاتمہ ضمیمۂ ۱ میں شامل ہے]۔ یہ نسخہ اِس قدر کم یاب ہے کہ اِس کی خبر کسی کو تھی ہی نہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ذخیرۂ قاضی عبدالودود میں اچانک یہ نسخہ سامنے آ گیا اور تب پہلی بار میں اِس کے وجود سے باخبر ہوا، ورنہ اُس وقت تک ہم سب یہی سمجھتے تھے کہ مصنف کا آخری بار نظرِ ثانی کیا ہوا نسخہ وہ ہے جو ۱۲۷۶ھ میں افضل المطابع میں چھپا تھا [یعنی نسخۂ ف]۔ کُل صفحات : ۱۳۵ مسطر: ستائیس ۲۷ سطری۔ خصوصیاتِ املا کے لحاظ سے اِس کا بھی احوال وہی ہے جس کی صراحت نسخۂ ف کے تعارف میں کی گئی ہے۔ اغلاطِ کتابت اِس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اِس کے سرورق پر سالِ طبع "۱۲۷۹" مرقوم ہے، مگر آخر میں سرور کی لکھی ہوئی

جونثرِ خاتمہ ہے، اُس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ ۲۷ رمضان ۱۲۸۰ھ کو افضل المطابع میں چھپ کر منظورِ نظر ہوا۔ سرورق پر مندرج سنۂ طباعت میں اور اِس نثر میں بیان کردہ سنۂ طباعت میں جو اختلاف ہے، اُس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف نسخۂ ض کے تعارف میں توجہ مبذول کرائی جا چکی ہے۔

سرورق پر یہ مرقوم ہے کہ: "در مطبع خاص افضل المطابع رونق طبع یافت۔" سرور کی نثرِ خاتمہ میں سرور نے بھی اِسی مطبع کی نشان دہی کی ہے: "شہر لکھنؤ محلہ فرنگی محل افضل المطابع میں چھپ کر منظورِ نظر ہوا۔" لیکن مطبع کی طرف سے جو نثرِ خاتمہ شامل کی گئی ہے، اُس میں یہ مرقوم ہے کہ: "باستشارۂ بحرِ نوال جامع ہر کمال ارسطو فطرت والا دودمان نواب سید فدا حسین خاں سلمہ المنان مطبع نجم العلوم لکھنؤ میں.... آب و رنگ تازہ پایا.... ارباب ہمم پیشہ سے امید ہے کہ جس قدر نسخے مطلوب ہوں مطبع نجم العلوم سے طلب فرمائیں۔" ـــــ مطبع افضل المطابع اور مطبع نجم العلوم، دونوں کے مالک (غالباً) مولوی محمد یعقوب انصاری[1] ہی تھے۔ اصل کتاب ص ۱۳۳ کے وسط میں ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد سرور کی لکھی ہوئی نثر ہے جو ص ۱۳۴ کے وسط میں ختم ہوتی ہے۔ اُس کے بعد مطبع کی طرف سے نثرِ خاتمہ ہے جو اِس صفحے کی آخری سطر پر ختم ہوتی ہے۔ ص ۱۳۵ پر سرور کی لکھی ہوئی ایک اور مختصر سی نثر ہے، جس کے ساتھ عنایت حسین گوپاموی کا قطعۂ تاریخِ طبع[2] ہے۔ یہ اِس صفحے کی آخری

---

[1] سرور کی دوسری کتاب شبستانِ سرور کے ناشر بھی مولوی محمد یعقوب تھے۔ اِس کتاب کے سرورق پر مطبع کا نام "نجم العلوم" لکھا ہوا ہے اور اندرونی ورق پر صراحت ہے کہ یہ کتاب "مطبع نجم العلوم کارنامہ لکھنؤ میں بہ اہتمام محمد یعقوب" چھپی ہے۔ اِس سے اِسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ نجم العلوم کے مالک یہی تھے۔ ہفتے وار "کارنامہ" کے مالک تو یہی مولوی یعقوب تھے۔ اخترِ شہنشاہی میں مرقوم ہے کہ مولوی یعقوب انصاری کئی مطبعوں کے مالک تھے۔ مزید دیکھیے ضمیمہ ۲ بہ ذیل "محمد یعقوب انصاری"۔

[2] اِس قطعے کے یہ اشعار بہت اہمیت رکھتے ہیں:

چھپا تھا میرِ حسن کے یہ پہلے مطبع میں — زمانہ اُس کو ہوا بیس سال سے بھی سوا

←

سطر پر ختم ہوتا ہے [یہ مکمل حصہ ضمیمہ ۱ میں شامل ہے] اور یہیں پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔
اِس نسخے میں پچھلے نسخوں کے مقابلے میں اضافے بھی ہیں اور لفظی تبدیلیاں بھی ہیں۔ مثلاً
ص ۱۶ پر [سطر ۵ سے سطر ۱۴ تک] معتمد الدولہ کے داروغۂ باورچی خانہ "میاں محمد اشرف"
کے متعلق جو کچھ مرقوم ہے، وہ صرف اِس نسخے میں ہے۔ یا مثلاً ص ۲۵ پر "باریک ہیں.....
ہم نہ ہوں گے" یہ پورا ٹکڑا [سطر ۲ سے سطر ۵ تک] اِس نسخے کے سوا کسی اور نسخے میں
موجود نہیں۔ لفظی تبدیلیاں تو بہت سی ہیں [دیباچے اور "بیانِ لکھنؤ" کے اختلافات کا
احوال ضمیمۂ اختلافِ نسخ سے معلوم کیا جا سکتا ہے] ـــــ اِس نسخے کا نشان ل ہے۔
(۸) اِس فہرست کا آٹھواں نسخہ وہ ہے جسے منشی نول کشور نے سرور سے حقوقِ اشاعت

پھر اِس نے جلوہ دیا مصطفائی مطبعے کو — سہ بارہ مُہرِ مصنف سے پھر صحیح چھپا
کیا صحیح مصنف نے پھر یہ افسانہ — اور اس کو حاجی محمد حسین نے چھاپا
غرض کہ بیس۲ دفعہ شہرِ لکھنؤ میں چھپا — نہ کچھ صحیح و غلط کا مگر خیال کیا
تلاش اب جو ہوئی شائقوں کو پھر اس کی — سرور نے بھی طبیعت کا زور دکھلایا
کیا درست فسانے کو اب جو چوتھی بار — ہوئی دو آتشہ پھر یہ مے سرور افزا
پھر اپنے ہاتھ سے اک خاتمہ یہ نثر لکھی — جو اعتبار ہوا سب کو اِس کی صحت کا

سب سے پہلی بات تو اِس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب پہلی بار مطبعِ میر حسن رضوی میں چھپی تھی۔ یعنی نسخۂ ح بلاشبہہ اِس کتاب کی اشاعتِ اول ہے۔ تیسرے مصرعے میں نسخۂ ض کا ذکر ہے، کیوں کہ مُہرِ مصنف اُسی کے آخر میں ہے۔ تیسرے شعر میں نسخۂ ک کا ذکر ہے اور اِس کا کہ اِس پر مصنف نے نظرِ ثانی کی تھی۔ چھٹے شعر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اِس نسخے (یعنی نسخۂ ل) کے لیے سرور نے چوتھی بار نظرِ ثانی کی ہے۔ اِس سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ سرور کے نظرِ ثانی کردہ نسخے صرف چار ہیں (یعنی ض، ک، ف، ل) اور یہ بالکل درست ہے۔ اِس طرح نسخۂ د اِس فہرست سے خود بہ خود خارج ہو جاتا ہے۔

۲ کوشش کے باوجود میں اِن کے متعلق کچھ معلوم نہیں کر سکا؛ اِسی لیے اِن کا نام ضمیمہ ۲ میں شامل نہیں ہو سکا۔

خریدنے کے بعد[1] ۱۲۸۳ھ [۶۷-۱۸۶۶ء] میں بہت اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بلاشبہہ یہ اعلا درجے کا اڈیشن ہے۔ لیکن اِس اڈیشن کے متعلق یہ غلط فہمی جو پھیل گئی ہے کہ یہ سرورؔ کا نظرِ ثانی کیا ہوا اڈیشن ہے، وہ درست نہیں، کیوں کہ اِس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اِس میں بہت سی رنگین تصویریں ہیں۔ تصویریں تو معمولی ہیں، لیکن رنگ اِس قدر پختہ ہیں کہ اب تک ماند نہیں پڑے ہیں۔ گہرے رنگ کا مضبوط بادامی کاغذ ہے، مسطر ۲۳ سطری ہے، جدول رنگین ہے، عنوانات سُرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ شاعروں کے تخلص، مصرعوں کے درمیان کا نشان، لفظِ مصرع، غزل، رباعی وغیرہ؛ اِن سب کو سُرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ کُل صفحات ۱۷۸۔ ص ۱۷۴ پر کتاب ختم ہو جاتی ہے، ص ۱۷۵ سے منشی فدا علی عیشؔ لکھنوی کی لکھی ہوئی نثرِ خاتمہ "مشعرِ حالِ مولّف باکمال" شروع ہوتی ہے جو ص ۱۷۶ پر ختم ہوتی ہے۔ اِس میں اُنھوں نے سُرورؔ کے لیے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کل "جناب موصوف بلدۂ محمد آباد عرف بنارس میں تشریف فرما ہیں۔" اِسی صفحے پر تین قطعاتِ تاریخ طبع ہیں۔ ص ۱۷۷ سے منشی فدا علی عیشؔ ہی کی دوسری نثر ہے، جس میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "منشی نول کشور نے نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولّف کے موافق طبع کرنے کا قصد کیا۔" اِس کے بعد عیشؔ نے اِس کی صراحت کی ہے کہ اِس نسخے کی کتابت منشی گوبند لال فضا نے کی ہے، تصویریں شیخ قائم علی

---

[1] نیّر مسعود صاحب نے لکھا ہے: "۱۸۶۷ء / ۱۲۸۳ھ میں منشی نول کشور نے سرورؔ سے فسانۂ عجائب کا حقِ تالیف خرید کر رجسٹری کرالیا" [رجب علی بیگ سرور، ص ۱۳۶]۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ حقوقِ اشاعت کی خرید اور اِس نسخے کی اشاعت، یہ دونوں واقعے ایک ہی سال یعنی ۱۲۸۳ھ کے نہیں ہو سکتے۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ اِس اشاعت کے سرورق پر "۱۲۸۲ھ" درج ہے؛ یعنی اِس سنہ میں کام شروع ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ حقوقِ اشاعت اِس سے پہلے یا زیادہ سے زیادہ اِس سنہ کے اوائل میں خریدے گئے ہوں گے۔ میرے سامنے ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ حقوقِ اشاعت کب خریدے گئے تھے۔ اِس نسخے کی اشاعت کا اہتمام و انتظام ۱۲۸۲ھ میں شروع ہو چکا تھا اور سرورؔ اُس وقت بنارس میں تھے [جیسا کہ عیشؔ نے لکھا ہے] تو پھر یہ لکھا پڑھی کب ہوئی اور کیسے ہوئی؟ لکھا پڑھی ہوئی تو تھی، مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ کب ہوئی تھی اور کس طرح ہوئی تھی۔ ہاں ڈاکٹر سلیمان حسین نے اپنے مرتبہ نسخے کے مقدمے میں اِسے ۱۲۸۲ھ کا واقعہ بتایا ہے [ص ۳۷]۔ یہ ممکن ہے، مگر ماخذ کا حوالہ اُنھوں نے نہیں دیا۔

مصوّر نے بنائی ہیں اور شیخ امیر علی صاحب نے " باریک جدول کشتی کا کھینچا "۔ آخری صفحے پر دو مزید قطعاتِ تاریخِ طبع ہیں۔ جو نسخہ میرے پیشِ نظر ہے، وہ اسی صفحے پر ختم ہو جاتا ہے۔

عیش نے یہ جو لکھا ہے کہ " نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولّف کے موافق طبع کرنے کا قصد کیا "، غالباً اسی جملے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ سرور نے اپنے معمول کے موافق اِس اشاعت کے لیے بھی نظرِ ثانی کی تھی؛ حالاں کہ اِس جملے سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ " نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولّف " تو کئی ایک موجود تھے، ایسا کوئی بھی نسخہ مراد لیا جا سکتا ہے۔ عیش نے اپنی دونوں نثروں میں سرور سے متعلق اور اِس اشاعت سے متعلق بہت سی باتیں لکھی ہیں؛ اگر سرور نے اِس اشاعت کی خاطر اپنی کتاب پر ایک بار پھر نظرِ ثانی کی ہوتی، تو یہ ایسی اہم بات تھی کہ اِسے تو خاص طور پر لکھا جاتا۔ کم از کم یہ تو لکھا ہی جا سکتا تھا کہ اِس اشاعت کے لیے مصنّف نے خاص طور پر نظرِ ثانی کی ہے؛ مگر عیش نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی [اور وہ لکھتے بھی کیسے، سرور نے نظرِ ثانی کی ہوتی تو وہ لکھتے۔ رہا " نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولّف " تو وہ ایک نہیں، کئی ایک موجود تھے]۔ غلط فہمی کو اچھی طرح رفع کرنے کے لیے میں عیش کی دوسری نثر کا متعلق حصّہ نقل کرتا ہوں: " عالی جناب... منشی نول کشور والا پایگاہ کو خیال طبع فسانۂ عجائب آیا۔ ایک دن ارشاد کیا کہ یہ کہانی لاثانی مع تصویرات مطبوع ہو۔ ایسی عمدہ چھپے کہ آج تک نہ چھپی ہو.... کارپردازانِ مطبع کو حکم کا انتظار تھا، فضلِ الٰہی سے سب سامانِ طبع تیار تھا۔ نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولّف کے موافق طبع کرنے کا قصد کیا "۔

اِس عبارت سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنّف کا نظرِ ثانی کیا ہوا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا، ورنہ منشی نول کشور یہ کہتے کہ اُس خاص نسخے کے مطابق یہ کتاب طبع ہو۔ میرا خیال ہے کہ عیش کی اِس عبارت کے بعد یہ خیالِ باطل پوری طرح ذہن سے نکل جائے گا کہ یہ نول کشوری اشاعت، خاص کر اِس مطبعے کے لیے سرور کے نظرِ ثانی کیے ہوئے متن پر مبنی ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ " نسخۂ نظرِ ثانی فرمودۂ مولّف " کے مطابق یہ کتاب چھپی ہے، تو غلط نہ ہوگا، کیوں کہ ایسے کئی نسخے موجود تھے۔ سرور نے جن نسخوں پر نظرِ ثانی کی ہے، اُن میں اُن کی لکھی ہوئی نثر بھی شامل ہے، جس میں وہ اِس کی صراحت کرتے ہیں کہ میں نے

اِس نسخے پر نظرِ ثانی کی ہے، اور جس ناشر کی فرمائش پر وہ نظرِ ثانی کرتے ہیں، اُس کا نام اور اُس کے مطبعے کا نام بھی شامل کرتے ہیں۔ اِس نسخے میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔ "بیانِ لکھنؤ" میں جہاں لکھنؤ کے مطبعوں کا بیان ہے، وہاں اِس نسخے میں وہی عبارت ملتی ہے جو اشاعتِ اوّل (ح) اور اشاعتِ ثانی (ض) میں ہے۔ یعنی یہ پورا حصّہ ح یا ض سے نقل کرلیا گیا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اِس عبارت میں میر حسن کا نام بھی اُسی طرح برقرار ہے اور اُن کے مطبعے کا ذکر بھی موجود ہے۔ البتہ مطبعے کے ذکر میں اُس پر ۱ کا نشان بنا کر حاشیے میں یہ لکھا گیا ہے: "واضح ہو کہ یہ مطبع فی الحقیقت ایسا ہی تھا مگر اب بہ سبب نامساعدت زمانۂ ناہنجار کے بالکل بند ہوگیا ہے" [ص ۱۲]۔ اگر سرورؔ، منشی نول کشور کے چھاپنے کے لیے نظرِ ثانی کرتے، تو ظاہر ہے کہ اِس مقام پر اُن کے مطبعے کا ذکر ہوتا اور یہ حاشیے والی سطر نہ ہوتی۔ ایک بات اور: اِس نسخے کے سرورق پر سالِ طبع ۱۲۸۲ھ درج ہے، لیکن آخر میں جو قطعاتِ تاریخِ طبع ہیں، اُن میں سالِ طبع ۱۲۸۳ھ مندرج ہے [اور مادّہ ہائے تاریخ سے یہی سنہ نکلتا بھی ہے]۔ یہ وہی صورت ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے آچکا ہے، کہ کتابت ۱۲۸۲ھ میں شروع ہوئی ہوگی اور طباعت ۱۲۸۳ھ میں مکمل ہوئی۔ اِس اشاعت کے متن کا تقابل جب دوسرے نسخوں سے کیا گیا، تو ایک یہ بات بھی سامنے آئی کہ اِس نول کشوری نسخے میں متعدد مقامات پر تحریف کی کارگزاری بھی ملتی ہے۔ میں برِ بنائے اختصار صرف چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

(۱) اِس نول کشوری اشاعت میں [آیندہ اِسے ن کہا جائے گا] "بیانِ لکھنؤ" میں ایک ٹکڑا یوں ہے: "فصلِ بہار کی صنعت پروردگار کی" [ص ۶]۔ سب نسخوں میں "فصل" کی جگہ "باغ" ہے۔ غالباً اِس خیال سے کہ "باغ" کی صورت میں قافیہ بندی بگڑ جائے گی، اُسے "فصل" سے بدلا گیا ہے۔ (۲) ن میں ص ۸ پر ایک ٹکڑا یوں ملتا ہے: "باہر بندو اُس کے بیٹے جو پائیں" جب کہ اور سب نسخوں میں "اُس کے بیٹے" کی جگہ "اورگی کی بہتی" ہے۔ غالباً "اورگی کی بہتی" کو بے معنی سمجھ کر بدل دیا گیا ہے۔ [ہمارے نسخے میں یہ جملہ ص ۱۵ پر ہے]۔ (۳) ہمارے نسخے میں ص ۱۷ پر ایک شعر یوں ہے:

پرتلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم　　　چھانتے ہیں اب وہاں پر خاک پروانے کو ہم

سب نسخوں میں "پرتلک" ہے ["پر" بہ معنیِ گذشتہ، جیسے پرسال] ۔ صرف ن میں "کل تلک" ہے [ص ۲۵] ۔ "پرتلک" کو مصحح نے غالباً بے معنی سمجھ کر اُسے "کل تلک" سے بدل دیا ۔ (۴) ہمارے نسخے میں ض، ص ۱۵ پر ایک جملہ یوں ہے : " دن دیے لٹ گیا عشق کا بیپاری "۔ سب نسخوں میں یہاں " دن دیے " ہے، صرف ن میں " دن دہاڑے " ہے [ص ۷۹] ۔ یہاں بھی مصحح نے غالباً " دن دیے " کو بے معنی یا متروک سمجھ کر " دن دہاڑے " سے بدل دیا ۔ میرا خیال ہے کہ اثباتِ مدّعا کے لیے یہ مثالیں کافی ہوں گی ۔

یہ اشاعت صحیح معنی میں کم یاب ہے ۔ اِس کا ایک نسخہ انجمن ترقّیِ اُردو [نئی دہلی] کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور وہی پیشِ نظر ہے ۔ اِس نسخے کے سلسلے میں اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس سے اِس کتاب کے اہم نسخوں کی فہرست میں اِس نسخے کو بھی شامل کرنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے، اِسی لیے اِسے بھی شامل کیا گیا ــــــ اِس نسخے کا نشان ن ہے ۔
اِن مذکورہ نسخوں کی ترتیب اِس طرح ہوگی :

(۱) مطبوعہ مطبعِ حسنی میرحسن رضوی لکھنؤ [طبعِ اوّل]	۱۲۵۹ھ	ح
(۲) " مطبعِ مصطفائی لکھنؤ	۱۲۶۲ھ	م
(۳) " مطبعِ حیدری لکھنؤ	۱۲۶۲ھ	د
(۴) " مطبعِ حسنی میرحسن رضوی لکھنؤ	۱۲۶۳ھ	ض
(۵) " مطبعِ محمدی کان پور	۱۲۶۷ھ	ک
(۶) " مطبعِ افضل المطابع محمدی کان پور	۱۲۷۶ھ	ف
(۷) " مطبعِ افضل المطابع لکھنؤ	۱۲۸۰ھ	ل
(۸) " مطبعِ نول کشور لکھنؤ	۱۲۸۳ھ	ن

(۲) دوسرے درجے میں وہ نسخے آتے ہیں جن کی تدوین کے نقطۂ نظر سے تو کچھ اہمیت نہیں، مگر محض قدامت کے لحاظ سے یا ایسی ہی کسی وجہ سے اُن کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ میری نظر سے ایسے جو نسخے گزرے ہیں، اُن میں سب سے نمایاں حیثیت اُس نسخے کی ہے جو دہلی میں مولوی

کریم الدین کے مطبع میں چھپا تھا۔ سالِ طبع : ۱۲۶۱ھ۔ اِس کے آخر میں عبارتِ خاتمۃ الطبع میں مرقوم ہے:۔

"للہ الحمد و المنۃ کہ نسخۂ عجیبہ و قصۂ غریبہ جان عالم شاہزادہ بزبان اُردو مسمی بفسانۂ عجائب از مصنفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بسرور کہ بیک واسطہ سلسلۂ تلمذ را بمیر سوز میرسانند در ماہ شوال روز پنجشنبہ تاریخ ۱۳ سنہ ۱۲۶۱ ہجری مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۵ء قاضی کے حوض پر مطبع رفاہ عام میں باہتمام مولوی کریم الدین صاحب کے چھاپہ ہوا۔"

کُل صفحات ۲۱۱۔ مسطر اُنتیس سطری۔ کتابت معمولی۔ اِس کے آخر میں شرف الدولہ کی مدحیہ نثر شامل ہے۔ یہ اشاعت لفظ بہ لفظ اشاعتِ اوّل (نسخۂ ح) کے مطابق ہے۔ یہاں تک کہ ہر صفحے کا اختتام اُسی لفظ پر ہوا ہے جس لفظ پر نسخۂ ح کے صفحے کا اختتام ہوتا ہے۔ ح میں اور اِس میں بس یہ فرق ہے کہ بعض الفاظ کا املا اِس میں ح سے مختلف ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ محض کتابت کا معاملہ ہے اور کچھ نہیں[1]۔ اِس نسخے کی اصل اہمیت دو باتوں میں پنہاں ہے : ایک تو یہ کہ یہ پہلا دہلوی اڈیشن ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو مطبوعہ نسخے اب تک میرے علم میں آئے ہیں، اُن میں طبعِ اوّل (۱۲۵۹ھ) کے بعد یہ سب سے قدیم اڈیشن ہے[2] ـــــــ یہ اشاعت کم یاب ہے۔ مجھے بہت سی تلاش کے بعد

---

[1] بس ایک نمایاں تبدیلی یہ ہے کہ خاتمۃ الطبع کی عبارت میں ح میں "سلسلۂ تلمذ را بہ جرات می رسانند" ہے؛ اِس اشاعت میں اُس کی تصحیح کر دی گئی ہے اور جرات کی جگہ میر سوز کا نام لکھا گیا ہے۔

[2] کریم الدین نے اپنے تذکرے طبقاتِ شعرائے ہند میں سرور کا احوال بھی درج کیا ہے؛ اُس کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہے : "ایک قصہ فسانۂ عجائب زبان اُردو میں اس کی تصنیف سے بہت مشہور ہے جو کہ دو دفعہ لکھنؤ میں چھپا اور ایک دفعہ میرے اہتمام سے دہلی میں درمیان مطبع بندہ کے سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں چھپا" [ص ۴۳۹]؛ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں [اتر پردیش اُردو اکیڈمی اڈیشن] میں اِس عبارت کو نقل کر کے لکھا ہے : "معلوم ہوتا ہے کہ کریم الدین نے اپنے تذکرے میں سرور کا ←

معلوم ہوا کہ اِس کا ایک نسخہ کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے۔ عزیزِ مکرّم انور قمر نے [جو مشہور افسانہ نگار ہیں] میری فرمایش پر بہت دوڑ دھوپ کے بعد اُس کے صفحات کا عکس حاصل کیا؛ وہی عکس پیشِ نظر ہے۔

دوسرا نسخہ وہ ہے جو "مطبع احمدی واقع شاہ درہ دلیائی ضلع میرٹھ" میں ۱۲۷۷ھ میں چھپا تھا۔ کُل صفحات ۱۳۰، مسطر پچیس[۲۵] سطری۔ کتابت، طباعت، کاغذ سب بہت معمولی ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی نسخہ بھی معمولی ہے۔

لکھنؤ کے مطبعِ علوی کا چھپا ہوا ایک نسخہ [سالِ طبع : ۱۲۶۷ھ] اور مطبعِ مسیحائی لکھنؤ کا چھپا ہوا اڈیشن [سالِ طبع : ۱۲۶۷ھ] بھی نیّر مسعود صاحب کی عنایت سے دیکھنے کو ملا۔ طباعت کے لحاظ سے یہ خاصے اچھے اڈیشن ہیں، لیکن تدوین کے نقطۂ نظر سے اِن میں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں۔ یہ دونوں نسخے بالترتیب نسخۂ ض اور ک پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ نصابی ضرورت سے بھی یہ کتاب چھپتی رہی۔ اِس کا ایک اڈیشن مطبوعۂ کالج پریس کلکتہ پیشِ نظر ہے۔ سالِ طبع ۱۸۶۸ء۔ سرورق پر یہ صراحت موجود ہے : "صاحبانِ عالی شان کی ڈگری کے امتحان کے لیے مقرر ہے"۔ مطبعِ مرآۃ الاخبار کلکتہ کے اڈیشن [سالِ طبع ۱۸۴۶ء] کا تعارف نیّر مسعود صاحب نے اپنی کتاب میں کرایا ہے۔ اُنھوں نے اِس کے منظوم اڈیشنوں کا اور ہندی و انگریزی ترجموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ غرض کہ ایسے بہت سے اڈیشنوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے؛ لیکن یہ سب تدوین کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، پچھلے مطبوعہ نسخوں کی نقل ہیں۔

←

حال سنہ ۱۲۶۲ھ کی ابتدا میں لکھا ہے اور لکھنؤ کی دو اشاعتوں سے مراد مطبعِ محمّدی اور مطبعِ مصطفائی کے اڈیشن ہیں" [ص ۵۱۶]۔ مطبعِ محمّدی کا اڈیشن تو ۱۲۶۷ھ میں چھپا تھا، اُس کو کیسے شامل کیا جا سکتا ہے؟ یہ تذکرہ ۱۸۴۸ء [۶۵-۱۲۶۴ھ] میں چھپا تھا اور سرور کا احوال کریم الدّین نے ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کریم الدّین نے یہاں دو اڈیشنوں سے نسخۂ ح [لازمی طور پر] اور نسخۂ م [بہ خیالِ غالب] مراد لیے ہیں۔ م ۱۲۶۲ھ میں چھپا تھا۔ [م کے لیے "بہ خیالِ غالب" یوں لکھا گیا ہے کہ نسخۂ د بھی اُسی سنہ میں چھپا تھا۔ چوں کہ م باضابطہ اشاعت ہے، اِس لیے میں نے اُسے ترجیح دی ہے]۔

(۴۳) ایک جعلی اڈیشن ـــــــ انجمن ترقی اردو ہند کے کتاب خانے میں فسانۂ عجائب کا ایک نسخہ محفوظ ہے جس کے سرورق کی آخری سطر میں لکھا ہوا ہے: "حسن سعی فضل حسین عرف محمد فیض لکھنوی سے مطبع جمنا داس اور بلدیو سہائے میں چھپی"۔ [سالِ طبع: ۱۲۷۰ھ] خاتمۃ الطبع کی عبارت میں مرقوم ہے کہ: "بالفعل اس کے چھاپنے کا قصد دل صفا منزل لالہ جمنا داس ادام اللہ افضالہم کے دل میں آیا۔۔۔ انھوں نے مصنفِ فسانہ سے کہ تابع فرمان بہ دل و جان ہے ارشاد کیا کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جائے۔۔۔ حسب ارشاد اس خجستہ نہاد کے نیاز قدیم نے کوشش عظیم سے ملاحظہ کرکے جہاں تہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا۔۔۔۔"ــــ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لالہ جمنا داس کی فرمایش پر سرور نے اِس نسخے پر نظرِ ثانی کی ہے؛ مگر یہ سب جعل ہے۔ یہ نسخہ لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر نقل ہے مطبعِ محمدی کان پور کے اڈیشن [نسخۂ ک] کی۔ یعنی نسخۂ ک میں جس لفظ پر صفحہ ختم ہوتا ہے، اِس نسخے میں بھی اُسی لفظ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ التزام آخر تک برقرار رہا ہے۔ بس آخر میں جہاں ک میں سرور کی عبارتِ خاتمہ میں مولوی محمد حسین کا نام آیا ہے، وہاں لالہ جمنا داس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ دونوں نسخوں کا مسطر بھی ایک ہے اور تعداد صفحات بھی۔ یہ جعل سازی غالباً محض تجارتی اغراض کے تحت کی گئی ہے۔

نسخۂ ک کے متن پر مبنی ایک اور نسخہ بھی ہے، جسے ڈاکٹر فیروز احمد [جے پور] نے متعارف کرایا تھا اِس دعوے کے ساتھ کہ یہ بھی سرور کا نظرِ ثانی کیا ہوا نسخہ ہے [رسالہ آجکل اکتوبر ۱۹۸۴ء]۔ یہ نسخہ مطبع احمدی آگرہ کا چھپا ہوا ہے۔ سالِ اشاعت ۱۲۷۹ھ۔ یہ اشاعتِ ثانی ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی بار اس مطبع سے اِس سنہ سے پہلے چھپ چکا ہے۔ اِس کا احوال بھی وہی ہے جو مطبعِ جمنا داس بلدیو سہائے والے نسخے کا ہے، کہ یہ بھی سرتاسر نسخۂ ک کی نقل ہے؛ مگر اِس نسخے کے ناشر نے اپنی عبارتِ خاتمۃ الطبع میں [جسے مقالہ نگار نے نقل کر دیا ہے] یہ کہیں نہیں لکھا کہ مصنف نے اِس اڈیشن کے لیے نظرِ ثانی کی ہے، اِس لیے اُس پر کچھ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ البتہ اُس نے یہ صراحت بھی نہیں کی کہ یہ کس اڈیشن کی نقل ہے؛ اِس سے مقالہ نگار کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اِسے ایک نیا

نسخہ اور اہم نسخہ فرض کرلیا۔ فیروز صاحب نے از راہِ لطف اِس نسخے کے کچھ صفحات کا عکس مجھے بھیج دیا تھا اور میں نے نسخۂ ک سے اُن کا مقابلہ کرلیا تھا اور صورتِ حال سے اُن کو مطلع بھی کردیا تھا۔

---

(۴) ہمارے زمانے میں بھی اِس کتاب کو متعدد حضرات نے مرتب کرکے شائع کیا ہے، لیکن بالعموم بہ لحاظِ متن یہ نسخے قابلِ توجہ حیثیت نہیں رکھتے؛ البتہ دو نسخے قابلِ ذکر ہیں: ایک نسخہ تو وہ ہے جسے میرے عزیز دوست اطہر پرویز مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ ناشر: سنگم پبلشرز، الٰہ آباد۔ سالِ طبع: ۱۹۶۹ء۔ مرحوم نے فسانۂ عجائب کے ۱۲۷۶ھ والے اڈیشن [نسخۂ ف] اور مطبعِ احمدی شاہدرہ سے ۱۲۷۹ھ میں شائع شدہ[1] اڈیشن کو بنیاد بنایا ہے۔ ۱۲۷۶ھ کے نسخے کا انتخاب اصولاً بالکل درست تھا؛ اِس لیے کہ اُس وقت تک ۱۲۸۰ھ والا نسخہ [ل] کسی کے علم میں آیا ہی نہیں تھا؛ ہم سبھی اِسی ۱۲۷۶ھ والے اڈیشن کو مصنف کا آخری نظرِ ثانی کردہ نسخہ مانتے تھے۔ [میں نے بھی شروع میں اِسی نسخے کو بنیاد بنایا تھا] لیکن مطبعِ احمدی شاہدرہ والے نسخے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں مرحوم نے اِس نسخے کا کس بنا پر انتخاب کیا تھا۔ مرحوم کی توجہ مقدمے کے مباحث خاص کر اُس کے تنقیدی حصے کی طرف مبذول رہی اور یوں ٹیکسٹ وغیرہ کا اہتمام ویسا نہیں ہو پایا جیسا ہونا چاہیے تھا۔ اُن کے مقدمے سے اُس خطی نسخے کا پتا چلا جو علی گڑھ میں ہے اور جس میں "بیانِ لکھنؤ" کا کچھ حصہ زیادہ ہے؛ اِسے اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ پھر بھی یہ نسخہ ایسے دوسرے نسخوں سے بہتر ہے؛ البتہ

---

[1] اطہر پرویز نے اِس نسخے کے آخر میں شامل عبارتِ خاتمۃ الطبع نقل کردی ہے؛ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اُس نسخے سے مختلف ہے جو ۱۲۷۷ھ میں اِسی مطبع سے چھپا تھا اور جس کا ذکر اِس سے پہلے آچکا ہے؛ مگر منقولہ عبارتِ خاتمہ میں یہ بھی مرقوم ہے کہ یہ کتاب تیسری بار چھپی ہے۔ اِس کا قوی امکان ہے کہ ۱۲۷۷ھ والی اشاعت، پہلی اشاعت ہو اور یہ ۱۲۷۹ھ والی اشاعت، تیسری اشاعت ہو، صرف مہتمم اور مصحح کے نام بدل گئے ہوں؛ اور مجھے یہی بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

کتابت اچھی نہیں اور یہ چیز بہت کھٹکتی ہے۔

دوسرا نسخہ وہ ہے جسے ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے مرتب کیا اور اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ اِس نسخے کا متن بہ قولِ مرتب دو نسخوں پر مبنی ہے: "اصل متن اُس نسخے پر مبنی ہے جو مطبعِ نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اِس کے متعلق خیال یہ ہے کہ یہ مصنف کا آخری نظر یافتہ نسخہ ہے...... دوسرا نسخہ وہ ہے جو ... ۱۲۶۷ھ ... کو مطبعِ محمدی کان پور سے چھپ کر شائع ہوا تھا" [ص ۳۸]۔ اصولِ تدوین کے لحاظ سے اِن دونوں نسخوں کو متن کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ ۱۲۶۷ھ والا نسخہ یوں کہ وہ خاصا موخر ہے، اُس کے بعد کے مصنف کے نظرِ ثانی کیے ہوئے نسخے موجود ہیں۔ اور مطبعِ نول کشور والا نسخہ یوں کہ خود مرتب کے پاس ایسی کوئی شہادت [یا دلیل] موجود نہیں جس کی بنا پر وہ یہ کہہ سکتے کہ مصنف نے اِس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اُنھوں نے "خیال یہ ہے" لکھا ہے، اور اِس "خیال" کی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں۔ مقدمہ اِس کا نسبتاً مختصر ہے۔ یہ نسخہ صرف اِس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اِس میں اصولِ تدوین کی واضح طور پر خلاف ورزی کی گئی ہے[1]۔ کتابت اور طباعت بھی اچھی نہیں۔ ہاں مقدمے میں زبان اور بیان سے متعلق بعض کام کی باتیں لکھی گئی ہیں۔

---

[1] صرف ایک مثال سے صورتِ حال کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ اِس نسخے میں ایک جملہ یوں مندرج ہے: "دن دہاڑے لٹ گیا عشق کا بیوپاری" [ص ۱۸۷]۔ نسخۂ نول کشور [۱۲۸۳ھ] میں "دن دہاڑے" ہی ہے، لیکن آخری لفظ "بیپاری" ہے۔ نسخۂ محمدی کان پور [۱۲۶۷ھ] میں یہ جملہ یوں ہے: "دن دیے لٹ گیا عشق کا بیوپاری" [ص ۶۳]۔ اِس ایک جملے میں پہلا جز "دن دہاڑے" نسخۂ نول کشور سے لیا گیا ہے اور آخری جز "بیوپاری" نسخۂ محمدی سے لیا گیا ہے [نسخۂ نول کشور میں "بیپاری" ہے]۔ جیسا کہ اِس سے پہلے لکھا جا چکا ہے، مصنف کے نظرِ ثانی کیے ہوئے جس قدر نسخے ہیں، اُن سب میں [بہ شمولِ طبعِ اول یعنی نسخۂ ج] "دن دیے" ہے [یہ لفظ لغت میں موجود ہے]۔ نسخۂ نول کشور کے مصحح نے یہاں تحریف سے کام لیا ہے کہ "دن دیے" کو [غالباً بے معنی یا متروک سمجھ کر] متعارف لفظ "دن دہاڑے" سے بدل دیا۔ چوں کہ مرتب نے نسخۂ نول کشور کو ←

محمود اکبر آبادی کے مرتب کیے ہوئے ایک نسخے کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے [ناشر: رام نرائن لال بینی مادھو، الٰہ آباد]۔ میرے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۷۶ء میں چھپا ہے۔ اس کا متن کسی ایسے موخر نول کشوری نسخے پر مبنی معلوم ہوتا ہے جس میں اغلاط اور تحریفات کی کمی نہیں؛ نتیجہ یہ ہے کہ متن کا احوال سقیم ہے۔ مقدمے میں مرتب نے خاص بات یہ لکھی ہے کہ سرور اکبرآباد [آگرہ] کے رہنے والے تھے۔ اُن کا یہ قول بھی غیر معتبر ہے۔ اُنھوں نے جس نسخے کو بنیاد بنایا ہے، اُس میں "بیانِ لکھنؤ" کے آغاز میں "متوطن حال" تحریر ہے؛ غالباً اسی پر اکبر آبادی ہونے کے ہوائی دعوے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ غرض کہ یہ نسخہ ہر لحاظ سے غیر معتبر ہے۔ گیان چند جین صاحب نے ڈاکٹر رفیق حسین کے مرتب کیے ہوئے ایک نسخے کا بھی ذکر کیا ہے [اُردو کی نثری داستانیں]۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ خود جین صاحب نے اس نسخے کے متعلق جو چند جملے لکھے ہیں، وہی اِسے غیر معتبر مان لینے کے لیے کافی ہیں۔

بُنیادی متن

فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے نام سے ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کتاب کی ایک روایت شائع کی ہے [سالِ طبع: ۱۹۷۳ء] جس کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ یہ اِس کتاب کی پہلی روایت ہے۔ مطبوعہ کتاب کے مقابلے میں یہ مختصر ہے۔ اِس میں "بیانِ لکھنؤ" کا حصہ تھوڑا سا ہے اور میر امّن کا مطلق ذکر نہیں۔ اُن کو اس کا مخطوطہ ملا تھا، جو ۱۲۵۵ھ

اپنے متن کی بنیاد بنایا ہے، اِس لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اِسی کو نقل کرتے۔ اُنھوں نے یہی کیا؛ اور یہ جملہ جو اصلاً تحریف شدہ تھا، اُن کے متن میں شامل ہوگیا۔ ایک بات اور: مرتب نے اپنے مقدمے میں جہاں زبان و بیان پر گفتگو کی ہے، وہاں ایک عنوان قائم کیا ہے "دہلوی محاورے"۔ اُس کے ذیل میں اُنھوں نے "دن دیے" بھی لکھا ہے، یعنی یہ دہلوی محاورہ سرور کے یہاں موجود ہے اور مثال میں یہی جملہ نقل کیا ہے: "دن دیے لٹ گیا عشق کا بیوپاری" [ص ۲۱]۔ یہ واقعتاً اُلجھن میں ڈالنے والی بات ہے۔

کا لکھا ہوا ہے۔ اُن کا خیال یہ بھی ہے کہ سرور نے پہلے پہل اس قصّے کو اختصار کے ساتھ سادہ نثر میں لکھا تھا؛ اِس کی موجودہ صورت بعد میں معرضِ اظہار میں آئی ہے۔ اس کا ایک اور مخطوطہ بھی ملا ہے جو پہلے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی ملکیت تھا، اور بہ روایتِ گیان چند جین صاحب اب وہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے۔ اِن دونوں نسخوں میں بھی باہم کچھ فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ ثانی الذکر نسخے میں "بیانِ لکھنؤ" کا حصّہ موجود ہی نہیں۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے اِس سے متعلق ایک مفصّل مضمون لکھا تھا [مشمولۂ رسالہ اکادمی (لکھنؤ) جولائی اگست ۱۹۸۵ء]۔ اِس مقالے میں نقوی صاحب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "یہ داستان ابتدا میں جس صورت میں قلم بند کی گئی تھی، اُسے کسی داستان گو نے اپنی پسند اور صواب دید کے مطابق ضروری تلخیص و ترمیم کے ساتھ ازسرِ نو تحریر کیا ہے" [ص ۱۲]۔ اُنھوں نے اپنے استدلال کی بنیاد جن اجزا پر رکھی ہے، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اِس روایت میں جگہ جگہ عبارت بے ربط ہوگئی ہے، جیسے بیچ سے ایک حصّہ نکال دیا گیا ہو۔ اُن کی اِس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ اِس روایت میں یہ خرابی واضح طور پر بہت سے مقامات پر موجود ہے۔ میں اِس تحریر میں تو قطعی طور پر کوئی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اُس کے لیے اِن نسخوں کے مفصّل جائزے اور تجزیے کی اور دوسرے نسخوں سے تقابل کی ضرورت پڑے گی اور اِس تفصیل نگاری کی یہاں ذرا بھی گنجایش نہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرۂ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے میرا اصل مقصد تو اِس متن کی اُس صورت کو پیش کرنا ہے جسے آخری بار مصنّف نے پیش کیا تھا اور اُس میں اِن نسخوں کے مباحث کے شمول کی نہ گنجایش ہے نہ ضرورت، ہاں الگ سے یہ کام کرنے کا ضرور ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی، تو میرا ارادہ بھی ہے کہ اِس موضوع پر ایک مفصّل مقالہ تحریر کروں۔ البتہ یہ صراحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نقوی صاحب کے اِس خیال سے پوری طرح متفق نہیں کہ اسے کسی داستان گو نے ازسرِ نو تحریر کیا ہے۔

طریقِ کار

متن کی بنیاد نسخۂ ل کو بنایا گیا ہے، اِس بنا پر کہ وہ [اب تک کی معلومات کے

مطابق] مصنف کا نظرِ ثانی کیا ہوا آخری نسخہ ہے۔ اِس نسخے کے آخر میں سرور کی لکھی ہوئی نثرِ خاتمہ بھی ہے، جس میں [اپنے معمول کے مطابق] انھوں نے یہ صراحت کی ہے کہ مولوی یعقوب انصاری کی فرمایش پر میں نے اِس نسخے پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اِس نسخے کے بالکل آخر میں مولوی عنایت حسین گوپاموی کا ایک قطعۂ تاریخِ طبع ہے اور اُس قطعے سے متعلق سرور کی لکھی ہوئی مختصر سی نثر بھی ہے: یہ دونوں چیزیں [یعنی سرور کی دونوں نثریں مع قطعۂ مذکور] ضمیمہ ۱ میں شامل کر لی گئی ہیں۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، نسخۂ ل میں اغلاطِ کتابت کم سے کم ہیں۔ جو غلطیاں ہیں، وہ بہت معمولی ہیں اور نہایت واضح۔ دوسرے نسخوں، خاص کر نسخۂ ف کی مدد سے [جس پر اصلاً ل کا متن مبنی ہے] اُن کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ اِس کتاب کے دوسرے مطبوعہ نسخوں کی طرح نسخۂ ل میں بھی پُرانے اندازِ کتابت کے اثر سے ہاے مخلوط و ملفوظ میں صورت کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اِسی طرح یاے معروف و مجہول کی کتابت میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے [اُس زمانے میں بہ طورِ عموم ایسے امتیازات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا]۔ تشدید کا بھی التزام نہیں ملتا، کہیں ہے اور کہیں نہیں [یہ بھی عام انداز تھا] پیراگراف نام کی کوئی چیز نہیں۔ پیش کو ظاہر کرنے کے لیے بعض الفاظ میں [اُس زمانے کی روش کے مطابق] الف کے بعد واو لکھا گیا ہے، جیسے: اوس (اُس) اوستاد (اُستاد)۔ آخرِ لفظ میں واقع نونِ غنہ پر ہر جگہ نقطہ ملتا ہے اور اضافت کے زیر عموماً موجود نہیں —— اِس کتاب میں موجودہ روش کے مطابق ہاے ملفوظ و مخلوط میں کتابت کے امتیاز کو ملحوظ رکھا گیا ہے، آخری نونِ غنہ کو نقطے کے بغیر لکھا گیا ہے، مشدد حروف پر تشدید پابندی کے ساتھ لگائی گئی ہے، اضافت کے زیر التزاماً لگائے گئے ہیں، یاے معروف و مجہول کی کتابت میں بھی تفریق کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اعراب بالحروف کی پُرانی روش کے مطابق لکھے گئے واو کو نکال دیا گیا ہے اور اُس کی جگہ الف پر پیش لگایا گیا ہے [جیسے: اُس، اُستاد] اور "اُس" کے بالمقابل "اِس" کو لازماً مع زیر لکھا گیا ہے۔ پیراگراف بنائے گئے ہیں اور علامات، نشانات، اعراب اور رموزِ اوقاف

کو شاملِ عبارت کیا گیا ہے [جن کی تفصیل اِس کے بعد پیش کی جائے گی]۔ اُس زمانے کا ایک اندازِ کتابت یہ بھی تھا کہ جو لفظ ہائے مخلوط پر ختم ہوتے تھے [خواہ اُس "ھ" کو دو چشمی صورت میں لکھا جاتا، یا ہائے ملفوظ کہنی دار کی شکل میں لکھا جاتا] اُن کے آخر میں [غالباً خوش نمائی کی غرض سے] ایک زائد "ہ" بھی لکھی جاتی تھی، جیسے: ہاتھہ، ساتھہ، کچھہ۔ ایسے لفظوں کے آخر سے اُس زائد "ہ" کو نکال دیا گیا ہے، جیسے: ہاتھ، ساتھ، کچھ۔ اِسی طرح لفظوں کو ملا کر لکھنے کا رجحان بھی اُس زمانے میں بہت تھا اور یہی صورت ل میں بھی بہت سے مقامات پر نظر آتی ہے [جیسے: کرنیلگا، اوسنے]۔ ایسے مرکبات کو الگ الگ لکھا گیا ہے، یعنی: کرنے لگا، اُس نے۔

اِن اُمور کے علاوہ، متن میں کسی جگہ تغیر و تبدل کو روا نہیں رکھا گیا ہے۔ سختی کے ساتھ اصل متن کی پابندی اختیار کی گئی ہے ——— اِس خیال سے کہ یہ کتاب صحت کے ساتھ چھپے، میں نے خود ہر کتابت شدہ صفحے کو پانچ بار پڑھا ہے۔ اِس کے باوجود اگر کتابت کی کوئی غلطی رہ گئی ہو، یا غلطیاں رہ گئی ہوں، تو اسے بشریت کا کرشمہ سمجھا جائے۔

خاص لفظوں میں ضروری مقامات پر اعراب لگائے گئے ہیں اور علامات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ بات بہ طورِ خاص ملحوظ رکھی گئی ہے کہ علامات ہوں یا اعراب، اِن کو صرف بہ قدرِ ضرورت استعمال میں لایا جائے۔ ہر جگہ علامت کو داخل کرنا یا ہر لفظ پر، یا لفظ کے ہر حرف پر حرکت یا جزم کو لانا غیر مناسب بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ بے امتیازی کے اِس عمل سے عبارت بوجھل نظر آئے گی اور افادیت کا حصول بھی نہیں ہوگا۔

علامات

معروف، مجہول، مخلوط اور غنّہ آوازوں کے تعیّن کے لیے بہت سے مقامات پر علامتوں کا شمول ضروری ہوتا ہے، اِسی طرح بعض نشانات بھی ضروری ہوتے ہیں؛ اِسی بنا پر علامات اور نشانات کو شاملِ متن کیا گیا ہے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) درمیانِ لفظ واقع یائے معروف کے لیے، اُس کے نیچے چھوٹی سی کھڑی لکیر،

جیسے: نیل، میل، تیر۔

(۲) یاے مجہول کے لیے اُس کے حرفِ ماقبل کے نیچے زیر، جیسے: میل، تیل، دیر۔

(۳) یاے لین [ماقبل مفتوح] کے لیے حرفِ ماقبل پر زبر، جیسے: مَیل، دَیر، غَیب۔

(۴) یاے مخلوط کے لیے اُس پر آٹھ کے ہندسے کا نشان، جیسے: پیار، کیا، گیانی۔

(۵) واوِ معروف پر اُلٹا پیش، جیسے: دُور، حُور، طُور۔

(۶) واوِ مجہول کے لیے حرفِ ماقبل پر پیش، جیسے: چُور، گُور، ڈُول۔

(۷) واوِ ماقبل مفتوح کے لیے حرفِ ماقبل پر زبر، جیسے: دَور، طَور، جَور۔

(۸) واوِ معدولہ کے نیچے خط، جیسے: خوزادہ، خویش، فراخوی کمال[1]۔

(۹) درمیانِ لفظ واقع نونِ غنہ پر قوس کا اُلٹا نشان، جیسے: آنت، گھونپ، کھانڈ۔

(۱۰) تخلص پر متعارف نشان ضرور لگایا گیا ہے، جیسے: ناسخ، سرور، سوز۔

(۱۱) خاص ناموں پر خط کھینچا گیا ہے، جیسے: دہلی، فسانۂ عجائب، تختِ طاؤس، نصیر الدین حیدر، دل کُشا۔ [ایک وضاحت: جو لفظ بہ طورِ خاص نام آئے ہیں، اُن پر بھی خط کھینچا گیا ہے۔ جیسے سرور نے نوازش کے اشعار سے پہلے کسی جگہ لفظ "استاد" لکھا ہے: ظاہر ہے کہ یہاں یہ لفظ نام کے بدل کے طور پر آیا ہے، اِس لیے اُس پر خط کھینچا گیا ہے۔ یا مثلاً حصۂ نعت میں رسول اللہؐ کے نام کے بجاے ایک جگہ "مخبرِ صادق" لکھا گیا ہے؛ اُس پر بھی خط کھینچا گیا ہے۔ یا جیسے "بیانِ لکھنؤ" میں "مقبرے" آیا ہے، جس سے مراد سعادت علی خاں اور اُن کی بیگم کے مقبرے ہیں: اُس پر بھی خط کھینچا گیا ہے۔ یا اِسی بیان میں لفظِ "مسجد" کہ اُس سے ایک خاص مسجد مراد ہے۔ یا "سڑک" کہ اُس سے ایک خاص سڑک مراد ہے]۔

---

[1] "خودو سرا اُس خودِ سر کا کاٹا" [ص۲۶۲]۔ لفظِ "خود سر" کوئی اجنبی لفظ نہیں، لیکن اِس جملے میں وہ "خود" کے ساتھ جس طرح آیا ہے، اُس کی بِنا پر اُسے "خودِ سر" لکھنا مناسب سمجھا گیا۔ یہ مثال یوں نقل کی گئی کہ اِس سے مرتب کے طریقۂ کار کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

علامتوں کے انتخاب میں میں نے گل کرسٹ کے اِس تصور کو پیشِ نظر رکھا ہے [کہ] ممکن حد تک کم سے کم ہوں؛ اِسی لیے مجہول اور لین آوازوں کے لیے زبر، زیر، پیش سے کام لیا گیا ہے، جو پہلے سے ہمارے پاس موجود ہیں اور بہت آسانی کے ساتھ ہمارے مفہوم کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ یائے معروف، واوِ معروف، واوِ معدولہ اور نونِ غُنّہ کی علامتیں متعارف ہیں، جو ایک مدّت تک غیر منقسم پنجاب کی درسی کتابوں میں اور انجمن ترقیِ اُردو کی مطبوعات میں مستعمل رہی ہیں۔ اِس کی تکرار کی جاتی ہے کہ اِن علامتوں کو صرف اُن مقامات پر شامل کیا گیا ہے جہاں اِن کا شمول ضروری سمجھا گیا ہے۔

رُموزِ اوقاف

سکتہ یعنی کاما (،)، وقفہ (؛)، بیانیہ[1] (:)، ندائیہ [ندا، تحسین، تأسّف اور تعجب کے لیے] (!)، استفہامیہ (؟)؛ اِن رُموزِ اوقاف کو معنوی نسبت کے لحاظ سے شاملِ عبارت کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اِس سلسلے میں التزام کو برقرار رکھا جائے۔

اِس سلسلے میں ایک اور التزام کو بھی شامل کیا گیا ہے، جس کی صراحت ضروری ہے۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں دو[2] لفظوں یا دو ٹکڑوں میں باہم فصل ضروری ہے، لیکن وہاں کاما نہیں لگایا جا سکتا [کاما لگانے سے معنوی سطح پر قباحت پیدا ہو سکتی ہے]۔ ایسے مقامات پر اِس کا التزام کیا گیا ہے کہ ایسے اجزا کی کتابت اِس طرح کی جائے کہ اُن کے

---

[1] اقتباس، قول، مصرعے یا شعر سے پہلے بیانیہ کا نشان ضرور لکھا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر عبارت میں ایسے ٹکڑے ملتے ہیں، جو کسی قول کی تشریح کرتے ہیں یا پھر اُس کو بیان کرتے ہیں اور اِس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اُن کو مسلسل یعنی کسی فصل کے بغیر لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا؛ ایسے مقامات پر بھی بیانیہ کا نشان لایا گیا ہے، جیسے: "گھونٹرُو کا وہ ڈھنگ کہ سب کہتے تھے: بیچا ہے" [ص ۲۵۴]۔

درمیان ذرا سا فصل پیدا ہو جائے، جو پڑھنے والے کی نظر میں بہ آسانی اور فوری طور پر آجائے اور وہ سمجھ لے کہ یہاں خواندگی میں اِن لفظوں کو الگ الگ آنا چاہیے۔ اِس کی وضاحت کے لیے میں شروعِ متن ہی سے ایک مثال پیش کروں گا: "سزاوارِ حمد و ثنا خالقِ ارض و سما، جلّ و علیٰ، صانعِ بے چون و چرا ہے" [ص ۱]۔ اِس جملے میں چار ٹکڑے ہیں۔ اِن میں سے دوسرے اور تیسرے ٹکڑے کے بعد کاما آیا ہے، مگر پہلے ٹکڑے [سزاوارِ حمد و ثنا] کے بعد کاما نہیں آسکتا، کیوں کہ یہ ٹکڑا اُس طرح الگ اور معنوی طور پر خود مکتفی نہیں، جس طرح وہ ٹکڑے ہیں؛ مگر ہے یہ بھی الگ سا؛ اِس لیے اِسے اِس طرح لکھا گیا ہے کہ اِس کے بعد ذرا سا فصل پیدا ہو گیا ہے۔ اِس اندازِ کتابت کو [اور اِس کی افادیت کو] ہر جگہ بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اِس التزام کو نباہنے میں مشکل تو بہت پیش آئی؛ مگر بہ ہر حال اِس میں کام یابی حاصل ہوئی اور یہ التزام آخر تک برقرار رہا۔[1]

مشدد حرفوں پر تشدید ضرور لگائی گئی ہے۔ اِسی طرح اضافت کے زیر بھی پابندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں اور اِس التزام کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اضافت کا مسئلہ بعض مقامات پر خاصا پریشان کن ہوا کرتا ہے، ویسے بھی یہ بڑی ذمّے داری کا کام ہے؛ اِن دونوں باتوں کو ذہن نشیں کر لیا گیا تھا اور پیشِ نظر رکھا گیا۔ اِس سلسلے میں

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ جو لوگ کسی متن کو مرتب کرتے ہیں اور اُس کا مسودہ کسی دوسرے شخص سے لکھواتے ہیں، یا ٹائپ کراتے ہیں؛ تو وہ تدوین کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ لازم ہے کہ مرتب اپنے قلم سے پورے متن کو نقل کرے، تاکہ مشخصاتِ متن [بہ شمولِ املاے الفاظ] برقرار رہ سکیں۔ میں نے اِس قول کو گرہ میں باندھ لیا تھا اور اِس پر پابندی سے عمل کرتا ہوں۔ اِس کتاب کا مکمل مسودہ بھی میں نے اپنے قلم سے لکھا اور ایسے مقامات پر، جہاں کاما کے بجاے دو لفظوں کے درمیان فصل رکھنا تھا، ایسے دونوں لفظوں کے درمیان ایک ترچھا خط سرخ روشنائی سے کھینچا گیا۔ اِس طرح سے یہ التزام برقرار رہ پایا [اِس کے باوجود، تحسین کے اصل مستحق زیدی صاحب ہیں، جنھوں نے اِس متن کی کتابت کی ہے]۔

یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ جن مقامات پر اضافت کا ہونا یا نہ ہونا بحث طلب ہو سکتا ہے، ایسے مقامات سے متعلق یا تو ضمیمۂ تشریحات میں یا پھر ضمیمۂ تلفظ و املا میں وضاحت ضرور کی گئی ہے۔ میں ایک مثال سے اِس کی وضاحت کروں۔ اِس کتاب میں ص ۱۵۸ پر "صاحب فراش" آیا ہے۔ یہ مرکب مع اضافت بھی درست ہے اور بغیر اضافت بھی؛ لیکن اِس متن میں اسے مع اضافت مرجح قرار دے کر "صاحبِ فراش" لکھا گیا ہے اور ضمیمۂ تلفظ و املا میں اِس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اِسے مع اضافت کیوں مرجح سمجھا گیا [ضمنی طور پر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اِس خاص مرکب میں "فراش" بہ کسرِ اوّل ہے]۔

ضمیمے

اِس کتاب میں سات ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا ضمیمہ اُن نثروں پر مشتمل ہے جو سرور نے مختلف اشاعتوں کے آخر میں لکھی تھیں۔ اِن نثروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے [اور ثابت ہوتا ہے] کہ مصنف نے کن نسخوں پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اشاعتِ اوّل [ج] کے آخر میں شرف الدولہ کی مدح پر مشتمل طویل نثر ہے، وہ نثر بھی اِسی ضمیمے میں شامل ہے۔

(۲) دوسرا ضمیمہ تشریحات پر مشتمل ہے۔ اِس متن میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جن کو کسی نہ کسی لحاظ سے تشریح طلب یا وضاحت طلب کہا جا سکتا ہے؛ ایسے مقامات سے متعلق وضاحتی حاشیے لکھے گئے ہیں، تاکہ اِن کے سمجھنے میں طلبہ کو آسانی حاصل ہو سکے۔ ہاں، اِس ضمیمے کے آخر میں "اضافے" کے عنوان سے اُن تشریحات کو لکھا گیا ہے جو کسی وجہ سے اپنی اصل جگہ پر شامل نہیں ہو سکی تھیں۔

(۳) تیسرا ضمیمہ انتساب اشعار کا ہے۔ اِس کتاب میں سرور نے اپنے، اپنے اُستاد نوازش کے اور دوسروں کے اشعار اچھی خاصی تعداد میں شامل کیے ہیں؛ جن اشعار کے انتساب کا سُراغ لگ سکا، اُن کی نشان دہی کی گئی ہے۔ متن میں ایسے اشعار پر گول دائرے کے اندر انگریزی ہندسے لکھے گئے ہیں۔ اِن ہندسوں کو اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پہلے اختلافِ نسخ کا طویل ضمیمہ بھی مرتب کیا گیا تھا اور اُس کے لیے ہر صفحے پر بہت سے

نمبر شمار ڈالنا پڑے تھے : انتسابِ اشعار کے نمبر شمار کو اُن سے الگ رکھنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ بعد میں اختلافِ نسخ والے بند سے تو ہر صفحے سے مٹا دیے گئے، یہ انگریزی ہند سے باقی رہ گئے۔ اِن کو بدلنے میں مزید طولِ عمل تھا، یوں اِنھیں برقرار رکھا گیا۔

میر سوز کے اشعار کے لیے اُن کے دیوان کا کئی جگہ حوالہ دیا گیا ہے ؛ اِس سے مراد وہ دیوان ہے جو رسالۂ اُردوے معلّیٰ [دہلی یونی ورسٹی] کے "میر سوز نمبر" میں شائع ہوا تھا۔ میر تقی میر کے اشعار کے لیے کلیاتِ میر مرتبۂ آسی کا حوالہ دیا گیا ہے ؛ "کلیات" سے یہی مراد ہے۔ نوآزش کے اشعار کا مقابلہ اُن کے خطی دیوان مخزونۂ خدا بخش لائبریری پٹنہ سے کیا گیا ہے۔ میرے علم میں اِس دیوان کا یہ واحد نسخہ ہے [یہ دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے]۔ ناسخ کے اشعار کے لیے کلیاتِ ناسخ طبعِ اوّل [۱۲۵۸ھ] اور طبعِ ثانی [۱۲۶۲ھ] دونوں نسخے پیشِ نظر رہے ہیں۔

④ دیباچۂ کتاب میں [ص ۱ سے ص ۳۱ تک] افراد، مقامات، عمارات [وغیرہ] کے جو نام آئے ہیں [اِس میں شعرا کے تخلص بھی شامل ہیں] چوتھے ضمیمے میں اُن کو شامل کیا گیا ہے۔ البتہ چار نام ایسے ہیں جو دیباچۂ کتاب میں نہیں، اصل کتاب میں ہیں ؛ یہ نام ہیں : مرزا حسین بیگ، درگا پرشاد مدہوش، للّوجی اور گھنٹا بیگ کی گڑھیا۔ اوّل الذکر سرور کے خاص دوست تھے اور باشندۂ لکھنؤ۔ مدہوش نے اِس کتاب کی تاریخ لکھی ہے جو شاملِ کتاب ہے اور یہ بھی سرور کے احباب میں سے تھے۔ لکھنؤ میں للّوجی اپنے زمانے میں کتھک کے باکمال فن کار تھے اور آخر الذکر لکھنؤ کے ایک محلے کا نام ہے ؛ اِس بنا پر اِن ناموں کی شمولیت ضروری سمجھی گئی۔ اِسے استثنا سمجھا جائے۔

دیباچۂ کتاب [اور کتاب] میں جمشید، رستم، اسفندیار، حاتم جیسے متعدد نام آئے ہیں ؛ لیکن یہ نام عموماً صفاتی حیثیت سے آئے ہیں [جیسے : جم شوکت] ایسے ناموں کو فرہنگ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ کتاب میں معروف شعرا کے جو نام [یا تخلص] آئے ہیں، [جیسے انشا، مصحفی وغیرہ] اِن سے لوگ عموماً واقف ہی ہیں : اِس لیے اِن کو اِس ضمیمے میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہی صورت معروف شہروں کے ناموں کی ہے [جیسے :

کلکتہ، ملتان، کان پور، دہلی وغیرہ] سرور کے رکھے ہوئے نام، جیسے: انجمن آرا، نزنگار، فسحت آباد بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، کیوں کہ یہ نام محض علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۵) پانچواں ضمیمہ تلفظ اور املا سے متعلق ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ خاص خاص الفاظ پر جو اعراب لگائے گئے ہیں یا جو املا اختیار کیا گیا ہے، اُس کی وجہ اور بُنیاد کیا ہے۔

(۶) چھٹا ضمیمہ "الفاظ اور طریقِ استعمال" پر مشتمل ہے۔ اِس میں ایسے لفظوں اور عبارت کے ٹکڑوں کو یک جا کر دیا گیا ہے جو اُس عہد کی زبان پر کام کرنے والوں کے مفید مطلب ہو سکتے ہیں۔ اِس ضمیمے کے اندراجات سے اِس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سُرور کی زبان کا احوال کیا ہے، اُس میں کس قدر پُرانا پن ہے اور کچھ لفظوں کو اُنھوں نے کیسے عجیب ڈھنگ سے استعمال کیا ہے، جمع الجمع، عدد معدود میں واحد اور جمع کی نسبت کا احوال کیا ہے اور مبیّنہ متروک لفظوں کا کس قدر ذخیرہ اُن کی اِس کتاب میں محفوظ ہے [یعنی ایسے لفظ اور ایسا طریقِ استعمال، جسے بعد والوں نے متروک اور غیر مستحسن قرار دیا]۔

(۷) ساتواں ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے۔ اِس ضمیمے کے سلسلے میں دو وضاحتیں ضروری ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ ضمیمہ صرف دیباچۂ فسانۂ عجائب پر مشتمل ہے [یعنی ص ۱ سے ص ۱۳ تک]۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابتدا میں جب اِس کام کا خاکہ بنایا گیا تھا تو یہ طے کر لیا گیا تھا کہ مکمل متن پر مشتمل ضمیمۂ اختلافِ نسخ تیار کیا جائے گا۔ خاص کر اسی کام کے لیے وہ سارے نسخے ڈھونڈے گئے جن کی شمولیت ضروری تھی۔ بہت کچھ دیدہ ریزی کے بعد مکمل اختلافِ نسخ کا ضمیمہ تیار کر لیا گیا۔ اِس کے لیے ہر صفحے پر متن میں نمبر شمار بھی ڈالے گئے۔ یہ ضمیمہ پچاسئ صفحات میں سمایا تھا۔ [اُس وقت تک نسخۂ د کی اطلاع نہیں تھی اور ن کی پہلی اشاعت [۱۲۸۳ھ] نہیں ملی تھی، دوسری اشاعت سے کام لیا گیا تھا۔ باقی سب نسخے یعنی ح، م، ض، ک، ف، ل موجود تھے، اِن سات نسخوں کی مدد سے اختلافِ نسخ تیار کیا گیا تھا]۔ جب سب کام مکمل ہو گیا تو معلوم ہوا کہ زیادہ ضخامت کی وجہ سے یہ کتاب نہیں چھپ سکتی [وہی پُرانی بات، دفتری خامہ فرسائی] مشورہ کیا گیا، طے یہ ہوا کہ اختلافِ نسخ کے اِس حصّے کو شامل نہ کیا جائے، اِس طرح کچھ تو ضخامت

کم ہو گی۔ یہ ایسی مجبوری تھی جس کا علاج میرے پاس نہیں تھا۔ اصولِ تدوین کے لحاظ سے یہ قطعی طور پر درست نہیں، مگر مجبوری تھی۔ اُس حصّے کو الگ کر دیا گیا۔ اِس کے نتیجے میں یہ بھی کرنا پڑا کہ متن کے جملہ صفحات پر مندرج اختلافِ نسخ کے نمبر شمار پر سفیدا لگانا پڑا۔

اِس سلسلے میں یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ دیباچۂ کتاب کا حصہ اختلافِ نسخ کے لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اِس کے صفحات بھی زیادہ نہیں؛ اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ اِس حصّے کا اختلافِ نسخ مرتب کر دیا جائے۔ یہ بات مجھے بھی مناسب معلوم ہوئی۔ حُسنِ اتفاق سے اُسی دوران نسخۂ د کا علم ہوا اور وہ مل بھی گیا۔ اِسی طرح مطبعِ نول کشور کی اشاعتِ ۱۲۸۳ھ بھی مل گئی۔ اِن دونوں اشاعتوں کو شامل کر کے، اب اِس کتاب کے آٹھ نسخوں کی مدد سے اِس حصّۂ کتاب کا اختلافِ نسخ ازسرِ نو مرتب کیا گیا۔ اِسی لیے آپ دیکھیں گے کہ اِس ضمیمے کے صفحات کی کتابت پوری کتاب کی کتابت سے بالکل مختلف ہے اور اُس قدر بہتر نہیں، بل کہ یوں کہیے کہ بدتر ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا کہ اِس بے جوڑ پیوند کاری کو مجبوراً گوارا کرنا پڑا۔ بہ ہر حال اختلافات کے لحاظ سے یہ مختصر حصّہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔

ضمیموں کے بعد آٹھواں حصّہ فرہنگ کا ہے۔ اِس کے سلسلے میں صرف یہ کہنا ہے کہ کوشش یہ کی گئی ہے کہ لفظوں کے وہی معنی لکھے جائیں جن معنوں میں وہ استعمال میں آئے ہیں۔ اگر معانی کے ذیل میں چند ضروری لفظ مزید لکھے گئے ہیں تو اُس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصل معنی کی مزید وضاحت ہو جائے۔ بعض لفظوں کے آگے اُن صفحات کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جہاں وہ آئے ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ اِس کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ یہ سارے لفظ صرف اُنھی صفحات پر آئے ہیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ حوالہ اُس صفحے کا دیا جائے جہاں وہ پہلی دفعہ آیا ہے۔ اِس کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ صفحات کا حوالہ زیادہ الفاظ کے تحت آنا چاہیے تھا۔ میرے ذہن میں تھی تو یہی بات؛ مگر اِسے فروگذاشت کہیے یا میری بدحواسی، کہ ایسے الفاظ کی تعداد کم رہی۔ [باغ و بہار کی فرہنگ جو میں نے بنائی ہے، اُس میں اِس فروگذاشت کو دخل نہیں ملنے پایا ہے]۔

آخری حصّہ اشاریے کا ہے۔ اِس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اشاریہ صرف متنِ کتاب

پر مبنی ہے؛ یعنی مقدمۂ مرتب اور ضمیموں کے حصے اِس کے دائرے میں شامل نہیں۔

ہاں یہ صراحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ اِس کتاب کے ابتدائی حصے میں [یہ شمولِ مقدمۂ مرتب و فہرستِ عنوانات فسانۂ عجائب] صفحات پر نمبرِ شمار علاحدہ سے ڈالے گئے ہیں اور متنِ کتاب کے صفحات کے نمبرِ شمار ازسرِ نو صں ۱ سے شروع ہوتے ہیں۔ ایسا یوں ہوا کہ ضمیموں کے اندراجات کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ متن پر نمبرِ شمار موجود ہوں [متن کی کتابت پہلے ہوئی تھی] تاکہ صفحات کا حوالہ دیا جاسکے۔ مقدمہ [حسبِ روایت اور حسبِ معمول] ضمیموں کی تکمیل کے بعد لکھا گیا۔ امتیاز کی خاطر ابتدائی حصے کے صفحات پر نمبرِ شمارِ صفحات کے نچلے حصے میں لکھے گئے ہیں، جب کہ باقی کتاب میں صفحات کے نمبرِ شمار [حسبِ معمول] صفحات کے اوپری حصے پر ہیں۔ اِس طرح اِس کتاب میں کُل صفحات ۷۱۹ ہیں۔

باعثِ تاخیر

یہ کام بہت پہلے مکمل ہوگیا تھا، مگر چھپنے کی نوبت اب آرہی ہے۔ تاخیر کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ جب اِس متن کی تدوین کا کام مکمل ہوگیا اور کتابت بھی ہوگئی، صرف مقدمہ لکھنا باقی تھا؛ اُسی زمانے میں مجھے پٹنہ جانا پڑا۔ وہاں خدا بخش لائبریری کے ذخیرۂ ادارۂ تحقیقاتِ اُردو کی فہرست میں فسانۂ عجائب کا ایک نسخہ مطبوعۂ ۱۲۸۰ھ نظر پڑا۔ میں حیران ہوا، کیوں کہ اُس وقت تک اِس سنہ کے کسی نسخے کا علم نہیں تھا۔ اب جو اُسے نکلوا کر دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہ گیا؛ معلوم ہوا کہ یہ تو مصنف کا نظرِ ثانی کیا ہوا نسخہ ہے۔ جس قدر مسرت ہوئی، اُسی قدر حیرانی بھی؛ اب کیا کیا جائے! ایک صورت تو یہ تھی کہ کتابت شدہ متن کو اسی طرح رہنے دیا جائے، آخر میں ایک نوٹ شامل کردیا جائے جس میں اِس نسخے کی بازیافت کی اطلاع ہو اور اِس مجبوری کی بھی کہ یہ ایسے وقت ملا ہے جب اِس سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آسان راستہ تھا؛ لیکن اصولِ تدوین کے احترام اور اخلاقی ذمے داری کے احساس نے اِس آسان پسندی کی اجازت نہیں دی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ متن کو ازسرِ نو مرتب کیا جائے، اور یہی کیا گیا۔ اِس میں اچھا خاصا وقت صرف ہوا۔

اِس کے علاوہ بعض وجوہ اور بھی تھے [جن کے بیان کا یہ محل نہیں] جن سے صحیح معنی میں تاخیر ہوئی اور کئی سال تک یہ کام یوں ہی پڑا رہا۔ میں تو اس کے چھپنے سے نا اُمید ہو چکا تھا کہ اچانک اِس کی طباعت کا انتظام ہو گیا۔ اب ایک بار پھر پورے کام پر نظر ڈالی گئی، اختلافِ نسخ کا ضمیمہ تیار کیا گیا اور مقدمہ لکھا گیا۔ اِس تاخیر سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نسخۂ د اور نسخۂ نول کشور ۱۲۸۳ھ سے استفادہ کیا جا سکا۔ اِس لحاظ سے یہ تاخیر فائدہ بخش اور "دیر آید درست آید" کا مصداق ثابت ہوئی۔

اِس کام کی تکمیل میں بہت سے دوستوں اور عزیزوں نے مدد کی۔ ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر فضل الحق اور جناب رئیس نعمانی نے اِس کتاب کے اکثر مطلوبہ نسخے فراہم کیے۔ ڈاکٹر فیروز احمد [جے پور] اور عزیزِ مکرم انور قمر نے بالترتیب نسخۂ مطبوعۂ آگرہ اور نسخۂ کریم الدین کے صفحات کے عکس بھیجے۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر حنیف نقوی اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی سے مراسلت ہوتی رہی؛ بہت سی باتوں پر مشورہ بھی کیا گیا اور بحث بھی کی گئی۔ اِس میں نیر مسعود صاحب کا حصہ سب سے زیادہ ہے؛ اُنھوں نے سُرور کی بعض دیگر تصانیف کے علاوہ اِس کتاب کے تین اہم نسخے بلا تکلف دے دیے اور بہت سے خطوط کے مفصل جوابات بلا تاخیر لکھتے رہے۔ صباح الدین عمر صاحب سے بعض الفاظ اور اصطلاحوں کے مفہوم پر طویل تحریری گفتگو ہوئی۔ ضمیمۂ تشریحات میں ص ۳۷۱ پر حاشیۂ صفحہ ۱۶ کے تحت چوسر کی بعض اصطلاحوں سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ انھی کا سمجھایا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اشرف [صدرِ شعبۂ عربی دہلی یونی ورسٹی] سے عربی کے بعض الفاظ اور عبارتوں کے سلسلے میں مشورہ کیا گیا۔ جناب امیر حسن نورانی اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے شروع میں اختلافِ نسخ کی تیاری میں چند روز تک تعاون کیا تھا۔ میں اِن سب حضرات کا بہ دل سے منت پذیر ہوں اور شکر گزار۔ میں اپنے عزیز دوست اور موجودہ صدرِ شعبۂ اُردو ڈاکٹر قمر رئیس کا بہ طورِ خاص ممنون ہوں جن کی ذاتی دل چسپی کی بہ دولت یہ کتاب اشاعت کے مرحلے سے گزر سکے گی؛ ورنہ میں تو اسے گلدستۂ طاقِ نسیاں فرض کر چکا تھا۔ محبّی ڈاکٹر خلیق انجم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی کوششوں سے یہ کتاب انجمن ترقیِ اُردو کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل ہوئی۔

آخر میں خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں سید ابو جعفر زیدی صاحب کا، جنھوں نے اِس کی کتابت میں بہت جان کھپائی ہے اور مجوّزہ پابندیوں اور التزامات کی پوری طرح پابندی کی ہے۔ یہ بہت مشکل کام تھا، خاص کر اِس زمانے میں، جب کہ مبیّنہ کاتبوں کی تعداد تو بڑھتی جاتی ہے، مگر صحیح معنی میں جن کو خوش نویس کہا جا سکے، اُن کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔

توقّع کرتا ہوں کہ کلاسکی نصابی متنوں کی تدوینِ نو کے سلسلے کی یہ پہلی کتاب اہلِ نظر کی پسندیدگی کے شرف سے محروم نہیں رہے گی، نیز اساتذہ اور طلبہ کے لیے یہ زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ اِس سلسلے کی دوسری کتاب باغ و بہار ہے، جو تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور جلد ہی طباعت کے مرحلے سے گزر سکے گی۔ مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزارِ نسیم اور نوطرزِ مرصّع اِس سلسلے کی دوسری کتابیں ہیں، نیز قصائدِ سودا کا ایک ایسا مجموعہ بھی اِس فہرست میں شامل ہے جس میں اُن کے جملہ اہم [اور نصابی] قصائد یک جا ہوں گے۔

رشید حسن خاں
شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی
یکم اگست ۱۹۸۹ء

فہرستِ عنوانات فسانۂ عجائب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَہٗ نَسَباً وَّ صِھْراً ط وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیْراً O

سزاوارِ حمد و ثنا خالقِ ارض و سما، جَلَّ وَعَلا، صانعِ بےچون و چرا ہے؛ جس نے رنگِ بے ثباتی سے، بہ ایں رنگا رنگی، تختۂ چمنِ دُنیا پُر از لالہ و گُل جزو کُل بنایا۔ اور باوُجودِ ترسِ باغبان و بیمِ صیّاد، وَلولۂ رُخِ گُل بلبل کو دے کر دامِ محبّت میں پھنسایا۔ اور عاشقِ باوَفا و معشوقِ پُر دَغا کو ایک آب و گِل سے خمیر کرکے، پردۂ غیب سے بہ عرصۂ شہُود لایا۔ ایک خِلقت سے دُو طَرح کا جلوہ دکھایا اور انسانِ ضعیف بُنیان کو اَشْرَفُ الْمخلوقات فرمایا۔

جلوۂ حُسنِ بُتاں بہ خُدا شیفتگی کا بہانہ ہے۔ نالۂ بلبلِ شیدا گوشِ گُلِ رعنا کا ترانہ ہے۔ اُس کی نیرنگیوں کے مشہور فسانے ہیں، ہم اُس کی قدرتِ کاملہ کے دیوانے ہیں۔ صفت اُس کی مُحال ہے، زبان اِس تقریر سے لال ہے۔ جس کی شان میں مُخبرِ صادقؐ یہ فرمائے، دوسرا اِس عُہدے سے کب بَر آئے: مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ۔

عنان تابیِ اَشہبِ خامہ وادیِ نعتِ رسولِ مجتبیٰ محمدِ مصطفیٰ سزاوارِ اُلوف تحیت و ثنا میں۔

بعدِ حمدِ خالقِ جن و بشر، حاکمِ قضا و قدر، مُبدِعِ شام، طالعِ سحر؛ نعت سیدِ کائنات، خلاصۂ موجودات، بہترینِ عالم، برگزیدۂ نوعِ بنی آدم کی ہے؛ جس کے چراغِ ہدایت کی روشنی سے تیرہ بخت، گم گشتۂ کوچۂ ضلالت بہ راہِ راست آئے۔ بہ توفیقِ رفیق اور مدارجِ تحقیق کیا کیا مرتبے بلند پائے۔ اور منحرف کور باطنوں کو فہمِ ناقص کی کجی اور زعمِ فاسد، وہمِ باطل نے کیسے کیسے روزِ سیاہ دکھائے۔ اُس کے حق میں یہ حکمِ حق آیا ہے؛ بہ چشمِ غور دیکھو تو، کسی اور نے ایسا رتبۂ رفیع اِس خاکدانِ پست بنیاد میں پایا ہے: لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔ سرحلقۂ اَوّلین، خاتمُ المرسلین، مظہرِ صنعتِ کریم، اَحمدِ بے میم، شفیعِ عرصۂ جزا محمدِ مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہِ الطَّاہِرِیْنَ وَاَصْحَابِہِ الْمُکَرَّمِیْنَ وَسَلَّمَ۔ کوئی شاعر اُس کی شان میں کہتا ہے، لا اَعلم:

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدۂ ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدۂ

اے ختمِ رُسل! قُربِ تو معلومم شد دیر آمدۂ، ز راہِ دور آمدۂ

اِس مشتِ خاک کا کیا فہم اور اِدراک، جو شمۂ صفاتِ ذاتِ بابرکات زبان پر لائے، جو عُشرِ عشیر بھی نہ در آئے۔ کام و زباں ناکامی سے فوراً جل جائے۔

اور منقبتِ امیرالمومنین، اِمامُ المتقین، یکّہ تازِ میدانِ لافتیٰ،

خُلاصۂ مضمونِ سوُرۂ ھَلْ اَتیٰ یہی کافی ہے جسے پیمبر نے کہا : لَحْمُکَ لَحْمِیْ وَ دَمُکَ دَمِیْ ۔ عَلِیٌّ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْہُ ۔

اور مَدْحِ اَہْلِ بَیتِ رِسالت کہ وِلا اُن کی، ایمان کی دلیل ہے اور مُحبّت اُن کی، ہر فردِ بشر کو واجِب بہ ایں حدیثِ جلیل ہے، حدیث : مَثَلُ اَہْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھا نَجیٰ وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْہا غَرِقَ وَھَویٰ ۔

زمزمہ پردازی عَندلیبِ نغمہ سراکی گلشنِ حالِ سلطان ابوالمظفر، شاہِ زمن، قُباد شوکت، وارثِ دوُدمانِ سعادت ہیں ۔

پَس اَز حمدِ خُدا و نعتِ سَروَرِ اَنْبیا؛ لازِم و ضَرور ہے کہ مَدحِ وَالیِ ملک بیان کرے ۔ قَوْلُہٗ تَعالیٰ : اَطِیْعُوا اللہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۔ اگرچہ صِفتِ شاہ گدا کی زبان بہ مَعرِضِ بیان لائے، تو "چھوٹا مُنہ بڑی بات" تمام کائنات کہنے لگے؛ مگر نامِ نامی، توصیفِ ذاتِ گرامی اُس کی، وسیلۂ توقیرِ اِس تحریر کا اور مِفتاحِ بابِ اِس پریشاں تقریر کا جان کر؛ شمّہٗ اَز شمائل و ذرّہٗ از خورشیدِ خصائل رَقَم کرتا ہوں ۔

شاہِ کیواں بارگاہ، بلند مرتبہ، عالی جاہ؛ سَرحلقۂ شاہانِ والاتَبار، جَمْ شوکت، فَریدوں فر، سُلیمان اِقتدار؛ کِشورگیر، مُلک سِتاں، خدیوِ گیہاں؛ اَبُوالمُظفّر، مُعِزُّ الدّین، شاہِ زمن غازِیُ الدّین حیدر

بادشاہِ غازی خَلَّدَ اللہُ مُلْکَہٗ وَ سَلْطَنَتَہٗ وَ اَیَّدَہُ اللہُ بِالنَّصْرِ وَالظَّفَر جَلَّ جلالہٗ۔

اگر مَعْرَکۂ رَزْم یا صُحبتِ بزم اُس کی اِنشا کروں، صَفحۂ دُنیا پر نہ لکھ سکوں۔ دمِ رَزْم: رُستم و سام و نَریمان مثلِ پیرزال لرزاں۔ اور وقتِ سخا اور عطائے زَر و مال: حاتم کے ہاتھ میں کاسۂ سوال۔ بزمِ طَرَب میں: زُہرہ اور مُشتری سَرگرمِ نغمہ پَردازی و عَربَدہ سازی۔ ہنگامِ عتاب و خَشم: مِرّیخ مُستَعِدِ جلّادی و بیدادی۔ یہ اَدنیٰ عنایت ہے، بیت:

چُناں بموسمِ سرما دوشالہا بخشید | کہ گرم شد ہمہ بنگالہ، سرد شد کشمیر

بس کہ سَحابِ بخشش اُس بحرِ عطا کا روز و شب مَزرعۂ کِہ و مِہ پر بارِش رکھتا ہے؛ شہر میں سالہا کان مشتاق سائل کی صدا کا اور دیدہ ندیدہ صورتِ گدا کا رہتا ہے۔ بحرِ مَوّاجِ فیض دن رات بہتا ہے۔ عَدل یہ کہ ہاتھی، چیونٹی سے ڈرتا ہے؛ شیر، بکری کی اِطاعت کا دم بھرتا ہے۔ بہ چشم اُس کے عَہدِ دولت میں ہزاروں نے دیکھا ہے: بکری شیر کے بچّے کو شِیر پلاتی تھی، کِنار میں شَفقت سے سُلاتی تھی۔ بازِ تیز پرواز بچۂ کُنجشک کا دَم ساز اور نگہباں۔ بلّی کی عادتِ جِبلّی یہ کہ کبوتر سے ہراساں۔ دُودِ دلِ اَندوہ ناک رَوزَنِ ہر خانہ سے مَسدُود۔ شَحنۂ داد رَخنہ بندیِ فَساد کو موجود۔ اللہ تعالیٰ اُس اُمّیدگاہِ عالَم و عالَمیاں کو اپنے حِفظ و اَمان میں سلامت رکھے۔

دَولت خواہ اُس والاجاہ کے بہ عیش و شادی مُدام اور دشمنِ رُوسیاہ بہ رنجِ نامُرادی گرفتارِ آلام رہیں؛ بہ حقِّ ربِّ ذُوالمِنَن، بہ تصدّقِ پنجتن۔

تقریرِ مُورّخِ دل پذیر کی، کیفیت شہرِ بے نظیر کی۔ ذکرِ صنعتِ کاملینِ علم و فن، واقفانِ رُموزِ سُخن و تذکرۂ اہلِ حرفہ، دُکان دار بہ طرزِ یادگار۔

یہ مُبتلٰی دِہاں، ہیچ مَداں، مُحَرِّرِ داستاں، مُقلِّدِ گُذشتگاں، سراپا قُصور مرزا رجب علی، تخلّص سُرور؛ مُتوطِّنِ خطّۂ بے نظیر، دل پذیر، رشکِ گُلشنِ جناں، مَسکنِ حور و غِلماں۔ جاے مَردُم خیز، باشندے یہاں کے ذکی، فہیم، عقل کے تیز۔ اگر دیدۂ انصاف و نظرِ غور سے اِس شہر کو دیکھے، تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے، ہر بار یہ کہے، شعر:

سُنا، رِضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سُبحانَ اللہِ وَبِحَمدِہٖ! عجب شہر گُلزار ہے۔ ہر گلی دل چسپ؛ ہر کوچہ ہے، باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طَور کا با وضع، قطع دار ہے۔ دو رویہ بازار کس انداز کا ہے! ہر دُکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ گو، ہر محلّے میں جہان کا ساز و سامان مُہیّا ہے؛ پر، اکبری دروازے سے جِلَو خانے اور پکّے پُل

تک، کہ صراطِ مستقیم ہے، کیا جلسہ ہے! نان بائی خوش سلیقہ۔ شیرمال، کباب، نان، نہاری، بلکہ جہان کی نعمت اِس آب داری کی! جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطّر ہو جائے۔ فرشتہ گزرے تو سونگھے، مست ہو جائے، غنودگی میں اونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھنے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سُرخ سُرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سُریلی چھنکار۔ شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ، بھُربھُری؛ ایک بار کھائے، نانِ نعمت کا مزہ پائے، تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔

کباب اِس آب و تاب کے کہ مُرغانِ ہوا، ماہیانِ دریا کا دل سیخ آہ پر متصل حسرتِ محرومی سے کباب۔ ادرک کا لچھا میاں خیر اللہ کی دُکان کا بال سے باریک کترا، ہاضم، نایاب۔ حُسینی کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن۔ اُس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند، جہان کو پسند۔ پپڑی لذیذ، دبیز، بسی بسائی، پستہ و بادام کی ہوائی؛ ہونٹ سے چبائے، دانت کا اُس پر تمام عمر دانت رہے، لگانے کی نوبت نہ آئے۔ جوزی: خوب۔ حبشی: اہلِ ہند کو مرغوب۔ دودھیا: شیر خوارہ نوش کر جائے۔

ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون: آدمی صورت دیکھتا رہے، رُعبِ حُسن سے بات نہ کر سکے۔ سنگر نہیں پری زاد، سرو قامت، رشکِ شمشاد۔ دکانوں میں انواع اقسام کے میوے قرینے سے چُنے۔ روزمرّے، محاورے اُن کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اٹھی، میٹھے بٹھائے قہقہہ مار اٹھی کہ: ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے! کھانے والو زور مزہ ہے! کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ برجستہ

سُناتی، جوبن کی جھمک دِکھاتی: مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں! کسی طرف یہ صدا آتی: گنڈیریاں ہیں پونڈے کی! ایک طرف تنبولی سُرخ روئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے، بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہردم یہ دم بھرتے: مگہ کا منہ کالا، مہوبا گرد کر ڈالا! کیا خوب ڈھولی ہے، ابھی کھولی ہے۔ عبیر ہے نہ گلال ہے، آدھی میں مکھڑا لال ہے۔

گلیوں میں گجر دم یہ آواز آتی: شیر مال ہے گھی اور دودھ کی! مفلس کا دل اُچاٹ ہے، ٹکوں کی چاٹ ہے۔ کدھر لینے والے ہیں؛ نمش کی قُفلیاں، کھیر کے پیالے ہیں! کیا خوب بھُنے، بھر بھرے ہیں؛ چنے، پرمل اور مرمرے ہیں! جیٹھ بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل انڈا چھوڑتی؛ دو پیسے کو برف کی قُفلی جمی دو کھائے، بدن تھرائے۔ زیادہ ہو کا کرے؛ لقوے، فالج میں مرے۔

سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا، نسیم و صبا کو سیدھا رستہ نہ ملا۔ شیخ کولی کی مٹھائی جس نے کھائی: جہان کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا؛ بنارس کا کھجلا بھولا، متھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا۔ برفی کی نفاست، بو باس، گھوئے نے ہوش کھوئے۔ وہ اُس کا دردراپن، نقرئی ورق کا جوبن؛ کسی اور شہر کا رکاب دار اگر دیکھ پائے، یا ذائقہ لب پر آئے: زندگی تلخ ہو، جب تک جیتا رہے، ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ اِمرتیِ مسلسل کا ہر پیچ ذائقے کو پیچ تاب دیتا، یا قوتی مفرح کا جواب دیتا۔ جب منہ میں رکھا اصل تو یہ ہے عسلِ مصفّٰی جنت کی نہر کا حلق

سے اُترا۔ پَراچیوں کی گلی کی کھجور: لذّت ٹپکتی، ذائقے میں چھوہ، بہتر از انگور؛ نہایت آب و تاب، ہم خرما ہم ثواب۔

نُورا کی دُکان کی بالائی جب نظر آئی، بِلّور کی صفا سے دل مُکدّر ہوا؛ نورٌ علیٰ نور کہہ کر، بے قند و شکر، شُکرِ خدا کر کر، چھُری سے کاٹی اور کھائی۔ مَدارِیے حُقّے وہ ایجاد ہوئے، گنگر ایسے اُستاد ہوئے کہ جب تڑاقا اُن کا سُنا؛ پیچوان کا دم بند ہوا، سب کو پسند ہوا۔ پیسے کا مَداریا کہیں دُنیا میں مدِّ نظر نہ ہو، دو روپے کو میسّر نہ ہو۔ پٹھانا کا تنباکو مُشک و عنبر کی خوش بو؛ جس نے ایک گھونٹ کھینچا، اُسی کا دم بھرنے لگا۔ آغا باقر کے امام باڑے سے مُتّصل جو تنباکو کی دُکان ہے، شائق اُس کا سب جہان ہے۔ محمدی اُس کا نام ہے، تبرک سمجھ کر لے جاتے ہیں، زبان زدِ خاص و عام ہے۔

رنگ ریز سُبک دست، طبیعت کے تیز۔ جو پھول دِکھایا؛ اُنھوں نے کپڑے پر اُس سے ڈہڈہا گُل کھلایا، نَقل کو اَصل میں مِلایا۔

عَلَی الخُصوص مردِ تماش بیں کے واسطے یہ شہر خَرّاد ہے، ہر فن کا یہاں اُستاد ہے۔ سیکڑوں گھامڑ، بدگِل، کُندۂ ناتراش، زُعمِ باطل میں عیّاش؛ اَطراف و جوانب سے آ، ہفتے عشرے میں چھیل چھلا وَضع دار ہوگئے۔ گومتی میں غُوطہ لگایا، دیہاتی پن کے دھبے دھوگئے، آدمی ہوگئے۔ ابوتراب خاں کے کٹڑے میں جا، میاں خیراتی سے، کسی کی خیرات میں خط بنوایا؛ بارہ برس کے سِن کی گالوں میں لوچ آئی، گو گردن میں موچ آئی۔ چار پہر کھونٹی

ٹٹولی، پتا نہ پایا۔ کاتبِ قدرت کا لکھا مٹاتا ہے، ایسا خط بناتا ہے۔

سید حسین خاں کے کٹرے کے دروازے پر عبداللہ عطر فروش کی دکان، جائے نشستِ ہر وضع دار جوان ہے۔ دو پیسے میں بیلے، چنبیلی یا حنا کا تیل، ریل پیل، فتنہ بپا کرنے والا ایسا ملا کہ سہاگ کا عطر گرد ہوگیا، جون پور سے دل سرد ہوگیا۔ عطر کی روئی رکھی کان میں، جا بیٹھا کسی افیونی کی دکان میں۔ سفید سفید چینی کی پیالیاں خوب صورت، رنگتیں نرالیاں۔ افیون فیض آبادی گلاب باڑی والے لالے کی وہ رنگین جس نے تریاکِ مصر کے نشے کرکرے کیے۔ جھمکڑا بادۂ ارغوانی و زعفرانی کا پیدا، یاقوت رشک سے ہیرا کھاتا۔ تبدیلِ ذائقے کو فرنی کے خونچے، نقرئی ورق جمے، پستے کی ہوائی پر بادام کا دل دو ٹکڑے ہو کر پستا۔ یا بمبئی کا پونڈا نرم، گندہ، قند و شہد کا سینچا۔ اگر پوپلا مسوڑھوں سے چبائے، شربت کا گھونٹ حلق سے اتر جائے۔ ادھر چسکی پی، یا اشکِ بلبل کا دورِ تسلسل ہوا، آنکھوں میں گل کھلا۔ پھر ایک دم کے بعد حقے کا دم کھینچا، حجاب کا پردہ اٹھ گیا۔ وہاں سے بڑھا، کان میں آواز آئی: بیلے کے ہار ہیں شوقین البیلے کو، پہن لے، چلا جا فرنگی محل کے میلے کو! جب یہ سج بنی، بگڑا، پنجوں کے بل چلا۔ یہ پھولا، وطن کی چال ڈھال، رہ و رسم بھولا۔ اکثر باہر سے آ، یہ دھج بنا، جون پور کے قاضی ہونے کو مفتی میں راضی ہوگئے ہیں۔ جمع پونجی پریشان ہو کے کھو گئے ہیں۔"

اگر برسات کا موسم ہے تو شہر کا یہ عالم ہے: اِدھر مینہ برسا، پانی

جا بہ جا سے بہ گیا، گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زردوزی جوتا پہن کر پھرے، سلیقہ شرط ہے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ باغ بہار کے صنعتِ پروردگار کے۔ رضوان جن کا شائق، دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشے کا میلا، ہر وقت چین کا جلسہ۔ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دِکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا۔ سڑک کے درختوں کی فضا؛ جدھا، کھجوا موجیں مارتا۔ ہار سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا۔ رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک؛ تختۂ لالہ و نافرمان جن پر قربان۔ بندہ ہائے خاص کی سبک روی، خرام ناز۔ ہر قدم پر کبکِ دری چال بھول کر جبینِ نیاز رگڑتے۔ شاخِ سرو شمشاد قامتوں کے روبہ رو نہ اکڑتی۔ شائق ہزار در ہزار، شمع پروانوں کا عالم، غول کے غول باہم۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا، خاص جھولا وہیں پڑا۔ جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا۔ محبت کے پینگ بڑھتے، دیکھنے والے درود پڑھتے۔ باغ میں کوئل، پپیہے، مور کا شور۔ جھولے پر گھٹا رہی اور بھی گھنگھور۔ ساون بھادوں کے جھالے، وہ رنگین جھولنے والے!

دشتِ غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے؛ دل پاش پاش ہو کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کان پور کی برسات، ہیہات! ہیہات! دخل کیا دروازے سے باہر قدم رکھے اور پھسل نہ پڑے۔ گلی میں پاؤں رکھا، کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا۔ دو اس فصل میں باہم نہ دیکھے، مگر چہلے کے پھنسے۔ اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جائیں کہیں۔

اُن کے حق میں ناحق برسات: حوالات، گھر: جہل خانہ۔ کیچڑ کے مُقیّد، کہیں جانا نہ آنا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے، تو چونک پڑے کہ پھسل گئے۔ اور جو بازاری، کاروباری ہیں، اُن کا یہ نقشہ دیکھا: ہاتھ میں جوتیاں، پائنچا چڑھا، کیچڑ میں لت پت، یہاں گرے، وہاں گرے؛ خُدا خُدا کر جیتے گھر پھرے۔ اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو، شعر:

دیکھی ہے یہ رسم اِس نگر میں — جوتا ہے گلی میں، آپ گھر میں

پھر بر سرِ مطلب آیا: خاص بازار کہ شہرِ وسیع و خوش قطع ہے، اُس کے نقشے سے مانی و بہزاد نے خار کھایا۔ شبیہ کشی تو کیا، خاکہ خاک نہ کھنچا، ہاتھ تھرّایا۔ کوٹھیاں فرح بخش و دل کُشا۔ بُرج ہر ایک جہاں نُما۔ سلطان منزل اور اِستری منجن نشاط افزا، توبہ شِکن۔ انسان کو، دیکھ کر سکتہ ہو جائے۔ کام اُن کا وَہم و قیاس میں نہ آئے۔ سرِ راہ کی بارہ دری جواہر سے جڑی۔ پری کی صورت کے قریب نہر جاری، تکلّف کی تیاری۔ پائیں باغ اُس کا جس نے دیکھا، باغِ اِرم سمجھا۔ سوسن نمط ہزار زبانیں بہم پہنچیں؛ تعریف نہ کر سکا، گونگے کا سپنا ہوا۔

رُومی دروازہ اِس رِفعت و شان کا ہے، گُذر گاہ ایک جہان کا ہے۔ اگر اُس پر چڑھ جائے؛ بامِ فلک پست معلوم ہو، فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے۔ سپہرِ اوّلیں اُس کی زمیں ہے شش جہت میں دوسرا نہیں ہے۔ مسجد اِنتخاب ہے۔ اِمام باڑہ لاجواب

ہے۔ مقبرے عالی شان، وہ نادر مکان کہ فلک بہ دیدۂ انجم نگراں ہے۔ اُن کے نظیر کی جستجو میں، مشعلِ مہ و خورشید روز و شب رَوشن کیے، کُو بہ کُو سرگرداں ہے۔ اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ اُن میں ہاتھ آئے، سرِ دست مرجانے کو جی چاہے۔ گومتی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے، طبیعت لہراتی ہے۔ دو رویہ آبادی، عمارت۔ کہیں رَمنے، کسی جا باغ بنے۔ صُبح و شام وہ بہار ہے کہ شامِ اَوَدھ اور بنارس کی سحر نثار ہے۔

شہر نفیس، مجمعِ رئیس۔ ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ خوش نویس حافظ ابراہیم صاحب سا۔ اِس قطع کا قطعہ لکھا: جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے، اپنے لکھے کو رُوتے، اشکِ حسرت سے وصلیاں دُھوتے۔ مرزائی صاحب کی مشق کا کوئی پرچہ اگر نظر پڑ جاتا، نیریز بریز بریز کہتا، یاقوت رقم ہیرا کھاتا۔

مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرزِ نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخِ کُہن نے مُسلّمُ الثبوت اُستاد کیا۔ عِلمِ موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا؛ اِس طرح کا دُھرپت، خیال، ٹپا گایا اور بنایا کہ کبھی کسی نائک کے وَہم و خیال میں نہ آیا۔ ایک رنگین اِحاطہ کھینچا ہے؛ جو اُس میں آیا، پھولا پھلا، وہ اِن کا پیرو ہوا۔ اور جس نے ڈھنگ جُدا کیا؛ وہ ٹکسال باہر، بد رنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا، اِن کے نام پر کان پکڑتا۔ بھیک مانگ کھاتا، مگر نہ گاتا۔

ہزاروں شاگرد، جگت اُستاد ہوا؛ مولوی سب میں پری زاد ہوا۔ امیروں میں حُسین علی خاں بلبلِ ہزار داستاں، خوش اِلحاں۔ مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مردِ مسکیں۔ مکرُوہاتِ زمانہ سے کبھی افسُردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظمِ خوب، دبیرِ مرغوب۔ سکندر طالع، بہ صُورت گدا۔ بارِ احسان اہلِ دوَل کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیے، سلام کا دیوانِ کثیر فرمایا۔ شہر میں جتنے رئیس تھے، اُن کے انیس، جلیس تھے۔

طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے، قُمْ بِاِذْنِی کا دم بھرتا ہے۔ جسے دیکھا بُقراط، سُقراط، جالینوسِ زماں ہے۔ اِس معنی میں یہ خطّہ، رشکِ زمینِ یونان ہے۔ میرک جان صاحب پَیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مَردُمِ برّ و بحر سرگرمِ ثنا ہوئے۔ شاعر، زباں داں ایسے کہ عُرفی و خاقانی کی غلطی بتائی، فِردوسی و انوری کی یاد بھلائی۔ شیخ اِمام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور رُوزمرے کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلامِ سابقین منسُوخ ہوا۔ فُصحائے شیراز و اِصفہاں اِس سیفِ زباں کا جوہر دیکھ کے، لوہا مان گئے۔ اپنے قُبح پر مُنفعِل ہوئے، اِس زباں کا حُسن جان گئے۔ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا، سیکڑوں کو اُستاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی کی آتش بیانی، شرر افشانی سے دل جلوں کے سینے میں سوز و گداز ہے۔ مردِ قانع، شاعرِ مُمتاز ہے۔

فرنگی محل کا حال کیا لکھوں! کہاں زبان و دست کا یارا، جو

شمہ لکھتا۔ مولوی : فاضل، عدیم المثال۔ ہر شخص جمیع علوم کا اُستاد۔ کُتبِ دَرسی اِبتدا سے اِنتہا تک یاد۔ منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کردیا۔ مولوی انوار کی تجلّی اور پرِتوفیض سے جہان رُوشن۔ مولوی مُبین دور بیں، سراجِ انجمن، بحرالعُلوم۔ مولوی سیّد مخدوم جامعِ ہر عُلوم۔ مولوی ظہور اللہ سُبحان اللہ! ایسے فقیہ، محقق کہاں ہوتے ہیں! یہی لوگ نادرُ الزّمان ہوتے ہیں۔

اُدھر رُکنِ دیں بِلا کَد میر سیّد محمد مُجتہدِ مستند۔ مرزا کاظم علی مُتقی۔ آخون محمد رضا رضائے خُدا کا جُویا۔ حاملِ قُرآں، ہمہ داں، کسی علم میں عاری نہیں، روئے زمین پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں۔ مگر وہ جو مَثَل ہے: نیک اندر بد؛ یہ اصل ہے۔ لبِ معشوق مولویوں سے، یعنی ہم پہلو لُعبتانِ مہ رُو، پری شمائل، زُہرہ جبیں، مُرزَن رہ زنِ دیں، مشتری خصائل۔ ستم ناز، غضب انداز، سحر کرشمہ، طلسم غمزہ، آفت عشوہ، قہر ادا، قیامت گات، کرامت بات کی؛ کہ ہاروت ماروت تو کیا، معاذ اللہ! اگر سب فرشتے عرش سے فرشِ خاک پر آئیں، اُن کی چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں۔ گھڑی بھر اُن سے ذرا توبہ زانو بیٹھے، توبۂ نصوحا ٹوٹے، اُن کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لولیِ چرخ بلا گرداں، اُن پر نثار رہے۔ ہر ایک حور وش، آفتِ روزگار رہے۔ خوش مزاج، مَردُم شناس۔ مردُم رہ شُستہ۔ دمِ تقریر رمز و کنایہ۔ اسی کوچے

کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراشِ اثرِ صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

کلاونت، قوال بے مثال۔ چھجو خاں، غلام رسول؛ سب کو موسیقی میں کمال حصول۔ شوری کے زور شور کی دنیا میں دھوم ہے۔ ٹپے کا موجد ہوا، سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا۔

پتنگ ایسا بنا، ایسا لڑا کہ نزدیک و دور مشہور ہے۔ ستر پچھتر تار ڈور، اس کا پتنگ خیراتی یا چھنگا کے ہاتھ کا، لڑائی کی گھات کا، رستم کی عافیت تنگ کرنے والا؛ منجھی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمدو نے ایسا لڑایا، عمداً اتنا بڑھایا کہ کروبیوں سے اس پیچ میں عبادت چھوٹی، دوڑ دوڑ کر ڈور لوٹی۔ آنکھ بچا کر پیٹا توڑا، فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔ مرزا نظر علی نے ہاتھ اور نظر میں یہ زور بہم پہنچایا کہ ساٹھ تار کا پتنگ، منڈھا پھینک کر بڑھایا۔ چھ سات سیر ڈور پر گھٹ بڑھ دیکھی، کنا کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ مردان بیگ مانجھا دینے والا دیکھا نہ سنا۔

غرض کہ جو چیزیں یہاں نئی بنیں اور ایجاد طبیعت سے کاریگروں نے نکالی؛ سلف سے آج تک نہ ہوئی تھی۔ زردوزی ایسی بنی، یہ باریکی چھنی کہ باہر بندڈ اوڑگی کی پتی جو پائیں؛ بجائے جیغہ و سرپیچ، اپنے سر پر لگائیں۔ انتہائے حیرت کی بات ہے، ستر اسی روپے کی

سادی کلابتون کی اَور گی۔ اور جوتا گھیتلا خُرد نوک کا۔ ببر علی نے اِس نوک جھوک کا بنایا کہ جہان کو پسند آیا۔ آرام پائی جس کے ہاتھ آئی، دل نے چین پایا۔ پانچ اشرفی دھنیا کہاری نے دے کر جوتا سِجوایا۔

چالیس سال جہان کی دیکھ بھال کی؛ ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے۔ چناں چہ میاں محمد اشرف، نواب معتمد الدّولہ بہادر کے زمانے میں باورچی خانے کے داروغہ تھے۔ آدمیت، مروّت، ہمت۔ ہزاروں مرد آدمی اُن کی ذات سے فیض پاتا تھا، جہان کی نعمت کھاتا تھا۔ کاریگر ایسے: معتمد الدّولہ بہادر کے دستارخوان پر سو اُمرا ہوتے تھے؛ چھ مہینے تک جو چیز ایک دن رُو بہ رُو آئی، دوسرے دن تکرار نہ ہونے پائی۔ پُلاو سے قلیہ، روٹی تک روز نئی صورت کی تمام شے دستارخوان پر چُنی، ذائقے میں دیکھی نہ سُنی۔ اور یہ قول تھا: جو اِرشاد ہو، برس دن تک ہر روز جو چیز رُو بہ رُو آئے، دوسرے دن ممکن نہیں جو اُس کی بو آئے۔ کاریگر ایسے تھے؛ ہمت میں امیر نہ ہوں گے، جیسے تھے۔

اَور تو اَور؛ شُہدا پیر بخارا کا، تماسا، سیّد الشّہدا کا شیدا؛ برس روز میں جو پیدا کیا، عشرۂ محرم میں محتاجوں کو نذرِ حسین کھلا دیا۔ یہ اِک رنگی مزاج میں سمائی: تمام سِن جُوا کھیلا، دُو سے کے داؤں پر اَدھی نہ لگائی؛ ایک روپیہ ہُوا خواہ سو، کہہ دیا: پو۔ سیکڑوں داؤں منجے گئے، مُنہ سے نہ پنجے گئے۔ وہاں بھی ایک چوک

لگا رہتا ہے۔ آدمی کے چھکّے چُھٹ جاتے ہیں، جب وہ لوگ نظر آتے ہیں۔

مَشائخ، فقیروں کے مزار خوب۔ خوابِ راحت میں آسُودہ سالِک و مَجذُوب۔ شاہ مِینا، شاہ پیر محمّد، شاہ خَیرُاللہ؛ ایک سے ایک سُبحانَ اللہ۔ بہ ظاہر مُردہ، حقیقت میں جیتے ہیں۔ اَشیاے لطیف کھاتے پیتے ہیں۔ مولوی عبدُالرحمٰن بَرگُزیدۂ یَزداں، عالِمِ باعَمل، دَرویشِ کامِل۔ خواجہ باسِط اور میر نصیر، جن کا عَدِیل نہ نظیر۔ خواجہ حُسین و حَسَن سَرگروہِ انجمن۔ طبیعت بس کہ مصروف بہ اِختصار ہے، ایک ایک فقرہ لکھا ہے؛ وگرنہ اِن بزرگواروں کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے؛ مگر، شعر:

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید، مختصر گیرید

اِس پر عمل کیا۔ مُنصِف سے انصاف طلب ہیں، ہٹ دَھرم سے کیا کہیں۔ جھوٹے کے رُو بہ رُو سچّا رُو دیتا ہے۔ بِالفَرض مُعتَرِض کہے: یہ لوگ کہاں کے تھے؟ تو یہ جوابِ شافی کافی ہے کہ یہ شہر ایسا تھا، جیتے جی یہاں سے نہ نکلے۔ مر گئے، پر یہیں رہے۔ اور یوں تو، مصرع: کس نگوید کہ دُوغِ من تُرش است

جو گفتگو لکھنؤ میں کُو بہ کُو ہے؛ کسی نے کبھی سُنی ہو، سُنائے۔ لکھی دیکھی ہو، دِکھائے۔ عہدِ دولتِ بابر شاہ سے تا سلطنتِ اکبرِ ثانی کہ

مَثَل مشہور ہے : نہ چولھے آگ ، نہ گھڑے میں پانی ؛ دہلی کی آبادی ویران تھی، خلقت مُضطر و حیران تھی۔ سب بادشاہوں کے عصر کے رُوز مرّے ، لہجے ، اُردوئے مُعلّیٰ کی فصاحت تصنیفِ شُعَرا سے معلوم ہوئی۔ یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی، نہ اب تک وہاں ہے۔

قطعِ نظر اِس سے ، لوگ اِس خلقت کے گروہ سے کھوئیں اور جلسہ کریں۔ چناں چہ ایک بندے کے شفیق ، جگت آشنا جناب مرزا محمد رضا ، مجمعِ خوبی از پا تا فرق ، تخلّص برق۔ فی الحقیقت کلامِ بلاغت نظام اُن کا صاعقۂ خرمنِ ہستیِ حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار اُن کے رُو بہ رُو کاسد ہے۔ جوانِ خوش رُو ، بہادر، آشنائے بامزہ ، نیک خو۔ شبِ ماہ صُحبتِ مُشاعرہ بہ دولت خانۂ مرزا مُعیّن ہے۔ رئیس ، امیر ، صغیر و کبیر تشریف لاتے ہیں۔ اُس مکانِ وسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قلّت ہوتی ہے۔ ہوا کشمکش سے بار پاتی ہے ، جب پنکھے کی سعی اُٹھاتی ہے۔ سخن سنج بے رنج ، خوش گو ، نازک فہم ، باریک بیں ، نیک خو جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اُن سے ، وہ لوگوں سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔ تلامذۂ مرزائے ممدوح خدمت کو حاضر۔ کورے کورے مداریے دم بہ دم۔ گلوریاں ورق لگی ، کتّھا بسا ، چونا سنگِ مرمر کا مُتواتر۔ قبل از غزل خوانی افیون کا چرچا ہوجاتا ہے ؛ کوئی پیتا ہے ، کوئی کھاتا ہے۔ اگر چاہ کسی کو چائے کی ہوئی ، دودھ پیتے بچے تک شیر چائے موجود کردی۔ ہمیشہ صُبح اُس

شام کے جلسے کی ہوجاتی ہے۔ طبیعت گھبراتی نہیں۔ گھر جانے والوں کو صدائے مُرغِ سَحَر، ندائے اَللہُ اَکْبَر آتی ہے۔ ہر چند سب لوگ یہاں کے قہر ہیں، مگر یہ بزرگوار زینتِ شہر ہیں۔

اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں، کسی شہر کے ایسے ہفت ہزاری ہیں۔ دَلّال : مُرفَّہ حال، خوش پوشاک، چکلے چمکائے۔ اور ملکوں کے سیٹھ، کرور پتی : لاکھ اَینٹھ سے گاڑھے میں لنگوٹی یا دُھوتی۔ جب بڑا تکلّف کیا، گاڑھے کا مرزائی پہن لیا۔ کلمۂ حق کہنے والے کا مَدار دار پر ہوتا ہے، منصور نگر اُس کا محلّہ ہے۔ یہ نکتہ بہ گوشِ دل و جاں سُن : اَلْحَقُّ مُرٌّ۔ حاسدوں کے خوف سے یہ مذکور، مختصر کیا۔ اگر زیادہ لکھتا، قصّہ ہوتا۔ کوتہ بیں لکھنؤ کے نام سے چڑ جاتے ہیں، رشک کھاتے ہیں، اِفترا پردازی کرتے ہیں، کُڑھ کر جل مرتے ہیں۔

اچھے آغاز کا انجام بہ خیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مشقّت کسی کی بے کار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ شروع زمانۂ غازی الدین حیدر بادشاہ میں ہوا۔ اور تمام عصرِ سلطان بن سلطان، اَبُو النَّصر نصیر الدّین حیدر دَامَ مُلْکُہٗ کے ہُوا۔

اللہ اللہ! یہ عجب شاہِ جَم جاہ اَریکہ نشیں ہوا کہ حاتم کا نام، صفحۂ سخا سے مثلِ حرفِ غلط مٹا دیا۔ فقیروں کو امیر بنا دیا۔ عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی؛ ایک ایک ادنیٰ کنجڑن، ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ شہزادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا۔ خواصوں کو

صاحب نوبت کیا؛ چنڈول، سکھپال میں چڑھایا۔ ہاتھی، پالکی کو جلو میں پھرایا۔ ہزار بارہ سے جلسے والی حور وش، برق کردار، کبک رفتار، نغز گفتار، از پا تا فرق دریائے جواہر میں غرق، ہر دم دست بستہ رو بہ رو کھڑی رہی۔ جہان کی نعمت اُن کے سامنے پڑی رہی۔ اصیلوں کو کروروں روپے دیے۔ پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کیے۔ قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی، معاً رفعت و شان فلکِ ہفتم پر پہنچائی۔ کئی کرور روپے اُس منظورِ نظر نے صرف کیے۔ خزانے خالی کر، محتاجوں کے گھر بھر دیے۔ تجربہ کاروں کا قول تھا کہ اِن کے بعد یہ شہر ویران اور تباہ ہو گا۔ نہ اِس ہمت کی بیگم، نہ اِس حوصلے کا بادشاہ ہو گا۔ ہر وقت راجہ اِندر کی صحبت سے بہتر جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اِس طرح کے بنوائے کہ فلکِ گرداں نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اِندراسن، گلشنِ اِرم، کس کس کا نام لوں! یہ باغ، یہ کوٹھیاں چشم و گوشِ سنسار نے دیکھیں نہ سنیں۔ دوازدہ اِمام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخِ گرداں کو اور خواب میں نظر نہ آئی۔ اِندراسن میں عطر کا حوض چھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔

مغلانیوں نے گوٹے کناری کی کترنوں سے چاندی سونے کے محل اُٹھائے۔ خاصے والیوں نے لونگ، الائچی، زعفران کے اپنے گھروں میں خاصے ڈھیر لگائے۔ مکّا خیّاط مالِ دنیا سے مالامال ہے، اِستغنا کا دم بھرتا ہے۔ سینا تو کیا، ٹانکا کم بھرتا ہے۔

بجز غمِ حُسین، شہریار کو اَندوہ و غم نہیں۔ کون ہے جو اِس زمانے میں شاد و خُرّم نہیں۔ اَرْبَعِین تک عزاداری ہوتی ہے۔ خلقِ خُدا ماتمِ حُسین میں رُوتی ہے۔ لاکھوں روپیہ اِس راہ میں صرف ہوتا ہے۔ چالیس شب نہیں سوتا ہے۔ تُخمِ عَمَلِ نیک مَزْرَعَۂ آخرت میں بُوتا ہے۔ روزِ تَوَلُّدِ ہر امام و شبِ وَفاتِ جگر بَنْدانِ خَیرُ الاَنام لاکھ لاکھ روپے کا صَرف ہے۔ اِس ہمّت کے آگے فَیَاضانِ گُذشتہ پر حَرف ہے۔ حُسنِ صورت، شَوکت و حَشمت، جاہ و ثَرْوَت؛ جتنی دُنیا کی خوبیاں ہیں، اللہ نے سب دی ہیں۔ ہر شب، شبِ بَرات، رُوز، عیدَین کے ہیں۔ سیرِ دریا کی دَفْعَتہً جو لہر آئی، گنگا سے نہر منگائی۔ اِس میں بھی غُربا نہال، کایَندے مالا مال ہو گئے۔ بس کہ خامۂ مُؤَلِّف اِختِصار رَقَم ہے؛ مگر جتنا اُس کی صفت میں لکھیے، بہت کم ہے؛ لہٰذا اِس غزل پر مطلب کو اِختِتام دیا۔ یہ داستان وہ نہیں جو لکھی جائے، ناچار تمام کیا۔ غزل:

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیرُ الدّین حیدر بادشاہِ لکھنؤ

گو ملے جنّت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک میں اُٹھتا ہوں اِس پر کہہ کے: ہائے لکھنؤ

رشک کھا کھا، گو فلک مجھ سے چھُڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں، دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

یا تو ہم پھرتے تھے اُن میں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

اِن کی اِستِغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جامِ جم پر تُف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

کیوں گمانِ زاغ بلبل کے ترانے پر نہ ہو
یاد آ جائیں جو وہ نغمہ سرائے لکھنؤ

ہر محلّے سے بچانا جی، ہے عیسیٰ کو مُحال — چھوڑتے جیتا نہیں معجز نمائے لکھنؤ
جنّ و اِنس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں — ہے سُلیماں اِن دِنوں فرماں روائے لکھنؤ
دشتِ غُربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا — دل سے اُڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ
یہ رہے آباد یا رب تا بہ دَورِ مُشتری — میں کہیں ہوں، مانگتا ہوں پر دُعائے لکھنؤ

بلبلِ شیراز کو ہے رشکِ ناسخ کا سُرور
اِصفہاں اِس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

اِلٰہی! بہ حُرمتِ سیّدِ اَبرار احمدِ مُختار و بہ تصدّقِ اَئمّۂ اَطہار، لکھنؤ کو آباد رکھ۔ والیِ مُلک کو یہاں کے کارفرما، رعیّت پَرور، سَریرِ حکومت پر دل شاد رکھ۔ جب تک گنگا جمنا میں پانی بہے، یہ خطّۂ دل چسپ، فَرح اَفزا آباد رہے۔ فَرد:

اِلٰہی! لکھنؤ بستا رہے دورِ قیامت تک
سُرورِ دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا

اور مُقلّد یہاں کے، مُوجِد سے بہتر ہوتے ہیں۔ شاگرد ہو کر، اُستاد کے ہمسر ہوتے ہیں۔ مَطبع اِس شہر میں اکثر سنگ کے ہیں، نمونے نیرنگ کے ہیں؛ مگر ہمارے شفیق و مہرباں، یک رنگ حاضر و غائب یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مَدَّظِلُّہٗ عزیزِ دلہا، ہمہ صفت موصوف ہیں۔ دور دور مشہور و معروف ہیں۔ سابِق اَزیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا، "اَلْعَاقِلُ تَکْفِیْہِ الْاِشَارَۃ"، رشکِ اَبنائے زمانہ تھا۔ اخبار کا پرچہ چھپتا تھا، اِن کا پتا نہ چھپتا تھا۔ خوش نویس

ایسے جمع ہوتے تھے : اور محرّر اپنے لکھے کو روتے تھے۔ اپنے اپنے انداز پر بے نظیر؛ یادگارِ آغا، ہم پہلوے میر۔ کلیں ولایتی دل کو بے کل کرتیں۔ یہ تکلّف کہ بے پاؤں اشارے پر چلتیں۔ کاپی کو دیکھ کے جی کانپتا۔ کیسا ہی زبردست جوان ہو؛ بے فرمائے، ایک فرما نکالنے میں ہانپتا۔ پتھروں پر ایسی جِلا کہ دمِ نظّارہ بیکِ نگاہ کا پاؤں پھسلتا۔ یہ صفا اگر بہ غور دیکھو تو قلمِ مُو سے یہ لکھا ہے کہ ہر پتّھر پر طُور کا جلوہ ہے۔ کُتُبِ پارینہ کے واسطے اِحیاے اَموات کا نقشہ تھا، مُعجِزۂ عیسیٰ کے اِثبات کا نقشہ تھا۔ شائقوں سے آری کی جب صدا آتی، بیلن سے بے لَنْ تَرَانیْ اور نہ ندا آتی۔ گو تحریر کا مُقدّمہ زمانے میں ہے، سیاہی میں روشنائی کا جلوہ اِسی کارخانے میں ہے۔ جو کتاب چھپی، وہ مُرقّعِ مانی کی تصویر تھی۔ حرف مِٹنے کا کیا حرف، مِثلِ نوِشتۂ تقدیر تھی۔

شہروں میں اس چھاپے کی دھوم تھی، گردشِ تقدیر کسے معلوم تھی! دفعۃً فلک نے یہ چکّر کھایا حرفِ غلط کی طرح رگڑ کے شہر کو مٹایا۔ بروین سے بناتُ النّعش کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرِقہ پڑا کہ پھر نہ کسی کی خبر پائی۔ فقیر حسبُ الطّلب مہاراج ایسری پرشاد نارائن سنگھ بہادر راجِ بنارس دامَ حشمتُہم بنارس میں آیا۔ شکر صد شکر کہ رئیس والاجاہ، رعیّت پناہ، غریب نواز، غُربا پرور، باریک بیں، قدرشناس، سخی، شُجاع، سخن فہم، عدل گُستر پایا۔

دَرپیں وِلا، دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغلِ پارینہ منظور ہوا، پہلے عزمِ فسانۂ سرور ہوا۔ اس کی صحّت کی خاطر بندے کو لکھا۔ بجز اقرار چارہ نہ ہوا، انکار گوارا نہ ہوا۔

ہرچند یہ فسانہ، بہ طرزِ زمانہ، ہر ایک چھاپہ خانے میں نیا نیا رنگ لایا۔ جس نے چاہا جس فقرے پر پانی پھیرا، صفحۂ کتاب سے بہایا۔ بہ قولِ فقیر: جو مضمون سمجھ میں نہ آیا، نہ پڑھا گیا، وہ کُندہ بسولے سے گڑھا گیا۔ جودتِ قلم نشّاروں کی ہوئی، اصلاحِ خط یاروں کی ہوئی۔ شعر:

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا، وَلے
سوز کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

یہ نہیں سمجھتے، مصرع:

قبولِ خاطر و لطفِ سخن، خداداد است

تُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَاءُ۔ حاسد مفلس کے چراغ کی طرح جھلملا کے جلتے ہیں۔ فروغ کیا ہو، منہ کی کھاتے ہیں، ٹیڑھی راہ چلتے ہیں۔ فقیر نے اس کے دیکھنے میں عرق ریزی از حد کی۔ حضرت کے خوف سے انتہا کی کد کی۔ جس جگہ محل اور موقع پایا ہے، کیا کیا جملہ بڑھایا ہے۔ طبیعت نے بڑھاپے میں کیا کیا زور دکھایا ہے۔ کہنے کو قصّہ ہے، کہانی ہے، ہر جا تصویر کھینچی ہے، مُرقّعِ مانی ہے۔ ہر صفحہ رشکِ گلزار، باغ سراپا بہار ہے، مگر حاسد کے دل میں کھٹکتا ہے، خار ہے۔ ایسی

متاعِ گراں بہا کس گنجینے میں ہے، جس کی جگہ ذی فہم قدر شناسوں کے سینے میں ہے۔ باریک بیں، نکتہ سنج، مرنجاں مرنج خود دیکھ لیں گے کہ اور نسخوں میں کیا ہے، اور اس میں کیا لکھا ہے۔ فصاحت کا دریا بہا دیا ہے۔ حشر تک اِس کے شائق دُنیا میں کم نہ ہوں گے، قیامت یہ ہے کہ ہم نہ ہوں گے۔ الٰہی! جب تک فلک کی حرکت سے چمنِ دُنیا میں نسیمِ بہاری رہے؛ کارفرما سرسبز، کام جاری رہے۔

بندہ کم ترینِ تلامذہ اور خوشہ چینِ خرمنِ سخنِ جناب قبلہ وکعبہ، اُستادِ شاگرد نواز، معزز و ممتاز، مجمعِ فضل وکمال، نیک سیرت، فرخندہ خصال، خرد آگاہ، دانش آموز، یادگارِ جناب میر سوز، عرفیِ عصر، سعدیِ زماں، رشکِ انوری وخاقانی آغا نوازش حسین خاں صاحب، عرف مرزا خانی، تخلص نوازش، ہے۔ حقیقتِ حال یہ مقال ہے کہ طرزِ ریختہ اور روزمرہ اُردو کا اُن پر ختم ہے۔ شعر اُن کے واسطے، وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں۔ کہنے کے علاوہ، پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے: اگر طفلِ مکتب کا شعر زبانِ معجز بیاں سے اِرشاد کریں، فیضِ دہاں، تاثیرِ بیاں سے پسندِ طبعِ سحبانِ وائل ہو۔ فی زمانہ تو کیا، سابقین جو موجدِ کلام کوسِ لمن الملکی بجاتے تھے، اُن کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسبِ لفظی یا صنائع بدائع کے ہوں گے، وہ اُن پر نازاں تھے اور متاخرین فخریہ سند گردانتے ہیں۔ لہٰذا جس شخص کو

فہمِ کامل یا اِس فن میں مرتبۂ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو؛ آپ کا دیوان بہ چشمِ انصاف و نظرِ غور سے دیکھے؛ کوئی غزل نہ ہوگی جو کیفیت سے خالی ہو۔ ہر مصرع گواہِ ہزار صنعت، ہر شعر شاہدِ معانی، باکیفیت۔ مطلع سے مقطع تک ہر غزل پری کی صورت۔ اکثر اشعار آپ کے تبرّکاً و تیمّناً بہ طریقِ یادگار بندے نے لکھے ہیں۔ جہاں لفظِ "اُستاد" ہو، وہ آپ کا شعر سمجھو۔

وجہِ تالیف اِس قصّۂ بے نظیر کی اور کیفیت صاحبِ فرمایش کی تقریر کی۔ حکیم صاحب کی تحریک، سفر کان پور کا، لکھنا سُرور کا۔

حَسبِ اِتّفاق ایک روز چند دوستِ صادق، مُحِبِّ مُوافق باہم بیٹھے تھے؛ مگر نیرنگیِ زمانۂ ناہنجار اور کج رویِ فلکِ سفلہ پرور، دوں نواز، جفا شِعار سے سب بادلِ حزین و زار اور ہُجومِ اَندوہ و یاس سے اور کثرتِ حرمان و اَفکار سے، کہ ہر دم یہ پاس تھے؛ دل گرفتہ، سینہ ریش اور اُداس تھے؛ یہ ذکر بر زبان آیا کہ شُعبدہ بازیِ چرخِ چنبریِ نیلی فام اَز زمانِ آدم عَلَیہِ السّلام تا ایں دم یوں ہی چلی آئی ہے۔ اور تفرقہ پردازی، رنج و مِحَن سے سوا آزار دیتی ہے؛ یہ ادنیٰ اِس ظالم کی کج ادائی ہے۔ اب یہی غنیمت جانیے، اِس کا احسان مانیے کہ تم ہم اِس دم باہم تو

بیٹھے ہیں۔ اُستاد:

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں، سُنو، یہ دم غنیمت ہے
یہ ہنسنا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے

اور واقعی شدّتِ رنج و اَلَم میں دوستِ صادق، یارِ مُوافق ہم پہلو ہو؛ تو کچھ خیال میں نہیں آتا ہے، دل بہل جاتا ہے۔ اور صُحبتِ غیر جنس میں تختِ سلطنت، تختۂ تابوت سے بدتر ہو کے کاٹے کھاتا ہے۔ سعدی:

پای در زنجیر پیشِ دُوستاں
بِہ کہ با بیگانگاں در بُوستاں

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوُجودِ کثرتِ غم و شدّتِ اَندُوہ و اَلَم، دو شخص باہم نہیں دیکھ سکتا۔ مرزا:

پھینکے ہے مَنجَنیقِ چرخ، تاک کے سنگِ تفرِقَہ
بیٹھ کر ایک دم کہیں، ہو دیں جو ہم کلام دو

جب سلسلۂ سخن یہاں تک پہنچا؛ اُس زُمرے میں ایک آشنائے بامزہ بندے کے تھے، اُنھوں نے فرمایا: اِس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رَفعِ کدُورت وجمعیّت پریشانیِ طبیعت ہو اور غُنچۂ سربَستۂ دل، جو سَمُومِ حوادِث سے مُضمحِل ہے؛ بہ اِہتزازِ نسیمِ تکلّم کِھل جائے۔ فرماں بردار نے بجز اِقرار، اِنکار مناسب نہ جانا؛ چند کلمے گُوش گُزار کیے۔ اگرچہ گریہ کردن را ہم دلِ خوش می باید؛ مگر اِس نظر سے، مصرع:

ہرچہ از دوست میرسد، نیکوست

وہ باتیں انھیں بہت پسند آئیں، کہا: اگر بہ دل جمعیِ تمام تو اس پراگندہ تقریر کو، از آغاز تا انجام، قصّے کے طور پر زبانِ اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظورِ نظرِ اہلِ بصر ہو؛ لیکن تقصیر معاف ہو، لغت سے صاف ہو۔ بندے نے کہا: طبیعتِ ابناے روزگار بیش تر متوجّہِ عیب جوئی و ہنر پوشی ہے، بہ قولِ دلگیر، شعر:

قبح کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر!
اور یہاں حُسن شناسانِ سخن تھوڑے ہیں

وہ بولے: چشمداشتِ صلہ، طلبِ اجرت کسی سے متصوّر نہیں، فقط ہماری خوشی مدِّنظر رکھ۔ جیسا رطب و یابس کہے گا، ہمیں پسند ہے؛ بہ شرطے کہ جو روزمرّہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیِ عبارت کے واسطے دقّت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔ نیاز مند نے کہا: یہ تو مقدّمۂ تحریر ہے؛ اگر سر سرکار کے کام آئے، جاے تقریر نہیں؛ مگر جلدی نہ کرنا، بہ وقتِ فرصت لکھوں گا۔ وہ تو یارِ شاطر، نہ بارِ خاطر تھے؛ قبول کیا۔

اُسی دن سے ہمیشہ اِس کا خیال رہتا تھا، عدمِ فرصت سے نہ کہتا تھا۔ آخرالامر بہ مقتضاے عادت، تلاشِ معاش کے حیلے میں فلکِ تفرقہ پرداز، گردونِ عربدہ ساز نے صورتِ مفارقت کی دکھائی؛

مُہاجرَت. وطن آوارہ کے اِستقبال کو آئی۔ مسرّت:

بوقتِ لُقمہ خوردن اے مسرّت! گفت بہائم
کہ روزی میکند از ہم جدا یارانِ ہمدم را

رَبیعَ الثّانی کے مہینے میں کہ سنہ ہجریِ نبوی صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم بارہ سے چالیس تھے؛ آنے کا اتّفاق مجبور، گوردہِ کان پور میں ہوا لیکن یہ بستی ویران، پوچ و لچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشیں، عزلت گزیں؛ مگر چھوٹی اُمّت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دلِ وحشت منزل اِس مقام سے سخت گھبرایا۔ قریب تھا جنون ہو جائے، تیرہ بختی روزِ سیاہ دکھائے۔ لیکن بہ شربتِ عنایت و معجونِ شفقتِ ارسطو فطرت، بقراط حکمت، حار و بارِدِ زمانہ دیدہ، تجربہ رسیدہ حکیم سید اسد علی صاحب شیرِ بیشۂ علم و کمال، سخن فہم، ظریف، خوش خصال؛ طبعِ سودا خیز اور سرِ جنون انگیز کو آرام و تسکیں حاصل ہوئی۔ اکثر حالِ فقیرِ دل گیر پر الطاف و کرم فرماتے تھے۔ تدبیریں نیک و احسن، دافعِ رنج و محن بتاتے تھے۔

ایک روز بعدِ اظہارِ حالِ مُکلّفِ فسانۂ دوستانہ، یہ بھی کہا کہ حسبِ وعدہ ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں۔ سُن کے فرمایا: بیکار مباش، کچھ کیا کر۔ میر:

میر! نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے ــــ نامِ خدا ہو جواں، کچھ تو کیا چاہیے

اُس وقت یہ کلمہ توسنِ طبع کو تازیانہ ہوا، تحریر کا بہانہ ہوا۔ اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویِٰ اُردو زبان پر لائے یا اِس فسانے کو بہ نظرِ نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہ جہاں آباد کہ مسکنِ اہلِ زبان، کبھی بیتُ السلطنتِ ہندوستان تھا؛ وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا؛ اُن سے تحصیلِ لاحاصل ہوتی، تو شاید اِس زبان کی کیفیت حاصل ہوتی۔ جیسا میر امّن صاحب نے قصۂ چار درویش کا باغ و بہار نام رکھ کے خار رکھایا ہے، بکھیڑا مچایا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن، حصّے میں یہ زبان آئی ہے؛ مگر بہ نسبت مؤلفِ اوّل عطا حسین خاں کے، سو جگہ منہ کی کھائی ہے۔ لکھا تو ہے کہ ہم دِلّی کے روڑے ہیں؛ پر، محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار گوید۔ یہ وہی مثل سننے میں آئی کہ: اپنے منہ سے دھنّا بائی۔ لیکن تحریر اس کی ایفائے تقریر ہے۔ قصّہ یہ دل چسپ، بے نظیر ہے۔

اُمید ناظرینِ پُر تمکیں سے یہ ہے کہ بہ چشمِ عیب پوشی و نظرِ اِصلاح ملاحظہ فرما؛ جہاں سہو یا غلطی پائیں، بہ اِصلاح مزیّن فرمائیں۔ کیسی ہی طبیعتِ عالی ہو، ممکن نہیں جو بشر خطا سے خالی ہو۔ اِس کے مطالعے سے خاطرِ خطیر اگر شاد ہو، عاصی دُعائے خیر

سے یاد ہو۔ نیاز مند کو اس تحریر سے نمودِ نظم و نثر، جودتِ طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا اِحتمال نہ تھا۔ بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دِقّت طلب، غیر مُستَعمل، عَرَبی فارسی کا مشکل تھا؛ اپنے نزدیک اُسے دور کیا۔ اور جو کلمہ سَہلِ مُمتَنِع، مُحاورے کا تھا؛ رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجائب اِس کا نام رکھا۔ اِنَّہٗ اَلْمُبْدِءُ وَاِلَیْہِ اَلْمَآبْ۔ عنایتِ ایزدی سے تمام ہوئی کتاب۔

آغاز داستانِ اعجاز بیان سلطان فیروز بخت کی، اور تلاش اُس کو وارثِ تاج و تخت کی۔ خوش قسمتی سے حاجت کا بر آنا، گوہرِ دُرجِ شہریاری صدفِ تمنّا سے پانا۔

اُستاد:

مثل ہی سے نہ الفاظِ تلازم سے یہ خالی ہے
ہر اک فقرہ کہانی کا گواہِ بے مثالی ہے

لا اَعلَم:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ ۔ سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

گرہ کُشایانِ سلسلۂ سُخن، تازہ کنندگانِ فسانۂ کُہن؛ یعنی مُحرّرانِ رنگیں تحریر و مُورّخانِ جادو تقریر نے؛ اَشہبِ جہندۂ قلم کو میدانِ وسیعِ بیان میں، باکرشمۂ سحر ساز و لطیفہ ہائے حیرت پرداز گرم عنان و جولان یوں کیا ہے کہ سرزمینِ خُتن میں ایک شہر تھا مینوسواد، بہشت نژاد، پسندِ خاطرِ

محبوبانِ جہاں، قابلِ بود و باشِ خوبانِ زماں۔ شمیمِ صفت اُس کی مُعطّر کُنِ دِماغِ جاں، مُسکّنِ اِلتہابِ قلب، دافعِ خفقاں۔ زمین اُس کی رشکِ چرخِ بریں۔ رِفعت و شان چشمک زنِ بلندیِ فلکِ ہفتمیں۔ گلی کوچے خجلت دِہِ گلشن۔ آبادی گلزار، بسانِ تختۂ چمن۔ بازار ہر ایک بے آزار، مُصفّیٰ، ہموار۔ دُکانیں نفیس۔ مکان نازک، پایدار۔ خلقِ خُدا باخاطرِ شاد اُسے فُسحت آباد کہتی تھی۔ سب طرح کی خلقت، ہر طور کی رعیّت رغبت سے اُس میں رہتی تھی۔

والیِ مُلک وہاں کا شاہِ گردوں وقار، پُرتمکین، باافتخار، سکندر سے ہزار خادِم، دارا سے لاکھ فرماں بردار، قُباد شوکت و کاؤس حَشَم، مالکِ تاج و تخت، والا مرتبت، عالی مقام، شاہنشاہ فیروز بخت نام۔ موجِ بخشش سے اُس بحرِ جُود و عطا کی، سائلانِ لب تشنہ سیراب۔ اور نائرۂ غضب کے شُعلے سے، دشمنِ بد باطن جگر سوختہ، بے تاب۔ دبدبۂ داد دِہی، غُلغلۂ عدالت سے، دشمن دوستِ جانی۔ چور مسافر کے مال کا نگہبان؛ ڈکیتوں کو عہدۂ پاسبانی۔ ملک وافر۔ سپاہ افزوں از قیاس۔ خزانہ لاانتہا، بے کراں۔ وزیر، امیر جاں فشاں۔ تاج بخش و باج ستاں۔ محتاج اور فقیر کا شہر میں نام نہیں۔ داد فریاد، آہ و نالے سے کسی کو کام نہیں۔ رعیّت راضی۔ سپاہ سر فروش، جاں نثار، شاداں۔ دشمن خائف۔ شمع کا چور سرِ محفل لرزاں۔ اِس نام سے یہ ننگ تھا کہ امیروں کا چور محل نہ ہونے پاتا تھا۔ دُزدِ حنا کا رنگ نہ جمتا تھا، سرِ دست ہاتھ باندھا جاتا تھا۔ آنکھ چُرانے سے ہم چشم چشمک کرتے تھے۔ کارِ خیر سے اگر کوئی جی چُراتا، تو نامردی کی

تہمت اُس پر دھرتے تھے۔

لیکن بہ ایں حکومت و ثروت، کاشانۂ اُمید کا چراغ گُل، اولاد بالکل نہ تھی۔ خواہشِ فرزند دَر دل۔ نہ ہونے کی کاہش مُتّصل۔ حسرتِ پسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِی فَرْداً وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ہر ساعت بَر زباں۔ وَ رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیّاً وظیفۂ ہر زماں۔ لڑکے کی تمنّا میں بادشاہ مثلِ گدا دست دراز۔ ایسا لاپروا، بے نیاز کی قدرت سے، بانیاز۔

آخرش جنابِ باری میں تَضَرّع و زاری اُس کی منظور ہوئی، لاولدی کی بدنامی دور ہوئی۔ ساٹھ برس کے سِن میں، بڑھاپے کے دن میں گوہرِ آب دار، دُرِ شاہوار، صَدَفِ بَطنِ بانوے خُجستہ اطوار سے پیدا ہوا۔ چھوٹا بڑا اُس کی صورت کا شیدا ہوا۔ اُس روح اَفزا کا، فیروز بخت نے، جانِ عالَم نام رکھا۔ شب روز پَرورِش سے کام رکھا۔ حُسن اللہ نے یہ عطا کیا کہ نَیّرِ اعظم چرخِ چارم پر رُعبِ جمال سے تھرّایا۔ اور ماہ، باوجودِ داغِ غُلامی، تابِ مُشاہدہ نہ لایا۔ اُس نقشِ قُدرت پر تصوّرِ مانی و بِہزاد حیران اور صَنّاعیِ آزر کی ایسے لُعبَتِ حقیقت کے رُو بہ رُو پشیمان۔ کاسۂ سَر سراسر شُورِ جوانی، زورِ شباب سے معمور۔ آنکھیں، جھپکانے والی دیدۂ غَزالانِ خُتن کی، شرابِ عشق کے نشے سے چکنا چور۔ چہرے پر جلالِ شاہی، شوکتِ جہاں پناہی نُمایاں۔ حُسنِ دَرَخشندہ کی تڑپ یہ از انجم و اخترِ تاباں۔ مُصحفیؔ:

اُسے دیکھ طِفلی میں، کہتی تھی دایہ①

یہ لڑکا طَرَح دار پیدا ہوا ہے

مرزا قتیلؔ، ع :

پارہ خواہد شد ازیں دست گریبانے چند

لکھا ہے کہ جب وہ مہرِ سپہرِ سلطنت برجِ حمل سے جلوہ افروز ہو، زینت بخشِ کنارِ مادر و زیب دِہِ آغوشِ دایہ ہوا؛ درِ خزانہ و محبس کھلا۔ ہزارہا قیدی رِہا ہو اپنے گھر آیا اور سیکڑوں لونڈی غلام نے فرمانِ آزادی پایا۔ شہر میں محتاج ناپیدا تھا؛ مگر اشرفی، روپیہ حاجیوں کے واسطے مکۂ معظم اور زائروں کی خاطر کربلائے معلیٰ میں پیہم بھیجا۔ ایک سال کا خراج رعیّتِ محتاج کو معاف ہوا۔ شہ زادے کے نام کے گنج آباد ہوئے۔ مسجدیں، مدرسے، مہمان سرا، مسافر خانے تعمیر ہوئے۔ اہلِ شہر دل شاد ہوئے۔

نجومی، پنڈت، جفر داں حاضر ہوئے۔ بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی: مہاراج کا بول بالا؛ جاہ و حشم ہردم بڑھے، مرتبہ دوبالا، اعلیٰ رہے؛ ہماری پوتھی کہتی ہے: بھگوان کی دیا سے شہ زادے کا چندرماں بلی ہے، چھٹا سورج ہے۔ جو گرہ ہے وہ بھلی ہے۔ دیگ تیگ کا مالک رہے۔ دھرم مورت یہ بالک رہے۔ جلد راج پر براجے۔ پرتھمی میں دھوم مچے، ایسی شادی رچے۔ استری تین ہو۔ دو کا پر مان، ایک کی ہین ہو۔ مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی؛ شنیچر پاؤں پڑے گا۔ ایک پنکھیرو سُوے کے برن میں ہاتھ آئے گا۔ تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھوڑا، دیس سے بدیس لے جائے گا۔ ڈگر میں شاہ زادہ بھٹکے گا، کوئی مانس پاس نہ پھٹکے گا۔ ساتھی چھٹیں۔

اپنے ڈیل سے ڈانواڈول رہے۔ پھر ایک مَنگھ' ٹھاکُر کا سیوَک کرپا کرے' راہ لگائے۔ کوئی کلنکن' تو بھی ہو' کشٹ دکھائے۔ وہاں سے جب چھُٹے' رانی ملے مہا سُندر؛ وہ چرن پر پران وارے۔ پِتا اُس کا گیانی' گُن کی تکھتی دے؛ اُس سے کئی مَلیچھ مارے' دُکھ میں آڑے آئے' بگڑے کاج بنائے۔

جب اُس نگر پہنچے' جس کی چِت میں گھر چھوڑے؛ تو لاب بہت ہو۔ دَرب' گہنے ہاتھ آئیں۔ دور سب کلیس ہو جائیں۔ پر' ایک ہِتی' من کا کپٹی' اِستری پر دُچِت ہو' کھٹائی کرے۔ جُھجھ پڑیں' نَر ناری لڑیں۔ اور کچھ جَل میں بھی ہل چل پڑے۔ پر ہِتی لوگ چھُٹ جائیں۔ نگر نگر کھوج میں پھر آئیں۔ سب بچھڑے مل جائیں۔ ماتا پِتا کے ڈھنگ آئیں۔ بڑا راج کرے۔ دیا دھرم کے کاج کرے۔ گُسَیاں کی کرپا سے جان کی کھیر ہے۔ بڑی بڑی دھرتی کی سیر ہے۔

یہ سُن کے بادشاہ گونہ ملول ہوا۔ پھر مستقل مزاجی سے یہ کلمہ فرمایا: فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْعَنِ الْحِکْمَۃِ۔ اُن سب کو بہ قدرِ حال' فراخورِ کمال مالا مال کیا۔ خِلعت و اِنعام دیا۔ بہ بشاشتِ تمام سرگرمِ پرورشِ صُبح و شام رہا۔ کوئی تو برسوں میں بڑھتا ہے؛ وہ نِہالِ نَو دَمیدۂ بُستانِ سلطنت گھڑیوں میں بلند بالا ہوتا تھا۔ چند عرصے میں' بہ حَول و قوّتِ الٰہی' وہ ہاتھ پاؤں نکالے؛ دس برس کے سن میں اُس غزال چشم نے ہرن کے سینگ چیر ڈالے۔ دست و بازو میں یہ طاقت ہوئی کہ دَرِندۂ فیلِ مست ہوا۔ جوانِ رعنا' چہرۂ زیبا' رستم شوکت'

اِسفَندیار سے زبردست ہوا۔ جو اُس کا رُوئے مُنوّر دیکھتا، یہ کہتا، لا اَعْلَم: (1)

مُنہ دیکھو آئنے کا، تری تاب لا سکے — خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

تصویر تیری کھینچے مُصوِّر تو کیا مجال — دستِ قضا تو پھر کوئی تجھ سا بنا سکے

تحصیلِ علم و فضل میں شُہرۂ آفاق ہوا۔ جتنے فنِ سپہ گری ہیں، اُن کا مَشّاق۔ جَمیع عُلوم، ہر فن میں طاق ہوا۔ جَلَّ جَلالُہٗ! باپ ویسا، بیٹا ایسا محبوب۔ محبّت میں بَسانِ یوسف و یعقوب عَلَیہِما السَّلام۔ جب وہ ہلالِ سپہرِ شہریاری بہ فضلِ باری بَدرِ کامل ہوا اور چودھواں بَرس بھر گیا، جوانوں میں شامل ہوا، بہ صلاح و صَواب دیدِ اَرکانِ سلطنت و ترقّی خواہانِ دولت شادی کی تجویز ہوئی۔ بہ تلاشِ بے شمار و تجسّسِ بسیار ایک شہ زادی پری پیکر، خوب صورت، نیک سیرت، حور نژاد، گُل اَندام، سیمیں بَر، رشکِ سَرو، غیرتِ شَمشاد، ماہ طلعت نام، دُودمانِ والا سے مُقرّر ہوئی۔ وہ جو آئینِ بادشاہی، طریقِ فرماں روائی ہے، اُسی طرح اُس کے ساتھ اُس اَخترِ تابِندۂ فلکِ شاہی کو ہمقِراں کیا، نکاح پڑھوا دیا۔

جَولانیٔ سَمَندِ تیز رفتارِ قلم کی میدانِ بیانِ سواریِ شہزادۂ جانِ عالم میں، اور خریدنا توتے کا، اور کج بختی ماہ طلعت کی توتے سے۔ پھر کیفیتِ حُسنِ انجمن آرا توتے سے سُننا، شہزادے کا نادیدہ عاشق ہونا، وحشت سے سر دُھننا۔

بُلبلِ نَوا سَنجِ ہَزار دَستاں، طوطیِ خامۂ زمزمہ ریزِ خوش بیاں

گلشنِ تقریر میں اِس طرح چہکا ہے، صَفحۂ فسانہ پہ کھا ہے کہ بعدِ رسمِ شادی، سیر و شکار کی اجازت، سواری کا حکم شاہِ ذَوی الاِقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام و پگاہ جانِ عالم سوار ہونے لگا۔ سیر و شکار کی طرف مائل ہوا۔ ایک روز گزر اُس کا گُذری میں ہوا۔ اَنبوہِ کثیر، جمِّ غفیر نظر آیا اور غُلغلۂ تحسین و آفرین اَز زمین تا چرخِ بریں بلند پایا۔ شہ زادہ اُدھر مُتوجّہ ہوا، دیکھا: ایک مردِ پیر، نحیف، ستّر اَسّی برس کا سن، نہایت ضعیف، پنجرہ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ اُس میں ایک جانور مانندِ ساکنانِ جناں سبز پوش، طائرِ بے مروّت، خانہ بدوش، با منقارِ گلنار لطیفے لطیف، رنگین اور نکتے قابلِ تعریف، نمکین، مثالِ طوطیِ پسِ آئینہ بیان کر رہا ہے۔ تماشائیوں کی کثرت سے بازار بھر رہا ہے۔ لِاَعلَم:

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند①

آنچہ اُستادِ ازل گفت، ہماں می گویم

شہ زادے کے دیکھتے ہی توتا مالک سے بولا: اے شخص! کوکبِ بخت تیرا اِفلاس کے بُرجِ تیرہ سے نکلا، نصیب چمکا۔ طالع بر سرِ یاری و زمانہ آمادۂ مددگاری ہوا۔ دیکھ! ایسا شہ زادۂ حاتم شعار، ابرِ گہر بار مُتوجّہ اِس مشتِ پر، ذرّۂ بے مقدار پر ہوا ہے۔ وہ بے کار شے کارگاہِ بے ثبات میں ہوں، جس کا طالب نہیں کہیں۔ یہ حد ہے کہ جانور ہوں اور بلّی کا کھاجا نہیں، مگر جو یہ نظرِ عنایت کرے: ابھی تیرا ہاتھ پُر زر ہو، دامن گہر سے بھرے۔

جانِ عالم نے یہ سخنِ ہوش رُبا، کلمۂ حیرت افزا کو سن، توتے عقل

کے اُڑا، پنجرہ اُس طائرِ ہمہ داں، جانورِ سحر بیاں کا ہاتھ میں لے کے، مالک سے قیمت پوچھی۔ توتے نے کہا، مؤلّف:

کب لگاتا ہے کوئی اِس دلِ بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

مگر جو حضور کی مرضی! جانِ عالم نے لاکھ روپے، خلعت کے سوا، عنایت کیے اور پنجرہ ہاتھ میں لیے دولت سرا کو روانہ ہوا۔ گھر میں جا، ماہ طلعت کو توتا دکھا یہ مصرع اِنشا کا پڑھا، اِنشا:

بازار ہم گئے تھے، اک چوٹ مول لائے (1)

توتے نے شہ زادے کو سخنانِ دل چسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شعرِ خوب، خمسہ ہائے مرغوب سنا اپنے دامِ محبّت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے، دربار کے سوا، ایک دم جدا نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا، پنجرہ بہ تاکیدِ حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا اور دربار سے دیوانہ وار، بہ شوقِ گفتار بے قرار جلد پھر آتا۔

ایک دن شاہ زادہ دربار گیا، توتا محل میں رہا۔ اُس روز ماہ طلعت نے غسل کیا اور لباسِ مکلّف سے جسم آراستہ، زیورِ پُر تکلّف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی۔ ہوا جو لگی، آئینے میں صورت دیکھ خود محوِ تماشا ہوئی۔ بحرِ عُجب و نخوت میں آشنا ہوئی۔ خواصوں سے، جلیسوں سے، جو جو دم ساز، محرمِ راز تھیں، اپنے حُسن و صورت کی داد چاہی۔ ہر ایک نے مُوافقِ عقل و شعور تعریف کی۔ کسی نے کہا: ہلالِ عید ہو۔

کوئی بولی: خُدا جانتا ہے، دید ہو نہ شَنید ہو۔ اللہ تعالیٰ نے، یہ اپنی کثرتِ مخلوقات، تمھارا ہمسَر اَز قِسمِ جن و بَشَر بنایا نہیں۔ پری نے یہ قد و بالا، حور نے یہ حُسن کا جھمکڑا پایا نہیں۔

جب وہ کہہ چکیں، ماہ طلعت نے کہا: تُوتا بہت عقل مند، ذی شعور، سیّاحِ نزدیک و دور ہے، اُس سے بھی پوچھنا ضرور ہے۔ مُخاطِب ہوئی کہ اے مُرغِ خوش خُو و طائرِ زمرّد لباسِ سُرخ رُو، بَذلہ سَنج بے رنج! سچ کہنا، اِس سَج دَھج کی صورت کبھی تیرے طائرِ وَہم و خیال کی نظر سے گزری ہے؟

نیرنگیِ چرخِ کج رفتار، فتنہ پَردازیِ گردُونِ واژُوں عیاں ہے۔ آگاہ سب جہان ہے۔ اُس وقت تُوتا رنجیدہ دل، کبیدہ خاطر مُضمَحِل بیٹھا تھا؛ چُپ ہو رہا۔ شہ زادی نے پھر پوچھا۔ تُوتے نے بے اِعتنائی سے کہا: ایسا ہی ہو! یہ رنڈی معشوق مزاج، طُرّہ یہ کہ شہ زادے کی جُورُو؛ شوہر مالکِ تخت و تاج؛ برہم ہو کے بولی: میاں مِٹھو! جینے سے خفا ہو جو ہمارے رُو بہ رُو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہو؟ تُوتے نے کہا: سوال و جواب اَور، دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا؛ غُصّے کی آنکھ دِکھانا اَور ہے۔ کیوں اُلجھتی ہو، شاید تمھی سچّی ہو! پھر تو شُعلۂ غَضَب کانُونِ سینۂ شہ زادی میں مُشتَعِل ہوا، کباب دل ہوا، کہا: کیوں جانورِ بد تمیز، ناچیز! تیری موت آئی ہے؟ کیا بیہودہ ٹیں ٹیں مچائی ہے! واہی بک رہا ہے! ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا ہے! تُوتے کے مُنہ سے نکلا: کیوں اِتنی خفا ہوتی ہو، اپنا

مُنہ مُلاحظہ کرو؛ صاحب. تم بڑی خوب صورت ہو!

یہاں تو یہ حَیص بَیص تھی، جانِ عالَم تشریف فرما ہوا۔ عجب صُحبت دیکھی کہ شہ زادی بہ چشمِ پُرآب و با دِلِ کباب، غَیظ میں آ، تھرّا تھرّا تُوتے سے بَحث رہی ہے۔ شہ زادے نے فرمایا: خَیر باشَد! تُوتا بولا: آج نِرا شَر ہے، خَیر بہ خَیر۔ مگر چَندِے حیاتِ مُستَعار اِس وَحشی کی اور آب و دانہ قَفَس میں پینا کھانا باقی تھا۔ اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے؛ تو میرا طائرِ روح، گُربۂ غضبِ شہ زادی سے مَجروح، پرواز کر جاتا، ہرگز جیتا نہ پاتے؛ مگر پِنجرہ خالی دیکھ مزاجِ عالی پریشان ہوتا، بہ حسرت و افسوس یہ فرماتے، اِنشا:

تُوتا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا (1)

ماہ طلعت اِن باتوں سے زیادہ مُکدّر ہوئی، شہ زادے سے کہا: اگر میری بات کا تُوتا جواب صاف نہ دے گا؛ تو اِس نگوڑے کی گردن مَروڑ، اپنے تَلوؤں سے اِس کی آنکھیں مَلوں گی، جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جانِ عالَم نے کہا: کچھ حال تو کہو۔ تُوتے نے گُزارِش کی: حُضور! یہ مُقدّمہ غُلام سے سُنیے۔ آج شہ زادی صاحب اپنی دانست میں بہت نِکھر، بقاؔ:

دیکھ آئینے کو، کہتی تھیں کہ اللہ ری مَیں! (2)

پھر مجھ سے فرمایا: تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی تھی؟ مُجھ اَجَل رَسیدہ کے مُنہ سے رَو میں نکلا: خدا نہ کرے! اِس جُرمِ قَبیح پر شہ زادی کے نزدیک کُشتنی، سوختنی و گردن زَدنی ہوں۔ بہ قولِ میر تقی، شعر:

بے جُرم تہِ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو[1]
کچھ بات بُری مُنہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جانِ عالم نے کہا: تم بھی کتنی عقل سے خالی، حُمق سے بھری ہو! تم تو پری ہو۔ اور جانور کی بات پر اِتنا آزُردہ ہونا! گو گُویا ہے، پھر طایر ہے؛ نادانی اِس کی ظاہر ہے۔ میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ بدل کے روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولا: خُدا وندِ نعمت! جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے۔ ہمسر جس کا کوئی نہیں، وہ ذات وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ کی ہے۔ اُس کے سوا ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔ سب کو یہ خبر ہے: فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ میں نے جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا۔ اگر راستی پر ہوتا، گردن کج کیے سیدھا گُور میں سُوتا۔ یہ سُن کے وہ اور مُجوِز ہوئی۔ مَثَل مشہور ہے: راج ہٹ، تِریا ہٹ، بالک ہٹ۔ جانِ عالم نے مجبور ہو کے کہا: جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے! سچ کہہ دو۔ تُوتے نے بہ منّت عرض کی: دُروغِ مصلحت آمیز، بہ از راستیِ فتنہ انگیز۔ مجھے سچ نہ بلوائیے، میرا مُنہ نہ کھلوائیے۔ نہیں، انجامِ راستی حُضور کے دشمنوں کو دَشت نَوَردی، بادیہ پیمائی، غریبُ الوطنی، کوچہ گردی نصیب ہوگی۔

شہزادے نے کہا: یہ جُملہ تم نے اور نیا سُنایا۔ اب جو کچھ کہنا ہے، کہا چاہیے، باتیں بہت نہ بنائیے۔ اُس نے کہا: میں نے ہر چند چاہا کہ آپ رنجِ سفر، مصائبِ شہر بہ شہر، ایذاے غُربت سے باز رہیں۔ کہ

سفر اور سقر کی صورت ایک ہے، اِس سے بچنا نیک ہے؛ مگر معلوم ہوا حضور کے مقدر میں یہ اَمر لکھا ہے، میرا قصور اس میں کیا ہے۔ رفیع سودا:

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو ①
سوزنِ تدبیر ساری عُمر گو سیتی رہے

سُنیے قبلۂ عالَم! یہاں سے برس دن کی راہ، شمال میں ایک مُلک ہے عجائب زرنگار۔ ایسا خطّہ ہے کہ مُرقّعِ خیالِ مانی و بہزاد میں نہ کھنچا ہوگا اور پیرِ دہقانِ فلک نے مزرعۂ عالَم میں نہ دیکھا ہوگا۔ شہر خوب۔ آبادی مرغوب۔ رنڈی، مرد حسین، طرح دار۔ مکان بلّور کے بلکہ نور کے، جواہر نگار۔ عقلِ باریک بیں مشاہدے سے دنگ ہو۔ خلقت اِس کثرت سے بستی ہے کہ اُس بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو۔ خورشید ہر سحر اُس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے۔ بدرِ کامل وہاں دو دن نہیں رہتا؛ غیرت سے کاہیدہ ہو، ہلال نظر آتا ہے۔

وہاں کی شہزادی ہے انجمن آرا۔ اُس کا تو کیا کہنا! کہاں میری زبان میں طاقت اور دہان میں طلاقت جو شمّہ مذکورِ شکل و شمائل اُس زہرہ جبیں، فخرِ لُعبتانِ لندن و چین کا سناؤں۔ اُستاد:

ایک میں کیا، خوب گر دیکھے اُسے حُسن آفریں ②
اپنی صنّاعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سَو خواصِ زرّیں کمر، تاجِ دل بری برسر، ماہ رُو، عنبریں مُو، سرگروہِ خوبانِ جہاں، جانِ جاں، آرامِ دلِ مشتاقاں؛ اُس کی خدمت

میں شب و روز سرگرمِ خدمت گزاری، بڑی تیاری سے رہتی ہیں۔ اگر اُن کی لونڈیوں کو شہزادی صاحب بہ چشمِ انصاف دیکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں، یقین تو ہے، چلّو بھر پانی میں، محجوب ہو کے ڈوب جائیں۔ ماہ طلعت یہ سُن کے سُن ہوئی، سر جھکا لیا۔ جانِ عالم کو کچھ اور ہی دھن ہوئی، پنجرہ اُٹھا لیا، دیوان خانے میں لے جا مفصّل حال دریافت کرنے لگا۔ جی کا حال کچھ اور ہی ہو گیا، ہر دم آہِ سرد دلِ نیم بسمل سے کھینچنے لگا۔ مولوی جامی:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ۔ بسا، کیں دولت از گفتار خیزد (۱)

در آید جلوۂ حسن از درِ گوش زجان آرام برباید، زدل ہوش

ز دیدن ہیچ اثر نے درمیانہ کند عاشق کساں را غائبانہ

توتے کو شہزادے کے طرزِ گفتگو، رنگِ رُو، آنکھ کی تری، ہونٹ کی خشکی، دل کی دھڑک، کلیجے کی پھڑک سے کہ یہ نشانِ عشق، گمانِ خبط سب ہیں، ثابت ہوا کہ شہزادے کا دل پُرنے پُرنے اور دماغ کا ایاغ بادۂ عقل سے خالی ہوا، خیالِ محالِ وصالِ انجمن آرا بھرا، خوب حالی ہوا۔ سخت نادم و خجل ہو کے دل سے کہا: کم بخت زبان نے، حُسن کے بیان نے غضب کیا، منترِ کارگر ہوا، پڑھا جن سر چڑھا، حضرتِ عشق کا گزر ہوا۔ چاہا کہ بہ لطائف الحیل اِس عزمِ بیجا سے باز رکھے، عقل اور عشق میں امتیاز رکھے، کہا: اے نادان، دشمنِ جان! یہ قصدِ لاحاصل ہے۔ عمداً اِس کوچے میں پاؤں نہ دھر، اپنے خون سے ہاتھ نہ بھر، بہ قولِ مؤلف:

خدا کو مان، نہ لے نام عاشقی کا سرور
کہ منفعت میں بھی اِس کی، ہیں سو ضرر پیدا

بیان اِس کا مُحال ہے، مگر مختصر سا یہ حال ہے: عقل اِس کام میں دور ہوجاتی ہے، وحشت نزدیک آتی ہے۔ لب خشک، چشم تر، چہرہ زرد، دل خون ہوتا ہے۔ بھوک پیاس مرجاتی ہے، خواب میں نیند نہیں آتی ہے۔ جانِ شیریں تلخ ہو، کلیجے میں درد، آخر کو جُنون ہوتا ہے۔ لختِ جگر کھاتا ہے، خونِ دل پیتا ہے، مر مر کے جیتا ہے۔ رقیبوں کے طعنوں سے سینہ فگار ہوتا ہے۔ لڑکوں کے پتھروں سے سر کا رنگ گلنار ہوتا ہے۔ دن کو ذِلّت و خواری، شب کو انتظار میں اختر شُماری۔ بے قراری سے قرار رہتا ہے۔ اپنے بیگانے کی نظر میں ذلیل و خوار رہتا ہے۔ جنگل میں جی لگتا ہے، بستی اُجاڑ معلوم ہوتی ہے۔ در بہ در پھرتے میں دن تو کٹ جاتا ہے، تنہائی کی رات پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ سینہ آتشِ غم سے جل کے تنور ہوتا ہے۔ آنکھوں سے دریا اُبلتے ہیں، طوفان کا ظہور ہوتا ہے۔ عقل کا چراغ گُل، تپِ فراق سے دل جلتا ہے۔ شجرِ تمنّا بے برگ و بار رہتا ہے، پھولتا ہے نہ پھلتا ہے۔ جوانی کا گُھن، پیری تک اُدھیڑ بُن رہتی ہے۔ گونگا بہرا بن جاتا ہے، ہر دم طبیعت سُن رہتی ہے۔ ابھی پہلی بسم اللہ ہے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو، لب پر آہ ہے۔ دیکھا نہ بھالا ہے، سینے کے پار عشق کا بھالا ہے۔ آئینہ ہاتھ میں لے مُنہ تو دیکھو، نقشہ کیا ہے۔ معشوقِ باوَفا گو گردِ سُرخ، لعلِ سپید سے نایاب سوا ہے؛ کہاں مِلتا ہے۔ خاک میں، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے خواہاں مِلتا ہے۔ یہ جو زمانے میں مشہور با مہر و وفا ہیں؛ بے وفا، بانیِ صد جَور و جفا ہیں۔ عشقِ کم بخت بے پیر ہے، او نوجوان! یہی ٹیڑھی کھیر ہے۔ سُنا نہیں، کوہ کَن نے جانِ شیریں کس تلخی سے کھوئی! یوسف کی چاہ میں

زلیخا نے کیسے کنوئیں جھانکے، کیا کیا رو دی؟ مجنوں کو اِس دشت میں جنون ہوا، لیلیٰ کا کیا بگڑا؟ پرویز کا اِس کوچے میں خون ہوا، شیریں نے کیا کیا؟ افسوس تو یہ ہے کہ اِتنا بھی کوئی نہ سمجھا، جامی:

غمِ چیزے رگِ جاں را خراشد①
کہ گاہے باشد و گاہے نباشد

ذلّت اِس کام میں عینِ عزّت ہے۔ درد کا نام یہاں راحت ہے۔ دل اِس کشمکش میں ٹوٹ جاتا ہے۔ رُستم کا اِس معرکے میں جی چھوٹ جاتا ہے۔ اِسفندِیار سا رُوئیں تن ہو، تو موم کی طرح پگھل کر بہ جائے، حسرت ہی حسرت رہ جائے۔ لوگوں نے ہزاروں رنج، صدمے اِس کام میں اُٹھائے، بعدِ خرابیِ بسیار ناتجربہ کار کہلائے۔ وہ یہ بُرا کام ہے، ناکامی جس کا آغاز، بدنامی انجام ہے۔ مبتدی ہو یا مشّاق ہے، دونوں کی رائے ایک سی ہوتی ہے۔ صدمۂ دوری، المِ حضوری شاق ہے۔ مرضِ عشق میں کوئی دوست گرفتار نہ ہو۔ مؤلّف:

دوست تو دوست ہے، دشمن کو یہ آزار نہ ہو

مسدّس:

کیا میں اِس کافرِ بدکیش کا احوال کہوں | یہی خوں خوار پیا کرتا ہے عاشق کا خوں
زار کر دیتا ہے انسان کو یہ اور زبوں | رفتہ رفتہ یہی پہنچاتا ہے نوبت بہ جنوں

یہی خوں ریز تو خوں خوار ہے انسانوں کا
دین کھوتا یہی کافر ہے، مسلمانوں کا

یہی کرتا ہے ہر اک شخص کو رسوا، ظالم　　یہی کرتا ہے ہر اک چشم کو دریا، ظالم
کوہ دکھلاتا ہے گا ہے، گہے صحرا، ظالم　　کیا بتاؤں تمھیں، کرتا ہے یہ کیا کیا ظالم
در بہ در، خاک بہ سر، چاک گریباں کرکے
جان لیتا ہے، قدرے بے سر و ساماں کرکے

یہی بانی تو زلیخا کی بھی تھا خواری کا　　یہی باعث دمن و نَل کی ہُوا یاری کا
یہی فرہاد کی، حامی تھا، تبر داری کا　　عشق کہیے نہ اِسے، قہر ہے یہ باری کا
تلخ کامی ہوئی شیریں کو اسی سے حاصل
کیے بے پردہ و برباد ہزاروں محمل

اِس نے مجنوں سے بنائے ہیں بہت دیوانے　　اِس نے خود رفتگی میں، اپنے کیے بیگانے
گو کہ مشہورِ جہاں اِس کے ہیں سب افسانے　　پر، جو اِس کام کا مشّاق ہو، وہ ہی جانے
کبھی معشوق کے پردے میں نہاں ہوتا ہے
کبھی سر چڑھ کے یہ عاشق کے، عیاں ہوتا ہے

ناقۂ لیلیٰ مُضطر کا شُتر باں یہ تھا　　نجد میں قیس سے پہلے ہی حُدی خواں یہ تھا
چاہ میں ڈال کے، یوسف کا نگہباں یہ تھا　　جان ہر شیر کی لینے کو، نیستاں یہ تھا
حُسن بن جاتا ہے، انداز کہیں، ناز کہیں
درد دل ہے یہ کہیں، سوز کہیں، ساز کہیں

مثلِ فرہاد بہت مر گئے سر پھوڑ، حزیں　　دی ہے شیریں کی طرح کتنوں نے جانِ شیریں
پاس عذرا کے گیا اور کوئی وامق کے قریں　　اِس سے آوارہ بچا اور نہ بچا گوشہ نشیں

اِس سے ملتا ہے جسے، رنج و محن ملتا ہے
گور ملتی ہے کسی کو نہ کفن ملتا ہے

طور کو نور کے جلوے میں جلایا اس نے
کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
جان چھوڑی نہیں، جیتا جسے پایا اس نے
اور نیرنگِ جہاں اپنا دکھایا اس نے
کام مُردوں سے لیا، زندوں کو ناکام رکھا
درد کا نام کبھی بے دردنے آرام رکھا

اِس کے افسانے ہیں دُنیا میں بہت طول وطویل
جس کا ہمدم یہ ہوا، ہو گیا وہ خوار و ذلیل
اِس کا بیمار، پڑا رہتا ہے بستر پہ علیل
دھونس دے دے کے، بجا دیتا ہے یہ کوسِ رحیل
رنج و ماتم کے سوا، اور یہ کیا دیتا ہے
وصل کی شب سحرِ ہجر دکھا دیتا ہے

یہی اِخفا ہے بہ صد زیب رگِ ہر گُل میں
سوز و نالہ یہ اِسی کا ہے دلِ بلبل میں
یہی ہے جُز میں، اگر دیکھو، یہی ہے کُل میں
گر فرشتہ ہو، تو آجاتا ہے اِس کے حُل میں
خون بے جرم زمانے کا بہاتے دیکھا
مَیل چِتون پہ کبھی اس کی نہ آتے دیکھا

ایک شمہ ہے، لکھا حال جو میں نے اِس کا
جس پہ اِس دیو نے اَلطاف کا سایہ ڈالا
دشتِ غُربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا
دوست بھی چھوٹتے ہیں، شہر بھی چھوٹے اپنا
پاس جس کے یہ گیا، خلق سے وہ دور ہوا
کون سا شیشۂ دل تھا کہ نہ وہ چور ہوا

ہجر کے رنج میں کتنوں کا ہوا اِس میں وِصال　　لے گئے سینے میں فرقت کا سبھی درد و ملال
اِس کی گردش سے ہر اک ماہ ہوا بَدر، ہِلال　　کس کی طاقت ہے جو تحریر کرے اِس کا حال

زیست کرنا غمِ ہجراں سے یہ ہے سب کی شاق
جان دے دیتے ہیں کہہ کہہ کے یہی : ہائے فراق!

وصل میں گو مزہ ہے، ہجر کا رنج وَلے جاں گزا ہے۔ چاہ، کنویں جھکواتی ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جو جان کے ساتھ جاتی ہے۔ ہمیشہ سے اِس کام والے آہ و نالہ بَرلَب، خاک بہ سَر، چاک گریباں سب رہے ہیں۔ اگر عاشق کی عزّت و توقیر ہوتی، تو دُنیا میں اِس سے بہتر کوئی شے نہ تھی۔ جستہ جستہ اِن لوگوں کے مرتبہ شَناس، قَدر داں ہیں؛ مگر ہر جگہ کہاں ہیں! اور یہ قصّہ جو میں نے کہا، فَقَط بات کی پَچ کا جھگڑا تھا؛ ورنہ کہاں مُلکِ زرنگار، کُجا شہ زادیِ عالی تَبار! جانِ عالم نے کہا : اَستَغفِرُاللہ! اگر وہ جھوٹ تھا، تو یہ فقرہ کب سچ ہے۔ یہ تو نری کھری پَچ ہے۔ سَوز :

خدا ہی کی قسم ناصح! نہ مانوں گا کہا اب تو[1]
نہ چھوٹے گا ترے کہنے سے، میرا دل لگا اب تو

اِسی تقریر میں یہ حال ہوا کہ دل میں درد، چہرہ زرد ہونے لگا۔ لب پر آہِ سرد، گرفتارِ رنج و تَعَب، عشق کے آثار سب ظاہر ہوئے۔ شاہ زادے صاحب جامے سے باہر ہوئے۔ ضبط کا پردہ درمیان سے اُٹھا۔ شورِ فغاں سے اُٹھا۔ جنون پیرامونِ عقل۔ بے چارہ نَو گرِفتار سلسلۂ محبّت میں اَسیر، بہ قولِ میر ہو گیا۔ طالِعِ بیدار دَفعَۃً سُویا، فتنہ چونک کر جاگا۔ دل بَر سے نکل بھاگا۔ میر :

(1)
طَبع نے اک جُنوں کیا پیدا ... اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
ہاتھ جانے لگا گریباں تک ... چاک کے پاؤں پھیلے داماں تک
بے قراری نے کج ادائی کی ... تاب و طاقت نے بے وفائی کی

توتا یہ حال دیکھ کر محجوب ہوا کہ ناحق، رنڈی کی کج بحثی سے، شہزادے کو مرگ کا مستعد کیا۔ بیٹھے بٹھائے خونِ بے گناہ اپنی گردن پر لیا۔ اب اِس طرح کا سمجھانا، مانع ہونا: اُبھارنا، بھڑکانا، بلکہ نرا جلانا ہے۔ گھبرا کر تسکین و تشفّی کرنے لگا اور زخمِ شمشیرِ عشق کو مرہمِ مژدۂ وصال سے بھرنے لگا۔ کہا: آپ ہوش و حواس بجا رکھیے۔ اگر مجھے ایسا سچا جانا کہ میرا جھوٹ، سچ مانا؛ اِس شرط سے آپ کو لے چلوں گا: جو میرا کہا نہ مانو گے؛ زک اُٹھاؤ گے، دھوکا کھاؤ گے، پھر مجھ کو نہ پاؤ گے، پچھتاؤ گے۔ جانِ عالم نے فرمایا: اے رہ برِ کامل، رنج کے غم گسار، راحت کے شامل! تیرے جادۂ اِطاعت سے ہرگز قدم باہر نہ دھروں گا۔ جو تو کہے گا، وہی کروں گا۔ مگر جلد حالِ مُفصّل اور بُعدِ منازل و سمتِ شہرِ دوست سے نِشانِ کامل دے؛ وگرنہ یہ دلِ بے تاب، خجلت دِہِ بے قرارِیِ سیماب، کہ قطرۂ خوں سے فزوں نہیں؛ تڑپ کر، از راہِ چشمِ نادیدۂ رُخِ دوست نکل جائے گا۔ پھر بجز حسرت و افسوس تیرے کیا ہاتھ آئے گا۔

میر: دل تڑپتا ہے مُتّصل میرا (2)
مُرغِ بسمل ہے، یا کہ دل میرا

توتے نے کہا: اِضطِراب کا کام خراب ہوتا ہے، ناحق حجاب ہوتا ہے۔

اِتنی جلدی موقوف کیجیے۔ آج کی رات اِس شہر میں کاٹ، صُبح اُدھر کی راہ لیجیے۔ اگر کشِش صادِق اور طالع بھی مُوافِق ہے؛ منزلِ مقصد کا سفر درپیش ہوگا، ہمراہِ رکاب یہ خیر اَندیش ہوگا۔ عزم بالجزم درکار ہے۔ درِ شہر پناہ پر خانۂ دل دار ہے۔

جانِ عالم یہ خوش خبری سُن کے بشّاش ہوا۔ پھر کہا، اُستاد :

مُژدۂ وصل ہے کل، رات کی نیّت ہو حرام①

زیں اگر طالعِ برگشتہ نہ تدبیر اُلٹ

اُس رات کی بے قراری، گریہ و زاری، اختر شُماری شہ زادے کی کیا کہوں! ہر گھڑی بہ حالِ پریشان سوئے آسمان مُضطر نگراں تھا کہ رات جلد بسر ہو، نُمایاں رُخِ سحر ہو، تا عزمِ سفر ہو۔ اور یہ کہتا تھا،

سعدی : سعدیا! نوبتی اِمشب دُہلِ صُبح نکوفت②

یا مگر صُبح نباشد شبِ تنہائی را!

آخرش تاثیرِ دُعاے سحری، اثرِ نالۂ نیم شبی سے ظُلمتِ شب، بہ نورِ روز مُنوّر ہوئی۔ وزیر زادے کو، باوُجودِ خود فراموشی، یاد فرمایا۔ لڑکپن سے تا زمانۂ عشقِ انجمن آرا، اُس سے بھی اُلفت رکھتا تھا۔ جب وہ حاضر ہوا، حُکم کیا : دو گھوڑے صبا رفتار، برق کردار؛ جن کی جھپٹ نسیمِ تُند رَو کو کھنڈل ڈالے، اُن کے قدم سے کُمیتِ صرصر کی ڈپٹ پاؤں نہ آگے نکالے؛ جلد لا۔ وہ بہ مُجرّدِ اِرشاد اِصطبلِ خاص میں جا، گھوڑے لایا۔ کچھ اسبابِ ضروری، وہ بھی بہ مجبوری سے لے کے؛ دونوں

خستہ تن، بہ قولِ میرحسن چل نکلے۔ میرحسن:

نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی [1]
نکل شہر سے، راہ جنگل کی لی

وطن آوارہ ہونا نوگرفتارِ محبّت کا، اُٹھانا ایذائے غُربت کا۔ نیا نیا سفر، راہ معلوم نہیں، رہ بر بجز ذاتِ حیّ قیّوم نہیں۔ ایک رفیق، وہ اکیلا۔ دوسرا جانور، یہ بے چارہ بے پر۔ پھر ہرن کا ملنا، اِن سب کا چھوٹنا، جادوگرنی کا سدِّ راہ ہوکے مزے لوٹنا۔

بادیہ پیمایانِ مرحلۂ محبّت و صحرانوردانِ منزلِ مودّت، رہ روانِ دشتِ اشتیاق و طے کنندگانِ جادۂ فراق، مسافرانِ یارِ ناکامی بردوش، بجز راہِ کوچۂ یار دین و دُنیا فراموش، عشق سر پر سوار، خود پیادہ، زیست سے دل سیر، مرگ کے آمادہ لکھتے ہیں کہ جب بہ ایں ہیئتِ کذائی، وہ پروردۂ دامنِ ناز و آغوشِ شاہی گھر سے نکلا اور درِ شہر پناہ پر پہنچا، پھر کر عماراتِ سلطانی، بسے ہوئے شہر کو بہ نظرِ پریشانی دیکھ، آہِ سرد دلِ پُر درد سے کھینچی۔ بیاباں مدِّ نظر کر، غریب الوطنی پر کمرِ ہمّت چُست کی اور فراقِ یارانِ وطن میں دل کھول کے وہ خستہ تن خوب رُویا۔ پھر فاتحۂ خیر پڑھ، آگے بڑھ، توتے کو

پنجرے سے کھول دیا۔ گھوڑوں پر شہ زادہ اور وزیر زادہ، سمندِ صبا پر میاں مٹھو پیادہ، نیا دانہ کھاتے، نیا پانی پیتے روانہ ہوئے۔

بعد طیِّ منازل و قطعِ مراحل اِن کا گزر ایک دشتِ عجیب، صحرائے غریب میں ہوا۔ ہر تختہ جنگل کا بہ رَوِشِ باغ تھا۔ جو پھول پھل تھا؛ تازہ کُنِ دل، معطّر نمائے دماغ تھا۔ جہاں تک پیکِ نگاہ جاتا، بجز گُل ہائے رنگین و یاسمن و نسترن اور کچھ نظر نہ آتا۔ شہ زادہ شگفتہ خاطری سے صنّاعی باغبانِ قضا و قدر کی دیکھتا جاتا تھا۔ ناگاہ ایک سمت سے دو ہرن برق وش، صبا کردار، سُبک جست، باچشمِ سیہ مست، تیز رفتار سامنے آئے۔ زر بفت کی جھولیں پڑیں، جڑاؤ سنگوٹیاں جڑیں۔ گلے میں مُغرّق ہیکلیں، مثلِ معشوقِ طنّاز عربدہ ساز، سرگرمِ خرامِ ناز، چھم چھم کرتے، چوکڑیاں بھرتے۔ جانِ عالم بے چین ہوا، وزیر زادے سے کہا: کسی طرح اِن کو جیتا گرفتار کیجیے، جانے نہ دیجیے۔ اِس سعی میں گھوڑے ڈالے۔ یا تو وہ اپنی وضع پر چلے جاتے تھے؛ جب گھوڑوں کی آمد دیکھی؛ سنبھل، کنوتیاں بدل، چوکڑی تیز باجست و خیز بھرنے لگے۔ اِنھوں نے گھوڑے ڈپٹائے۔ اِن کا گھوڑے دوڑانا، وہ طائرِ فرزانہ چوکڑی بھول کے پکارا: ہاں ہاں، اے نوجوان! کیا غضب کرتا ہے! یہ دشت پُر سحر ہے، بیہودہ کیوں قدم دھرتا ہے! ہر چند پکارا، مگر سنّاٹے میں کسی نے نہ سُنا، توتے نے لاکھ سر دُھنا۔ آخر مجبور ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھ رہا، وہ چلے گئے۔

دو چار کوس دونوں ہرن ساتھ بھاگے؛ پھر ایک اور سمت،

دوسرا آور طرف چلا۔ ایک کے ساتھ شہ زادہ، دوسرے کے تعاقب میں وزیر زادہ۔ یہ بھی جُدا ہوئے۔ اَلقِصّہ تا غُروبِ آفتاب وہ شمسِ سپہرِ سلطنت گھوڑا بگٹٹ پھینکے گیا۔ دفعتہً ہرن نظر سے غائب ہوا۔ اِس نے باگ رُوکی۔ گھوڑا عرق عرق، خود پسینے میں غرق، سر سے پا تک تر، بہ حالِ مُضطر، حیران و پریشان، نادم و پشیمان، یکہ و تنہا، وزیر زادہ نہ تُوتا، آپ یادشتِ پُرخطر۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر بہت دیکھا؛ بوے انسان و حیوان مشامِ جان تک نہ آئی، طبیعت سخت گھبرائی۔ جب کسی کو نہ دیکھا، بہ صد یاس یہ کہا، شعر:

اُڑے یہ ترنگ جوانی کی، کیا جس نے مجھ کو جلا وطن①
ہوا ایسا پیش ازیں کا ہے کو، مَیں نکل کے گھر سے خراب تھا

اور کبھی جو یادِ یارانِ ہمراہی جی میں آتی تو یہ شعرِ دردناکِ میر سوز بادِلِ صد چاک و آہِ جگر دوز پڑھتا، میر سوز:

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو②
راہ ملتی ہی نہیں دشت کے آوارون کو

کچھ آگے بڑھا، چشمۂ آب نظر پڑا۔ گھوڑے سے کود ہاتھ منہ دھویا، اپنی تنہائی پر خوب رُویا۔ اُسی حالِ گریہ و زاری میں دستِ دُعا بہ جنابِ باری اُٹھا پکارا کہ اے کسِ بے کسان و اے مددگارِ رہ گم کردگان! مجھ خستہ و پریشان، دور فتادۂ یار و دیار کی رہ بَری کر۔ تیرے بھروسے پر سلطنت کو خاک میں مِلا، گھر سے ہاتھ اُٹھا، آوارۂ صحراے غربت، مُبتلاے رنج و مصیبت

ہوا ہوں۔ لا اَعْلَم :

نہ مونسے، نہ رفیقے، نہ ہمدمے دارم حدیثِ دل بکہ گویم، عجب غمے دارم

تیری ذات ہے یا یہ جنگل وحشت انگیز، دشتِ بلاخیز؛ جہاں بوئے عمرانات نہیں آتی ہے، دھڑکے میں جان جاتی ہے۔ یہ کہہ کے زارزار مانندِ ابرِ نوبہار رونے لگا، دامن و گریباں بھگونے لگا۔ فریاد و زاری، تڑپ اور بے قراری اُس کی بہ درگاہِ مُجیبُ الدَّعوات قبول ہوئی۔ تیرِ دُعا ہَدَفِ اِجابَت سے لبِ معشوق ہوا۔ ایک پیرمرد سفید ڈاڑھی والے، سبز عمامہ سر پر، عبائے عُنّابی کندھے پر ڈالے، ہاتھ میں عصا، خِضر صورت، بزرگ سیرت، پارسا؛ وارد ہو پکارے : اَلسّلامُ عَلَیکَ اے نو بادۂ چمنِ سلطنت و اے گرفتارِ محنتِ محبّت ! شہ زادے نے آنسو پونچھ سلام کا جواب دیا۔ پیرمرد نے فرمایا: اے عزیز! کیا حاجت رکھتا ہے، بیان کر۔ یہ سُن کے ایسا خوش ہوا کہ رنج راہ بھولنے کا بھولا۔ وزیر زادے اور توتے کی جُدائی بھی یاد نہ آئی، کہا: آپ کو قسم اُسی کی جس نے میری رہ بری کو بھیجا ہے، جلد نشانِ مُلکِ زرنگار دکھا دیجیے، یا دَرِ دل دار تک پہنچا دیجیے۔ وہ ستودہ صِفات ہنسا اور کہا : اللہ رے بے خودی ! ابھی بلائے ناگہانی، آفتِ آسمانی، جس میں آپ پھنسے ہیں، اُسی سے نجات نہیں پائی، معشوقہ یاد آئی ! جانِ عالم نے کہا: کوئی آفت و ستم و بلا ہجرِ جاناں اور مُفارَقتِ دوست سے سوا نہیں ہے۔ میر سوز :

نہ لگے دردِ جُدائی کو قیامت کا رنج①
روزِ محشر کو نہ میری شبِ ہجراں سے مِلا

اُس صاف باطن نے فرمایا: صاحب زادے! یہ صحرائے غضب، دشتِ پُرتعب ہے۔ ہر تختہ اس کا دامِ ستم، گُل اور بوٹا نرا خارِ غم و اَلَم ہے۔ یہاں کا پھنسا، اُلجھا، حشر تک نہیں چھٹتا۔ یہ سب کارخانۂ طلسم ہے۔ شہ زادے نے کہا: ہم سحرِ محبت میں گرفتار ہیں، ہمیں جینا، مرنے سے فزوں ہے۔ دل کا حال دِگرگوں ہے۔ شیفتہ:

ہمیشہ آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے②
الٰہی! موت دے، گزرا میں ایسے جینے سے

اُس کریم النّفس کو اِس کے حال پر رحم آیا، فرمایا: بدحواس نہ ہو، نظر بہ خدا رکھ کہ وہ چارہ سازِ عالمیں، جامعُ المتفرّقین ہے۔ شہ زادے نے کہا: فی الحقیقت، مگر برائے خدا ایک نظر مُلکِ زرنگار اور وہ معشوقِ طرح دار اگر نظر آئے، جانِ زار بچ جائے۔ زیست کا کیا اِعتبار رہے، مرگ ہر دم ہم کنار رہے، حسرتِ دید تو نکل جائے۔ اُس خدا پرست نے فرمایا: آنکھ بند کر۔ پلک سے پلک شہ زادے کی لگی، مُلکِ زرنگار میں گزر ہوا، آفتِ تازہ سے دوچار ہوا اور صورت اُس حور کردار کی نظر پڑی۔ یہ مجرّد نگاہ، دل سے آہ کی۔ بے ہوشی ساری، غشی طاری ہوئی۔ مردِ بزرگ نے سمجھایا: اِس اَمرِ لاطائل سے کیا حاصل! زندگی درکار ہے، ایک روز دوست بھی ہم کنار ہے۔ سمجھانے سے اِتنی تسکین ہوئی کہ آنکھ کھولی۔ رات ہوگئی

تھی؛ پیر مرد نے کچھ کھلا، لبِ چشمہ سُلا یا۔

جس وقت اُفُقِ چرخ سے، راہ گُم کردہ مُسافرِ مغرب، یعنی آفتابِ عالَم تاب جلوہ افروز ہو حصۂ چہارُم آسماں پر آیا، شہزادے کی آنکھ کُھلی۔ دہاں آپ کو پایا جہاں سے ہرن کے پیچھے گھوڑا اُٹھایا تھا۔ سجدۂ شُکر ادا کر سرگرمِ رہِ دوست ہوا۔ راہ کا پتا اُس رہ بَرِ خَیلِ سبز پوشاں سے پوچھ لیا تھا۔ قدم بڑھایا۔ جاتے جاتے، ایک روز آفتاب کی تمازت بہ درجۂ اتم تھی، پیاس کی شدت ہوئی۔ آب وہاں گوہرِ نایاب تھا۔ خضر تک اُس دشت میں لاعلاج، پانی کا محتاج تھا۔ زبان میں کانٹے پڑے۔ ریت کی گرمی سے تلوے جلتے تھے۔ دو گام قدم نہ چلتے تھے۔ لُوں کا شُعلہ یہ سرگرمِ آزارِ جگر سُوختگاں تھا کہ پرندے پتّوں میں مُنہ چھپاتے تھے۔ کوسوں دوندے نظر نہ آتے تھے۔ دشت، کُورۂ آہنگراں تھا۔ ہر طرف شُعلۂ جوّالہ دواں تھا۔ ریگِ صحرا کیفیتِ دریا دِکھاتی تھی، پیاسوں کی دوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی۔ صدائے زاغ و زَغن سے سنّاٹا، دھوپ کا تڑاقا۔ دشت کا پتھر تپنے سے انگارا تھا۔ جانور ہر ایک پیاس کا مارا تھا۔ وہ تابشِ شمس جس سے ہرن کا لاہو، مذکور ہے زبان میں چھالا ہو۔ بادِ سَموم سے وحشیوں کے مُنہ پر سیہ تاب تھا۔ لُوں سے گاوِ زمیں کا جگر کباب تھا۔ سیپیوں نے گرمی کے مارے لب کھولے تھے۔ حبابِ دریا کی چھاتی میں پھپھولے تھے۔ ہر ذی حیات حرارت سے بے تاب تھا۔ سوا نیزے پر آفتاب تھا۔ مچھلیاں پانی میں بُھنتی تھیں، جل جل کر کنارے پر سر دُھنتی تھیں۔ سرطانِ فلک جلتا تھا۔

کیکڑا لبِ دریا اُبلتا تھا۔

ایسے موسم کے سفر میں مفر کیوں کر ہو۔ مُسافر خواب میں بَرّاتے: چُلّو بھر پانی دو۔ درخت خشک، سوکھے پتّے کھڑکھڑاتے تھے۔ جانور پرکھولے پھڑپھڑاتے تھے۔ چار پایے ایک سمت ہانپتے تھے، گرمی کے خوف سے کانپتے تھے۔ یہ حرارت مُستولی تھی کہ دوستوں کی گرمی سے جی جلتا تھا۔ مُسافرِ وہم پانے گُماں سے راہ نہ چلتا تھا۔ خورشیدِ حشر کی طرح آفتاب تاباں تھا۔ صحرائے قیامت وہ بیابان تھا۔

اِسی حالِ خراب میں شہ زادہ سَرگشتہ، دِل بِرِشتہ، حیران پریشان؛ ایک طرف درخت گُنجان، سایہ دار دیکھ کر آیا۔ وہاں حَوض، مُصفّٰی پانی سے مُلبّب بھرا پایا۔ پانی دیکھ کے جانِ رَفتہ تَن میں آئی۔ آنکھوں نے لہروں سے ٹھنڈک پائی۔ گھوڑے سے اُترا، پانی پینے کو جُھکا؛ چرخِ کُہن نے نیرنگی نئی دِکھائی: وہی معشوقۂ مرغوبۂ مطلوبہ، جس کے سَیلِ تلاش میں غریقِ مُحیطِ اَلَم، گرفتارِ لطمۂ غَم، مثلِ پرِ کاہ بہا بہا پھرتا تھا؛ حوض میں نظر آئی۔ آنکھ چار ہوتے ہی وہ بولی: اے شناورِ بحرِ محبّت و اے غوّاصِ چشمۂ اُلفت! دیر سے تیری مُنتظر تھی، لِلّٰہِ الْحَمْد تو جلد پہنچا۔ تامّل نہ کر، کود پڑ۔ اِنھیں تو وہ آنکھ بند کرنے کا نقشہ ہر پَل مدِّنظر تھا؛ بے تامّل نہنگِ آفت کے مُنہ میں کود پڑا؛ زلالِ پست سے سیراب ہو، یہ کہتا، شعر:

①
کودا کوئی یوں گھر میں ترے دَھم سے نہ ہوگا ... جو کام ہوا ہم سے، وہ رُستم سے نہ ہوگا

کُودتے ہی سر تلے، ٹانگیں اوپر، غلطاں پیچاں تحت الثریٰ کو چلا۔ گھڑی بھر میں تہ کو پاؤں لگا۔ آنکھ کھولی۔ نہ حوض نظر آیا نہ اُس دُرِ شہوار کو پایا؛ مگر صحرائے لق و دق، جسے دیکھ کے رُستم اور اِسفندیار کا رنگ فق ہو، دیکھا۔ اُس وقت سمجھا: دوسری زک اُٹھائی، تُوتے کی بات آگے آئی، مصرع:

وای بر ما و گرفتاریِ ما

یہ کہہ کے آگے چلا۔ دور سے چار دیواری معلوم ہوئی۔ جب قریب آیا، باغ اور عمارتِ مُفصّل دیکھی۔ درِ باغ بسانِ آغوشِ مُشتاق، وا۔ سرد سرد ہوا۔ یہ تو گرمی کا مارا، وطن آوارہ تھا، بےتکلّف اندر قدم رکھا، باغ میں آیا۔ قطعۂ دل چسپ پھولا پھلا پایا۔ تختہ بندی معقول۔ پیڑ خوش قطع، خوب صورت پھول۔ روشیں صاف، نہریں شفّاف۔ چشمے ہر سمت جاری، نئی تیّاری۔ درختوں پر جانورانِ نغمہ سرا۔ برگ و بار و گُل سے بالکل باغ بھرا۔ باغبانیانِ پری وش بر روش پر بہ روشِ دل بری خراماں۔ شاخوں پر بُلبلیں غزل خواں۔ بیچ میں بارہ دری عالی شان، سب تکلّف کا سامان۔ اُس کے مُتّصل چبوترا سنگِ مرمر کا، بادلے کا سایبان کھنچا، مسندِ مُغرّق بچھی۔ ایک عورت خوب صورت عجب آن بان سے اُس پر بیٹھی۔ خواصیں دست بستہ گرد و پیش، وہ مغرور بہ حُسن و جمالِ خویش۔

شہزادے کو دیکھ کر ایک خواص پکاری: اے صاحب! تم کون ہو؟

جان نہ پہچان، بے دھڑک پرائے مکان میں چلے آئے! یہ تو زیست سے بیزار، مرگ کا طلبگار تھا؛ اُسے جواب نہ دیا، بے تامُّل مسند پر برابر جا بیٹھا یہ شعر پڑھتا، اُستاد:

پھر بیٹھے ہو دو زانو، وضعِ مُؤدّب اُس سے[1]
وضعی جو تھا، تو ہم کو دابِ ادب نہ آیا

وہ تو فریفتۂ قدیم تھی، ہنس کے چُپ ہو رہی۔ پوچھا: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ شہزادہ مُتحیّر باغ کو دیکھ رہا تھا۔ جو پیڑ تھا، پَر دار جانور کی صورت۔ پھول کھِلے، پھل تیار، آپس میں سرگرم گفتار۔ جس میوے پر رغبت ہو؛ اُس درخت کا جانور سامنے آ رقص کرے، پھل بے ہاتھ لگائے مُنہ کے پاس آئے۔ جتنا اُسے کھاؤ، ثابت پاؤ۔ جب طبیعت سیر ہو، اُسی درخت میں دیکھ لو۔ یہ حرکتیں اُس کی خواصیں شہزادے کے دِکھانے کو، در پردہ ڈرانے کو کرتی تھیں۔ اِس قرینے سے جانِ عالم کو یقین ہوا کہ یہ سب جادو کا ڈھکوسلا ہے۔ پیرمرد سچ فرماتا تھا۔ افسوس، بُرے پھنسے!

یہ تو اِن خیالوں میں تھا، اُس نے مکرّر پوچھا۔ شہزادے نے جواب دیا کہ ہمارا آنا جانا تمھی خوب جانتی ہو۔ اجنبی ہیں، مگر تم پہچانتی ہو۔ وہ مُسکرائی، خواصوں نے کہا: آپ مہمان ہیں، مُروّت شرط ہے۔ اُنھوں نے کچھ اشارہ کیا۔ کشتیاں شراب کی، قابیں گزک کو کباب کی، مع جام و صُراحی خود بہ خود آئیں۔ اور مینائے بے زباں، پُنبہ دہاں،

رَقّصاں یہ بولی، حافظ:

اگر شراب خوری، جُرعۂ فشاں بر خاک ①
ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر، چہ باک

پھر دَفعتہً جامِ لَب ریز، بریز بریز کہتا، خندہ زناں، جانِ عالم کے قریب آکے بولا، حافظ:

بنوش بادہ کہ ایّامِ غم نخواہد ماند ②
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

شہ زادے نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی۔ ڈرا کہ اگر عُذر کروں اور اسی طَرح یہ شراب بے قصد حَلق میں اُترے، تو کیا لُطف رہے؛ مگر صاحبِ خانہ سے آنکھ ملا، بہ صد حسرت یہ شعر پڑھا، لا اَعلَم:

یار سے ہے لطف مے کا، آہ یہ ہو، وہ نہ ہو ③
یہ کوئی صحبت ہے ساقی! واہ یہ ہو، وہ نہ ہو

پھر اُس جام کو ناکام ہاتھ میں لے کے، لہو کے سے گھونٹ، گلا گھونٹ گھونٹ پیے۔ وہ دَورۂ بے سَرانجام، پُرآلام گردش میں آیا۔ جب دو چار ساغَر مُتواتر جادوگرنی نے پیے؛ کاسۂ دِماغ سے عَقل دوُر، وَلولۂ مستی سے مَعمُور ہو، چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ شاہ زادہ اُس کا اِختِلاط، کج بَحثی سے بدتر جانتا تھا۔ مجبور، گردِشِ گردُونِ دوُں دیکھ کر، کچھ ہاں ہوں کر دیتا۔ سچ ہے: جسے جی پیار کرتا ہے؛ اُس کی گالی، بدمزاجی کے بوس و کنار سے زیادہ مزہ دیتی ہے۔ اِسی

صُحبت میں آدھی رات گزری۔ خاصہ طلب کیا۔ دو چار نوالے جانِ عالم نے بہ جبر، پانی کے سہارے سے، اُگل اُگل، حلق کے نیچے اُتارے۔ اُس مرجُھکّی نے قرار واقعی ہتّھے مارے۔

کھانا زہر مار کر، شہ زادے کا ہاتھ پکڑ بارہ دری میں لے گئی۔ جواہر نگار مسہری پر بٹھایا۔ ایک تو شراب کا نشہ، دوسرے عالَم تنہائی؛ بیٹھتے ہی، شرم و حجاب کا پردہ اُٹھا لپٹ گئی۔ وہ سرکا۔ پھر تو خفیف ہو کے بولی: تو نے سُنا ہوگا شہپال جادو شہنشاہِ ساحرانِ جہاں، فخرِ سامری و جیپال کا نام؛ میں اُس کی بیٹی ہوں۔ تمام باغ، بلکہ نواح اِس کا، سب سحر کا بنا ہے۔ برسوں سے تیری فریفتہ و شیدا ہوں۔ بہ تمنائے وصال خراب حال جیتی تھی۔ کوفت کے سوا کچھ نہ کھاتی نہ پیتی تھی۔ آج لات، مَنات کی مدد سے تو میرے اختیار میں آیا، دل کا مطلب بھر پایا۔ جس چیز کا شائق و طلبگار ہو، جو شے تجھے درکار ہو، بجز مُلاقاتِ انجمن آرا، جہان کا سامان مُہیّا ہے؛ بہ شرطِ اطاعت و اظہارِ محبّت؛ وگرنہ خدا جانے تیرا مآلِ کار کیا ہو، او بے مروّت!

جانِ عالم پہلے ڈرا، پھر جی مضبوط کر کے بولا: یہ سب سچ ہے جو تو نے کہا، مگر تیری تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ تو رہ و رسمِ محبّت سے آشنا ہے۔ نوشِ وصل، نیشِ فصل کا مزہ چکّھا ہے۔ انصاف کر، جس کے واسطے خانماں آوارہ، غُربت کا مارا، سرگرداں ہوا ہوں، تو اُسی کے نام کی دشمن؛ میں تیری دوستی پر کیوں کر اِعتماد کروں؟ دُنیا

ہیں تین طرح کے دشمن ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو صریح اپنا عدو ہو۔ دوسرا: دشمن کا دوست۔ تیسرا: دوست کا دشمن۔ یہ سب سے بُرا ہے، اُس سے کنارہ اچھا ہے۔ یا یہی شرطِ محبت ہے کہ ایک شخص کا نام خراب کرکے؛ جہاں آسایش ملے، وہاں بیٹھ رہے؛ فکرِ سلطنت، جُستجوے دولت میں سر بہ صحرا نہیں ہوا ہوں، جو تیری جاہ و ثروت پر اِکتفا کروں۔ تجھے معلوم ہوگا اللہ کی عنایت سے گھر کی حکومت، چین کرنے کو کافی تھی؛ مگر میرا تو یہ حال ہے، میر تقی:

اک مدت پاے چنار رہے، اک مدت گلخن تابی کی[1]
برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے، عشق نے خانہ خرابی کی

یہ سن کے، وہ کھسیانی کُتیا سی جھنجھلائی، کہا: قدرتِ سحر میری سن لے: مغرب و مشرق کا فاصلہ گردشِ چشم ہے، زرنگار جانا کیا پشم ہے! اِدھر پلک جھپکائی، اِتنے عرصے میں زرنگار گئی اور آئی۔ خیر، اگر میری ہم صحبتی گراں جانتا ہے، تیری امید بھی قطع کر دیتی ہوں؛ ابھی انجمن آرا کو لا، تیرے رُو بہ رُو جلا، اپنا دل ٹھنڈا کرتی ہوں۔ جانِ عالم بد حواس ہوا کہ رنڈی کے غصے سے ڈرا چاہیے۔ سخت غضب میں گرفتار ہوئے۔ انکار میں قتلِ معشوق مدِ نظر اور اقرار کرنے میں اپنی جان کا ضرر۔ دونوں طرح مشکل ہے۔ حیران ہو مآلِ کار سوچنے لگا، منہ نوچنے لگا۔ واقعی یہ مقدمہ بہت پیچ دار ہے؛ جس پر گزرا ہو، وہ جانے۔ دل کا حال یہ ہوتا ہے:

جدھر آیا، آیا؛ جس سے پھرا، پھرا۔ اور یہ کیا عذابِ عظیم ہے: فراقِ محبوب، وِصالِ نامرغوب۔

آخرکار شہ زادے کو بجز اطاعت، مصلحت نہ بن پڑی۔ دل کو تسلّی دے کہا: اگر اِس سے مُوافقت کرو گے، انجمن آرا کی اور اپنی زندگی ہوگی۔ خالق رحمۃ للعالمین، جامعُ المتفرقین ہے؛ کوئی صورت نکل آئے گی کہ اِس بلا سے رہائی، درِ دل دار تک رسائی ہو جائے گی۔ اِلّا، حیلہ شرط ہے۔ یہ خیال کر، ساحرہ سے کہا: ظالم! ہم تیرا جی دیکھتے تھے۔ ہم نے سُنا تھا: عاشق، معشوقوں کے ناز بردار ہوتے ہیں؛ مگر یہ جھوٹ تھا۔ دھمکاتے ہیں، ڈراتے ہیں۔ عاشقی میں حکومت کسی نے کانوں سے نہ سُنی ہوگی، ہم نے آنکھوں سے دیکھی۔ تو یہ نہ سمجھی، ایسا کون احمق ہوگا جو تجھ سا معشوقِ عاشق خصال اور یہ سلطنتِ لازوال چھوڑ کے، اَمرِ نادیدہ کی جُستجو کرے۔ اُمیدِ موہوم پر جنگل جنگل ڈھونڈھتا پھرے۔ یہ فقط اختلاط تھا۔ یہ کہ کے گردن میں ہاتھ ڈال دیا، بات کو ٹال دیا۔ وہ قحبہ تو ازار کھولے بیٹھی تھی، لپٹ گئی۔ ناچار باخاطرِ فگار پہلے تو ٹالا کیا، پھر اُس تیرہ بخت کا مُنہ کالا کیا۔ پھر ہاتھ مُنہ دُھو، اُس کے ساتھ سو رہا۔ وہ چُڑمرانی بدمست لیٹتے ہی جہنّم واصل ہوئی، دل کی تمنّا حاصل ہوئی۔

یہاں نیند کہاں۔ جی سینے میں بے قرار، پہلو میں وہ خار۔ ہر دم آہِ سرد دلِ پُردرد سے بلند۔ چشمۂ چشم جاری، فریاد و زاری دوچند۔ جگر میں سوزِ فراق نہاں، لب سے دُودِ پنہاں عیاں۔ سینہ مجمر،

دلِ وجگر سپند، یہ رُباعی برزباں، لا اَعلم:

کسی کی شبِ وصل سوتے کٹے ہے — کسی کی شبِ ہجر روتے کٹے ہے [1]
ہماری یہ شب کیسی شب ہے الٰہی! — نہ سوتے کٹے ہے، نہ روتے کٹے ہے

مگر جب وہ کروٹ لیتی، اِس کی جان خوف سے نکلتی، دَم بہ خود ہوجاتا، جھوٹ موٹ سو جاتا۔ اِسی حال سے، بہ ہزار خرابی و مشاہدۂ بے تابیِ جانِ عالم گریبانِ سحر چاک ہوا۔ رات کا قصّہ پاک ہوا۔ جادوگرنی اُٹھی، شہزادے کو حمّام میں لے گئی۔ وہاں اور عجائباتِ سحر دِکھائے۔ نہا کے دونوں باہر آئے۔ خاصہ چُنا۔ ناچ دیکھا، گانا سُنا۔ بعدِ فراغِ صحبت و جلسۂ طعام اُس نے یہ کلام کیا کہ میرا معمول ہے اِس وقت سے تا شام عَلَی الدَّوام شہپال کے دربار میں حاضر رہتی ہوں، تیری اِجازت ہو تو جاؤں، دربار کا رنگ دیکھ آؤں۔ جانِ عالم نے دل میں کہا: لِلّٰہِ الحمد جو دم تیری صورتِ پُر کدورت نہ دیکھیے، غنیمت ہے، مگر ظاہر میں زمانہ سازی سے کہا: فُرقت تمھاری گوارا نہیں، روکنے کا یارا نہیں، جلد آنا۔ ساحرہ اِس کلمے سے بہت خوش ہو چل نکلی۔ اُس کے جاتے سے باغ سُنسان، ویران، وَحشت انگیز، ہُو کا مکان ہُوا۔ تنہا شاہ زادہ باخیالِ دل بَر پھر تو بے تکلّف ہو، جی کھول کے، میرؔ:

غمِ دل کو زبان پر لایا [2]
آفتِ تازہ جان پر لایا

کہا: ہم سا بھی بدنصیب، دُور اَز حبیب دوسرا نہ ہوگا؛ جس کا یار نہ مددگار، جس سے دل کا درد کہیے، تا تسکین ہو۔ صحبت اُن کی ملی ہے

جنھیں دیکھ چُپ رہیے کہ عشق اَور کا نہ اُن کے ذہن نشیں ہو۔ ایک جانور جو رَہ بَر تھا، یوں اُڑا۔ وزیر زادہ جو لڑکپن سے جان نثار اور یاوَر تھا، وُوں چُھٹا۔ ہَوَس :

① سوائے اندوہ و یاس و حرماں، ہُوا نہ حاصل جہاں سے ہم کو
اُٹھائیں کاندھے پہ بارِ ہستی، سفر ہے بہتر یہاں سے ہم کو

نہ رفیق ہے نہ شفیق۔ حیران و پریشاں، بے سروسامان ہوں۔ خیالِ دوست ہے اور میں نیم جاں ہوں۔ شعر :

② بھیج دیتا ہے خیال اپنا، عوض اپنے مُدام　　اِس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

اِسی سوچ میں چھ گھڑی دن باقی رہا، جادوگرنی چمکی چمکائی آئی۔ جانِ عالم کو اُس کی صورت دیکھ کے رُونا آیا لیکن ڈر کے مارے جو ہنسنے لگا، نالہ گلے میں پھنسنے لگا۔ پھر وہی اَکل و شُرب کا چرچا مچا۔ جب نصف شب گزری، لَہو و لَعَب سے فرصت ملی۔ وہ تو سُو رہی؛ اِن کو بیداری، اختر شُماری نصیب ہوئی۔ فرد :

③ شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر　　جھپکی نہیں آنکھ مُصحفی کی

اِسی انداز سے دو مہینے گُزرے۔ جانِ عالم کا رُوز کی کُوفت سے یہ عالم ہوا کہ سُوکھ کے کانٹا ہوگیا۔ بدن، ڈھانچا ہوگیا۔ اُستاد :

④ ہوں کاہ سے کاہیدہ، بس زار اِسے کہتے ہیں　　عیسیٰ سے نہ ہوا اچھا، بیمار اِسے کہتے ہیں
بِن ہاتھ لگے دِس کے، جا سے نہیں ہلتا میں　　لاغر اِسے کہتے ہیں، تیّار اِسے کہتے ہیں
تصویرِ مُرقّع ہوں، سکتے کا سا عالم ہے　　جُنبش ہی نہیں، نقشِ دیوار اِسے کہتے ہیں

قضارا، ایک رُوز وقتِ رُخصت ساحرہ بولی: جانِ عالم! تیری تنہائی کا اکثر خیال بلکہ مجھے ملال رہتا ہے۔ تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا، باغِ خالی کاٹے کھاتا ہوگا۔ مجبور ہوں، کوئی تیرے دل بہلانے کی گَوں نہیں، جسے چھوڑ جاؤں۔ یہ رنڈیاں بدسلیقہ ہیں، اِن کو کہاں تک آدمیت سکھاؤں۔ ہنوز اِنھیں نشست برخاست کا قرینہ نہیں آیا، اِن سے تو اور برخاستہ خاطر ہوگا۔ شہزادے نے کہا: ہم کیا گھبرائیں گے! دل بہلانے والا کہاں سے لائیں گے! تنہا پیدا ہوئے، تمام عمر اکیلے رہے۔ ہماری قسمت میں دوسرا لکھا نہیں۔ ہم صحبت ہمارا خدا نے خلق کیا نہیں۔ لیکن یہ اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے: کوئی ہمیں مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹّی خراب رہے، تم سے کون جا کر کہے۔ ہنسی کی جا ہے، رونے والا ناپیدا ہے۔ وہ بولی: یہ مکانِ طلسم ہے، بادِ مخالف کا گزر محال ہے، تیرا کدھر خیال ہے! شہزادے نے کہا: اگر کوئی جادوگر یہ قصد کرے، اُسے کون روکے؟ فریفتہ بہ شدّت تھی، بند ہوئی۔ وہم یہ ہوا کہ میرے بعد کوئی جادوگرنی آئے اور اِس پر عاشق ہو جائے؛ مار ڈالنا کیسا، یہاں سے اُڑائے، تو تو کہاں پائے! سب محنت برباد جائے! فرطِ محبت، نشۂ اُلفت میں انجامِ کار نہ سوچی؛ بے تامّل نقشِ سلیمانی، جو بزرگوں کی امانت اور نشانی تھی، صندوق سے نکال اُس کے بازو پر باندھا، کہا: اب نہ تاثیرِ سحر، نہ دیو کا گزر، نہ پری سے ضرر ہوگا۔ دل کا کھٹکا مٹا، مزے اُڑا۔ یہ کہہ کے، وہ تو بہ دستور چلی گئی، جانِ عالم کے سر پر خرابی آئی؛ وہی بلبلانا، شور مچانا، باغ

کو سر پر اُٹھانا۔ اور گاہ انجمن آرا کے تصوّر سے یہ کہنا، مؤلّف :

لکھا ہوا یہی قسمت کا تھا، سو جان، ملا — کہ میری، خاک میں، محنت دے آسمان، ملا
ہزار صدمے پہ دل نے ہمارے اُف بھی نہ کی — جو اک رفیق ملا، وہ بھی بے زبان ملا
نہ ہم نے چین بہ زیرِ فلک کبھی پایا — عنایتِ ازلی سے عجب مکان ملا
تری تلاش میں در در بھٹکتے پھرتے ہیں — ملا نہ تو ہی، تو جوتی سے، گو جہان ملا
نہ کہہ تو پیرِ فلک! پر کہے گی ساری خلق — کہ خاک میں ترے جوروں سے کیا جوان ملا
بہت جہان کی کی سیر اے سُرورِ حزیں — یہ بے خزاں نہ ہمیں کوئی بوستان ملا

ایک دن عالمِ تنہائی میں جانِ عالم کو یہ خیال آیا: اِس نقش کی تعریف اُس نے بہت کی تھی؛ کھولو تو، شاید عُقدۂ کارِ بستہ کھلے۔ یہ سوچ کے اُسے کھولا۔ اُس کا یہ نقشہ تھا: بِست در بِست کا نقش؛ ہر خانے میں اَسماے اِلٰہی مع ترکیب و تاثیر تحریر تھے۔ دیکھتے دیکھتے خانۂ مطلب میں نظر پڑی۔ لکھا تھا کہ کوئی شخص اگر کسی ساحر کی قید میں ہو، یہ اِسم پڑھے، نجات پائے۔ یا مکانِ طلسم میں پھنسا ہو، اِسے پڑھتا، جدھر چاہے چلا جائے۔ اور جو کوئی سحر کرتا ہو، اُس پر دَم کر پھونک دے؛ اُسی دم اِس کی برکت ساحر کو پھونک دے۔

یہ سانحہ اُس میں دیکھ کے، قریب تھا شہزادہ شادی مرگ ہو۔ جلد جلد وہ سب اِسم یاد کر، نقش بازو پر باندھا۔ اِس عرصے میں جادوگرنی موجود ہوئی؛ جانِ عالم کے تیور بُرے دیکھے، پوچھا: مزاج آج کیسا ہے؟ وہ بولا: اَلحمدُ لِلّٰہ بہت اچھا ہے۔ دیر

سے تیرا مُنتَظِر تھا۔ لے تجھے شیطانِ عَلَیْہِ اللَّعن کو سونپا، ہمارا اللہ نگہبان ہے۔ یہ سُنتے ہی روح قالب سے نکل گئی۔ سمجھی بیچ پڑا۔ جانِ عالم چل نکلا۔ سحر سے رُوکنے لگی، تاثیر نہ کی۔ سر پیٹ کر کہا، سعدی :

کس نیاموخت علمِ تیر از من①

کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

یہ کہ کے ناریل زمین پر مارا۔ وہ پھٹا، ہزارہا اژدہا شُعلہ فشاں پیدا ہوا۔ شہ زادے نے کچھ پڑھا؛ وہ سب کے سب پانی ہوگئے، ہستی سے فانی ہوگئے۔ پھر تو منّت کرنے لگی، پاؤں پر سر دھرنے لگی۔ جادوگرنیاں سمجھانے لگیں کہ یہ شرطِ مُروّت نہیں؛ جو اپنا والہ و شیدا ہو، اُس سے دَغا کیجے۔ شہ زادے نے کہا: گریبان میں مُنہ ڈالو، سوچو تو؛ ہم بھی کسی کے عشق میں خود رفتہ، وحشی، عزیزوں سے جُدا، مُصیبت کے مُبتلا، سر بہ صحرا ہوئے تھے؛ ہمیں جبر سے قید کیا، ہزار طرح کا اَلَمِ مُفارَقت دیا۔ یہ احسان کچھ کم ہے، ہم نے طِلِسم دَرہَم و بَرہَم جو نہ کیا۔ وہ سمجھیں، یہ نہ ٹھہرے گا۔ عاشقی کا کام نصیحت و پَند، قید و بَند سے نہیں ہوتا۔ اور جبر کا کام اگر اِختیار کیا؛ حباب آسا ناپایدار ہے، اُس کا کیا اِعتبار ہے۔ حسن :

سدا ناو کاغذ کی بہتی نہیں②

اور یہ قَضِیّۂ اِتّفاقیہ ہے، مصرع :

ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے③

حسن : کبھی یوں بھی ہے گردشِ روزگار[1]
کہ معشوق، عاشق کے ہو اختیار

لیکن سوچو تو، لاکھ طرح کا راحت و آرام ہو، جہاں کا چین صبح و شام ہو، جو جی نہ لگے تو کیا کرے۔ اُستاد: دولتِ کونین حاصل ہو تو اُٹھیے لات مار[2]
پھر نہیں لگتا ہے جی، جس جا سے ہو جس کا اُچاٹ

اَلغرض وہ سر پیٹتی رہیں۔ جانِ عالم نے بہ برکتِ اَسمائے اِلٰہی اُس طِلِسم سے رہائی پائی، اپنی راہ لی۔ چند رُوز میں پھر اُس حوض پر وارِد ہوا۔ دیکھا اسپِ وفادار پتھر سے سر مار مار مرگیا تھا۔ اُس کی لاش دیکھ کے دل پاش پاش ہوا، خوب رُویا۔ اب اور رنج پیادہ پائی کا قدم بوس ہوا۔ پاؤں اُٹھانا کالے کوس ہوا۔ سُبحان اللہ! کہاں وہ شہ زادہ پروردۂ نعم و ناز، کہاں یہ پیادہ پائی کا سفرِ دور و دراز! ہر قدم خار، ہر گام آزار، مگر تصوّرِ یار پیشِ نظر۔ ہر قطرۂ اشک میں سو سو لختِ جگر۔ آہ و نالہ در دہاں، یہ شعر ہر ساعت بر زباں، ناسخ:

مانعِ صحرا نوردی، پاؤں کی اِیذا نہیں[3]
دل دُکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

کیوں نہ کھٹکوں آسماں کو رات دن مَیں ناتواں
آبلے کی شکل اُس میں، مجھ میں عالم خار کا

رنگِ رُو فق، دل میں قلق۔ سینہ فِگار، پا آبلہ دار۔ چھاتی غمِ دوری سے شق۔ کبھی حکایتِ شکایت ہیز، گاہ نالۂ قیامت خیز۔ اور یہ غزل مؤلف کی درد آمیز

پڑھتا چلا جاتا تھا ، مؤلّف :

توڑ کر خُم اور پٹک کر آج پیمانے کو ہم ۔ سوے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم
شمعِ رُو! محفل میں کب دیں بار پروانے کو ہم ۔ ایک کیڑے سے بھی کیا کچھ کم ہیں جل جانے کو ہم
خواب سا کرتے ہیں ہم ایّامِ عشرت کو قیاس ۔ دھیان میں لاتے ہیں جس دم گزرے افسانے کو ہم
پر تلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم ۔ چھانتے ہیں اب وہاں پر خاکِ پروانے کو ہم
اشکِ گل گوں کے نشاں چھُٹے، کچھ پتا ملتا نہیں ۔ جب خزاں میں ڈھونڈتے ہیں اپنے کاشانے کو ہم
جُرم کچھ صیّاد کا اپنی اسیری میں نہیں ۔ روتے ہیں کُنجِ قفس میں آب اور دانے کو ہم

رشکِ زلفِ یار سب عُقدے ہیں میرے اے سُرورؔ
اور اُلجھ اُٹھتے ہیں، بیٹھیں جب کہ سُلجھانے کو ہم

چشمِ تر، رنگ زرد، آہ سرد، دل میں درد۔ پاؤں کہیں رکھتا، آبلہ پائی سے کہیں اور جا پڑتا۔ نہ راہ میں بستی نہ گاؤں۔ نہ میل نہ سنگِ نشاں، راہ کا سر نہ پاؤں۔ دلِ صفا منزل میں عزمِ دیدِ دل دار۔ آبلوں کو اُنسِ خار۔ سخت بدحواسی تھی۔ کانٹوں کی زبان تلووں کے خون کی پیاسی تھی۔ نہ کوچ کی طاقت، نہ یارائے مُقام۔ گھبرا کے وہ ناکام یہ کہتا، مؤلّف :

بدل دے اور دل اِس دل کے بدلے ۔ الٰہی! تو تو ربّ العالمیں ہے
اور اُس پر نقدِ جاں دے کر، بدل لیتا سُرورؔ
گر دلِ بے رنج چڑھ جاتا کسی کا دھیان میں

اور جب ولولۂ شوق سے جوشِ جنوں ہوتا، آنکھوں سے موج زن دریائے خون ہوتا، تو یہ غزل مؤلّف کی پڑھتا، مؤلّف :

قرار باقی نہیں جانِ زار بن تیرے — ستا رہا ہے دلِ بے قرار بن تیرے
گھمنڈ تھا مجھے جن جن کا، سب وہ بھاگ گئے — حواس و ہوش، شکیب و قرار بن تیرے
سر گزشتۂ محبوب، خاک شرح کرے — بسر جو کرتا ہے لیل و نہار بن تیرے

خلاصۂ کار یہ کہ اسی حالِ خراب اور دلِ بے تاب سے ہر روز سرگرم منزل تھا۔ دیدۂ دیدار طلب سے رواں خونابۂ دل تھا۔

رہا ہونا اُس گرفتارِ دامِ سحر کا جادوگرنی کے جال سے، اور ملاقات ہونی ملکہ مہر نگار صاحبِ حسن و جمال سے۔ ملکہ کی طبیعت کا لگاو، تازہ شمشیرِ الفت کا گھاو۔ باہم کی چھیڑ چھاڑ، بناو کا بگاڑ۔ پھر ملکہ کے باپ سے ملنا، لوح لے کے چل نکلنا۔

عشق ہے تازہ کار، تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال①
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
گہ نمک، اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا، چراغ کا پایا
کہیں طالب ہوا، کہیں مطلوب — اس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب

یہاں سے دشت نوردانِ وادیِ سخن، جگر افگار و غربت زدگانِ پُر محن و سینہ ریش باپاے زخم دار و دلِ خار خار بیان کرتے ہیں کہ وہ مسافرِ صحراے اندوہ و حرماں، عازمِ سمتِ جاناں، بے توشہ و

زادِ راہ، ہر روز بادلِ پُرسوز کراہ کراہ؛ بادیہ گردی کرتا، جیتا نہ مرتا؛ ایک روز نواحِ دل کشا و صحرائے فرح افزا میں گزرا۔ دیکھا کہ باغبانِ قدرت نے صفحۂ دشت گل ہائے گوناگوں، مختلف رنگ، بوقلموں سے بہشتِ ہشتم، رشکِ صحنِ چمن بنایا ہے اور بوٹا پتا گھانس کا بہ از گلِ باغِ اِرَم، خجلت دِہِ نسرین و نسترن کر دکھایا ہے۔ گرد جدولِ آبِ رواں۔ چشمہ ہر ایک چشمۂ حیواں۔ اور لکّہ ہائے ابر نے چھڑکاو سے عجب رنگ جمایا ہے۔ نسیمِ بہار اور درختِ گل دار سے میدان رشکِ ختن و تاتار ہے۔ نہ کہیں گرد ہے نہ غبار ہے۔ درختوں پر فیضِ ہوا اور ترشح سے سرسبزی اور چمک کا جوبن ہے۔ گل ہائے خود رو سے جنگل نمونۂ گلشن ہے۔

یہ تو مدتوں کا مسافت دیدہ، مسافرت کشیدہ تھا؛ وہ زمینِ خجستہ آئین بہت پسند آئی۔ دل میں آیا: آج کی شب اِسی جا سحر کیجیے، قدرتِ حق مدِّ نظر کیجیے۔ ایک سمت زمین ہموار، درخت گنجان، چشمہ ہائے آبِ رواں دیکھ کے جا بیٹھا۔ جنگل کی کیفیت جی بے کل کرنے والی۔ جانوروں کی چھل بل، اُچھل کود کی دیکھا بھالی۔ خوش فعلی کی سیر۔ کلیل میں وحش و طیر۔ بو باس ہر برگ و گل کی۔ دھوم دھام طائروں کے غل کی۔ بوٹے پتّے کی نشو و نما۔ سرد سرد ہوا۔ کوسوں تک پہاڑ کی ڈانگ، اُس پر عجائب غرائب نقاشِ ازل کے سانگ۔ ایک سمت ابرِ سیاہ گھرا، سرخ و سفید، اودی ساون بھادوں کی گھٹا۔ چرخِ کہن نئے نئے رنگ بدلتا۔ کبھی بجلی چمک جاتی، آنکھ جھپک جاتی۔ رعد زور شور سے مے خواروں کو یہ سُنا رہا، میر سوز:

کی فرشتوں کی راہ ، ابر نے بند①
جو گنہ کیجیے ، ثواب ہے آج

ندّیاں نالے چڑھے ، دریا بڑھے۔ جھیلیں ، تالاب لب ریز۔ ڈبرے موج خیز۔ پپیہے کا مستوں سے مخاطب ہونا، پی پی کہہ کے آپی جان کھونا۔ کوئل کی کوکو اور توتو سے کلیجا منہ کو آتا تھا۔ مور کا شور، برق کی چمک ، رعد کی کڑک ، ہوا کا زور زور رنگ دکھاتا تھا۔ شام کا وقت ، غروبِ آفتاب کا عالم ، جانوروں کا درختوں پر بیٹھنا باہم۔ زمین پر فرشِ زمرّدیں یکسر بچھا۔ جہاں تک نظر جاتی ، دھان لہریں لے رہا۔ آسمان میں رنگا رنگ کی شفق پھولی ، شامِ اودھ کی سیر بھولی۔ ایک سمت قوسِ قزح ، جسے دھنک کہتے ہیں ، بہ صد جلوہ و شان فلک پر نمایاں ؛ سرخ ، سبز ، زرد ، دھانی لکیریں عیاں۔ بلبل کے چہچہے۔ درخت سرسبز ، لہلہے۔ کوسوں تک سبزہ زار ، پھولوں کی بہار۔ کہیں ہرن چرتے ، کہیں پرند سیر کرتے۔ کسی جا طاؤسانِ طنّاز سرگرمِ رقصِ ناز۔ لبِ ہر چشمۂ آب مرغِ آبی و سرخاب۔ کبھی نمود ہونا ماہ کا ؛ چکور کا دوڑنا ، بھرنا آہ کا۔ دونوں وقت ملتے۔ اس دید کی خراش سے دل پاش پاش ، زخمِ جگر چھلتے۔ یہ سیر جو ہجرِ جاناں میں نظر سے گزر جائے ؛ کیوں کر دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو ، چھاتی نہ بھر آئے۔ استاد :

کارِ اخگر کرتی ہے ہر بوند تن پر یار بن②
کیا عجب ، گر ہوں ہرے داغِ جگر برسات میں

قاعدہ ہے جب آدمی کو سامانِ عیش و نشاط، اِس طرح کی سیرِ فرحت و اِنبساط میسّر ہوتی ہے، جسے پیار کرتا ہے، وہ یاد آتا ہے۔ شہزادے نے مدّت کے بعد یہ فرحت و فضا جو دشت میں پائی، یار کی یاد آئی؛ آنکھیں بند کر کے کہا، شعر:

①
میں وہ نہیں جو کروں سیرِ بوستاں تنہا　　　بہشت ہو تو نہ منہ کیجے باغباں، تنہا

اِس سوچ میں بیٹھا تھا، ایک طرف سے سواری کا سامان نظر آیا۔ "ادب" اور "ملاحظہ" کا غُل، "تفاوت" اور "قرینے"، "نگاہ رُو بہ رُو" کا شور بلند پایا۔ غور جو کیا، رنڈیوں کا غول سامنے آیا۔ یہ گھبرایا؛ دھوکا پا چکا تھا، جنگل میں غوطہ کھا چکا تھا۔ سنبھل بیٹھا اور اَسمائے ردِّ سحر پڑھنے لگا، بہ موجِبِ مثل: دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیتا ہے۔ جب وہ آگے بڑھیں، غور سے دیکھا: چار پانچ سے عورت پری زاد، حور وش، غیرتِ سرو، خجلت دہِ شمشاد، زرّیں کمر، نازک تن، سیم بر، چُست و چالاک، کم سن، اَلّڑھ پنے کے دن، اچھلتی کودتی، مردانہ وار پیادہ؛ اور جواہر نگار ہوا دار پر ایک آفتابِ محشر سوار، گرد پریوں کی قطار، تاجِ مرصّع کج سر پر، لباسِ شاہانہ پُر تکلّف در بر، نیمچۂ سلیمانی اُس بلقیس وش کے ہاتھ میں، سیماب وشی بات بات میں، صید کرنے کی گھات میں۔ اور بندوقِ چقماقی خاص لندن کی، طائرِ خیال گرانے والی برابر رکھے؛ شکار کھیلتی، سیر کرتی چلی آتی ہے۔ حُسنِ خداداد بے مثال، کاہشِ بدر، غیرتِ ہلال، عجب سن و سال۔ میر حسن:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن　　　جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن②

طالعِ بیدار یاور، اقبال دم ساز۔ غمزہ و عشوہ جلو میں۔ انداز و ادا ردیں۔ آفتِ جانِ عاشق، سرمایۂ ناز۔ جانِ عالم نے بہ آوازِ بلند کہا،

میر تقی :

(۱)
کیا تنِ نازک ہے، جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے، تہ جس کی پیراہن پہ ہے

یہ صدا، جو اہتمامِ سواری آگے آگے کرتی تھیں، اُن کے کان میں پڑی اور نگاہ جمالِ جانِ عالم سے لڑی؛ دفعۃً سب کی سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئیں۔ کچھ، سکتے کے عالم میں سہم کر جھجک گئیں۔ کچھ بولیں: اِن درختوں سے چاند نے کھیت کیا ہے۔ کوئی بولی: نہیں ری! سورج چھپتا ہے۔ کسی نے کہا: غور سے دیکھ، ماہ ہے۔ ایک جھانک کے بولی: یا اللہ ہے، مگر چودھویں کا چاند ہے۔ دوسری نے کہا: اِس کے رُو بہ رُو وہ بھی ماند ہے۔ ایک نے غمزے سے کہا: چاند نہیں تو تارا ہے۔ دوسری چٹکی لے کے بولی: اُچھال چھکّا! تو بڑی خام پارا ہے۔ ایک بولی: سرو ہے یا چمنِ حُسن کا شمشاد ہے۔ دوسری نے کہا: تیری جان کی قسم پرستان کا پری زاد ہے۔ کوئی بولی: غضب کا دل دار ہے۔ کسی نے کہا: دیوانیو! چپ رہو! خدا جانے کیا اِسرار ہے۔ ایک نے کہا: چلو نزدیک سے دیکھ، آنکھ سینک کے دل ٹھنڈا کریں۔ کوئی کھلاڑن کہ اُٹھی: دور رہو، ایسا نہ ہو اِسی حسرت میں تمام عمر جل جل مریں۔ ایک نے خوب جھانک تاک کے کہا: خدا جانے تم سب کے دیدوں میں چربی کہاں کی چھاگئی ہے، کیا ہُوا ہے؟ یہ تو بھلا چنگا، ہٹا کٹا مردُوا ہے۔

سواری جو رُکی، ملکہ نے پوچھا: خیر ہے؟ سب نے ڈرتے ڈرتے دست بستہ عرض کی: قربان جائیں، جان کی امان پائیں تو زبان پر لائیں۔ ہمیشہ

سواری حضور کی اِس راہ سے جاتی ہے، مگر آج خِلافِ معمول اِن درختوں سے ایک شکلِ دل چسپ ایسی نظر آتی ہے کہ، فرد:

سُنا یوسفؑ کو، حسینانِ جہاں بھی دیکھے[1]
ایسا بے مثل طرح دار نہ دیکھا نہ سُنا

ملکہ متعجب ہو کے پوچھنے لگی: کہاں؟ ایک نے عرض کی: وہ، حضور کے سامنے۔ جیسے ملکہ کی نگاہ چہرۂ بے نظیر، صورتِ دل پذیرِ جانِ عالم پر پڑی، دیکھا: ایک جوان، رشکِ مہِ پیرِ کنعاں، رعنا، سروِ قامت، سہی بالا، بحرِ حُسن و خوبی کا دُرِ یکتا، کاسہ سر سے فرِ شاہی نمایاں، بادۂ حُسنِ دل فریب سے معمور ہے۔ دماغِ کشورِستانی ہے، اُٹھتی جوانی ہے، نشۂ شباب سے چکنا چور ہے۔ خمِ ابرو محرابِ حسیناں، سجدہ گاہِ پردہ نشیناں۔ چشمِ غزالی سُرمہ آگیں ہے۔ آہوئے رم خوردۂ کشورِ چیں ہے۔ چِتون سے رمیدگی پیدا ہے۔ مستِ مےِ محبت ہے، اِس پر چوکنّا ہے۔ دیدے کی سفیدی اور سیاہی لیل و نہار کو آنکھ دِکھاتی ہے۔ سوادِ چشم پر حورِ سویدائے دِل صدقے کیا چاہتی ہے۔ حلقۂ چشم میں کتنے ہموار مردمِ دیدہ دھرے ہیں۔ صانعِ قدرت نے موتی کوٹ کوٹ کے بھرے ہیں۔ مژہ نکیلی اُس کمان ابرو کی دل میں دوسار ہونے کو لیس ہے۔ رشکِ لیلیٰ یہ غیرتِ قیس ہے۔ ناوکِ نگاہ سے سپرِ چرخ تک پناہ نہیں۔ دِل دُوزی بے گناہوں کی اِس کی مِلّت میں صواب ہے، گناہ نہیں۔ لوحِ پیشانی: تختۂ سیمیں یا مطلعِ نور ہے، یا طباشیرِ صُبح یا شمعِ طور ہے۔ کاکُلِ مُشکیں سے

زُلفِ سُنبُل کو پریشانی ہے۔ بُوباس سے خُتَن والوں کے ہوش خطا ہوتے ہیں، حیرانی ہے۔
عَنبر پس مُویوں کو زِندگی وَبال ہے۔ بال بال پُرپیچ وخَم دار ہے۔
روئے تاباں بسانِ چشمۂ حَیواں ظُلمت سے نَمودار ہے۔ ہُما اپنے
پَروبال سے اِس صاحبِ اِقبال کا مَگس راں ہے۔ رُخِ تابندہ کی
چمک سے نیّرِ اعظم لَرزاں ہے۔ لَبِ گُل بَرگِ تَر پر سبزے کی نَمود
ہے، یا دُھواں دھار مُشتاقوں کے دل کا دُود ہے۔ نظر جھپکتی ہے، تجلّیِ
قُدرتِ ربِّ وَدُود ہے۔ ہر حلقہ گیسوئے مُعَنبَر کا کمندِ گرہ گیر ہے؛ مگر
بالوں کے اُلجھنے سے کُھلتا ہے کہ کسی کی زُلفِ پیچاں کا خود بھی اَسیر ہے۔
خَندۂ دَنداں نُما سے ہونٹ، لعلِ بَدَخشاں کا رنگ مِٹاتا ہے۔ دانتوں کی
چمک سے گوہرِ غلطاں بے آب ہوکر لُوٹا جاتا ہے۔ معشوقوں کا اُن پر دانت
ہے، دل وجان وارتے ہیں۔ جو نظر سے پنہاں ہوں، ڈاڑھیں مارتے
ہیں۔ دمِ تقریر دُرجِ دَہاں جو کھولتا ہے، سامع مُوتی رُولتا ہے۔
ہر کلمہ اِعجاز نُما ہے، بیمارِ محبّت کا مسیحا ہے۔ دونوں ہاتھ نِہالِ اُلفت
کی شاخِ باردار ہیں، دل کی دَستبُردی کو اور خزانۂ قارُون بانٹ دینے
کو سَرِ دَست تیار ہیں۔ کفِ دَست کی لکیریں۔ دَست آویزِ محبّت، یدِ قُدرت
سے تحریر ہے، سَرنَوِشت سے یہ کُھلتا ہے کہ سلسلۂ الفت میں کسی کے رگ وپے بستۂ
زنجیر ہے۔ مرآتِ سینہ میں عکس اَفگن کوئی صاحبِ جمال ہے، مدِّ نظر
کسی کا خیال ہے۔ کمرِ نازک جُستجو پر چُست باندھی ہے، گو بیٹھا سُست
ہے؛ چلنے کو مثلِ صبا آندھی ہے۔ پاؤں وادیِ تلاش میں سَرگرمِ رفتار

ہیں۔ زیرِ قدم دَشت و کُہسار ہیں۔ مگر قسمت اپنی بَرسَرِ یاری ہے کہ ہمارے دام میں یہ ہُمائے اَوجِ شَہریاری ہے۔

یہ تصوّر دل میں تھا کہ کارپَردازانِ محکمۂ ناکامی حاضر ہوئے اور مَشّاطۂ حُسن و عشق نے پیش قدمی کر متاعِ صبر و خِرَد، نقدِ دل و جاں، اَثاثِ ہُوش و حَواس، تاب و تَوانِ ملکۂ جگر فِگار آرَمغانِ رونُمائی میں نذرِ شہزادۂ والاتَبار کیا۔ عقل و دانِش گُم، صُمٌّ بُکمٌ کا نقشہ ہوا۔ حضرتِ عشق کی مدد ہوئی، سب بَلا رَد ہوئی۔ شوقِ وصل دل میں پیدا ہوا، جی شیدا ہوا۔ دَفعتہً کیا تھا، کیا ہوا۔ میر تقی:

تھی نظر، یا کہ جی کی آفت تھی ۔۔۔ وہ نظر ہی وَداعِ طاقت تھی ①
ہُوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ ۔۔۔ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
دل پہ کرنے لگا تپیدن ناز ۔۔۔ رنگ چہرے سے کر گیا پرواز

ملکہ تھرتھرا کر ہَوادار پر غَش ہوئی۔ خَواصوں نے جلد جلد گُلاب اور کیوڑا، بیدِ مُشک چھڑکا۔ کوئی نادِ علی پڑھنے لگی۔ کوئی سورۂ یوسف دَم کرنے کو آگے بڑھنے لگی۔ کسی نے بازو پر رومال کھینچ کر باندھا، تَلوے سہلانے لگی۔ کوئی مٹّی پر عطر چھڑک کر سُنگھانے لگی۔ کوئی بیدِ مُشک سے ہاتھ مُنہ دھوتی تھی۔ کوئی صدقے ہو ہو رُوتی تھی۔ کوئی بولی: چِہل کُنجی کا کٹورا لانا۔ کسی نے کہا: یَشب کی تختی دھر کے پلانا۔ کسی نے کہا: بِلا رَیب آسیب ہے۔ کوئی بولی: اُسی کے دیکھنے سے دل ناشکیب ہے۔ کوئی بولی: یہ تو عجب چمک کا ماہ پارہ ہے! اِس کا دیکھنا یہ رنگ لایا، گویا چاندنی نے مارا ہے۔ کوئی سمجھی: یہ شخص ہم جنس نہیں، قسمِ جن سے ہے۔ کوئی بولی: دیوانیو! یہ غشی

تقاضائے سِن سے ہے۔

غرض کہ دیر میں ملکہ کو اِفاقہ ہوا، مگر دل مُضطرب، تپاں۔ خواہش اُسی طرف کشاں۔ جذبِ عشق سے مقناطیس و آہن کا عالم۔ کششِ محبت سے کاہ و کہربا اُسی دم ہوگئی۔ رنگِ رُو طائرِ پریدہ۔ صبر و ضبط دامن کشیدہ۔ مشورہ ہوا سواری اِدھر سے پھیرو، ملکہ کو بیچ میں گھیرو، لیکن تابِ تحمّل، یارائے جبر ملکہ کو بالکل نہ رہا، اُسی بدحواسی میں کہا تو یہ کہا: دیوانیاں ہو! یہ کوئی مسافرِ بے چارہ، خانماں آوارہ، غربت کا مارا تھک کر بیٹھ رہا ہے، اِس سے ڈرنا کیا ہے! قریب چلو، حال پوچھو۔ ناچار، وہ سب فرماں بردار چلیں، مگر جھجکتی، ایک دوسرے کو تکتی۔ جوں جوں سواری قریب جاتی تھی، ملکہ کی چھاتی دھڑکتی تھی، دل میں تڑپ زیادہ پاتی تھی۔ اگرچہ جمالِ پری تمثال ملکہ مہر نگار بھی سحرِ سامری کا نمونہ، مہ و مہر سے چمک دمک میں دُونا، عابد کُش، زاہد فریب تھا؛ جانِ عالم بھی بے چین ہوا، مگر دامنِ ضبط دستِ اِستقلال سے نہ چھوڑا۔ جس طرح بیٹھا تھا، جُنبش نہ کی، تیور پر مَیل نہ آیا۔

ایک خواصِ خاص بہ اِشارۂ ملکہ آگے بڑھی، پوچھا: کیوں جی میاں مُسافر! تمھارا کدھر سے آنا ہوا؟ اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے، سوائے اللہ کی ذات، ہیہات، کوئی سنگ نہ ساتھ، اِس جنگل میں وارِد ہو؟ شہ زادے نے مسکرا کر کہا: مصیبت، خیلا، تجھ پر پڑی ہوگی۔ معلوم ہوا یہاں آفت زدے آتے ہیں، ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ کہو تو تم سب کی کیا کم بختی، ایاموں کی گردش، نصیبوں کی سختی ہے؛ جو خاک پھانکتی، مسافروں کو تاکتی جھانکتی، چڑیلوں کی طرح ناکام سرِ شام

پھرتی ہو! سوکھے میں مسافروں پر پھسل پھسل کے گرتی ہو۔

ملکہ یہ کلمہ سن کے پھڑک گئی اور ہوادار آگے بڑھا خود فرمانے لگی: واہ واصاحب! تم بہت گرماگرم، تند مزاج، حاضر جواب، پابہ رکاب ہو۔ حال پوچھنے سے اتنا درہم برہم ہوئے، کڑا فقرہ زبان پر آیا۔ اِس مُردار کے ساتھ، تھوتھو، مجھ چھٹ سب کو پچھل پائیاں بنایا۔ جانِ عالم نے کہا: اپنا دستور نہیں کہ ہر کس وناکس سے ہم کلام ہوں۔ دوسرے، مُردار سے بات کرنا مکروہ ہے، مگر خیر، دھوکے میں جیسا اُس نے سوال کیا، ویسا ہم نے جواب دیا۔ اب تمھارے منہ سے مُردار نکلا، ہم سمجھ گئے، چپ ہو رہے۔ ملکہ نے ہنس کر کہا: خوب! یک نہ شد دو شد۔ صاحب! چوں چرا سنبھالو، ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو۔ کیا میرے دشمن درگور مُردار خور ہیں؟ آپ بھی کچھ زور ہیں! بھلا وہ تو کہ کے سن چکی، میں آپ سے پوچھتی ہوں: حضورِ والا کس سمت سے رونق افروز ہوئے، دولت سرا چھوڑے کے روز ہوئے؟ اور قدومِ میمنت لزوم سے اِس دشتِ پُرخار کو کیوں رشکِ لالہ زار کیا، بارِ گرانِ سفرِ غربت کب سے سر پر لیا؟

جانِ عالم نے کہا: چہ خوش! آپ در پردہ بناتی ہیں، بگڑ کر طنز سے یہ سناتی ہیں۔ ہم حضور کا ہے کو، مزدور ہیں۔ آپ اپنے نزدیک بہت دور ہیں۔ جیتے جی چار کے کاندھے چڑھی کھڑی ہو، بے شک حضور ہو۔ عارضی جاہ و حشم پر مغرور ہو۔ جو جو جلیسیں تھیں، بولیں: ملکۂ عالم! آپ کس سے گفتگو دُبدُو کرتی ہیں! یہ مردوا تو لٹھ ہے، سخت منہ پھٹ ہے۔ ملکہ بولی: چپ رہو، اِن باتوں میں دخل نہ دو۔ اگر یہ بدمزہ ہو جائے گا تو صلواتیں سنائے گا۔ وہ سب ہٹیں، آپس میں کہا: خدا خیر کرے! آج جنگل میں گل پھولا چاہتا ہے، یہ پردیسی پنچھی راہ

بھولا چاہتا ہے۔ پھر ملکہ بولی: اے صاحب! خُدا کے واسطے کچھ مُنہ سے بولو، سر سے کھیلو۔ نذر، بھینٹ جو درکار ہو، لے لو۔ جانِ عالم نے کہا: اُمرائیت کو کام نہ فرماؤ، نیچے آؤ۔ یہ ہمیں معلوم ہوا تم بڑی آدمی ہو۔ سواری مانگے کی نہیں۔ خواصیں بھی تمھاری ہیں، جو ہمراہِ سواری ہیں۔ خاک نشینوں کی ہم بستری اختیار کرو، تکلّف تہ کر رکھو۔ طبیعت حاضر ہوگی تو تمھارے بیٹھنے سے، کچھ کہ اُٹھیں گے۔ آپ ہَوادار کیا، ہَوا کے گھوڑے پر سوار؛ فقیر بسترِ خاک پر سایہ دار۔ حافظ:

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا①

ملکہ نے کہا: مدّت العمر میں ایسا مسافر جریدہ، دہن دریدہ تمھارے سوا، بہ خدا، نہ دیکھا نہ سُنا۔ اُستاد:

زباں سنبھالو، یہ مُنہ زوریاں غریبوں پر②
خُدا کی سَوں کوئی تم سا بھی بدلگام نہیں

زور چیز ہو، کتنے بے تمیز ہو۔ یکہ و تنہا، نہ ٹٹو نہ گھوڑا؛ پیادہ پائی میں لحاظ پاس پاس نہیں، سب کو چھوڑا۔ گٹھری نہ بقچہ، ننگا لُچّا۔ وہی مَثَل ہے: رہنے جھونپڑے میں، خواب دیکھے محلوں کا۔ ہر بات میں ٹھنڈی گرمیاں کرتے ہو۔ جو یہی خوشی ہے تو لو، یہ کہہ کے ہَوادار سے اُتر، زمین میں شہزادے کے برابر بیٹھ گئی۔

خواصوں نے بہت بھیانک ہو کے کہا: لو بی بی، یہ مُوا کیا سحر بیان، جادو کا انسان ہے! ملکہ سی پری کو، گالیاں دے دے کے، کیسا شیشے میں اُتار لیا! بیٹھے بٹھائے میدان مار لیا۔ ایک بولی: تجھے اپنے دیدوں کی قسم، سچ بولیو؛ ایسا جوان رنگیلا، سجدار، بُکیلا، ٹھٹھول،

طرّار، آفت کا پرکالہ، دُنیا سے نرالا! تو نے یا کبھی تیری ملکہ نے دیکھا بھالا تھا؟ اری دیوانی، نادان! خوب صورتی عجب چیز ہے۔ اِس کا دوست طالب، دشمن کا مطلوب ہے۔ حُسنِ خوب سب کو مرغوب ہے، جہان کو عزیز ہے۔ غرض کہ جب ملکہ بیٹھی، جانِ عالم دَم سرد بھر کے بول اُٹھا، لااَعلَمْ:

چہ گویم از سر و سامانِ خود، عُمریست چوں کاکُل①
سیہ بختم، پریشاں روزگارم، خانہ بر دوشم

مؤلّف: سراسر دل دُکھاتا ہے، کوئی ذکر اور ہی چھیڑو
پتا خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو آشیانے کا

گرفتارِ رنج و اَلَم، خوشی سے دور، مُبتلائے غم، بے یار و مددگار، دوست نہ غم خوار، آفت کا مارا، خانماں آوارہ، ہمہ تن یاس، باختہ حواس۔ توشۂ راہ بجز غمِ جاں کاہ نہیں۔ اور رہ بَر سوائے دلِ مُضطر ہمراہ نہیں۔ گو پاؤں میں طاقتِ رفتار نہیں، لیکن اِیڑیاں رگڑنا بھی اِس راہ میں ننگ و عار نہیں۔ یہ حال ہے، وہ سب نام ہیں، کوہ و دَشت اپنے مسکن، مقام ہیں۔ آدمی مجھ سے رَم کرتے ہیں، جانور رام ہیں۔ اور حال یہ ہے، میر سوزؔ:

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں
پر، یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں، کہاں ہوں②
اے ساکنانِ دُنیا! آرام دوگے اک شب
بچھڑا ہوں دوستوں سے، گُم کردہ کارواں ہوں

ہاں اہلِ بزم! آؤں میں بھی، پر ایک سُن لو
تنہا نہیں ہوں بھائی، با نالہ و فغاں ہوں
سوراخ، چاک لاکھوں، داغوں کی کون گنتی
گلشن دل و جگر ہے، گو صورتِ خزاں ہوں
نام و نشاں نے یارب، رسوا کیا ہے مجھ کو
جی چاہتا ہے، حق ہو، بے نام و بے نشاں ہوں
سر مانگتا ہے قاتل، قاصد! شتاب لے جا
اتنی سبک سری پر کاہے کو سرگراں ہوں
قاتل پکارتا ہے، ہاں کون کُشتنی ہے!
کیوں سوز چُپ ہے بیٹھا، کچھ بول اُٹھنا ہاں ہوں

یہ پڑھ کے چُپ ہو رہا۔ ملکہ سمجھی: یہ مقرّر شاہ زادۂ عالی تبار ہے، مگر کسی کا عاشقِ زار ہے۔ بات میں یہ تاثیر ہے کہ ہر کلمہ، ناوک کا تیر ہے۔ دل میں آیا: کسی طرح گھر لے چلیے، پھر مفصّل حال معلوم ہو جائے گا، کہاں تک چھپائے گا۔ بہ منّت و سماجت کہا: اے عزیز! یہ سرزمین ہمارے علاقے میں ہے۔ تم مسافرانہ، اتفاقاتِ زمانہ سے وارِد ہو؛ مہمانی ہم پر واجب ہوئی۔ چند گام اور قدم رنجہ کیجیے، غریب خانہ قریب ہے۔ آج کی شب استراحت فرمائیے، نانِ خشک کھائیے۔ صبح اختیار باقی ہے، اتنی مشتاقی ہے۔

جانِ عالم نے تبسّم کر کے کہا: پھر دَرپردہ اِمارت کی لی۔ یعنی، ہم تو

یہاں کے مالک ہیں، آپ بھوکے پیاسے سالِک ہیں۔ چلو، یہ فِقرہ کسی فقیر کو سُناؤ۔ محتاج کو کَرّ و فَر، جاہ و حَشَم سے دَبکاؤ۔ جادۂ اِعتِدال سے زَبان کو باہَر گام فَرسا نہ فرماؤ۔ یہاں طبیعت اپنی اپنے اِختِیار میں نہیں۔ اور رَدا رَدی سے فُرصت قَلیل ہے۔ مکان پر جانا، دعوت کھانا جَبر ہے؛ آنے جانے کی کون سی سَبیل ہے۔ ملکہ نے اَفسُردَہ خاطِری سے کہا: دعوت کا رَد کرنا مَنع ہے؛ آیندہ آپ مُختار ہیں، ہم مجبور و ناچار ہیں۔ جانِ عالم نے دل میں خَیال کیا: برسوں کے بعد ہَم جِنسوں کی صُحبت مُیَسَّر آئی ہے اور یہ بھی شاہ زادی ہے؛ اِس کا آزُردَہ کرنا، نِری بے حیائی ہے۔ آدمیّت کا لحاظ، اِنسانیت کا پاس، اپنی بے اِعتِنائی کا حِجاب کر کے کہا: کھانے پینے، سونے بیٹھنے کی ہَوَس دل سے اُٹھ گئی ہے؛ مگر دل شِکَنی کسی کی، اپنے مذہب میں گُناہِ عظیم ہے، خُدا اِس بات کا عَلیم ہے۔ شعر:

عِوَض ہے دل شِکَنی کا بہت مُحال، اے یار①
جو شیشہ ٹوٹے، تو کیجے جواب شیشے کا

لیکن اِتنی رُکھائی اور یہ کَج اَدائی جو ظُہور میں آئی؛ مُعاف کیجیے، اِس کا یہ سبب تھا، شعر:

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

دل فِگاروں کی صُحبت سے انسان کو ملال حُصُول ہوتا ہے۔ غمگیں کا ہَم نَشیں ہمیشہ مَلول ہوتا ہے۔ میر دَردؔ:

نہ کہیں عیش تمھارا بھی مُنَغَّص ہووے
دوستو! دَردؔ کو محفل میں نہ تم یاد کرو②

اور جو یوں ہی مرضی ہے، تو بسم اللہ۔ یہ کہہ کے اُٹھا۔ ساتھ ساتھ، ہاتھ میں ہاتھ، پیادہ پا باتیں کرتا چلا۔ بس کہ شاہ زادہ لطیف و ظریف تھا؛ کوئی فقرہ نوک چوک، رمز و کنایہ، ذو معنی سے خالی زبان پر نہ لاتا تھا۔ ملکہ کا ہر بات پر دل پگھلا جاتا تھا؛ مگر دل سے کہتی تھی کہ لے ناکام دبخت نافرجام! ایسا نہ کرنا کہ ہاتھ ننگ و ناموس سے دھونا پڑے۔ بیٹھے بٹھائے آلَمِ مفارقت میں رونا، جان کھونا پڑے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی کا عاشقِ زار ہے، نشۂ محبت میں سرشار ہے۔ دوسرے، غریبُ الوطن۔ بہ قولِ میرحسن:

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت(1)
مَثَل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

مگر تپشِ دل متّصل ترقّی میں تھی۔ خواہش، جی کی کاہش میں۔ بے قراری کو اِس پر قرار تھا کہ خدا کے کارخانے میں کبھی کسی کو دخل نہیں ہوا۔ اے نادان! جو دمِ وصل ہے، اُسے غنیمت جان۔ آغازِ عشق میں انجامِ کار سوچنا سراسر خلاف ہے۔ اِس میں شرع کی تکلیف معاف ہے۔ مؤلّف:

غنیمت جان لے یہ صحبتیں آپس کی اے ناداں
دِگر گوں حال ہو جاتا ہے اک دم میں زمانے کا

اَلقصّہ نادر باغ باخاطرِ فراغ پہنچے۔ دروازہ کھلا، اندر قدم رکھا۔ جہاں فضائے صحرا وہ تھی، وہاں کے باغ کا کیا کہنا! اگر ایک تختے کی صفت تحریر کروں، ہزار تختۂ کاغذ پر بہ خطِ ریحاں اُس گلزار کی تعریف نہ لکھ سکوں۔ دمِ تسطیر

قلم میں برگ نکلتے، لکھنا بار ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بالکل پھولتے ہیں، صفحۂ قرطاس پر گُل پھولتے ہیں؛ حاسد شاخسانے نکالتا ہے، خار ہوتا ہے۔ صریرِ خامہ میں بلبل کے چہچہے پیدا ہوتے ہیں، باغبان کو حالت حال کی ہوتی ہے۔ اور سطرِ پیچاں میں طائرِ مضموں پھنستے ہیں، بعینہٖ کیفیت صیّاد کے جال کی ہوتی ہے۔ بہت آراستہ و پیراستہ۔ عرض مربّع میں۔ چاروں کونوں پر چار بنگلے، گرد سبزۂ نوخاستہ۔ دروازہ عالی شان۔ نفیس مکان۔ زیرِ دیوار خندق پر کیلے؛ اکیلے نہیں، قطار در قطار۔ تختہ بندی کی بہار۔ رَوِش کی پٹریاں قرینے کی۔ منہدی کی ٹٹیوں میں رنگت مینے کی۔ گُل منہدی سرخ، زرد پر افشاں۔ عبّاسی کے پھولوں سے قدرتِ حق نمایاں۔ نرگس دیدۂ منتظر کی شکل آنکھیں دکھاتی تھی۔ گُلِ شبّو سے بھینی بھینی بو باس آتی تھی۔ میوہ دار درخت یک لخت جدا۔ بار کے بار سے ٹہنیاں جھکیں، درخت سرکشیدہ۔ پھل لطیف و خوش گوار۔ پھول نازک و قطع دار۔ رَوِشیں بلّور کی۔ نہریں نور کی۔ حوض و نہر میں فوّارے جاری۔ چمنوں میں بادِ بہاری۔ موسم کی تاک میں، تاک کا مستوں کی رَوِش جھومنا۔ غنچۂ سربستہ کا منہ تاک تاک کے، نسیم کا چومنا۔ انگور کے خوشوں میں دلِ آبلہ دار کا پتا۔ زربفت کی تھیلیاں چڑھیں، نگہبانی کو گوشوں میں باغبانیاں اَلمست کھڑیں۔

ہر تختہ ہرا بھرا۔ رَوِش کے برابر چینی کی ناندوں میں درختِ گُل دار معنبر و معطّر۔ بیلا، چنبیلی، موتیا، موگرا، مدن بان؛ جوہی، کیتکی، کیوڑا، نسرین و نسترن کی نرالی آن بان۔ ایک سمت تختوں میں لالہ خوفِ خزاں سے بادِلِ داغ دار؛ گرد اُس

کے نافرمان کی بہار۔ سرو، شمشاد لبِ ہر جو، فاختہ اور قمری کی اُس پر کوکو، حق سرہٗ۔ شاخِ گُل پر بلبلِ شوریدہ کا شور۔ چمن میں رقصاں مور۔ کہیں خندۂ کبکِ دری، کہیں تدرو برسرِ جلوہ گری۔ نہروں میں قاز بلند آواز، تیز پرواز۔ کسی جا بط اپنے ولولے میں خود غلط۔ ایک طرف قرقرے۔ دو رویہ درخت گل و بار سے بھرے۔ سیب سے زنخِ گُل عذاروں کی کیفیت نظر آتی۔ ناشپاتی اور بہی آسیبِ دستِ باغباں سے بری۔ ہر شاخ ہری۔ سنبلِ مسلسل میں پیچ و تابِ زلفِ مہ وشاں کا ڈھنگ۔ سوسن کی اداہٹ مسی لبِ خوب رؤیوں کا جوبن دکھاتی۔ داؤدی میں صنعتِ پروردگار عیاں۔ صد برگ میں ہزار جلوے نہاں۔ آم کے درختوں میں کیریاں زمرد نگار۔ مولسری کے درخت سایہ دار۔ باغبانیاں خوب صورت سرگرمِ کار۔ خواجہ سرا امرد اُن کے مددگار۔ حور و غلمان کا عالم۔ بیلچے، کھرپیاں جواہر نگار مرصع ہاتھوں میں باہم۔ درخت اور روشوں کو دیکھتی بھالتی، گُل و بار چمن سے چنتی، گلابرگ، سڑا بار، جھڑا پڑا اخار صحنِ چمن سے نکالتی پھرتی تھیں۔

بیچ میں بارہ دری پُرشوکت و با رفعت و شان، پرستان کا لبا مکان۔ ہر کمرا سجا سجایا، صانعِ نادر دست کا بنایا۔ غلام گردش کے آگے چبوترا سنگِ مرمر کا۔ حوض مصفّٰی پانی سے چھلکتا۔ فرش یک لخت افشاں پتھر کا۔ شامیانہ تمامی کا تنا۔ سفید بادلے کی جھالر، کلابتوں کی ڈوریاں، سراسر مغرق بنا۔ چودھویں رات، ابر کھلا، آسمان

صاف، شبِ ماہ؛ سامان اِس تکلّف کا، برسات کی چاندنی، سُبحان اللہ! فوّاروں کے خزانے میں بادلا کٹا پڑا، ہزارے کا فوّارہ چڑھا۔ پانی کے ساتھ بادلے کی چمک، ہوا میں پھولوں کی مہک۔ فوّارے نے زمین کو ہمسرِ آسماں بنایا تھا؛ ستاروں کے بدلے، بادلے کے تاروں کو بچھایا تھا۔ بڑی چمک دمک سے ملکہ کے مکان پر چاندنی دیکھنے کا سامان تھا۔ شہ زادے کے آنے کا کسے گمان تھا۔

غرض کہ جانِ عالم کو لے جا، شامیانے کے تلے مسندِ جواہرنگار پر بٹھایا۔ شرابِ ارغوانی و زعفرانی کی گلابیاں کشتیوں میں لے کر، وہ وہ زنِ پری پیکر زیب دِہِ انجمن ہوئی کہ بطِ مَے رشک و خجالت سے بحرِ ندامت میں غوطہ زن ہوئی۔ ایک طرف جام و سبو، ایک سمت نغمہ سرایانِ خوب رو و خوش گلو۔ سفید سفید صوفیانی پوشاک، سر سے پاؤں تک الماس کا زیور، دو رویہ صف باندھ کر کھڑی ہوئیں۔ اِن کے بیٹھتے ہی گانا ناچ شروع ہوا۔ سارنگی کے سُر کی زوں زوں کی صدا چرخ پر زہرہ کے گوش زد ہوتی تھی۔ طبلے کی تھاپ، بائیں کی گمک خفتگانِ خاک کا صبر و قرار کھوتی تھی۔ ہر تان اُپج تانسین پر طعن کرتی۔ بازبہادر اور نَیکسا کے ہوش پَران تھے۔ چھجّو خان کو غش تھا، غلام رسول حیران تھے۔ زمزمے اور تحریر گٹکری پر شوری زور شور سے ہاتھ ملتا تھا۔ ہر پلٹے فقرے اور سُر

کے پلٹے پر الٰہی بخش پوربی کا جی نکلتا تھا۔

ناچنے کو ایسے ایسے برق وش آئے اور اِس تال و سم سے گھنگرو بجائے کہ للّوجی شرمائے۔ کتھک جو بڑے اُستاد اتھک تھے، اُنھوں نے سم کھائے۔ ٹھوکر، مُردہ دِلوں کی مسیحائی کرتی تھی۔ گَت کے ہاتھ پر یہ گَت تھی کہ مجلس کفِ افسوس ملتی تھی اور دَمِ سرد بھرتی تھی۔

جب ہنگامۂ صُحبت بہ ایں نَوبت پہنچا کہ راجا اِندر کی محفل کا جلسہ نظر سے گر گیا، بہشت کا سامان پیشِ چشم پھر گیا؛ اُس وقت ملکہ مہر نگار نے گلاس شراب سے بھر کر شہ زادے کو دیا، کہا: اِسے اُلش کر دیجیے، تا رنجِ سفر خاطرِ اَنور سے دور ہو، مجھے اِستفسارِ حال ضَرور ہے۔ جانِ عالم نے بہ اَسبابِ ظاہر انکار کیا۔ مہر نگار نے کہا: آپ دل شکنی بُری جانتے ہیں، اِس پہلو تہی کرنے میں ملالِ خاطر کے سِوا کیا مُتصوّر ہے؟ شہ زادے نے مسکرا کر ساغر ہاتھ میں لیا، یہ شعر پڑھ کر باطَبعِ شگفتہ پیا، اِنشا:

گر یار مَے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے (1)
زاہد نہیں میں، شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

پھر جانِ عالم نے جام لبالب اپنے ہاتھ سے بھر کے ملکہ کو دیا۔ دَورِ جام بے دَغدَغۂ نیرنگیِ اَیّام چل نکلا۔ دو چار ساغرِ آبِ آتش رنگ جوانی کی ترنگ میں پَیہم و مُتواتر جو پیے، دونوں کو گونہ سُرور ہوا۔ رنجِ سفر اِدھر سے، تمیز و خیالِ خیر و شَر اُدھر سے دور ہوا۔ اُس وقت

جانِ عالم نے کہا، میر دردؔ :

ساقیا ! یہاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ①

جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے

یہ سن کر، وہی خواصِ گرما گرم، جس نے شہ زادے سے پہلے گفتگو کی تھی، ملکہ کی بہت منہ لگی تھی، آنکھ ملا کر بولی، بقاؔ:

لطفِ شبِ مہ اے دل! اُس دم تجھے حاصل ہو ②

اک چاند بغل میں ہو، اک چاند مقابل ہو

ملکہ نے بہ حسرت فرمایا کہ مُردار! ہم تیری چھیڑ چھاڑ سب سمجھتے ہیں؛ کیا کریں، افسوس کی جا ہے! حال اپنا موافقِ قولِ سوداؔ ہے، رفیع سوداؔ:

جو طبیب اپنا تھا، دل اُس کا کسی پر زار ہے ③

مژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

جانِ عالم نے یہ سن کر، اُسی خواص کو سنا کے متنبّہ کیا، اُستاد:

میں مسافر ہوں، مجھ سے دل نہ لگا ④

کیا بھروسا مرا، رہا نہ رہا

ملکہ ٹال کر حال پوچھنے لگی، کہا: تم کو قسم ہے پروردگارِ عالم کی، سچ کہو، تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کس کی تلاش میں خود رفتہ، گھبرائے ہو؟ اُس وقت جانِ عالم کو بجز راستی، مفر نظر نہ آیا، کہا: ملکہ! میں شاہ فیروز بخت کا بیٹا ہوں، جانِ عالم نام ہے۔ سرزمینِ ختن وطن ہے۔ فُتحت آباد بیت السّلطنت کا مقام ہے۔ میں نے ایک توتا مول

لیا تھا؛ بہت طرّار، سحر گفتار۔ اُس کی زبان سے شُہرۂ حُسنِ انجمن آرا سُن کے؛ نادیدہ دیوانہ وار بے قرار، بیابان مرگ، آوارہ وطن، موردِ رنج و محن ہوا ہوں۔ پھر توتے کا راہ میں اُڑ جانا، وزیر زادے کا پتا نہ پانا، شمّہ بیانِ گرفتاریِ طلسم اور اپنی خواری، جادو گرنی کا نقشِ سُلیمانی دینا اور اپنا رستہ لینا کہہ کر، کہا: بے مُلکِ زرنگار پہنچے نہ جان کو چین ہے نہ دل کو قرار ہے، زیست بے کار ہے۔ اور یہ غزل پڑھی، مؤلّف:

بہ سوزِ شمع رؤیاں، اِس طرح کا سینہ سوزاں ہوں
کہ رفتہ رفتہ آخر جلوۂ سروِ چراغاں ہوں
نسیمِ صُبح ہوں، یا بوئے گُل، یا شمعِ سوزاں ہوں
میں ہوں جس رنگ میں پیارے، غرض دم بھر کا مہماں ہوں
نہ پھل پایا لگانے کا، بجز افسوس و حسرت کے
میں نخلِ بے ثمر کس مرتبہ مردودِ دہقاں ہوں
عبث تدبیر ہے گور و کفن کی اُس کے کوچے میں
میں ننگِ دو جہاں، ننگے ہی رکھ دینے کا شایاں ہوں
نہ مرتے مرتے مُنہ پھیرا محبّت سے کبھی میں نے
جفائیں کس قدر جھیلیں، وفا پر اپنی نازاں ہوں
تنی رہتی ہے اکثر چادرِ مہتاب تُربت پر
کہ تا معلوم ہو سب کو، قتیلِ مہ جبیناں ہوں

سُرورِ غم رسیدہ ہوں، مجھے طوفانِ محشر میں
ترانا تو ہی خاوندا! غریقِ بحرِ عصیاں ہوں

ملکہ نے جب سُنا کہ یہ فریفتۂ جمالِ پری تمثالِ انجمن آرا ہے، آہِ دِل دوز، نعرۂ جاں سوز کھینچ کر رونے لگی، اُمید قطع ہوئی۔ جانِ عالم نے بےقرار ہو کے کہا کہ اَیں ملکہ مہرنگار، خیر باشد! ملکہ نے اُسی بےتابی میں جواب دیا، اُستاد:

مائل اُس فتنۂ عالم پہ کیا جو مجھ کو①
سوئے بیداد مگر مرضیِ دوراں آئی
چاکِ دل تک تو کچھ اے دستِ جنوں، پردہ تھا
یہ کھلا اب تو کہ نوبت بہ گریباں آئی

اے شہ زادۂ والا تبار، غارت گرِ کشورِ دل، عاشقِ زار! میرا حال سُن، مصرع: عجیب واقعہ و طُرفہ ماجرایے ہست

باپ میرا بھی شاہنشاہ تھا، بہت سے تاج دار باج گزار تھے؛ مگر ابتدا سے طبیعت مُتوجّہِ فقر، اور عبادت کی عادت تھی۔ آخر کار، کارخانۂ دُنیا سے دِل ہیچ و پُوچ جان کے، عزمِ وارستگی ٹھان کے، بر زباں ہر آن تھا، سوز:

جب ہیچ ہی ہم بوجھ چکے وضعِ جہاں کو②
غم ہیچ، الم ہیچ، طرب ہیچ، عطا ہیچ

اور حکومت کا بکھیڑا چھوڑا۔ مُعاملۂ سلطنت بےکار جان اور بےثباتیِ جہانِ گُذراں مدِّ نظر کر، دُنیا سے ہاتھ اُٹھایا، بادشاہت کو مِٹایا، آبادی سے مُنہ موڑا، اِس صحرائے پُرخار میں مکان بنا کے بیٹھ رہا۔

ہر چند مجھے شادی کو ارشاد کیا، میں نے بہ سببِ مُفارَقت، انکار کیا۔ اب دفعتہً آفتِ آسمانی، بلائے ناگہانی مجھ پر ٹوٹ پڑی کہ بہ یک نگاہ عاشق کیا، دیوانی ہوگئی، ہوش و حواس سے بے گانی ہوگئی۔ میرؔ:

رُسوا ہوا، خراب ہوا، مبتلا ہوا①
کیا جانیے کہ دیکھتے ہی۔ مجھ کو کیا ہوا

اور تو اُس کا عاشق و طلب گار ہے، جس کا نظیر اِس زمانے میں ہاتھ آنا بہت دشوار ہے۔ میرؔ:

محمل نشیں ہیں کتنے خُدّامِ یار میں یہاں②
لیلیٰ کا ایک ناقہ، سو کس قطار میں یہاں

اب بجُز مرگ کیا چارہ! میں ننگِ خانماں، خراب کُنندۂ خانداں، فقط ذِلّت و خواری ماں باپ کی اور گریہ و زاری اپنی چاہتی تھی۔ صُبح تو کہاں، میں کہاں! یہ صُحبتِ شب خواب ہو جائے گی۔ نمودِ سحرِ مُفارَقت شامِ غُربت کا رنگ دکھائے گی۔ دامنِ سحر کی طرح گریبانِ صبر چاک ہوگا، ہمارے سر پہ آفت و خرابی آئے گی۔ انصاف کیجیے، کس سے کہوں گی: بے قراری ستاتی ہے، جانِ عالم کی جُدائی سے روح بدن سے جُدا ہوتی ہے، جان جاتی ہے۔ ہم صُحبتیں طعنے دیں گی۔ اَنیسیں چھیڑ چھیڑ کر جان لیں گی۔ جب لونڈیوں پر خفا ہوں گی، بڑبڑائیں گی، زبان پر یہ کلمہ لائیں گی: ملکہ عاشقی

کا رنج و ملال یوں درپردہ ٹالتی ہیں۔ شہ زادہ چلا گیا، نہ رک سکا؛ اُن سے تو بس نہ چلا؛ ہم جو بے بس ہیں، بس غصّے کی جھانجھ ہم پر نکالتی ہیں۔ باپ پر حال کھلا تو خجالت ہوگی۔ ماں نے گر سُنا، تو ندامت سے کیا حالت ہوگی! رُسوائی کے خوف سے دل کھول کر نہ رو سکوں گی۔ بدنامی کے ڈر سے جی نہ کھو سکوں گی۔ جب دلِ بے تاب ہجر سے گھبرائے گا، فرمائیے کون تسکین فرمائے گا؟ کیا کہہ کے سمجھائے گا؟ آپ اُدھر تشریف لے جائیں گے، ہم اِدھر غمِ فرقت سے گُھٹ گُھٹ کر مر جائیں گے۔ ہماری سَرنَوِشت پر رُونا رَوا ہے۔ ماجرا ہمارا عِبرت اور حیرت اَفزا ہے۔ ہر چند ظِلِّ سُبحانی عاملِ بے بَدَل، ساحرِ بے مِثل ہیں؛ عُلوی، سِفلی سب کچھ پڑھا لکھا؛ ہماری پیشانی اور لَوحِ جَبیں کی تحریر نہ دیکھی کہ کیا پیش آنی ہے! اور خطِّ شکستہ سے ایسے نَستَعلیق نے کیا بُرا لکھا ہے! افسوس، صد افسوس! مُؤَلِّف:

وہ بھی ہوگا کوئی، اُمید بر آئی جس کی
اپنے مطلب تو نہ اِس چرخِ کُہن سے نکلے

یہ باتیں کر، دل پر ہاتھ دھر رونے لگی۔ دامن و گریباں آنسوؤں سے بھگونے لگی۔ شہ زادے کو ثابت کیا، یقین ہوا: ملکہ بہ شدّت فَریفتہ و شَیدا ہے، بات سے حُزن و ملال پیدا ہے۔ دل دُکھنے کے مزے سے زَبان، لذّت پا چکی تھی؛ جان ہجر کے صدمے اُٹھا چکی تھی؛ بے چین ہو کر بولا، زَبان کو تسکین کی باتوں میں کھولا، کہا:

آپ کا کدھر خیال ہے، بندہ فرمان بردار بہ ہر حال ہے۔ جو کہو گی، بجا لاؤں گا۔ بارِ اطاعت سے سر نہ اُٹھاؤں گا؛ مگر برائے چندے صبر، دل پر جبر ضرور ہے۔ اگر اُس کی جستجو میں نہ جاؤں گا، تمھیں میری کیا اُمید ہوگی، ہم چشموں سے آنکھ کیوں کر ملاؤں گا۔

سُبحانَ اللہ! وہ وقت دیکھا چاہیے کہ معشوق، عاشق کی تسکین کرے۔ اپنی اطاعت اُس کے ذہن نشیں کرے۔ خوش قسمتوں کو ایسے بھی مل جاتے ہیں کہ عاشق کے رنج کا غم کھاتے ہیں، دل داری کرکے سمجھاتے ہیں۔ اِس کا لوگ رشک کرتے ہیں، آتشِ حسد سے جل مرتے ہیں۔

ملکہ یہ سُن کر دل میں شاد، بندِ فکرِ غم سے آزاد ہوئی۔ یہ بات اِمتحان کی ہے: جسے جی پیار کرتا ہے، وہ اگر جھوٹ بھی بولے، عاشق کو سچ کیا، بہ منزلۂ حدیث و آیت ہو جاتا ہے؛ مگر یہ کہا، مُصحفی:

عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبر و تحمّل ①

وہ کام تو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو

لیکن خیر، ہم تو اِسے بھی جھیل لیں، یہ کھیل بھی کھیل لیں؛ اگر ہماری یاد تمھیں فراموش نہ ہو، وحشت کا جوش نہ ہو۔ جانِ عالم نے قسمیں شدید کھائیں، اِختلاط کی باتیں درمیان میں آئیں کہ اِس میں سرِ مُو فرق نہ ہوگا۔ اور مژدۂ وصل سے مسرور کیا، خیالِ مُفارقت ملکہ کے دل سے دور کیا، کہا: اب ہنسی خوشی کی باتیں کرو، یہ بکھیڑا

جانے دو۔ جُدائی کی گھڑی یسر پر کھڑی ہے؛ رات تھوڑی، کہانی بڑی ہے۔ فَلکِ سِفلَہ پَروَر جفا کیش ہے، عاشق و معشوق کا بد اَندیش ہے۔ اُستاد :

بہ شبِ وصل شکوہ ہا مکنید①
شب کوتاہ و قصّہ بسیار است

مگر شبِ وَصل اَزَل سے کُوتاہ ہے، خدا گواہ ہے۔ دو کلِے ہنسی کے خوشی سے نہ ہونے پائے، فلک نے رونے کے سامان دکھائے۔ یکایک مُرغِ سَحَر "بیدار باش" پکارا۔ زاہد ندائے اَللہُ اَکبَر سنا کے للکارا۔ گجر کی آواز بھی دونوں کے کان میں آئی۔ یساوُلانِ سُلطانِ خاوَر نے صُبح کی دھوم مچائی۔ ملکہ پریشان ہو کر بولی، مُؤلِّف :

وَصل کی شب چونک اُٹھے ہم، سُن کے زاہد کی صدا
یاں دمِ تکبیر ہی، اللہ اکبر ہو گیا

وَلَہٗ :

زاہد بھی تیسرا ہے شبِ وصل میں حَریف
مشہور گو جہان میں صُبح و خُرُوس ہے

جانِ عالم نے نمازِ صُبح پڑھ کر، کمر بہ عَزمِ سفر چُست کی۔ ملکہ سَہم کر، آبدیدہ ہو، یہ شعر پڑھنے لگی، جُرأت :

نہ آیا اور کچھ اِس چرخ کو، آیا تو یہ آیا②
گھٹانا وصل کی شب کا، بڑھانا روزِ ہجراں کا

جب شاہ زادے نے چلنے کا قصد کیا، ملکہ نے کہا: اگر حرج متصوّر نہ ہو، میرے والد سے ملاقات کر لو۔ یہ اَمر فائدے سے خالی، لااُبالی نہ ہوگا۔ جانِ عالم نے کہا: بہتر ہے۔ پھر وہی خواص ہمراہ ہوئی۔ جب قریب پہنچا، دیکھا: مکان پاکیزہ، بُوریاے بے رِیا بچھا ہے۔ مُصلّے پر ایک مردِ مہذّب، بہ ذِکرِ حق مشغول، با دِلِ ملول بیٹھا ہے۔ یہ رسمِ سلام بجا لایا۔ اُس نے دُعاے خیر دے کر ہاتھ بڑھایا، چھاتی سے لگایا۔ قریب بٹھا کے فرمایا: ماجراے شبِ تیرۂ ملکہ، فقیر پر رُوشن ہے۔ ایسی بدقسمت دوسری، خَلق میں نہیں ہوئی۔ ہمارے کہنے سے انکار کیا؛ بڑے بُول کا سر نیچا ہوا، تو تم سے کیا کیا دار و مدار کیا۔ جو تم اِتنی تسکین نہ کرتے، اُس کا زندہ رہنا مُحال تھا، اِسی طرح کا دل پر صدمہ اور ملال تھا۔ اگر اِیفاے وعدہ کرو گے، اللہ بھلا کرے گا؛ وگرنہ یہ رنج بُرا ہے، دیکھیے اُس کا حال کیا کرے گا۔ دِل داری جگر فگاروں کی، عیادت مَرضِ محبّت کے بیماروں کی جواں مردوں پر فرض ہے۔ یہ سمجھنا: ساحل را از خس و خاشاک گُذار و گُل را از صحبتِ خار ننگ و عار نمی باشد۔

شہ زادے نے سر جُھکا عرض کی: آپ کیوں محجوب فرماتے ہیں، مجبور ہوں۔ اِس عزم میں گھر چھوڑا۔ عزیزوں، یگانوں سے ترک کر، شہر سے مُنھ موڑا۔ نہ جانے میں وہ جانیں گے: سخت کم ہمّت و بے جُرأت تھا، راہ میں آسایش ملی، بیٹھ رہا۔ خوف سے جا نہ سکا، جھوٹا تھا،

ناحق عشق کا دَم بھرا۔ پیرمرد نے فرمایا: مَرحبا! جزاکَ اللہ!
یہی شرط جواں مردی و ثابت قدمی کی ہے۔ ہمیں بھی، تمھارے اِس
عَزم سے، ایفاے وعدہ کی اُمّید ہوئی۔ پھر ایک لَوح عِنایت
کی اور کہا: جب کوئی مُہِمّ سخت رُو بہ کار ہو؛ بہ طَرزِ فال، اُس
حال میں اِسے دیکھنا۔ جو نکلے، اُس پر عَمل کرنا۔ اللہ تعالیٰ وہ
مشکلِ سخت ایک آن میں آسان کرے گا۔ تو، بہ حِفظِ حافِظِ حقیقی
سپُردَم۔ وَاللہُ مَعَکُمْ اَیْنَ مَاکُنْتُمْ۔ فَرد:

بسفر رَفتنَت مبارک باد
بسلامت رویّ و باز آیی

شہ زادہ رخصت ہوا۔ لَوح لے کے ملکہ کے پاس آیا، اُس رُوشن ضمیر
کا ارشاد سُنایا اور یہ زبان پر لایا، مُؤلِّف:

کوچ کی اپنے اب تیاری ہے
تیرا حافظ جنابِ باری ہے

ملکۂ ناکام گردِشِ اَیّام دیکھ اور یہ کلمۂ جاں کاہ سُن کر، کلیجا تھام،
سَرِ شُوریدہ کو دُھن کر یہ شعر پڑھنے لگی، اُستاد:

میں مر گئی، سُن اُس کے سَرانجام سفر کا
آغاز ہی دیکھا نہ کچھ انجام سفر کا (1)
کہتے ہیں وہ اب جاتا ہے، ایسی ہی دُعا کر
مسدُود ہو رستہ دلِ ناکام، سفر کا

مت جان نکمّا مجھے اے جان، لیے چل
کرتی چلوں گی ساتھ ترے کام سفر کا
میں کشورِ ہستی ہی سے اب کوچ کروں گی
آگے نہ مرے لیجیو تو نام سفر کا
چلنے کی صلاح اُس کے ٹھہرتی نہیں اب ساتھ
موقوف نوازشؔ ہوا آرام سفر کا

آخر جبراً قہراً رخصت کیا۔ کہا: خُدا حافظ، امام ضامنِ ثامن کے حفظ میں سونپا۔
مصرع: ترا موسیٰ رضا ضامن، ترا اللہ والی ہے ①
جس طرح پیٹھ دِکھاتے ہو، اِسی صورت اللہ تمھارا مُنہ دِکھائے، غمِ دوری ہمارا دور ہو جائے۔ جانِ عالم یہ سُن کر روانہ ہوا۔ یہاں تپشِ دل کو بہانہ ہوا۔ دریائے سرِشک چشمِ خوں پالا سے موج زن ہوا، غریقِ لُجّۂ مُفارقت جان و تن ہوا۔ جلیسیں بولیں: ملکہ! کیوں جی کھوتی ہو! کس واسطے بِلک بِلک کر روتی ہو! مسافر کے پیچھے رونا زِبُوں اَز حد ہے۔ بی بی خیر ہے! یہ شگون بد ہے۔ وہ دن بھی اللہ دِکھائے گا، جو وہ پردیسی صحیح سلامت خیر سے پھر آئے گا؛ تو اُن کو وہ غم کی ماری یہ سمجھاتی، سوزؔ:

چشم کا کام، اشک باری ہے ۔۔۔ چشمۂ فیض ہے کہ جاری ہے ②

مؤلّف:

بے درد کوئی اِتنا سمجھتا نہیں ہے ہے! ۔۔۔ دل دُکھے تو کس طرح سے فریاد نہ ہووے

وَلَہٗ :

مجھ کو رُونے کو نہ تم مَنع کرو ہَم نَفسو! غمِ دل کرتی ہوں مَیں دیدۂ تَر سے خالی

اور جب آنسو کمی کرتے، تو دل اور جگر سینے میں بَرہمی کرتے؛ اُس وقت گھبرا کر یہ کہتی، مُؤَلِّف :

مددِ اے سُوزِ جگر! تاکہ نہ ہوئے خِفَّت نُوکِ مِژگاں ہوئی پھر لَختِ جگر سے خالی

پھر نہ مُنّہ اُس نے کیا میری طرف، ہَے ظالم! سخت تم بھی مرے نالو، ہوا اثر سے خالی

نہ لگا اُس کو، مری بات کو تو مان سُرورؔ! دل کا لگنا، نہیں اے یار، ضَرر سے خالی

غَرَض کہ جوں جوں شہزادے کی مُفارَقَت بڑھتی تھی، ملکہ صدمۂ ہجر سے وُوں وُوں گھٹتی تھی۔ بَدر سا چہرہ کاہیدہ ہو کے ہِلال ہوا۔ تَپِ جُدائی سے عجب حال ہوا۔ کبھی کہتی تھی: وائے ناکامی! اگر دل کا حال کہوں، شَرم آتی ہے؛ جو چُپ رہوں، جان جاتی ہے۔ یہ سب کہتے ہوں گے: ملکہ کو غیرت نہیں آتی، راہ چلتوں سے بیٹھی ہوئی دل لگاتی ہے؛ آپ رُوتی ہے، ہمیں مفت رُلاتی ہے۔ اُس سمجھانے والے کو کہاں سے لاؤں، جسے دل کا حال سُناؤں۔ زیست اِسی میں ہے جو مرجاؤں۔ اب کون آنسو پُونچھ رُونے کو منع کرے گا! کون میرے دَمِ گرم پر آہِ سرد بھرے گا! پیار سے سر چھاتی پر دھرے گا!

جب ملکہ کا یہ حالِ بَتَر، چُپکے چُپکے جی سے باتیں کرنا دیکھ کر، لوگ گھبراتے، دستِ شَفقت سَرِ وحشت انگیز پر پھیرتے اور پوچھتے کہ اے جی کی دُشمن! ہمیں تُو بتا، دل کا حال کیا ہے؟ تو وہ

کہتی : اور تو کچھ جانتی نہیں، پر یہ نقشہ ہے : ہاتھ پاؤں سنسناتے ہیں، خود بہ خود غش چلے آتے ہیں۔ دم سینے میں بند ہے، گھبراتا ہے، مکان کاٹے کھاتا ہے۔ باغ ویران، گُل دِ بوٹا خار معلوم ہوتا ہے۔ گھر زِنداں، بات کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے۔ جان بے قرار ہے، بند بند ٹوٹتا ہے۔ دامنِ صبر دستِ اِستقلال سے چھوٹتا ہے۔ جنگل پسند ہے۔ ویرانے کا جی خواہش مند ہے۔ دشت کا سناٹا بھاتا ہے، بلبل کا نالہ دل دُکھاتا ہے۔ خدا جانے کس کی جُستجو ہے، دل کو مرغوب قُمری کی کوکو ہے۔ تنہائی خوش آتی ہے، آدمیوں کی صورت سے طبیعت نفرت کھاتی ہے۔ سینہ جلتا ہے، دل کو کوئی مسوس کر ملتا ہے۔ آنکھ ظاہر میں بند ہوئی جاتی ہے، مگر نیند مُطلق نہیں آتی ہے۔ ہاتھ چاہتے ہیں سرِ دست چاکِ گریباں دیکھیں۔ پاؤں چل نکلے ہیں کہ بیاباں دیکھیں۔ نل دمن کی مثنوی سے ربط ہے۔ لیلیٰ و مجنوں کا قصہ پڑھتی ہوں، یہ کیا خبط ہے۔ دِل کی تمنا ہے کہ بے قراری کر۔ آنکھیں اُمڈی ہیں کہ اشک باری کر۔ جہان کی بات سے کان پریشان ہوتے ہیں، مگر جانِ عالم کا ذکر دل لگا کر سُنتی ہوں۔ جو کوئی سمجھاتا ہے، رونا چلا آتا ہے، سر دُھنتی ہوں۔ ناکامی، مجھ خستہ و پریشاں کا کام ہے۔ آہ، مجھ بے سر و ساماں کا تکیہ کلام ہے۔ مُنہ کی رونق جاتی رہی، زردی چھا گئی، بہارِ حُسن پر خزاں آ گئی۔ ہر دم لب پر آہِ سرد ہے، ایک دل ہے اور ہزار طرح کا درد ہے۔ جان جانے کا

وَسواس نہیں، بزرگوں کا لحاظ و پاس نہیں۔ زیور طَوق و سَلاسِل ہے، زیب و زینت سے بَدمزگی حاصل ہے۔ دل و جگر میں گھاو ہے۔ بگاڑنا، بَناو ہے۔ بسترِ نرم خار خار ہے! ارے لوگو، یہ کیا آزار ہے! سب سے آنکھ چُراتی ہوں، ہم صُحبتوں سے شرماتی ہوں۔ اب صدمے اُٹھانے کا یارا نہیں۔ بے موت اِس بکھیڑے سے چُھٹکارا نہیں۔ عجیب حال ہے، اکثر یہ خیال ہے، مُؤلّف:

افسوس! یہ حال ایک عالم دیکھے ایسا نہ ہوا کہ جانِ عالَم دیکھے

اگر اِسی کا عشق و عاشقی نام ہے؛ تو مَیں در گُزری، میرا اسلام ہے۔ جو لوگ عشق کرتے تھے، کیوں کر جیتے تھے؟ بتاؤ تُو، کیا کھاتے تھے، کیا پیتے تھے؟ دو دن سے کچھ نہیں کھایا، مگر پیٹ بھرا ہے۔ کھڑی ہوں، جی بیٹھا جاتا ہے۔ پہلے مجھے نہ منع کیا، ہَے ہَے! میری جان کے دشمنو، یہ کیا کیا! اللہ کی مرضی، جیسا کیا ویسا بُھگتیں گے، کسی کا کیا بگڑا۔ میری قسمت کا لکھا، جو کیا، وہ اچھا کیا۔

یہ سن کے ایک کھیلی کھائی، عشق کے نیرنگ دیکھی، وصل کے ہجر میں صدمے اٹھائی، قریب آئی، کہا: قربان جاؤں، واری، ابھی سلامتی سے نَوگرفتاری ہے جو اِتنی آہ و زاری اور بے قراری ہے۔ سہتے سہتے عادت ہو جائے گی، تو تسکین آئے گی۔ اِن باتوں کے سننے سے چوٹ سی لگی۔ ملکہ کا دل جو بھر آیا، بے اختیار خونابۂ دل، لَختِ جگر چشمِ تَر سے مُتَّصِل بہانے لگی۔ دیدۂ دیدار طَلَب سے سمندر کی لَہر لہرانے لگی۔ نَظم میں دل کا

حال سُنانے لگی، مُؤلّف:

حالت ہے اِس کی پارے کی، برق و شرار کی
کیا کیا تڑپ سُناؤں دلِ بے قرار کی
پھوٹے تپش سے دل کی یہ سب آبلے مرے
مِنّت کشی نہ کرنی پڑی نوکِ خار کی
دل اپنا قبر میں بھی جلے گا اِسی طرح
حاجت رہے گی ہم کو نہ شمعِ مزار کی
وعدے کی شب کو، دیدۂ اختر جھپک گئے
دیتے مثل ہیں لوگ مرے انتظار کی
لے جائیو اُدھر سے جنازہ مرا سُرورؔ
حسرت بھری ہے دل میں مرے کوئے یار کی

رُخصت ہونا جانِ عالم کا ملکہ مہر نگار سے اور پہنچنا ملکِ زرنگار، مملکتِ دلدار کا۔ ملاقات خواجہ سرا کی، دریافت ہونا حالِ پُر ملال جادوگر کا۔ پھر اُس کو قتل کرکے لانا اُس ماہ پیکر کا۔

بیت : یہاں کا تو قصّہ یہ چھوڑا یہاں
سُنو پھر اُسی غم زدے کا بیاں[1]

طِلِسم کُشایانِ گنجینۂ سُخَن، فخرِ سامری و رہ نَوَردانِ اِقلیمِ حِکایتِ کُہَن، مَشّاقِ جادو و شُعبدہ گری؛ رَسامانِ جفاکَش و محنت کَشیدہ؛ سِحرِ سازانِ سَخُن سَنج، دَریں سَرائے سِپَنج رُوئے راحت نہ دیدہ؛ گوسالۂ سَخُن کو ذیرِ خراب آباد میں یوں گُویا کرتے ہیں کہ ملکہ مہر نِگار کے باغ سے چالیس منزل ملکِ زَرنِگار، کِشوَرِ آفتِ رُوزگار تھا۔ شہزادۂ دل اَز کَف دادہ، یَکّہ و تنہا، صُعوبَتِ سفر کا مُبتَلا، پاؤں میں چھالے، لب پر آہ و نالے، گِرتا پڑتا، کئی مہینے کے بعد اُس زمینِ خُجستہ آئیں میں پہنچا اور جو جو پتے تُوتے نے بتائے تھے، وہ سب اُس جَوار میں پائے۔ واقعی عجب نَواحِ شِگُفتہ و شاداب، ہر سِمت چشمہ ہائے آب۔ جنگل سب سبزہ زار، گُل بوٹے خود رُو کی انوکھی بہار۔ ہَوا فرحت انگیز، بُو باس مُشک بیز، جُنوں خیز۔ جانِ عالم خوش و خُرَّم جلد جلد قدم اُٹھاتا چلا جاتا تھا۔

ایک روز دو چار گھڑی دن رہے، کیا دیکھتا ہے کہ ایک شَے مِثلِ آفتاب، بہ صَد آب و تاب شِمال کی سِمت یہ دَرخشاں ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی، عقل حیراں ہے۔ دل سے کہا: آثارِ حَشر نمُود ہوئے۔ یہ کیا قیامت ہے، ہم مُشاہدۂ جمالِ جاناں سے محروم رہے۔ مشرق و مغرب کو چھوڑ، سورج شِمال کی طرف جا نکلا۔

افسوس، صد افسوس! اب تک نہ دل کا مدّعا نکلا جب قریب پہنچا، دیکھا تو دروازہ ہے عالی شان، سر بہ اوجِ فلک کشیدہ، دیدۂ روزگار نہ دیدہ۔ بس کہ مُطلّا ہے اور لعل و یاقوت اِس کثرت سے جڑے ہیں کہ جوہریِ وہم و گمان حیران کھڑے ہیں۔ شُعاعِ آفتاب سے یک رنگیِ خورشید حاصل ہے۔ شرمندہ اُس کے رُو بہ رُو بدرِ کامل ہے۔ یقین ہوا، اب بر سرِ مطلب پہنچا۔ یہ وہی دروازہ ہے بابِ اُمّید، جس کا ذِکر وہ سُرخ رُو، زمرّد لباس کرتا تھا۔ سجدۂ شکر بہ درگاہِ منزل رسانِ راہ گُم کردگاں کیا اور خوش ہوکر دوڑا۔ فرد:

وعدۂ وصل چون شود نزدیک　　آتشِ شوق تیز تر گردد

غرض اُفتان و خیزاں درِ شہر پناہ پر آیا۔ دروازۂ جواہر نگار رفعتِ فلک دکھاتا، دیوار و در جگمگاتا، بلّور کی اینٹیں، یاقوت کی تحریر، ہر خشت مُصفّیٰ و مُطلّا، درِ بہشت کی طرح وا۔ حصنِ حصین بہ صد فر و تمکیں بنا۔ جا بہ جا بُرج۔ برنجی و آہنیں ڈھلی ہوئی توپیں چڑھیں۔ گولنداز جوان جوان، بنفشئی بادلے کے دگلے پہنے، گلنار اک پیچے سجے، چُست و چالاک۔ توپوں کے بائیں دہنے ٹہل رہے۔ زمین و آسمان اُن کی ہیبت سے دہل رہے۔ گلی کوچے صاف، خس نہ خاشاک، کثافت سے پاک۔ دروازے پر پانچ ہزار سوار، لاکھ پیادے؛ کچھ جا بہ جا چوکی پہرے پر، کچھ جنگ کے آمادے۔ چھاؤنی کے طور پر تنبیں بنیں۔ پیدل

بگڑے دِل جو تھے، اُن کی چھولداریاں تنیں۔

جانِ عالم نے اُن سے پوچھا: اِس شہر کا کیا نام ہے اور حاکم یہاں کا کون ذی اِحترام ہے؟ اُنھوں نے دیکھا: ایک جوان سَرو قامَت، قَمر طَلعَت، خسوفِ سفر، خاکِ رَہ گُذر میں نہاں ہے؛ مگر دَبدَبۂ شَوکت وصَولَت، نشانِ جُرأت چہرۂ انور سے عَیاں ہے۔ وہ خود کہنے لگے: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ شہ زادے نے کہا: بھائی! سوال دیگر، جواب دیگر۔ آخر ایک شخص نے کہا: قبلہ! اِس ملک کو زَرنگار کہتے ہیں، بڑی چمک دمک کے لوگ اِس میں رہتے ہیں۔ سُنتے ہی، چہرہ بَشاشَت سے کُندَن کی طَرح دَمکنے لگا۔ جُوریت کا ذرّہ تھا، اَفشاں کی صورت مُنہ پر چمکنے لگا۔ دل سے کہا: یہ خواب ہے یا بیداری! طالِعِ گَردِش دِہ سے اُمّیدِ یاری و مددگاری نہ تھی۔ ایسی قسمت رَہ بَر ہماری نہ تھی۔ پھر کچھ نہ پوچھا، یہ کہتا چلا،

مُؤَلِّف: لِلّٰہِ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری
طے ہوئی آج کی منزل میں مَسافت میری

دروازے سے آگے بڑھا۔ شہر دیکھا قَطع دار، ہموار، قرینے سے بازار۔ کُرسی ہر دُکان کی کمر برابر۔ مکان ایک سے ایک بہتر و برتر۔ بیچ میں نہر، جا بہ جا فَوّارے۔ سب عمارات شہر پناہ کے میل کی، جواہِر نگار، سانچے کی ڈھلی۔ ہاتھ کا کام معلوم نہ ہوتا تھا، کام اُس کا معمارِ عقل کے ہوش کھوتا تھا۔ نہ کہیں بلندی نہ پستی، ہموار بسی ہوئی بستی۔ ایک کا جواب دوسری طرف۔ اِدھر

بزّاز، تو اُدھر بھی۔ صرّاف کے مُقابِل صرّاف۔ بازار کا صحن نفیس، شفّاف۔ جوہری کے رُو بہ رُو جوہری۔ زر و جواہر کا ہر سمت ڈھیر۔ نقد و جنس سے ہر شخص سیر۔ کوئی شَے، کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اُس بازار میں نہ تھا۔ مغرب و مشرق کی اَشیاے نادِرہ کا ہر جا اَنبار تھا۔ جنوب و شمال کا خریدار تھا۔ حلوائی، نان بائی، کُنجڑے، قصائی۔ سقّوں کے کٹوروں کی جھنکار۔ میوہ فروشوں کی پُکار۔ دلّالوں کی بول چال۔ جہان کا اسباب و مال۔ نہر کی کیفیت جُدا، قدِ آدم آبِ مُصفّیٰ۔ فوّاروں سے کیوڑا، گُلاب اُچھلتا؛ بازار مہک رہا، مسافر ہر ایک بہک رہا۔ ہر طرف دھوم دھام، خلقت کا اِزدِحام۔ چلنے پھرنے والوں کے کپڑے، لتّے ہوئے جاتے تھے۔ وَہم و گُمان کشمکش سے بار پاتے تھے۔

جانِ عالم قدرتِ حق دیکھتا جاتا تھا، ہوش برجا نہ آتا تھا۔ دل سے کہتا تھا: اِنَّ اللہَ عَلیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیر۔ کیا مُلک، کیا سلطنت، کیا شہر و بازار ہے! کیا بیوپاری ہیں، کیسا کیسا خریدار ہے! ہر شخص کو آرام و راحت ہے، کیا بند و بست با اِنتظام ہے، کیا حکومت ہے! جب چوک میں آیا، پوچھا: اَیوانِ جہاں پناہ، دولت سرائے شاہ کی کدھر راہ ہے؟ لوگوں نے کہا: دستِ راست سیدھے چلے جائیے۔ پیاس لگی ہو تو شربت حاضر ہے۔ بھوک ہو تو جس شَے پر رغبت ہو، کھائیے۔ مدِّ نظر مسافر نوازی ہے، جو چیز ہے گرما گرم، تازی ہے۔ اَلغرض بازار طے کر قریبِ عماراتِ بادشاہی جب آیا، اُن مکانوں کو نِرا طلسم پایا۔ عقل کام نہ کرتی تھی۔ ہر کنگرہ ایوانِ فلک سے

اونچا۔ بُرج ہر ایک جہاں نُما، خورشید سا چمکتا۔ لیکن جو لوگ درباری یا مُلازمِ سرکاری آتے جاتے دیکھے، سب سیاہ پوش، خُمِ خانۂ اَلَم کے جُرعہ نوش۔ اِس کا ماتھا ٹھنکا، پاؤں ہر ایک کئی مَن کا ہوگیا۔ ہر شخص کا مُنہ تکتا تھا، قدم اُٹھ نہ سکتا تھا، گویا سکتہ تھا۔ کہتا: خُدا خیر کرے، اِشگونِ بد ہے، دل کو بے قراری اَز حد ہے۔ چند قدم اور بڑھا۔ سواری کا سامان سامنے آیا۔ "بچو، بڑھائیو" کا شور بلند پایا۔ دیکھا: ایک خواجہ سرا پُرانا، زیرک و دانا، محبوب علی خاں نام، نوّاب ناظِرِ سراپردۂ شاہی بااِحترام؛ وہ بھی باخاطرِ حزیں، غمگیں، سیہ پوش، حواس باختہ، ہوش فراموش، اَندوہ یاد، رنج سے ہم آغوش۔

جانِ عالم نے سلام کیا۔ وہ جواب دے کر شہ زادے کو دیکھنے لگا، حیران و ششدر، متحیّر سا؛ اور سواری رُوکی، کہا: سُبحان اللہ وَبِحَمدِہٖ! کیا تیری قُدرت کی شان ہے! جنسِ بشر میں کس کس طرح کا پری پیکر خلق کیا ہے کہ چشم کو تابِ جمال، زبان کو صفت کی مجال نہیں۔ نہایت مُتوجّہ ہو کر پوچھا کہ اے شمشادِ نو رُستۂ چمنِ جہاں بانی و سروِ نوخیزِ بوستانِ سلطنت و حُکم رانی! حضور کہاں سے رونق بخش اِس شہرِ نحوست اثر کے ہوئے؟

شہ زادے نے کہا: میاں صاحب، خیر ہے! ہم فقط اِس شہر اور یہاں کے شہر یار کے شوقِ دید میں وطن سے بعید ہو، خستہ و خراب، بادلِ مُضطر و جانِ بے تاب یہاں پہنچے ہیں۔ برائے خدا، یہاں کی نحوست، اپنی سیہ پوشی کی علّت بیان کیجیے۔ خواجہ سرا نے

یہ سُن کر نعرہ مارا، بے چین ہو کر پکارا کہ اے جوانِ رعنا! تو نے یہ قصّہ سُنا ہوگا: زینتِ تختِ سلطنت، رونقِ شہر، موجدِ آبادی، صاحبِ جاہ و حشمت، مالکِ عفّت و عصمت انجمن آرا یہاں کی شہ زادی تھی۔ شُہرۂ جمالِ بے مثال اُس حور طلعت، پری خصال کا از شرق تا غرب اور جنوب سے شمال تک زبان زدِ خلقِ خدا تھا۔ اور ایک جہان حُسن کا بیان سُن کر، نادیدہ اُس کا مُبتلا تھا۔ آج تک چشم و گوشِ چرخِ کج رفتار نے، بہ ایں گردشِ لیل و نہار، ایسی صورت دیکھی نہ سُنی تھی۔ مُرقّعِ دہر سے وہ تصویر چُنی تھی۔ بہت سے شاہ اور شہریار، اُس کے وادیِ طلب میں قدم رکھ کر تھوڑے عرصے میں آوارۂ دشتِ اِدبار، پتھروں سر مار مار، مصرع: رہ رَوِ اقلیمِ عدم ہو گئے۔

اب پانچ چار روز سے ہمارے طالعِ بیدار جاگتے جاگتے دفعۃً سو گئے۔ ایک ساحرِ مکّار، جفا کار، بہ زورِ سحر اُسے محل سے اُٹھا لے گیا۔ داغِ غمِ فرقت دے گیا۔ ہنوز یہ جملۂ غم ناتمام تھا کہ جانِ عالم کا کام تمام ہوا۔ آہِ سرد کھینچ کر بہ حالِ خستہ و پریشان، بمثالِ قالبِ بے جان زمین پر گر کے بہ حسرت و یاس پکارا، شعر:

جی کی جی ہی میں رہی، بات نہ ہونے پائی (۱)
حیف ہے، اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اے گردُونِ جفا پرداز و اے فلکِ عربدہ جو! یہ کیا تیری خو ہے! اِتنی دور لا کر ناکام رکھا۔ مؤلّف:

عشرت کدے جہاں میں ہوئے سیکڑوں، وَلے
اک دل ہمارا تھا کہ وہ ماتم سَرا رہا
تاثیرِ آہ دیکھی ، نہ گریے میں کچھ اثر
ناحق میں اِس اُمید پہ کرتا بُکا رہا
کیا دیکھتا ہے سینے کو میرے تو اے سُرُورؔ
جُز یادِ یار ، اِس میں نہیں دوسرا رہا

شعر: یہ کہہ کر وہ اِس طرح غش کر گیا   کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا①

خواجہ سَرا سخت گھبرایا ، سمجھا : یہ شخص بھی گرفتارِ محبت ، اَسیرِ دامِ اُلفت اُسی کا ہے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ، دَفعتہً خبرِ بد سُنانی نہ تھی ، آفت اِس کی جان پر جان کر لانی نہ تھی۔ ہرچند گُلاب ، کیوڑا چھڑکا ؛ ہوش نہ آیا۔ بدحواس ، بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا ، رو کر عرض کی : آج ماتمِ انجمن آرا تازہ ہوا۔ بادشاہ نے فرمایا : کیا ماجرا ہے؟ اُس نے عرض کی : کسی ملک کا شہ زادہ اُس کی محبت میں سلطنت سے ہاتھ اُٹھا ، فقیرانہ سج بنا ، یہاں تک پہنچا ہے۔ مجھ سے جادوگر کے اُٹھالے جانے کی خبر سُن کر ، آہ کھینچ زمین پر گرا ہے۔ اب تک ہوش نہیں آیا تھا۔ عجب صدمہ دل پر دھر گیا ہے! خدا جانے جیتا ہے یا مر گیا ہے! خلق کا انبوہ اُس کے سر پر ہے ، بازار لوگوں کی کثرت سے بھر گیا ہے۔ کیا عرض کروں! غلام کی نظر سے اِس سج دھج کا پری پیکر آج تک از قسمِ بشر نہیں گزرا۔ اگر ان دونوں کی صورت آئینۂ چشم میں بہم نظر آتی ، قِرانُ السّعدَین

کی کیفیت کھل جاتی۔ جو حضور ملاحظہ فرمائیں گے، شہ زادی کو بھول جائیں گے۔

بس کہ بادشاہ غمِ مفارقتِ انجمن آرا سے بے قرار تھا، ارکانِ سلطنت سے کہا: جلد جاؤ، جس طرح ہو اُسے لاؤ۔ لوگ دوڑے، مُردے کی صورت اُٹھا لائے۔ اِس عرصے میں شام ہوئی۔ بادشاہ نے ہاتھ منہ دُھلوا، بید مشک چھڑکا، کیوڑا منہ میں چُوایا، لخلخہ سُنگھایا۔ جانِ عالم کو ہوش آیا، گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ دیکھا: ایک شخص تاجِ خسروانہ بر سر، چار قبِ ملوکانہ در بر، سن رسیدہ، لیل و نہار دیدہ، بڑے کرّ و فر سے تخت پر جلوہ گر ہے۔ اور چار ہزار غلام زرّیں کمر باشمشیر و خنجر، اونچی بنا، دست بستہ رُو بہ رُو کھڑا ہے۔ گِرد امیر، وزیر، سپہ سالار، پہلوان، گُردانِ گردن کش، ایک سے ایک بہتر جوان اپنے اپنے قرینے سے زیب دہِ کرسی و دنگل ہے۔ تہمتنوں کا جنگل ہے۔ جانِ عالم اُٹھا، بہ طورِ شاہ و شہریار و شہ زادہ ہائے عالی تبار رسمِ سلام بجا لایا۔ سب تعظیم کو اُٹھے۔ بادشاہ نے گلے لگا پاس بٹھایا۔ جب سے بادشاہ کی نظر پڑی تھی، محوِ حُسنِ دل فریب، مفتونِ چہرۂ مہر وش و صورتِ پُر زیب ہو گیا تھا۔ اور حضارِ مجلس بھی سب دنگ تھے، سکتے کے ڈھنگ تھے۔ سب کو صدمۂ تازہ یہ ہوا کہ ایسا وارثِ تاج و تخت ہاتھ آئے اور محروم پھر جائے۔ اُس وقت کا رنج و قلق شہ زادے کا کوئی فراق کشیدہ سمجھے، بہ قولِ مرزا حسین بیگ صاحب، شعر: ①

حسرت پر اُس مسافرِ بے کس کی رُویئے ۔۔۔ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

مگر باعثِ شرم وحیا کہ لازمۂ شرفا و نُجبا ہے، خاموش، سینے میں غم کا جوش وخروش۔ بادشاہ نے اِستِفسارِ وطن اور نامِ جدّو آبا کیا۔ یہاں فرطِ اَلَم، کثرتِ غم سے گلا گھُٹ رہا تھا؛ مگر ضبط کو کام کرکے، حَسب ونَسب اور مُلک کا پتا بتایا۔ پھر سر جُھکا شہزادی کا حال پوچھا۔ بادشاہ نے فرمایا: اے گرامی اخترِ سِپہرِ شہریاری! مدّت سے ایک جادوگر اِس فکر میں تھا۔ یہاں بہ مرتبہ نگہبانی ہوتی تھی، لیکن وہ دُھوکا دے کر لے گیا۔ آج تک محل میں نہیں گیا ہوں۔ وہ محل، جو عِشرت کدۂ خاص تھا، ماتم سرائے عام ہے۔ ہر سُو شُورِ رِقّت، ہر سِمت نالۂ پُر آفت بلند ہے۔ کھانا پانی حرام، چھوٹا بڑا مُبتلائے آلام ہے۔ جانِ عالم نے کہا: کچھ یہ بھی ثابت ہوا کہ کدھر لے گیا۔ بادشاہ نے فرمایا: پانچ کُوس تک پتا ملتا ہے۔ آگے قلعہ ہے سَر بہ فلک کَشیدہ، آگ سب بھری ہے، شُعلہ سَرگرم تا چرخِ چنبری ہے اور انگاروں کا اَنبار تا کُرۂ نار ہے۔ وہاں کا حال نہیں کُھلتا ہے، عقل بے کار ہے؛ مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سحر کا کارخانہ ہے۔ آگ کا بہانہ ہے، ہمیں سُلگا کے جلانا ہے۔ شہزادے نے کہا: خیر، اگر حیاتِ مُستعار باقی ہے، بہ مددِ ایزد کہاں جانے پاتا ہے؛ اُس ملعون کو جہنّم واصل کرکے، شہزادی کو فدوی زندہ لاتا ہے۔

یہ کہہ کر اُٹھا کہ قبلہ، خُدا حافظ! بادشاہ لپٹ گیا، کہا: بابا! خدا کے واسطے اِس خیالِ مُحال سے در گُزر۔ طائرِ خیال کے اُس دشت میں پَر جلتے ہیں۔ پیکِ صبا کے پاؤں میں چھالے نکلتے ہیں۔

دوسرے، مجھے مفارقت تیری کب گوارا ہے۔ ایک کو دھوکے میں کھویا، تجھے دیدہ و دانستہ جانے دینے کا کہاں یارا ہے۔ ایسی آفت میں تجھ سے جوان کو جانے دوں! بڑھاپے میں بد نامی لوں! سلطنت حاضر ہے، بسم اللہ حکم رانی کر۔ میں ضعیف ہوں، گوشے میں بیٹھ اللہ اللہ کروں۔ شہ زادے نے عرض کی: یہ تخت و سلطنت حضور کو مبارک رہے۔ بندہ آوارہ خانماں، ننگِ خاندان، گھر کی حکومت و ثروت چھوڑ، عزیزوں سے منہ موڑ، خراب و خستہ، سر گرداں، دربدر حیران و پریشان ہو یہاں تک پہنچا؛ اب یہ کلمہ ہتک اور ذلت کا سننے کو جیتا رہوں، ملک بیگانے میں بادشاہت کروں۔ لوگ کہیں: جادوگر تو شہ زادی کو لے گیا؛ یہ شخص بے غیرت تھا، جیتا رہا، سلطنت کرنے لگا۔ جواں مردی سے بعید ہے۔ عاشق کو معشوق کی راہ میں جان دینا عید ہے۔ لا اَعلَم:

تا سر ندہم، پا نکشم از سرِ کویش
نا مردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

پگ آگے، پت رہے اور پگ پاچھے، پت جائے۔ قدمِ عشق پیشتر بہتر۔ جس مددگار نے ہزار بلا سے بچا کے یہاں تک زندہ و سالم پہنچایا ہے، وہی وہاں سے بھی مظفر و منصور آپ سے ملائے گا۔ نہیں تو یہ صورتِ نحس لوگوں کو دکھانی کیا ضرور ہے۔ گو بشر مجبور ہے، لیکن اس زیست سے آدمی مرنا گوارا کرے، بے موت مرے۔ پہلے جب عقل و عشق سے معرکہ اٹکا تھا، میرا دل کھٹکا تھا۔ عقل کہتی تھی: ماں باپ کی مفارقت

اِختیار نہ کرو، سلطنت سی شَے نہ چھوڑو۔ عشق کہتا تھا: ماں باپ کس کے! آزاد ہو، بادشاہت کیسی! سَررِشتۂ اُلفتِ غَیر توڑو۔ کوچۂ دل دار کی گدائی، سلطنتِ ہَفتِ اِقلیم ہے، اگر مُیَسّر آئے۔ بے یار خدا کسی کی صورت نہ دِکھائے۔ عقل کہتی تھی: آبرو کا پاس کرو، ننگِ خانداں نہ ہو۔ غریب الوَطَنی سے عار کرو، صَحرا نَوَردی نہ اِختیار کرو۔ عشق کہتا تھا: یار کے ملنے میں عزّت ہے، بادِیَہ پَیمائی میں بہار ہے۔ تَشنۂ خونِ آبلۂ پا مُدّت سے صحرا کا خار ہے۔ عقل کہتی تھی: یہ لباسِ شاہی، قَبائے فرماں رَوائی چاک نہیں کرتے۔ دانِش مند جادۂ راستی سے خلاف قدم نہیں دَھرتے۔ عشق کہتا تھا: لباس، عُریانی ہے۔ عقل دیوانی ہے۔ یہ وہ جامہ ہے جسے اِحتِیاجِ شُست وشُو نہیں۔ کیسی ہاتھا پائی ہو، چاک نہ ہو، کسی آلائِش سے ناپاک نہ ہو؛ اَصلاً کارِ سُوزَن و رَفو نہیں۔ نہ بار برداری اِس کو چاہیے، نہ چور کا ڈر، نہ راہ زَن سے خَطر ہے۔ پانی سے بھیگے نہ آگ سے جلے، سڑے نہ گلے، گلے سے کبھی جدا نہ ہو۔ نہ بند بندھے، نہ وا ہو۔ نہ کوئی اِس کو لے سکے، نہ خود کسی کو دے سکے۔ نہ دستِ وحشت میں اِس کا تار آئے، نہ اِس کے دامن تک سَرِ خار آئے۔ نہ اِس کا جسمِ لاغر پر بوجھ ہو، نہ کسی کے بدن پر بار ہے۔ مسافرِ صَحرائے مَحبّت کو یہی درکار ہے۔ آتش:

تن کی عُریانی سے بہتر نہیں دُنیا میں لباس ①
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

آخر کار بہ صَد تکرار عقل کو شِکستِ فاش ہوئی، کوچۂ دِلبر کی تلاش

ہوئی۔ نام سے نفرت، ننگ سے تنگ ہوا، نشانِ ہوش و حواس مٹایا۔ سلسلۂ دیوانگی ہاتھ آیا۔ طبیعت عشق کی محکوم ہوئی۔ وحشت کی ترقی میں سر اور پتھر کا مقابلہ ہوا، لڑکوں کی دھوم ہوئی۔ دامانِ غیرت، گریبانِ حیا چاک ہوا۔ ننگ و ناموس کا قصّہ بکھیڑا پاک ہوا۔ ایک پرندہ، کہ توتا تھا، رہ بَرو مددگار رہا۔ دوسرا دَرِندہ، وہ وزیر زادہ تھا، تنہائی میں غم گُسار رہا۔ پھر تو سلطنت اور وطن چھوڑ، عزیز اور یگانوں سے رشتۂ محبت توڑ، رہ نَوَردِ بادیۂ حرمان اور گام فَرسائے دشتِ اِدبار ہوا، لیکن اُن کا ساتھ بھی نہ سزاوار ہوا، فلک درپئے آزار ہوا۔ پہلی بسم اللہ یہ غلط ہوئی کہ منزلِ اوّل میں توتا اُڑ گیا۔ وزیر زادہ ہرن کے ملنے سے چھُٹ گیا۔ وہ جو اَثاث ظاہر کی دل لگی کا تھا، لُٹ گیا۔ تنہائی ہمراہ ہوئی۔ ہمدمِ دمِ گرم سرد آہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد طِلسم میں پھنسایا۔ ہمیں رُلا کے دشمنوں کو ہنسایا۔ تھوڑی سی آفت اُٹھا کے رہائی پائی۔ سمتِ مطلوب کی راہ ہاتھ آئی، مگر نہ سنگِ نشان دیکھا، نہ میل نظر آیا۔ نہ گردِ کارواں دیکھی، نہ صدائے زنگ و جرس سُنی۔ نہ راہ بَر ملا، نہ کفیل نظر آیا۔ سواری چھُٹی، پیادہ پائی ملی، فکرِ غیر سے رہائی ملی۔

جب اِس منزل میں حضرتِ عشق نے آزمایا، باوجودِ آبلہ پائی اور خَلِشِ خارِ صحرا ثابت قدم پایا، دوسرے مرحلے میں امتحان مدِّ نظر ہوا، پریوں کے اکھاڑے میں گزر ہوا۔ ایک مہ سیما کو اِس جانب میلان ہوا، پھر وہی عیش و نَشاط کا سامان ہوا۔ بہت سے نیرنگ دِکھائے، ہر شب عجب دن آگے آئے۔ لِلّٰہِ الحمد کہ شیشۂ عصمت

سنگِ ہوا و ہوس سے سالم رہا۔ وحشتِ دل کا یہ دستور عالم رہا۔ رخصت میں مصلحت جانی، جوان و پیر کی بات نہ مانی۔ اب گھر پہنچ کر دھوکا کھانا، جان بوجھ کر بھول جانا کس ملت میں روا ہے؟ یہ نرا وسوسہ ہے۔ مجھ سے وحشیِ بےخود سے ایسی ہوشیاری دور ہے۔ جیتے جی مرگ منظور ہے۔

اِس گفتگو کی خبر محل میں پہنچی کہ آج اِس طرح کا مہ جبیں، حسیں، انجمن آرا کا عاشق وارد ہوا تھا؛ وہ بھی حرارتِ محبت سے اُسی آگ میں جلنے جاتا ہے۔ جو دیکھتا ہے، آنسو بہاتا ہے۔ انجمن آرا کی ماں درِ دولت سرا پر چلی آئی۔ خواجہ سرا دوڑے، بادشاہ سے عرض کی: جلد شہ زادے کو لے کر محل میں رونق فرما ہوجیے۔ بادشاہ جانِ عالم کو ہمراہ لے آرام گاہ میں تشریف لایا۔ وہ بھی ہزار جان سے نثار ہو، دیر تک پروانہ وار اُس شمعِ انجمنِ سلطنت کے گرد پھری۔ رنڈیوں نے گھیر لیا، سب کو قلق ہوا۔

غرض کہ بہ ہزار سعی بادشاہ نے بہ منت صبح کی رخصت پر اُس شب روکا۔ پہر بجے خاصہ طلب ہوا۔ شہ زادے نے انکار کیا۔ وہی نواب ناظر حاضر تھا؛ پاؤں پر گرا، گرد پھرا، سمجھایا: پیر و مرشد! کئی دن سے محل میں کھانا پانی سب کو حرام ہے؛ جو آپ کچھ بھی نوش فرمائیں گے، تو یہ سب کھائیں گے۔ ناچار باخاطرِ فگار دو چار نوالے پانی کے گھونٹ سے حلق میں اتارے۔ پھر ہاتھ منہ دھو، نیند کا بہانہ کر پلنگ پر جا لیٹا؛ مگر نیند کس کی اور سونا کیسا! مؤلف:

وا دَرِ دیدہ سدا رہتا ہے تیری یاد میں
آنکھ جب سے لگ گئی، روتے ہیں سو جانے کو ہم

پھر لیٹے لیٹے انجمن آرا کا تصوّر کر، دمِ گرم و آہِ سرد سینے سے بھر کر، یہ پڑھنے لگا، ابیات:

(1)
تجھ بن ہے خراب زندگانی
ہے مجھ کو عذاب زندگانی
اِتنا تو نہ چھپ، کہ لے کفن کا
گھبرا کے نقاب، زندگانی

جب کروٹیں بدلتے بدلتے پسلیاں دُکھ جاتیں اور بے قراریاں ستاتیں، تو دلِ بے تاب کو مستعدِ ضبط، آمادۂ جبر و صبر کر یہ کہتا، نظم:

(2)
کمالِ ضبط کو عاشق کرے اگر پیدا
کہاں کی آہ، کرے بات بھی اثر پیدا
ہزار رنگ زمانے نے بدلے، پر افسوس
کہیں ہوئی نہ شبِ ہجر کی سحر پیدا
کرے گی ہمسری نالے کی میرے تو بلبل!
شعور اِتنا تو کر جا کے جانور پیدا
ہمیشہ ہاتھوں سے اِن کے رہا ہوں میں جلتا
یہ زور گرم ہوئے تھے دل و جگر پیدا
یہ دل میں ذوقِ اسیری ہے جو قفس میں مدام
میں نوچتا ہوں، جو ہوتے ہیں بال و پر پیدا

آخرش بہ صد نالہ و آہ، کراہ کراہ صبح کی۔ بعدِ فراغِ نمازِ پُر سوز و گداز مرنے پر کمر باندھی۔ شب کو یہ خبر عام ہوئی تھی کہ کل جادوگر کی لڑائی کو، شہزادہ آمادہ ہو، جائے گا۔ دیکھیے فلک کیا تماشا دکھائے گا! پہر رات رہے سے مجمعِ عام دَرِ دیوانِ خاص پر تھا۔ یکایک روشنی آئی، بادشاہ تخت پر سوار، برابر شاہزادۂ والا تبار، برآمد ہوا۔ چشمِ مشتاقاں میں نورِ طور، نزدیک و دور تجلّی کر گیا۔ ہر شخص رُو بہ قبلہ ہو، دعائے فتح و ظفر اُس ماہ پیکر کی مانگنے لگا۔ القصّہ جہاں تک

لوگ آتے جاتے تھے، بادشاہ ساتھ آیا، آگے بڑھنے کی تاب نہ لایا۔ جانِ عالم نے قسمیں دے کر رُخصت کیا۔ ناچار، بادلِ داغ دار و خاطرِ فگار قلعے میں داخل ہوا، مگر وہاں سے ڈیوڑھی تک صدہا ہرکارۂ صبادَم مُتعیّن کیا کہ ہردم کی خبر حضور میں پہنچے۔ جانِ عالم پھر اکیلا باحسرت و یاس رہا۔ غمِ دلبر رفیقِ قدیم پاس رہا۔ یہ شعر پڑھتا آگے چلا، مُصحفیؔ:

اے غمِ یار! میں بندہ ہوں رفاقت کا تری
نہ کیا تو نے گوارا مری تنہائی کو

آگ کا قلعہ سامنے تھا۔ آسمان سے تا زمیں بجز شعلۂ جوّالہ یا بُرجِ آتشیں اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شہ زادہ غور سے دیکھنے لگا۔ ایک ہرن اُس آگ سے نکلا، اُچھل کود کر پھر اُس میں غائب ہوا۔ جب مُکرّر آمد و رفت کی، جانِ عالم نے لوحِ پیرمرد کی دیکھی۔ اُس میں معلوم ہوا: اگر یہ اِسم پڑھ کے، کچھ بڑھ کے ہرن کو تیر مارا اور خطا نہ کی، طلسم ٹوٹ جائے گا۔ وَگر نشانہ چوکا، خود آماج گاہِ خدنگِ قضا ہوا، کوئی راکھ کے سِوا پتا نہ پائے گا۔ شہ زادے نے کہا: جو ہرن مارا، تو میدان مارا، لطفِ زندگی ہے۔ نہیں، حیلۂ مرگ خوب ہے۔ بے یار جینا معیوب ہے۔ یہ سوچ، لبِ سوفار چلّے سے جوڑ، شست و مُشت برابر کر اِسم شروع کیا۔ اُدھر ہرن نکلا، اِدھر تیر کمان سے سرگوشی کر کے چلا۔ بس کہ یہ قدر انداز تھا، اُس کی قضا دامن گیر، تیر دوسار ہوا۔ فردوسیؔ:

فلک گفت احسن، مَلک گفت زِہ ①

ہرن زمین پر گرا، آسمان سے دار وگیر کا غل اُٹھا: ہاں ہاں، لیجیو، گھیریو! جانے نہ پائے! قریب تھا خوف سے جی نکل جائے۔ زمانہ تیرہ و تار، صحرا پُر غبار ہوا۔ گھڑی بھر میں وہ تاریکی دور ہوئی، آفتاب نمودار ہوا؛ نہ آگ رہی، نہ قلعہ۔ برابر سطحِ میدان، انسان نہ حیوان؛ مگر چبوترے پر لاش جھلسی ہوئی پاش پاش دیکھی۔ یعنی وہ جادوگر کریہ منظر، سیندور کا ٹیکا ماتھے پر، زرد زرد دانت ہونٹوں کے باہر، مُنہ مُہری سے گندہ، نطفۂ حرام، شیطان کا بندہ، بالوں کی لٹیں لٹکتیں، ہڈیاں، کھوپڑیاں گلے میں پڑیں، کالا بھجنگا، گانڑ سے ننگا؛ تیر سے چھد کر جہنم واصل وہ اُلّو کا پٹھا، حواصل ہوگیا ہے۔ شکر کا سجدہ بجا لایا، قدم ہمت آگے بڑھایا۔

ہرکارے یہ ماجرا دیکھ، فوراً حضور میں حاضر ہوئے۔ بعدِ دعا و ثنا عرض کی: اے شہر یارِ ذِی الاقتدار! فتح مبارک۔ شہ زادہ بلا کا پتلا ہے؛ ایک تیر میں وہ آگ کا قلعہ ٹھنڈا کر، سر گرم راہ ہوا، جادوگر کا گھر تباہ ہوا۔ بادشاہ یہ مژدۂ فرحت افزا سن کے خوش ہوا، فرمایا: یقین کامل ہے کہ جانِ عالم حسبِ دل خواہ مراجعت کرے گا، فتح و فیروزی شامل ہے، ہونہار بِروے کے چکنے چکنے پات۔ خبر داروں کو خلعت و انعام موافقِ قدر و منزلت مرحمت کر، پھر روانہ کیا۔

اِس عرصے میں شہ زادہ وہ وادیِ پُر خطر، میدانِ سراسر ضرر کو طے کر، متصلِ قلعۂ ساحر، جہاں انجمن آرا قید تھی، پہنچا۔ وہ عجیب

مُعلّق قلعہ تھا۔ زمین سے چار پانچ گز بلند بہ رُوے ہوا ایک تختہ کُمھار کے چاک کی طرح بہ ایں سُرعت گردش میں تھا کہ نگاہ کام نہ کرتی تھی۔ آنکھ کی پُتلی اِتنا جلد نہ پھرتی تھی۔ بلند ایسا کہ دیکھنے میں پگڑی گرتی تھی۔ جانِ عالم وہاں ٹھہرا، وہ قلعہ بھی حرکت سے ساکِت ہوا۔ اُس وقت مُفصّل نقشہ معلوم ہوا کہ قلعہ جواہِر نگار ہے، زیب و زینت بے شمار ہے۔ دروازے چار ہیں۔ بُرج گنے نہیں جاتے، ہزار در ہزار ہیں۔ کمندِ فکر اُس کی بلندی کے رُو بہ رُو کوتاہ ہے۔ ہر طرف سے سحر بند، مسدُود راہ ہے۔ جہاں جانِ عالم کھڑا تھا، زمرّد کا بنگلا نظر آیا، اُس میں سے آواز آئی کہ اے اَجَل رَسیدہ! کیوں مَلَکُ الموت کو چھیڑتا ہے، زندگی سے مُنہ پھیرتا ہے؟ مجھے تیرے حُسن و صورت پر رَحم آتا ہے۔ جلد یہاں سے جا۔ خطاے اوّل، عِوضِ خوبیِ شکل و شمائل مُعاف کی؛ وگرنہ بہ ایں شدائِد و خواری قتل کروں گا کہ آسمان تیرے حالِ پریشاں پر خون روئے گا۔ ساکنانِ زمیں کو گوشت پوست، ہڈیوں کا پتا نہ ملے گا، بادشاہ تیرے غم میں جان کھوئے گا۔ اِس دشت کی خاک تیرے لہو سے رنگین ہوئے گی۔ روح بھی تا حشر خوابِ مرگ میں آرام سے نہ سوئے گی۔

شہ زادے نے ہنس کر کہا: اے مادر بہ خطا! تو کیا ہماری خطا مُعاف کرے گا، کہاں تک لاف و گزاف کا دَم بھرے گا۔ اِنشاءَ اللہ تعالیٰ اور تو کیا کہوں، تجھے بھی اُسی کی پائنتی بھیجتا ہوں ۔ یہ

سُن کر وہ جھلّایا۔ بنگلے سے سر نکال، تھوڑے ماش اُس بدمعاش نے اور کالا دانہ نکالا۔ اُس وقت چرخ چکّر میں آیا اور زمین تھرّائی، جب سرسُوں میں بنولے اور رائی ملائی، پھر تیتا پیتا اور ٹوناچماری کو نمک حرام نے پکارا، اُن دانوں کو اُس احمق نے آسمان کی طرف پھینک مارا۔ دفعتہً ابرِ تیرہ و تار گھِر آیا، شہ زادے پر پتھّر اور آگ کا مینہ برسایا۔ یہ بھی اسمائے ردِّ سحر پڑھتا تھا، آگے بڑھتا تھا۔ جب آگ قریب آتی، پانی ہو کر بہ جاتی۔ اور پتھّر بھی ہر ایک خاک تھا، ایسا وہ اِسم پاک تھا۔

جادوگر خفیف ہو کر سحرِ تازہ کی فکر میں تھا۔ جانِ عالم نے لَوح کو دیکھا، اُس میں نکلا: کسی طرح لَوح کو قلعے کی دیوار سے لگادے، پھر قدرتِ خالق کا تماشا دیکھ لے۔ شہ زادے نے بہ جرأتِ تمام تر اُچک کر لَوح دیوار سے لگائی۔ اُس پر آفت آئی، مرتبۂ اوّل سے زیادہ چکّر میں آیا، پھرتے پھرتے اِس طرح کی صدا ہیبت ناک آئی کہ ہزار توپیں ایک بار چھُٹیں تو ایسی نہ ہو۔ سامری کی روح زیرِ زمین گھبرائی۔ یہ درجہ مُہیب تھی کہ گاوِ زمیں کا کلیجا ہِل گیا۔ خورشید برجِ اسد میں چھپ کر دہل گیا۔ زمانے کا رنگ دِگرگوں ہوا۔ جنگل گرد برد ہو گیا، وہ ناری سرد ہو گیا، لرزاں کوہ و ہامُون ہوا۔ میدان سیاہ، بلند صدائے نالہ و آہ ہوئی۔ چار گھڑی میں وہ تاریکی دور ہوئی، شہ زادے کی طبیعت مسرور ہوئی۔ نہ قلعہ نظر آیا، نہ مکانات کا نشان پایا، لیکن ریت کا ٹیلا،

سَر کنڈے گڑے اور کچّا سوت نیلا پیلا اُن پر لپٹا، کچھ پھندے پڑے؛ اُس میں وہ ماہِ شبِ چاردہ، حور کی صورت، نور کا عالَم؛ پریشان، بدحواس، سراسیمہ، مُتحیّر، کوئی آس نہ پاس، ہر سِمت حیران ہُو ہُو دیکھ رہی تھی۔

جانِ عالَم نے پہچانا۔ تاب نہ رہی، جی سینے میں رُعبِ محبّت سے سنسنایا۔ اکیلا دیکھ کے کلیجا مُنہ کو آیا۔ ہرچند ضبط کیا، نہ ہو سکا۔ تھرّاتا، دَم چڑھا جاتا، دوڑ کر گرد پھرنے لگا، لڑکھڑاہٹ سے گرنے لگا۔ انجمن آرا نے شرما کر، سر کو جھکا کر کہا: سنبھلو صاحب! کچھ پاس لحاظ بھی کسی کا نہیں! یوں بے باکانہ پاس چلے آنا حرکتِ مجنونانہ ہے۔ لوگ کہیں گے، دیوانہ ہے۔ مگر اِس گفتگو میں آنکھ بھی چار ہو گئی۔ سِنانِ اُلفت اِدھر تو گڑی ہی تھی، اب دو سار ہو گئی۔ شہ زادہ خنجرِ عشق کا زخمیِ قدیم تھا، وہ تازہ شمشیرِ محبّت کی گھائل ہوئی، طبیعت اُدھر مائل ہوئی، بدن تھرّایا۔ جانِ عالَم نے یہ سُنایا، میر سوز:

جس کو نہ ہو شکیب، نہ تابِ فغاں رہے ① تیری گلی میں وہ نہ رہے تو کہاں رہے
آہستہ رَو تو منزلِ مقصود کو گئے رفتار گرم تھے، سو ہمیں درمیاں رہے
بندہ نواز! حال پہ میرے کرو نگاہ ہے جائے گریہ یہ کہ پسِ کارواں رہے

یہ کہہ کر گر پڑا، غش آگیا۔ عشق کی نیرنگیاں نہاں نہیں، حاجتِ اِظہار و بیاں نہیں۔ کشش اِس کی چھوٹے بڑے پر آشکارا ہے، ہزاروں کو اِس نے فریب سے مارا ہے۔ انجمن آرا کو دلِ مُضطرِب

نے تڑپ کر سمجھایا، بے قراری میں اِس پر قرار آیا کہ یہ مُقَرَّرہ عاشقِ صادق ہمارا ہے، جو ایسی بلا سے نہ ڈرا۔ سر کو بیچ کر اِس وادی میں پاؤں دھرا۔ وگرنہ اِتنے دن گزرے، بے کسی کے سوا کوئی ہمدم، شریکِ زِندانِ غم نہ تھا۔ دل قبضۂ اِختیار سے جاتا رہا۔ حجاب ہر چند مانع آتا رہا، مگر جانِ عالم کا سر سرکا، زانو پر رکھا، چہرے کی گرد جھاڑی۔ غشی تو کبھی آنکھ سے دیکھی نہ تھی، گھبرا کر رُونے لگی، اِس طرح رُوئے یار دھونے لگی۔ اور یہاں جو بوند آنسو کی مُنہ پر پڑی اور دِماغ میں خوش بوئے کنارِ دل دار چڑھی، لخلخے کا کام کر گئی، گلاب، کیوڑا چھڑکنے کی حاجت نہ رہی، آنکھ کھول دی۔ سُبحان اللہ! سرِ خاک اُفتادہ کنارِ یار و زانوئے دِل دار پر پایا۔ ناز و نیاز نے دِماغ عرشِ اعلیٰ پر پہنچایا۔ اور پاؤں پھیلایا، یہ اِترایا۔ انجمن آرا نے جھجک کر گھٹنا سرکایا۔ جانِ عالم نے چشمِ نیم وا سے شہ زادی کا مُنہ دیکھا اور کہا: ہماری بے ہوشی ہشیاری سے اچھی تھی! مُؤلّف:

میں جو چونکا، تو وہ بھی چونک پڑا
ہوئی غفلت، جو ہوشیار ہوا

یہ کہ کے آنکھیں بند کر لیں کہ پھر ہمیں غش آیا، کیوں تم نے زانو سرکایا۔ انجمن آرا نے کہا: کیا خوب! اِتنا اِختلاط میری چڑ ہے۔ میں نے تیری محنت و مشقّت پر نظر کر کے یہ اِنسانیت کی حرکت

کی تھی؛ تم چل نکلے۔ خدا جانے دل میں کیا سمجھے۔ اپنی راہ لیجیے، چلتا دھندا کیجیے۔ واہ وا! نیکی برباد، گُنہ لازِم۔ جانِ عالم نے یہ جواب دیا، اُستاد:

خاک ہی اپنی اُٹھے تو اِس مکاں سے اُٹھ سکے

ہم جہاں جوں نقشِ پا بیٹھے، نہ واں سے اُٹھ سکے

اِلّا، چُور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ میں تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا، نہ معشوقوں کے دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا۔ انجمن آرا نے کہا: چہ خوش! بھلا دل تو بہلا لو۔ کچھ ہو یا نہ ہو، زبان کا مزہ نکالو۔ یہ تو وہی مَثَل ہوئی: مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ تمھارا بِعَینِہٖ یہ حال ہے، فَرد:

چہ خوش گفتست سعدی در زلیخا

اَلَا یَا اَیُّہَا السَّاقی اَدِر کاساً وَّ ناوِلْہا

عشق و عاشقی کی باتیں میری بَلا جانے۔ رَمز و کِنایہ کسی اَور سے جا کے کرو، اپنا چُوچُلا تَہ کر رکھو۔ اپنی صورت تو غور سے دیکھو، تم نے سُنا نہیں شاید، مَثَل: حلوا خوردن را روی باید۔ جانِ عالم نے کہا: مَیں بے چارہ خستہ تَن، غُربت زدہ، دور اَز وطن، مِحنت مِن کہاں سے لاؤں! کیوں کر ویسی صورت بناؤں! کوئی خَندہ پیشانی ہے، کوئی نصیبوں کو رُوتا ہے، کُفر اور اسلام میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تمھیں ابھی تک مُوہنِ بھوگ کا ذائقہ نہیں بھولا ہے، دَمِ تقریر زبان پر حلوا ہے۔ ہم نے آپ کے واسطے جُوگ لیا، سلطنت کو تَج دیا؛ اب مُراد

پوری ہوئی، دُور دُوری ہوئی۔

انجمن آرا پتے کی سن کر کھسیانی ہوگئی، کہا: چلو صاحب! وہ مُوا قربان کیا تھا، اپنی چونچ بند کرو، کٹی جلی کی ہنسی اپنے گھر جاکر کرو۔ سحر جادو، زور ظلم، مکر و فریب سے انسان ناچار ہے؛ اس میں کس کا اختیار ہے۔ مگر خیر، اور جو چاہیے کہ لیجیے۔ در پردہ کیا، صاف صاف گالیاں دیجیے۔ یہ باتیں قسمت کی گردش سنواتی ہے۔ دیکھوں ابھی تقدیر آگے کیا کیا دکھاتی ہے۔ اگر خدا ہمارا گھر بار چھڑا موذی کے بس میں نہ پھنساتا، تو ہر ایک راہ چلتا ہمیں کاہے کو ایسی باتیں سناتا۔

جانِ عالم یہ سن کر ڈر گیا۔ رنگ زرد ہوگیا، خجالت سے مر گیا۔ سہم کر، آبدیدہ ہو کہنے لگا: میری کیا مجال جو آپ کو کچھ کہوں! میں تو خانماں آوارہ، مسافر ہوں۔ انصاف تو کرو، تم کتنی ہٹ دھرم، احسان فراموش ہو! ہنسی میں رو دیا، ہمیں دونوں جہان سے کھو دیا۔ انجمن آرا نے دیکھا: اس کے آنسو جاری، ہچکی طاری ہے؛ مسکرا کر کہا: ایک بات مطلب کی کہی، مگر، مصرع:

سچ ہے، اوچھے کا بھی احسان بُرا ہوتا ہے

خاطر جمع رکھ، اپنے گھر چل کر تجھے مال و زر سے لاد دوں گی کہ تو چل نہ سکے گا، بوجھ سے ہل نہ سکے گا۔ شہ زادے نے کہا: آخر سلطنت کا گھمنڈ آیا! ہمیں محتاج جان کے یہ فقرہ سنایا! ہم بھی کبھی

حاجت رَوائے عالَم مشہور تھے، مگر اُلفت سے مجبور تھے۔ اگر پَر تم عاشق نہ ہوتے؛ کیوں سلطنت کھوتے، سر پر ہاتھ رکھ کر رُوتے۔

یہاں یہ نوک جھوک، چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی؛ وہاں خبرِ فتح و ظفر ہَرکاروں نے بادشاہ کو پہنچائی۔ وہ تو ہَمہ تَن گوش تھا، اُسی وقت مَع اَرکانِ سلطنت روانہ ہوا۔ ہمراہِ رَکاب یگانہ و بیگانہ ہوا۔ ایک سُکھپال ہمراہ لیا، صبا وار سنّاٹے میں آ پہنچا۔ جو جو نزدیک تھے، دور کھڑے رہے۔ کہاریاں بادشاہ کا تَخت قریب لائیں۔ انجمن آرا مُنہ چھپا کر بیٹھ گئی، جانِ عالم پاس سے سَرکا۔ بادشاہ تَخت سے اُترا، جانِ عالم کو گلے لگایا، جُرأت کی تعریف کی، ہمّت پر تحسین و آفرین کہی۔ پھر بیٹی کو چھاتی سے لگا، سُکھپال میں سوار کیا، شہ زادے کو برابر تخت پر بٹھا لیا۔ ترقّی خواہانِ دولت، مُلازِمانِ قدیم نزدیک آئے؛ زرِ سُرخ و سفید تَخت اور سُکھپال پر نثار کیا۔ اِس قدر اَشرفی، روپیہ تَصدُّق ہوا کہ آج تک جو محتاج، مسافر اُدھر جاتے ہیں؛ چاندی سُونا پاتے ہیں، نصیب جاگتے ہیں؛ ڈھیر کے ڈھیر لے بھاگتے ہیں۔

بادشاہ کے پھرتے پھرتے، جلوسِ سواری، نَوبت نِشان، فوج اور سب سامان پہنچا۔ اَہلِ شہر یہ خبر سُن کر ہزاروں دَوڑے۔ شادیانے بجاتے، مُبارک سلامت کا غُل مچاتے شہر میں داخل ہوئے۔ مُلک کی رونق گئی ہوئی پھر آئی۔ خلقت نے جانِ تازہ پائی۔ محل میں انجمن آرا رونق اَفروز ہوئی، سب کو شادیِ نَوروز ہوئی۔ محل والیوں

نے کُہرام مچایا۔ بادشاہ نے فرمایا: یہ خوشی کا وقت ہے، نہ ہنگامِ غم؛ اِسی طرح سب بچھڑے خدا کی عنایت سے باہم ہوں۔ انجمن آرا کے نانا، ماں، گرد پھرتی تھی، دم بہ دم سجدہ کرنے کو زمین پر گرتی تھی۔ کہتی تھی: اللہ نے، میرے، بدولتِ جانِ عالم دن پھیرے۔ انجمن آرا جب یہ نام سنتی، خوش کیا، کِھل جاتی؛ اِلّا، لوگوں کے سُنانے کو، تجاہُلِ عارِفانہ کرکے یہ سُناتی: صاحبو، خیر ہے! یہ کیا بار بار کہتی ہو! جو میرا مُقدّر سیدھا نہ ہوتا، تو وہ کون تھا جو دِن پھیرتا!

ہم صُحبتیں، مزاج داں، اِس رُکھائی سے تاڑ گئیں کہ آپ کی بھی آنکھ پڑی، طبیعت لڑی۔ جب اُس کی ماں سَرکی، وہ سب پاس آ آ کہنے لگیں: ہے ہے! ہم تو تیری مُفارقت میں مرتے تھے۔ زندگی کے دن، گھڑیاں گِن گِن بھرتے تھے۔ یہ صورت اللہ نے دکھائی، یا جانِ عالم کی جوتیوں کے صدقے سے نظر آئی۔ جس طرح ہمارے مطلبِ دِلی ملے، خالق اُس کے بھی جی کی مُراد دے۔ انجمن آرا غُصّے کی شکل بنا، تیوری، بھوں چڑھا کہنے لگی: تم سبھوں کی شامت آئی ہے! کیا بیہودہ بک بک مچائی ہے! چُوچلے کی خوبی، بُزرگی خُردی سب ڈوبی! واہ وا! تم نے میری چِڑ نکالی، اپنی دانست میں دیوانی بنالی! خدا جانے یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے! سبھوں نے میرا مَغز کھایا ہے۔ اُسے تو کیا کوسوں، وہ تو مسافر بےچارہ ہے؛ جی میں آتا ہے اُس کا مُنہ نوچوں جس جس نے یہ نخرا بگھارا ہے۔ اور بھئی،

مجھے چھیڑو گی تو رُو دوں گی، اپنا سر پیٹ لوں گی۔ یہ کہہ کر مسکرانے لگی، ہونٹ چبانے لگی۔ آپس میں رمز و کنایے رہے۔

تمام مُلازِمانِ بادشاہ، مع رُوَساے ترقّی خواہ نذریں لے کر حاضر ہوئے۔ شہر میں مُنادی ہوئی کہ جتنے ساکنانِ قلمرِو بادشاہ ہیں، فقیر سے ہفت ہزاری، بڑے آدمی سے بازاری تک؛ آج کاروبار موقوف کر کے ناچ دیکھیں، خوشی کریں۔ اور جسے مقدور نہ ہو، سرکار سے لو۔ تمام شہر میں عیش و نشاط، راگ رنگ کی مجلس با فرحت و انبساط ہوئی۔ بادشاہ نے جشنِ جمشیدی کیا۔ تمام شب بادۂ گُل گوں کا دَور رہا۔ ناچ گانا، صُحبتِ بے تکلّفانہ؛ یہ طَور رہا۔ دمِ صُبح شاہِ کیواں جاہ دیوانِ عام میں رونق افزا ہوا۔ درِ خزانہ و قید خانہ وا ہوا۔ اِس قدر زر و جواہر محتاج، فقیروں کو عنایت و امداد ہوا کہ کاسۂ گدائی اُن کا، جام و صُراحی سے مُبدّل ہو گیا۔ محل میں بر محل رت جگے، صحنک، جا بہ جا کونڈے، حاضری، دونے، پڑیاں منّتوں کی، جس جس نے مانی تھیں؛ کرنے، بھرنے، دینے لگیں۔ اور ڈومنیاں طرّاق پرّاق، پری وش، خوش گلو، با انداز مع سامان و ساز حاضر ہوئیں۔ مُبارک سلامت کہہ کر "شادی مبارک" گانے، پچھّے مچانے، نئی مُبارک باد سُنانے لگیں، مؤلّف:

شادی و جشنِ سزاوار مبارک ہووے

آج شہزادی کا دیدار مبارک ہووے

صدوسی سلامت رہے با اَمن و اَمان
حُسن کی گرمیِ بازار مبارک ہووے
وہ بھی دن آئے جو سہرا بندھے سر پر اس کے
سب خوشی سے کہیں ہر بار: مبارک ہووے
بعد شادی کے، خدا دے کوئی فرزندِ رشید
ہم کہیں آ کے: یہ دِل دار مبارک ہووے
خار کھاتے رہیں کم بخت جو دشمن ہوں شرور
دوستوں کو گُل و گلزار مبارک ہووے

بیانِ جلسۂ شادی اُس وطن آوارہ کا۔ انکار کرنا اُس مہر سیما، ماہ پارہ کا۔ ماں کا سمجھانا، اُس کا شرما کے سر جھکانا۔ پھر سامان برات کا، مزہ لوٹنا پہلی رات کا۔

①
کدھر ہے تو اے ساقیِ گُل عذار | مرا غم سے، دل ہو گیا خار خار
پلا دے کوئی ساغرِ لالہ رنگ | جوانی کی لائے جو دل میں ترنگ
کہے کتنے صحرا نوردی کے رنج | بھلا کچھ تو شادی کا ہوں نغمہ سنج

سُرود سرایانِ بزمِ شادی و نغمہ پردازانِ محفلِ عروسی و دامادی، انجمنِ بیاں میں یہ زمزمہ سنج ہوئے ہیں کہ جب جلسۂ عیش و طرب سے فرصت سب کو ہوئی؛ ایک روز بادشاہِ جم جاہ محل سرائے خاص میں جلوہ بخش تھا؛ بی بی سے خلوت میں فرمایا کہ حقوق اور احسان جیسے جانِ عالم کے ہمارے ذمۂ ہمت ہیں، تمام عالم جانتا ہے اور یہ بھی نزدیک و دور مشہور ہے کہ عشقِ انجمن آرا میں نادیدہ مبتلا ہو، سلطنت کھو، یہاں آیا ہے؛ اور کس مردانگی سے جادوگر کو مار، اُس کے پھندے سے چھڑایا ہے۔ اِس کے قطعِ نظر؛ صورت، سیرت، خُلق، مروّت، ہمت، جُرأت؛ یہ جتنی صفتیں ہیں، سب خالق نے عطا کی ہیں۔ حسب: عالی، نسب: والا۔ حُسن میں مہر و ماہ سے نرالا۔ مناسب کیا، ضرورت ہے کہ جلد سامانِ شادی درست کر، منعقد کرو۔ خدا جانے آج کیا ہے، کل کیا ہو! کارِ امروز را بہ فردا مگذار۔ اُس نے عرض کی: جو رائے اقدس میں گزرا، یہی میرا عین مطلب تھا۔ بادشاہ نے فرمایا: آج انجمن آرا سے یہ مقدمہ اظہار کر کے، جوابِ باصواب حاصل کر لو؛ کل سے سرگرمِ سامانِ شادی ہو۔

یہ کہہ کے، بادشاہ دیوانِ عام میں رونق افزا ہوا۔ انجمن آرا کو ماں نے طلب کیا اور دو چار مغلانیاں، آتو سِن رسیدہ، محلداریں جہاں دیدہ، قدیم جو تھیں، انھیں بلایا۔ شہ زادی کی جلیسیں تھی، یہ خبر سُن کر، بے بُلائے آئیں۔ اُس نے پہلے بیٹی کو گلے سے

لگایا، پیار کیا، پھر کہا: سنو پیاری! دُنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک، بیٹی کسی کی، ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور غیرت دار کے گھر میں لڑکی جوان، ہر وقت رنج کا نشان، خفّت کا سامان ہے۔ اور خدا و رسول کا بھی حکم یہی ہے کہ جوان کو بٹھا نہ رکھو، شادی کر دو۔ وَرائے اِن باتوں کے، ایک شخص نے تمھارے واسطے گھر بار چھوڑا۔ سلطنت سے ہاتھ اُٹھا، کسی آفت سے مُنہ نہ موڑا۔ جی پر کھیل گیا، کیا کیا بلائیں جھیل گیا۔ سر کھپی اور جان جوکھوں کی؛ جب تم نے ہم کو دیکھا، ہم نے تمھاری صورت دیکھی۔ شکل میں پری شمائل، فرخندہ خو، فرشتہ خصائل۔ تمام شہر عاشقِ زار ہے۔ چھوٹا بڑا اُس پر فریفتہ و نثار ہے۔ ہر چند، تم پارۂ جگر، نورِ نظر ہو؛ مگر واری، جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میں اُس میں بڑا فرق ہے! تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے، وہ مردِ میدانِ نبرد ہے۔ رنڈی، مرد کا بہت تفاوت مشہور ہے۔ آگاہ نادان و ذی شعور ہے۔ اِلّا، جانی! ہمارا کہنا، آرسی مصحف میں نظر پڑے گا۔ دیکھیے گا، جو دکھائی دے گا۔

انجمن آرا نے یہ سُن کر سر جھکا لیا، رونے لگی۔ کہا: حضرت! صورت شکل کا مذکور یہاں کیا ضرور تھا۔ یہ اللہ کی قدرت ہے: کسی کو بنایا، کسی کو بگاڑا۔ بہت سے لُولے لنگڑے، کانے کھدرے، گونگے بہرے ہیں؛ وہ، چاہیے نہ جییں۔ کہیں نور ہے، کہیں نار ہے؛

گُل کے پہلو میں خار ہے؛ یہ سب صَنعَتِ پروردگار ہے، دُنیا میں کون سی شَے بے کار ہے۔ بلکہ بُروں سے اچھّوں کی تمیز ہے؛ یوں تو بادشاہِ مصر، غلامِ عزیز ہے۔ اور جو بارِ احساں سے دب کر فرماتی ہو کہ ایسا کرو؛ تو دُنیا، عالَمِ اَسباب ہے؛ ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے۔ یہ شخص نہ آتا اور میرے مُقدّر میں رِہائی ہوتی؛ کچھ ایسا سامان نکل آتا، اور کوئی اللہ کا ولی پیدا ہوجاتا، میری بند چُھڑاتا۔

لِمُؤلِّفِہٖ:

نیک و بدِ زمانہ نہیں اِختیار میں
ہوتا وہی ضرور ہے، جو سرنوشت ہو

میری قسمت کم بخت بُری ہے؛ ایک مصیبت سے چُھڑا، دوسری آفت میں پھنسایا۔ ہر دم کے طعنے اپنے بیگانے کے سُننے پڑے کہ یہ آیا، مجھے قید سے چُھڑایا۔ خُدا جانے وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے! اپنے مُنہ سے میاں مِٹھو، شہ زادہ ہونے کا سب میں غُل مچایا ہے۔ مَیں آپ کی لونڈی ہوں، بہر صورت فرماں بردار؛ اگر کنوئیں میں جھونک دو، چاہ سے گر پڑوں، اُف نہ کروں؛ مگر جو آپ اِس کی صورت شکل پر رِیجھ، محنت اور مشقّت کو سمجھ بوجھ یہ مُقدّمہ کیا چاہتی ہیں؛ تو میں راضی نہیں۔ اگر مزدوری کی اُجرت، خدمت کا اِنعام منظور ہے؛ کہ بادشاہوں کے نزدیک، احسان کسی کا اُٹھانا، بہت دور ہے؛ تو روپیہ، اشرفی، جاگیر عنایت کرو کہ اُس کا بھلا ہو، کام ہو، آپ کا نام ہو۔

یہ فقرہ سُن کے وہ بہت ہنسی، کہا: شاباش بچّی! اُس کی جاں فشانی کی خوب قدر دانی کی! واقعی وہ بے چارہ تمھارے ملک کا یا روپے پیسے کا محتاج ہے! اری نادان! وہ تو خود صاحبِ تخت و تاج ہے۔ اِس بات پر ہم سِنوں نے قہقہہ مارا، کہا: حضور! بس اِن کا یہ شعور ہے۔ اِن کے نزدیک وہ شاہ زادہ نہیں، مزدور ہے۔ انجمن آرا نے جھنجھلا کے کہا: روپیہ وہ شے ہے اور مُلک وہ چیز ہے کہ اِس کے واسطے اِسفندیار سا رُوئیں تن مارا گیا، فریدون و افراسیاب کا سر اُتارا گیا۔

وہ جو دائی، دَدا، آتو، مُغلانیاں پُرانی پُرانیاں حاضر تھیں، بولیں: قُربان جائیں، واری، ماں باپ کی عدُول حُکمی میں خُدا و رسول کی نافرمانی ہوتی ہے، تمھیں انکار مناسب نہیں۔ اور خُدا نخواستہ یہ کیا تمھاری دشمن ہیں، جو راہ چلتے کے حوالے، کسی کے کہے سُنے سے بے دیکھے بھالے کر دیں گی۔ آدمی رُوز بہ رُوز عقل و شعور سیکھتا ہے۔ نشیب و فراز، بات کا محل موقع سوچتا سمجھتا ہے۔ تم، سلامتی سے، ابھی تک وہی بچپنے کی باتیں کرتی ہو۔ کھیلنے کودنے کے سوا قدم نہیں دھرتی ہو۔

انجمن آرا نے جواب نہ دیا، سر زانو پر رکھ لیا، لیکن وہ جو امیر زادیاں اُس کی ہم نشیں، جلیس تھیں، جن سے راتوں کو اِسی دن کے رُوز مشورے رہتے تھے، بولیں: ہے ہے، لوگو تمھیں کیا ہوا ہے! آتو جی صاحب! بے ادبی مُعاف، آپ نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا ہے۔

خَیر ہے صاحبو! دُلھن سے صاف صاف کہوایا چاہتی ہو! دُنیا کی شرم و حیا نگوڑی کیا اُڑ گئی! اِتنا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے، جو یہ نہ مانیں گی۔ اَلْخَامُوشی نِیم رَضا۔ بوڑھے بڑے کے رُو بہ رُو اور کہنا کیا۔ یہ سُن کے آتُو قدیم، جس نے انجمن آرا کو ہاتھوں پر کِھلایا تھا، پڑھایا لکھایا تھا؛ بِسْمِ اللہ کہہ کے اُٹھی، انجمن آرا کی ماں کو نَذر دی، مُبارَک باد کہہ کے ہنسنے لگی۔ محل میں قہقہے مچے، شہ زادی بناوٹ سے رُونے لگی۔ نوّاب ناظِر، بیگم کی نَذر لے کر بادشاہ کے حُضور میں حاضر ہوا۔ نَذر دی، خِلعَت مَرحمَت ہوا۔ یہاں تو اَرکانِ سلطنت اِسی دن کے رُوز مُنتظِر رہتے تھے؛ یہ مُژدۂ فرحت اَفزا دریافت کر کے اُٹھے، بہ مَراتِب نَذریں گُزریں۔ تُوپ خانوں میں شَلَّک کا حکم پہنچا۔ نَوبت خانوں میں شادِیانے بجنے لگے۔ تمام شہر آگاہ ہوا کہ اب بیاہ ہوا۔ مُبارک سلامت کی صدا زمین و آسمان سے پیدا ہوئی۔ شعر:

فلک پر یہ مبارک باد ہے اب کس کے ملنے کی ①
یہ ایسا کون بختاوَر ہے، جس کا بخت جاگا ہے

بادشاہ نے وزیرِ اعظم سے اِرشاد کیا: جانِ عالم یہاں مُسافِرانہ وارِد ہے؛ تم اُمُوراتِ محل میں مُستعِد رہو، ہم اُس کا سامان سَرانجام کریں۔ وزیر آداب بجا لایا؛ خِلعَتِ فاخِرہ ملا، ہاتھی، پالکی سے سَرفَراز ہوا۔ جانِ عالم کا یہ نقشہ تھا: چہرے پر بَشاشَت سے سُرخی، باچھیں تا بُناگوش کِھلیں، فرحت کے باعث بَندِ قبا ٹوٹے جاتے تھے، پھولے نہ سماتے تھے؛ مگر شرم کے باعث

آپ سر نہ اُٹھاتے تھے۔

بادشاہ نے رَمّال، نُجومی، پنڈت، جَفر داں؛ جو جو علمِ ہَیئت اور ہِندَسہ اور نُجوم میں طاق، شُہرۂ آفاق تھے؛ طَلَب کیے اور ساعتِ سعید کا سوال کیا۔ کسی نے قُرعہ پھینکا، زائچہ کھینچا، شکلیں لکھیں۔ کسی نے پوتھی کھولی۔ کوئی حرفِ مُفرد لکھ کر حساب کرنے لگا۔ کوئی تُلا، بِرچھک، دَھن، مَکَر، کُمبھ، مین، میکھ، بِرکھ، مِتھُن، کَرک، سِنگھ، کَنیاں گن کر بچار کرنے لگا۔ کوئی مُشتری، مِرّیخ، شَمس، زُہرہ، عُطارِد، قَمر، زُحَل کا حال مع گردشِ بُرج کہ کے؛ حَمَل، ثَور، جَوزا، سَرطان، اَسَد، سُنبُلہ، قَوس، عَقرَب، جَدی، دَلو، حوت، میزان کی میزان دے کر، شُمار کرنے لگا۔ کہا: بعدِ مُدّت قَمر اور مُشتری کا، بہ طرزِ خلاف، حَمَل میں قِران ہے؛ اِس ہفتے کا دن رات سَعدِ اکبر ہے۔ اور بالاِتّفاق ایک رُوز مقرّر کیا۔ حُضور سے، بہ قدرِ علم و کمال، خِلعَت اور اِنعام عنایت ہوا اور بعدِ جلسۂ شادی، بہ اُمیدِ دیگر و اِمدادِ وافر اُمیدوار کیا۔

اَلقِصّہ بہ مُوجِب اَحکامِ اختر شَناسانِ بلند بیں، فلک سَیر، ماضی مستقبل کے حال داں، باریک خیال و مُنجّمانِ صَدر نَشین مسندِ گُذشت و دیر، حُکم رَوایانِ خوش فال؛ مانجھے کا جوڑا دُلھن کے گھر سے چلا۔ مزدور سے تا فیل نَشین، زَن و مرد فَرد فَرد بالباسِ رَنگین۔ سُکھراج

کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے۔ سُنہرے خوانوں میں پِنڈیاں: مُقوّی، مُفرّح، ذائقہ ٹپکتا، خوان تک بسا۔ اور دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے۔ طلائی چوکی۔ جواہر جڑا زمرد نگار کٹورا بٹنا ملنے کا۔ کنگنا بہ از عِقدِ ثُریّا، دُر یکتا بڑا بڑا۔ لُنگی مُلتان کی تھی، بیل بوٹے میں گلستاں کی تھی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطرِ کشمیر پر خندہ زن ہو، مُعطّرِ دماغِ انجمن ہو۔ کنٹروں میں عطرِ سہاگ، مہک پری: ایجادِ نصیرالدین حیدری، ارگجۂ محمد شاہی۔ فتنے کی بُو چارسُو۔ زعفران کا سا تختہ کھلا، کوسوں تک خوان سے خوان مِلا۔ نوبت نشان۔ گھوڑوں پر شہنا نواز، نقارچی جوان جوان۔ سُکھپال اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں، اُن کے بناو کی تیاریاں۔ کہاریاں پری چہرہ، برقِ درخشاں کا عالم، باہم قدم قدم۔

اِس سامان سے وہ سب مانجھالے کے، درِ دولتِ نوشاہ پر جو بس گئے، شہر کے کوچہ و بازار بس گئے۔ وہاں دولھا، یہاں دُلھن نے مانجھے کے جوڑے پہنے۔ مُبارک سلامت سب لگے کہنے۔ مُنادی نے ندا کی: جو سفید پوش نظر آئے گا، اپنے خون سے سُرخ ہوگا؛ یعنی گردن مارا جائے گا۔ بادشاہ نے خود ملبوسِ خاص رنگین زیبِ جسم کیا، رنگ کھیلنے لگا۔ تمام خلقت ہولی کی کیفیت بھولی۔ شہر میں شہاب اور زعفران کے سُرخ و زرد نالے بہے۔ گلیوں میں عبیر، گُلال کے ٹیلے ٹھیکرے رہے۔ کوچہ ہر بازار کا زعفران زارِ کشمیر تھا۔ ایک رنگ میں ڈوبا امیر و فقیر تھا۔

پھر بہ تاکیدِ تمام خاص و عام کو حکم ہوا کہ آج سے چوتھی تک

سوائے اہلِ حرفہ، اپنے اُمورِ ضروری موقوف کر، گھروں میں ناچ دیکھو، جشن کرو۔ جو کچھ احتیاج ہو، سرکار سے لو۔ اور ہر رئیسِ محلّہ، سردارِ قوم سے فرمایا: جو جو تم سے متعلّق ہوں، اُن کی فرد درست کر، حضور میں گزرانو، سب کو ہمارا مہمان جانو۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان، خواہ ہندو ہو یا مسلمان، حضور سے ملے گا۔ اور اربابِ نشاط کے داروغہ کو احکام مِلا: جس کی جیسی لیاقت ہو، یا جس کا جو شائق ہو، بہ شرطے کہ اُس کے لائق ہو؛ بہ رضامندیِ طرفین، وہ ویسا طائفہ وہاں بھیج دو۔

دُکان داروں کو ارشاد ہوا: دن رات دُکانیں کھلی رہیں، قریب قریب ناچ ہو۔ اُن کے کھانے کا صرف، تصرّفی باورچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندو کو: پوری، کچوری، مٹھائی، اچار۔ مسلمان کو: پُلاو، قلیہ، زردہ، قورمہ، ایک آبی، دوسری شیرمال، فرنی کا خوانچہ، تشتری کباب کی، بہت آب و تاب کی۔ شہر میں گلی گلی عیش و طرب، خوشی میں چھوٹے بڑے سب، نہ کسی کو کسی سے غرض نہ مطلب۔ پکّا پکایا کھانا کھانا، دُکانوں میں بیٹھے ہر وقت ناچ دیکھنا، سرکار کا کام بنانا، بغلیں بجانا۔ بیت:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد①
کسے را با کسے کارے نباشد

اور اِس سے پہلے بہ تعیّنِ روزِ شادی، نامے بادشاہوں کو، فرمان راجا بابو کو، صوبے داروں کو شُقّے، عاملوں کو پروانے

جا چکے تھے۔ دو چار منزل گرد پیش، سرِ راہ دو دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور حلوائی کھانا، مٹھائی گرما گرم تیار کیے بیٹھے رہتے تھے کہ اِس عرصے میں جو مسافر گزرے، یا طَلَبیدۂ بادشاہ آئے، بھوکا نہ جائے۔ اور مُژدۂ شادی راہ چلتوں کو سُنا، شہر میں بھیج دیتے تھے کہ یہ جلسہ قابلِ دید ہے۔

غَرض کہ دو منزل، چار منزل بلکہ دس بیس دن کی راہ سے، تماش بین بے فِکرے لکھنؤ والوں سے، سَیر دیکھنے کو آئے۔ اور ساچق کا دن آیا۔ اگر سب سامان بیان کروں، کہانی ناتمام رہ جائے؛ مگر دَہی مُشتے نمونہ از خَروارے۔ پچاس ہزار چوگھَڑے: رُپہلے، سُنہرے، جواہر نگار، نُقل اور میوے سے لَبالَب۔ لاکھ خوان: بہ حُسن و خوبیِ بسیار، پُر تکلّف سب؛ پچاس ہزار میں مصری کے کوزے، باقی میں میوہ۔ اور قند کی چھبڑیاں مُرصّع کاری کی، بڑی تیاری کی۔ نُقرئی دَہی کی مَٹکی، گلے میں مچھلیاں ناڑے سے بندھیں۔ آرایش کے تخت بے حساب، اِس رَوِش کے جن کے دیکھنے سے صنّاعیِ صانعِ حقیقی کی یاد آئے۔ گُل بوٹا اِس سج دَھج کا، جو نَقل کو اَصل کر دکھائے۔ آتش بازی کے ٹوکرے قطار در قطار، بے پایاں۔ سَرو، جھاڑ، درختِ میوہ دار ہزار در ہزار، لا بَیان۔ بہت تُزُک، بڑا سامان۔ آرایش کے گُلدستوں سے چمنِ رَواں ساتھ تھا۔ سَرِ دَست یہ باغ ہاتھوں ہاتھ تھا۔

اِس انداز سے ساچق گئی۔ منہدی کی شب ہوئی۔ وزیرِ درست تدبیر نے خوب تیاری کی۔ نارنول کی منہدی ہزار ہا مَن، بو باس میں دُلھن بن۔ وہ رنگین جس کی دید سے، دستِ نظارہ مثلِ پنجۂ مرجان رشکِ عقیقِ یمن ہو جائے، سرخ رُو ہمہ تن ہو جائے۔ ایک بار لگائے، لال ہو، تمام عمر کفِ افسوس ملتا رہے، نہ ہاتھ لگنے کا ایسا ملال ہو۔ بہ ظاہر سرسبز، ہری، جگر میں سُرخی کوٹ کوٹ کے بھری۔ جڑاؤ سینیوں میں حنا، شمعِ مومی و کافوری اُس پر روشن۔ ملیدے کے خوانوں پر جوبن۔ آرایش اور آتش بازی ہمراہ۔ سب کے لب پر واہ واہ۔ بہت چمک دمک سے منہدی لایا اور یہ رنگ ڈھنگ حُسنِ تدبیر سے دکھایا کہ تمام ہم چشموں میں سُرخ رُو ہوا۔

برات کی رات کا حال سُنو: دیوانِ خاص سے دُلھن کا مکان چار پانچ کوس تھا۔ یہاں سے وہاں تک دونوں طرف بلّور کے جھاڑ آدمی کے قد سے دو چند، سو سو بتّی کے سر بلند، پانچ پانچ چھ چھ گز کے فاصلے سے روشن۔ اور دس گز جُدا نُقرئی، طلائی پنج شاخہ جلتا۔ اُن سے کچھ دور ہزاروں مزدور ٹھاٹھروں پر روشنی کرتے۔ جھاڑ رشکِ سروِ چراغاں، چمکتے۔ جا بہ جا ترپولیے اور نوبت خانے بنے؛ کتھک اتھک اُن پر ناچتے، نوبت بجتی، مُغرّق شامیانے تنے۔ اِس کے قریب دو رُویہ آتش بازی گڑی، خلقتِ خدا تماشا دیکھنے کو کھڑی۔ روشنی یہ روشن تھی کہ چیونٹی سوار کو بہ ہیئتِ مجموعی، مُفصّل معلوم ہوتی تھی۔

غرض نوشہ سوار ہوا، شور و غُل یک بار ہوا۔ کسی نے کہا: سواری جلد لانا! کوئی پٹکا، شملہ سنبھال، خدمت گار کو پکارا کہ ہاتھی بٹھانا!

پلٹنیں آگے بڑھیں، عربی باجے بجنے لگے۔ کوس و کوّر گرجنے لگے۔ نوبت و نشان، ماہی مراتب، جُلوس کا سامان۔ سواروں کے رِسالے دو رُویہ باگیں سنبھالے۔ خُود اَسپے، اِکّے، پیش قرار در ماہے دار۔ پھر ہزار بارہ سے تختِ رواں، تمام تمامی سے منڈھا؛ اُن پر رنڈیاں جوان جوان، شادی مُبارک گاتیں؛ سج دھج دِکھا، طبلے بھڑ بھڑاتیں۔ بہت سے سانڈنی سوار تیز رفتار۔ خاص بردار۔ خاصیاں کندھوں پر، دولھا کے برابر۔ اُن کے قریب برچھے والے، بان دار، چوبدار۔ رُوشن چوکی والے؛ شہنائیں پُرتکلّف، سُر نرالے۔ ہزاروں غلام زرّیں کمر، سُنہری رُپہلی انگیٹھیاں ہاتھوں میں؛ جھولی میں عنبرِ سارا، عودِ غرقی بھرا، سارا شہر مہکتا۔ گرد ہزارہا پنج شاخہ جھلکتا، سونے چاندی کی دستیاں روشن، ہتھوں پر جوبن۔ قُوریں چالیس بادشاہ پُرشوکت وجاہ۔ پیچھے بارہ ہزار ہاتھیوں پر امیر وزیر، ارکانِ سلطنت، ترقی خواہ۔ خواصی میں انجمن آرا کا بھائی، جانِ عالم کا سالا بجائے شہ بالا۔ آہستہ آہستہ، قدم قدم خوش و خرّم چلے۔ کوچہ و بازار بو باس سے مُعطّر تھا۔ چرخِ گرداں دیدۂ دیدبانِ چارم سے تماشائی تھا، یہ سامان تھا۔ دشت کا وحش و طیر حیران تھا۔

پہر رات رہے دُلھن کے دروازے پر پہنچے۔ ماما، اَصیلیں دَوڑیں؛ پانی کا تشت ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا۔ کسی نے کچھ اور ٹوٹکا کیا۔ دولھا اُتر کر مجلس میں داخل ہوا۔ بارہ سے طائفہ رنڈیوں کا؛ سوائے بھانڈ، بھگتیے، ہیجڑے، زنانے، کشمیری قوّال، بین کار،

رَبابیے، سَرودیے کے، حاضر تھا۔ ناچ ہونے لگا۔ قریبِ صُبح قاضی طَلَب ہوا۔ بہ ساعتِ مُعَیَّن کئی سلطنت کے خراج پر مَہر بندھا۔ طالب و مطلوب کو سِلکِ اِزدِواج میں مُنسلِک کیا۔ مُبارک سلامت کا غُل مچا۔ میر سوز:

فلک، شب کتخدائی دیکھ اُس کی، سوز! یوں بولا ①
تجھے یہ رات، اے رشکِ مہِ انور مُبارک ہو

سب طائفے ساتھ کھڑے ہو، ایک سُر میں مبارک باد گانے لگے۔ حوصلے سے زیادہ انعام پانے لگے۔ دولھا زنانے میں طَلَب ہوا۔ وہاں رسمیں ہونے لگیں۔ وہ بھی عجب وقت تھا: آرسی مُصحَف رُو بہ رُو، محبوبِ دل خواہ دُو بہ دُو، سُورۂ اِخلاص کھُلا، آئینہ رُونُمائی میں مزے لُوٹتا، سلسلۂ محبّت مُستحکم ہو رہا۔ ڈومنیوں کا سٹھنیاں گانا، دولھا دُلھن کا شرمانا۔ کبھی ٹُوتے، گاہ اچھے بنے سلونے۔ ہمجولیوں کا پوچھنا: ٹُونا لگا؟ دولھا کا ہنس کے کہنا: عرصہ ہوا۔ کوئی دُلھن کی جُوتی، دولھا کے شانے میں چھُوا گئی۔ کوئی اُسی کا کاجل پیار ا ہوا لگا گئی۔ ہم سِنوں کی چھیڑ چھاڑ، اُن کے جوبن کی بہار، فقط ململ اور شبنم کے دوپٹّوں کی آڑ۔ جس دم یہ رسمیں ہو چکیں، تو بات کی نوبت آئی، اِس طرح چُنی، کہ دیکھی نہ سُنی۔ میر حسن:

وہ جب پاؤں پر کی اُٹھاتے اَڑا ②
نہیں اور ہاں کا عجب غُل پڑا

جس دم یہ رسمیں ہو چکیں، پھر ڈومنیوں نے پائینی گائی، سب کی

چھاتی بھر آئی۔ دُلھن سے رُخصت ہونے لگے، رُو رُو بھی کھونے لگے۔ سواری تیار ہو کے دروازے پر آئی۔ دولھا نے سہرا سر سے لپیٹ دُلھن کو گود میں اُٹھایا؛ سب کا دل اُمنڈ آیا، شور و غُل مچایا۔ دُنیا کے کارخانے قابلِ دید ہیں، بلکہ دید ہیں نہ شنید ہیں۔ شادی میں غم سلف سے توام ہے؛ مگر ثبات بجز ذاتِ باری کسی کو نہیں۔ مقدّماتِ جہانِ گُذراں خوابِ پریشاں ہیں، اِس میں سب حیراں ہیں۔ مؤلّف :

اک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طَور، آہ معلوم ہو گیا مجھے لَیل و نہار سے

غرض کہ دُلھن کو سُکھپال میں سوار کیا۔ بادشاہ نے اسبابِ ضروری، سامانِ ظاہری کے سِوا، مُلک و سلطنت و خزانہ جہیز میں لکھ دیا۔ برات رُخصت ہوئی۔ وہ اِہتمام، تجمّل، سواری کا سامان۔ ہر شخص خُرّم و خنداں۔ جہیز کا آگے بڑھنا، لوگوں کا دولھا پر دُعائیں پڑھنا۔ نسیمِ سحر کا چلنا، شمع کا جِھلمِلا جِھلمِلا کے جلنا۔ شہنا میں بھیروں، بِبھاس، آنیا، للت، رام کلی کا پھونکنا۔ نقیب اور چوبداروں کا کوئل کی طرح کوکنا۔ نوبت کی ٹکور، جھانجھ کا جھانجھ سے شور۔ جھٹ پٹا وقت، نور کا تڑکا۔ کڑکیتوں کا سوہیل کڑکا۔ کچھ کچھ تاروں کی چمک۔ نقّاروں کی صدا، دھونسے کی گمک۔ چاند کے مُنہ پر سفیدی، دُلھن والوں کی یاس و نا اُمیدی۔ عطر کی ہر سُو لپٹ، پھولوں کی مہک۔ سب کو نیند کا خُمار، کوئی پیادہ کوئی سوار۔ فرش

باسی ہار پھولوں سے رشکِ صحنِ چمن، کہیں جھول، کہیں شکن۔ کسی جا پکھر وٹے اور پیڑوں کے پتّے کھلے پڑے، کہیں لوگ حیران و ششدر کھڑے۔ مجلس کے فراق میں، اہلِ محفل کے اشتیاق میں، شمع کی زاری، اشک باری۔ لگن میں پروانوں کی بے قراری، خاکساری۔ دولھا کے لوگوں کی خوش بشاش تیاری، دُلھن کے گھر میں نالہ و زاری۔ کوئی کہیں نیند کی جھونک میں پڑا، کوئی یہ سامان بہ چشمِ عبرت دیکھ، تاسُف میں کھڑا۔ شمع فانوس میں گُل۔ گُل، گُل گیر میں۔ زیر انداز پر پروانوں کے پَر، فرّاش فرش اُٹھانے کی تدبیر میں۔ بیٹھی ہوئی ہر ایک کی آواز، کہیں سوز، کہیں ساز۔ یہ وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، راہ چلتا بھی دیکھ کر روتا ہے۔ اِس کی لذّت وہ جانے، جس کی نظر سے یہ ہنگامہ گزرا ہو۔ کسی کی برات دیکھی ہو، گو بیاہ نہ کیا ہو۔

قصہ مختصر، دولھا شگفتہ خاطر، خنداں۔ چہرے پر شباب کی چمک، عارضِ تاباں سے حُسن کی بہار عیاں۔ ہاتھی پر سوار، گرد شاہ و شہریار۔ زرِ سُرخ و سفید نثار ہوتا۔ سرِ چوک پہر بجے دیوانِ خاص میں داخل ہوا۔ اب گھر پہنچنے کی ریت رسم ہونے لگی۔ دولھا دُلھن جب اُترے، بکرا ذبح کیا انگوٹھے میں لَہو لگا دیا، پھر کھیر کھلائی۔ رسموں سے فرصت پائی۔ اب یہ منتظر ہوئے کہ شام ہو، وصل کا سَر انجام ہو۔ اُس دن جانِ عالم کا گھبرانا، گھڑی گھڑی گھڑیالی سے دِن کی خبر منگوانا دیکھنے کی گوں تھا۔ بدحواس پھرتا تھا کہ کہیں جلد رات ہو، بے تکلفی کی ملاقات

ہو۔ کبھی کہتا تھا: واہ، قسمت کی خوبی! پہر بھر کا عرصہ ہوا، گھڑی نہیں ڈوبی! ہوش کہاں بجا تھا، مکرر یہ پوچھتا: ابھی کیا بجا تھا؟ اُدھر انجمن آرا کبھی جمائیاں لیتی تھی، تکیے پر سر دھر دیتی تھی۔ جب یہ بھی تدبیر بن نہ آتی تھی؛ لوگوں کے چونکانے کو اونگھ جاتی تھی۔

غرض کہ خدا خدا کر وہ دن تمام ہوا، نمود وقتِ شام ہوا۔ عروسِ شب نے مقنعۂ مہتاب سے رو پوشی کی، مشتاقوں کو فرصت ملی گرم جوشی کی۔ لوگ آنکھ بچا کر جا بہ جا کنارے ہوئے، دولھا دُلھن چھپر کھٹ میں ہم کنار بے تابی کے مارے ہوئے۔ شادی کا روز، شباب کا عالم؛ مشتاقوں کا بیٹھنا باہم۔ آنکھوں میں خمار نیند کا، دل میں اشتیاق دید کا۔ عطرِ سہاگ اور فتنے کی خوش بو۔ بٹنے اور تیل کی عجب میل کی مہک ہر سو۔ پھولوں سے پلنگ بسا، ادقچہ کسا۔ خود نشۂ عشق سے باختہ حواس، تمنائے دل پاس، نہ کچھ دغدغہ نہ وسواس۔ ہنگامۂ صحبت طرفین سے گرم؛ اُدھر شوق، اِدھر شرم۔ ایک طرف ولولۂ گرم جوشی، ایک سمت کثرتِ حیا سے منہ پر مہرِ خموشی۔ بیان کرنا گزشتہ حال کا، خیال لوگوں کی دیکھ بھال کا۔ یہ معمول ہے: اُس روز ہم سنیں تاکتی جھانکتی ہیں، لیکن اِن ڈروں پر چپ نہ رہے، آہستہ آہستہ دونوں نے دکھڑے کہے۔

جانِ عالم نے توتے سے ذکر سن کر در بہ در خراب خستہ ہو کر آنا، توتے کا بیٹھ رہنا، وزیر زادے کا صدمۂ فراق سہنا؛ پھر

طِلسم کا پھنس جانا، جادوگرنی کا ستانا؛ بعد اس کے نقشِ سُلیمانی لینا، وہاں سے چل دینا؛ بہ کُشادہ پیشانی و خوش بیانی بیان کیا۔ مگر ملکہ مہر نگار کی ملاقات، جگت رنگی کے حرف و حکایات؛ اُس کی طبیعت کا آجانا، اپنا بے اِعتنائی سے چلے آنا؛ کچھ شرما کے، بات کو مطلب کی جا سے چبا چبا کے بیان کیا۔ یہ اکثر ہوا ہے کہ معشوق کے رُو بہ رُو، جو اِس پر کبھی کوئی عاشق ہوا ہے، اُس کا ذکر کرتا ہے، شیخی بگھارتا ہے، کچھ جھوٹ اپنی طرف سے جوڑتا ہے، دل کے پھپھولے توڑتا ہے۔ اِس کی شرح، گو طول طلب ہے؛ پر، عاشق مزاجوں پر منکشف سب ہے۔

انجمن آرا نے جادوگرنی کے قصے پر تاسّف کیا۔ ملکہ کے مذکور پر، بناوٹ سے ہنس دیا۔ پھر رُوکھی صورت بنائی، ناک بھوں سمیٹی، تیوری چڑھائی؛ مگر چلے آنے کے سہارے پر مسکرائی۔ اپنا بھی اِشتیاق، لیے دیے، آرزوئے ملاقات، محنت و مشقّت کی قدر دانی اِس سے، جادوگر کی لڑائی میں جاں فشانی سے بیان کرکے کہا: اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَانِ۔ جب اِس طرح کے دو دو اُنچھر ہو چکے، دل کے ارمان کھو چکے؛ پھر دونوں بے ساختہ ہو، شرم و حیا کھو ہم آغوش ہوئے۔ رنج درکنار، غم و دردِ مُہاجرت فراموش ہوئے۔ مؤلف:

یہ ہم کنارِیِ جاناں سے تازہ لطف اُٹھا   گلے سے ملتے ہی، سب رنج درکنار ہوا

سینے سے سینہ، لب سے لب، ہاتھ پاؤں؛ بلکہ جتنے اعضائے جسم ہیں،

سب وَصل تھے مَثَل ہے: ایک جان دو قالِب؛ وہ ایک جان ایک ہی قالِب' غالب ہے کہ ہو گئے۔ اُستاد:

ایّامِ وصل میں ہم پٹتے ہیں جیسے اُس سے — یوں وَصلی کے بھی کاغذ چِپیاں بَہم نہ ہوں گے[1]

خواہش کو اِضطِرار' حیا مانِعِ کار' شرم برسرِ تکرار۔ دونوں کے دم چڑھ گئے تھے' انداز سے بڑھ گئے تھے۔ دست بُردی' ہاتھا پائی تھی' چُوریاں تھیں۔ جنگِ زرگری' گاہ زُوریاں تھیں۔ شہزادی موقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ جب بے بس ہو جاتی تو چُٹکیاں لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی: اے صاحب! اِتنا کوئی گھبراتا ہے! دیکھو تو کون آتا ہے! کبھی خود اُٹھ کے دیکھتی بھالتی تھی' کوئی دم یوں ٹالتی تھی۔ آخر کار جب غمزہ و ناز کی نوبت بڑھ گئی' تھک کے ڈھب پر چڑھ گئی۔ غُنچۂ سربستہ' تمنائے دراز' بہ حرکتِ نسیمِ وَصل شگفتہ و خنداں ہوا۔ دُرِ ناسُفتہ' دُرجِ شہریاری؛ رشکِ عقیقِ یمنی' غیرتِ دہِ لعلِ بدخشاں ہوا؛ جیسا پیرِ دہقاں' فردوسیِ سخن داں نے کہا ہے' شعر:

چناں بُرد و آورد و آورد و بُرد — کہ دایہ ز حسرت پسِ پردہ مُرد

رشک و حسرت سے جگرِ صَدف چاک ہوا' قطرۂ نیساں صَدف میں گرا' دشمن کم بخت در پردہ ہلاک ہوا۔ تقاضائے سن' اَلھڑ پنے کے دن' سیر تو یہ ہوئی اُس وقت دونوں ناتجربہ کار' بادۂ اُلفت کے سرشار کیا کیا گھبرائے' ہزاروں طرح کے نئے نئے خیال آئے' کیفیت سب بھولی' جب دامنِ شب میں چادرِ پلنگ پر شَفقِ صُبح پھولی۔ غرض کہ شرما کے اِستراحت فرمائی' دلِ بے تاب نے تسکین پائی۔

ہنوز پلک نہ جھپکی تھی' صُبح کا غُلغُلہ ہوا' نمودِ سحر ہوئی' خاص و عام میں شب کی خبر ہوئی۔ دمِ صُبح ایک سُرخ رُو' دوسرا ژولیدہ مُو حمّام میں داخل ہوئے۔ جو جو محرمِ راز' شریکِ ناز و نیاز تھیں؛ رات کی باتوں کے پتے' رمز و کنایے میں دینے لگیں۔ کوئی شرمایا' کوئی جُھنجھلایا۔

غمزہ و ناز ہر انداز میں رہا۔ اُس وقت قہقہے کا شور آسمان پر پہنچایا، جب خوانوں میں پنجیری اور شیشوں میں تنبول آیا۔ الغرض نہا دھو خاصہ نوش فرمایا۔ جانِ عالم بادشاہ کے حضور میں آیا، خلعتِ فتح پایا۔ اب اُمورات سلطنت بہ مشورۂ شاہ زادہ ہونے لگے۔

بعد رسم چوتھی چالے کے، لبِ دریا ایک باغ بہت تکلّف کا "نشاط افزا" نام، بادشاہ نے رہنے کو عنایت کیا۔ اگر اُس باغ کی تعریف رقم کروں، شاخ زنبق و نرگس کی ٹہنی کو لاکھ بار قلم کروں۔ اِلّا، خضر کی حیات، رضواں کا ثبات درکار ہے؛ نہیں تو ناتمام رہے، لکھنا بے کار ہے۔ سو بار خزاں جائے، بہار آئے؛ ایک پٹڑی کی روشِ صفا تحریر نہ ہو سکے، خامۂ مانی پھسل جائے۔ رشکِ گلزارِ جناں، ایک تختۂ فردوس سا کئی کوس کا باغِ بے پایاں۔ برگ و بار، گل اُس کے جورِ خزاں سے آزاد بالکل۔ نہ بلبل پر ستمِ باغباں، نہ خوفِ صیاد؛ عجائب غرائب چہچہے، نئے رنگ ڈھنگ کے ترانے یاد۔ جتنے دنیا کے میوے ہیں، تر و تازہ ہمیشہ تیار۔ سرسبز پتّے، خوش رنگ پھول، پھل مزے دار۔ گُل تکلیفِ خار سے بری۔ جہان کی نعمت ہر تختے میں بھری۔ روش کی پٹڑیوں پر منہدی کی ٹٹیاں کتری ہوئی برابر۔ چمن میں وہ وہ درخت پھلے پھولے، جسے دیکھ کر انسان کی عقل بھولے۔ پھولوں کی بو سے خوش سے دل و دماغ

طاقت پائے۔ جو پھل نظر سے گزرے، بارِ خاطر نہ ہو؛ ذائقہ زبان پر، مُنھ میں پانی بھر آئے۔

نہریں ہزار در ہزار، پُر از آبشار۔ گرد چرند و پرند خوب صورت، قطع دار۔ باغبانیاں پری زاد، حور وش، کم سِن، مِہر لِقا۔ بیلچے جواہر نگار ہاتھوں میں۔ ہر ایک آفت کا پرکالہ، دل رُبا، مہ سیما۔ کُنوئیں پختہ، جڑاؤ چرخی، رسّے کلابتوں کے۔ ڈول وہ کہ عقل دیکھ کر ڈانواں ڈول ہو۔ چرسے پر نزاکت برسے۔ بیل کے بدلے نیل گائے کی جوڑیاں۔ آہو جن کے رو بہ رو چہ کارہ، باغبانیاں مہ پارہ۔ زر بفت کے لہنگے قیمت کے مہنگے۔ شبنم کے نفیس دوپٹے مُغرّق۔ مسالے کی کُرتی، انگیا۔ چھڑے پاؤں میں: طلائی، واچھڑے۔ کان کی لَویں ہیرے کی بجلی: برق دَم، سب کی آنکھ جس پر پڑے۔ کوئی ڈول کو سنبھال ٹپّا، خیال گاتی۔ کوئی شعرِ برجستہ یا ہندی کا دوہا اُس میں ملاتی، چھیڑ چھاڑ میں چٹکی لے کے اُچھل جاتی۔

ایسے باغِ پُر بہار میں جانِ عالم اور انجمن آرا ہاتھ میں ہاتھ، پریوں کا اکھاڑا ساتھ، دین و دُنیا فراموش، ہر دم نوشا نوش، باعیش و نشاط اوقات بسر کرنے لگا۔ جہان کا ساز و ساماں ہر دم مُہیّا۔ شراب و کباب، چنگ و رباب کا جلسہ۔ خدمت گزاریں پری طلعت، ماہ پیکر سب کام کو حاضر۔ جیسے کنھیّا شامِ عشرت سحر کرنے لگا۔ نہ خیال اپنے شہر و دیار کا، نہ خوفِ نیرنگیِ فلک، نہ بیم و ہراسِ گردشِ روزگار کا، نہ ماں باپ سے مطلب۔ یار آشنا بھولے سب۔ نہ کچھ دھیان

اُس جگر فگار، کُشتۂ اِنتظار ملکہ مہر نگار کا۔

شَرحِ جگر خراشیِ مصائب دیدۂ روزگار، یعنی ملکہ مہر نگار کی۔ تڑپ، بے قراری، نالۂ نیم شبی اور اشک باری اُس مصیبت شعار کی۔ دو ایک جملۂ معترضہ پُر شکایت، کشش محبت کی حکایت۔ نظم:

کدھر ہے تو اے ساقیِ بے خبر! | نہ کی لطف سے غم زدوں پر نظر
ہوا حال شادی کا سب اِختتام | مگر غم کا قصہ ہے وہ ناتمام
تپش سے، تڑپ سے تو کر دے بہم | کہ لکھتا ہوں پھر داستانِ الم
خوشی سے، مجھے رنج مرغوب ہے | یہ مونس ہے، ہم دم بہت خوب ہے
یہی ساتھ دیتا شب و روز ہے | یہ غم، عاشقوں کا غم اندوز ہے

نالہ نوازانِ بزمِ ماتم و تفتہ جگرانِ کلبۂ غم، حاکیانِ حکایتِ حزن و ملال و نشارانِ دل خوں، آشفتہ حال لکھتے ہیں کہ اُس بے سر و ساماں، کُشتۂ ہجراں، دور اَز دِل دار و ہم قرینِ غم، رُو نا دیدۂ شادی، بوریا نشینِ ماتم، دِل رِیش، سینہ فگار یعنی ملکہ مہر نگار کا فُرقت میں یہ حال ہوا، اُستاد:

یاں تک کہ اُٹھانے کا وقت اپنے، قریب آیا

اِس پر، مرے بالیں پر تم اُٹھ کے نہ آ بیٹھے ①

میں نام ترا لے لے دن رات جو چلاؤں

اُو سُنتے ہوئے بہرے! کیوں کر نہ گلا بیٹھے

جو کوئی کہتا: خیر ہے ملکہ! گھُلی جاتی ہو، کیوں اتنا رنج و غم کھاتی ہو!
تو یہ کہتی، مُصحفی:

غم کھاتی ہوں لیکن مری نیت نہیں بھرتی ②

کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

مؤلِف:

نہ پوچھو کچھ مری حالت کہ اِس دِل کے لگانے سے

پریشاں، سینہ سُوزاں، مُنفعِل، سر در گریباں ہوں

ایسی باتیں دردآمیز، وحشت انگیز کرتی کہ سُننے والوں کی چھاتی پھٹتی۔ وہ
کہتیں: نظر بہ خدا رکھو۔ حَسَن:

اُسے فضل کرتے، نہیں لگتی بار ③

نہ ہو اُس سے مایوس، اُمید دار

سُوز: پھر بہار آتی ہے تجھ میں، اے گلستاں! غم نہ کھا ④

وہ چلی آتی ہے فوجِ عندلیباں، غم نہ کھا

گو کہ شب آخر ہوئی، اے شمع! تو زاری نہ کر

پھر وہی محفل، وہی تیرا شبستاں، غم نہ کھا

وہ سُن کر یہ کہتی کہ میں چراغِ سحری ہوں، یقین ہے کہ تا صُبح بزمِ جہاں سے، جل کے، سفری ہوں۔ خُسرو:

پس از انکہ من نمانم، بچہ کار خواہی آمد①

مُؤلّف: ہماری جان کے جانے میں جب عرصہ رہا تھوڑا

تب اُس کے دل میں آیا دھیان میرے پاس آنے کا

آج تک اُس غفلت شِعار، فراموش کار کی کچھ خبر نہ آئی، ہم نے غمِ جُدائی میں مفت جان گنوائی۔ مُؤلّف:

تپِ جُدائی سے اِس طرح اب نزار ہوں میں

اجل کے مُنہ سے بھی، غالب ہے، شرمسار ہوں میں

کیا ہے رنجِ جُدائی نے ایسا کاہیدہ

نظر میں خلق کی، رشکِ خطِ غُبار ہوں میں

جو تو وہ گُل ہے کہ عالم کے دل میں ہے تری جا

تو سب کی آنکھ میں کھٹکا کیا، وہ خار ہوں میں

قرار می بَرد از خلق آہ و زاریِ ما

سُرورؔ! رنج میں کس کے یہ بے قرار ہوں میں

یہ معمول تھا: جب چار گھڑی دن رہتا، سوار ہو کر، اُن درختوں میں، جہاں جانِ عالم سے ملاقات ہوئی تھی، جاتی اور جو جو شریکِ راحت و رنج تھیں، اُن سے مخاطب ہو یہ کہتی، اہلی شیرازی:

خوش آنکہ تو باز آیی و من پای تو بوسم ۔۔۔ در سجدہ فُتَم، خاکِ قدمہای تو بوسم ①
ہر جا کہ تو روزے نَفَسے جای گرفتی ۔۔۔ آنجا روم و گریہ کُناں جای تو بوسم
روی تو تصوّر کنم و لالہ و گل را ۔۔۔ در حسرتِ رخسارِ دل آرای تو بوسم
ہر جا کہ غزالیست، چو مجنوں سرِ چشمش ۔۔۔ در آرزوی نرگسِ شہلای تو بوسم
من اہلِ درویش، تو آں شاہِ بُتانی ۔۔۔ دستیکہ ببوسم، بہ تمنّای تو بوسم

اور کبھی صبح سے پھرتے پھرتے، قریبِ شام بادِلِ ناکام اُسی جنگل میں پھر آتی، یہ غزل زبان پر لاتی، جُراَت:

بہ شکلِ مہر ہے گردش ہی ہم کو سارے دن
جو تم پھر آؤ تو پیارے، پھریں ہمارے دن ②
نہیں ہے تیرے مریضانِ ہجر کا چارہ
اب اپنی زیست کے بھرتے ہیں یہ بچارے، دن
یہ وصل کیونکے مُبدّل ہوں ہجر کے ایّام
مگر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دن
رہے تھا جب کہ ہم آغوش مجھ سے وہ پیارا
عجب مزے کی تھیں راتیں، عجب تھے پیارے دن
کب اُس سے ہوگی ملاقات، میں یہ پوچھوں ہوں
ذرا تو دیکھ نجومی! مرے ستارے، دن
لگایا روگ جوانی میں کیوں میاں جُراَت
ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن

رات کو بہ حالِ بے قرار وہ سوگوار ناچار گھبرا آتی۔ تمام شب کراہ کراہ، سب کو جگاتی اور یہ سُناتی، اُستاد:

حرام نیند کی، اِقرارِ وصلِ جاناں نے ①
الٰہی! کوئی کسی کا اُمیدوار نہ ہو

وہ رات جسے شبِ فُرقت کہتے ہیں، بے چینی سے پہاڑ ہو جاتی؛ تو وہ غم کی ماری سخت گھبراتی، یہ لب پر لاتی، اُستاد:

جیسا شبِ عشرت کو فلک! تو نے گھٹایا ②
کی جلد نہ فرقت کی، ستم گر، سحر ایسی!

ہے ہے! آج نہ صدائے مُرغِ سحر آئی، نہ مؤذن نے ندائے اَللّٰہُ اَکبَر سُنائی۔ نہ خوابِ غفلت سے پاسبان کم بخت چونکا اور نیند کی جھونک میں، گھڑیالی بھی گجر کا بجانا بھول گیا۔ جُرأت:

تھے شبِ وصل یہ سب جان کے کھانے والے ③
آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے!

شب کو نالہ تھا، دن کو زاری تھی؛ دن رات اُس پر سخت بھاری تھے۔ لوگ کہتے تھے: ملکہ! اللہ کو یاد کرو، کبھی تو دل کو شاد کرو۔ شافیِ مُطلق تمھارے مَرضِ مُفارقت کو بہ صحتِ وَصل بدل کرے؛ اب رُوزِ وِصال، عنایتِ ذُوالجلال سے قریب ہے؛ تو اُس وقت بہ حسرت یہ کہتی، اُستاد:

شبِ وِصال جو قسمت میں ہے، تو ہووے گی ①
دُعا کرو، شبِ فرقت تو یہ سحر ہووے

نظم:

مریضِ ہجر کو صحت سے اب تو کام نہیں — اگرچہ صبح کو یہ بچ گیا تو شام نہیں ②
رکھو وَیا نہ رکھو مرہم اِس پہ، ہم سمجھے — ہمارے زخمِ جُدائی کو اِلتیام نہیں
کیا جو وعدۂ شب اُس نے، دن پہاڑ ہوا — یہ دیکھیو مری شامت کہ ہوتی شام نہیں
وہی اُٹھائے مجھے، جس نے مجھ کو قتل کیا — کہ بہتر اِس سے مرے خون کا انتقام نہیں
اُٹھایا داغِ گُل، افسوس، تم نے دل پہ سرورؔ — میں تم سے کہتا تھا، گلشن کو کچھ قیام نہیں

اُستاد:

آخر شبِ وصال کی جا، پیش کی وہی ③
ہر دن تھا اے فلک مجھے جس رات کا خیال

مُعاملاتِ عشق دیکھیے: وہاں شہ زادے کو غم سے فراغ، کیفیتِ باغ، گُل عِذار بغل میں، راحت و آرام؛ یہاں ملکہ آتشِ فراق سے بادِلِ پُر داغ، آشُفتہ دماغ، خارِ غم جگر میں، گرفتارِ رنج و آلام۔ لیکن دردِ دلِ بے قرار، نالۂ جگر اَفگار رایگاں نہیں جاتا۔ جب تڑپ بلبل کے دل میں زیادہ ہوتی ہے، موسمِ گُل آتا ہے۔ اِسی طرح سوزِ دلِ عاشق جو حد سے فزوں ہو، معشوق رحم کھاتا ہے۔ بھولا ہو، یاد آئے۔ وگر ہجر میں پھڑک کر مرجائے، مطلوب کو نعش پر لائے، اُس کی بھی جان گنواتا ہے۔ حضرتِ عشق دشمنِ جانِ عاشق و معشوق ہیں، اِن کا حال کیا کہیں!

چُناں چہ یہ نَقل، ضَربُ المَثَل ہے اور حقیقت میں اَصَل ہے۔ چشمِ عبرت بیں اور گوشِ شنوا اِس کے دیکھنے اور سُننے کو درکار ہے، نیرنگیِ عشق کا اظہار ہے۔

نَقل سوداگر کی بیٹی کی۔ انگریز کا آنا، فَریفتہ ہو جانا؛ آخر کو جان دینا دونوں کا۔

کلکتے میں ایک سوداگر تھا عالی شان۔ مَتاعِ ہر دِیار، تُحفۂ جوار جوار دُکان میں فَراواں۔ اُس کی بیٹی تھی حسین، مہر طَلعَت، ماہ جَبیں، سیمیں تَن، کافرِ فَرنگ، غارت گرِ لندن۔ غَرَض کہ اَور تو اَسباب سب طَرح کا دُکان میں تھا، مگر گھر میں وہ زُودِ رَقَم، طُرفہ تُوم تھی۔ فَرنگ سے ہِند تک اُس کے حُسن کا چرچا تھا۔ رُوم سے شام تک اور بَنبئی سے سُورَت تک اُس کی صورت کی دھوم تھی۔ اُستاد:

ہے رَخنہ سازِ ایمان وہ زادۂ فَرنگی①
اِسلام اب کہاں ہے، عاصیؔ، فَرامِش ہے

ہزاروں انگریز، پرہیز کرتے، اُس پر شیفتہ و بے تاب تھے۔ لاکھوں مسلمان سَرگرداں، خَستہ و خراب تھے۔ جب ہَوا کھانے کو سوار ہو کر آتی تھی؛ راہ میں دو رویہ خَلقَت کی جان، اُس کی ہَوا خواہی میں برباد جاتی تھی۔ گَبر و تَرسا اُس کا کلمہ پڑھتے تھے، یَہُود و نَصارٰی اُس کا دَم بھرتے تھے، مسلمان دل و جاں نذر کرتے تھے۔ مُؤلّف:

اُس لُعبتِ فرنگ کو دکھلا کے قاشِ دل
کہتا ہوں : چکھو ، یہ دلِ بریاں کا توس ہے

اِتّفاقِ زمانہ ، کوئی انگریز لندن سے تازہ وارِد ہوا جلیلُ القدر ، ذی شان ، خوب صورت ، نوجوان ؛ شورِ عشقِ سودا خیز سر میں ، سوز دل میں ؛ مزاج بے شر ، بے قراری آب و گِل میں ۔ تیر :

تھا طرح دار آپ بھی ، لیکن ①
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بِن

قضارا ، وہ آفت کا مارا کچھ اسباب لینے اُس کی کوٹھی میں آیا اور اُس غارت گرِ دین و ایمانِ ہر گبر و مسلماں سے دوچار ہوا ۔ عشق گلے کا ہار ہوا ۔ دیکھتے ہی متاعِ عقل ، اثاثِ ہوش و حواس گرہ سے کھو بیٹھا ۔ دل سے ہاتھ دھو ، دمِ نقدِ جان کو رو بیٹھا ۔ اسباب خریدنے گیا تھا ، سودا مول لیا ۔ اُس نے مشتری سمجھ ، میزانِ محبت میں تول لیا ۔ ہاتھ پاؤں نے سست ، دل نے ہمت ہاری ؛ دِن دِیے لُٹ گیا عشق کا بیپاری ۔ جب اور کچھ تدبیر بن نہ آئی ، خرید و فروخت کے حیلے میں آمد و رفت بڑھائی ۔ پھر تو یہ حال ہوا ، جرأت :

دِن میں سو سو بار اب ہم اُن کے گھر جانے لگے ②
منہ چھپانے وہ لگے ، ہم اُن پہ مرجانے لگے

سلف سے آج تک عشق چھپا نہیں ، مشہور ہے ۔ اِس مقدمے میں انسان مجبور ہے ۔ میر :

(1) عشقِ بے پردہ جب فسانہ ہوا مضطرب کدخدائے خانہ ہوا

جب یہ اَمرِ مُفَصَّل سوداگر کے گوش زد ہوا، بہ پاسِ نام و نشان خوفِ ذِلّت و رُسوائی کا اَز حد ہوا۔ پہلے دونوں کو نصیحت کی، پَند کیا؛ پھر سلسلۂ آمد و رفت قطع، دیکھا بھالی کا رخنہ بند کیا۔ اُدھر شُعلۂ عشق نے بھڑک کر تاب و تواں و شکیب و تحمُّل کو ہیزمِ خُشک کی طرح جلا دیا، عقل کا چراغ بُجھا دیا، صبر کا قافلہ لُٹ گیا، دامنِ ضبط ناتواں کے ہاتھ سے چُھٹ گیا، بے چارے صاحب کو چند عرصے میں سلامت نہ رکھا۔ میر:

(2)
بسترِ خاک پر گرا یہ زار درد کا گھر ہوا دلِ بیمار
خاطر اَفگار، خار خار ہوئی جان، تمنّا کشِ نگار ہوئی
دل نہ سمجھا اور اضطراب کیا شوق نے کام کو خراب کیا
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے لگے اُڑنے جگر کے پرکالے

یہاں تک تپِ مُہاجرت اور دردِ مُفارقت سے حال درہم و برہم ہوا کہ صاحب بہادر شکستِ فاش اُٹھا کے صاحبِ فراش ہوا؛ دل و جگر سینے میں پاش پاش ہوا۔ حس و حرکت کی طاقت نہ رہی، لینے کے دینے پڑ گئے۔ اُستاد:

(3)
مرض یہ پھیل پڑا ہے تپِ جدائی سے
کہ پیٹھ لگ گئی یاروں کی چارپائی سے

جو جو اُس کے یار، مونس و غم گسار تھے، نصیحت و پند، قید و بند کرنے لگے۔ عورتوں کی بے وفائی، بتوں کی سنگ دلی، معشوقوں کی

کج ادائی بہت مُشرَّح سمجھائی؛ سود مند نہ ہوئی، خاطر میں نہ آئی۔ اُن سب میں ایک اُس دشمنِ جان کا شفیق دغم خوار، وفا شعار تھا؛ کہنے لگا: کیوں جویائے مرگ ہوا ہے! ظالم، یہ کیا کرتا ہے! اے ناداں، عدوے دل، بدخواہِ جان! اِس کا انجام ذِلّت ہے۔ حاصل اِس کا خفّت ہے۔ یہ خیالِ محال اپنے دل سے نکال۔ زورقِ زندگانی، سفینۂ نوجوانی دیدہ و دانستہ وَرطۂ ہلاکت میں نہ ڈال۔ اپنے کس و کو پر نظر کر۔ لِلّٰہ دلِ خود رفتہ کو سنبھال۔ تو نے پسرِ مجسّٹن کی حکایت نہیں سُنی کہ اُس پر کیا گزری! یہ سُن کے، وہ حزیں بادلِ غمگیں پوچھنے لگا: کیونکر ہے؟

حالِ خُسراں مآل مجسّٹن کے بیٹے کا۔ سفر کو جانا، راہ میں جہازوں کا غرق ہو جانا۔ پھر تختے کے سہارے سے پہنچنا کنارے پر، فریفتہ ہونا ایک ماہ پارے پر۔ لڑکوں کا پیدا ہونا۔ پھر تفرقہ، اور خفّت کا مبتلا ہونا۔

وہ بولا: اِسی شہر میں ایک شخص تھا مجسّٹن نام۔ نہایت اہلِ دِوَل، مرفّہ حال۔ صاحبِ علم و فضل، جامعِ ہر کمال۔ طبیب و ادیبِ بے بدل۔ سخن سنج، لطیفہ گو برمحل۔ کمالات میں یگانۂ روزگار۔ تجارت میں نامورِ ہر دیار۔ سو سو جہاز ایک ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ نصیب ایسا جاگتا تھا مٹّی کو چھوتا، سونا ہاتھ آتا تھا۔ کسی طرح کا خواہش مند، بجز فرزندِ ارجمند

نہ تھا۔ دُعا، دوا، خیرات تک بند نہ تھا۔ شب و روز اِس کا خیال تھا۔ مُدام فُرحت میں یہ ملال تھا۔ ہزاروں رنج لاولدی کے سہتا تھا؛ مگر صابر ایسا تھا کہ خدا کے سوا کسی بندے سے کچھ نہ کہتا تھا۔

خوش قسمتوں کی دُعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنّاے دل حُصول ہوتی ہے۔ چھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا حسبِ دل خواہ، صورت میں غیرتِ ماہ۔ بہت شادان ہوکے سرگرمِ پرورش ہوا۔ ایک عالم اُس کی صورت دیکھ کے غش ہوا۔ جب بارہ برس کا سن ہوا، نشیب و فراز دیکھنے کا دن ہوا؛ بہ سببِ طبعِ رسا و تعلیمِ اُستادانِ باذکا جمیع علوم، سب فنون میں یکتاے زمانہ مشہور ہوا۔ ماں کو خوشی، باپ کو سُرور ہوا۔ درس دینے لگا، مطب کرنے لگا؛ اوروں کو تعلیم سب کرنے لگا۔ چودھویں برس باپ سے سفر کی اِجازت چاہی، کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے، والدین کو حاصلِ مشقّت دکھائے۔ محسن نے کہا: اپنا بھی یہی قصد تھا؛ مگر چندے توقّف کرو، ابھی ناتجربہ کار ہو۔ اُس نے عرض کی: حضور عمرِ طبعی کو پہنچے، مُسن ہیں؛ فدوی کے سیاحت اور سفر کے یہی دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بہ قیدِ حیات سفر کو جاؤں، گرم و سردِ زمانہ دیکھوں، جودتِ طبع سب کو دکھاؤں۔

آخر محسن نے دس بارہ جہاز پُر متاع و مال، اور کچھ رفیقِ قدیم کارگزار، دیانت دار، امانت شعار ہمراہ کر رخصت کیا۔ نشیب و فرازِ دوراں، نیرنگیِ جہاں سے آگاہ کر دیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے۔ دو مہینے کے بعد ہواے جورِ گردوں سے سرنگوں ہوکے تباہ ہوگئے۔ محسن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوب گیا۔ یارانِ ہمراہی عالمِ بقا کو راہی ہوئے، کچھ طُعمۂ نہنگ و ماہی ہوئے۔ یہ ایک تختے پر ڈوبتا اُترتا بہہ چلا۔ حیاتِ مستعار باقی تھی؛ ساتویں دن بہتا پھرتا تختہ کنارے پر لگا۔ غش سے جو افاقہ ہوا؛ آنکھیں کھولیں، سر اُٹھایا، تختے کو

گھاٹ پر پایا۔ بہ ہر کیف اُترا۔ کچھ گھانس لا، رسّی بنا، وہ تختۂ کشتیِ شکستہ پتھر سے اَٹکا دیا۔ پھر آپ بہ تلاشِ آب و دانہ روانہ ہوا۔ تھوڑی مسافت بہ صد آفت طے کی۔ شہرِ عظیمُ الشّان بہت آبادان نمود ہوا۔ آہستہ آہستہ، بیٹھتا اُٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجیب سانحہ، طُرفہ ماجرا نظر آیا: دُکان ہر ایک وا، اَشرفی روپے کا ڈھیر جا بہ جا، اسباب سب طرح کا نایاب موجود؛ مگر آدمی کا پتا مفقود۔ اِس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنسِ بشر سے خالی ہے۔ ویرانِ مطلق ہے، شہر کا وارث ہے نہ والی ہے۔ پھرتا پھرتا قلعے میں آیا۔ باغ سرسبز، پُرمیوہ؛ بیچ میں بنگلا، زربفت کے نفیس پردے پڑے ہوئے، در و دیوار میں جواہرِ بیش بہا قرینے سے جڑے ہوئے۔ پردہ اُٹھا بنگلے میں گیا۔ پلنگ جواہر نگار گُستردہ، اُس پر بہ شکلِ مُردہ ایک شخص دوپٹّا تانے، نہ کوئی پائینتی نہ سرہانے، پڑا ہے۔ اِس نے دوپٹّا جو سرکایا، وہ عورت تھی۔ نیند سے چونک پڑی، سر اُٹھایا، متعجب ہو کے اِس کی صورت دیکھی، متأسف ہو کے یہ سنایا کہ اے عزیز! اپنی جوانی پر رحم کر۔ یہ مکان نہیں، سیلِ فنا ہے؛ تو نا آشنا ہے۔ اِس سے درگزر، وگرنہ آفت کا مبتلا ہوگا، خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا! اِس نے کہا: ایسا ماجرا کیا ہے، بیان تو کر۔ عورت نے کہا: پہلے تو اپنے یہاں آنے کا حال سنا کہ کیوں کر آ پھنسا۔ اِس نے کہا: ہفتہ گزرا بے دانہ و آب، خستہ و خراب ہوں؛ جو کچھ کھاؤں، تو داستان پریشانی کی سناؤں۔ عورت بولی: مدّت کے بعد کھانے کا نام تیرے مُنھ سے سنا ہے؛ سو کھانا یہاں کہاں، بجز غم کھانے کے اور پانی، سوا اَشک بہانے کے۔ آنسو پینے کا نام ہے، اِس سے نہیں پیتی ہوں اور کھانے کی قسم سے قسم تک نہیں کھاتی۔ متحیر ہوں کیوں کر جیتی ہوں! مگر تنہائی میں ہاں، خوف کھا کے، روز دِن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شبِ اوّلینِ گور ہے، جان کنی رہتی ہے؛ سخت جانی کی

بدولت نہیں مرتی ہوں۔ جرأت:

یہ غلط کہتے ہیں، بے آب و خورش جیتے ہیں ①   لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں

تو اِس باغ میں جا، جس میوے پر رغبتِ خاطر ہو، کھا۔ محسن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا، نہر سے پانی پیا۔ گونہ رنجِ فاقہ کشی سے اِفاقہ ہوا۔ پھر عورت کے پاس بنگلے میں آ کے حسب و نسب اپنا اور باعثِ سفر، جہاز کی تباہی کی مفصل سرگذشت سُنائی۔ پھر اُس کا ماجرا پوچھا۔ وہ بولی: اے شخص! اِس شہرِ بے چراغ کی میں شہزادی ہوں۔ باپ میرا اِس ملک کا حاکم تھا۔ چھوٹا بڑا یہاں کا شاد و خرم تھا۔ باپ جو تاج دار تھا، مجھ کو مشغلۂ سیر و شکار تھا۔ ایک روز لبِ دریا مصروفِ تماشا بیٹھی تھی، دفعتاً ایک سانپ پانی سے نکل کے میری طرف بڑھا۔ میں نے اُس کو تیر مارا۔ معلوم نہیں لگا، یا خطا کر گیا۔ پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب بہ شکلِ عجیب جھپٹا آتا ہے۔ میں تو ڈر، گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی۔ جو جو ہمراہِ رکاب تھے، طعمۂ دہنِ مارِ خوں خوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں، ساکنانِ شہر مع بادشاہ، انسان سے تا حیوان، کوئی نہ بچا، سب ہلاک ہوئے، تہِ خاک ہوئے؛ فقط میں سخت جان باقی ہوں۔ اور یہ صحبت ہے کہ قریبِ شام وہ مارِ خوں آشام آ کر اِس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے؛ دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے، اِسی باغ سے میوہ کھا، پانی پیتی ہوں، اِس خرابی سے جیتی ہوں۔ کوئی غم خوار بجز ذاتِ پروردگار نہ تھا، جس کو حالِ زار سُناتی۔ اِتنے دنوں میں آج تجھے دیکھا، خوفِ خدا آیا، مطلع کر دیا۔

پسرِ محسن نے کہا: خاطرِ پریشاں جمع رکھ؛ اگر فضلِ الٰہی مددگار ہے، تو جلد اُس کو فی النّار کر، تجھ کو اِس آفت سے نجات دیتا ہوں۔ یہ کہہ کے، جس جگہ سانپ کے بیٹھنے کی جگہ عورت نے بتائی تھی، وہاں گڑھا کھودا اور قلعے سے باروت لاکر، دور تک نقب سی بنا، باروت اُس میں چھڑک دی۔ پھر گھانس ہری اُس پر جمائی۔ شہ زادی نے کہا: اب وہ آتا ہی ہوگا۔ یہ جا کے سرِ نقب پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا؛ کہ دفعۃً وہ افعیِ پُر زہر، خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اُس سبز قدم نے فرشِ زمرّدیں پایا؛ بہت خوش ہو کر بیٹھا۔ یہ تو تاک میں تھا؛ پتھر سے آگ نکال، اُس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا، وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہنچا۔ دونوں نے شکر کا سجدہ بہ درگاہِ دافعُ البلیّات کیا۔ باہم بے اندیشہ و غم رہنے لگے۔ سات برس دونوں ساتھ رہے۔ اِس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے۔ ایک دن رنجِ تنہائی کی شہ زادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔ سعدی:

بہارِ عمر، ملاقاتِ دوستدارانست ①
چہ حظ برد خضر از عمرِ جاوداں تنہا

کب تک تنہائی میں بسر کریں، شامِ غم انجام رو رو کے سحر کریں۔ کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ ویران شہر آباد ہو، خاطرِ غمگیں شاد ہو۔ وہ بولا: اگر وطن جاؤں اور محسن کو یہاں لاؤں، تو یہ بستی بسے۔ عورت نے کہا: اکیلی میں کیوں کر بسر کروں گی، میں بھی ساتھ چلوں گی۔ آخر ش، ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کے چل نکلے۔

قضارا، وہاں پہنچے جہاں تختہ بندھا تھا؛ ذہن میں آیا: پیادہ پا لڑکوں کا لے چلنا محال ہے، یہ بے جا خیال ہے۔ توکلت علی اللہ کہہ کے اِسی تختے پر سوار ہو، رسی کھول دو؛ کہیں تو جا نکلو گے۔ یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے۔ وہ تختہ کھولنے لگا، شہ زادی نے کہا: مال و اسباب تو اِس قدر ہے کہ بیان میں زبان قاصر ہے؛ مگر ایک ناریل اِکسیر سے بھرا ہے، دولتِ لاانتہا ہے، رتی باون تولے کا تجربہ ہو چکا ہے۔ بہت تردد سے ظلِ سبحانی نے پایا تھا، سب سے چھپایا تھا؛ جو تو اجازت دے تو اُسے لے آؤں۔ مصرع: بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند①

مجستن کے بیٹے نے کہا: اچھا۔ وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یوں ہی رہا۔ شہ زادی لڑکا لیے اُتری۔ اِس کے اُترتے ہی ایسی تند ہوا چلی کہ رسی، تکان سے ٹوٹ گئی؛ تختہ بہ چلا۔ ہر چند اس نے ہاتھ پاؤں مارے، وہ ساحلِ مطلب سے کنارے ہوا۔ کنارے پر شہ زادی بہ حالِ خراب، دریا میں وہ بادلِ کباب بہ نکلا۔ دل سے کہتا تھا: دیکھیے، مرضیِ ناخدائے کشتیِ بادبان شکستہ کیا ہے! یہ جھونکا ہوا ہے قومِ ثمود، عاد کا ہے۔ اِس سوچ میں چلا جاتا تھا کہ ایک جہاز نمود ہوا۔ اہلِ جہاز نے جو دیکھا: تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لیے بہا جاتا ہے؛ رحم کھا، پنسوہی کو دوڑا جہاز پر لیا۔ اِتفاقِ زمانہ، مالکِ جہاز مجستن کا دوست و دم ساز تھا؛ اُس کو پہچانا، بہت تعظیم تکریم سے پیش آیا۔

برس روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا۔ جہاز کا حاکم مجستن کی ملاقات کو آیا، بچھڑے بیٹے کو باپ سے ملایا۔ یہاں جس دن

سے جہاز کی تباہی ہجستان نے سن پائی تھی، محیطِ رنج والم، غریقِ لجۂ غم تھا۔ بارے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بہ درگاہِ باری کیا، پوتا گھاتے میں ملا، اور کلماتِ شکریہ اُس سے کرنے لگا۔ اُس نے کہا: بندہ پرور! خیر ہے، دُنیا اِسی کا نام ہے۔ جس کا کام جس سے نکلے، وہ فخر و سعادت سمجھے۔

بعدِ چند روز ہجستان نے بیٹے سے روداد سفر پوچھی۔ اُس نے ابتدا سے انتہا تک حکایت، فلکِ کج رفتار کی شکایت بیان کی۔ وہ یہ سُن کر سمجھا: مشکل پیچ پڑا، مگر سہل انگاری سے یہ جواب دیا کہ اَلْخَیْرُ فِی مَا وَقَعَ خیریت اِسی میں تھی جو ہُوا۔ مصرع: بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید، بگذرد۔①

مگر یہ مقدمہ اور بیان "سرود بستاں" ہُوا۔ بیٹے نے کہا: مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلیے۔ ایسا ملکِ مالا مال، یہ دولتِ لازوال ہاتھ سے نہ دیجیے، نصیبِ دشمناں نہ کیجیے۔ ہجستان نے کہا: خیر ہے بابا جان! کیسا آنا، کیسا جانا! یہ بھی ایک فسانہ تھا جو تم نے کہا، ہم نے سنا؛ اور وہ بھی خوابِ پریشاں تھا جو تو نے دیکھا۔ اِس کو یاد رکھ، لا اَعْلَمُ:

ایّامِ وصال و صحبتِ سیم تناں
در عالمِ خواب اِحتلامے شد و رفت

بیٹے نے جواب دیا: آپ سا عقل مند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے۔ دُنیا میں تین مزے کے ہیں: زر، زمین، زن؛ یہ سامان جمع ہیں؛ اگر آپ نہ جائیں گے، فدوی تنہا جائے گا، پھر نہ آئے گا۔ ہجستان نے کہا: افسوس! ہم تجھے دانا جانتے تھے؛ اِلّا، ہماری نادانی تھی۔ حُمق کی مُقتضی

تمہاری نوجوانی تھی۔ اے بھائی! کوئی نادان سے نادان عورت کی بات کا دھیان نہیں کرتا۔ یہ باتیں جب تک تھیں، جو تم اور وہ باہم تھے۔ وہ مونس تھی، تم ہم دم تھے۔ اب خیریت ہے۔ سعدی:

زن دوست بود، ولے زمانے   تا جز تو نیافت جہر بانے
چون در بر دیگرے نشیند   خواہد کہ ترا دگر نہ بیند

مصرع: اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

ہر چند اُس نے سر پھرایا، مغز خالی کیا، یہ مقدمہ اُس پر حالی کیا، وہ بے مغز نہ سمجھا۔ مصحفی:

مصحفی! سود نصیحت کا نہیں عاشق کو
میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

ناچار مجسٹن نے کہا: تم جب تک ذلت نہ اُٹھاؤ گے اور ہمیں خراب نہ کرو گے، اِس حرکتِ بے جا سے باز نہ آؤ گے، نہ چین لو گے۔ اُسی دن مجسٹن سامانِ سفر درست کر، ساٹھ جہاز مع اسباب اور چند مشیر خوش تدبیر ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ عقل کے دشمن بیٹے کو ساتھ لیا۔ چند روز میں، ہوا جو موافق تھی، وہ جزیرہ ملا۔ جہازوں کو لنگر ہوا۔ مجسٹن کا بیٹا اُترا۔ مگر جہاں ویرانہ، بوم و غول کا آشیانہ تھا، وہاں بستی دیکھی۔ اور جس جگہ بیہڑ تھا، اُسے ہموار پایا، بلندی نظر آئی نہ پستی دیکھی۔ دشت مصفّیٰ، آدمی ہر سمت سرگرمِ کاروبار، شہر پناہ تیار۔ اِسے تعجب ہوا، سمجھا کہ میں بھول گیا۔ کسی سے پوچھا: اِس شہر کا نام کیا ہے؟ والیِ ملک کون سا ہے؟ وہ بولا: مدت سے یہ ملک

بہ سببِ آفتِ آسمانی اُجاڑ ہوگیا تھا۔ رِعایا برایا، بلکہ بادشاہ بھی نہ بچا تھا، فقط بادشاہ کی بیٹی باقی تھی۔ اب برس دن سے اُس نے شوہر کیا ہے، شہر از سرِ نو آباد ہوا، نیا طرز ایجاد ہوا۔ زمین یہاں کی زرریز، چشمے سرد و شیریں، ہوا فرحت انگیز، ٹھنڈی ہے۔ عورت نے بسایا ہے، اِس باعث سے نام اِس کا شہزادی منڈی ہے۔

مجستّن نے یہ ماجرا سُن کر بیٹے سے کہا: خوش تو بہت ہوئے ہوگے! تو سیدھے پھر چلو، یہاں نہ ٹھہرو۔ اُس نے کہا: اِتنی سفر کی صعوبت اُٹھائی، اُس کی صورت بھی نظر نہ آئی۔ دو باتیں کرلوں تو پھر چلوں۔ مجستّن نے کہا: یہ مصیبت کچھ نہ تھی، جو بات کرنے میں ایذا اُٹھے گی۔ وہ کسی کی کب مانتا تھا، عورت کو اپنے اوپر فریفتہ جانتا تھا، اُنھیں لوگوں سے پھر پوچھا: شہزادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے؟ کسی سے دوچار بھی ہوتی ہے؟ وہ بولے: روز ہر گلی کوچے میں آتی ہے، دیکھ بھال کے چلی جاتی ہے۔ غرض کہ سواری کا وقت دریافت کر، لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے سرِ راہ جا کھڑا ہوا؛ کہ شہزادی شبدیز کو تہمیز کرتی آپہنچی۔ یہ پکارا: ہم نے ایفائے وعدہ کیا، حاضر ہوئے، آئے، اور لڑکا بھی فضلِ الٰہی سے سلامت موجود ہے، ساتھ لائے؛ کیا ارشاد ہوتا ہے؟ اُس نے بے گانہ وار، جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے، گھورا؛ مگر جواب کچھ نہ دیا، چلی گئی۔ یہ خفیف گھر پھرا۔

مجستّن نے حال پوچھا، کیا گزری؟ یہ بولا: ملاقات نہ ہوئی، کل پھر جاؤں گا۔ اُس نے کہا: صبح کا جانا؛ روزِ سیاہ، شامِ غم دِکھائے گا؛ بُھور ہو جائے گی، بہت پچھتائے گا۔ اُس نے نہ مانا۔ دوسرے روز بیٹے کو سِکھایا کہ جب سواری قریب آئے، گھوڑے سے لپٹ جانا اور یہ زبان پر

لانا کہ دُنیا کا لہو سفید ہوگیا۔ مہرِ مادری سے محبّتِ پدری میں لطف زیادہ پایا کہ ہمیں ساتھ یہ آرامِ تمام لیے پھرتا ہے؛ تم بات بھی نہیں پوچھتی ہو، بلکہ پہچانتی نہیں۔ جس دم سواری قریب آئی؛ یہ تو بہت جلا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ کھیل بگڑ گیا، کہا: شاہ زادی! باگ کو رُوکو، شیروں کا نعرہ سُن لو۔ وہ خود تو رُکی تھی، باگ بھی خود بہ خود رُک گئی۔ پسرِ حُسنؔ نے اور تو کچھ نہ کیا، یہ مُسدّس شروع کیا، مؤلف:

یاد ایام، کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے ہوتی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے مگر تھا یاد، خبر تھی نہ بہانے سے تجھے
بے دھڑک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا
ہمیں ہم تھے، تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا

کبھی چوٹی کی خبر تھی نہ تھا کنگھی کا خیال بارہا اُلجھے ہی رہتے تھے ترے سُلجھے بال
پان کے لاکھے سے اور مِسّی سے ہوتا تھا ملال مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گزرا نہیں سال
ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم!
دفعتہً سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم!

تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خلطا سب ہے گرم جوشی کا بھلا کب تھا یہ لپکا سب ہے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب ہے تجھ کو لگ چلتے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب ہے
اب تو ہنسی میں کیا چھیڑ، غضب تو نے کیا
کھل گیا سب یہ ترا بھید، غضب تو نے کیا

شکر صد شکر، ہوئی جلد رہائی تجھ سے اب تو تا حشر مکدّر رہے صفائی تجھ سے
وضع اپنی نہیں، کیا کیجے بُرائی تجھ سے نہ ملیں پر جو کہے ساری خدائی، تجھ سے

بہ خُدا، ملنے سے ہم ہاتھ ترے دُھو بیٹھے
اُٹھو بس جاؤ، تمھیں کھُول کے دل رُو بیٹھے

سوچ اکثر ہے مگر دل یہ ہمارا کرتا گرچہ حیوان سے تو ربط گوارا کرتا
ایسا بدنام تو وہ بھی نہ بچارا کرتا بحرِ اُلفت سے نہ اِس طرح کنارا کرتا
مُفت لی پیارے! زمانے کی بُرائی ہم نے
سخت اوقات یہ بیہودہ گنوائی ہم نے

اب قسم کھاتا ہوں تو، دل نہ لگاؤں گا کبھی ذِلّت و رنج نہ اِس طرح اُٹھاؤں گا کبھی
گر طرح دار بھی اِس دہر میں پاؤں گا کبھی اُٹھ کھڑا ہوں گا، نہ میں پاس بٹھاؤں گا کبھی
موسم اب دل کے لگانے ہی کا، جانا، نہ رہا
رَبط کیا خاک کریں ہم، وہ زمانا نہ رہا

بَرزباں یاروں کے یہ ذکر رہے گا ہر بار گو کہ عاشق تھا، مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
دیکھ بدوَضع کیا دیکھیے ایسا انکار سر پٹک مر گئے سب، پَر نہ مِلا وہ زِنہار
کرے معشوق کسی سے تو دَغا ایسی کرے
پیچ کرے بات کی عاشق، تو بھلا ایسی کرے

یہ سن کر وہ شرمندہ ہوئی۔ پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا۔ یہ بے چارہ نادان، اُن باتوں کا سوُد و زیاں کچھ نہ سمجھا، جو کچھ باپ نے سکھایا تھا کہنے لگا۔ جب کہہ چکا، شہزادی نے تپنچہ قبوُر سے کھینچ لڑکے پر چھوڑ دیا۔ دَھم سے گر پڑا، دایۂ اَجَل نے کنارِ عاطفت میں اُٹھا، اَہلِ قبوُر سے مِلا دیا۔ پھر باگ اُٹھا چل نکلی۔ مجسٹن کے بیٹے نے بہت خاک اُڑائی،

بیٹے کی لاش باپ کو دکھائی۔ اُس نے کہا: ہماری بات جو سُنتا تو کیوں سر دُھنتا! وہ بدنصیب دشمنِ عقل بولا: صُبح اِختتام ہے، جو ہونا ہے، ہو جائے گا۔ مجسٹن نے کہا: تو اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا۔ دمِ سحر جب وہ چلا، مجسٹن کا جی نہ رہ سکا، ساتھ ہوا۔ جس دم شہ زادی کی سواری پاس آئی، باگ پکڑ لی۔ ہنوز زبان نہ ہلائی تھی، شہ زادی نے کہا: اے مجسٹن! ہم نے سُنا تھا کہ تو مردِ جہاں دیدہ، سرد و گرمِ رُوزگار چشیدہ، تجربہ رسیدہ ہے، مگر افسوس! بہ ایں ریش و فش پیرِ نابالغ ہے۔ تو نے سُنا نہیں، لاأعلم:

(1) زحادثاتِ جہاں بس ہمیں پسند آمد　　　　کہ خوب و زشت، بد و نیک در گذر دیدم

اِس پیرانہ سالی میں تجھ پر ہزار سانحے گزرے ہوں گے؛ کچھ الم و رنج کا مزہ، یا فرحت و خوشی کا نشہ باقی ہے؟ اے ناداں! دُنیائے دُوں کے معاملے بوقلموں ہیں۔ کس کس بات کو یاد کیجیے۔ کس کا غم، کس بات سے خاطر شاد کیجیے۔ اگر عقلِ رسا یا کچھ فہم و ذکا ہو، تو دُنیا میں کافی ہے یہ بات: گُذشتہ را صلٰوات۔ مصحفیؔ:

(2) اے مصحفی! ایں رُووں کیا پچھلی صحبتوں کو　　　　بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ کہہ کر گھوڑا پچکارا کہ پھر سلسلہ جُنبانی اِس اَمرِ بے معنی کی موجبِ مضرتِ جاں جاننا۔ مجسٹن نے بیٹے کو سلام کیا، اور نہ کچھ کلام کیا۔ وہ بھی نطفۂ ضعیف کا پیدا، بوڑھے باپ کا بیٹا، محجوب وطن پھرا، جیتے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی۔

یہ جملہ اُس انگریز نے تمام کر کے کہا: مطلب اِس سمع خراشی سے یہ ہے کہ آدمی وہ بات نہ کرے جس کا حصول ذِلت و خفت ہو۔ کہو اب کیا کہتے ہو؟ یہ قصہ سُن کر، وہ فرہادِ بیستونِ عشق شیریں زبانی سے یہ کہنے لگا: یہ سب میں نے سنا مگر یہ قولِ اُستاد:

کب تلک جیوں گا میں، موت اک دن آنی ہے ہجر میں جو آجاوے، عین مہربانی ہے ①

سب جلسہ سر پٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا، کہا: جب یہ جان گنوائے گا، تب جھگڑا جائے گا۔ آخر کار جب اُس کا حال رَدی ہوا، دوستوں کو چِٹھیاں لکھ کر جمع کیا، کہا: دُنیا مقامِ گُذراں ہے۔ جو ہے، رواں دَواں ہے۔ کل اِس مقام سے ہمارا کوچ ہے۔ یہ سَرا سَراسَر پُوچ ہے۔ اگر ہماری وصیّت بجا لاؤ گے، دُنیا میں نام، حشر کو بہ خیر انجام ہوگا۔ سب نے اِقرار کیا کہ سرِ مُو اِس میں کمی بیشی نہ ہوگی، مطلق عاقبت اندیشی نہ ہوگی، جو جی میں ہو شوق سے کہو۔ اُس نے کہا: بعدِ اِنتقال ہمارا جنازہ تکلّف کا بنا کر بجرے کی چھت پر صندوقِ نَعش دھر، باجے بجاتے، ہمارے معشوق کی کوٹھی جو لبِ دریا ہے، دارِ فنا ہے، اُس کے نیچے سے لے جانا۔ اور دل میں یہ کہتا تھا، اُستاد:

ساتھ وہ میرے جنازے کے لَحد تک آئے ②
اے اَجَل! تیرا قدم مجھ کو مبارک ہووے

قصہ مختصر، اُسی شب کو تڑپ کر اُس مریضِ فرقت کا ہجر میں وِصال ہوا، سرائے فانی سے انتقال ہوا۔ گویا:

مرنے کو بھی لوگ کہتے ہیں وِصال ③
یہ اگر سچ ہے تو مر جاتے ہیں ہم

مؤلّف: مر کے حاصل کیا فرقت ہی میں تو نامِ وِصال
جان دی ہم نے، مٹایا ہے خَلِش ہجراں کا

صبح کو یہ خبر عام ہوئی کہ سوداگر بچّے کے عاشقِ محروم، ناکام کا کام تمام ہوا،

مرگیا۔ شُدہ شُدہ سوداگر کو اور اُس ماہ پیکر کو یہ حال معلوم ہوا۔ جذبِ محبّت سے حال تغیر ہوا، مگر ضبط سے کام لیا، دلِ بے قرار کو تھام لیا۔ انگریز جمع ہو، بہ صد پریشانی وصیّت بجا لائے۔ جنازہ درست کر، بجرے کی چھت پر دھر، لباس سب نے سیاہ کیا، نالہ و فریاد کرکے حال تباہ کیا۔ سر ننگے، غُل مچاتے، باجے بجاتے چلے۔ عجب سانحہ تھا کہ ہزارہا زن و مرد کنارے کنارے گریاں چلا آتا تھا۔ صندوقِ نعش کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُسی دن سے آج تک اندوہ میں دریا دریا اشک بحرِ عمّاں کی چشم سے رواں ہے، مثلِ سیماب بے قرارانہ دواں ہے۔ اور جسے احباب حباب کہتے ہیں، یہ فرطِ قلق سے ہر محیط کی چھاتی میں پھپھولا پڑتا ہے اور پھوٹتا ہے، موجوں سے تلاطم نہیں چھوٹتا ہے۔ ماہیانِ بحر کا خنجرِ الم سے خنجر یعنی گلا زخم دار ہے، سنانِ غم سینے کے پار ہے۔ ساکنانِ دریا کو بس کہ شمشیرِ عشق کا خوف و خطر ہے، اِس ڈر سے ہر سنگ پشت کی پُشت پر سپر ہے۔

جس وقت اِس حالِ خراب سے جنازہ اُس کی کوٹھی تلے آیا اور فرنگیوں نے شور و غُل زیادہ مچایا، اُس زندۂ جاوید نے بہ آوازِ بلند سُنایا، اُستاد:

اے فلک! آخر ہی پھیرا ہے، نہ ہو تجھ سے گر اور ①
اُس کے کوچے میں جنازہ مرا سنگین تو ہو

اُس وقت وہ ماہ سیما کششِ دل اور تپشِ متّصل سے مطّلع ہو، دیوانہ وار

بے قرار کوٹھے پر چڑھی اور بے تابانہ پوچھا کہ یہ لاشِ دِل خراش کس جگر پاش پاش کی ہے کہ حاجبانِ بارگاہِ عشق سے صدا "دُور باش دُور باش" کی ہے۔ وہ سب بولے : عجب ماجرا ہے! یہ کُشتہ تمھارا ہے۔ رنجِ مُفارقت نے آپ کے اِسے بے اَجَل مارا ہے۔ افسوس کہ اِس بےکَس نے جان دی اور تم کو مُطلق خبر نہ ہوئی! اور کسی شخص نے عَمداً اُسے سُنا کر یہ شعر پڑھا، جُرأت :

مُکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے ①
سبھوں سے پوچھتا ہے : کس نے اِس کو مار ڈالا ہے؟

یہ باتیں سُن کر، سر دُھن کر؛ دَفعتہً نعرۂ جاں سوز، آہِ دِل دُوز سینۂ بِریاں سے کھینچ، آتشِ غیرت میں بھُن کر کُود پڑی۔ عشق کا نشانہ دیکھیے : صندوقِ نعش پر گر، ٹکڑے ٹکڑے مِثلِ جگرِ عاشقِ زار ہو، خوابِ مرگ میں سو، بختِ خُفتۂ عاشق جگایا؛ کششِ محبّت نے اِس طرح بچھڑوں کو مِلایا۔ دیکھنے والے تھرّا گئے، دل گُدازوں کو غش آ گئے۔ شہر میں یہ چرچا گھر گھر ہوا، مُنتزلوں یہ اَخبار مُشتَہر ہوا۔ اُس کے ماں باپ نے بہت سی خاک سر پر اُڑا، دونوں کو پیوندِ زمیں کیا۔ اِس عشقِ فتنہ انگیز نے کیا کیا نہیں کیا! تہِ خاک ہجر کے ماروں کو، بے قراروں کو قرار آیا۔ ہزارہا شخص دیکھنے کو سَرِ مزار آیا، مطابِقِ قولِ میر تقی :

حیرتِ کارِ عشق سے، مردُم | شکلِ تصویر، آپ میں تھے گُم ②
کام میں اپنے عشق یکّا ہے | ہاں، یہ نیرنگ ساز یکّا ہے

جس کے ہو التفات اُس کی، نصیب ہے وہ جہانِ چند روز، غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے
کون محرمِ وصل یہاں سے گیا کہ نہ یارِ اُس کا اِس جہان سے گیا
اپنی قدرت جہاں دکھاتا ہے اِس سے جو کچھ کہو سو آتا ہے

پھر یہاں سے خامۂ مصیبت نگار حالِ ملکۂ زار لکھتا ہے کہ آخر جی بتنگ ہوا، تپِ دوری سے یہ ڈھنگ ہوا، اُستاد:

① لگے زمین پر اب سب اُتارنے ہم کو یہ دن دکھائے ترے انتظار نے ہم کو
فراق میں ترے، بن موت اب تو مارا ہے تڑپ تڑپ کے، دلِ بے قرار نے ہم کو
جب اپنا، آہ، دمِ نزع کنٹھ بیٹھ گیا تم آئے بالیں پر اُس دم پکارنے ہم کو

صبح سے تا شام ٹکٹکی جانبِ در، دستِ تاسّف برسر اور دیوانوں کی طرح یہ کلمہ زبان پر، اُستاد:

زبس کہ رہتا ہے آنے کا اُس کے دھیان لگا ②
صدائے در پہ ہے دَر پردہ اپنا کان لگا
بہ یادِ زُلف، نہ تا دُودِ آہ سب پہ کھلے
مَیں مُنہ پہ اِس لیے رہتا ہوں پیچوان لگا
ہزار خار ہوئے تجھ سے، عندلیب! یہاں
یہ بے ثبات چمن ہے، نہ آشیان لگا

آخر کثرتِ انتظار سے نظر کمی کرنے لگی۔ اور جانِ زار، تڑپنے سے دلِ بے قرار کے، برہمی کرنے لگی۔ یہ نوبت ہوئی، شعر:

③ گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

اُس وقت کشش محبتِ ملکۂ مہر نگار نے جانِ عالم کے دل کو بے چین کیا، خیال آیا کہ خدا جانے صدمۂ فرقت سے اُس کا کیا حال ہوگا! دل نے کہا: جینا وبال ہوگا۔ گھبرا کر دست پاچہ ہوا، عیش و نشاط بھولا؛ یہ تازہ گُل پھولا۔ انجمن آرا سے کہا: زیادہ طاقتِ مفارقتِ احباب دلِ بے تاب کو، اور گوارا دوریِ وطن مجھ خستہ تن کو نہیں؛ آج بادشاہ سے رُخصت خواہ ہوں گا۔ وہ بہ ہر حال اِطاعت اور رضا اِس کی جمیع اُمور پر مُقدّم جانتی تھی، کہا: مجھے بھی تمنّائے سیرِ کوہ و بیاباں، بے بیاں ہے۔

شہزادہ موافقِ معمول دربار میں آیا اور سلسلۂ سخن بہ طلبِ رخصتِ وطن کھول کے، عزمِ بالجزم سنایا۔ بادشاہ محزون و غم ناک ہو فرمانے لگا: یہ کیا کہا، جو کلیجا مُنہ کو آنے لگا! جانِ من! تابِ جدائی نہیں، رخصتِ بادیہ پیمائی نہیں۔ اگر خواہشِ سیر ہے، تو فضا اِس نواح کی جا بہ جا مشہور ہے۔ خزانہ موجود، فوج فرماں بردار، مُلک حاضر، میری جان نثار؛ اگر منظور ہے۔ حکمِ سفر، اجازتِ دوری بہت دور ہے۔

جانِ عالم نے دست بستہ عرض کی: اے شہریارِ باوقار، پُرتمکیں! برس دِن میں حضور کو مجھ غمگیں سے یہ محبت ہوئی کہ مال، مُلک، سلطنت، بلکہ جان تک دریغ نہیں؛ وائے برحالِ مادر و پدرِ سوختہ جگر! جنھوں نے لاکھ منّتوں، کرور مُرادوں سے، دن کو دن، نہ رات کو رات جان کر، سولہ سترہ برس دُنیا کی خاک

چھان کر مجھ کو پالا۔ شومیِ طالع، وَلولۂ طبیعت نے گھر سے نکالا۔ اب مُدّتِ مَدید، عَرصۂ بَعید گزرا، انھیں میرے جینے مرنے کا حال معلوم نہیں۔ اُن کے صدمے کو غور کیجیے، رُخصت بہ ہر طَور کیجیے۔ آدمیّت سے بَعید ہے: آپ عَیش و نَشاط کرے، ماں باپ کو رنج و تَعَب میں چھوڑ دے، سَررِشتۂ اِطاعتِ والِدین توڑ دے۔ اُمّیدوار ہوں اِس اَمر میں حُضور کَد نہ کریں، بہ کُشادہ پیشانی اِجازتِ وَطَن دیں۔ اگر حَیاتِ مُستعار، زیستِ ناپائدار باقی ہے؛ پھر شَرَفِ آستاں بوس حاصل کروں گا؛ نہیں تو اِس فِکر میں گھُٹ گھُٹ کر مروں گا۔ دین برباد ہوگا، دُنیا میں عزّت و آبرو نہ رہے گی۔ خدا ناخوش ہوگا؛ خَلقت تَن پَرور، راحت طَلَب کہے گی۔

بادشاہ سمجھا یہ اب نہ رُکے گا، آنسو آنکھوں میں بھر کر کہا: خَیر بابا! مرضیِ خُدا، جو تیری رَضا؛ مگر تیّاریِ سامانِ سفر کو چالیس دن کی مہلت چاہیے۔ جانِ عالَم نے یہ بات قبول کی۔ یہ تو رُخصت ہو کر گھر آیا، خبرداروں نے اِس حال کا خاص و عام میں چرچا مچایا۔ خُلاصہ یہ کہ شُدہ شُدہ غُلغُلہ گھر گھر ہوا۔ خُرد و کلاں، بوڑھا اور جوان شہر کا اِس خبر سے باخبر ہوا۔

عزمِ وطن شاہ زادۂ جانِ عالَم کا، حال بادشاہ کے رنج و غم کا۔ تیّاریِ سامانِ سفر بہ صد کَرّ و فَر۔

بادشاہ کا دور سے نظارہ، ترقیِ اندوہ سے گریبانِ صبر پارہ پارہ۔ اہلِ شہر کی گریہ وزاری، آمدِ سواری۔

نظم:

چل اے توسنِ خامہ چالاک و چُست
کہ اب بیٹھے بیٹھے، بہت جی ہے سُست
جگہ بیٹھ رہنے کی دُنیا نہیں
یہاں خاک بیٹھے کوئی دِل حزیں
سفر ہر نفس سب کو رہتا ہے یاں
سرائے فنا بھی عجب ہے مکاں
نہ بیٹھا کبھی جم کے اک جا سُرور
قریبوں سے اپنے رہا دور دور

طے کنندگانِ مُلکِ معانی و سیّاحانِ اِقلیمِ خوش بیانی؛ بادیہ پیمایانِ بے توشہ، بارِ محبت برسر؛ راہ نوردانِ ہوش باختہ، بے راہ بر؛ یادِ دِل دار دردِل، دین و دُنیا فراموش؛ اَلَم ہمراہ، ہرگام نالہ و آہ، تصوّرِ یار ہم آغوش لکھتے ہیں کہ اُس عازمِ سمتِ معشوقِ عاشق خصال کو چلّہ وہیں گزرا، سامانِ سفر تیّار ہوا، اب صُبح کو اُس چلّہ نشینِ حُجرۂ محبت کی رُخصت ٹھہری۔ سرِ شام بادِلِ ناکام، بادشاہ دامنِ سحر کی صورت گریبان چاک کر، مع ارکانِ سلطنت دو کوس شہر سے باہر سرِ راہ دامنِ کوہ پر جا بیٹھا۔ وزیرِ خوش تدبیر سے فرمایا: تم شہ زادے کو رُخصت کرو؛ ہم یہاں سے جلوسِ سواری، سامانِ سفر دیکھ لیں گے۔

یہ خبر اہلِ شہر کو معلوم ہوئی۔ تمام خلقت، پانچ برس کا لڑکا، پچانوے برس کا بوڑھا، رنڈی، مرد، دوسرے ٹیکرے پر جمع ہوا۔ جھٹپٹے وقت جانِ عالم نے سواری طلب کی۔ ہرکاروں نے حضور میں عرض کی۔ بادشاہ راہ کی طرف متوجہ ہوا۔ روشنی نمود ہوئی۔ پلٹنیں آئیں سجی سجائیں۔ توپ خانہ گزرا۔ پھر بارہ ہزار ہاتھی سواری کا، ہودج و عماری کا۔ ہزار بارہ سے جنگی، گاڑھا، مست، ایک سے ایک زبردست، چاروں جھٹیاں ٹپکتیں، بان، پٹے سونڈوں میں چڑھے، بھسونڈے رنگے، جواہرنگار چوڑی دانتوں پر، طلائی نقرئی زنجیریں کھنکتیں، جھولیں زربفت کی نئی نئی، رتے کلابتون کے، ہیکلیں جڑاؤ، مغرق گجگاہیں پڑیں، سری سلمے ستارے کی، پنکھے کا جوبن، ہوا پر دیکھنے والوں کی نگاہیں لڑیں، دو رویہ اس انداز کے کہ اگر اصحابِ فیل انھیں دیکھتا، خوف کھاتا، کبھی کعبہ ڈھانے نہ آتا۔

فیل بان زربفت کی قبا یا کمخواب کی پہنے، جوڑے دار پگڑیاں باندھے۔ کمر میں پیش قبض یا کٹار، ہاتھوں میں گجباگ جواہرنگار۔ مستوں کے ساتھ دو بوڑی بردار۔ ایک چرکٹا سنڈا، ہاتھ میں ڈنڈا۔ دو برچھے والے، دیکھے بھالے، آگے۔ پیچھے ترئیل، قریب سانٹھ مار، برابر دو سوار۔

پھر کئی لاکھ سواروں کے پرے، ہاتھیوں سے پرے پرے۔ سر سے تا پا لوہے کے دریا میں ڈوبے۔ بیس اکیس برس کا

ہر شخص کا سن۔ شباب کی راتیں، جوانی کے دن۔ خُود، بکتر، زِرہ پہنے، بائیں دہنے۔ چار آئینۂ فولادی میں ہر دم بروئے ہر رگ معائنہ کرتے، بل سے قدم دھرتے۔ ہاتھوں میں داستانے، خانہ جنگوں کے بانے۔ دو تلواریں: ایک قاشِ زین میں، دوسری ڈاب میں، سیلِ فنا آب میں۔ تپنچے کی جوڑیاں قبوُر میں۔ نشۂ بہادری سے سُرور میں۔ کمر میں قرولی یا کٹار آب دار، سپر پُشت پر، برچھا ہاتھ میں، تیکھاپن ہر بات میں۔ مثلِ نہنگانِ بحرِ ہیجا و شیرانِ کُنامِ وغا، موچھوں کو تاو دیتے، ہر بار نُوک کی لیتے۔ گھوڑے وہ خوش خرام کہ سمندِ سبز فام جن کا قدم دیکھ کے آج تک چال بھولا ہے۔ دیکھنے والے کہتے تھے: چمن رواں کیا پھلا پھولا ہے۔ دو صفیں باندھے ہوئے، بیچ میں بیچ شاخِ رُوش، گھوڑے کُداتے، جوبن دِکھاتے چلے گئے۔

پھر ہزار بارہ سے سانڈنی سوار خوش رفتار۔ زرد زرد قبائیں دربر، سُرخ پگڑیاں سر پر، آبی بانات کے پاجامے پاؤں میں۔ ہتھیار لگائے، مُہاریں اُٹھائے ستاروں کی چھاؤں میں۔ سانڈنیوں میں دو دو سے کوس کا دم، ہر قدم گھنگرو کی چھم چھم۔ بختیِ فلک اب تلک بلبلاتا ہے، جب اُن کا دھیان آتا ہے۔

قدم قدم یہ جب بڑھے تو سواری کے خاص خاصے نظر آئے: عربی، ترکی، تازی، عراقی، یمنی اور کاٹھیاوار کا دکھنی۔ وہ وہ گھوڑا جو ابلقِ لیل و نہار کی نظر سے نہیں گزرا۔ سبک رَو ایسے کہ جو دریا میں در آئیں: سوار بجرے کا مزہ لوٹیں، سُم کے تلے حباب

نہ ٹوٹیں۔ ہڈا نہ موتڑا، نہ رس کا خلل۔ ڈانک اجاڑ نہ کھونٹا اکھاڑ، ساپنین نہ ناگن، عقرب نہ ارجل۔ شب کور نہیں، منہ زور نہیں، کم خور، نہ منتھا نہ کھوٹا، بال بھونری سے صاف۔ حشری نہ کمری، گھٹنہ لنگ نہیں، سینے کا تنگ نہیں، ہمہ تن اوصاف۔ کسی پر جڑاؤ زین بندھا، الماس، زمرد کے ہرنے، کسی پر چارجامہ دوالگو کسا۔ بنا بنا کر زمین پر پاؤں دھرتے، کودتے پھاندتے، لمبیاں بھرتے۔ کسی کی فقط گردنی اُلٹی، موتیوں کی جھالر لٹکتی۔ گنڈا، پٹا، ساز، یراق جواہر نگار۔ دمچی طرح دار۔ پرِ ہما کی کلغی لگی۔ پاکھر پُر تکلف پٹھوں پر پڑی۔ دوگاما، گام، شہ گام، پویا، ایلیا، رہوار، دُلکی کا منجا، اُلیل کرتا۔ جلودار جنوّر لیے مشغول تگس رانی میں۔ ہم رکاب تپائی بردار معقول سرگرم جان فشانی میں۔ باگ ڈوریں پُر زر سائیس لے کر نکلے۔

اُن کے بعد نوبت نشان، ماہی مراتب، میگھ ڈمبر۔ آگے علم اژدہا پیکر، جلو میں نصرت و ظفر۔ بڑا جلوس، نہایت کرّ و فر۔ نوبت کی ندا، جھانجھ کی جھانجھ سے صدا۔ قرنا کا شور و غل، شہنا بین بھیروں، بھاس کے سُر بالکل۔ نقیب اور چوبداروں کی آواز پُر سوز و گداز۔ عجب کیفیت کا عالم تھا۔ اُدھر نقارہ ہائے شتری اور فیلی سے گوشِ کروبیاں کر ہوا جاتا تھا۔ ایک طرف شہر کے لڑکوں کا غول "بجا دے بجا دے" کا غل مچاتا چلا آتا تھا۔ میر سوز:

کہے تو، مہر و مہ لے کر عصائے نور ہاتھوں میں (1)
یہی کہتے تھے گردوں پر: ادب سے اور تفاوت سے

پھر شکار کا سامان میر شکار لائے۔ بازِ آہنی چنگال، باز بچے تیز بال۔ بحری، باشے کے تماشے۔ شاہینِ فولاد مخلب، عقابِ فلک سیر، جہان کے طیر سب۔ اُن کے قریب وِلایتی کتّے۔ بودار، گلڈانگ، تازی، جاں بازی کرنے والے۔ چیتے، جو دشمنوں کا بُرا چیتے، بلکہ لہو پیتے۔ سیاہ گوش در آغوش۔ ہرن لڑنے والے، خانہ زاد، گھر کے پالے۔ اِن کے بعد ہزار ہا سقّا، خواجہ خضر کا دم بھرتا، چھڑکاو کرتا۔ کمریں کھاروے کی لُنگیاں، شانوں پر بادلے کی جھنڈیاں۔ مشکوں میں بید مُشک بھرا، دہانے میں ہزارے کا فوّارہ چڑھا، آب پاشی کرتا۔

مُتعدّد غلام بادلہ پوش، حلقہ بہ گوش، ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے پڑے، منقل، انگیٹھیاں سونے چاندی کی لیے، عنبر و عود جھونکتے نکلے۔ پھر تو کوسوں تک جنگل رشکِ خُتن و تاتار مثلِ طبلۂ عطّار ہوگیا۔ اُن کے متصل دو ہزار لالٹین والے کم سن، بلّور کی صاف صاف شفّاف لالٹینیں لیے، شمعِ مومی و کافوری روشن، وہ سب غنچہ دہن، زیبِ انجمن، بڑھے۔ پھر صداے اہتمامِ نقیبانِ خوش گلو چار سو بلند ہوئی اور صُبحِ صادق نے جلوہ دکھایا، ہاتھ کو ہاتھ اور اپنے بیگانے کا منہ صاف نظر آیا۔ سلطانِ اَریکۂ زنگاری بھی دریچۂ مشرق سے سر نکال، مشغولِ نظّارہ ہوا، حسرت میں وطن آوارہ ہوا۔

وہ دمِ سحر نسیم و صبا کی فرفر۔ شمع کا جھلملا جھلملا اُداس جلنا، سواری کا آہستہ آہستہ چلنا۔ پہاڑی جانوروں کی سیر،

ذکرِ حق میں کہیں وحش، کسی جا طیر۔ سر سبز درخت لہلہے، پھول رنگ برنگ کے ڈہڈہے۔ سقّوں کی آب پاشی۔ صدائے نالۂ مرغ خوش الحان سے دل خراشی۔ خسروِ انجم کا مع ثابت و سیارہ چھپتے جانا، سورج کی کرن کا جگمگانا۔ پھولوں کی بُو باس، چشمۂ سرد و شیریں آس پاس۔ خلق کا مجمع دامنِ کوہ پر، سب کی نگاہ کبھی اُس کیفیت پر، گاہ اِس انبوہ پر۔ اِدھر مسافروں کی کثرت، اُدھر بادشاہ پُر ارمان۔ خلقِ خدا باحسرت بہ چشمِ انتظار، اُمید وارِ آمدِ پیادہ و سوار، محوِ تماشائے عجیبِ روزگار تھی۔

یکایک غول خاص برداروں کا آیا: کمخواب کے مرزائی، انگرکھے، گجراتی مشروع کے گھٹنے، دلّی کے ناگوری پاؤں میں، سر پر گلنار اینٹھے طرح دار۔ خاصیوں کے غلاف باناتی، سقرلاتی، باغ و بہار۔ گرد پوش ململ کے۔ سینگڑے اور ساز مطلّا، جھلا جھل کے۔ رفل: چقماق، توڑے دار۔ قرابین، شیر بچے، جس سے شیر زندہ نہ بچے: جواہر نگار۔ اور برچھے بردار، بان دار، کتّے والے، ییکے، بیش قرار درماہے دار، راکب و مرکب جھمکڑے کا عالم، گرداگرد۔ بیچ میں شہزادہ جانِ عالم اسپِ باد رفتار پر سوار۔ برابر انجمن آرا کا سُکھپال پری تمثال۔ ہزاریاں نئے کہاریاں حور وش، پیاری پیاریاں، کم سن، جسم گدرایا، شباب چھایا، زربفت و اطلس کے لہنگے، مسالا ٹنکا، ململ کے دوپٹے باریک، بنت گوکھرو کی کرتی انگیا،

کاشانی مخمل کی کُرتیاں کندھوں پر، کچھ سُکھپال اُٹھائے، باقی پَرا جمائے اِدھر اُدھر۔ جڑاؤ کڑے ملائم ہاتھوں میں پڑے، پاؤں میں سونے کے تین تین چھڑے، کانوں میں سادی سادی بالیاں، نشۂ حُسن میں متوالیاں۔ رُخساروں کا عکس جو پڑ جاتا تھا، شرم سے کُندن کا رنگ زرد نظر آتا تھا۔ کسی کا کان جو آلا تھا، تو حُسن کی دُکان میں ناز و انداز کا نرخ دو بالا تھا، اندازِ ناز نرالا تھا۔ وہ آہستہ تیوری چڑھا کے پاؤں رکھنا۔ کبھی سِسکی، جھجکی۔ بڑی سیر تھی۔

کئی سے سواری کا دوڑنے والا خواجہ سرا، عجیب عجیب طرح کا نَس کٹا۔ جلّشنیں، قلماقنیں، ترکنیں سرگرمِ اہتمام، کبک خرام۔ خواجہ سرایانِ ذی لیاقت، معقول، نوّاب ناظر، داروغہ سب حاضر، عُمدہ پوشاک پہنے گھوڑوں پر سوار بندوبست میں مشغول۔ جریب زمین پر پڑتی، کوس کا پہیا ساتھ؛ ہاتھوں ہاتھ زمین کی پیمایش، سواری کی آرایش۔ خلاصہ یہ کہ بہ مرتبہ کرّ و فر، نہایت دھوم دھام۔ اَشرفی، روپیہ تصدّق ہوتا، شُہدوں کا اِزدحام۔ اِس صورت سے بادشاہ کے پاس آ پہنچے۔ جانِ عالم نے دیکھا: ظلِّ سُبحانی کے چشمۂ چشم سے جوئے خوں جاری، ہچکی لگی، بے قراری طاری ہے؛ گھوڑے سے کود کر آدابِ تسلیمات بجا لایا۔ بادشاہ نے بہ تبسّم فرمایا: اِس وقت ہمارے پاس نہ آؤ، خُدا کو سونپا، چلے جاؤ۔ مجبور، شہزادہ مُجرا کر کے سوار ہوا۔ جس دم جانِ عالم نے گھوڑا بڑھایا، تمام خلقت کا جی بھر آیا۔ علی الخصوص بادشاہ کی بے قراری، امیر اُمرا کی نالہ و زاری اور انجمن آرا کے بَین سے، تمام تماشائی شور و شین سے واویلا مچا کہنے لگے: آج رونقِ شہر کی رُخصت ہے، زینتِ سلطنت کی فرقت ہے۔ ایسے مہر و ماہ کے جانے سے شہر میں غدر پڑے گا، اندھیر ہو جائے گا۔ اِن کا اَلَمِ جُدائی و رنجِ دہشت پیمائی ہزار روزِ سیہ، شامِ غم دکھائے گا۔ کہتے ہیں: سیکڑوں

مرد و رنڈی بے کہے سُنے ہمراہ ہوئے۔ غریبُ الوطنی اختیار کی، وہاں کی بود و باش گوارا نہ ہوئی۔

اِن کے بعد پیچھے سات سے پالکی، نالکی، چنڈول، محافہ امیرزادیوں کا اور اَنیسوں، جلیسوں کی تین چار سے کھڑکھڑیا اور فنس قیمت کا بڑھیا۔ آتو اور محل داروں کے جو پہلے سے پہلے مغلانیوں کی منجھولیاں۔ خاص خواصوں کے پیچھے پیش خدمتوں کا دو تین سو میانہ۔ ہزار نو سے رتھ اکبرآبادی، دو بُجے سایبان دار، نئے مغرق پردے چمکتے، ناگوری بیل، جو نُورِ فلک نے نہ دیکھے تھے، جُتے، مخمل کی جھولیں پڑیں، لونڈیاں، باندیاں، اَنا، چھوچھو، چھٹی نویس باری دارنیاں اُن پر چڑھیں۔

جب یہ آگے بڑھیں، پھر چھکڑے اور اونٹ، ہاتھی خزانے اور اسباب کے، ڈیرے، پیش خیمے لدے لدائے، کسے کسائے، چھکڑے نظر آئے۔ غرض کہ تا شام بہیر بُنگاہ، بازاری سرکاری سب لوگ چلے گئے۔ لکھا ہے کہ روپے اور اشرفیاں امام ضامن کی دمِ رُخصت اتنی آئیں کہ بازوؤں پر بندھ نہ سکیں، تمام راہ سیّد مسافروں نے پائیں۔ اور کلچھوں کا یہ حال ہوا کہ اُن کا لے چلنا مُحال ہوا۔ راتب کے سوا، ہاتھیوں کو ملے اور اہلِ لشکر کو بانٹ دیے۔ کھجوریں جو بٹ نہ سکیں، راہ میں پھینک دیں۔ وہ اُگیں، اُس کے درخت آگے کم تھے، اُس دن سے جنگل ہو گئے۔

اُس وقت بادشاہ سراسیمہ و بدحواس باحالِ یاس دولت سرا میں پھر آیا۔ وہ بسا بسایا شہر لُٹا، اُجڑا، ویران نظر آیا۔ بازار

میں جا بہ جا چراغ گُل، سرِ شام پگڑی غائب، اندھیرا بالکل۔ جس طرف دیکھا، لوگ تھکے ماندے پھر کر پڑے تھے۔ بازار میں تختے لگے، ٹٹّر جڑے تھے۔ لوگ سوزِ مفارقت سے دردمند، دکانیں بند۔ جو جہاں پڑا تھا، شہ زادے کی رخصت کا ذکر کر رہا تھا۔ دو شخص اگر باہم تھے، بادلِ پُرغم تھے۔ کوئی سوتا تھا، کوئی چپکا پڑا روتا تھا۔ بستی سنسان، بازار میں سنّاٹا، خلقِ خدا اندوہ کی مبتلا۔ بادشاہ کو دونا قلق ہوا، رنگ فق ہوا، دل سینے میں شق ہوا۔ محل سرا میں آیا، وہاں بھی چھوٹے بڑے کو غمگین پایا۔ لوگوں کے عزیز جدا ہو گئے، سب اُس یوسفِ رفتہ کے زندانِ فراق میں اسیرِ بلا ہو گئے۔ علی الخصوص انجمن آرا کی ماں، جس کی نظر سے وہ چاند سورج چھپ گئے؛ زمانہ آنکھ میں تیرہ و تار، دل غم سے خار خار، حیرت میں نقشِ دیوار ہو رہی تھی۔ آنکھوں پر زور تھا، زار زار رو رہی تھی۔ بادشاہ نے سمجھایا، ہاتھ مُنہ دُھلوایا، کچھ کھلایا۔

یہ تو سب نالہ بہ لب، آہ دَر دِل؛ جانِ عالم اور انجمن آرا رُو بہ منزل۔ پانچ پانچ کوس کا کوچ، دو چار دن کے بعد ایک دو مقام بہ راحت و آرام کرتے چلے۔ فوجِ ظفر موج ساتھ۔ اُردوئے معلّیٰ کا عجب عالم تھا۔ ایک شہر روز ہمراہ، جہان کی نعمت تیار شام و پگاہ۔ صرّاف، بزّاز، جوہری؛ روپیہ پیسہ، اشرفی کھری سے کھری؛ ڈھاکے کا ریزہ، بنارس کا گلبدن، گجرات کا کمخواب؛ الماس و زمرّد، یاقوتِ احمر؛ جو چاہو سو لو، موجود۔ ایک طرف قصّاب اور

نانبائی، وہ کچّا گوشت لیے، یہ پکّی پکائی۔ میوہ فروش خانہ بدوش۔ حلوائی طرح طرح کی مٹھائی درست کیے۔ مینا بازار باغ و بہار۔ جُدا جُدا ہر گنج کا جھنڈا گڑا، ہر ایک منڈی کا پتا ملتا، چوپڑ کا بازار پڑا۔ جلو خانے کے رو بہ رو نصف شب گزرے تک دُکانیں کھلیں، آکاسی دیا جلتا، بھولا بھٹکا اُس کی روشنی میں آملتا۔ کوتوال سرگرم پاسبانی، بازاریوں کی نگہبانی، ترسنگا رونْد میں پھونکتا۔ غرض کہ سب خُرّم و شاداں رواں تھے؛ مگر جانِ عالم گاہ گاہ جذبِ محبّتِ ملکہ سے یہ کہتا، شعر:

بساماںِ سفر باخود دلِ رنجیدۂ دارم
بکف چیزیکہ دارم، دامنِ برچیدۂ دارم

وُرُودِ موکبِ جاہ و جلالِ شاہ زادۂ خُجستہ خِصال مُتّصِلِ باغِ فراق دیدۂ روزگار ملکۂ مہر نگار، اور بیان ملاقاتِ انجمن آرا کا، پھر نکاح ملکہ کا۔

مشّاطۂ خامہ نے عروسِ دل فریبِ سخن کو بہ صد زیب و زینت حجلۂ بیاں میں اِس طرح جلوہ آرا کیا ہے کہ بعد قطعِ منازل و طیِّ مراحل جس روز وُرُودِ لشکرِ فیروزی اثر باکرّ و فر ملکہ مہر نگار کے باغ سے قریب ہوا، خبرداروں نے اور اخبار کے ہرکاروں نے یہ مُژدۂ جاں بخش فوراً ملکہ کو

پہنچایا کہ حضور کی عمر و دولت روز افزوں ہو، محکوم گردوں ہو؛ مبارک! شاہ زادۂ جانِ عالم تشریف لایا۔ بس کہ غمِ مفارقت سے تاب و تواں طاق، زندگی شاق تھی؛ سنتے ہی مشتاق کو غش آیا، پھر سنبھل کر فرمایا: بختِ خفتہ کب بیدار ہوتا ہے، ایسا پاؤں پھیلائے سوتا ہے! اور جو میرا دل بہلانے کو یہ کہتے ہو، تو سن لو، مؤلف:

تفریح کلفتوں کی، ترغیب ہے لاحاصل
بہلانے کی باتیں ہیں، یہ دل بھی بہلتے ہیں

چندے جو یہی لیل و نہار ہے تو قصہ فیصلہ ہے۔ تدبیر خلافِ تقدیر سراسر بے کار ہے۔ مؤلف:

گر اُس کے ہجر میں یوں ہی اندوہگیں رہے
تو ہوئے گا وصال، دِلا، یہ یقیں رہے
ہے احتیاط شرط کہ اِس چشمِ تر پر، آہ!
دامن رہے رہے نہ رہے، آستیں رہے
مدفن کا اپنے ہم کو تردّد ہو کس لیے
کوچے کی تیرے، یار، سلامت زمیں رہے
تو گلشنِ وصال کی کر سیر عندلیب!
ہم خرمنِ فراق کے بس خوشہ چیں رہے
جو جو کہ انتخاب تھے صفحے پہ دہر کے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نشاں بھی نہیں رہے

کس کی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیسا اِختلاط

ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے

چھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اُس کا اے سُرور

دم بھرتے ہم اُسی کا دمِ واپسیں رہے

اِس عرصے میں وہی خواص دل آرام نام بارہ دری سے نیچے اُتری، پھر کہا: خُدا جانے کہاں سے یہ لشکر آکر اِس دشت میں اُترا ہے! ملکہ ہنس کر بہ حیلۂ سیر خواصوں کے کندھوں پر ہاتھ دھر، ٹھنڈی سانس بھر کوٹھے پر چڑھی۔ دیکھا تو فی الحقیقت لشکرِ بے پایاں، سپاہِ فراواں، فزوں اَز حدِ شُمار و بیاں ہے۔ خیام شاہی اِستادہ ہیں، پھرتے چلتے سوار اور پیادے ہیں۔ یکایک شہزادہ جانِ عالم، بہ چند سوار، اسپِ صرصر خِرام، رخشِ تیز گام پر سوار نظر آیا، تاجِ سلطانی سر پر کج، شہریاری کی سج دھج۔ یا تو اُسے تَنِجا کُھچا، منزلوں کا مارا، دشتِ غُربت کا آوارہ دیکھا تھا، اب حِشم و خَدم، جاہ و حشم سے پایا! بدن تھرّایا، اعضا اعضا میں رعشہ ہوا، یہ زور تماشا ہوا۔ اُستاد:

آتے ہی ترے، چھُٹتا ہے رعشہ سا بدن میں①

ہر چند کہ ہیں بیٹھتے ہر لحظہ سنبھل ہم

وہ زردیِ چہرۂ پُر غم مژدۂ وصل کی سُرخی سے بدل گئی، غش سے سنبھل گئی۔ شہزادہ گھوڑے سے اُتر کے، سیدھا ملکہ کے باپ پاس گیا، جھک کر نذر دی، رسمِ سلام بجا لایا۔ اُس نے

دُعاے خَیر دے کر چھاتی سے لگایا، کہا: لِلّٰہِ الحمد تمھیں بہ صحت و عافیت اللہ نے کام یاب دِکھایا۔ پھر انجمن آرا کی سواری آئی، تسلیم بجالائی۔ پیر مرد نے فرمایا: شہ زادی! فقیر کے حال پر کرم کیا، اللہ بھلا کرے۔ اُس نے عَرض کی: کنیز مُدّت سے حضور کی صِفَت و ثَنا ظِلِّ سُبحانی کی زَبانی سُنا کرتی تھی، آج شہ زادے کی بدولت سعادتِ آستاں بُوس سے مُشرَّف ہوئی۔ دو گھڑی بیٹھی، پھر اِلتماس کیا: اگر اجازت دیجیے، ملکہ کی ملاقات سے مسرور ہوں۔ اُس حق پَرَست نے فرمایا: اِس کا پوچھنا کیا، بابا! بے تکلّف خانہ خانۂ شماست۔ جانِ عالم تو رخصت ہو کے خیمے میں آیا، انجمن آرا نے ملکہ کے مکان کا رستہ لیا۔ آنے کی خبر پیش تر ملکہ کو پہنچی تھی، سامان اُس اُجڑے مکان کا درست ہو چکا تھا۔

جب سواری اُتری، لبِ فرش لینے آئی، فَرّاشی سلام کیا۔ انجمن آرا نے گلے سے لگالیا۔ ملکہ آبدیدہ ہو کر بولی: تم نے مجھے مَحجُوب کیا۔ مَیں فقیر کی بیٹی، تم شاہ زادی۔ ہر چند شاہ و گدا دونوں بندۂ خُدا ہیں؛ اِلّا، تمھارے قدم آنکھوں پر رکھوں تو بجا ہے، آپ کے آنے سے مجھے بڑا اِفتخار حاصل ہوا ہے۔ انجمن آرا بولی: ہم نے خوب کیا۔ رنڈی! یہ چوچلے کی باتیں بیگانہ وار نہ کرتی تو کیا ہوتا! اے صاحب! ہمارے تمھارے تو رِشتۂ ہمسَری، سَررِشتۂ برابری ہے۔

اور حساب کی راہ سے، پہلی تو سلامتی سے، تمھیں ہو۔ سرکار کا اُنس ہمیں ملا ہے، پہلے مزہ آپ نے چکھا ہے، جوبن لوٹا ہے۔ غرض کہ دو دو نوکیں ہوگئیں۔ پھر اختلاط، حرف و حکایات، رمز و کنایہ میں تمام رات بسر ہوئی۔

جس وقت عروسِ شب نے مقنعۂ مغرب میں منہ چھپایا اور نوشاہِ روز مشرق سے نکل آیا؛ انجمن آرا جانِ عالم کے پاس آئی، ماجرائے شب برزباں لائی، کہا: بہ خدا اِس خُلق و مروت، سنجیدہ صفت کی عورت آج تک نہ دیکھی نہ سُنی تھی۔ دوسرے دن جانِ عالم نے ملکہ کے باپ سے عرض کیا کہ اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَی۔ اُس سالکِ راہِ حق نے ارشاد کیا: ہم اس لائق کہاں ہیں، لیکن، مصرع:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

تم قول کے پورے، اقرار کے سچے ہو۔ بسم اللہ، اپنے زمرۂ کنیزوں میں سرفراز کرو، آبرو بخشو۔ شادی کا نام لینا، منہ چڑانا ہے کہ نہ اب وہ ہم ہیں، نہ ہمارا زمانہ ہے۔ آخرش بہ طورِ شرعِ شریف ملکہ کا نکاح جانِ عالم کے ہمراہ ہوا۔ اب یہ معمول ٹھہرا: ایک شب انجمن آرا کی، دوسری رات ملکہ کی ملاقات ٹھہری؛ مگر اُن دونوں میں وہ رہ و رسم، محبت، اُلفت کی بڑھی کہ شہ زادے کی عاشقی نظر سے گر گئی، نظری ہوئی۔ اور سچ ہے: جو طرفین سے نجیب الطرفین ہوتے ہیں، اُن میں رشک و حسد، رنج و ملال دخل نہیں پاتا، شکوہ و شکایت لب تک نہیں آتا۔

کٹی جلی، ڈاہ، بُغض، عداوت، خواہ نخواہ کج بحثی، دانتا کل کل، رُوز کی تو تو مَیں مَیں چھوٹی اُمّت پر ختم ہے۔ لاکھ طرح اِنھیں سمجھاؤ، نشیب و فراز دِکھاؤ؛ لیکن اِن لوگوں سے بے جھونٹک جھانٹا گھڑی بھر چین سے رہا نہیں جاتا۔ آخر کار یہ ہوتا ہے کہ آدمی سر پکڑ کے روتا ہے۔ دو دن ایک طرح پہ صحبت بر آر نہیں آتی ہے؛ زندگی انسان کی تلخ ہوجاتی ہے۔ لاکھ طرح کا غم ہوتا ہے، ناک میں دم ہوتا ہے۔ مؤلف:

عشق میں طرفین سے الفت برابر چاہیے
جو بہ دِل بندہ ہو، اُس کو بندہ پرور چاہیے

داستانِ حیرت بیاں، رخصت شہ زادۂ باوقار کی، پیرِ مرد کا عمل بتانا، وزیر زادۂ گُم گشتہ کا اُسی روز آنا، جانِ عالم کی عنایت، اُس کا انجمن آرا پر فریفتہ ہوجانا، دعا سے شہ زادے کو بندر بنانا۔ بعدِ خرابی ملکہ کے باعث رہائی پانا۔

نظم:

مُصیبت نگار و مصائب رقم، جگر چاک و مغموم میرا قلم
زمانے کی کچھ طرز لکھتا ہے یاں، عجائب غرائب ہے یہ داستاں

مری بات یہ دل سے کرنا یقیں — کسی کا کوئی دوست مطلق نہیں
جو یہ دوست ہیں، ان سا دشمن کہیں — نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں
کیا امتحاں میں نے اکثر سرور — ضرورت کی کچھ دوستی ہے ضرور

قصہ کوتاہ، چندے شہ زادۂ والا جاہ وہاں رہا۔ ایک روز یہ سب عاشق و معشوق باہم خوش خرم بیٹھے تھے؛ جانِ عالم نے کہا: ہمیں وطن چھوڑے، عزیزوں سے منہ موڑے عرصہ ہوا؛ ہنوز دِلّی دور ہے، اب چلنا ضرور ہے۔ وہ دونوں نیک خو، رضا جو، بولیں: بہت خوب۔ اُسی روز حرفِ رخصت ملکہ کے باپ سے درمیان آیا۔ مردِ انجام بیں نے روکنا مناسب نہ جانا۔ سفر کی تیاری ہوئی۔ دمِ رخصت اِس قدر مال و اسباب، نقد و جنس وغیرہ کی قسم سے شہ زادی کو ملا کہ انجمن آرا کا جہیز بھولا اور وقتِ وداع پیر مرد نے بادلِ پُر درد جانِ عالم سے کہا: فقیر کے پاس آپ کے لائق کچھ نہ تھا جو پیش کش کرتا، مگر ایک نکتہ بتاتا ہوں، جب کہ امتحان ہوگا، خزانۂ قارون سے زیادہ کام آوے گا۔ راست، دروغ خاطر نشاں ہوگا، لطف مل جائے گا۔ پھر چند فقرے تنہا لے جا کے بتا کے، تاکید سے کہا: اگر یہ مقدمہ حقیقی بھائی سے اظہار کر دو گے، یاد رکھو، حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ صدمے سہو گے۔ زمانے کے اخوان الشیاطیں بہ ہزار کید آمادۂ کیں رہتے ہیں۔ اِسی سبب سے دانش مند زبان بند رکھتے ہیں، راز اپنا نہیں کہتے ہیں۔ یہ نکتہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے سب کو یاد ہے: دنیا میں

برادرِ حقیقی دشمنِ مادر زاد ہے۔ فرد:

بھاگ اِن بَردَہ فروشوں سے، کہاں کے بھائی[1]

بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

پھر انجمن آرا پاس آ فرمایا: شہ زادی! فقیر زادی کنیز کو عزیز جان کر، نظرِ الطاف و کرم ہر دم رکھنا۔ یہ بھی خدمت گزاری میں قصور نہ کرے گی۔ اِسے تم کو سونپا، تمھیں حافظِ حقیقی کے سپرد کیا؛ لو خدا حافظ۔ سواری دیر سے تیّار تھی۔ لوگوں پر ثابت تھا کہ کوئی اَمرِ پوشیدہ، درویشِ باوقار شہ زادے پر بہ تکرار اظہار کرتا ہے۔

اِتّفاقاتِ زمانہ، اُسی روز وہ وزیر زادہ جو وطن سے ساتھ نکل، ہرن کے پیچھے گھوڑا پھینک، دشتِ اِدبار میں شہ زادے سے جُدا ہوا تھا؛ سرگشتہ و پریشان، پھرتا پھرتا، پیادہ پا اِدھر آ نکلا۔ اُس نے جو یہ لشکرِ جرّار اور قافلہ تیّار دیکھا، پوچھا: کس کی سواری کہاں کی تیّاری ہے؟ لوگوں نے تمام جانِ عالم کا قِصّہ سنایا۔ یہ خوش ہوا، جی میں جی آیا۔ پوچھا: شہ زادہ کہاں ہے؟ وہ بولے: پیر مرد جو یہاں کا مالک ہے، کامل ہے، عامل ہے، فقیرِ سالک ہے؛ کچھ کہنے کو تنہا جُدا لے گیا ہے۔ اِس عرصے میں جانِ عالم رُخصت ہو سوار ہوا۔ سلامی کی توپ چلی، نقارہ نواز نے ڈنکے پر چوب دی۔ وزیر زادے نے ہلّڑ میں دوڑ کر مُجرا کیا۔ شہ زادے نے گھوڑے سے کود کے گلے لگایا، دیر تک نہ چھوڑا۔ اُسی دم لباسِ فاخرہ پہنا، ہمراہ سوار کیا۔ راہ

میں سرگذشتِ تفرقہ پوچھتا کہتا چلا۔ جب خیمے میں داخل ہوا، وزیر کو محل سرا میں طلب کیا۔ انجمن آرا اور ملکہ کو نذر دلوا کے، کہا: یہ وہی شخص ہے جس کا اَلَمِ مُفارَقَت مُدام دل میں کانٹا سا کھٹکتا تھا، جی سینے میں تنگ تھا، آمد و شُد میں دم اٹکتا تھا۔ دیکھو، جب اچھے دن آتے ہیں، بے تلاش بچھڑے مل جاتے ہیں۔ جس دن گردُوں نے ہمیں آوارۂ دشتِ اِدبار کیا تھا، جُدا ہر ایک دوست دار، غم خوار کیا تھا۔ اب مُساعدتِ بخت سے ایّامِ سخت دور ہوئے، باہَم ہَمجوُر ہوئے۔

وزیر زادے کا حال سُنو: انجمن آرا کا حُسن و جمالِ بے مثال دیکھ، دیوانہ ہو، ہوش و حواس، عقل کھو، نمک حرام بنا، وصل کی تدبیر میں پھنسا۔ اُستاد:

یار، اَغیار ہو گئے، اللہ!①
کیا زمانے کا اِنقِلاب ہوا

اُستاد:

خدا ملے تو ملے، آشنا نہیں ملتا②
کوئی کسی کا نہیں دوست، سب کہانی ہے

دو چار گھڑی یہ صُحبت رہی، پھر اپنے اپنے خیموں میں گئے۔ وزیر زادے کے واسطے خیمۂ عالی اِستادہ ہوا۔ پھر جتنی جَلیسیں، اَنیسیں حسیں، مَہ جَبیں دونوں شہ زادیوں کے ہمراہ تھیں، اُسے دِکھا، فرمایا: جس طرف تیری رغبت ہو، سعی کروں، دِلوا دوں۔ وہ نُطفۂ حرام اور خیال

یں تھا، یہ مُقدّمہ مطلب کے خلاف صاف صاف سمجھا، غرض کرنے لگا: میری کیا مجال ہے اور کیا تاب و طاقت ہے جو انھیں بُری نگاہ سے دیکھوں۔ جانِ عالم اِس وَضعی حرکت سے بہت رضامند ہوا کہ یہ بڑا نیک طینت، صاف باطن ہے۔ یہ اسبابِ ظاہر اِس نظر سے زیادہ مدِّ نظر ہوا، دِل میں گھر ہوا۔ تمام صُعوبتیں، حالاتِ سفر، رنجِ راہ، قریہ و شہر کا گزر شہ زادے نے بیان کیا؛ مگر جب پیر مرد کے مشورے کا ذکر آتا، ٹال جاتا۔ وہ سمجھا، کچھ اِس میں بھید ہے۔

ایک روز ملکہ مہر نگار اور انجمن آرا نے مُتّفق ہو کر جانِ عالم سے کہا: یہ نیا ماجرا ہے، ہر دم ایک شخصِ غیر اور جوان کو شریکِ صُحبت خلا مَلا رکھنا کیا مناسب ہے؟ اور دابِ سلطنت سے بھی یہ اَمر بعید ہے۔ شیطان کو انسان دور نہ جانے۔ غیر تو کیا، اپنے کا اِعتبار نہ مانے۔ جانِ عالم نے کہا: پھر ایسا کلمہ زبان پر نہ لانا۔ تم نے اِتنا نہ قیاس کیا کہ اُس نے تمھاری لونڈیوں کا پاس کیا، نہ کہ تمھارا حِفظِ مراتب۔ اور میں بھی تو ایسا بیہودہ، نادان نہ تھا جو خلافِ وَضع حرکت کرتا۔ ملکہ یہ سُن کر ہنسی، انجمن آرا سے مخاطب ہو کر کہا: برائے خُدا انصاف کیجیے، خاطر کی نہ لیجیے؛ اِن کے حُمق میں کس بے وَقوف کو تامّل ہوگا! آپ اگر عقل کے دُشمن نہ ہوتے، تو کیوں حوض میں کود کر، ساحرہ کی قید میں پھنستے، نام ڈبوتے۔ تو بھلا سچ کہو، شرمندہ نہ ہو؛ جی میں کیا سمجھے تھے جو کود پڑے؟ ذرا یہ خیال نہ آیا، غوّاصِ فکر کو محیطِ تامّل میں غوطہ زن نہ فرمایا کہ

کہاں انجمن آرا، کجا جنگل کا حوض! وہ اِس میں کیوں کر آئی! وہ از خاندانِ شاہی تھی، یا شریکِ سلسلۂ ماہی، واہی تباہی تھی!

جانِ عالم کھسیانا ہو گیا، کہا: بات اور، مسخرا پن اور۔ کہاں کا ذکر کس جگہ لا کے ملایا۔ میری حماقت کا موقع خوب تمھارے ہاتھ آیا، جس کو سند بنایا۔ یہ تو سمجھو، شعر:

عشق ازیں بسیار کرد است و کند
سبحہ را زُنّار کرد است و کند

اُستاد:

کہتے ہیں جسے عشق، وہ از قسمِ جنوں ہے[1]
کیوں کر کہ حواس اپنے میں پاتے ہیں خلل ہم

بھلا کچھ اپنی باتیں تو یاد کرو، دل میں مُنصف ہو۔ ملکہ نے کہا: دیکھا! آپ شرمائے تو یہ کہانی لائے۔ مَیں تو رنڈی ہوں، ناقص عقل میرا نام ہے، مردوں کا یہ کلام ہے۔ بھلا صاحب! اگر مجھ سے کوئی بے وقوفی کی حرکت ہو جائے، تعجب کی جا نہیں، ایسی بڑی خطا نہیں؛ لیکن شُکر کرنے کی یہ جا ہے کہ آپ کا مزاج بھی میرا ہی سا ہے۔ آخر یہ بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ مگر وہ مکّار ہر کوچ و مُقام میں وقت کا مُنتظِر تھا۔ ایک روزِ غم اندوز شہزادے کا خیمہ صحرائے باغ و بہار، دشتِ لالہ زار، مگر ہمہ تن خار خار، پُر آزار میں ہوا۔ فضائے صحرا نے کیفیت دکھائی، پھولوں کی خوش بو دماغ میں سمائی۔ جا بہ جا چشمے رواں دیکھ کے، یہ لہر آئی کہ تنہا

وزیر زادے کا ہاتھ پکڑ لبِ چشمہ جا بیٹھا۔ کشتی شراب کی طلب ہوئی۔ جس دم جانِ عالم کی آنکھوں میں سُرور آیا، اختلاط کا زبان پر مذکور آیا؛ اُس دغاشعار، پُرفن مکّار نے وقتِ تنہائی، صحبتِ بادہ پیمائی، نشے کی حالت غنیمت جانی، رونے لگا۔ شہ زادے نے ہنس کر کہا: خیر ہے! وہ بولا: جو جو شرطِ رفاقت، حقِّ خدمت دُنیا میں ہوتا ہے، غلام سب بجا لایا؛ مگر محنت و مشقّت، غریب الوطنی، دشت نوردی کا عوض خوب بھر پایا۔ جب آپ سا قدر دان بات کو چھپاوے، تو پھر اَور کسی سے کس بات کی اُمید رہے۔

جانِ عالم نشے میں انجامِ کار نہ سوچا، اُس فیلسوف کے رونے سے بے چین ہوگیا، کہا: اگر تجھے یہی اَمر ناگوار ہے تو سُن لے جو اَسرار ہے: مجھے ملکہ کے باپ نے یہ بات بتائی ہے کہ جس کے قالب میں چاہوں، اپنی رُوح لے جاؤں۔ اُس نے پوچھا: کس طرح؟ شہ زادے نے ترکیب بتا دی۔ جب وہ سب سیکھ چکا، بولا: غلام کو بے امتحان غلطی کا گُمان ہے۔ شہ زادے نے کہا: اثبات اِس بات کا بہت آسان ہے۔ اُٹھ کر جنگل کی طرف چلا۔ چند قدم بڑھ کر بندر مُردہ دیکھا، فرمایا: دیکھ مَیں اِس کے قالب میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر شہ زادہ زمین پر لیٹا، بندر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر زادے کو سب ڈھنگ یاد ہوگیا تھا؛ فوراً وہ کور نمک زمین پر گرا، اپنی رُوح جانِ عالم کے قالبِ خالی میں لا، کھڑا ہوا اور کمر سے تلوار نکال، اپنا جسم ٹکڑے

ٹکڑے کرکے دریا میں پھینک دیا۔ یہ غضب بڑا ہوا، شہزادے کا نشہ کرکرا ہوا۔ سمجھا: بڑی خطا ہوئی، از ماست کہ بر ماست، خود کردہ را علاجے نیست۔ وہ کافر بندر کے پیچھے دوڑا۔ شہ زادہ بچارا بھاگ کر درختوں کے پتّوں میں چھپا۔

پھر تو بہ دلِ جمعیِ تمام وہ نُطفۂ حرام لہو کپڑوں پر چھڑک، بے دَھڑک ملکہ کے خیمے میں گیا، رُویا پیٹا، کہا: اِس وقت ظلم کا حادثہ ہوا، مَیں وزیر زادے کے ساتھ سیر کرتا تھا؛ یکایک جنگل سے شیر نِکلا، اُسے اُٹھا لے چلا۔ ہر چند مَیں نے جاں بازی سے شیر کو تہِ شمشیر کیا، زخمی ہوا؛ مگر اُسے نہ چھوڑا، لے ہی گیا۔ ملکہ نے تأسّف کیا، سمجھایا: قضا سے کیا چارہ! یہی حیلۂ مرگ اُس کے مُقدّر میں تھا۔ پھر انجمن آرا پاس گیا، وہاں بھی یہی اِظہار کیا؛ اِلّا، گھبرایا ہوا باہر چلا گیا۔ ملکہ، انجمن آرا کے خیمے میں آئی، وزیر زادے کا مذکور آپس میں رہا؛ لیکن ملکہ کو قیافہ شناسی کا بڑا ملکہ تھا، پریشان ہوکر یہ کلمہ کہا: خُدا خیر کرے! آج بہت شُگونِ بد ہوئے تھے: صُبح سے دَہنی آنکھ پھڑکتی تھی؛ راہ میں ہرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا مُنہ تکتی تھی، اپنے سایے سے بھڑکتی تھی؛ خیمے میں اُترتے وقت کسی نے چھینکا تھا؛ خوابِ مُوحِش نماز کے وقت دیکھا تھا۔ تم بھی فضلِ الٰہی سے عقل و شعور رکھتی ہو، آج کی حرکتیں شہ زادے کی غور کرو؛

خِلافِ عادت ہیں، یا مجھی کو وَہم بے جا ہے؟ انجمن آرا نے کہا: تم جانتی ہو وزیر زادے سے محبّت کیسی تھی! رنج و اَلَم بُرا ہوتا ہے، بدحواسی میں اَور کیا ہوتا ہے۔

اَلقصہ، وہ شب ملکہ کے پاس رہنے کی تھی، اِسے اندر کا حال کیا معلوم تھا؛ طبیعت کے لگاو سے انجمن آرا کے خیمے میں گیا۔ جس وقت پہر بجا، ملکہ اِنتظار کرکے وہاں گئی۔ دیکھا شاہ زادہ مُضطرِب بیٹھا ہے۔ اِس نے پوچھا: آج کہاں آرام کروگے؟ وہ ٹھٹک کر بولا: جہاں تم کہو۔ ملکہ نے کہا: یہیں سو رہو۔ شہ زادے نے کہا: بہت خوب۔ یہ کلمہ بھی خلافِ دستور ظہور میں آیا۔ اِس کا "خوب کہنا" ملکہ نے بُرا مانا۔ انجمن آرا کا ہاتھ پکڑ اپنے خیمے میں لائی، رُدئی بیٹھی، چِلّائی۔ انجمن آرا بولی: ملکہ! خُدا کے واسطے کچھ مُفصّل بتا۔ وہ بولی: غَضَب ہوا، قسمت اُلٹ گئی، شہ زادے سے چھُٹ گئی؛ خُدا کی قسم یہ جانِ عالم نہیں۔ وہ بھی شہ زادی تھی، گو سیدھی سادی تھی، کہا: دُرست کہتی ہو، بہت سی باتیں اِس نے آج نئی کی ہیں۔ ملکہ نے کہا: خیر، اب جو ہو سو ہو، تم یہیں سو رہو۔ پھر جَسُوسنوں، تُرکَنوں سے فرمایا: ہم سوتے ہیں، تم دَرِ خیمہ پر مُسلّح جاگو؛ اِس وقت شہ زادہ کیا، اگر فرِشتہ آئے، بار نہ پائے۔ یہ خبر سُن کر وہ نامَرد ڈرا، اکیلے اَور خیمے میں جا پڑا۔ ایک ڈر دو طرف ہوتا ہے۔ ملکہ نے

کہا: دیکھا! اگر جانِ عالم ہوتا، کبھی اکیلا نہ سوتا، بے تامّل چلا آتا۔ بدمزگی کا باعث، خفگی کا سبب پوچھتا۔ اُسے کس کا ڈر تھا! اُس کا تو گھر تھا۔ انجمن آرا کہنے لگی بصورت تو وہی ہے۔ اُس وقت ملکہ نے ماجرا غیر کے قالب میں روح لے جانے کا دمِ رخصت اپنے باپ کے بتانے کا مفصّل بتایا، پھر کہا کہ شہ زادے نے وزیر زادے کو یہ حال بتایا ہے۔ آپ تو خدا جانے کس مصیبت میں مبتلا ہوا، ہم کو موذی کے چنگل میں پھنسایا ہے۔ ہمیں روزِ اوّل اُس کی چتون پر بدگمانی کا شک آیا تھا، سامنے لانے کو منع کیا تھا، سمجھایا تھا۔ وہ نادان ہمارا کہنا خاطر میں نہ لایا، اُس کا مزہ پایا۔

اَلقصّہ، وہ شب کہ شبِ اَوّلین گور تھی، رُوتے پیٹتے میں کٹی۔ انجامِ کار کا اُس نابکار کے خوف سے تردّد و تفکّر رہا کہ دیکھیے شیشۂ ناموس و ننگ سنگِ ظلم سے کیوں کر بچتا ہے! اور یہ کہتی تھیں، اُستاد:

کسے تیغِ جفائے چرخ سے اُمید ہنسنے کی ①

جو ہووے بھی تو ہاں شاید دہانِ زخم خنداں ہو

اِسی فکر و اندیشے میں صبحِ قیامت نمود ہوئی، سواری ڈیوڑھی پر موجود ہوئی، کوچ ہوا۔ خبرداروں نے اُس بتنے شہ زادے سے عرض کی: یہ سر زمینِ غضنفریہ ہے، یہاں سے پانچ کوس شہر ہے۔ حاکم وہاں کا غضنفر شاہ زرہ پوش ہے۔ سوار و پیادے کے سوا، لاکھ غلام جنگ آزمودہ، جرّار حلقہ بہ گوش ہے۔ حکم کیا: خیمہ ہمارا شہر کے قریب ہو۔ کار پرداز حسبُ الارشاد عمل میں لائے۔ جب شہ زادیاں خیمے میں داخل ہوئیں، خود آیا۔ اِدھر یہ بے چاریاں

ڈر سے بادلِ صد چاک، اُدھر ملکہ کے رُعب سے وہ بچہ بھی خوف ناک۔ ساعت بھر بیٹھ کے اُٹھ گیا۔

جب غُلغُلۂ فوج اور آمدِ لشکر وہاں کے بادشاہ نے سُنا کہ لشکرِ بے شمار، سپاہِ جرّار شہر کے مُتّصل آپہنچی؛ اُسے بہت تشویش ہوئی۔ وزیرِ خوش تدبیر کو چند تُحفے دے کر، اِستِفسارِ حال، بہ ظاہر اِستِقبال کو بھیجا؛ تا ملازمت حاصل کر کے مِن وعَن حُضور میں عرض کرے۔

وزیر حاضر ہوا۔ عَرض بیگیوں نے خبر پہنچائی۔ وہ تو دابِ سلطنت، ریاست کا رنگ، ملاقات کا ڈھنگ جانتا تھا؛ وزیرِ اعظم کا بیٹا تھا، طرزِ رزم و بزم، آئینِ صُلح و جنگ جانتا تھا؛ رُو بہ رُو طَلَب کیا۔ بعدِ ذِکر و اَذکارِ ہر شہر و دِیار، اپنا سَبَبِ آمد بہ جہتِ سیر و شکار اور اچّھا ہونا آب و ہَوا اِس جوار کا اور دیکھنا یہاں کے شہر و شَہر یار کا بیان کیا۔ دَمِ رُخصت خِلعتِ فاخِرہ وزیر کو عنایت ہوا اور بہ طرزِ دوستانہ کچھ ہَدایا بادشاہ کو روانہ کیا۔

جب وزیر اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ حُسنِ اَخلاق، دبدبۂ شوکت و صَولت، آئینِ سلطنت، رُعب و جُرأت کا اُس کے اِس رنگ ڈھنگ سے ذکر کیا کہ وہ بادشاہ بے ساختہ مُشتاق ہو کر سوار ہوا۔ خبر داروں نے اِس حال سے مُطّلع کیا۔ اَرکانِ سلطنت، وُزَرا، اُمَرا، بخشی، سپہ سالار پیشوائی کو گئے۔ جب قریب پہنچا، خود دَرِ خیمہ تک آیا۔ مُعانَقہ کر، دونوں تخت

پر جا بیٹھے۔ سلسلۂ کلامِ بلاغت نظام طرفین سے کھلا۔ وہ بھی اِس کی صورت پر غش ہو گیا، فصاحت پر آش آش کرتا رہا۔ بہ صد تکرار شہر کا مکلّف ہوا۔ جلد جلد عمارتِ شاہی سجی سجائی خالی ہوئی، اُس کو اُتارا، لشکر وہیں رہا۔ پھر حسبِ طلبِ ملکہ و انجمن آرا سرِ چوک دو محلسرا برابر خالی ہوئے؛ اُس میں وہ ناموسِ سلطان، مبتلائے بلائے بے درماں، مضطر و حیران داخل بہ صد خستہ حالی ہوئے۔

چند روز دعوت، جلسے رہے۔ جب فرصت ملی، دل میں سوچا: اگرچہ جانِ عالم بندر ہے؛ اِلّا، اُس کے جینے میں اپنی مرگ کا خوف و خطر ہے۔ ایسی تدبیر نکالیے کہ اُسے جان سے مار ڈالیے، پھر بے کھٹکے آرام صبح و شام کیجیے۔ ملکہ سے ڈرتا تھا، بہ پیر مرد کے نام لینے سے مرتا تھا، جیسے چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ سوچ کر حکم کیا: ہمیں بندر درکار ہیں؛ جو لائے گا، دس روپے پائے گا۔ اہلِ شہر ہزاروں بندر پکڑ لائے۔ جو سامنے آتا؛ بہ غور دیکھ، سر تڑواتا۔ تھوڑے عرصے میں بہت بندر ہلاک اُس سفّاک نے کیے۔ جب بندر کم ہوئے، دام بڑھے۔ بہ حدّے کہ فی بندر سو روپے مقرر ہوئے۔ دو کوس، چار کوس گرد و پیش نام و نشان نہ رہا، بندر عنقا ہو گیا۔ چناں چہ وہیں کے بھاگے ہوئے آج تک متھرا اور بندرا بن اور اودھ بنگلے میں خستہ تن ہیں۔ بلکہ اُس زمانے میں "بندرا بن" بالفتح تھا؛ اب عرصۂ دراز گزرا، وہ بندروں کی کثرت جو نہ رہی؛ اِس کثرت سے، یہ لفظ بالکسر خلقت کہنے لگی۔

غرض کہ شہر میں ہر طرف غُلغُلہ، سب کی یہی معاش ہوئی۔ ہر شخص کو بندر کی تلاش ہوئی۔ ایک چڑیمار زیرِ دیوارِ سرا، اُس بستی میں بستا تھا؛ مگر محتاج، مفلوک۔ بہ ہزار جستجو و تگاپو تمام دن کی گردش میں دس پانچ جانور جو ہاتھ آجاتے؛ دو چار پیسے کو بیچ کر جورو خصم روٹی کھاتے۔ اگر خالی پھرا، فاقے سے پیٹ بھرا۔ ایک روز اُس کی جورو کہنے لگی: تو سخت احمق ہے، دن بھر جانوروں کی فکر میں دربدر، خاک بہ سر، اُلّو سا دیوانہ ہر ایک ویرانہ جھانکتا پھرتا ہے؛ اس پر، جو روٹی ملی تو بدن پر لتّہ ثابت نہیں۔ کسی طرح اگر ہنومان کی دیا سے ایک بندر بھی ہاتھ آئے؛ تو برسوں کی فرصت ہو، دِلدّر جائے۔

لالچ تو بُرا ہوتا ہے، وہ راضی ہوا، کہا: کہیں سے آٹا لا، روٹی پکا اور جس طرح بنے، تھوڑے چنے بہم پہنچا۔ صبح بندر کی تلاش میں جاؤں گا، نصیب آزماؤں گا۔ اُس نے مانگ جانچ وہ سامان کر دیا۔ دو گھڑی رات رہے چڑیمار جال، پھٹکی پھندنک، لاسا، کمپا، چھوڑ، ٹٹی جو دھوکے کی تھی، وہ توڑ، روٹی، چنے اور رسّی لے کے چل نکلا۔ شہر سے چھ سات کوس باہر نکل، درختوں میں ڈھونڈھنے لگا۔

وہاں کا حال سُنیے: شہ زادہ جو بندر بنا تھا، اُس نے جس دن سے بندر پکڑتے لوگوں کو دیکھا تھا اور سر تڑوانے کا حال سُنا

تھا؛ بدحواس، پریشان، سراسیمہ، زیست سے یاس، حیران،
ہر طرف چھپتا پھرتا تھا کہ مبادا کوئی پکڑ لے جائے، زندگی میں خلل
آئے۔ اُس روز کئی دن کا بے دانہ و آب، خستہ و خراب، ضعف و نقاہت زنجیرِ پا تھا،
ہر قدم اُلجھ کے گرتا تھا؛ ایک درخت کے کُول میں غش ہو کر پڑا تھا۔ چڑیمار
نے دیکھا، دبے پاؤں آ کر گردن پکڑ لی۔ اُس نے آنکھ کھولی؛
گلا دستِ قضا میں پایا، جینے سے ہاتھ اُٹھایا۔ یقین ہوا: زیست
اِتنی تھی، آج پیمانۂ بقا بادۂ اجل سے لب ریز ہو کر چھلکا؛
پُکارا: اے گردُونِ دُوں! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ چڑیمار
نے کمر سے رسّی کھول مضبوط باندھا، پھر شہر کا رستہ لیا۔
تھوڑی دور چل، بندر نے کفِ افسوس مَل اُس سے کہا: اے شخص!
کیوں خونِ بے گناہ، بندۂ اللہ، راندۂ درگاہ اپنی گردن پر لیتا ہے،
مُصیبت زدے کو اور دُکھ دیتا ہے۔ وہ بولا: کیا خوب، تو باتوں
سے مجھے ڈراتا ہے! اگر دیو، بھوت، جن، آسیب، جو بلا ہے،
بلا سے؛ مگر تیرا چھوڑنا ناروا ہے۔ آج ہی تو قسمت آزمائی ہے، نعمتِ
غیر مُترقب رام جی نے دِلوائی ہے۔ تجھے بادشاہ کو دوں گا، سو روپے لوں گا،
چین کروں گا۔ یہ سُنتے ہی سُن ہو گیا، رہی سہی جان قالب سے نکل
گئی۔ ہر چند منت سماجت سے کہا: لالچ کا کام بُرا ہوتا ہے؛ کچھ کام
نہ آیا۔ چڑیمار نے جلد جلد قدم بڑھایا، قریبِ شام شاد کام گھر آیا،
جُورُو سے کہا: اچھی ساعت گھر سے گیا تھا، طائرِ مطلب بے دام و دانہ

خواہش کے جال میں پھنسا۔ یہ کہہ کر خوب ہنسا۔

دو کلمے یہ سُنیے: جس دن شہزادہ گرفتارِ بلائے تازہ ہوا، یعنی چِڑیمار کے دامِ حرص میں گرفتار ہوا؛ ملکۂ دِل گرفتہ خود بہ خود گھبرائی، رُو رُو کر یہ بیت زبان پر لائی، اُستاد:

ہوئی کیا وہ تاثیر اے آہ تیری①
تھی آگے تو کچھ بیش تر آزمائی

انجمن آرا سے کہا: تم نے سُنا، یہ کم بخت بندر پکڑوا کے سر کُھجلواتا ہے؛ یقین جانو جانِ عالم اِس ہیئت میں ہے۔ اور آج، خدا خیر کرے، صُبح سے بے طرح دِلِ ناکام کو اِضطراب ہے، جانِ زار کو پیچ و تاب ہے۔ گھر کاٹتا ہے، غم کلیجا چاٹتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے شہزادہ پکڑا گیا۔ یا کوئی اَور آفتِ تازہ، ستمِ نو بے اندازہ چرخِ کہن دِکھائے گا۔ ہنسی کے بدلے رُلائے گا۔ میر:

جس سے جی کو کمال ہو اُلفت　　جس کی جانب درست ہو نسبت②
جُنبش اُس کی پلک کو گر وھاں ہو　　دل میں یھاں کاوِش اک نمایاں ہو
یار کو دردِ چشم گر ہووے　　چشمِ عاشق لہو سے تر ہووے
وھاں دَہَن تنگ، یھاں ہے دل تنگی　　حُسن اور عشق میں ہے یک رنگی

انجمن آرا نے جھلّا کر کہا: اِس سے اور اَفزوں کیا دُنیا میں تباہی و خرابی ہو گی: شہر چھُٹا، سلطنت گئی، ماں باپ، عزیز و اَقرِبا کی جُدائی نصیب ہوئی، گھر لُٹا۔ زخمِ دل و جگر آلے پڑے ہیں، جان

کے لالے پڑے ہیں۔ مُصحفی:

مَرَضُ الموت سے کچھ کم نہیں آزار اپنا
دل میں دشمن کے بھی یارب نہ چُبھے خار اپنا

اور جس کے واسطے آوارہ و سَرگَشتہ ہوئے، یہ صدمے سہے بانحوستِ بَختِ نافَرجام، گردِشِ ایّام سے اُسے کھو بیٹھے، وطن سے ہاتھ دُھو بیٹھے۔ اب رَضِینا بہ قضا۔ مرضیِ مَولیٰ اَز ہمہ اَولیٰ۔ ناسخ:

مجھے فرقت کی اسیری سے رہائی ہوتی①
کاش عیسیٰ کے عِوَض موت ہی آئی ہوتی

ابرِ رحمت سے تو محروم رہی کشت مری
کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی

ہوں وہ غم دوست کہ سب اپنے ہی دل میں بھرتا
غمِ عالَم کی اگر اِس میں سمائی ہوتی

یہاں تو یہ باتیں تھیں، اُدھر چڑیمار کی جُورو چراغ لے کر بندر کو دیکھنے لگی۔ بندر سوچا: وہ کم بَخت بَرسَرِ رَحم نہ ہوا، کیا عجب یہ رنڈی ہے، اگر نَرم زَبانی سے مذکورِ آفتِ آسمانی سُنے اور مہربانی کرے۔ اِس خیال سے پہلے سلام کیا۔ وہ ڈَری، تو یہ کلام کیا: اے نیک بَخت! خوف نہ کر، دو باتیں میری گوشِ دل سے سُن لے۔ گنواریاں جی کی کڑی بھی ہوتی ہیں، بندر کا بولنا اَچنبھا سمجھ کر کہا: کہہ۔ وہ بولا: ہم غریبُ الوطن، گرفتارِ رنج، مُبتلائے محَن،

گھر سے دور، قید میں مجبور ہیں۔ ماں باپ نے کس کس ناز و نعم سے پالا۔ فلکِ تفرقہ پرداز نے کون کون سی مصیبت دِکھانے کو گھر سے نکالا۔ یہاں تک دَر بہ دَر حیران پریشان کر کے پردیس میں بُرے دن دکھائے کہ تیرے پاس گرِفتار ہو کر آئے۔ اُستاد:

پیدا کیا خدا نے کسی کو نہیں عبث[1]

لایا مجھی کو یاں یہ جہاں آفریں عبث

اب صُبح کو جب ہم گردن مارے جائیں گے، تب سَو روپے تمھارے ہاتھ آئیں گے۔ خونِ بے گناہ کی جزا حشر کو پاؤ گی۔ بَیکُنٹھ چھوڑ نَرک میں جاؤ گی۔ پیسہ روپیہ ہاتھ کا مَیل ہے، اس پر جو مَیل کرتی ہو، کتنے دن کھاؤ گی؟ کلنک کا ٹیکا ہے، دَھبّا اِس کا جیتے جی نہ چھوٹے گا، دھوتے دھوتے گھر بہاؤ گی۔ اگر ہمارے حال پر رحم کرو، خُدا اَور کوئی صورت کرے گا۔ سَو روپے کے بدلے تمھارا گھر اَشرفیوں سے بھرے گا۔ ہمارے قتل میں گُناہِ بے لذّت یا ایک موذی کی حسرت نکلنے کے سِوا اَور کیا فائدہ ہے؟ اگرچہ ایسا جینا، مرنے سے بُرا ہے؛ لیکن خُدا جانے اِرادۂ اَزَلی، مَشِیّتِ اِیزدی کیا ہے! ہماری تقدیر میں کیا کیا لکھا ہے! جو خدا کے نام پر نثار ہے، اللہ اُس کا ہر حال میں مُمِدّ و مددگار ہے۔ تو نے بادشاہِ یمن کا قصہ سُنا نہیں، ایک سلطنت لِلّٰہ دی، دو پائیں؛ لالچیوں کی قضا آئی، جانیں گنوائیں۔

رنڈی موم کی ناک ہوتی ہے، جب گھر گئی، جدھر پھیرا پھر گئی۔ بندر کی باتوں پر کچھ تعجب، کچھ تاسّف کر کے کہنے لگی: ہنومان جی! وہ کہانی کیسی ہے، سناؤ مہاراج۔

فسانۂ سلطانِ یمن۔ سائل کو سلطنت دے کے غریبِ دیار ہونا، سوداگر کے فریب سے شہ زادی کا کھونا۔ پھر بیٹوں کی جدائی، اپنی دشت پیمائی۔ آخر سلطنت کا مل جانا، بیٹوں کا آنا، بی بی کا پانا، پھر سوداگر کا قتل کرنا۔

بندر نے کہا: سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اُس کا مالا مال، دولت لازوال۔ بخشندۂ تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکار رہی: میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اُس کا نزدیک و دور "خدا دوست" مشہور ہوا۔ ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ اگر تو خدا دوست ہے، تو لِلّٰہ تین دن کو مجھے سلطنت کرنے دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بسم اللہ۔ جو اراکینِ سلطنت، مسند نشینِ حکومت حاضر تھے؛ بہ تاکید انھیں حکم ہوا کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتاب

سلطانی ہوگا۔ یہ فرما، وہ فرماں روا تخت سے اُٹھا، سائل جا بیٹھا، حکم رانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا: اب قصد کیا ہے؟ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔ سائل بولا: پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ ملا؛ برائے خُدا یہ تاج و تخت یک لخت مجھے بخش دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بہ رضائے خُدا یہ حکومت آپ کو مبارک ہو، مَیں بہ خوشی دے چکا۔ بادشاہت دے کر کچھ نہ ہیہات لیا؛ فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا: اِتنے دنوں سلطنت، حکومت کی؛ چندے فقیری کی کیفیت، فاقے کی لذّت دیکھیے۔ گو جاہ و حشم مفقود ہے، مگر شاہی بہ ہر کیف موجود ہے؛ الّا اِس شہر میں سے کہیں اَور چلنا فرض ہے۔ حکمِ خُدا قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ہے۔ دُنیا جائے دید ہے۔ عنایتِ خالق سے کیا بعید ہے جو کوئی اَور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا؛ بلکہ تکلّف کا لباس بھی وہ خُداشناس بار سمجھا، نہ لیا؛ جامۂ عُریانی جسم پر چُست کیا اور چل نکلا۔ نیرنگیِ سپہرِ بوقلموں، دُنیائے دوں کا یہ نقشہ ہے، مصرع:

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است ①

کل وہ سلطنت، ثروت، کرّ و فرّ، افسر و تاج؛ آج یہ مصیبت، اذیّت، دربہ در، پیادہ پا سفر، محتاج۔ کبھی دو کوس، گاہ چار کوس، بے نقّارہ و کوس، بہ ہزار رنج و تعب چلتا۔ جو کچھ میسّر

آیا، تو رُوزی ہوئی، نہیں تو رُوزہ۔ یوں ہی ہر رُوز راہ طے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی، چند روز میں ایک شہر مِلا، مسافر خانے میں بادشاہ اُترا۔ اِتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارِد ہوا۔ قافلہ باہر اُتار، تنہا گھوڑے پر سوار، سیر کرتا مہمان سرا میں وارِد ہوا۔ شہ زادی گو کہ گردِ راہ، صعوبتِ سفر کی مبتلا تھی، لیکن اچّھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدیؔ:

حاجتِ مشّاطہ نیست روی دلآرام را ①

سوداگر کی آنکھ جو پڑی، بہ یک نگاہ از خُود رفتہ ہوا، سانس سینے میں اڑی۔ بادشاہ کے قریب آ سلام کیا۔ یہ بے چارے اللہ کے ولی، وہ وَلَدُ الزِّنا شقی۔ بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اِس عرصے میں وہ غدّار حیلہ سُوچا، بہت فَسُردہ خاطِر ہو کر کہا: اے عزیز! میں تاجِر ہوں، قافلہ باہر اُترا ہے۔ میری عورت کو دردِ زِہ ہو رہا ہے۔ دائی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں۔ تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر، اِس نیک بخت کو لِلّٰہ میرے ساتھ کر دے، تا اِس کی شراکت سے اُس کو رنج سے نجات ملے، وگرنہ بندۂ خدا کا مُفت خون ہوتا ہے، آدمی کا مر جانا زبوں ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا نام سُن کر گھبرائے، بی بی سے کہا: زِہے نصیب! جو محتاجی میں کسی کی حاجت بر آئے، کام نکلے بِسْمِ اللّٰہ، دیر نہ کرو۔ اُس نے دَم نہ مارا، کھڑی ہو گئی، سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل اُس غریب سے کہا: قافلہ دور ہے، مجھے

آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے؛ آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تو جلد پہنچیں۔ وہ فلک ستائی فریب نہ جانتی تھی، سوار ہوئی۔ سوداگر نے گھوڑے پر بیٹھا، باگ اُٹھائی۔ قافلے کے پاس پہنچ کے کوچ کا حکم دیا، آپ ایک سمت گھوڑا پھینکا۔ اُس وقت اُس نیک بخت نے داد بیداد، فریاد مچائی۔ تڑپی، روئی پیٹی، چلّائی۔ آہ وزاری اِس کی، اُس بے رحم، سنگ دل کی خاطر میں نہ آئی۔

بادشاہ پہر بھر منتظر رہا، پھر خیال میں آیا: خود چلیے، دیکھیے وہاں کیا ماجرا ہوا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلا۔ ہر چند ڈھونڈھا؛ نشان کے سوا قافلے کا سُراغ نہ ملا۔ دور گردِ سیاہ اُڑتی دیکھی، جرس اور زنگ کی صدا سُنی۔ نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب؛ سب طرح کا عذاب۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار۔ نہ خدا ترس، نہ فریاد رس۔ بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ یہ کہا، مصحفی:

①
تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے، تو ہم رہے

لاچار، لڑکوں کو لے کر اُسی طرف چلا۔ چند گام چل کر اضطراب میں راہ بھول گیا۔ ایک ندی حائل پائی، مگر کشتی نہ ڈونگی نہ ملاح۔ نہ راہ سے یہ آشنا، نہ وہاں سیّاح کا گزارا۔ کنارے پر دریا کے خاک اُڑا کے، ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی تباہی پھرا، رہ برِ کامل کو پکارا؛ ساحلِ مطلب سے ہم کنار

نہ ہوا، بیڑا پار نہ ہوا۔ مگر کچھ ڈھبڈھبانے کا ڈھب تھا، گو گھاٹ کڈھب تھا؛ ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر اُٹھا، دریا میں در آیا۔ نصف پانی بہ صد گرانی طے کیا تھا؛ کنارے کا لڑکا بھیڑیا اُٹھالے چلا۔ وہ چلّایا، بادشاہ آواز سُن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مُضطرِب جو ہُوا، خود غُوطے کھانے لگا؛ لیکن زندگی باقی تھی، بہ ہر کیف کنارے پر پہنچا۔ دل میں سمجھا: بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب کے مُوا۔ نیرنگیِ فلک سے عالمِ حیرت، بی بی کے چُھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے اَلَم سے دل کباب، سلطنت دینے سے خستہ و خراب۔

اِسی پریشانی میں شُکر کرتا پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ درِ شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی، اُدھر آیا۔ اُس مُلک کا یہ دستور تھا: جب بادشاہ عازمِ اقلیمِ عدم ہوتا؛ ارکانِ سلطنت، رُؤسائے شہر وہاں آکر باز اُڑاتے تھے۔ جس کے سر پر بیٹھ جاتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چُنانچہ یہ رُوز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے، ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اِس بادشاہِ گدا صُورت کا پہنچنا، باز اِس کے سر پر آبیٹھا۔ لوگ معمول کے مُوافق حاضر ہوئے، تخت رُو بہ رُو آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا، کہا: مَیں گُم کردہ آشیاں سلطنت کے شایاں نہیں ہوں۔ میں نے اِسی عِلّت سے اپنے مرز بُومِ شُوم کو چھوڑا ہے، حکومت

سے مُنہ موڑا ہے۔ مگر وہ لوگ اِس کے سر پر باز کا بیٹھنا، عنقا سمجھ، نہ باز رہے۔ جو جو شاہیں تھے تاڑ گئے، پر ہیں پہچان گئے کہ یہ مُقرّر ہُمائے اوجِ سلطنت ہے۔ قصّہ مختصر، رگڑ جھگڑ تختِ طاؤس پر بٹھا نذریں دیں، توپ خانے میں شلّک ہوئی۔ بڑے تُزک، حشمت سے آشیانۂ سلطنت، کاشانۂ دولت میں داخل کیا۔ تمام قلمرو، نقد و جنس، اشیائے بحری و برّی اِن کے تحتِ حکومت، قبضۂ تصرّف میں آیا۔ گز، سکّے پر نام جاری ہوا۔ مُنادی نے ندا دی، دُہائی پھر گئی کہ جو ظُلم و جور کا بانی ہوگا؛ وہ لنڈورا، گردن مارا جائے گا، سزا پائے گا۔ سوز:

پَل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نشیں ①
کچھ اَچنبھا نہیں اِس کا کہ خدا قادِر ہے

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں؛ نہ اِعتمادِ سلطنت، نہ قیامِ غُربت و عُسرت۔ مرزا رفیع:

عجب نادان ہیں، جن کو ہے عُجبِ تاجِ سلطانی ②
فلک بالِ ہما کو پَل میں سونپے ہے مگس رانی

یہ سلطنت تو کرنے لگا مگر فسردہ خاطر، پژمُردہ دِل۔ بہ سببِ شرم و حیا مُفصّل حال کسی سے نہ کہتا تھا، شب و روز غمگین و اندوہ ناک پڑا رہتا تھا۔ جب وہ بُلبُلِ ہزار داستاں یعنی فرزند، شمعِ دُودماں یاد آتے تھے؛ دن کو پیشِ چشم اندھیرا ہوجاتا، ظلِّ سُبحانی کو، کو کر کے نالہ و فریاد مچاتے تھے۔

اب اُن لڑکوں کا حال سُنیے۔ جس کو بھیڑیا لیے جاتا تھا، اُدھر سے کوئی تیر انداز بہ سبک دستی آتا تھا؛ اُس نے چھڑایا۔ دوسرا جو غوطے کھاتا تھا، بلبلاتا تھا؛ اُس کو ماہی گیر نے دامِ محبّت میں اُلجھایا، کنارہ دکھایا۔ وہ دونوں لاوَلد تھے؛ اُسی شہر کے رہنے والے جہاں اِن لڑکوں کا باپ بادشاہ ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر میں لا، بہ قدرِ مقدور لڑکوں کو پرورش کرنے لگے۔ جَلّ جلالہٗ! کیا سنگِ تفرقۂ فلک نے پھینکا کہ ایک دوسرے کے سنگ نہ رہا، جُدا ہوگیا۔ چند عرصے تک بادشاہ نے ضبط کیا، آخر بیٹوں کی مُفارقت نے بے چین کیا؛ وزیر سے فرمایا: دو لڑکے قومِ شریف سے ہماری صحبت کے قابل ڈھونڈھ کے لاؤ، ہمارا دل بہلاؤ۔ وزیر نے تمام شہر کے لڑکے طلب کیے۔ حُکمِ حاکم مرگِ مُفاجات! وہ دونوں بھی آئے۔ سُبحانَ اللہ! جامعُ المتفرّقین بھی اُسی کا نام ہے، بچھڑے ملانا اُس کے رُو بہ رُو کتنا کام ہے! بس کہ صورت و سیرت دونوں کو خالق نے عطا کی تھی، شاہ زادے تھے؛ وہی وزیر کو پسند آئے، رُو بہ رُو لایا۔ بہ سببِ طولِ زمانِ مُفارقت اور تکلیف و عُسرت نقشے بدل گئے تھے، قطع اور ہو گئی تھی؛ نہ بادشاہ نے پہچانا، نہ تقاضائے سن سے لڑکوں نے باپ جانا، اور نہ یہ سمجھ آئی کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ یہ بھی قدرت نمائی ہے، باہم ہوئے مگر جُدا رہے؛ لیکن جوشِ خون سے بادشاہ کا حال دگرگوں ہوا، دونوں پر بہ محبّت تمام مصروفِ عنایت علَی الدّوام رہا۔ سب نے سُنا ہے، کامل کا یہ نکتہ ہے: کُلُّ اَمرٍ مَرھُونٌ بِاَوقَاتِہ۔ تھوڑے دن میں مُعتمَد و مُقرّب ہوئے۔

اور وہ سوداگر جَو فَروشِ گَندُم نُما، دغا کا پُتلا یہاں کے پہلے بادشاہ سے رَسائی، عَملے سے شَناسائی رکھتا تھا؛ اِس نظر سے وہ بھی اُس عورتِ ناراض کو لے کر وہاں وارِد ہوا۔ خَبرِ مَرگِ بادشاہ سُن کر مَلوُل ہوا کہ مطلب نہ حُصوُل ہوا۔ لوگوں نے کہا: بادشاہِ تازہ اُس سے زیادہ خَلیق و غریب پَرْوَر ہے۔ بہ وَساطَتِ وزیرِ اعظم تُحفہ تَحائِف لے کے حُضور میں حاضر ہوا، نَذر گُزرانی، شَرفِ عَتَبہ بُوس حاصل ہوا۔ ایک نظر تو دیکھا تھا، بادشاہ نے نہ پہچانا، نہ سوداگر نے حریف جانا؛ مگر بادشاہ اُس کو ذی اِعتبار، سَیّاحِ دِیار دِیار سمجھ بیش تر اَطراف وجَوانِب کا مذکور سُنتا تھا۔

ایک دن قریبِ شام حُضور میں حاضر تھا، بادشاہ نے فرمایا: آج کی شب گھر نہ جا، کچھ دیدہ و شنیدہ حکایت ہم کو سُنانا۔ وہ بیٹھا تو مگر مُکَدَّر، پریشان۔ بادشاہ نے تَرَدُّد کا سبب پوچھا۔ یہ باعثِ عنایت فِی الجُملہ گُستاخ ہو چلا تھا، دست بَستہ عرض کی: خانہ زاد کے پاس ایک عورتِ ناراض ہے، اُس کو فِدوی سے اِغماض ہے؛ اُس کی نگہ بانی، حفاظت بہ ذاتِ خود کرتا ہوں۔ بہ مرتبہ ڈرتا ہوں ایسا نہ ہو، نکل کے رازِ پنہاں فاش کرے، حمایتی تلاش کرے۔ حُکم ہوا: یہ مُقَدَّمہ آج ہمارے ذِمّے ہے۔ وہی لڑکے بس کہ مُعتَمَد تھے، با خاص دستہ اُن کے ہمراہ کر، پاسبانی کی تاکیدِ اَکید کی۔ لڑکے آداب بجا کے، سوداگر کے مکان پر گئے۔ باغ میں خَیمہ

برپا تھا، درِ خیمہ پر کرسی بچھا دونوں بیٹھے۔ پاسبان آس پاس پھرنے لگے۔ جب آدھی رات گزری، ایک کو نیند آنے لگی۔ دوسرے نے کہا: سونا مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کوئی فتنۂ خوابیدہ جاگے، خیمے سے کوئی چونک بھاگے۔ وہ بولا: تو ایسا فسانہ کہو جو نیند اُچٹنے کا بہانہ ہو۔ اُس نے کہا: خیر، آج ہم اپنی سرگزشت کہتے ہیں، اگر غور سے سُنو گے، نیند کیا، کئی روز بھوک پیاس پاس نہ آئے گی، عبرت ہو جائے گی۔ اے عزیزِ باتمیز! میں بادشاہِ یمن کا لعل ہوں۔ میرا باپ لِلّٰہ سلطنت سائل کو دے، مجھے اور ایک میرا چھوٹا بھائی کہ وہ تم سے بہت مشابہ تھا، اُس کو اور اپنی بی بی کو ہمراہ لے کر، غریب الوطن ہوا تھا۔ راہ میں ایک سوداگر فریب سے شہ زادی کو لے گیا، ہم دونوں بھائی ساتھ رہے۔ آگے چل کر دریا ملا۔ ناو، بیڑا کچھ نہ تھا۔ بادشاہ مجھ کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کنارِ شفقت میں اُٹھا، کندھے پر چڑھا پار چلا۔ مجھے بھیڑیے نے پکڑا۔ میرے چلّانے سے بادشاہ جو بدحواس ہوا، بھائی دوش پر سے آغوشِ دریا میں کھسک پڑا۔ خود غوطے کھانے لگا۔ پھر نہیں معلوم کیا گزرا۔ مجھے تیر انداز نے دہنِ گرگ سے چھڑایا، اب فلک اِس بادشاہ پاس لایا۔

وہ رو کر لپٹ گیا، کہا: بھائی! دریا میں ہم گرے تھے، مچھلی والوں کے باعث ترے تھے۔ پھر تو دونوں بغل گیر ہو، ایسے

چِلّائے کہ وہ عورت نیند سے چونک پڑی۔ پردے کے پاس آ کے حال پوچھنے لگی۔ اُنھوں نے ابتدا سے اِنتہا تک وہ داستانِ مُصیبت بیان کی۔ وہ پردہ اُلٹ جھٹ پٹ لڑکوں سے لپٹ گئی؛ کہا: ہم اب تک سوداگر کی قید میں مجبور ہیں، سب سے دور ہیں۔ اُسی دم یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ سواری جلد بھیجی، رو بہ رو طلب کیا۔ اُس وقت باہم دِگر سب نے پہچانا۔ فوراً سوداگر کو قید کیا۔ باقی رات مُفارَقت کی حکایات میں گزر گئی۔ صُبح دَم جلّادِ سِپہر یعنی بے مِہر مِہر جب شمشیرِ شُعاع کھینچ کر ہنگامہ پردازِ عالَم ہوا، سوداگر کو کاروانِ عَدَم کا ہَم سفر کر کے بارِ ہستی سے سُبک دُوش کیا۔

یمَن میں اخبار نویسوں نے یہ حال لکھا۔ وہاں عجب ہر بُونگ مچا تھا۔ وہ سائلِ ستم شِعار بہ درجہ ظلم پیشہ و جفا کار نکلا۔ رعیّت نالاں، اَرکانِ سلطنت ہراساں رہتے تھے، ہزاروں رنج رات دن سہتے تھے۔ جب یہ خبر وہاں پہنچی، وزیر نے بہ صلاحِ رئیسانِ شہر زہر دے کر اُسے مارا۔ تلخ کامی سے سب کو نجات ملی۔ اور عرضداشت اپنے بادشاہ کو لکھی، تمنّائے قدم بُوس تمام شہر کی تحریر کی۔ بادشاہ کے بھی مُحبّتِ وطن دل میں جُوش زن ہوئی۔ سفر کی تیّاری ہونے لگی۔ قطعہ:

حُبِّ وطن از مُلکِ سلیماں خوشتر   خارِ وطن از سُنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی میکرد   میگفت: گدا بودنِ کنعاں خوشتر

اَلقصّہ یمَن میں آیا۔ دونوں سلطنتیں قبضے میں رہیں۔

جب بندر نے فسانہ تمام کیا، پھر کہا کہ اے نیک بخت! مطلب اِس کہانی سے یہ تھا کہ جو بادشاہ عاشقِ اللہ، خُدا پر شاکر تھا، ایک

سلطنت دی، دُو پائیں۔ یہ دونوں بدبخت جو لالچی تھے، انھوں نے جانیں گنوائیں۔ قیامت تک مطعونِ خلائق رہیں گے۔ جتنے نیک ہیں؛ یہ قصہ سُن کر، بد کہیں گے۔ رنڈی اِن باتوں سے بَرسرِ رحم ہوئی، بندر کی تسکین کی، کہا: تو خاطر جمع رکھ؛ جب تک کہ جیتی ہوں، تجھے بادشاہ کو نہ دوں گی، فاقہ قبول کروں گی۔ پھر اُسے رُوٹی کھلا، پانی پلا، کھنڈری میں لِٹا، سو رہی۔

صُبح کو چڑیمار اُٹھا، بندر کے لے جانے کا قصد کیا۔ عورت نے کہا: آج اَور قسمت آزما، پھر جانور پکڑنے جا۔ جو رُوٹی میسر آئے تو کیوں اِس کی جان جائے؛ ہم پر ہتیا لگے، بدنامی آئے۔ نہیں تو کل لے جانا۔ وہ بولا: تو اِس کے دم میں آگئی۔ بندر نے کہا: ماشاءَ اللہ! رنڈی تو خدا پر شاکر ہے، تو مرد ہوکر مضطر ہے؟ پاجی تو زن مُرید ہوتے ہی ہیں، پھر وہ پٹک جھٹک، جال، پھٹکی اُٹھا، لاسا، کمپا لے؛ ٹٹی کندھے سے لگا گھر سے نکلا۔ یا تو دن بھر خراب ہوکر دو تین جانور لاتا تھا؛ اُس روز دوپہر میں پچاس ساٹھ ہاتھ آئے، پھٹکی بھر گئی۔ خوش خوش گھر پھرا۔ کئی روپے کو جانور بیچے۔ آٹا، دال، نون، تیل، لکڑی خرید، تھوڑی مٹھائی لے، بھٹی پر جاکے ٹکے کا ٹھرّا پیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جھومتے، گیت گاتے گھر کا رستہ لیا، مُفلسی کا غم یکبہ بھول گئے۔ جورو سے آتے ہی کہا: اری! ہنومان جی کے کدم

بڑے بھاگوان ہیں۔ بھگوان نے دیا کی، آج رُپیا دلوائے، اِتنے جانور ہاتھ آئے۔ وہ گھر بسی بھی بہت ہنسی۔ پہلے مٹھائی بندر کو کھلائی؛ پھر رُوٹی پکا، آپ کھا، کچھ اُسے کِھلا، پڑ رہی۔ بندر بیچارا سمجھا: چَندے پھر جان بچی، جو فلک نہ جل مرے اور اِس کا بھی رشک نہ کرے۔ مُؤلّف:

کیا شاخِ گُل پہ پھول کے بیٹھی ہے عَندلیب
ڈرتا ہوں میں، نہ چشمِ فلک کو بُرا لگے

جب لایا، بارِ یاس ہی لایا یہ، اے سُرورؔ
گاہے نہ نخلِ غم میں ثمر اِس سوا لگے

اب روز بہ روز چڑیمار کی ترقّی ہونے لگی۔ تھوڑے دنوں میں گھر بار، کپڑا لتّہ، گہنا پاتا درست ہوگیا۔ قَضارا، کوئی بڑا تاجر سَرا میں اُس بھٹیاری کے گھر میں اُترا، جس کی دیوار تلے چڑیمار رہتا تھا۔ ایک روز بعدِ نمازِ عشا سوداگر وظیفہ پڑھتا تھا؛ ناگاہ آوازِ خوب، صدائے مرغوب، جیسے لڑکا پیاری پیاری باتیں کرتا ہے، اُس کے کان میں آئی۔ بھٹیاری سے پوچھا: یہاں کون رہتا ہے؟ وہ بولی: چڑیمار۔ سوداگر نے کہا: اُس کا لڑکا خوب باتیں کرتا ہے۔ بھٹیاری بولی: لڑکا بالا تو کوئی بھی نہیں، فقط جورو خصم رہتے ہیں۔ سوداگر نے کہا: اِدھر آ، یہ کس کی آواز آتی ہے؟ بھٹیاری جو آئی، لڑکے کی آواز پائی۔ وہ بولا: اِس صدا سے بُوئے درد

پیدا ہے؛ اِس کو میرے پاس لا، باتیں کروں گا۔ کچھ لڑکے کو دوں گا اور تیرا بھی مُنھ میٹھا کروں گا۔

بھٹیاری چڑیمار کے گھر گئی۔ دیکھا: بندر باتیں کرتا ہے۔ اِسے دیکھ چُپ ہو رہا۔ وہ دونوں بھٹیاری کے پاؤں پر گر پڑے، منّت کرنے لگے، کہا: ہم نے اِسے بچّوں کی طرح پالا ہے، اپنا دُکھ ٹالا ہے۔ شہر پُر آشوب ہو رہا ہے، بندر کُش بادشاہ اُترا ہے۔ ایسا نہ ہو، یہ خبر اُڑتے اُڑتے اُسے پہنچے، بندر چھِن جائے، ہم پر خرابی آئے۔ وہ بولی: مجھے کیا کام جو ایسا کلام کروں۔ سرا میں آ کے سوداگر سے کہا: وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس نے کہا: دیوانی! ابھی وہ آواز کس کی تھی؟ یہ غور سُنیے کہ کیا معقول جواب وہ نامعقول دیتی ہے: بلّیاں لوں، بھلا مجھے کیا غرض جو کہوں: بندر بولتا ہے۔ سوداگر خوب ہنسا، پھر کہا: تو سڑن ہے، ارے بندر کہیں بولا ہے! پھر بولی: جی گریب پرور! صدقے گئی، اِسی سے تو میں بھی نہیں کہتی ہوں کہ بندر بولتا ہے، اور چڑیمار کی جورو نے بتانے کو منع کیا ہے۔ سوداگر کو سخت خلجان، بہ مرتبہ خفقان ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے! مکان قریب تھا، خود چلا گیا۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک عورت، دوسرا مردِ مچھندر، تیسرا بندر ہے۔ یقین کامل ہوا یہی بندر بولتا تھا، بھٹیاری سچّی ہے، گو عقل کی کچّی ہے۔ وہ سوداگر کو دیکھ کے بندر کو چھپانے لگے، خوف سے تھرّانے لگے۔ اِس نے کہا: بھید کھُل گیا، اب پوشیدہ کرنا اِس کا لاحاصل ہے۔ مصلحت یہی ہے، بندر

ہمیں دو۔ جو احتیاج ہو، اس کے جلدؤمیں لو۔نہیں تو بادشاہ سے اِطّلاع کروں گا۔ یہ بے چارہ مارا جائے گا، چھپانے کی علّت میں تمھارا سر اُتارا جائے گا، بُرا کیا جائے گا۔ وہ دونوں رُونے پیٹنے لگے۔ بندر سمجھا: اب جان نہیں بچتی، اِتنی ہی زیست تھی۔ چڑیمار سے کہا: اے شخص! فَلکِ کج رفتار، گردُونِ دَوّار نے اِتنی جفا پر صبر نہ کیا، یہاں بھی چین نہ دیا۔ مناسب یہی ہے رضائے اِلٰہی پر راضی ہو، مجھے حوالے کردو۔ قضا آئی، ٹلتی نہیں۔ تقدیر کے آگے کسی کی تدبیر چلتی نہیں۔ فردِ بَشَر کو حُکمِ قضا و قَدَر سے چارہ نہیں، اِس کے ٹال دینے کا یارا نہیں۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَایَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَایَسْتَقْدِمُوْنَ۔

چڑیمار نے کہا: دیکھو بندر کی ذات کیا بے وفا ہوتی ہے! ہماری محنت وَمشقّت پر نظر نہ کی، تُوتے کی طرح آنکھ پھیر لی، سوداگر کے ساتھ جانے کو راضی ہوگیا۔ بڑا آدمی جو دیکھا، ہمارے پاس رہنے کا مطلق پاس نہ کیا۔ بندر نے کہا: اگر نہ جاؤں، اپنی جان کھوؤں، تم پر خرابی لاؤں۔ آخر کار بہ ہزار گریہ و زاری سوداگر سے دونوں نے قسم لی کہ بادشاہ کو نہ دینا، اچّھی طرح پَروَرِش کرنا۔ یہ کہہ کر بندر حوالے کیا۔ سوداگر نے اِس کے عوض بہت کچھ دیا۔ بندر کو سرا میں لا، پیار کیا، بہ دل داری و نرمی حال پُوچھا۔ بندر نے یہ چند شعر حَسْبِ حال، سَودا کے، سوداگر کے رُو بہ رُو پڑھے، مرزا رفیع:

① نے بلبلِ چمن، نہ گلِ نودمیدہ ہوں — میں موسمِ بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں
گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بہ شکلِ جام — اس مے کدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا، بہ قولِ درد — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

اے عزیز! آتشِ کارواں، نقشِ پائے یارانِ رفتگاں ظاہر ہوں، مگر پنہاں ہوں بلبلِ دُور از گلزار، گم کردہ آشیاں، صیاد آمادۂ بیداد، گھات میں باغباں، کیوں کر نہ سرگرمِ فغاں ہوں۔ حضرتِ عشق کی عنایت ہے، احبابِ زمانہ کی شکایت ہے، طُرفہ حکایت ہے کہ حاجت روائے عالم، محتاج ہے۔ تخت ہے نہ افسر ہے، نہ وہ سر ہے نہ تاج ہے۔ غریبِ دیار، چرخ مؤجدِ آزار۔ شفیق و مہرباں نہیں، حالِ زار کا کوئی پُرساں نہیں۔ حیرت کا کیوں نہ مبتلا ہوں، اپنے ہاتھ سے اسیرِ دامِ بلا ہوں۔ خود گرفتارِ پنجۂ ستم ہوا، کبھی مجھے جن کا الم تھا، اب انھیں میرا غم ہوا۔ مرنے سے اس لیے ہم جی چھپاتے ہیں کہ ہمدم میرے فراق میں مُوئے جاتے ہیں۔ مجھے دامِ مکر میں اُلجھایا، دوستوں کو میرے دشمن کے پھندے میں پھنسایا، گردشِ چرخِ ستم گار سے عجب سانحۂ ہوش رُبا سامنے آیا۔ میر تقی:

② سخت مشکل ہے، سخت ہے بیداد — ایک میں خوں گرفتہ، سو جلاد
کوئی مشفق نہیں جو ہووے شفیق — نے کسی چُھٹ، نہیں ہے کوئی رفیق
آہ، جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات — ایک میں اور ہزار تصدیعات

مصرع: گویم، مشکل وگرنگویم، مشکل۔

مگر آج خوش قسمتی سے آپ سا قدرداں ہاتھ آیا ہے، اِنتشارِ طبیعت برطرف ہو تو بہ دِل جمعیِ تمام، آغاز سے تا انجام اپنی داستانِ غم، سانحۂ ستم گزارِش کروں گا۔ سوداگر کے، اِس مضمونِ درد ناک سے، آنسو نکل پڑے، سمجھا: یہ بندر نہیں، کوئی فصیح و بلیغ، عالی خاندان، والا دودمان سحر میں پھنس گیا ہے، کہا: اطمینانِ خاطر رکھ، تیری جان کے ساتھ میری جان ہے، اب زیست کا یہی سامان ہے۔ بندر کو تسکینِ کامل حاصل ہوئی۔ غزلیں پڑھیں، نقل و حکایات میں سرگرم رہا، اپنا حال پھر کچھ نہ کہا۔ تمام شب سوداگر نہ سویا، اِس کے بیانِ جان کاہ پر خوب رویا۔

اب بہت تعظیم و تکریم سے بندر رہنے لگا۔ مگر اَمرِ شُدَنی بہ ہر کیف ہُوا چاہے۔ راز فاش ہو، اگر خُدا چاہے۔ سوداگر کا یہ انداز ہوا: جو شخص نیا اِس کی ملاقات کو آتا، اُسے بندر کی باتیں سنواتا۔ اُس کو اِستعجاب سے فکر ہوتا، اِس کا ہر جگہ ذِکر ہوتا۔ آخرش، اِس کی گویائی کا چرچا کوچہ و بازار میں مچا اور یہ خبر اُس کورِ نمک، مُحسِن کُش کے گوش زد ہوئی۔ سنتے ہی سمجھا یہ وہی ہے، بعدِ مُدّت فلک نے پتا لگایا، اب ہاتھ آیا۔ فوراً چوبدار بندر کے لینے کو، سوداگر کے پاس بھیجا۔ یہ بہت گھبرایا۔ اور تو کچھ بن نہ آیا، بہ صد عجز و نیاز عرضداشت کی کہ غلام صاحبِ اولاد نہیں، اِس اندوہ میں

دلِ مُضطر شاد نہیں۔ طبیعت بہلانے کو اِسے بچّہ سا لے کر فرزندوں کی طرح بڑی مشقّت سے پالا ہے، رات دن دیکھا بھالا ہے۔ بندر ہے، مگر عنقا ہے۔ مُفارقت اِس کی خانہ زاد کی جان لے گی، آیندہ جو حضور کی مرضی۔

چوبدار یہاں سے خالی پھرا، وہ ظالمِ اَظلَم غضب میں بھرا، وہاں کے بادشاہ کو لکھا کہ اگر سلطنت اور آبادیِ مُملکت اپنی منظور ہو، سوداگر سے جلد بندر لے کر یہاں بھیج دو۔ نہیں تو اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، نام و نشان مٹا دوں گا۔ یہ خبرِ وحشت اثر سُن کے غضنفر شاہ مُتردِّد ہوا۔ مُشیرانِ خوش تدبیر، امیر وزیر سمجھانے لگے کہ خداوندِ نعمت! ایک جانور کی خاطر آدمیوں کا کُشت و خون زبوں ہے۔ حکم ہوا: کچھ لوگ سرکاری وہاں جائیں، جس طرح بنے، سوداگر سے بگڑ کر، بندر اُس کی ڈیوڑھی پر پہنچائیں۔ جب بادشاہی خاص دستہ سرا میں آیا، بندر دست بستہ یہ زبان پر لایا کہ اے مونسِ غم گُسار، وفا شعار! اِس اَجَل رسیدہ کے باب میں کدو کوشش بے کار ہے، سراسر بیجا ہے۔ قضا کا زمانہ قریب پہنچا، درِ ناکامی وا ہے۔ مبادا، کسی طرح کا رنج میری دوستی میں تمھارے دشمنوں کو پہنچے، تو مجھے حشر تک حجاب و ندامت رہے، خلقِ خدا یہ ماجرا سُن کے بُرا بھلا کہے۔ سوداگر نے کہا: اَستغفِرُاللہ، یہ کیا بات ہے! جو کہا، وہ سر کے ساتھ ہے۔

جب بادشاہ کے لوگوں کا تقاضاے شدید ہوا اور دن بہت کم رہا؛ بعدِ رَدّ و قدح، بہ معذرتِ بسیار و منّتِ بے شمار، ہزار دینار دے کے اُس شب مُہلت لی اور صُبح کے چلنے کی ٹھہری، بہ موجبِ مَثَل، مصرع:

زر بر سرِ فولاد نہی، نرم شود

اِس عرصے میں یہ حالِ تباہ، ماجراے جاں کاہ گلی کوچے میں زبانِ زدِ خاص و عام ہوا کہ ایک بندر کسی سوداگر کے پاس باتیں کرتا تھا، وہ بھی کل مارا جائے گا۔ بہ حدّے کہ اُس کُشتۂ اِنتظار، مایوسِ دل فِگار یعنی ملکہ مہر نگار کو بھی معلوم ہوا۔ وہ شیداے جانِ عالم سمجھی کہ یہ بندر نہیں، شہ زادہ ہے۔ افسوس! صد ہزار افسوس! اب کون سی تدبیر کیجیے جو اِس بے کس کی جان بچے! دل کو مَسُوس، وزیر زادے کو کوس، لوگوں سے پوچھا: دمِ سحر کدھر سے وہ سوداگر جائے گا؟ یہ تماشا ہمارے دیکھنے میں کیوں کر آئے گا؟ لوگوں نے عرض کی: حضور کے جھروکے تلے شاہراہ ہے، یہی ہر سمت کی گُذرگاہ ہے۔ یہ سُن کے تمام شب تڑپا کی، نیند نہ آئی۔ دو گھڑی رات سے برآمدے میں برآمد ہوئی اور ایک توتا پنجرے میں پاس رکھ لیا۔ گجر سے پیش تر بازار میں ہُلّڑ، تماشائیوں کا میلا سا ہو گیا۔ جس وقت تاجرِ ماہ نے متاعِ انجم کو نہاں خانۂ مغرب میں چھپایا اور خسروِ زنگیں کُلاہ نے بندرِ مشرق سے نکل کر تختِ زَنگاری پر جلوس فرمایا؛ سوداگر نمازِ صُبح پڑھ کر ہاتھی پر سوار

ہوا۔ کمر میں پیش قبض رکھ، گود میں بندر کو بٹھا، مرنے پر کمر مضبوط باندھ کر مجبور چلا۔ بندر سے کہا: پریشان نہ ہو، جب تقریر سے اور اصرافِ کثیر سے کام نہ نکلے گا، جو کچھ بن پڑے گا، وہ کروں گا۔ اپنے جیتے جی تجھے مرنے نہ دوں گا۔ قولِ مردان جان دارد۔ اور، مصرع:

بعد از سرِ من کُن فیکوں شُد، شُدہ باشد

سوداگر کا سرا سے سراسیمہ آگے بڑھنا کہ خلقت نے چار طرف سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطب ہو کے یہ کہنے لگا، میر سوز:

برقِ تپیدہ، یا شررِ بر جہیدہ ہوں
جس رنگ میں ہوں میں، غرض از خود رمیدہ ہوں (۱)

اے اہلِ بزم! میں بھی مرقع میں دہر کے
تصویر ہوں، ولے لبِ حسرت گزیدہ ہوں

صیّاد! اپنا دام اُٹھا لے کہ جوں صبا
ہوں تو چمن میں، پر گُلِ عشرت نچیدہ ہوں

اے آہ و نالہ! مجھ سے نہ آگے چلو کہ میں
بچھڑا ہوں کارواں سے، مسافر جریدہ ہوں

غم ہوں، الم ہوں، درد ہوں، سوز و گداز ہوں
سب اہلِ دل کے واسطے میں آفریدہ ہوں

صاحبو! دُنیاے دوں، نیرنگیِ زمانۂ سفلہ پرور، بوقلموں

عبرت و دید کی جا ہے۔ گرما گرم آیندہ رَوِندہ کا بازار ہے۔ کس و ناکس جنسِ ناپایدار، لہو و لعب کا خریدار ہے۔ اپنے کام میں مصروف قضا ہے۔ جو شے ہے، ایک روز فنا ہے۔ معاملاتِ قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے، یہی مسئلۂ جبر و اختیار ہے۔ کوئی کسی کی عداوت میں ہے، کوئی کسی کا شیدا ہے۔ جسے دیکھا، آزاد نہ پایا؛ کسی نہ کسی بکھیڑے میں مبتلا ہے۔ ایک کو اِتنا سوجھتا نہیں کیا لین دین ہو رہا ہے۔ سوُد کی اُمید میں سراسر زِیاں ہے؛ سِرے ہی ٹوٹنے کا سودا ہے۔ اُس کی قُدرتِ ناطقہ دیکھو: مجھ سے ناچیز، بے زبان کو یہ تکلّفِ گویائی عنایت کیا؛ تم سب کا سامعوں میں چہرہ لکھ دیا، باتیں سُننے کو ساتھ چلے آتے ہو۔ جُدائی میری شاق ہے، جو ہے وہ مشتاق ہے، حالِ زار پر رحم کھا آنسو بہاتے ہو۔ یہ رَحیمی کی صفت ہے؛ شانِ قہّاری دیکھو: اُسی تقریر کی دھوم ہے، ایک ظالمِ شوُم سے مجھ مظلوم کا مُقابلہ ہوتا ہے۔ یقینِ کامل ہے کہ وہ قتل کرے گا، بے گُناہ کے خون سے ہاتھ بھرے گا۔ سَوادُ الْوَجْہِ فِی الدّارَیْن ہوگا، تب اُسے آرام اور چین ہوگا۔ یہ گویائی، گویا پیامِ مرگ تھا۔

دُنیا جائے آزمایش ہے۔ سفیہ جانتے ہیں یہ مقام قابلِ آرام و آسایش ہے۔ دو رُوزہ زیست کی خاطر کیا کیا ساز و سامان پیدا کرتے ہیں۔ فرعونِ بےسامان ہو کے زمین پر پاؤں نہیں دھرتے

ہیں۔ جب سر کو اُٹھا آنکھ بند کرکے چلتے ہیں، خاکساروں کے سر کچلتے ہیں۔ آخر کار حسرت و ارماں فقط لے کر مرتے ہیں۔ جان اُس کی جستجو میں کھوتے ہیں جو شے ہاتھ آئے ذلّت سے، جمع ہو پریشانی و مشقت سے، پاس رہے خسّت سے، چھوٹ جائے یاس و حسرت سے۔ پھر سر پہ ہاتھ دھر کر روتے ہیں۔ صُبح کو کوئی نام نہیں لیتا ہے، جو کسی اور نے لیا تو گالیاں دیتا ہے۔ ناسخ:

دُنیا اک زالِ بیسوا ہے — بے مہر و وفا و بے حیا ہے ①
مردوں کے لیے یہ زن ہے، رہ زن — دنیا کی عدو ہے، دین کی دشمن
رہتی نہیں ایک جا پہ جم کر — پھرتی ہے بہ رنگِ نرد گھر گھر

انجامِ شاہ و گدا دو گز کفن اور تختۂ تابوت سے سوا نہیں۔ کسی نے اَدھر سا، یا محمودی کا دیا، یا تحریر کربلا، کسی کو گزہی گاڑھا میسر ہوا بہ صد کرب و بلا۔ اُس نے صندل کا تختہ لگایا، اِس نے بیر کے چیلوں میں چھپایا۔ کسی نے بعد سنگِ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مرمر کے گور گڑھا پایا۔ کسی کا مزار مُطلّا، مُنقّش، زنگار رنگ ہے۔ کسی کی، مانندِ سینۂ جاہل، گور تنگ ہے۔ حسرتِ دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرشِ خاک ہوا۔ نہ امیر سمور و قاقم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بوریا لا سکا۔ بعدِ چندے، جب گردشِ چرخ نے گنبد گرایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا، تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گورِ شاہ ہے، یہ لحدِ فقیر ہے۔ اِس کو مرگِ جوانی نصیب ہوئی، یہ اُستخوانِ بوسیدۂ پیر ہے۔ سو یہ بھی

خوش نصیب، نیک کمائی والے گور گڑھا، کفن پاتے ہیں؛ نہیں تو سیکڑوں ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں، لوگ "دَر گور" کہہ کر چلے آتے ہیں۔ کُتے بلّی، چیل کوّے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دامنِ دَشتِ عُریاں کفن، گور بے چراغ، صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یاس و حسرت کے سوا کوئی نہ سرہانے رُوتا ہے۔ تمنّا چھُٹ کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے۔

سالہا مقبروں کی عماراتِ عالی اور ساز و سامان کی دیکھا بھالی میں سریعُ السّیر رہے، ہزاروں رنج گورِ بے چراغِ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے سہے؛ طُرفہ نقل ہے کہ والی وارث اُن کے سریرِ سلطنت، مسندِ حکومت پر شب و روز جلوہ افروز رہے؛ مگر تنبیہِ غافلوں کو، قُدرتِ حق سے، گنبدوں میں آشیانۂ زاغ و زغن، میناروں پر مسکنِ بوم شوم، قبروں پر کتّے لوٹتے دیکھے۔ میر:

مزارِ غریباں تأسّف کی جا ہے وہ سوتے ہیں، پھرتے جو کل جا بہ جا تھے①

رنگِ چمن صرفِ خزاں دیکھا۔ ڈھلا ہوا حُسنِ گُل رُخاں دیکھا۔ اگر گُلِ خنداں پر جوبن ہے، بہار ہے؛ غور کیا تو پہلوئے نازنیں میں نشتر سے زیادہ خلشِ خار ہے، گریاں اُس کے حال پر بلبلِ زار ہے۔ دُنیا میں دن رات زق زق بق بق ہے۔ کوئی چہچہے کرتا ہے، کسی کو قلق ہے۔ نوش کے ساتھ گزندِ نیش ہے۔ ہر رہ رَو کو کڑی منزل در پیش ہے۔ ایک فقیر کے اِس نکتے نے بہت جی کڑھایا، مگر سب کو پسند آیا کہ بابا! دن تھوڑا، سر پر بوجھ بھاری، منزل دور ہے؛ مسافر کے پاؤں میں حرص کے چھالے، ہوس کی بیڑیاں، غفلت کا نشہ،

راہ بے دیکھی، راہ بر ناپیدا، لیکن چلنا ضرور ہے۔ مؤلف:

بلبل کو خزاں میں جان کھوتے پایا　　صیاد کو سر پٹک کے روتے پایا
گل چیں کی بھی نیند اُڑ گئی، لیک سرورؔ　　جو اہلِ دول تھے، اُن کو سوتے پایا

مدتوں صدائے مرغِ سحر کے رنج اُٹھائے، کبھی دم نہ مارا، شکوہ لب پر نہ لائے۔ برسوں ندائے اَللّٰہُ اَکبَر کے صدمے سہے، شکر کیا، چُپ رہے۔ مہینوں گجر کی آواز نے دم بند کیا، قلق جی پر لیا، نالہ نہ بلند کیا۔ سوچے تو وصلِ مہ رُویاں خوابِ شب تھا۔ لطف اُن کا عین غضب تھا۔ تمام عالم کی خوب سیر کی، کبھی حرمِ محترم میں مسکن رہا، گاہ دھونی رمائی گُنشت و دَیر کی۔ عالم سے آیہ، فاضل سے حدیث، ناصح سے پند سُنا۔ ناقوسِ برہمن سُن سُن بُت ہوگئے، سر دُھنا۔ وہ بدکیش: مانعِ ملّتِ صنم، لُطفِ زیست، حظِّ نفس کا دشمن تھا۔ یہ کوتہ اندیش: رخنہ پردازِ اہلِ ایمان، دین کا رہ زن تھا۔ تامّل کیا تو اِن دونوں سے دور حسد، بُغض، بیر ہونا معلوم۔ اپنے نزدیک اِن کا انجام بہ خیر ہونا معلوم۔ وَاللّٰہُ اَعلَم یہ لوگ کیا سمجھے! خود اچھّے ٹھہرے، اور کو بُرا سمجھے۔ مطلب کی بات ہیہات دونوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ اِفراط تفریط نے گونگا بہرا کیا، لوگوں کو بے بہرہ کیا، ذلّت دلوائی۔ سب سے بہتر نظر آیا کُنجِ تنہائی۔ مؤلف:

اچھّے کو بُرا، بُرے کو اچھا سمجھے　　کتنی یہ بُری سمجھ ہے، اچھا سمجھے

دُنیا فقط راہ گُذر ہے۔ ہر دم مثالِ تارِ نفس در پیش سفر ہے۔

تا زیست ہزاروں مفسدے ہیں، ڈر ہے۔ مرنے کے بعد باز پُرس مدِنظر ہے کسی طرح انسان کو مفر نہیں۔ کون سا نفع ہے، جس کی تلاش میں بے سود ضرر نہیں۔ حاصلِ کار یہ ہے: دُنیا کی محبّت دل سے کم کرے، کسی کے جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم کرے، تامقدور خاطرِ فردِ بشر نہ برہم کرے! وگرنہ، شعر:

نیم شبے آہ زند پیر زال ‎ ‎ ‎ دولتِ صد سالہ کند پایمال

دل شکستہ کی دِل داری، پا فتادہ کی مددگاری کرے۔ ہوا و ہوس جو دل سے دور ہو جائے، تو مال سے یا کمال سے۔ عُجب و نخوت نزدیک نہ آئے۔ عنایتِ ایزدی پر قانع ہو۔ شکرِ ہر نعمت، سپاسِ خدمت کرکے، منہیات کا مانع ہو۔ رنج کا حامل رہے، سب رنگ میں شامل رہے۔ زمانے کے مکروہات سے گھبرائے نہیں۔ صحبتِ غیر جنس سے نفرت کرے، تو بدنامی پاس آئے نہیں۔ دولت کا اِعتبار کیا، مفلسی سے ننگ و عار کیا۔ ایک دن مرنا ہے، جینا مستعار ہے، اِس پر کس کا اِختیار ہے۔ نیک عمل کا خیال رکھے کہ قیدِ ہستی زیست کا نام ہے۔ رہائی ایک دن یہاں سے انجام ہے۔ باہمہ بے ہمہ رہنے میں مزہ ہے، باقی بکھیڑا ہے۔ شعر:

کسی کی مرگ پر اے دل نہ کیجے چشم تر ہرگز①
بہت سا روئیے اُن پر جو اِس جینے پہ مرتے ہیں

عمرِ خضر کی تمنا اور حشمتِ خسرو، خزانۂ قارون کی فکر میں ہر ایک صباح و مسا ذلیل و خوار ہے۔ تحصیل لاحاصل ہے، کوشش اِس

اَمر میں سراسر بے کار ہے۔ بہ قولِ ناسخ :

ہاتھ آتی ہے کب علم و ہنر سے دولت ملتی ہے قضا اور قدر سے دولت ①
جو علم و ہنر رکھتے ہیں، وہ ہیں محروم مانوس ہے بَل اَحمق و خر سے دولت

روپے کا جمع ہونا، جواہر کی تلاش میں ہیرا کھانا، دن کا جاگنا، چاندی سونے کی اُمید میں رات کا نہ سونا، سیمیں تن، لعل لبوں سے بہم ہونا جنھیں میسّر ہر بار ہے، اُنھیں مُفارقتِ دُنیا ناگوار ہے اور یہ کلام ہے، مؤلف :

یاں کے جانے سے جی اُلجھتا ہے
کیا ہی دل کش سرائے فانی ہے

لیکن کبھی صبحِ عشرت، گاہ الم کی شام ہے، دُنیا عجب مقام ہے۔ نہ امیر ہوتے عرصہ لگتا ہے، نہ فقیر بنتے کچھ دیر ہے، اِس کارگاہِ بے ثبات میں یہ اندھیر ہے۔ سلَف سے اَہلِ کمال دُنیا کے مال سے محروم رہے۔ جو سزاوارِ حکومت تھے، وہ محکوم رہے۔ شعر :

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم ②

یہاں کی نیرنگیوں سے فارغ البالوں پر عرصہ تنگ رہا، مگر گردشِ چرخ کا وہی ڈھنگ رہا۔ سودا :

ہے چرخ جب سے اَبلقِ اَیّام پر سوار
رکھتا نہیں یہ ہاتھ عناں کا بہ یک قرار ③
جن کے طویلے بیچ، کئی دن کا ذکر ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شُمار

اب دیکھتا ہوں مَیں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار

اور جب وعدہ آپہنچا تو نہ روپیہ کام آتا ہے، نہ فوجِ ظفر موج سے کچھ ہو، نہ تہمتنِ جرّار بچاتا ہے۔ نہ کوئی آشنا دوست آڑے آئے، نہ عزیز و اَقرِبا پنجۂ مَلکُ الموت سے چھڑائے۔ اگر یہی اَمر مانِعِ قضا و قدَر ہوتے، جمشید و کاؤس، دارا و سکندر بہ صد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے۔ نیک عمل کرے تو وہ ساتھ جاتا ہے۔ بُرے وقت میں اِحتیاج کسی کی برلائے، یا لِلّٰہ کسی کو کچھ دے، یہ البتّہ کام بناتا ہے۔ اگر اپنے حال کو سوچے، تو مُنہ نوچے۔ بَینَ العَدَمَین آدمی ہے، دُنیا یہ بیچ کی سَرا ہے، وگرنہ دُنیا سَراب، نقش برآب، زندگی بدتر اَز حَباب ہے۔ پابند اِس کا خراب، ترک کرنے والا نایاب ہے۔ ناسخ:

ترکِ دُنیا کا سوچ کیا ناسخ کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں①

شعر: اِس گلشنِ ہستی میں عجب سیر ہے، لیکن②
جب آنکھ کھُلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا

قطعہ:

دُنیا خوابیست، کش عدم تعبیر است③
صَیدِ اجل است گر جوان و رپیر است
ہم روی زمین پُر است و ہم زیرِ زمیں
این صفحۂ خاک \ ہر دو رُو تصویر است

اِلّا، مُقتضائے عقل یہ ہے کہ عالَمِ اَسباب میں کسی اَسباب کا پابند نہ ہو، تعلّقِ خاطر نہ رکھے۔ ہمیشہ اِس نے بھلے سے بُرائی کی ہے۔ جو گیا یہاں سے، یعنی جہانِ گذراں سے، اِس کا شاکی تھا بادشاہ سے فقیر تک، جوان سے پیر تک۔ حقیقت میں یہ نفسِ امّارہ سخت ناکارہ ہے، اِس کو بہ ہر کیف زیر کرے، زبردستی پچھاڑے۔ گردِ ہوا و ہوس سے دامنِ ہمت جھاڑے۔ شعر:

دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند
آنرا کہ عقل بیش، غمِ روزگار بیش

یہاں کوئی ایسی بات خدا کی عنایات سے پیدا کرے تا صَفحۂ روزگار پر چندے بہ نیکی نام یاد رہے۔ شعر:

اِس طرح جی کہ بعد مرنے کے ①
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

دُنیا میں کسی سے دل نہ لگائے کہ یہ کارخانہ بہت بے ثَبات ہے۔ وَصل سے فرحت، ہجر کی مصیبت اپنے سر پر نہ لائے کہ مرجانے کی بات ہے۔ معشوقِ باوفا عَنقا کی طرح ناپیدا ہے اور پُر دَغا ہرجائی ہر جا مُہیّا ہے۔ خواہش کا انجام کاہش ہے۔ تمنّا دل سے دور کرنے میں جان کی آسایش ہے۔ مؤلّف:

کبھی نہ چین سے رہنے دیا تمنّا نے
خراب وخستہ میں اِس دل کی آرزو سے ہُوا

مگر وائے غفلت، ہائے نادانی! کہ جب نشۂ جوانی کا موسم پیری میں

خُمار اُتار ہوتا ہے، اُس وقت آدمی سر پر ہاتھ دھر کر رُوتا ہے۔ وقتِ اَز دست رَفتہ و تیرِ اَز شَست جَستہ کب ہاتھ آتا ہے۔ ناچار ہو، کفِ افسوس مَل کے پچھتاتا ہے۔ گُزشتہ را صَلوات کہہ کے دل کو سمجھاتا ہے۔

آدمیوں کو بندر کی تقریرِ دِل خَراش، پُراثر سے عبرت وحیرت حاصل تھی۔ کبھی نصیحت و پند، گاہ کلامِ رنگین و دلچسپ بادِلِ دردمند، کبھی سَخُنانِ وحشت اَفزا سُناتا چلا جاتا تھا۔ اہلِ دل، طبیعت کے گُداز رُوتے ساتھ آتے تھے۔ ہر فقرۂ پُردرد پر ضبط نہ ہوسکتا تھا، چلّاتے تھے۔ خلقِ خُدا، جنازے کی طَرح ہاتھی کے ہمراہ تھی۔ ایک عالَم کے لب پر نالے تھے، فُغان و آہ تھی۔ اِسی سامان سے ملکہ کے جھروکے تلے پہنچے۔ وہ مُنتَظِرِ تمام شب، نالہ بہ لَب، سوداگر سے فرمانے لگی: ایک دم ٹھہر جا، میں بھی اِس اسیرِ پنجۂ تقدیر کی تقریر کی مشتاق ہوں۔ سوداگر نے ہاتھی رُوکا۔ ملکہ نے کہا: اے مُقَرِّرِ بے زَباں، وطن آوارہ، گُم کردہ خانماں! اگرچہ اب ہم کس لائق ہیں، مگر تیری داستانِ ظُلم وجَور کے شائق ہیں۔ بندر نے آواز پہچانی۔ پہلے تو خوب رُویا، پھر جی کو ٹھہرا کر کہنے لگا، شعر:

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدیؔ از دستِ خویشتن فریاد

میرؔ:

کیونکے کہیے، کوئی نہیں آگاہ ۔۔ اک قیامت بَپا ہے یہاں سرِراہ (۱)

کچھ چھپا اب نہیں رہا یہ راز   ہے جہاں اِس سے سب سخن پرداز
بس تغافُل نہ کر، ترحُّم کر   گوشِ دل جانبِ تکلّم کر

شعر:

قسمت تو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو تین ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! یار نے عیّاری کی، دغا سے یہ نوبت ہماری کی۔ جس کا رُونا ہمیں ناگوار تھا؛ وہ ہمارے لہو کا پیاسا، قتل کا روادار تھا۔ یہ مَثَل سچ ہے: تیرھویں صَدی ہے، نیکی کا بدلا بدی ہے۔ مجبوروں کی تمنّا دل میں رہی۔ وطن جانے کی حسرت آب و گل میں رہی۔ دوستوں کا کہا نہ مانا؛ وہ آگے آیا، پچھتانا پڑا۔ بے اَجَل جلّاد کے فَریب سے ذَبح ہوئے۔ طالب و مطلوب جان جُوکھوں میں پھنسے، زندہ درگور ہوئے۔ اَلحق، دُنیا دم مارنے کی جا نہیں۔ راز کسی سے کہنا اچھّا نہیں۔ منصور حلّاج نے کلمۂ حق کہا تھا، ناحق لوگوں نے دار پر کھینچا۔ غَرَض جو بولا، وہ مارا گیا؛ جان سے بے چارہ گیا۔

کہتے تو کہا، پَر کچھ سوچ کر بات بنائی۔ جی میں دہشت آئی کہ مَبادا یہ خبر اُس اَلْفَر کو پہنچے، تو یقینِ کامل ہو، جان دَشنۂ ظلم سے نہ بچے۔ کہا: اے ملکہ! کوئی کسی کمال سے دُنیا میں نِہال ہوتا ہے؛ یہ بے گناہ، گویائی کے سبب، ناحق حرام زادے کی بدولت

حلال ہوتا ہے۔ مؤلف :

کمالِ شے، زوالِ شے ہے، اِس پر لاکھ حاسد ہوں
بھلا نازاں نہ ہوں کیوں کر میں اپنی بے کمالی کا
خدا جانے کہ دیکھا، دیکھ کر یہ چاند، مُنہ کس کا
ہوئی ہے عید غیروں کو، ہمیں ہے چاند خالی کا

میں نے دانستہ اپنے ہاتھ سے پاؤں میں کلھاڑی ماری، فلک نے بنا کر بات بگاڑی۔ مصرع :

اے روشنیِ طبع! تو بر من بلا شدی

شعر :

گُل و گلچیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر①
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اب سَرِدست کچھ تدبیر بن نہیں آتی ہے۔ صورتِ مرگ آئینۂ چشم میں مدِّ نظر ہے، ہماری ہمیں کو خبر ہے، کوئی گھڑی میں مُفت جان جاتی ہے۔ جو جانتا ہے، وہ دیکھتا ہے؛ جسے خبر نہیں، اُس سے کہ دو: تمھارے واسطے غریبِ دیار ہوئے اور تمھارے سبب سے قتل کے سزا وار ہوئے۔ شعر :

بجرمِ عشقِ توام می کُشند و غوغائیست②
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

اِن باتوں سے دبے سہے شک ملکہ کے برطرف ہوئے، سمجھی

جانِ عالم یہی ہے۔ جواب دیا کہ جو جانتے تھے، اُن سے کیا ہو سکا، اَن جان کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ! اور توتے کی گردن مروڑ، پنجرہ باہر نکالا۔ بندر کی نگاہ پنجرے پر پڑی، سمجھا: ملکہ پہچان گئی، یہی فرصت کا وقت ہے۔ ہنگامہ و تلاطم تو مچا تھا، کسی نے دیکھا نہ بھالا، بندر سوداگر کی گود میں لیٹ کر توتے کے قالب میں پرواز کر آیا۔ توتا پھڑکا، ملکہ کا خوشی سے دل دھڑکا، پنجرہ اندر کھینچ لیا۔

سوداگر نے دیکھا: بندر مرگیا۔ چاہا: ہلاک ہو جائے، بدنامی کا قصہ پاک ہو جائے۔ جو شخص خواصی میں بیٹھا تھا، سمجھانے لگا: بندہ پرور! شکر کرنے کی جا ہے، شکایت کا موقع کیا ہے۔ حرمت رہی، جان بچی۔ مرگِ فرزند سے ماں باپ کو چارہ نہیں۔ مرجانا بجز حمقا عقل مند کو گوارا نہیں۔ اگر بادشاہ جبر سے بندر کو چھین کر مار ڈالتا، جان کھونے کی جگہ تھی۔ صبر کیجیے، جو خدا کی مرضی۔ اُس کی رضا میں مجبوری ہے، جائے صبوری ہے۔ صابروں کا مرتبہ بڑا ہے، اُن کے حق میں اللہ فرماتا ہے، تم نے سنا ہے کہ نہیں: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔

تماشائیوں پر یہ حال کھلا، رونے پیٹنے کا دونا شور و غل مچا۔ سب نے متفق یہی کہا: بس کہ بندر عقیل تھا، یہ پیامِ طلب، کوسِ رحیل تھا۔ سامنے جانے کی نوبت نہ آئی، سوداگر کی گود خالی کر کے جان گنوائی۔ اپنا قتل جو ثابت ہوا، خوف سے مرگیا، داغِ تقریر

ہمارے صفحۂ دل پر دَھر گیا۔ یہ خبر اُس کافرِ اکفر کو پہنچی۔ اِس پر بھی چَین نہ آیا؛ لاش منگا، جلا کے دل ٹھنڈا کیا۔ خاک تک برباد کی، جب تسکین ہوئی۔

وہاں ملکہ مہر نگار پنجرہ لے بیٹھی، لوگوں کو پاس سے سَرکا دیا۔ میاں مٹھو نے ھُوَ ھُوَ ابتدا سے اِنتہا تک مُفصّل سب حال سُنا دیا کہ اِس طَرح نشے کی حالت میں اُس کے رُونے پر عمَل بتایا؛ وہ ہمیں پر عمَل میں لایا، بندر بنایا۔ پھر چڑیمار کے جال میں پھنسے، دوست رُوئے، دشمن ہنسے۔ وہاں سے سوداگر متاعِ خوبی سمجھ کر، اپنے پاس لایا۔ فلک نے بعدِ خرابیِ بسیار آج تم سے مِلایا۔ ملکہ نے کہا: خاطرِ پریشاں جمع رکھیے، اِنشاءَاللہ تعالیٰ جلد کوئی صورت ہوئی جاتی ہے۔ یہاں یہ گفتگو تھی کہ اُس نُطفۂ شیطاں کی آمد ہوئی۔ ملکہ باہر نکل آئی، تعظیم و تواضع کرنے لگی۔ ہمیشہ یہ معمول تھا: جب وہ آتا، ملکہ بات نہ کرتی، مُدارات نہ کرتی؛ طَیش میں آتا، خَفیف ہوکر اُٹھ جاتا۔ اُس روز جو گفتگو ہوئی، وہ مَردک سمجھا: بندر کا مرنا بہ چشم ملکہ نے دیکھا، اِس سے دب گئی، بے اِعتنائی کی بات اب گئی۔ جلدی نہ کرو، اِمروز فَردا مُقدّمہ درست ہو جائے گا؛ لیکن پہلے اِسی سے فیصلہ شرط ہے۔ ملکہ کے باپ کا بہت ڈر تھا، اِس باعث ملکہ کا پاس کرتا تھا کہ اُن کے باپ سے ہِراس کرتا تھا۔ جب رخصت ہونے لگا، ملکہ نے کہا: ایک بکری کا بچہ خوب صورت سا ہمیں بھیج دو،

پالیں گے، رنج کو ٹالیں گے۔ یا تو چُپ رہتی تھی، آج بچّہ مانگا!
یہ بچّہ بہت خوش ہوئے۔ اُسی وقت ایک بربری کا بچّہ تحفہ،
بھجوا دیا۔ دوسرے روز جو آیا، ملکہ کو زیادہ متوجّہ پایا۔ اُس کے
رُو بہ رُو بچّے سے کھیلا کی۔ دو تین روز یہی صحبت رہی۔

ایک روز ملکہ نے بچّے کو دبا کر اَدھ مُوا کر دیا اور چوبدار
دوڑایا کہ شہزادے کو جلد بُلا لا، عرض کرنا: اگر دیر لگاؤ گے،
جیتا نہ پاؤ گے۔ یہ خبر سُن کر وہ محل سرا کا عازم ہوا۔ ملکہ نے
پنجرہ اُس ہُمائے اوجِ سلطنت کا پلنگ کے پاس رکھ لیا۔ جب
وہ نابکار رُو بہ رُو آیا، ملکہ نے بچّہ گود میں اُٹھا کے اِس زور
سے دبایا کہ وہ مر گیا۔ اُس کا مرنا، اِس کا نالہ و فریاد کرنا۔ گریباں
چاک کرنے کی، بکھیڑا پاک کرنے کی تدبیر کی۔ وہ بے قرار ہو کر
بہ منّت بولا: ملکہ! ہزار بچّہ اِس سے اچھا ابھی موجود ہوتا ہے،
تم کیوں روتی ہو، جی کھوتی ہو۔ ملکہ نے اُسی حالت میں کہا:
میں کچھ نہیں جانتی، تم اِسے ابھی جِلا دو، جو میری خوشی چاہتے ہو۔
وہ بولا: مُردہ کہیں جیا ہے؟ کبھی کسی نے، سوائے مسیح، ایسا
کیا ہے؟ ملکہ نے رو کر کہا: واہ! تم نے میری مینا جو جِلائی تھی،
جب میں بلبلائی تھی۔ یہ دل میں سمجھا: شاید شہزادے نے یہ حرکت
کی ہوگی! کارخانے مُسبّب الاسباب کے مشہور و معروف ہیں۔
دُنیا میں، مَثَل ہے: کہ کرد کہ نیافت۔ جس نے جیسا کیا، ویسا

پایا۔ ہر فرعونے را موسیٰ۔ رُباعی :

①

اے یار! جو کوئی کسی کو کلپاوے گا　　یہ یاد رہے، وہ بھی نہ کل پاوے گا

اِس دارِ مُکافات میں، سُن اے غافل!　　بیداد کرے گا آج، کل پاوے گا

وہ بدحواس پوچھنے لگا : ہم نے مینا کیوں کر جلائی تھی؟ ملکہ بولی : تم پلنگ پر لیٹ رہے تھے، وہ جی اُٹھی تھی۔ یہ پتا بھی درست پایا اور قضا کا زمانہ قریب آیا، کہا : بچّہ گود سے رکھ دو۔ ملکہ نے پھینک دیا۔ وہ پلنگ پر لیٹا، اپنی روح بچّے کے قالب میں لایا، وہ اُٹھ کر کودنے لگا۔ ملکہ مہر نگار نے گود میں لیا، پیار کیا۔ وہ سوچا دو گھڑی ملکہ کی طبیعت بہل جائے، پھر روح قالب میں لے جاؤں گا، مطلب تو نکل آئے۔ یہ نہ سمجھا فلک کی گھات ہے، فریب کی بات ہے، چرخ کو کچھ اور چکّر منظور ہے، اب اُس جسم کے نزدیک جانا بہت دور ہے۔ شہزادہ جانِ عالم یہ سب مُعاملے پنجرے سے دیکھ، سُن رہا تھا؛ قالب کو خالی پایا، فوراً اپنی رُوح اپنے جسم میں لایا، مُنہ سے اِلّا اللہ کہا، اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بُزدِلا جانِ عالم کو دیکھ کر تھرّا گیا، خوف چھا گیا۔ سمجھا قسمت اب بُری ہے، کوئی دم کو گلا ہے اور چُھری ہے۔ ملکہ نے جلد دو آنچھر وہ پڑھ کر پھونک دیے کہ وہ اور کے قالب میں روح لے جانا بھول گیا۔

پھر انجمن آرا کو بلایا، کہا : تُو صاحب مبارک ہو! اللہ تعالیٰ نے تمھاری ہماری حُرمت و آبرو کو بچایا، بچھڑے سے ملایا۔ یہ

آپ کا اَحْمَقُ الَّذِی شہ زادہ ہے۔ وہ بکری کا بچّہ؛ بے دین، حرام زادہ وزیر زادہ ہے۔ یہ کہہ کر تینوں عاشق و معشوق گلے مل مل خوب روئے۔ جو جو محرمِ راز تھیں، دوڑیں، مبارک سلامت کی دھوم ہوئی؛ بشاش ہر ایک مغموم ہوئی۔ جانِ عالم نے اُسی وقت سوداگر کو طلب کیا، اپنی سرگذشت سے آگاہ سب کیا۔ بعدِ ادائے شکرِ نعمت، خلعتِ مکلّف اور انعام ہر اقسام کا مع ہاتھی، پالکی عنایت کیا۔ وطن آنے کا وعدہ ختمی لیا۔ پھر چڑیمار اور اُس کی جورو کو بلایا۔ روپیہ اشرفی، زر و جواہر دے کر فکرِ دنیا سے بری کر دیا اور بمشورۂ غضنفر شاہ اُس مملکت کے چڑیماروں کا چودھری کر دیا۔ پھر لشکرِ ظفر پیکر کو حکمِ تیاریِ سامانِ سفر فرمایا، آپ رخصت ہونے کو غضنفر شاہ پاس آیا۔ آخر کار بہ دقّتِ تمام و طولِ کلام، درازیِ ایّامِ مفارقتِ والدین کہہ کر اُسے راضی کیا۔ پیش خیمہ اُسی دن لد گیا۔ دو چار دن رخصت کی دعوتوں میں گزرے۔ اخیر جلسے خوب دھوم دھڑکّے کے ہوئے۔ اپنے عمل تک غضنفر شاہ ساتھ آیا۔ تمام لشکر نے اُس کی سرحد تک یکّا پکایا پایا۔ پھر رخصت ہوئے۔ وہی دو چار کوچ، ایک دو مُقام کرتے بہ راحت و آرام چلے۔

ناقہ بٹھانا تقدیر کا پھر اُسی دشتِ پُر خوف و خطر میں۔ لبِ حوض خیامِ شاہی ہونا، ساحرہ کا آنا، تمام لشکر کو نصف پتھر بنانا۔ سب کا رونا، پھر ملکہ کے باپ کا آنا،

آفت سے چھڑانا۔ صفوف آرائیِ افواجِ شاہی۔ جادوگر اور جادوگرنیوں کی لڑائی۔ شہپال کا قتل، لشکر کی رہائی۔

نظم:

نگارِندۂ داستانِ عجیب یہ لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب
طِلسمِ جہاں دید کا ہے مکاں پھنسے اِس میں رہتے ہیں پیر و جواں
ولیکن ہنسا جو کوئی غنچہ ساں ہُوا مثلِ گُل دستِ بُردِ خزاں
جسے ہم نے دیکھا، وہ تھا دِل حزیں خوشی کی جگہ، سچ ہے، دُنیا نہیں

مُحرّرانِ جادونگار و سحر ساز، راقمانِ فسانۂ ہوش رُبا و حیرت پرداز نے لکھا ہے کہ جانِ عالم ہر صُبح مثلِ مِہرِ دَرَخشاں قطعِ مَنازِل و مَراحِل یعنی کوچ، و ہر شام مانندِ ماہِ تاباں مُقام کرتا؛ چند عرصے میں پھر اُسی دَشتِ اِدبار و صحرائے خار خار، جہاں حوض میں کود پڑا تھا، وارِد ہوا۔ حوض کے مُتّصل سراپردۂ خاص نَصب ہوئے۔ گرِد لشکرِ نُصرت اثر اُترا۔ انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کو وہ چشمہ دکھایا، ماجرائے گذشتہ زبان پر لایا۔ جب دن تمام ہوا، نمازِ شام کے واسطے جُدا خیمے میں تشریف لایا۔ بعدِ ادائے فریضۂ باری، راہ کے کسل سے لیٹنے کی تیاری کی۔ پلنگڑی جواہر نگار بچھی تھی، اُس پر استراحت فرمائی۔ سُستی کے باعث غنودگی سی تھی کہ دَفعۃً ایک خواصِ خاص انجمن آرا کی بدحواس دوڑی آئی، کہا: شہزادۂ عالم

کی عمر دراز ہو، قضا مطیع، قدر دم ساز ہو، نصیب دشمناں شہزادی کی طبیعت ناساز ہے، سب کی عقل کو پرواز ہے۔ شدت سے کلیجے میں درد ہوتا ہے، چھوٹا بڑا محل کا روتا ہے۔ وہ نقشِ سلیمانی اور لوح دیجیے، دھو کر پلا دیں۔ یا اور کوئی تجربے کی چیز عنایت ہو کہ کھلا دیں۔

عارضۂ مزاجِ مطلوب، بدمزگی طبیعتِ محبوب سن کے بے قرار ہوا، عقل اُڑ گئی، حواس فرار ہوا۔ کچھ نیند کا خمار، کچھ طبیعت کا انتشار، دیکھا نہ بھالا، نہ وقفہ کیا نہ ٹالا، لوح و نقش حوالے کیا۔ نقش دیتے ہی نقشہ بگڑ گیا، مقدمہ سب خراب ہوا، ثواب کے بدلے عذاب ہوا۔ ایک آوازِ مہیب پیدا ہوئی کہ اے جانِ عالم! بہت دنوں اُڑا پھرا، مدت کے بعد پھنسا، خبردار ہو جا! ایسی آوازِ ہولناک تھی کہ سب لشکر ڈر گیا، شجاعوں کے دل تھرا گئے، محل میں رنڈیوں کو غش آ گئے۔ گھبرا کر شہزادے نے اُٹھنے کا قصد کیا، جگہ سے ہلا نہ گیا۔ غور جو کیا تو آدھا جسم پتھر کا تھا۔ پھر تو جہاں بیٹھا تھا بیٹھا رہ گیا۔ جو کھڑا تھا، وہ زمین میں گڑا تھا، اینٹھا رہ گیا۔ ہر طرف غل اور شور تھا۔ جو پڑا تھا، زندہ درگور تھا۔ کچھ دُکھ، کچھ ہنسی تھی۔ تمام فوج آفتِ ناگہانی میں پھنسی تھی۔ عجب کھلبلی مچی، نامردوں کی بائی پچی۔ کل لشکر انسان سے حیوان تک نیچے کا دھڑ پتھر کا، اوپر کا جسم بہ دستور۔ آہ و نالہ، فریاد و بکا سب لشکر میں بپا تھا۔ اور محل سرا میں بھی یہی ہنگامہ مچا تھا، ہر ایک گرفتارِ بلا تھا۔ وہ رنڈیوں کی زاری، انجمن آرا کی بے قراری! علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسماں کانپتا تھا، جب وہ یہ کہتی تھی، شعر:

ہر دم زمانہ داغِ دگر گونہ در دہد   یک داغ نیک ناشدہ داغِ دگر دہد

تمام لشکر میں، اَز شام تا پگاہ، ہر ایک کے لب سے نالۂ جاں کاہ بلند رہا۔ جس وقت ماہ دَمِ سرد بھرتا، نقابِ سیاہ روئے تاباں پر ڈال کر غم کدۂ مغرب کی طرف روانہ ہوا اور آفتابِ جگر سوختہ مشرق سے نکل کر خدنگِ آہِ بےکساں کا نشانہ ہوا، ایک اَبرِ تیرہ و تار نمود ہوا۔ آدمی سب خوف زدہ دیکھنے لگے۔ اُس اَبر سے اژدہا خوں خوار، شعلہ فشاں، آتش دہاں نکلا۔ ایک رنڈی اُس پر سوار، وہ بھی آتش بار، شہ زادے کے خیمے میں اُتری۔ جانِ عالم نے پہچانا کہ وہی جادوگرنی ہے، دل سے کہا: شہر اپنا دور رہا، موت قریب آئی، قسمت نے کس جگہ لاکر نیرنگی دِکھائی! وہ بولی: جانِ عالم! کہو اب کیا قصد ہے؟ شہ زادے نے کہا: وہی جو تھا۔ اُس نے کہا: اب وہ نقشِ سلیمانی اور لوحِ پیر مرد کی نشانی کہاں ہے، جس کے بھروسے پر کودتے تھے! اگر زندگی مع لشکر درکار ہو، اور دُوش پر سر بار ہو تو ملکہ اور انجمن آرا سے انکار کرو۔ ہماری اِطاعت اور محبّت مقدّم جانو، جو کہیں مانو، ہم سے دارو مدار کرو۔ نہیں تو ایک دم میں سب کو بے گور و کفن، طعمۂ زاغ و زغن کردوں گی۔ دشت لاشوں سے بھر دوں گی۔

شہ زادے نے کہا: ہماری لوحِ دل پر نقشِ اِرادتِ باری، جو حافظِ حقیقی ہے، کلکِ قدرت سے منقّش ہے۔ عادت سے مجبور ہوں، بے وفائی کے کوچے سے دور ہوں۔ جو کہا، سو کہا، کیا سو کیا۔ اگر قضا

آئی ہے، مرنے سے کیا چارہ ہے؛ مگر جیتے جی بات جانی کب گوارا ہے۔ یہ سن کر جل گئی، غصے سے رنگت بدل گئی۔ کچھ بڑبڑا کر جانِ عالم پر پھونکا۔ یا نصف پتھر تھا، اب حلق تک ہو گیا۔ حسرت و یاس سینے میں بھری تھی، تصویرِ آزری سی پلنگڑی پر بے حس، خالی دھری تھی۔ وہ تو اژدہے پر چڑھ کر اڑی اور پکاری: اے اجل رسیدہ! آج کے دن اور رات کی مہلت ہے؛ اگر صبح کو بھی انکار کیا، تو یاد رکھنا، لشکر کا خون اپنی گردن پر لیا۔ یہ سنا وہ تو ہوا ہوئی۔

اب یہاں کا حال سنو۔ جب تک شہزادہ آدھا پتھر تھا، تو ملکہ اور انجمن آرا اپنے اپنے خیموں سے گھبرا کر پکارتی تھیں، جانِ عالم جواب دیتا تھا۔ یہی آواز کا سہارا اُن کی زیست کا سبب تھا۔ اب تا حلق پتھر ہونے سے، وہ جرسِ قافلۂ گم کردہ راہِ دشتِ غربت، بے صدا ہو گیا۔ وہاں صبر کا راہ بر جدا ہو گیا۔ ہر چند دونوں چلائیں، شہزادہ جانِ عالم نے مطلق جواب نہ دیا، بولا ہی نہ گیا۔ پھر تو ملکہ مہرنگار بادلِ فگار سر پیٹ کر کہنے لگی، میر حسن:

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا①

کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا

مژدہ اے مرگِ غریب الوطنی! خوب حیلہ ہاتھ آیا؛ تو بدنامی سے بچی، ہم نے ناکامی میں جان دی۔ چرخِ ستم شعار زور رنگ لایا۔

انجمن آرا بے چاری مصیبت کی ماری۔ سب کا مُنْہ حیرت سے تکتی تھی اور رُوتی تھی۔ نہ بَین کر آتے تھے، نہ غُل مچایا جاتا تھا، گھُٹ گھُٹ کر جان کھُوتی تھی۔ خواصیں سِر کھُول کر کہتی تھیں: ہَے ہَے! ہم اِس جنگل ویران میں لُٹ گئے، وارِث سے چھُٹ گئے۔ شعر:

تو وہ کریم ہے، ناشاد کو جو شاد کرے
مراد مند کو ہر طَرح بامُراد کرے

لوگو! ہم کدھر جائیں، کیوں کر اِس بلا سے نَجات پائیں! کوئی کہتی تھی: شیطان کے کان بہرے، خدانخواستہ اگر جانِ عالَم کے دشمنوں کا رُونگٹا مَیلا ہُوا، شہ زادیاں خاک میں مل جائیں گی، غمِ جُدائی سے جانیں گنْوائیں گی۔ ہم اِن کے ماں باپ کو مُنْہ کیا دِکھائیں گے، اِس دَشْتِ اِدْبار میں سِر ٹکرا کر مر جائیں گے۔ یہ جادوگرنی قُربان کی تھی، لاشوں کو گُور و کفن نہ دے گی۔ اور آتُو، محل دار جگر اَفگار سِر سے چادریں پٹک، مدینے کی طرف پکار پکار یہ کہتی تھیں، شعر:

تَصَدُّق اپنے نَوَاسوں کا یا رسولَ اللہ
کہو کہ حل کریں مشکل ہماری حضرتِ شاہ

ایک طرف مُغلانیاں غم کی ماریاں دمِ گرم، آہِ سرد بھرتی تھیں۔ ایک سمت اَنِیسیں، جلیسیں نَجَف کی طرف بال کھُول کر اِلتجا سے، گِریہ و بُکا سے یہ عرض کرتی تھیں، شعر:

تم نے مدد کر نوح کی طوفاں سے کشتی پار کی یا مُرتضیٰ مشکل کُشا! کیوں بار میری بار کی

کوئی کہتی تھی: ہمارا لشکر اِس بلا سے جو نکلے گا، تو مُشکل کُشا کا کھڑا دونا دوں گی۔ کوئی بولی: مَیں سہ ماہی کے رُوزے رکھوں گی، کونڈے بھروں گی، صحنک کھلاؤں گی، دودھ کے کوزے بچّوں کو پلاؤں گی۔ کسی نے کہا: مَیں اگر جیتی چُھٹی، جنابِ عبّاس کی درگاہ جاؤں گی، سقّائے سکینہ کا عَلَم چڑھاؤں گی۔ چہل منبری کرکے نذرِ حسین سبیل پلاؤں گی۔

غرض کہ لشکر سے زیادہ خیموں میں تلاطُم پڑا تھا۔ صدائے حزیں، نالۂ ہر غمگیں سے ہنگامۂ محشر بپا تھا۔ اِتفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا رشید، فنِ سحر میں دیدہ و شنید اُس مردِ بزرگ کی ملاقات کو بہ روئے ہوا اُڑا جاتا تھا۔ یہ نالۂ بلند، صدائے ہر دردمند اُس کے کان میں جو پہنچی، زمین کا مُتوجّہ ہوا۔ دیکھا تو ایک لشکرِ عظیم بہ حالِ سقیم سحر کا مُبتلا ہے، شور و غُل ہو رہا ہے۔ جب قریب تر آیا، طُرفہ ماجرا نظر آیا کہ انسان سے تا جانور سب آدھے پتّھر ہیں۔ سمجھا، سحرِ شہپال میں خراب حال ہیں۔ لوگوں سے پوچھا: یہ ستم رسیدہ لشکر کس کا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے یہ حال بنایا ہے؟ وہ ملکہ مہرنگار کے ملازم تھے، اپنا حال سب نے بیان کیا۔ جب اُسے یہ امر معلوم ہوا کہ اُستاد زادی کی خانہ بربادی ہے اور شہپال کی بیٹی کو مسرّت ہے، شادی ہے؛ درِ خیمۂ ملکہ پر آیا، سر پیٹا، چِلّایا۔ ملکہ نے آواز پہچانی، کہا: بھائی! اِس وقت پردہ کہاں کا! یہاں آ کے بالمُشافہہ ہمارا عذاب اور حالِ خراب دیکھو۔ وہ اندر آیا، ملکہ کو بھی اُسی عالم میں پایا۔ اُس نے فرمایا: عداوتِ ساحرہ سے ہمارا

قافلہ تباہ ہے۔ وہ عرض کرنے لگا: فدوی کو اُس کی ہمسری کی طاقت نہیں اور وقفہ کم، صبح سب کارخانہ درہم و برہم ہو جائے گا۔ بجز آپ کے والدِ بزرگوار کے تشریف لائے یہ بلا ٹلتی نہیں، خادم کی یہاں دال گلتی نہیں۔ تو خُدا حافظ و ناصر ہے! یہ کہہ کر بہ حالِ خستہ و تباہ، لب پر نالہ و آہ، اِس تیز قدم سے چلا کہ اَدہمِ صبا کی ڈپٹ ہر قدم نثار تھی، ٹھوکروں میں صرصر بے قرار تھی۔ پہر بھر میں واردِ باغ ہوا: گُل سا چاک گریباں، شبنم نمط اشک رواں، غنچے کی صفت گاہ خموش، بلبل کے ڈھنگ سے گاہ نالے کا جوش و خروش۔ پیر مرد نے فرمایا: خیر ہے! اُس نے شمّۂ گرفتاریِ جانِ عالم، ملکہ کی بے قراری، انجمن آرا کا اَلَم، لشکر کا حالِ بتر کہہ کر عرض کی: جلد چلیے؛ اگر شام تک نہ پہنچے، وہاں صُبح ہے۔ دمِ سحر مَلَکُ الْمَوت کا بازار گرم ہوگا، ارمان سب دل میں رہے گا، کُشتوں کو عالم بے والی و وارث کہے گا۔ کوئی گور و کفن نہ پائے گا، خاتمہ بالخیر ہو جائے گا۔ پیر مرد نے آہِ سرد بھر کر فرمایا: افسوس! شہ زادے کو سب کچھ سمجھایا تھا مگر عمل میں نہ لایا۔ میر سوز:

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا ①
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ، نئی

اُسی دم شاہینِ تیز پرواز پر سوار ہوا، مغرب کی نماز لشکر میں داخل ہو کر پڑھی۔ پہلے جانِ عالم کے خیمے میں آیا، حال دیکھ کر سخت گھبرایا۔ پھر انجمن آرا کی جا کر تسکین کی، وہ رونے لگی۔ وہاں سے ملکہ کے پاس

آگے فرمایا: تمھاری بدبختی نے ہماری وضع میں فرق ڈالا، برسوں کے بعد باغ سے نکالا۔ ملکہ نے رو کر عرض کی: یہ وقتِ تدبیر ہے نہ ہنگامِ تعذیر۔ بعد رہائی اس آفتِ سماوی کے جو چاہنا فرمانا۔

القصہ مجبور و ناچار وہ عارفِ باوقار شہزادے کے خیمے کے نزدیک دور تک حصار کھینچ کر بیٹھا۔ یہ مردِ بزرگ، نیک صفات، فنِ سحر کے سوا، عاملِ اسمِ ذات کا تھا؛ کچھ پڑھنے لگا۔ کبھی مناجات بہ درگاہِ مجیب الدعوات کرتا کہ اے یاورِ زیردستان و سرفرو کنندۂ گردن کشاں! اس بوڑھے کی شرم تیرے ہاتھ ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، آخیر وقت کا تو حافظ و نگہبان ہے۔ مجھ پر جو مشکل ہے، تیرے رو بہ رو آسان ہے۔ سفید ڈاڑھی کو بدنامی کے وسمے سے نہ رنگانا۔ تیرہ بختی کا دھبا بہ ایں ریشِ سفید نہ لگانا۔ شعر:

مشکل، ز توجہ تو آساں آسان، ز تغافلِ تو مشکل

جب کہ سجادہ نشینِ چرخِ اوّل با مجمعِ مریدانِ کواکب حجرۂ مغرب میں روپوش ہوا، اور ساحرِ فلکِ چہارم پرشوکت و باحشم طلسمِ مشرق سے نمودار باجوش و خروش ہوا؛ اور وہ عبادت گزار پیرِ جواں مرد شب زندہ دار وظائفِ صبح سے فرصت پاچکا؛ یکایک وہ نابکار شیطان صفت، ناپاک عورت اژدہے پر سوار، بہ چشمِ خوں خوار

عَزْمِ قتلِ جانِ عالَم، اور لشکر میں تنہا آئی۔ پہلے ملکہ کے باپ پاس گئی، آنکھیں لال لال، طیش کمال اور بہ آوازِ کرخت وہ نگوں بخت پکاری اے مردِ پیر، سُست تدبیر! تیری اَجَل بھی دامن گیر ہو کر، کشاں کشاں اِس دَشتِ جاں فشاں میں لائی! مجھے شرم آتی ہے کہ تو پیرِ نَوَد سالہ ہو چکا ہے، بے مارے مر رہا ہے، تیرے قتل میں بدنامی چھُٹ فائدہ کیا ہے۔ جدھر سے آیا ہے، سیدھا چلا جا۔ میں بہ یک نگاہِ کج نشانِ لشکر اِس صَفحۂ زمیں سے مثلِ حرفِ غَلَط کازدِ سحر سے مِٹائے دیتی ہوں۔

مردِ بزرگ نے آشُفتہ ہو کر فرمایا: اے ننگِ فرقۂ بنی آدم، مردُودِ عالَم! تجھے جُوشِ شہوَت، وَلولۂ مُباشَرت نے آمادۂ قتلِ ہزارہا بندۂ اللہ، بے جُرم و گناہ، کیا۔ میں مرگِ عزیزاں دیکھوں، مرنے سے ڈروں! بہ قول تیرے: آج نہ مُوا، کل مرجاؤں گا! یہاں سے جو چلا گیا، خلق کو مُنہ کیا دکھاؤں گا! ہم چشموں سے ناحق آنکھ چھپانی پڑے گی! تو بدبخت مجھ سے کیا لڑے گی! یہ سُن کر وہ فاحشہ جھلّا، آستین چڑھا سحر کی نیرنگیاں دِکھانے لگی۔ اِن کی بھی دُعا کی تاثیر سپر بن کے، اُس کا سحر اُس پر ڈھال، رنگ مٹانے لگی۔ صبح سے پہر دن باقی رہا، کوئی دَقیقہ طرفین سے نہ باقی رہا۔ طوُل اِس مقام کا بے جا تھا، اِسی کلمے پر تمام کیا کہ جب وہ عاجز ہوئی، تب سحر کی طاقت سے شیر کی صورت بنائی۔ پیر مرد بھی اَسَدُ اللہِ الغالِب کو یاد کر، وہ

مہیب ببر بنا اور اس طرح للکار کر گونجا کہ جنگل کے چار پایے نعرے کے خوف سے دریا میں گرے اور پانی کے جانور خشکی میں چھپتے پھرے۔

کچھ دیر اس ہیئت میں لڑائی، زور آزمائی رہی۔ آخر کار وہ روباہ خصال، اُس ہزبرِ نیستانِ شجاعت کی تاب نہ لائی؛ گیدڑ بھبکی دکھائی اور عقاب بن کر اُڑ چلی۔ وہ شاہینِ اوجِ دلیری سوچا: بے گرفتاریِ طائرِ مطلب، یعنی اِس ڈھڈّو کے، لشکر جنجال سے نہ نکلے گا؛ اِسی طرح یہ پھٹکی پھٹکی ٹٹّی کی آڑ میں شکار کھیلے گی۔ بلا سے کچھ ہو، اِسے پھنساؤ۔ زور میں کم پایا تھا؛ فوراً بازِ تیز پرواز ہو کے، اِس سنّاٹے سے چنگلِ آہنی میں اُسے دبوچا، ایسا نوچا کہ اُس کی جان سنسنا گئی۔ بھاگتے وقت رجالُ الغیب سامنے تھا، موت پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑی۔ بہت تڑپی، پنجۂ قضا سے نہ چھوٹ سکی۔ اسی کشمکش، اینچا کھینچی میں، مرغِ روح اُس کا مجروح، قفسِ تن سے اُڑ کر آشیانۂ جہنّم میں پہنچا۔ غلغلۂ حشر، شورِ نشور اُس صحرا میں نزدیک و دور مچا۔ ہر طرف سے دار و گیر کی صدا آئی۔ آسمان چکّر میں آیا، زمین تھرّائی، دشت تیرہ و مکدّر ہوا، آندھی چلی، سحر کا کارخانہ اُڑ گیا، ابتر ہوا۔ قریبِ شام وہ سیاہی موقوف ہوئی، خورشید نے رُخِ انور دکھایا، اپنا بے گانہ نظر آیا۔ جانِ عالم گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اہلِ لشکر نے رہائی، از سرِ نو زندگی پائی۔

جانِ عالم خیمے سے نکل، نادِم و خَجِل، پیرمرد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سب نے دیکھا: دُور حصار میں ایک رنڈی، اَسّی نوّے برس کا سِن، ضُعف کا زُور شُور، بُڑھاپے کے دن۔ قد خَمیدہ جیسے چڑھی کمان۔ مرنے پر تیس، مُنہ اُترا، آنکھیں تودۂ طوفان۔ جسم کا ہر پٹّھا درپئے ژُولیدگی گُھنی ہوئی رگیں صاف نظر آتی تھیں۔ ہڈیاں پسلیاں بوسیدہ جِلد کے باہر سے گِنی جاتی تھیں۔ دُرجِ دہاں بے دُرِ دنداں، حُقّۂ خالی کی طرح وا۔ ڈاڑھ، دانت کے نام سے مُنہ میں خاک نہیں، بھاڑ سا کُھلا۔ نیلے نیلے مسوڑھے سڑے۔ تالو توے کا پتّا؛ جیب جُھلسی، چھالے پڑے۔ ہاتھ دَہنا برگد کا ٹَہنا۔ بایاں جو زمین پر ڈالا تھا، وہ ساکھو کا ڈالا تھا۔ سینۂ پُرکینہ تنگ۔ چھاتیوں کے تکّے تکّے کی صورت لٹکتے، دمِ رفتار ٹانگوں میں اٹکتے۔ پیٹ کے پلیٹ کی انتہا نہیں، بے خاکِ گور کبھی بھرا نہیں۔ دل پہاڑ کی سِل۔ گُردہ توپ کا مُقابل۔ بغلوں سے کیچڑ بہتی۔ ناف جیسے گُھنٹا بیگ کی گڑھیا۔ ٹانگ ہر ایک تاڑ سے بڑی۔ کھڑی ہو تو سقفِ بے سُتوں کی آڑ ہو، گُنبدِ چرخ کی پاڑ ہو۔ پھیلائے پڑی تھی، گویا پتھورا کے محل کی کڑی تھی۔ ہڈّی سے گوشت، گوشت سے کھال جُدا۔ پیرزال، فرہاد کُش بُڑھیا۔ چہرے کا یہ رنگ کہ سِلہٹ کی سِحَر کا اُس کے رُو بہ رُو مُنہ سفید ہو جائے، شبِ فُرقت کی سیاہی میں کالی بلا سی نظر آئے۔ گھونگر کا وہ ڈھنگ کہ سب کہتے تھے: بیچا ہے، لڑکوں کو نہ ڈرائیے۔ ماتھے پر سیندُور کا ٹیکا دور سے نظر پڑتا اور سفید جُونڈا چنور کی طرح لٹکتا۔ سیاہی کا دَھبّا بجز تیرہ بختی کہیں نہ دیکھا۔

ایسے سر کی مانگ میں بھی مانگ جا بجا سیندور بھرا۔ بالوں میں ناریل کا تیل۔ پھٹے پھٹے دیدوں میں ندیدوں کی طرح کاجل ریل پیل۔ گہنے کے عوض سانپ بچھو لپیٹے، کھوپڑی اور ہڈیوں کے ہار گلے میں پڑے، سحر کا سنگار وہ نابکار کیے، پشت بہ بہشت، رُوئے نحس سوئے جہنم، چِت پڑی تھی۔ قد کا ڈول سب سے نرالا، عوج بن عنق کی سگی خالہ۔ یہ دیکھ کے، شہزادہ پیر مرد کو ساتھ لے کے محل سرا کے خیمے میں آیا۔ شہزادیوں نے جان پائی، جلیسوں کے منہ پر رونق آئی۔ خواصوں نے شکرِ جنابِ باری کیا۔ ماما، اصیلوں نے پیر مرد کے قدم پر گر کر عرض کیا، مصرع:

اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما

اُس بزرگ نے فرمایا: ابھی اِس مفسر کے سے نجات نہیں ہوئی، آفتِ عظیم کا سامنا باقی ہے۔ جانِ عالم نے پوچھا: قبلہ! وہ کیا ہے؟ اُس نے فرمایا: اِس کا باپ شہنشاہِ جادوان ہے، کوئی دم میں ضرور آئے گا، بکھیڑا مچائے گا۔ ملکہ مہر نگار مضطرب ہوئی۔ پیر مرد نے فرمایا: اللہ یار ہے، وہ کیا نابکار ہے۔ مصرع:

دشمن اگر قویست، نگہباں قوی تراست

یہ کہہ کر دو ماش چپ و راست پھینکے۔ دو جانور نئی صورت کے پیدا ہوئے: ہرن کے چہرے، طاؤس کا دھڑ، یاقوت کے سینگ، الماس کی آنکھیں، زمرد کے پر۔ اور دو ٹھیکریوں پر کچھ لکھ کر

اُن کے سامنے رکھا۔ وہ ہر ایک پنجے میں دبا اُڑ گیا۔

وہ رات بھی بیم و ہراس میں گزری۔ جس وقت ساحرِ شب گشت عاملِ صُبح کی آمد کے دبدبے سے بھاگا؛ ہَوا تُند چلی، برق چمکی، رَعد کی آواز ہوئی۔ اہلِ لشکر ڈر گئے۔ مَثَلِ مشہور: مار گزیدہ از ریسمانِ پیچیدہ می ترسد۔ پیر مرد کے گرد سب جمع ہوئے، کہ ایک سمت سے غُول کے غُول، غَٹ کے غَٹ جادوگروں کے جھٹ پٹ؛ باز، جُرّے، باشے، بُھجنگے پر نِنگے دھڑنگے سوار، قطار قطار آئے۔ میدان میں مُرشدِ کامل نے اِن کا پَرا جمایا۔ دوسری جانب سے جادوگرنیاں طاؤس اور ناگنوں پر سوار، آتش بازی کے حُقّے اُڑاتی، ناریل اُچھالتی؛ اِکتارے چھیڑتے، بادلے کی جھنڈیاں کُھلی، ہَوا سے اُڑتی ہوئیں؛ آپس میں چھیڑ چھاڑ، سحر آزمائیاں، ہاتھوں کی صفائیاں ہوتی، لڑائی کے عزم پر ہَر ہَر کرتی موجود ہوئیں؛ اُسی پَرے کے مُقابِل ٹھہریں۔

اِنھیں دیکھ کے جانِ عالَم کا جی کُلبلایا، فوج کے سرداروں کو بلایا، فرمایا: گو آج دَغدغہ کامل ہے؛ اگر فضلِ الٰہی شامل ہے تو یہ جلسہ اور معرکہ دیکھنے کے قابل ہے۔ زندگی ہے تو ایسا روز کبھی کاہے کو نظر سے گزرے گا، وگرنہ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ ہماری فوج بھی چمک دمک سے صَف آرا ہو، اسباب نیا سب نکالو۔ یہ خبر سُن کر پہلے بیلدار نکلے۔ پَست و بَلند زمین ہموار کر، کنکر پتھر چُن کر، جھاڑی جُھنڈی کاٹ ڈالی؛ جھاڑی ہوئی زمین صاف برابر نکالی۔ پلٹنوں کی خاطر مُورچے درست کیے،

توپوں کے لیے دمدمے باندھے، جھانکی لگائی۔ کہیں سرنگ کا پوشیدہ رنگ جمایا، باروت کو بچھایا، میدانِ جنگی بنایا۔ پھر سقے آب پاشی کر گئے۔ توپ خانے والے بانچھوں میں پانی بھر گئے۔

فوج کی آمد ہوئی۔ صفِ کارزار، موت کا بازار آراستہ ہوا۔ راس و چپ پانچ پانچ سے ہاتھی مست، پٹے سونڈوں میں، گل کاری بھسونڈوں میں۔ دانت سفید، آب دار، اُن پر چوڑی جواہر نگار چڑھی۔ ایک ایک پہلوان ثانیِ رستم دستاں، قوی ہیکل، زرہ پوش، گرزِ گراں، کوہ شکن بر دوش اُن پر سوار۔ پھر پلٹنیں اور توپ خانہ آیا، انھیں قرینے سے جمایا۔ کیا کیا توپ فلک شکوہ، شعلہ دہاں، آتش فشاں، سورج جھنکار اور نانک متے کے پیتے کی، گردونِ گردان پر چوٹ کرنے والی، غضب سے بھری، ترحّم سے خالی۔ مدد کو ہوٹ، کوسوں کی چوٹ کی۔ اور وہ غباری، جس کا گولہ قصرِ زنگاری میں آ تا ہے۔ پھر سواروں کے پرے میں میمنہ، میسرہ، قلب و جناح، ساقہ و کمیں گاہ درست کر دیا۔ آگے ہراول۔ پیچھے سواروں کے پیدل فوجوں کے دَل۔

نقیب چار سو سے نکلے، کلّے سے کلّہ، کنوتی سے کنوتی، پٹھے سے پٹھا، دُم سے دُم، سُم سے سُم ملا دیا۔ نشان برداروں نے علم سبز و سرخِ زر افشاں کو جلوہ دیا۔ سرِ ہر علم ماہی پرچم کی چمک چشمِ دلاوراں میں بادۂ جرأت کا کام کر گئی۔ نامردوں کو ہول ہوئی، بھاگنے کی فکر پڑی، پیٹ میں کھلبلی مچی۔ کتنوں کی چلتے چلتے گانڑ چلی۔ دریائے فوجِ ظفر موج موج زن ہوا۔ حشر کا میدان رن ہوا۔ غرّشِ کوسِ حربی، صدائے نقارخانۂ جنگی چرخ پر برجِ ثور تک،

زیرِ زمیں گاوِ ثریٰ کو پہنچی۔ اور صدمۂ دمامۂ تندر نہیب، آوازِ دُہلِ گوش فریب سے کُرۂ اَرض و سَما دَہل گیا۔ اور کرنا ے چینی نے غریو سے صوُر کی ہمدمی کا دم بھرا۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَہَا کا وقت قریب آیا۔

جانِ عالم بھی بہ صد جاہ و حشم اسپِ پری پیکر پر جلوہ گر ہوا۔ چترِ زرنگار بالاے سَر، تاجِ شہریاری کج کرکر، شمشیرِ برق دَم زیبِ کمر، فولادی سپر پُشت پر۔ دہنے ہاتھ میں نیزۂ اژدہا پیکر، دو زَبان۔ بائیں ہاتھ میں مَرکبِ رشکِ صَرصَر کی عناں۔ فتح و نُصرت جِلَو میں، اِقبال یاوَر تگ و دو میں۔ ہمّت و غیرت دست بستہ بہم، جُراُت زیرِ قدم۔ قربوسِ زیں میں کمانِ کیانی، چہرے پر رُعب و جلالِ کشور ستانی۔ سمندِ صبادَم کو گرم عناں، رخشِ تیز قدم کو جولاں کرکے پَرے کے برابر باگ لی۔ چاؤشِ طرار "خبردار باش" للکارا۔ مریخ سا خنجر گذار، بالاے چرخ "اَلْاَمان" پکارا۔ فوج کو ملاحظہ فرمایا۔ کڑکیتوں نے کڑکا شروع کیا۔ نقیبوں نے نہیب دی کہ دِلاورو! آج عرصۂ جنگ جگہ نام و ننگ کی ہے۔ دُنیا میں زندگی چار دِن ہے۔ لڑنے بھڑنے کا، نوجوانو یہی سن ہے۔ کسی کو بقا بجز ذاتِ خدا نہیں۔ ہمیشہ دُنیا میں کوئی جیتا رہا نہیں۔ شعر:

رستم رہا زمیں پہ نہ سامؔ رہ گیا ①
مَردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

اِس صدا سے، جو سدا کے بہادُر، صاحبِ جُرأت تھے؛ اُن کا دریائے شجاعت سینے میں مَوج زَن ہوا۔ مونچھیں کھڑی، آنکھیں سُرخ، چہرے بشّاش ہو گئے۔ بسانِ شیر وہ دلیر قبضہ ہائے شمشیر دیکھنے لگے اور چُست و چالاک ہو کر مُستعِدِ کارزار ہوئے، جاں فشانی کو تیّار ہوئے۔ ہر دم باہم یہ اِختلاط تھا: دیکھیں، آج تلوار کس کی خوب کاٹتی ہے! کس کس کا لہو چاٹتی ہے! پہلے نیزہ کس کا سینۂ عدو پر چلتا ہے! اور نیزے کی طَعن پر کون کون چھاتی تانتا ہے، لوہا کون مانتا ہے! کس کے تیر کے نشانے سے خون کا فوّارہ اُچھلتا ہے! آبِ پیکاں سرِ میداں دُشمن کے حلق میں کون اُتارتا ہے! سرِ پیکاں کس کا تالَبِ سوفار سُرخ رُو ہوتا ہے! کس کو کون للکار کر، ڈانٹ کر مارتا ہے، دَدا کو کون پکارتا ہے! عرصۂ کارزار میں حقِ نمک آقا کا ادا کیجیے، دشمنوں کا لہو پیجیے۔ جب بگڑے تو وہ کام بنے جس سے رُستم کی گور تھرّائے، سام و نریمان کا رنگ فق ہو جائے۔ کوہ کو پَرِ کاہ کی طرح اُکھاڑے۔ دیو سامنے آجائے تو پچھاڑے۔ رئیسِ قدرداں سرِ میداں سرگرمِ نظّارہ ہے؛ دیکھیے کون کام کا ہے، کون ناکارہ ہے! کس کے ہاتھ کھیت رہتا ہے، کون کون کھیت رہتا ہے! مَن چلا پن کرلو، زرِ سُرخ و سفید سے سپریں بھرلو۔ آج ہی تو آن بان ہے۔ یہ گُو، یہ میدان ہے۔ ڈھل گنڈوں کا 'لاحول وَلا' عجب ڈول ہوا کہ ہَول سے

چہرے زرد، لب پر آہِ سرد۔ مُنہ پر ہوائیاں اُڑتی تھیں، ہر بار بھاگنے کو باگیں مُڑتی تھیں۔ کھڑے ہوئے اپنے مُنہ نُوچتے تھے، بھاگنے کی راہ سُوچتے تھے۔ پیٹ پکڑے پھرتے تھے، دست سَرِ دست چلے آتے تھے۔ ڈر کے مارے بے مارے مُوئے جاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا: میاں! جی ہے تو جہان ہے۔ نوکری نہ ملے گی، بھیک مانگ کھائیں گے، جانیں کہاں پائیں گے! حُرمت گئی تو گئی، جوتی پیزار سے، جان تو رہے گی، لہو کی ندی بدن سے نہ بہے گی۔ یہی نا کوئی نامَرد کہے گا، آبرو جائے گی؛ جی تو رہے گا۔ یہاں بگڑی، اور کہیں بنالیں گے۔ تیر تلوار کی گُولی بچاکر، گالیاں کھالیں گے۔ لڑنے کو سپاہیوں نے کمریں باندھی ہیں؛ کُوسنے کو ہم موجود ہیں، کُوسوں بھاگنے کو آندھی ہیں۔ جُوکیں لگانے میں، ہمارے ماں باپ بھنگ پلاتے تھے، معجون کِھلاتے تھے۔ کسی کی فَصد کُھلی دیکھ کر ہمیں غَش آتے تھے۔ ہم تو دوست ہو یا دشمن، دونوں کی خَیر مانگنے والے ہیں۔ سب سے پہلے مَعرکے سے بھاگنے والے ہیں۔ ہمیشہ گالی گلوچ کو خانہ جنگی، دَھول دَھپّے کو میدان داری سمجھے۔ لڑائی بِھڑائی سے کبھی بِھڑ کے نہ نکلے۔ تمام عُمر بدن میں سوئی نہ گڑی۔ یہ سر وہ سِپَر ہے جس پر جوتے کے سوا کوئی چیز نہیں پڑی۔ بے غیرتی کا بھلا ہو، جس کے صدقے میں آج تک جان سلامت رہی۔ اِس پر بھی قسمت نے یہ روزِ سیاہ دِکھایا! خُدا نے ہمیں ہیجڑا کیوں نہ بنایا!

فوج میں تو اس طرح کی کھلبل، ہلچل مچی تھی؛ ادھر انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار نے ایک اونچا ٹیکرا تجویز کر، خیمہ بپا کیا۔ چلمن چھوڑ آ بیٹھیں، سیر دیکھنے لگیں۔ اس عرصے میں لشکرِ غنیم کی آمد ہوئی، یعنی شہپال جادو سیاہ رو، نولاکھ ساحر کا پرا ہمراہِ رکاب، شکست انتساب لے کر، تخت پر سوار، چالیس اژدرِ خون خوار تخت اٹھائے، شعلے نکلتے، بھاڑ سا منہ ہر ایک پھیلائے، بڑے کر و فر سے آیا۔ فوجِ بے قیاس وہ خدا ناشناس لایا اور سامنے جوانانِ تہمتن و گردانِ صف شکن کے اپنا پرا جمایا۔ پھر علم کالے آگے نکالے اور پرچمِ سیاہ ہم صورتِ بخت اس گم راہ کے، کھلے۔ دف و نے اور جھانجھ بجنے لگے، ادھر کوس و کورگرجنے لگے۔ دونوں لشکر لڑائی پر تلے۔ وزیر اس کا کچھ پیام پہلے پیر مرد کے پاس لایا، دستِ ادب باندھ کر عرض کی: ایلچی کو زوال نہیں، زیادہ گوئی کی مجال نہیں، شہپال نے فرمایا ہے: تمھارا جینا مرنا برابر ہے کہ گرم و سردِ زمانہ دیکھ کر عمرِ طبعی کو پہنچے؛ مگر ان نوجوانوں پر، اپنے بے گانوں پر رحم نہ کیا۔ ان کے خون کا حساب، اپنے اعمال کی کتاب پر لکھوایا، بوجھ اپنے ذمے لیا۔ پیر مردِ خوش تقریر نے فرمایا: اس اجل رسیدہ پیرِ نابالغ سے کہنا: طرفین سے جس کا خون زمین پر بہے گا؛ اس کا مظلمہ، مواخذہ؛ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی، اس کی گردن پر رہے گا۔ ہم سمجھتے تھے وہی ننگِ خاندان تھی؛ لیکن اب معلوم ہوا: وہی زمین سے اگتا ہے، جو بوتے ہیں؛ ایسوں کے ویسے ہی ہوتے ہیں۔ تجھے سفید ڈاڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مری، تیرا کلنک کا ٹیکا مٹا۔

تو تو اُس سے زیادہ بے حیا، بیسہ قلب نکلا۔ یہ مقامِ رزم ہے جائے نیزہ و شمشیر، یا بزم ہے جو محلِ تقریر ہو؟ گفتگو بے فائدہ ہے، لاطائل باتوں سے کیا حاصل۔ جو منظور ہو، بسم اللہ، اُس میں دیر نہ کر۔ دیکھیں آج کس کے حصے میں تخت و تاج ہوتا ہے اور گور و کفن کو کون محتاج ہوتا ہے!

وزیر محجوب پھرا، شہپال سے سب حال کہا۔ پھر تو وہ کافرِ غدّار، گبرِ ناہنجار مثلِ مارِ دُم بُریدہ برخود پیچیدہ ہو، شعلۂ غضب سے وہ ناری جل گیا۔ چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ پہلے تو آپ حقۂ آتشی پیر مرد پر مارا، پھر لشکر کے سرداروں کو، جادوگرِ ناہنجاروں کو للکارا۔ دو پہر تک عجیب و غریب سحر سازی، ہنگامہ پردازی، جادوگر اور جادوگرنیوں کی لڑائی رہی کہ دیکھی نہ سُنی۔ کسی نے کسی کو جلایا، کسی نے بجھایا۔ کسی سنگ دل نے پتّھر برسائے، سب کچھ سحر کے نیرنگ دکھائے۔

آخر کار جب جادوگری ختم ہوئی، لڑائی کی نوبت بہ گُرز و شمشیر و نیزہ و تیر آئی، پھر تو شہزادۂ جانِ عالم کی بن آئی، باگ اُٹھائی۔ فوجِ جرّارِ غازیانِ نامدار خبردار ہوئی، سپاہ مانندِ ابر چار سمت سے گھِر آئی۔ صف کی صف دھڑ دھڑکی، برقِ شمشیر چمکی۔ پہلوانوں کے نعرے نے رعد کا کام کیا۔ خوب لوہا برسا، بوند بھر پانی کو ہر ایک زخمی ترسا۔ یہ سب تازہ دم، وہ دو پہر کے شل، سیکڑوں ٹاپوں میں کچل گئے، گھوڑوں کی جھپٹ میں کھندل گئے۔ شمشیر

صاعقہ خصالِ جانِ عالَم کا یہ حال تھا: جس کے سر پر پڑی، خُود و سر اُس خُود سَر کا کاٹا۔ حَلْق میں قطرۂ سیماب کی طَرح اُتر، سینۂ پُر کینہ کا لہو چاٹا۔ وہی سر جو پناہِ خُود میں تھا، پلک جھپکی تو گود میں تھا۔ پھر گھوڑے کے تنگ سے چُست گُزر، زخم کُشادہ کر، خانۂ زیں سے زمین میں قرار لیا۔ سَرِ بالیں اُس کے قضا کو رُوتے دیکھا، اُسے خوابِ مرگ میں پاؤں پھیلائے سُوتے دیکھا۔ مَلَکُ المَوت کی صدا آئی: وہ مار لیا جس پر ایک کر ایک وار کیا، دُو کیا؛ دُو کو چار کیا۔ حواسِ خمسہ کسی کے درست نہ تھے، ششدر ہو گئے۔ ساتوں طَبَق زمین کے تھرّائے، آسمان کو چکّر ہُوا، مُردے قبروں سے چَونک کے باہر نکل آئے۔ جو اَٹکا، اُسے مار لیا، بھاگتے کا پیچھا نہ کیا۔

گھڑی بھر میں خون کا دریا بہ گیا، لاشوں کا اَنبار رہ گیا۔ کاسۂ سَر حبابِ دریا کی طَرح بہتے نظر آتے تھے۔ موجِ خوں میں دھڑ، دھڑا دھڑ غُوطے کھاتے تھے۔ دشمنوں کی کشتیِ زیست طوفانی تھی، آبِ تیغ کی طُغیانی تھی۔ فوجِ عدو کا زندگی سے دل سیراب اور اُچاٹ تھا۔ لہو لُہان ہر تلوار کا گھاٹ تھا۔ کوسوں تک لاشے پٹے تھے، یہ پاٹ تھا۔ آخر کار فوج کو شِکست ہوئی۔ شہپال کو مارا، سر اُس خُود سَر کا مثلِ خیارِ تَر اُتارا۔ سپاہِ باقی ماندہ اُس تیرہ بخت، نِگوں سار کی فَرار ہوئی، زندگی دشوار ہوئی۔ پھر تو غازیانِ فتح نصیب و جادُوانِ مَہیب لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ سب کچھ لوٹا، ساز و سامان اُن کا ذرّہ نہ چھوٹا۔

اِدھر نشان کھلے، شادیانے بجے۔ وہ سب چادر پھراتے، ماتم کرتے، گریباں چاک، سر و رُو آغشتۂ خاک، دمِ سرد بھرتے، جس کا مُنہ جدھر اُٹھا، بھاگ نکلے۔ میدان کُشتوں سے اَٹ گیا، جنگل لاشوں سے پَٹ گیا۔ آج تک طُعمۂ زاغ و زَغَن اُسی بَن سے ہے۔ صحرائی دَرِندوں کے خوب پیٹ بھرے؛ بلکہ جانوروں کی دعوتوں کو، گوشت کے مُچّے قیمہ کیے اُٹھا رکھّے۔ بہت ہَیضہ کر کر مرے۔ وہ سرزمیں، قَلعَہ، خزانہ جانِ عالم کے قبضے میں آیا۔ بڑی جُستجو، تگاپُو سے وہ لَوح اور نقش پایا۔ پیر مرد رخصت ہوا اور جتنے مَدارِجِ پند و نصیحت تھے، مُکرّر سمجھائے۔ راہ کا خطر، مصیبتِ سفر، ہر منزل و مقام کا نَفع و ضَرَر کہہ کر، کہا: میری جان! اب ایسی حرکت، وہ سامان نہ کرنا جو پھر کوئی روزِ سیاہ دشمنوں کے سامنے آئے، دوستوں سے دیکھا نہ جائے۔ ہم سے باغ چھوٹے، کوہِ الم ٹوٹے۔ تُو اللہ حافظ و ناصر رہے! رسول اُس کا تمھارا مددگار و یاوَر رہے!

روانہ ہونا شہزادۂ جانِ عالم کا اُس دشت سے با فتح و ظفر اور اُترنا دریائے شُور کے کَنارے پر۔ آنا جہاز کا، سوار ہونا یارانِ دَم ساز کا۔ پھر جہاز کی تباہی، باہم کا تَفرِقہ، معشوقوں کی جُدائی۔ پھر جوگی کا سمجھانا،

توتے کا مل جانا، ڈوبتوں کا ترنا۔

آشنایانِ بحرِ تقریر و غوّاصانِ محیطِ تحریر، شناورانِ شطِّ اُلفت و غریقِ لجۂ محبّت نے گوہرِ آب دارِ سخن کو سلکِ گفتار میں منسلک کرکے زیبِ گوشِ سامعانِ ذی ہوش اِس طرح کیا ہے کہ بعد فتحِ جنگِ جادو شہپال اور ہاتھ آنے خزانۂ مالامال کے، ڈو مہینے تک تفریحاً لشکرِ نُصرت اثر شب و رُوز اُس دشت میں جلوہ افروز رہا۔ جب پیرمرد باغ کو تشریف فرما ہوا، جانِ عالم نے کوچ کیا۔ چند مدّت کے بعد ایک روز خیمہ لبِ دریائے شور ہوا۔ شہ زادہ معشوقوں سے باہم، تماشا بحرِ زخّار و نظارہ امواجِ پیچ دار کا اور سیر دریائے ناپید اکنار کی، پانی کا زور، ہوا سے دریائے شور کا شور، کیفیتِ لطمہ و گرداب دیکھتا تھا، دید دریائی جانوروں کی کرتا تھا۔ نظم:

آب کیسا کہ بحر تھا زخّار ۔۔۔ تُند و موّاج و تیرہ و تہ دار①
موج کا ہر کِنایہ طوفاں پر ۔۔۔ مارے چشمک حباب عمّاں پر
گذرِ موج جب نہ تب دیکھا ۔۔۔ ساحل اُس کا نہ خشک لب دیکھا

ناگاہ ایک جہاز پُرتکلّف، بانقش و نگارِ بسیار صبا وار نمودار ہوا۔ شہ زادہ سمجھا: کوئی سوداگر کہیں جاتا ہے۔ جب قریب آیا، جہاز کو لنگر کیا اور ناخُدا درِ دولت پر شرف اندوز ہوکر عرض کرنے لگا: ہم لوگ ملّاح ہیں، یہاں جو شاہ و شہریار رونق افزا

ہوتا ہے، ہم اُسے دریا کی سیر و شکارِ بحری، جانورِ آبی دکھاتے ہیں۔ مُوافقِ قَدر، جو قسمت میں ہوتا ہے، انعام پاتے ہیں۔ یہ سُن کر خواہشِ سیرِ دریا شہزادے کے سفینۂ دل میں موج زَن، نَطمَہ پیرا ہوئی، ملکہ سے کہا: چلتی ہو؟ اُس نے عرض کی: ہنُوز گردابِ غم، تلاطُمِ اَندوہ و اَلَم سے ساحلِ فرحت و طَرَب کی ہم کناری مُیسّر نہیں ہوئی؛ آپ کو اور لہر آئی، نیا ڈھکوسلا سوجھا۔ جانِ عالم نے کہا: دریا کی سیر جی مسرور کرتی ہے، خَفَقان دور کرتی ہے، طبیعت بَہَل جاتی ہے، لاکھ طَرح کی کیفیت نظر آتی ہے۔ تم نے سُنا نہیں قولِ سعدؔی، مصرع:

بدریا در مَنافع بے شمار است①

دو چار گھڑی دل بہلا چلے آئیں گے، مَلّاح محروم نہ رہ جائیں گے۔ ملکہ مہر نگار نے مُتَرَدِّد ہو کر کہا: یہ سب سچ ہے جو آپ نے فرمایا، خَفَقان کیسا، تمھارے دشمنوں کو نِرا مالیخولیا ہے، میں تے بارہا انجمن آرا سے کہا ہے؛ سو یہ مَرَض لادَوا ہے، پانی سے دُونا ہوتا ہے۔ اِس کے سِوا، میرے دماغ میں بھی کیا خَلَل ہے؟ میرا دوسرے مصرع پر عَمَل ہے، سعدؔی:

اگر خواہی سلامت، بر کنار است②

شہزادہ بدمزہ ہوا، فرمایا: خَیر ہم تو سِڑی ہیں، تنہا جائیں گے؛ تم نہ چلو، بیٹھی رہو، آرام کرو۔ جُدائی کی تاب محبّت کے مُبتَلا کو کہاں ہے، اُلفت کا یہی بڑا امتحاں ہے؛ ناچار اُسی دم ملکہ مہر نگار اُٹھی اور

انجمن آرا مع چند خواص ہمراہ ہوئیں، جہاز پر پہنچیں۔ بادبان کھنچے، پالیں چڑھیں۔ مہر نگار مضطرب وار یہ شعر پڑھنے لگی، حزیں:

دریں دریاے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا①

دل افگندیم بسم اللہ مجریها و مرسٰها

لوگ مصروفِ تماشا، بلکہ غریقِ بحرِ تفکر، غوطہ زنِ گردابِ تحیّر، لطمۂ اندوہ و الم کی آشنا۔ بار بار انجمن آرا سے کہتی تھی: خدا خیر کرے! دشمن نہ ایسی سیر کرے! بے طور موجِ الم سر سے گزرتی ہے، خود بہ خود پانی دیکھ کر جان ڈرتی ہے، اللہ حافظ و نگہبان ہے۔ سراسر سامانِ بد نظر آتے ہیں، کلیجا خوف سے لرزاں ہے۔

القصّہ، چار گھڑی جہاز نے بادِ مراد پائی، سیر دکھائی، پھر آفت آئی۔ ناخدا چلّایا، ملّاح ہراساں ہوئے۔ شہ زادے نے پوچھا: کیا ہے؟ عرض کی: طوفانِ عظیم الشان اٹھا ہے۔ ابھی یہ ذکر تھا، ہوا عالم گیر ہوئی، جہاز تباہی میں آیا، بادبان ٹوٹ گئے، مستول گرا؛ ملّاحوں کے چھکّے چھوٹ گئے، سنبھالنے کا مقدور نہیں رہا۔ آخرش تلاطمِ آب، صدمۂ پیچ و تابِ موج سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ملی، کون ڈوب گیا، کون جیتا رہا۔ ایک سے دوسرا جدا ہو گیا۔ جانِ عالم تختے کے سہارے سے ڈوبتا ترتا، چار پانچ دن میں کنارے لگا۔ جب تکان پانی کی موقوف ہوئی، غش سے آنکھ کھلی، دیکھا: کنارے گیا ہوں، بلکہ گور کے کنارے لگ رہا ہوں۔

بڑی جِدّ وکد سے اُترا، آہستہ آہستہ بیٹھتا اُٹھتا ایک طرف چلا، بستی میں پہنچا۔ وہاں کے باشندے اِس کا چہرہ اور جمال، یہ خراب حال دیکھ کر بہت گھبرائے، قریب آئے۔ کوئی بولا: یہ پری زاد ہے، مثلِ سَرْوِ آزاد ہے، چمنِ حُسن و خوبی کا شمشاد ہے۔ کسی نے کہا: ابھی تو دِن ہے، یہ از قسمِ جن ہے۔ غَرَض کہ جن جن نے اِسے جِن کہا تھا، پاس آ، کچھ خوف سا کھا اِس طرح بولے، اُستاد، مصرع:

کون ہو، کیا ہو، سچ کہو حور ہو یا پری ہو تم①

شاہ زادۂ مَصائب دِیدہ نے دمِ سرد دلِ سوختہ سے بھر کے، چشمِ خوں بار تَر کرکے اُن لوگوں سے کہا، لا اَعْلَم:

جائے دارم چناں کہ دشمن خواہد
جانے دارم کہ فرقتِ تن خواہد
ناکامیِ خویش را اگر شرح دہم
دشمن بخدا زندگیِ من خواہد

اَیُّھَا النّاس! مَیں گُم کردہ کارواں، جَرَس کی طَرَح نالاں ہوں۔ دل گرِفتہ، نقشِ پائے یارانِ رفتہ، حُمُق میں گرِفتار ہوں، بچھڑوں کا طالبِ دیدار ہوں۔ غریبِ دِیار، بے تاب، دانہ نصیب ہوا نہ آب، مُفارَقتِ یارانِ چند سے خستہ و خراب۔ ہوش و حواس یک لَخت زائل، ضُعف سدِّ راہ، ناطاقتی حائل۔ یاروں کی صورت نظر آتی نہیں، دیدۂ دیدار طَلَب میں بینائی نہیں۔ نہ تابِ رفتار، نہ طاقتِ گفتار۔ مؤلّف:

بسانِ نقشِ پا بیٹھے جہاں، واں سے نہ پھر سَر کے
ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا

بہ یادِ دوستاں پہروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے
کہیں مذکور جب ہوتا ہے کچھ گزرے فسانوں کا

عَلَم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظَفَر ہم کو
کہ باعث فتح کا ہوتا ہے، کُھل جانا نشانوں کا

چُھڑائے جبر سے پیرِ فلک نے دوست سب میرے
مٹے گا داغ کب دل سے مرے اُن نوجوانوں کا

شرر مُنھ سے نکلتے ہیں سُرورِ دلِ حزیں ہر دم
بھلا دیواں ہو کیوں کر جمع ہم آتش بیانوں کا

اِس حکایتِ جاں سوز، شکایتِ چرخِ بے مہر، غم اندوز سے سب رونے لگے، کہا: یہ شاہ زادہ عالی تبار ہے؛ اِلّا، دل آزردہ دست دادہ، محبوبوں سے دور فتادہ، اِس سبب سے دل افگار ہے۔ منّت و سماجت سے مکان پر لے گئے۔ ہاتھ مُنھ دُھلوا کھانا پانی حاضر کیا۔ شہ زادۂ جانِ عالم نے آب و طعام دیکھ کر رو دیا، یہ کہا، اُستاد:

ہو خاک بھوک کی اُس فاقہ مست کو پھر جہاں تجھ ①
جو اپنا خونِ جگر، روز ناشتا سمجھے

خدا جانے میرے بچھڑوں کا کیا حال ہوا! کسی کو دانہ پانی مُیسّر آیا، یا کچھ نہیں پایا! میں بھی نہ کھاؤں گا، بھوکا پیاسا اِسی کوفت میں مر جاؤں گا۔ وہ بولے:

حضرت سلامت! کھانے پینے سے انکار۔ نادانی ہے، اِسی سے بَشَر کی زِندَگانی ہے۔ جو جیتے ہو تو کسی روز بِچھڑوں سے مل جاؤگے، وگرنہ غُربت کے مرجانے میں گور و کفن بھی نہ پاؤگے۔ ناچار سب کے سمجھانے سے، دو ایک نوالے بہ جَبر حَلق سے اُتارے۔ پانی جو پیا، ہاتھ پاؤں سَنسنائے، پیہم غش آئے۔ جب طبیعت ٹھہری؛ سب حالِ پُر ملال، جہاز کی تباہی، اَنیسانِ ہم راز کی جُدائی، اپنا ڈوبتے اُچھلتے وہاں تک آنا، اَوروں کا پتا نہ پانا بیان کرکے، بہ قولِ میرزا حُسین بیگ صاحِب یہ کہا، بَیت:

ہمرہاں رفتند و ما ماندیم و دُزد داں در کمیں①
خانۂ ملّاح در چین است و کشتی در فرنگ

سب تأسُّف کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا: یہاں سے دو منزل ایک پہاڑ ہے، کوہِ مطلب بَرآر نام ہے، اُس پر جُوگی کا مَقام ہے؛ مردِ باکمال، شیریں مَقال۔ ہزاروں کوس سے حاجت مند اُس کے پاس جاتے ہیں، سب کے مطلب بَر آتے ہیں۔ بس کہ اُس پر عنایتِ باری ہے، چشمۂ فیض اُس سے جاری ہے۔ مشہور ہے کہ آج تک کوئی شخص محروم، ناکام اُس مَقام سے نہیں پھرا۔ یہ مُژدہ سُن کر چہرے پر بَشاشَت چھاگئی، گئی ہوئی جان اُسی آن بدن میں آگئی، گھبرا کر یہ شعر پڑھا، حافظ:

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند   آیا بُوَد کہ گوشۂ چشمے بما کنند②

اُسی دم چلنے کا عزم کیا۔ وہ لوگ مانع ہوئے، کہا: ابھی جانے کی طاقت آپ میں آئی نہیں، پاؤں میں راہ چلنے کی تاب و توانائی نہیں۔ دو چار روز یہاں آرام کرو۔ قوت آجائے تو مختار ہو۔ غرض کہ جانِ عالم نے اُن لوگوں کے سمجھانے سے وہاں مُقام کیا۔ عجب پریشانی میں صُبح کو شام کیا کہ گرد وہ سب حلقہ زن، یہ بہ اندوہِ معشوقاں گرفتارِ رنج و محن۔ کبھی تو محزوں چپ رہتا، گاہ مثلِ مجنوں خود بہ خود بکنے لگتا۔ اور جب حواسِ خمسہ دُرست ہوتے، یہ خمسہ پڑھتا، اُستاد:

ہر سو خبرِ اُلفت کیا آپ سے پہنچائی ①
آگے بھی مرے لب پر فریاد کبھی آئی
کیوں مجھ سے بگڑتا ہے او کافرِ ترسائی
تا داشت دلم طاقت، بودم بہ شکیبائی
چوں کار بجاں آمد، زیں پس من و رسوائی

گاہے مرے لب پر ہے فریاد، گہے افغاں
پیارے! غمِ دوری سے میں سخت ہوں اب نالاں
یہ جائے ترحّم ہے، کر رحم ذرا جاناں
در زاویۂ الفت دور از تو چو مہجوراں
تنہا منم و آہے، آہ از غمِ تنہائی

ہے دن کو تو یہ عالم ظالم، ترے مجنوں پر
ہیں گرد کھڑے لڑکے، جھولی میں بھرے پتھر

سُونے کی کسے فُرصت، اے یار اِسے باوَر کر
شبہا منم و اشکے، وز خون ہمہ بالیں تر
عشق ایں ہُنرم فرمود، از عیب نفرمائی
اَعضا شِکنی گا ہے، گہ دردِ جگر، دیکھو
رومال بھگوتا ہوں لاکھوں ہی کبھی رُو رُو
گردن زَدَنی ہوں میں، شکوہ کروں تیرا، گو
صد رنج ہمی بینم اے راحتِ جاں از تو
از دیدہ تواں دیدن چیزیکہ تو بنمائی
تھا تاب و تحمّل میں یکتا جگرِ خسرو
آگے تو نہ بہتی تھی سِلکِ گہرِ خسرو
تم اب تو نوازش لو چل کر خبرِ خسرو
بس دُر کہ ہمی ریزد از چشمِ ترِ خسرو
کز دست بروں رفت است سر رشتۂ دانائی

آخرش، وہ رات کی رات بہ ہزار عُقوبات تڑپ تڑپ کر سحر کی، نمازِ صُبح کے بعد پہاڑ کی راہ لی۔ چار دن میں ناچار وہ راہ طے کی، پہاڑ پر پہنچا۔ سنگِ سفید کا پہاڑ بہت آب دار، مانندِ ہمتِ جواں مردانِ صاف باطن سربَلند اور مثالِ طَبعِ سخنوراں فرح افزا و دل پسند۔ دَرَہ ہائے فَراخ کُشادہ، رُوشن۔ جوشِ نَباتات، رُوئیدگی رَیاحین و لالہ زار سے اور خَروشِ مُرغانِ خوش اِلحان سے رشکِ صد گلشن۔

چشمہ ہاے سرد و شیریں جا بہ جا، فرہاد کی روح کا ٹھکانا۔ ہر قسم کا میوہ دار درخت قدرتِ حق سے اُگا، پھولا پھلا۔ پتھر ہر ایک معدنِ لعل۔ پرند چرند صاحبِ حُسن و جمال۔ یہ سیر دیکھتا چلا۔ ایک طرف درخت گنجان، گھنے، پختہ مزار بیدار دلوں کے بنے۔ اور مَنڈھی کا گنبد بسانِ گنبدِ گرداں، بیستوں کا جواب بنا۔ ترسول کھڑا، کھاروے کے جھنڈے پھر پھر اُڑتے، کلمۂ شہادت بہ خطِ جلی اُس پر لکھا صاف معلوم ہوا۔

جب اُس کے نزدیک آیا؛ دور دور تک مکان صاف، صحن شفاف پایا۔ مَنڈھ کے رو بہ رو درخت کے تلے چبوترے کے اوپر ایک جوگی، سو سوا سے برس کا سن و سال، مگر ٹانٹھا کمال۔ ڈاڑھی ناف سے بڑی، گرہ لگی۔ جٹا ہر ایک راکھ سے بھری، قدم بوس ہو رہی، پاؤں پر پڑی۔ پلکیں دیدۂ حق بیں کا اسرار چھپانے کو، چشمِ حاسد کی گزند بچانے کو مونچھوں سے ملیں۔ جسم میں موجِ دریا کی طرح جھرّیاں پڑیں۔ کمر پر کردھنی موٹی سی مہین بان کی، عجب آن بان کی۔ کھاروے کا لنگوٹ سترِ عورتین کی اوٹ۔ گلے میں محمودی کی کفنی، سامنے گریبان پھٹا، کارِ سوزنی، سر پوشیدہ نہیں، کھلا، حقّہ چوگانی مُنہ سے لگا۔ افیونیوں کی شکل بنائے، شیر کی کھال بچھائے، بھبوت رمائے، دید وادید سے بہ ظاہر آنکھیں بند، مگر دیدۂ دل کھلا۔ خموشی پسند، قلب گویا بولتا۔ سوتا نہ جاگتا، آسن مارے، دُنیا سے کنارے خدا جانے کس پینک میں بیٹھا۔ پیٹ پیٹھ

سے لگا۔ تیر سا قدِ راست مثلِ کماں خمیدہ، گویا چلّہ کھینچ چکا ہے۔ زنّار آسا رگیں عیاں۔ کھال سے ہڈیوں کے جوڑ شمعِ فانوس نمط نمایاں۔ تسبیحِ سُلیمانی، ایمان کی نشانی ہاتھ میں۔ "ہر بھجو، ہر بھجو" تکیہ کلام بات میں۔ قشقہ، ٹیکا ماتھے پر ہندوؤں کا، اور سجدے کا گھٹّا بدرِ کامل کی صورت چمکتا۔ زرد مٹّی بدن میں، ذکرِ حق دل و دہن میں۔ کہیں مُصلّے پر سُبحہ و سجدہ گاہ رکھی، کپڑے کی جا نماز بچھی، کسی جا پوتھی کھلی، دھونی رمی؛ دونوں سے راہ رکھی۔ عجب رنگ کا انسان، خُلاصہ یہ کہ ہندو نہ مسلمان، بہ قولِ مرزا سودا:

کس کی مِلّت میں گنوں آپ کو، بتلا اے شیخ![1]
تو کہے گبر مجھے، گبر، مسلماں مجھ کو

ایک طرف تکیے میں دو چار کیاریاں، بیلے چنبیلی کی بہار، گُل کاریاں۔ کہیں مُرشدوں کے ڈھیر، گرد کی چھتری، بزرگوں کے مزار؛ اُن پر مولسری کے درخت سایہ دار قطار قطار۔ درختوں کی ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے، جانور باہم بحث کرتے، اٹکتے۔ فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہ، کوکلا کے دم، سنّاٹے کا عالم۔ کہیں مرگ چھالا بچھا، شیر چوکی دیتا، دھونی لگی، لکڑ سلگتا۔ کسی جا ببر کی کھال کا بستر، آہوے صحرائی اُس پر بیٹھا؛ اداسا، تونبا، بے منتّا دھرا۔ ایک سمت بھوانی کا مٹھ، تُلسی کا پیڑ ہرا بھرا، گرد چشمہ پانی کا بھرا۔ جائے دل چسپ، مکانِ رُعب دار، گُلِ خود رُو کی جدا بہار۔ ایک طرف بھنڈارا جاری، کڑھاو چڑھا، موہن بھوگ ملتا۔ کہیں پُلاو،

تَکیے کی تیاری، چھانڈا بٹ رہا تھا۔ کچھ مہنت بالکے، کچھ مُرید حال قال کے۔ کوئی چِلّے میں بیٹھا، کوئی دُنیا سے ہاتھ اُٹھائے کھڑا۔ کسی کے خِرقہ و تاج سر و تن میں، کوئی پچواگن میں۔ کہیں کتھا ہوتی، کوئی وَعظ کہہ رہا۔ ایک طرف خَنجری بجتی، تنبورا چھڑتا، بھجن ہوتے۔ ایک سمت حلقۂ مُراقبے کا بندھا، توجّہ پڑ رہی، لوگ رُوتے۔ عجیب وہ گُرو مُرشِد، غریب یہ مُرید چیلے۔ روز ایک دو کو مُونڈتا۔ تیسرے چوتھے دن عُرس، ہر ہفتے میں میلے۔ حاصِلِ کلام یہ کہ وہ عجب جلسہ تھا کہ دیکھا نہ سُنا۔ یہ اِجتماعِ نَقیضَین آرام و چین سے۔

شہ زادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی، مردِ آگاہ دل، رُوشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اُٹھائی، آنکھ مِلائی۔ دیدے لال لال چڑھے پُر رُعب و جلال۔ جانِ عالم کو بہ غور دیکھا۔ اِس نے جُھک کر مُؤدّب سلام کیا۔ اُس خوش تقریر، شیریں مقال نے کہا: بھلا ہو بچّہ! بڑی مصیبت فلک نے دکھائی جو یہ صورت یہاں تک آئی۔ آؤ بیٹھو، گُرو بھلا کرے۔ مُرشِد کی دُعا سے حق، حاجت روا کرے۔ ہم تمھارے امانت دار ہیں؛ سواری کھڑی ہے، چلنے کو تیار ہیں۔

جانِ عالم مُتحیّر تو ہو رہا تھا، زیادہ حیران ہوا کہ یہ کیا اَسرار ہے۔ پاس جا بیٹھا۔ جُوگی اُٹھا، چشمے میں جاکر نہایا۔ گیروا چادرا پھینک، سفید اُوڑھ، عِطر لگا، جانِ عالم کے نزدیک آ، یہ نُکتہ زبان پر لایا: بابا! ایک دن ذوق شوق کے عالَم میں ہمارے

مُرشد گرُو نے تیرے حال سے خبر دی تھی کہ ایک شہ زادے کا جہاز تباہ ہو جائے گا، وہ بہ سُراغِ مطلب یہاں آئے گا؛ اُس کا کام تجھ سے، تیرا کام اُس کے سامنے پورا ہو جائے گا۔

اِس بات کے سُننے سے شہ زادے کو نہایت مسرّت ہوئی، کہا: جُوگی جی! تمھارے نام سے میری زندگی ہوئی؛ وگرنہ دو چار دن میں گریبانِ صبر چاک ہو جاتا، میں سر پٹک کر ہلاک ہو جاتا۔ خوب صورتی کا بھی عجب مزہ ہے، جہان اِس کا شیدا ہے۔ عالَم کو مرغوب ہے، طرح دار سب کا محبوب ہے۔ پیر فقیر، غریب امیر سب کو عزیز ہے۔ اِس کا خواہش مند ہر باتمیز ہے۔ جوگی سمجھانے لگا کہ یہ اِضطراب عالَمِ اَسباب میں بیجا ہے۔ دیر آید، دُرست آید۔ بابا! دُنیا کا یہ نقشہ ہے: کسی شَے کو ایک وَضع پر دو گھڑی ثبات و قرار نہیں۔ اِس کی نیرنگی کا اِعتبار نہیں۔ گاہ خوشی، کبھی غم؛ یہ دونوں اَمر باہم ہیں۔ کبھی وصل کی شام کو دِل کیسا بشّاش ہوتا ہے، کبھی ہجر کی صُبح کو کلیجا پاش پاش ہوتا ہے۔ ایک شب بستر پر لذّتِ ہم کناری ہے۔ ایک روز پہلو تہی، گریۂ زاری ہے۔ کبھی شبِ وصل کیا کیا اِختلاط ہوتے ہیں۔ گاہ فَصل کے دن سر پیٹتے ہیں، رُوتے ہیں۔ آدمی جب رنج سے گھبرائے اور غمِ مُفارقتِ دوست جان ہونٹوں پر لائے؛ دل کو یہ تسکین دے کر بہلائے، مصرع:

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند [1]

مصرع:

در پسِ ہر گریہ، آخر خندہ ایست [2]

مُصحفی : زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن ①
فصلِ گُل جیتوں کو پھر اگلے برس آئے گی

جو وصل میں راحت و آرام پاتا ہے، وہی ہجر کے دُکھ، قلق اٹھاتا ہے۔ تو نے اُن دونوں بھائی، جو توام پیدا ہوئے تھے، اُن کا قصّہ سُنا نہیں، کہ پہلے انھوں نے کیا کیا صعوبت اُٹھائی، پھر ایک نے سلطنت پائی، دوسرے کے ہاتھ شہ زادی آئی۔ جانِ عالم نے کہا: اِرشاد ہو، کیوں کر ہے؟

حکایتِ پُر عبرت، جاں سوز، حیرت افزا، غم اندوز، یعنی سانحۂ برادرانِ توام۔ جانا شکار کا، دامِ قضا میں پھنسنا طائرانِ پُر اعجاز، عجائبِ روزگار کا۔ پھر ایک نے سلطنت پائی، دوسرے کے ہاتھ بہ صد خرابی شہ زادی آئی۔

جوگی نے کہا: ایک شہر میں دو بھائی تھے توام، پرورش یافتۂ ناز و نعم، روزگار پیشہ، نیک اندیشہ۔ سوائے رشتۂ برادری، سر رشتۂ دوستی و اتحاد وہ نیک نہاد باہم مستحکم رکھتے تھے؛ مگر دونوں کی طبیعت متوجّہِ سیر و شکار، ہمّت مصروفِ سیاحیِ دیار دیار تھی۔ ایک روز شکار کھیلتے جنگل میں جاتے تھے، ہرن سامنے آیا۔ چھوٹے بھائی نے تیر لگایا، کاری نہ لگا۔ ہرن

کنوتیاں اُٹھا کے بھاگا۔ دونوں نے تعاقب کیا۔ تمام دن رَوان ودَوان، اُفتان وخیزاں چلے گئے۔ قریبِ شام موقع پا کے بڑے بھائی نے جو تیر مارا، ہرن ڈگمگا کر گرا۔ یہ گھوڑوں سے اُترے، ذَبح کیا۔ دن بھر کی دَوڑ سے گھوڑے شَل، خود بھی مُضمَحِل ہو گئے تھے۔ تمام رُوز کے بے دانہ وآب، بھوک پیاس سے بے تاب تھے۔ لکڑیاں چُن کر، پانی بہم پہنچا کر کباب لگائے، بہ خوبیِ تمام دونوں نے کھائے؛ مگر اُس روز جو کیفیت اور لذّت خُشک کباب میں پائی، مُرغ کی زیرہ بریانی تر تراتی کبھی ایسی نہ کھائی تھی۔ پانی جو ڈگڈگا کے پیا، سُستی معلوم ہوئی اور رات بھی ہو گئی تھی؛ لیکن شبِ ماہ، پورن ماسی کا چاند، اللہ اللہ! جنگل کی فِضا، سبزۂ نَو رُستہ جا بہ جا۔ اُنھوں نے کہا: آج کی شب اِس صحرا میں سَحَر کیجیے، چاندنی کی بہار، صنعتِ پَروَردگار دیکھ لیجیے۔ پھر دل میں سوچے کہ تنہائی کی چاندنی گور کے اندھیرے سے بدتر ہے۔ سچ ہے: جب ماہ رُو بَر میں نہ ہو، تو نور نظر میں نہ ہو، اندھیرا اُجالا آنکھ میں برابر ہے۔ ناسخ:

دھوپ بہتر، پر شبِ فرقت کی بدتر چاندنی①
صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی

خیر، یہ دونوں ایک درختِ سایہ دار چشمے کے قریب دیکھ، شطرنجی، چاندنی تو ہمراہ نہ تھی؛ زین پوش چاندنی کے عِوض بچھا، چاندنی کی سَیر کرنے لگے۔ باگ ڈور سے گھوڑے اٹکا دیے۔ چھوٹا بھائی

بڑا متین، ذی شعور، نکتہ سنج، دوربیں تھا، بڑے بھائی نے کہا: آج ہم تمھاری عقل کا امتحان کرتے ہیں؛ بتاؤ تو اِس وقت ہمارے شہر کا ہم سے کتنا فاصلہ ہے؟ اور یہ سمت کون سی ہے؟ تیسرے، کباب کی لذت، پانی کا زیادہ مزہ آج ملا، اِس کا سبب کیا تھا؟ اُس نے جواب دیا: یہ باتیں سہل ہیں۔ شہر ہمارا یہاں سے سو کوس ہے اور دلیلِ کامل یہ ہے کہ بارہا تجربہ کیا ہے، میرا گھوڑا تمام دن میں سو کوس اِسی چال سے پہنچتا ہے۔ اور سمت، ستاروں سے ثابت کہ شمال ہے۔ رہا کھانے پانی کا لطف، خلافِ وقت سے تھا؛ اِلّا، نیا مقدمہ یہ سنیے: یقینِ کامل ہے کہ صبح کو عنایتِ خالق اور مددِ طالع سے وہ سامان مہیا ہو جو کدورتِ سابق دور ہو، آیندہ آسایش رہے، طبیعت مسرور ہو۔ بڑے بھائی نے اِس کی وجہ پوچھی۔ اُس نے کہا: آج سو کوس کی مسافت بہ صد آفت طے کی، بھوکے پیاسے رہے، لیکن دل بشاش ہے۔ وہ سن کے چُپ ہو رہا۔ یہ قصہ رفت و گذشت۔

پھر مشورہ ہوا کہ یہ جنگل سنسان، ہُو کا مکان ہے؛ یہاں درندہ و گزندہ، سانپ بچھو، شیر بھیڑیے کے سوا پرندہ، دوندہ نظر نہیں آتا؛ جو ہم تم دونوں سو رہے، تو "اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ" خدا جانے کیا معاملہ رو بہ کار ہو۔ تین پہر رات باقی ہے؛ ڈیڑھ پہر ہم جاگیں، پھر تم ہشیار رہو۔ یہ صلاح پسندِ خاطرِ طرفین ہوئی۔ پہلے

بڑے بھائی نے آرام کیا، چھوٹے نے جاگنے کا سرانجام کیا۔ تیر و کماں ہاتھ میں اُٹھا ٹہلنے لگا۔ جب زُلفِ لیلائے شب کمر تک آئی، اُسی درخت پر دو جانور آپس میں اپنی اپنی توصیف و تعریف زبانِ بے زبانی میں کرنے لگے۔ اور یہ شخص بہت جانوروں کی بولی سمجھتا تھا، آواز پر کان لگائے۔ ایک بولا: میرے گوشت میں یہ تاثیر ہے: جو کھائے؛ ایک لعل تو پہلے دوپہر کے بعد اُگلے، پھر ہر مہینے مُنہ سے نکلے۔ دوسرا بولا: جو شخص میرا گوشت کھائے، اُسی روز بادشاہ ہو جائے۔

یہ باتیں سمجھ دل میں نہایت خوش ہوا۔ تیر و کماں تو موجود تھا؛ اِلّااللہ کہہ کر، تیر بے تامّل چلّے سے جوڑ کر کھینچا۔ لبِ سوفار کان کے پاس آ، بہ وعدۂ نشانہ سرگوشی کرکے روانہ ہوا۔ قضا نے ہر چند اُن کے سر پر "خبردار" پکارا، کمان کڑکڑا کر چلّائی کہ وہ مارا۔ رزات کا تیر سراسری اُنگریس؛ مگر مرگ جو درپے ہو گئی، کسی گوشے میں جان نہ بچی۔ پیکان سے تا سوفار دوسار ہوا، زمین پر بِھد کر دونوں ایک تیر میں گر پڑے۔ اِس نے تکبیر بِلا تاخیر کہہ کے ذبح کیا، طائرِ روح اُن کا اُڑ گیا۔ دن کی لکڑیاں بچی پھر سلگا کباب لگائے۔ جس کے گوشت میں سلطنت کا ذائقہ سمجھا تھا، اُسے کھایا۔ دوسرا، بھائی کے واسطے اُٹھا رکھا اور ایسا خوش ہوا کہ تمام شب آپ پاسبانی کی، بڑے بھائی کو تکلیف نہ دی۔ جلّ جلالہٗ! معاملاتِ قضا و قدر سے مجبور بشر ہے،

انسان کے قبضۂ قدرت میں نفع ہے نہ ضرر ہے۔

مصرع: تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ

شعر: آنچہ نصیب است، ہم می رسد

ور نستانی، بہ ستم می رسد

جس وقت زاغِ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانۂ مغرب میں چھپائے اور صیّادانِ سحر خیز دام بر دوش آئے اور سیمرغِ زرّیں جناح، طلا بال، غیرتِ لعلِ بدخشاں بہ صد عظم و شان قفسِ مشرق سے نکل کے گلشنِ زنگاری میں جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گزری، روز ہوا؛ بڑا بھائی نیند سے جو چونکا، چھوٹے نے وہ کبابِ پس ماندۂ شب، رات کے بچے رُو بہ رُو رکھے؛ وہ نوش کر گیا، اور حال کچھ نہ کہا۔ دو گھڑی دن چڑھے جب لعل اُگلا، تب سمجھا: ہم نے بہت تدبیر کی، مگر سلطنت بڑے بھائی کی قسمت میں تھی۔ پھر وہ لعل بہ طریقِ نذر رُو بہ رُو لایا اور رات کا فسانہ مفصّل سب کہہ سنایا، کہا: اللہ کی عنایت سے جلد آپ کو سلطنت حصول ہو، یہ نذر غلام کی قبول ہو۔ اُس کو اِس کی سعادت مندی سے خرسندی حاصل ہوئی، پھر کہا: سامنے آبادی سی معلوم ہوتی ہے؛ ہم جا کر اِس لعل کو کسی دلّال کے ہاتھ بیچ آئیں، تم گھوڑوں کے پاس رہو۔ اگر اپنے شہر چل کر یہ امر کریں گے، حاکم کا خوف مانعِ کار ہوگا، مفلسی کے باعث کس کو ہمارا اعتبار ہوگا۔ یہ کہہ کر سمتِ شہر چلا۔

جس دم شہر کے دروازے پر پہنچا، خلقت کا انبوہ نظر پڑا۔

اُس ملک کا یہ معمول تھا: جب وہاں کا بادشاہ دارُالسّلطنتِ عدَم کا تختْ نشیں ہوتا؛ وضیع و شریف شہر کے، سُوم کی رسم کے بعد، وزیرِاعظم کے ہمراہ صُبح دَم تخت لے کے دروازے پر آتے تھے؛ جو اُس روز پہلے مسافر باہر سے آتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ قَضارا، وہاں کا بادشاہ قضا کر گیا تھا، لوگ تخت لیے مُنتظِر تھے، یہ داخل ہوا۔ سب نے تخت پر بِٹھا نذریں دیں۔ نَوبت و نشان، جُلوس کا سب سامان موجود تھا، دھوم دَھڑکّے سے دیوانِ خاص میں داخل کیا۔ مُنادی ہوئی، بہ قولِ مشہور: اِن کی رائی دُہائی نزدیک و دور ہوگئی۔ اِس کو سُرورِ سلطنت اور اَحکامِ مُملکَت کے باعث اُس دن بھائی کا خیال نہ آیا۔ دوسرے روز جب تخت پر رونق اَفروز ہوا اور سامنے لعل آیا، تب بھائی کا خیال آیا۔ فوراً جاسوس، ہرکارے درخت کا پتا بتا روانہ کیے، کہا: اِس صورت کا جوان اور دُو گھوڑے وہاں ہیں، جلد حُضور میں حاضر کرو۔

وہ سب دوپہر تک تمام جنگل کی خاک چھان، حیران و پریشان پھر آئے، عرض کی: تمام دَشت میں پھر کر پاؤں توڑے، نہ آدمی ملا نہ گھوڑے۔ وہ کچھ رنجیدہ ہو سلطنت کے شُغل میں مشغول ہوا، بھائی بے چارے کو بھولے سے بھی کبھی یاد نہ کیا؛ مگر وہ لعل جسے بیچنے کو لایا تھا، جس کے بِکنے میں تخت و تاج مُیسّر آیا تھا؛

فالِ مبارک اور بے نشان بھائی کی نشانی سمجھ، ہر روز سرِ دربار لاتا، ملازموں کو دِکھاتا۔ وہ سب بہ خاطرِ شاہ واہ واہ کہتے، یہ سن کر خوش رہتے۔

حکایتِ پُرشکایت چھوٹے بھائی کی، نقلِ سپہرِ بے مہر کی کج ادائی کی۔ اُٹھالے جانا جانورِ مہیب کا، بدولتِ سوداگر کنویں سے نکلنا اُس بلا نصیب کا۔ میرِ قافلہ کی بُرائی، شہ زادی تک رسائی، پھر تقدیر کی بھلائی۔

صیّادانِ طائرِ معانی، ذی ہوش و دام دارانِ بلبلِ خوش بیانی، خانہ بدوش نے حالِ اُس منتظرِ زیرِ درخت کا یہ لکھا ہے کہ ہمہ تن چشم محوِ انتظارِ برادرِ فراموش کار بیٹھا تھا، ناگہاں ایک جانورِ مہیب، بہ شکلِ عجیب آیا اور پنجے میں داب کر اُڑا۔ گھوڑوں نے ڈر سے باگ ڈور تڑا کے جنگل کا رستہ لیا، کود بھاگے۔ اللہ کی قدرت دیکھیے بڑا بھائی سلطنت کا مالک ہوا، چھوٹا بیچارا موذی کے چنگل میں پھنسا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَم بِالصَّواب وہ جانور وہاں سے کتنی دور اُڑا۔ آخر کار تھک کر، ایک درخت کنویں کی جگت پر تھا، اُس پر جو بیٹھنے لگا، یہ پنجے سے چھٹ کر چاہ میں ڈوبا۔ جامیؔ:

فغاں زیں چرخِ دَوْلابی کہ ہر روز①
بچاہے افگند ماہِ دل افروز

اِلّا، رَسَنِ حیات مضبوط تھی؛ نہ گزند پنجے کی پہنچی، نہ چوٹ چپیٹ گرنے کی لگی۔ میرحسن:

کنْواں وہ جو اندھا تھا، رُوشن ہوا جواں اُس میں وہ، سانپ کا مَن ہوا②

وہ جانور تو دم لے کر اُڑ گیا، یہ بے پَر کنْویں میں پڑا رہا۔ اِتّفاقاً اُسی روز ایک قافلۂ گُم گَشْتہ راہ خستہ وتباہ سَرِچاہ پہنچا۔ کنْواں دیکھ کر پانی کے لالچ سے وہاں قیام کیا۔ آدمی پانی بھرنے کنْویں پر آئے۔ اِس بے چارے نے رسّی کا سہارا جو پایا، اِس پھندے میں کنْویں سے باہر آیا۔ جس نے اِس کا چہرۂ رعنا مشاہدہ کیا، یَابُشْرٰی هٰذَا غُلَام کا غُل برپا کیا۔ دُنیا کے عجب مُعاملے ہیں۔ شعر:

روزی نگر کہ طوطیِ جانم سوی لبش بر بوی پستہ آمد و بر شکرا وفتاد

جب لوگ حال پوچھنے لگے؛ اِس نے جیسا موقع دیکھا، ویسا بیان کیا۔ غَرَض کہ میرِ قافلہ کی خدمت میں توقیر سے رہنے لگا۔ چند روز میں قافلہ منزلِ مقصود کو پہنچا اور مہینا بھی تمام ہوا؛ جوانِ غم دیدہ، بلا رسیدہ نے دوسرا لعل اُگلا۔ رئیسِ قافلہ دیکھ کے تمام ملال بھولا۔ پست ہمّتی سے سوچا کہ ایسی گراں بہا شَے کا سہل لے لینا مشکل ہے، مَبادا کچھ فساد اُٹھے۔ وہ بدافعال اِس کا خون حلال سمجھا، بُرے کام کا مطلق نہ مآل سمجھا۔ جوان کو قید کر کے کوتوال پاس بھیجا، کہا: یہ میرا غُلام ہے، آج اِس نے لعل چُرایا، کچھ ایسا وَسْوَسۂ شیطانی

دل میں آیا، میں نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اِسے سزا ملے، تا، لوگ ڈریں، عبرت سے آیندہ ایسی حرکت نہ کریں۔ کوتوال نے قاضی سے مسئلہ پوچھا۔ اُس نے بے تحقیق ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دیا، مگر اُس شہر کا چندے سے یہ دستور تھا: جب کسی شخص پر گناہ ثابت ہوتا، تو مدّعی اور مدّعا علیہ بادشاہ کی بیٹی کے رُو بہ رُو حاضر ہوتے۔ اِظہارِ حال کے بعد، مُرافعۂ ثانی میں جو اُس کی راے مَعدِلَت پیرا ے میں آتا، وہ ہوتا؛ اِس واسطے کہ بادشاہ مُسِن تھا، بیٹی کے سوا اور کوئی تخت و سلطنت کا وارث نہ تھا۔ اللہ رے اُس کے جمال کا جلوہ اور حُسن کا غوغا! پری کو ہزار جان سے اُس کی پروا، حور اُس کی شیدا، خلقِ خُدا اُس مہ سیما پر نثار، آفتِ عصر، بلاے روزگار تھی۔ حُسنِ عالم فریب کے علاوہ طبعِ حلیم، راے سلیم، نکتہ فہم، دقیقہ رس، اپنے عصر کی حکیم۔ حقیقۃً قابلِ ریاست وہ صاحبِ فراست تھی۔ غنچۂ خاطر اُس گُل اندام، یاسمین پیکر کا رُونا دیدۂ صبا تھا۔ دہنِ صدفِ مُراد تمنّاے قطرۂ نیساں میں بند۔ کوچۂ عصمت و عفّت میں اُس دُرِ ناسُفتۂ دُرجِ شہر یاری کے وَہم و فکرِ تاج دارانِ دہر کا گُزر نہ ہوا تھا، اُس دم تک ناکتخدا تھی۔

جس وقت وہ دونوں رُو بہ رُو ہوئے، پہلے شاہ زادی نے میرِ قافلہ سے پوچھا۔ اُس نے جو کچھ کوتوال سے قیل و قال کیا تھا، وہی

بے کم و کاست مکرّر عرض کیا۔ شہ زادی نے یہ مصرع برجستہ پڑھا، سعدی:

باطلست آنچہ مدّعی گوید①

پھر جوان کی طرف مخاطب ہوئی۔ بس کہ یہ زیست سے تنگ، آمادۂ مرگ تھا، بے تامّل بولا: شہ زادی! آپ روشن ضمیر ہیں، ہم مصیبت زدوں کی طرح سلسلۂ بے جرمی میں اسیر ہیں، یہ شخص سچا ہے۔ وہ تو عقیلہ تھی، زیادہ شک ہوا، دل سے کہا: آج تک کسی چور نے حاکم کے رُو بہ رُو بجز انکارِ دست بُردی، دفعۃً اقرارِ دُزدی کیا نہیں۔ یہ بے گناہ ہے۔ تقریر اِس شاہد کی، شاہد ہے، خُدا گواہ ہے، کچھ اِس میں بھید ہے۔ قافلہ باشی سے فرمایا: کل تو محکمے میں حاضر ہونا۔ جوان کو ڈیوڑھی پر قید کیا۔ یہ تو حسین، بلکہ مہر طلعت، ماہ جبیں تھا؛ طالع کا ستارہ جو چمکا، شہ زادی کا میلانِ خاطر جوان کی جانب ہوا۔ شب کو تنہا بُلا کے بہ دِل داری و تاسّف اِستفسارِ حال فرمایا۔ اُس وقت جوانِ ناکردہ گُناہ نے دل سے آہِ سرد بھر مشرُوحاً از آغاز تا انجام عرض کیا۔ شہ زادی کا دل، یہ نیا قصّہ سُن کے، بہ مرتبۂ اَتم مسرور ہوا۔ چوری کا شک اُس دُزدِ دل کی جانب سے دور ہوا۔

صُبح کو بادشاہ کے حضور میں لا، خود دستِ ادب باندھ کر عرض کی: قبلۂ عالم و عالمیاں کی عُمر دراز ہو، قیصر و فغفور کی اِس در پر جبیں بہ نیاز ہو! شہر کا قاضی اور کوتوال بے دریافتِ حقیقتِ حال

حُکمِ سزا بندہ ہائے خُدا کو دیتے ہیں، بروزِ جزا کی جواب دہی اپنی گردن پر لیتے ہیں۔ غضب کی جا ہے، عجیب ماجرا ہے واجبُ التّعذیر، صاحبِ تقصیر کو لعل ملے، بے گُناہ کا ہاتھ کٹے۔ بادشاہ نے پھر دونوں کی زبان سے حال سُنا۔ بہ سببِ کبرِ سِن کہ عقل کو زوال ہوتا ہے، یہ وہ دن ہیں کہ نسیان بہ مرتبۂ کمال ہوتا ہے؛ ذہن نہ لڑا، تأمّل کیا۔ شہ زادی نے اِلتماس کیا: حُضور! یہ اِمتحان بہت آسان ہے، ایک مہینے اور اِس جوان کو قید رکھیے؛ اگر دوسرا اُگلا، تو سچا ہے؛ پھر ایسے دُرِ یتیم صدفِ راستی کو کیوں بے آب و تاب کیجیے، آبرو لیجیے؛ وگرنہ بہ ماہِ آیندہ یہ بدکردار دار کا سزاوار ہے، ہاتھ کاٹنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟

بادشاہ کو سرِ دست جوابِ باصواب بیٹی کا بہت پسند آیا، حاضرین نے تحسین و آفرین کی۔ بادشاہ نے جوان کو اپنی آنکھوں کے سامنے نظر بند کیا۔ میرِ قافلہ کو شہ زادی نے مجلس بھیجا۔ قصّہ کوتاہ، وہ مہینا بھی تمام ہوا اور اِتنے دنوں میں شعلۂ محبت، مجمرِ سینۂ شہ زادی سے بھڑکنے لگا، دم پھڑکنے لگا، حال طشت از بام اُفتادہ ہوا۔ جوان نے عرض کی: کل لعل اُگلوں گا۔ پھر صُبح کو سرِ دربار رُو بہ رُوئے حُضّار لعلِ بے بہا دُرجِ دہاں سے نکالا۔ سب کو حیرت، شہ زادی کو فرحت و مسرّت حاصل ہوئی۔ اُسی دم مال و اسبابِ قافلہ باشی کا جوان کو مِلا۔

اُسے تشہیر کرکے شہر سے بدر کیا۔ جوان کی صورتِ دل پذیر، فصاحتِ تقریر پسندِ خاطرِ صغیر و کبیر تھی؛ بہ ایمائے شہ زادی سب نے مُتَّفِقُ اللَّفْظ بادشاہ سے عرض کی کہ یہ شخص حضور کی عنایت کے لائق ہے؛ تمنائے مُلازمت رکھتا ہے، کَفش بَرداری کا شائق ہے۔ بادشاہ بھی اِس کی راست بازی سے خوش تھا، راضی ہوا۔ سعدی:

راستی مؤجبِ رضای خداست①
کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

چند عرصے میں مُقرّبِ بارگاہِ سُلطانی، مَورِدِ عنایاتِ جہاں بانی ہوا۔ ہر مہینے لعل اُگل کے حُضور میں لانے لگا۔ روز بہ روز ہم چشموں میں سُرخ روئی حاصل کرکے آبرو پانے لگا۔ آخر کار، بہ مشورۂ مُلازِمانِ قدیم و بہ تحریکِ حُکَما و نَدیم بادشاہ نے اُس گوہرِ مُسلَّم سِلکِ تاج داری کو بہ رِشتۂ عَقد اُس لعلِ بے بہا کے مُنعقِد کیا۔ یہ دونوں مشتاق بہ صد اِشتیاقِ باہَم، لطف کے ساتھ بے اندیشہ و غم، اَیّام گُزاری بڑی دھوم اور تیاری سے کرنے لگے؛ مگر ہر رُوز بِلاناغہ جوان بادشاہ کے دربار میں حاضر رہتا تھا۔

ایک دن اِیلچی اِس کے بھائی کا کسی تقریب میں وارِد ہوا اور جواہر کا ذِکر نکلا۔ اِیلچی نے عرض کی: ہمارے بادشاہ کے پاس ایک لعل اِس رنگ، ڈھنگ، سَنگ کا ہے کہ آج تک جوہرِیِ چرخ نے باوُجودِ عینَکِ مِہر و ماہ و گردِشِ شام و پگاہ، سال و ماہ میں، اُس کے

سنگ کا کیا، پاسنگ کے برابر نہیں دیکھا ہے۔ یہ کلمہ سن کر، بادشاہ نے وہی لعل، جو سینۂ بے کینۂ جواں سے نکلے تھے، دس بارہ ایلچی کو دکھائے۔ وہ بھی جواہر شناس تھا؛ سخت حیران، تا دیر سر بہ گریبان رہا، پھر عرض کی: قبلۂ عالم! عجب کی جا ہے کہ رنگ، روپ، وزن، نقشہ ان کا اُس کا ایک سا ہے۔ اِتنا فرق مقرر ہے کہ وہاں ایک ہے، یہاں ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔ بادشاہ نے جوان کی طرف اشارہ کیا کہ یہ میرا فرزند ہر مہینے ایک لعل بے رنج و ملال تھوکتا ہے۔ ایلچی نے غور سے جو دیکھا، اپنے بادشاہ سے مشابہ کیا، بعینہٖ پایا۔ خیر، رخصت ہوا۔

جب اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ اُس کا تو معمول تھا، جب تخت پر آکر جلوہ گر ہوتا، وہ لعل پیشِ نظر ہوتا؛ ایلچی کو وہ سانحہ یاد آیا، دست بستہ عرض کی: قبلۂ عالم اِس لعل کو جدا کرتے نہیں، بے اِس کے قدمِ مبارک تخت پر دھرتے نہیں؛ اِن روزوں خانہ زاد جس بادشاہ پاس گیا تھا، نیا ماجرا دیکھا: معدنِ لعل کہ وہ اِمکان نہیں، لیکن وہ جواہرِ بے قیاس رکھتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ لعل کا پُتلا زندہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ بادشاہ نے اُس کا حال مفصل پوچھا۔ اُس نے سب بیان کیا کہ دامادِ اُس شاہِ خجستہ نہاد کا ہر مہینے لعل اُگلتا ہے۔ اور کیا گزارش کروں، جیسے حضور کی صورت ملتی ہے، حقیقی بھائی ایسے دکھائی نہیں دیے۔ یہ سنتے ہی اُس کو یقین ہوا کہ اب پتا مِلا، مقرر وہ میرا بھائی ہے۔ اُسی وقت نامۂ شوقیہ اُس کانِ گہر کے اشتیاقِ دید

میں بادشاہ کو لکھا کہ برائے چندے اگر اُس فرزندِ ارجمند کو اِدھر روانہ کرو، محبتِ دیرینہ سے بعید نہ ہو۔ ہمیں شوقِ دیدار ازحدِ تحریر و اِظہار افزوں ہے۔ اور پوشیدہ خط تمنا بھائی کو رقم کیا کہ آج تک تیری مفارقت سے تختِ شاہی، بدتر از بوریائے گدائی تھا؛ اب ایلچی سے یہ خبرِ فرحت اثر سُن کر دل کو سُرور، آنکھوں میں نور آیا؛ لازم کہ بہ مجردِ وُرودِ رقیمۂ وِداد اِدھر کو روانہ ہو۔ اور کچھ پتے حسب ونسب کے، سانحۂ شکار تفصیل وار قلمبند کردیے۔ ایلچی سے فرمایا کہ نامہ علیٰ رُؤسِ الاَشہاد بادشاہ کو اور یہ خط خُفیہ اُس غیرتِ ماہ کو دینا۔

قاصدِ صبادم، صرصر قدم جلد تر اُس شہر میں وارِد ہوا۔ بادشاہ کو نامہ دیا اور خطِ پوشیدہ جوان کو حوالے کیا۔ وہ مکتوبِ محبت دیکھ کر ایسا گھبرایا، یہ لہو نے جوش کھایا کہ اُسی دن رخصت کا ذِکر بادشاہ سے لایا۔ آخر وہ عاشقِ برادر، معشوقۂ روح پرور کو لے کر، جہاز پر سوار ہوا، تب اُس بےچین کو قرار ہوا۔ راہ میں ایلچی سے شہر کا نقشہ، راہ کا پتا، سب پوچھ لیا۔ فرطِ شوق سے دن رات سرگرمِ رفتار تھا۔ ساعت بھر مُقام کسی منزل کا ناگوار تھا کہ جلد پہنچیں، کہیں نہ ٹھہریں۔ نیرنگِ زمانۂ کج سرشتِ بوقلموں کہ ہر دم و ہر ساعت دِگرگوں ہے، کیا کہوں! جب دس بارہ کوس وہ شہر رہا، جہاز تباہ ہو کے بہا۔ جس کی قضا تھی تہِ آب و گرداب رہا۔ جس کی بقا تھی بہ نکلا۔

یہ قصۂ جاں گداز دور دراز پہنچا، اِن کے بھائی نے سُنا، فوراً ہزار سوار تیز رفتار دوڑائے کہ جس ڈوبتے اُچھلتے کا پتا پاؤ، جلد حضور میں لے آؤ۔ آخرکار بہ ہزار جستجو و تگاپو شہ زادیِ خوش خو ہاتھ آئی، جوان کی خبر نہ پائی۔ اُسے بادشاہ پاس حاضر کیا، جوان کے ڈوبنے کا حال کہہ دیا۔ بادشاہ بہ حالِ تباہ گردابِ فراق میں پھنسا۔ شہ زادی صف نشینِ ماتم، لُجّۂ و لطمۂ اَندوہ و غم میں اُلجھی۔ جوان کا حال یہ ہوا کہ تختے کے سہارے سے بہتا بہتا، پیاس کے صدمے، بھوک کی موجیں سہتا سہتا کئی دن میں کنارے پر پہنچا۔ فی الجملہ، جب کچھ تاب و طاقت آئی، پوچھتا پوچھتا اُس شہر میں داخل ہوا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی، رُو بہ رُو بلایا۔ بہ سببِ طولِ ایّامِ مُہاجرت اور درازیِ زمانۂ صُعوبت مُطلق نہ پہچانا۔ اُستاد:

اِتنی مدت میں مِلا مجھ سے وہ دھوکا دے کر[1]
یاد بھی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی

ہیئت تبدیل، خوار و ذلیل تھا۔ اِس اِختلاف کو دیکھیے: یہاں صحرا نوردی، بھوک پیاس، مصیبت؛ وہاں حُکم رانی، عیش و آرام و تختِ سلطنت۔ ناچار شہ زادی کو طلب کیا، اُسے بھی تامّل ہوا۔ وہ شخص بولا: پہر بھر کا عرصہ باقی ہے، آج لعل اُگلنے کا دن ہے، پھر تم سب پہچانو گے۔ بادشاہ کو یقین ہوا، کہا: اگر یہ جھوٹا ہوتا، تو ایک پہر کا وعدہ نہ کرتا۔ شہ زادی نے کہا: اُس شخص

کی طبیعت کی جَودت مشہور ہے، ایک مُعَمّا پوچھتی ہوں؛ اگر بدیہہ جواب دیا، تو بے شک شک رفع ہوا: بھلا وہ کیا شَے ہے جسے گَبر و مسلماں، یہود و نصاریٰ، سب انسان کا فرقہ آشکارا کھاتا ہے؛ مگر جب اُس کا سِر کاٹ ڈالو تو زہر ہو جائے، کوئی نہ کھائے اور جو غصّے میں زیست سے خفا ہو کر کھائے تو فوراً مر جائے۔ جوان نے ہنس کر کہا: شہ زادی! "قسم" ہے۔ یہ کیا مُعَمّا پوچھا ہے! وہ پھڑک گئی، وحشت مٹی، دل کی بھڑک گئی۔ بے باکانہ چلمن اُٹھا، پروانے کی طرح اُس شمعِ بزمِ فرقت کے گرد پھری۔

بادشاہ مُتَعجّب ہوا کہ ہم تو کچھ نہ سمجھے، شہ زادی کیا سمجھ کر سامنے ہوئی۔ جوان نے عرض کی: قبلہ! وہ چیز "قسم" ہے، تمام عالَم کھاتا ہے، سِر اُس کا "قاف" ہے، اُسے کاٹو تو "سَم" صاف ہے؛ "سَم" زہر کو کہتے ہیں، کون کھاتا ہے؟ کھانے والا مر جاتا ہے۔ بادشاہ یہ سُن کر بغل گیر ہوا۔ اُس نے لعل اُگلا۔ شادیانے بجے، بچھڑے ملے۔ اِس طرح جامعُ المُتَفرّقین سب بچھڑوں کی دوری کا بکھیڑا مٹائے۔ جو جس کا مشتاق ہو، جس کی جدائی جسے شاق ہو، وہ اُس سے مل جائے۔

جوگی نے یہ رام کہانی تمام کر کے جانِ عالَم سے کہا: بابا! شعر:

مشکلے نیست کہ آساں نشود
مرد باید کہ ہراساں نشود

جُویندہ، یابندہ ہے یہاں سے منزلِ دوست قریب ہے، سب کچھ معلوم ہے؛ اِلّا، کہنا منع ہے، بُرا ہے۔ دُنیا مقامِ چُپ رہنے کا ہے۔ اِتنا اِس جگہ وَقفہ کر کہ میری زیست کا ساغر بادۂ اَجَل سے لب ریز ہے، سمندِ جاں کو نَفَسِ سرد مَہمیز ہے، مجھے زیرِ زمیں سونپ، تشریف لے جانا۔ اور چند وَصیّت کیں۔ جانِ عالم نے کہا: یہ قَلَق و رنج کس سے اُٹھے گا! بیٹھے بِٹھائے یہ صدمہ کیوں کر دیکھا جائے گا! پتھر کا کلیجا کہاں سے ہاتھ آئے گا کہ ایسے دوستِ غم خوار کو اپنے جیتے جی زیرِ خاک کیجیے، اُس کے ماتم میں گریبانِ صبر چاک کیجیے! یہ کہہ کر رونے لگا، گریباں تا دامن بارشِ اشک سے بھگونے لگا۔ جوگی اِس کی مَحبت کا بڑوگی ہوا، کہا: افسوس! دمِ واپسیں کا عرصہ بہت کم، دم نہیں مار سکتے ہم؛ وگرنہ تیرے ہمراہ شریکِ دردوغم ہوتا۔ بھلا آخری، فقیر کا، اگر تجھ کو یاد یہ لٹکا رہے گا، سائیں چاہے تو کہیں نہ اٹکا رہے گا، قبر میں لے جا کر کیا کروں گا۔ پھر چند کلمے وہ بتائے کہ جس صورت کا دھیان لائے، فوراً ہو جائے۔

یہ مُقدّمہ بتا، ہر ہر کر، گُرو کا نام لیا۔ پھر کلمہ جو پڑھا، دُنیا سے چل بسا، دم نکل گیا۔ جوگی مسافرِ عدم، بیکنٹھ باسی ہو گیا۔ جانِ عالم کا روتے روتے دَم گیا، بے تابانہ نعرۂ اَنفراق مارے۔ مُرید، چیلے جمع ہو کر "گُرو گُرو" "یا ہادی" کہہ کر بہت پکارے۔ بولتا، نکل گیا، جوگی نے صدا نہ دی، منزلِ مقصد کی راہ لی۔ شہ زادے

نے بہ موجبِ وصیت غسل دیا، کفنایا؛ قبر تک لاتے لاتے کچھ نہ پایا۔ آخرکار برابر کفن پھاڑ دیا؛ آدھا چیلوں نے جلایا، نصف مریدوں نے منڈھی میں گاڑ دیا۔ ہندوؤں نے راکھ پر چھتری بنائی۔ مسلمانوں نے قبر بنا کے سبز چادر اُڑھائی۔ وہ تخت منڈرا، تسبیح و مصلّیٰ، خرقہ و جُبّہ اُس کے منظورِ نظر کو دے کر جانشیں کیا۔ مرید، چیلوں کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں سونپا۔ اُسے ایک ولولہ آیا، از سرِ نو اُن سب کو یہ تلقین کیا، رازِ سربستہ کھول کے ذہن نشیں کیا کہ سنو بچّہ! گوجوگی ظاہر میں آنکھوں سے نہاں ہے؛ مگر مرشد کا جلوہ، سائیں کا ظہورا ہر برگ بار بوٹے پتّے، گل و خار، بلکہ درِ مسجد و دیوارِ کنشت سے دیدۂ دوربیں میں عیاں ہے۔ عارف کا یہ کلام ہے، سعدی:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار[1]
ہر ورقے، دفتریست معرفتِ کردگار

دیدۂ بینا، گوشِ شنوا اِس رمز کو درکار ہے۔ ہر ذرّے میں اُسی کا جھمکڑا ہے۔ نمونۂ قدرت، نشانِ وحدت دُنیائے بے ثبات کا نقش و نگار ہے۔ بلبل کے پردے میں ترانہ سنجی ہوتی ہے۔ قمری کی کوکو متلاشی کی جان کھوتی ہے۔ اُسی کے ذکر میں سرگرم ہے، جس کی زبان و منقار ہے۔ کسی کو حرمِ محترم میں نامحرم رکھا، بھٹکایا؛ کسی کو بیتُ الصّنم میں بلا کر جلوہ دکھایا۔ کعبے کا دھوکا، دیر کا بہانہ ہے؛ دوڑا کر تھکانا ہے۔ اور جس نے مَن یَشاء کو رہ بر کر کے ڈھونڈھا، اُس نے گھر بیٹھے پایا ہے۔ امیر خسرو:

جِن ڈھونڈھا، تِن پائیاں گہرے پانی پَیٹھ[1]

ہَوں بَوری ڈوبن ڈری، رہی کنارے بَیٹھ

دُنیا کا مُعاملہ، مذہب و مِلّت کا جھگڑا، یہ اچّھا وہ بُرا، پُر زِیان، سَراسَر بے سُود ہے۔ حق بے شک داتا ہر آن موجود ہے۔ رنج میں دل کو خوش، اَلَم میں طبیعت کو شاد رکھو۔ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ نِرنکار ہے۔ شِرکت کرنے والا مُشرِک، حماقت شِعار ہے۔ مُرسَل رہ بَر ہیں، پوشیدہ راز سے ماہر ہیں؛ اُن کو رُستگار جانو، بَرید یار سمجھ کر مانو۔ مُرشِد کی ذات، گُرو کی صِفات ہر جلسے میں یاد رکھو۔ بُود و نابُود کا غم نہ ہو۔ اور اَحباب کا دل کہ حَباب سے نازک تر ہے، خدا کا گھر ہے، آشُفتہ و بَرہَم نہ ہو۔ اللہ بس باقی بے فائدہ ہوس۔ یہ کہہ کر قصّہ مختصر کیا، بے خبروں کو باخبر کیا۔

جب اِس صُحبت سے جانِ عالَم کو فرصت ملی، چلنے کا عَزم کیا۔ اُس جانشین مَہنت نے رُوکا۔ اور دو چار دن خاطر سے مُقام کیا؛ پھر جس طرف جُوگی نے بتایا تھا، چل نکلا۔ پہاڑ سے جس دم آگے بڑھا، دریا ملا۔ ہر چند ڈھونڈھا، ناؤ، بیڑے کا تَھل بیڑا نہ لگا؛ مگر ایک لعلِ دَرَخشاں بہ رُوئے آبِ رَواں سامنے آیا۔ قریب اُس کے دوسرا نظر پڑا۔ اِسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بہت لعل بہتے دیکھے۔ تازہ فکر ہوئی کہ اِس حال کو کیوں کر دریافت کیجیے۔ کنارے کنارے سَیر دیکھتا چلا۔ دو کوس راہ جب طے کی، عمارت عالی شان دیکھی اور اُس چشمے کو اُس کے اندر سے رَواں پایا۔ دروازے

اور دَر کی بہت تلاش کی، تا اندر جانے کا باب مفتوح ہو، نہ ہُوا۔ سوائے دیوار، دَر نہ تھا۔ اُس وقت بلبل بن کر دیوار پر جا بیٹھا۔ مکان رَفیعُ الشّان، باغ بھی بہار کا؛ مگر سنسان، اِنسان نہ حیوان، فقط ایک بنگلا نہایت نقش و نگار کا۔ وہ نہر اُسی بنگلے کے اندر سے جاری تھی۔ چمن خالی اور بادِ بہاری تھی۔ آدمی یا جانور ناطِق و مُطلَق، مُطلق نہ تھا۔ باغ میں اُتر، صورتِ قدیم بدل کر بنگلے میں آیا۔ مُنقّش، مُطلّا، سجا سجایا پایا؛ لیکن طُرفہ حال یہ دیکھا: ایک پلنگ زُمرّد کے پایوں کا بچھا ہے، اُس پر کوئی دوشالہ تانے سوتا ہے۔ برابر، یاقوت کی تپائی پر پھولوں کا دستہ: آدھے سرخ، نصف سپید۔ جانِ عالم نے قدم بڑھا دوشالہ سرکایا۔ وہ تنِ پری پیکر بے سر نظر آیا۔ حسرت سے کہا: کس ظالم، ستم شِعار، بے رَحم، جفا کار نے اِس سَردفترِ خوبی، سراسر دل بری و محبوبی کا سر کاٹا ہے! نخلِ شمشاد کو تبرِ ظلم سے چھانٹا ہے!

بہ حیرت ہر طرف دیکھتا تھا۔ چھت پر آنکھ پڑی: چھینکا بندھا، سر کٹا دھرا ہے۔ سر کے نیچے نہر جاری ہے۔ جو خون کا قطرہ اُس حلقِ بُریدہ سے پانی میں گرتا ہے، اللہ کی قدرتِ کاملہ سے وہ لعل ہو کر تیرتا ہے۔ اِس نے کہا: سُبحان اللہ! مُقرّر یہ سِحر کا کارخانہ ہے۔ قریب جا کر غور سے جو دیکھا، تو انجمن آرا کا چہرہ تھا۔ پہچانتے ہی سَر و تَن کا ہوش نہ رہا۔ چاہا کہ سر سے سر ٹکرا کر ہم سَر ہو، کسی کو نہ خبر ہو؛ بس کہ تجربے کار ہو چکا تھا، سوچا:

مرنا ہر وقت ممکن ہے، پہلے حال مفصّل معلوم کرو، کہیں جوش کا سا دھوکا نہ ہو۔ ہر چند غوّاصِ عقلِ رسا محیطِ فکر میں غوطہ زن و آشنا ہوا؛ گوہرِ مقصد صدفِ مراد سے ہاتھ نہ لگا، معاملے سے نا آشنا رہا۔

اِس عرصے میں شام نزدیک ہوئی۔ تند ہوا چلی، شور وغل مچا۔ یہ سمجھا: اب کسی دیو یا ساحر کی آمد ہے، چھپا چاہیے۔ سرِ گلدستہ، گلبُنِ محبت کے رُو بہ رُو بھونرا بن کے بیٹھ رہا۔ دفعۃً دیو آ پہنچا قوی ہیکل، زبوں شمائل، بامگر وحشی سا ہر سمت بو سونگھنے لگا۔ پھر اُسی گلدستے سے سفید پھول توڑا، اُس یاسمین پیکر کو سنگھایا؛ سر اچھل کر بدن سے مِلا، انجمن آرا اُٹھ بیٹھی۔ دیو نے میوۂ تر و خشک رُو بہ رُو رکھا؛ مگر پریشان، ہر سو متحیر نگراں۔ شہ زادی نے کہا: خیر ہے؟ اُس نے کہا: آج غیر انسان کی بو آتی ہے اور تعجب یہ ہے خوف سے جان جاتی ہے۔ وہ کہنے لگی: ہمیں آج تک جانور کی پرچھائیں نہ نظر آئی، تو نے آدمی کی بو پائی۔ طُرفہ خبط ہے، یہ جملہ بے ربط ہے۔ غرض کہ صبح تک مذکورِ ہر شہر و دیار، عجائباتِ روزگار کا بیان رہا۔ دمِ سحر اُسی دستے سے سرخ پھول اُس خون آشام نے توڑ کر اُس لالہ فام کو سنگھایا۔ سر تو جھٹکے پر سربلند ہوا، تن نے پلنگ پر آرام فرمایا۔ دیو دو شالہ اُڑھا راہی ہُوا۔

جانِ عالم نے چار گھڑی بہ جبر صبر کیا۔ پھر اپنی صورتِ اصلی بن کر، وہی سفید پھول توڑ کر سنگھایا۔ انجمن آرا بہ دستورِ اوّل اُٹھی،

شہ زادہ چیخ مار کر لپٹ گیا۔ دونوں مہجور اِس زور شور سے رُوئے کہ تمام باغ ہِل گیا، زمین و آسمان دہل گیا۔ جانِ عالم ہنوز اپنے مصائب، وہاں تک آنے کا حال، فرقت کا درد و ملال کہنے نہ پایا تھا کہ انجمن آرا نے یہ کہا، لاَاَعلَم :

تجھ بن مری اوقات جو اکثر گزری — وہ حالتِ نزع سے بھی بدتر گزری
تو تو کہے سرگذشت اپنی ظالم! — میں کس سے کہوں جو کچھ کہ مجھ پر گزری

یہ کہہ کر، پھر دونوں چِلّا چِلّا، آہ و بُکا سے رُونے لگے۔ دُنیا کے مُعاملے میں ہمیشہ سے کسی کی عقل نہیں لڑی، شکست ہوئی ہے۔ شعر :

بیک لحظہ، بیک ساعت، بیک دم
دگرگوں می شود احوالِ عالم

مُؤَلِّف :

اک وَضع پر نہیں ہے زمانے کا طَور، آہ!
معلوم ہو گیا ہمیں لَیل و نہار سے

ہر عُقْدَۂ مالاینْحَلِ ناگُزیر کے واسطے ناخُنِ تدبیر خَلْق میں خَلْق کیا ہے۔ اور جہان میں، جہاں تدبیر کا دَخل نہ ہو سکا، اُسے تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔ اکثر جس بات میں عقل عاجز آتی ہے، وہی طَرفَۃُ الْعَین میں خود بہ خود ہو جاتی ہے۔

ناگہاں ایک سفید دیوِ زبردست، زور کے نشے سے سرشار، مست، بڑا طاقت دار، رستم کا یادگار اُدھر سے گزرا۔ نالۂ حزیں،

صدائے غمگیں کان میں آئی۔ بس کہ بہ ایں زور و طاقتِ خُدا داد،
وہ دیوِ نیک نہاد، رحم دل، غم رسیدوں کے رنج کا شامل تھا،
گریہ وزاری سُن کر دل کو بے قراری ہوئی، سمجھا: کوئی انسان نالاں
ہے؛ مگر اس صحرائے پُر خار، وادیِ ہمہ تن آزار میں آدمی کا ہونا
مُحال ہے۔ اگر ہے، تو حقیقت میں مُبتلائے اَلَم، اسیرِ پنجۂ ستم،
خراب حال ہے۔ یہ سوچ کر باغ میں آیا۔ یہاں رُوتے رُوتے دونوں
کو غش آگیا تھا۔ دِیو ڈھونڈھتا ہوا بنگلے میں آیا۔ دیکھا: مہر و ماہ
گردشِ سپہرِ بے مہر سے۔ بُرجِ زمرّدیں میں بے ہوش ہیں۔ چہرے
کے رنگ اُڑے ہوئے، سکتے کی حالت میں ہم آغوش ہیں۔ روئے یار
آئینہ دار درمیان ہے، فلک بر سرِ امتحان ہے۔ سمجھا: مدّت کے
بعد دونوں کا مقابلہ ہوا ہے، اِس سے کُسوف و خُسوف کا رنگ ڈھنگ
پیدا ہے۔ سرِ بالینِ بیمارانِ محبّت بیٹھ کر، نہر سے پانی لیا، دونوں
کے مُنھ پر چھڑکا۔ آنکھیں کھولیں، ہوش و حواس درست ہوئے۔
دیکھا کہ ایک دِیو سرھانے بیٹھا ہے۔ سفید دِیو نے اُٹھ کر بہ آئینِ شایستہ سلام کیا، تسلّی
کا کلام کیا، کہا: تشویش نہ فرمائیے، بندہ دوست دار، جاں نثار ہے۔
پہلے جانِ عالم اُٹھا، بغل گیر ہوا۔ وہ حال پوچھنے لگا۔ بس کہ
شہ زادۂ عالم لسان، خوش بیان تھا؛ اپنی رام کہانی چرب زبانی
سے کہہ سُنائی۔ دیو ماجرائے گذشتہ سُن کر بے قرار، اشک بار
ہوا، عرض کی: آپ بہ دلجمعیِ تمام آرام کیجیے؛ اب وہ قُرمساق

آئے، تو عملِ بد کی سزا پائے۔ جانِ عالم بہ شدّت لگاوٹ باز تھے؛ اُس سے بھائی چارا کیا، صیغۂ اُخوّت پڑھا۔ وہ بیچارہ بندۂ بے دام، حلقہ بگوش غلام ہوا۔ وہاں سے اُٹھ کر باغ کی سیر کرتے تھے کہ وہ جفا کار بھی آ پہنچا۔ یہاں اَور رنگ دیکھا کہ شہ زادی، آدمی زاد کے ہمراہ پھرتی ہے؛ سفید دیو کا ہاتھ میں ہاتھ ہے، مُصاحبت کرتا ساتھ ہے۔ جل کر جانِ عالم پر جھپٹا۔ دیوِ سفید نے بہ جلدیِ تمام اُس نُطفۂ حرام کا ہاتھ پکڑا۔ وہ کافر اُس رَحم دِل سے لپٹا۔ باہم کُشتی ہونے لگی۔ یہ کشمکش ہوئی کہ زمین جا بہ جا شَق ہوئی۔ اَلغَرض، بہ مَدَدِ مددگار و قُوّتِ پَروَردگار سفید دیو نے زمین سے لنگر اُکھاڑ، سر سے اونچا کیا، زمین پر پٹک کے چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ جانِ عالم قریب آیا، زور و طاقت کی تعریف کرنے لگا، کہا: جنابِ باری نے تجھ مسافروں کے مددگار کی یاری کی، جو ایسے مَردُود پر ایک دَم میں تجھے فتح و ظفر حاصل ہوئی؛ اگر ناگوارِ طَبع نہ ہو، میں بھی ایک زور کروں۔ وہ بولا: بسم اللہ۔ شہ زادے نے ایک ہاتھ شانے پر دَھر، دوسرے سے گردن اُس سرکش کی مضبوط پکڑ، دھڑ سے کھینچ کر زمین پر دھڑ سے پھینک دی۔ دیوِ سفید یہ طاقت دیکھ کر، سفید ہو گیا، شہ زادے کا چہرہ سُرخ ہوا۔ وہ زَرد رُو، بے دین اَسفَلُ السّافِلین پہنچا۔

اِس عرصے میں سفید دیو کے ملازم بھی حاضر ہوئے۔ دعوت کی تیّاری، ضیافت کی اِضافت کی۔ ایک ہفتہ اَکل و شُرب، گانا ناچ خوب رہا۔

آٹھویں روز اُس ماہِ دو ہفتہ یعنی انجمن آرا نے رنجِ جدائیِ ملکہ مہرنگار، ہمدمانِ لشکر کا لبِ دریا انتظار بیان کرکے کہا: بہ خدا مفارقتِ ملکہ میں خواب و خور حرام ہے، چین دل کو، نہ جی کو آرام ہے۔ تمھارے بارِ احسان سے دب کر کبھی ہنسی لب پر آگئی؛ وگرنہ دورِ شراب و کباب، خونِ دل، لختِ جگر تھا۔ ہر گلاس بُرادۂ الماس تھا، فقط تمھارا پاس تھا۔ اُس نے عرض کی: میرے آدمی جائیں، پتا لگا آئیں۔ انجمن آرا نے کہا: اپنے تجسس میں زیادہ مزہ ہے، اپنا کام آپ خوب ہوتا ہے۔ ناچار رخصت ہو کر چلے اور آنے جانے کے باہم وعدہ ہائے مستحکم ہو گئے۔ مگر ہر دم ملکہ کا خیال، ہر گام دل پر فرقت کا ملال تھا کہ خدا جانے، ڈوب گئی یا ہماری طرح کسی آفت میں پھنسی۔ کبھی دو کوس کبھی چار کوس بہ صد حسرت و افسوس چلتے۔ دو تین دن میں پاؤں سوج گئے، چھالے پڑے، قدم اُٹھانے کے لالے پڑے۔ وہ سفر سخت، یہ نازک مسافر، وہ کالے کوس مالوے کی طرح کے کافر۔ انجمن آرا جھلا کر کہنے لگی، میر:

کب تھا یہ شور و نوحہ، ترا عشق جب نہ تھا ①
دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی

آپ کی بدولت یہ ذلت و رسوائی، پیادہ پائی، صحرا نوردی، عزیزوں کی جدائی، غرض کہ کون سی مصیبت ہے جو نہ اُٹھائی۔ میر سوز:

چھڑا کر مجھ سے میرے خانماں کو ②
خدا جانے چلا ہے اب کہاں کو

شہ زادہ ہنس کر چُپ ہو رہا۔ پھر وہ عمل جو جُوگی سے سیکھا تھا، انجمن آرا کو بتایا۔ دونوں نے توتے کی ہیئت بنائی اور توکّلتُ علَی اللہِ کہہ کر، نظر بہ خدا، ایک سمت سرگرم پرواز ہوئے۔ پہر دو پہر اُڑنا، پھر کسی درخت پر بسیرا، خیمہ پاس نہ کوئی ہمراہ ڈیرا۔ اِس روپ میں قاصِدِ سیر ہوئے۔ سابق مُصاحِبِ انسان تھے، اب ہم نشینِ وحش و طیر ہوئے۔ روز نیا پانی، نت نیا دانہ۔ جس ٹہنی پر بیٹھ رہے وہی آشیانہ۔ کبھی جنگل طے کر کے کسی بستی میں ہو نکلے۔ گاہ کوئی سُنسان ویرانہ نظر پڑا، اُس میں سے رُو نکلے۔ کبھی اپنی حکومت اور زمانہ جو یاد کیا؛ تو گھبرا کر فریاد کی، نالہ ایجاد کیا۔ اِسی طرح روز چلے جانا، دل سمجھانے کو یہ شعر لب پر لانا۔ لا اَعلَم:

شبِ عشرت غنیمت دان و دادِ خوشدلی بستاں
کہ در عالَم کسے احوالِ فردا را نمی داند

بیانِ حال اُس غریقِ بحرِ ملال کا، یعنی ملکہ مہر نگارِ جگر فگارِ خوش خصال کا۔ اور آنا اُس سبز پوشِ ذی ہوش کا مکتوبِ محبّت اُسلوب لے کے؛ پھر توتے کی رُخصت، ملکہ کی رِقّت اور مِل جانا انجمن آرا اور شہ زادۂ با اقبال کا۔

نظم:

اے جنوں تو دلِ شوریدہ کی اِمداد کو آ تا لکھوں حال میں اک اور ستم دیدہ کا

چین دُنیا میں نہیں عشق کے بیماروں کو　　　　نِت نیا رنج فلک دیتا ہے بے چاروں کو
بارِ فُرقت کبھی معشوق جو دھر جاتے ہیں　　　　جیتے جی دب کے یہ اُس بوجھ سے مر جاتے ہیں
زیست بے لطف گزر جاتی ہے بے چاروں کی　　　　کیا کہانی میں کہوں تم سے دل اَفگاروں کی

نگارِندۂ حالِ غریقِ شطِ فُرقت و کشتیِ شکستۂ لجۂ محبت، بادباں گُسستۂ صرصرِ دُوری و لنگر بریدۂ کارزدِ مہجوری، طوفاں رسیدہ، کنارِ کام یابی نہ دیدہ، یعنی ملکہ مہر نگار، خامۂ جگر اَفگار یوں رقم کرتا ہے کہ جب جہاز تباہ ہوا تھا، یہ بھی ایک تختے کے ٹکڑے پر، دِل ٹکڑے ٹکڑے، ڈوبتی ترتی چلی جاتی تھی۔ اُدھر سے کوئی بادشاہِ عالی جاہ جہاز پر سوار سَیر دیکھتا آتا تھا۔ دور سے تختہ بہتا دیکھا۔ جب قریب آیا، آدمی اُس پر پایا۔ خوفِ خُدا سے جلد پَنسوہی دَوڑا جہاز پر منگوایا۔ ملکہ کو تلاطُمِ آب نے بے تاب کیا تھا اور جانِ عالم، انجمن آرا کے صدمۂ جُدائی سے جی ڈوب گیا تھا، یعنی غش تھا؛ لیکن صورتِ رعنا، چہرۂ زیبا میں فرق نہ ہوا تھا۔ بادشاہ بہ یک نگاہ والہ و شیدا ہو گیا۔ جلد جلد عطر سنگھا، بازو باندھا، اور تدبیریں کیں۔ دو تین گھڑی میں ملکہ کی غش سے آنکھ کھلی، دیکھا کہ نہنگِ اجل کے منہ سے تو بچی، آفتِ لطمہ و لجہ سے برکنار جہاز پر سوار ہوں؛ مگر شخصِ غیر سے دوچار ہوں۔ شرم سے سر کو جھکایا، تمام جسم میں پسینا آیا۔ بادشاہ نے پوچھا: اِسم شریف؟ گو باعثِ حجاب بولنا گوارا نہ تھا، لیکن بے جواب دیے چارہ نہ تھا، آہستہ سے کہا: محروم، ناکام، آفت

کی مبتلا، ذلیل و خوار، فلک درپئے آزار، پُرآلام، جگرخوں، دل خستہ و محزوں، کشتی تباہ، گم کردہ راہ، ناخداگم، فتادۂ تلاطم۔

اِس کی فصاحت و بلاغت، چہرے کی شان و شوکت سے ثابت ہوا کہ یہ شہ زادی ہے، اور کلامِ دردناک نے گریبانِ صبر و شکیب چاک کیا، بادشاہ نے رو دیا۔ پھر خاصہ طلب فرمایا۔ ملکہ نے انکار کیا، نہ کھایا۔ اُس نے بہت اِصرار کیا، لجاجت سے کہا: آپ کھانا نوش فرمائیں، وطن کا پتا بتائیں؛ جب تاب و توانائی تم میں آئے گی، وہاں بھجوادیں گے۔ ملکہ نے کہا: ہم جن کے دامنِ دولت سے اُلجھے تھے، وہ تو گردِ راہ کی صورت، خارِ صحرا کی طرح جھاڑ، اِس دریائے ناپیداکنار میں ڈوبے، خدا جانے کیا ہوئے، کدھر گئے، جیتے ہیں یا مر گئے۔ اگر سوئے عدم ہمیں روانہ کرو، بکھیڑا چھٹے، غم و الم سے نجات ملے، بڑا احسان ہو۔ اُس نے کہا، مؤلف:

تم سلامت رہو زمانے میں　　ایسی باتیں زبان سے نہ کہو

غرض کہ مجبور، کچھ کھایا۔ دو چار دن میں تاب و طاقت بھی گونہ آئی اور جہاز دارُالسلطنت میں پہنچا۔ ملکہ کے واسطے مکانِ عالی شان خالی ہوا۔ لونڈیاں، پیش خدمت، آتو، محل دار؛ جو کہ قرینہ شاہ اور شہریاروں کا ہوتا ہے اور جس طرح شہ زادیاں رہتی ہیں، سب سامان مہیا کر دیا۔ ایک روز وہ بادشاہ آیا، کہنے لگا: تم اپنا حسب و نسب چھپاتی ہو، مگر ہمیں معلوم ہوا تم شاہ زادی ہو، ہماری تمھاری ملاقات اِس حیلے سے ہوتی تھی؛ لازم ہے کہ مجھے فرماں روا نہ جانو، فرماں برداروں میں قبول فرماؤ، میری بات مانو۔ ملکہ نے

جواب دیا: میں نے تمام عمر سلطنت کا نام نہیں سُنا، اِلّا، آپ کو خالق نے بادشاہ کیا ہے۔ اِنصاف شرطِ فرماں روائی ہے، اس کو ہاتھ سے نہ دے۔ مَیں ظُلم رسیدہ، آفت کشیدہ، فلک کی ستائی ہوں۔ خُدا جانے کون ہوں اور کس طرح یہاں تک آئی ہوں۔ بہ قولِ اُستاد:

دیکھتے آنکھوں کے کیا کیا لوگ اُٹھے پیشِ چشم ①
ہوں لبِ حیرت بہ دنداں رنگِ دُنیا دیکھ کر

اگر بے گناہ کا خون گردن پر لینا گوارا ہے؛ مختار ہے، مجھے کیا چارہ ہے۔ اور جو خوشی سے یہ اَمر منظور ہے، تو برس روز کی مُہلت مجھ کو دے۔ اِس عرصے میں کوئی ڈوبا ترا، میرے وارثوں کا پتا مِلا، کوئی مُوا جیتا پھرا تو خیر؛ نہیں، میں تیرے قبضۂ اِختیار میں ہوں۔ جبر کرنا کیا ضرور ہے، عدالت سے دور ہے۔ بادشاہ دل میں سوچا: آج تک ایسے غرق ہوئے، اُبھرتے نہیں۔ وہاں کے گئے، پھر اِدھر قدم دھرتے نہیں۔ اِتنے دنوں کی فرصت دو، حکومت نہ کرو۔ آنکھ بند کرنے میں سال تمام ہو جائے گا، پھر کون سا حیلہ پیش آئے گا۔ کہا: بہت خوب، لیکن جو تمھیں ناگوار نہ ہو تو جی چاہتا ہے گاہ گاہ آنے کو، تمھارے دیکھ جانے کو۔ ملکہ نے یہ اَمر مُغتنم جانا، کہ حاکم محکوم کا فرق سب کو معلوم ہے۔ اب یہ انداز ٹھہرا: پانچویں چھٹے روز پہلے خواجہ سرا آ کے اِطّلاع کرتا، پھر بادشاہ قدم دھرتا۔ دو چار گھڑی کی نشست ہوتی۔ قصہ ہر شہر و دیار کا، تازہ اخبار دربار کا بیان کر کے اُٹھ جاتا۔

یہاں سے دو کلمے یہ سُنیے، مُسَبِّبُ الْاَسْباب کی کارسازی کے سامان دیکھیے: وہ محل جو ملکہ کے رہنے کو ملا تھا، اُس میں مُختصر سا پائیں باغ بہت کیفیت کا تھا۔ طرح طرح کا میوہ دار درخت، باغ بہار کا۔ یک لخت نئے نئے رنگ ڈھنگ کے وہ گُل بوٹے، جو بادِ خزاں سے جھڑے نہ ٹوٹے۔ پھل قصد سے مُنہ میں آجائے، ہاتھ بڑھانے کی بار نہ آئے۔ رَوِشیں مورت کی صورت کی سالم۔ آبِ رَواں میں پری کا عالم۔ بھدّے نہ بدقوارے، سُڈول، سانچے کے ڈھلے، نازک سنگ فوّارے۔ کیاریاں پیچ دار، اُن میں آبشار۔ پُختہ ہر ایک رَوِش۔ جو کیاری تھی پیاری تھی، سراسر گُل کاری تھی۔ چمن بندی قطع دار، جا بہ جا چبوترے معقول؛ گُلِ پیادہ و سوار پُربہار، مساوی عَرض و طُول۔ باغبانیاں خوب صورت، نوجوان، تکلّف کے سامان۔ طلائی نُقرئی کُھرپیاں، مُرصّع کار بیلچے ہاتھوں میں۔ غمزہ چال میں، ادا دیکھ بھال میں، لگاوٹ باتوں میں۔ کسی طرف کُنویں کی جگت پر کیلی والی لال بے رنج و ملال ہو رہی۔ کوئی کچھ اُکھاڑتی، کوئی بو رہی۔ کوئی پھول چُنتی، پھل اُٹھاتی، گھانس کُھرپی سے چھیل ڈالتی۔ کوئی ٹوٹا جھڑا پتّا، گرا پڑا کانٹا کیاری سے نکالتی۔ سرِ شاخِ ہر گُلِ رعنا بُلبلوں کا غُنچہ۔ سَرو و شمشاد پُرجوبن، صداے قُمریِ طوق در گردن۔ ایک طرف طاؤسوں کا رقصِ پُرناز، ہر ایک خوش آواز۔ باغ کے گرد مُلبّب جھیل غنچوں کا چٹکنا کوسِ رحیل۔ کہیں لالہ پیالہ در دست۔ کسی جا نرگسِ شہلا

باچشمِ مست۔ تاکِ انگور پر مے خواروں کی تاک۔ عنبر بیز صحنِ گلشن کی خاک۔

ملکہ گہ و گاہ، شام و بیگاہ، رفعِ پریشانی، دفعِ سر گرانی کو وہاں آکے، نظارۂ صحبتِ گرم جوشیِ گل و بلبل سے رشک کھا کے، بہ صد حسرت و افسوس سوئے گردونِ دوں سر اٹھا کے یہ پڑھتی، میر سوز:

وہ دن خدا کرے کہ خدا بھی جہاں نہ ہو[1]
میں ہوں، صنم ہو اور کوئی درمیاں نہ ہو
گل ہو شگفتہ خاطر و گلزار خندہ رو
بادِ صبا بھی ہووے، وَلے باغباں نہ ہو
گلشن ہو اور یارِ دل آرام اور میں
اپنا ہو قصہ، غیر کی وہاں داستاں نہ ہو

کبھی پیچ و تابِ زلف اور گیسوئے معنبر کی پریشان حالی جعدِ سنبل کو دکھاتی۔ گاہ سیاہیِ داغِ جگر لالے کی لالی سے لڑاتی۔ غنچۂ فسردہ سے جو کچھ دل گرفتگی کی تسکین ہوتی، تو گل کی ہنسی پر پھوٹ پھوٹ کے خوب روتی اور اِس غزل سے دل کو سمجھاتی، مؤلف:

لازم ہے سوزِ عشق کا شعلہ عیاں نہ ہو
جل بجھیے اِس طرح سے کہ مطلق دھواں نہ ہو
زخمِ جگر کا وا، کسی صورت، دہاں نہ ہو
پیکانِ یار اُس میں جو شکلِ زباں نہ ہو

اللہ ری بے حسی کہ جو دریا میں غرق ہوں
تالاب کی طرح کبھی پانی رواں نہ ہو
گُل خندہ زن ہے، چہچہے کرتی ہے عندلیب
پھولی ہوئی چمن میں کہیں زعفراں نہ ہو
بھاگو یہاں سے، یہ دلِ نالاں کی ہے صدا
بہکے ہو یارو، یہ جرَسِ کارواں نہ ہو
ہستی، عدم سے ہے مری وحشت کی اک شلنگ
اے زلفِ یار! پاؤں کی تو بیڑیاں نہ ہو
لینا بجائے فاتحہ، تُربت پہ نامِ یار
مرنے پہ یہ خیال ہے، وہ بدگماں نہ ہو
ناقہ چلا ہے نجد میں لیلیٰ کا بے مہار
مجنوں کی بن پڑے گی، اگر سارباں نہ ہو
چالوں سے چرخ کی، یہ مرا عزم ہے سُرورؔ
اُس سرزمیں پہ جاؤں جہاں آسماں نہ ہو

گاہ لبِ جُو کسی سَرو کے پاس یادِ قامتِ جانِ عالم میں مثلِ فاختہ کوکو کرتی، دلِ بے تاب کو تڑپا کر لہو کرتی۔ غور کرو تو دُنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں۔ اِس کا سب کارخانہ، پیدا ہے کہ پایدار نہیں۔ کبھی تو رُوزِ رُوشن ہے، گاہ اندھیری رات ہے۔ یہ کائنات کی کائنات بے ثبات ہے۔ گلشن میں اگر بہار ہے، تو خزاں درپئے آزار

ہے۔ بلبل کو ہزار چہچہے یاد ہیں؛ پر باغبان آشیاں اُجاڑنے کی فکر میں ہے، دام بردوش صیاد ہیں۔ نوش کے ساتھ گزندِ نیش ہے۔ کوئی دل شاد، کسی کا سینہ ریش ہے۔ عاشق ازل سے غم کا مُبتلا ہے۔ مَثَل مشہور ہے کہ: معشوق کی ذات بے وفا ہے۔ اور جو کبھی کسی قسمت کے زبردست کو اتفاقاً غم خوارِ وفادار ہاتھ آتا ہے؛ تو بسرِ دست کسی نہ کسی پیچ سے فلکِ تفرقہ پسند رشک کھا کے چُھڑاتا ہے۔ اِسی سہارے پر لوگ جان دیتے ہیں، جی بیچ کر یہ رُوگ مُول لیتے ہیں؛ اِتنا نہیں معلوم کہ اَلقَلِیلُ کَالمَعدُوم۔

یہ جُملہ تو مُعتَرِضہ تھا، پھر وہی قصہ شُروع ہوا۔ ایک رُوز فرح اندوز ملکہ بہ دستورِ قدیم، بے یار و ندیم باغ میں گئی۔ شہ زادے کی صُحبت کا خیال اور انجمن آرا کی گرم جوشی کا ملال، تنہائی میں اپنا خراب حال دیکھ کر یہ شعر مؤلّف کا پڑھا، مؤلّف:

ایک انقلابِ چرخ سے، افسوس! دیکھنا
وہ صحبتیں رہیں، نہ تو وہ ہم نشیں رہے

پھر ایسا رُوئی کہ ہچکی لگی۔ شام کا وقت تھا، جانور درختوں پر بسیرا لیتے تھے۔ جس درخت کے تلے ملکہ کھڑی تھی، ایک تُوتا اُس پر آ بیٹھا۔ گریہ و زاری اِس غم کی ماری کی دیکھ کر بے چین ہوا، پوچھنے لگا: شاہ زادی! کیا حال ہے، کون سا ملال ہے؟ اور کون سا صدمہ ایسا جاں کاہ ہے جو اِس طرح لب پر نالہ و آہ ہے؟ ملکہ نے کہا: سُبحانَ اللہ! قسمت کی گردش سے یہ حال بہم پہنچا کہ جانور ہم پر رحم کھاتے ہیں، احوال

پوچھنے کو اُڑکر آتے ہیں۔ زیادہ بے قرار اور اَشک بار وہ سوگوار ہوئی۔ یہ قاعدۂ کُلّیہ ہے: جب کسی دل شکستہ کی کوئی دل داری کرتا ہے، تو بے شک اُسی کا دل اُمنڈ آتا ہے۔ ملکہ نے بے اِختیار ہوکر کہا، آصفُ الدّولہ:

جو دو شخص خنداں بَہَم دیکھتے ہیں فلک کی طرف رُد کے ہم دیکھتے ہیں

اے جانورِ خوش بیاں، سخن سنجِ مہربان! کیا بتاؤں! گھر بار سے جُدا، بے کسی میں مُبتلا، عزیز اَقرِبا سے الگ، جینے سے خفا ہوں۔ بسانِ آئینہ حیراں، مثلِ زُلف سیہ بخت، پریشاں، نَے کی طرح نالاں، موردِ صد اَندُوہ و بلا ہوں۔ شعر:

بے کسی سوختہ، کسے می خواہم نَفَسے ہم نَفَسے می خواہم

شامِ تیرہ بختی کی سیاہی میں بے قرار، صُبحِ قیامت کی صورت دامن چاک، گریباں تار تار۔ شعر:

کس کو اب زیرِ فلک طاقتِ رُسوائی ہے کاش شَق ہووے زمیں اور سما جاؤں مَیں

دل میں اَلَم سے خار خار، غیر جِنسوں کے دام میں گرفتار، سخت مجبور و ناچار ہوں۔ طائرِ رنگ پَرَیدہ، ہزاروں جَور و ستم میں جَریدہ، رُوئے راحت، کوئے آشیاں نہ دیدہ؛ شبِ غم کے اندھیرے میں سوجھتا نہیں، خوں بار ہوں۔ ناسخ:

① صُبح سے کرتے ہیں معمار مرے گھر کو سفید شام سے کرتی ہے فرقت کی شبِ تار، سیاہ

طوطے نے کہا: مجھے تم سے بوئے محبت آتی ہے، تمھاری باتوں سے چھاتی پھٹی جاتی ہے؛ برائے خُدا جلد اپنے رازِ سربستہ سے مجھے آگاہ

کرو، لِلّٰہ مُفصّل حال کہو۔ ملکہ نے قصّۂ عشقِ جانِ عالم، انجمن آرا کا آنا، وزیر زادے کی بُرائی، جادوگرنی کی کج ادائی، جہاز کی تباہی، اپنا یہاں آنا، اوروں کا پتا نہ پانا، جانِ عالم کا چھٹ جانا، سب بیان کرکے کہا: وہ شاہِ گردوں بارگاہ ہمیں منجدھار میں ڈوبتا چھوڑ، اپنا بیڑا پار لگا، منہ موڑ، خدا جانے کیا ہوا! ہم ہیں اور رنجِ تنہائی میں بے تابی انیس ہے، پریشانی ہمدم، خانہ ویرانی جلیس ہے۔ جو دم ہے، دمِ شمشیر ہے۔ سانس، ناوک کا تیر ہے۔ جیتے جی صبر و قرار نہیں، بڑی مجبوری یہ ہے کہ مرجانے کا اختیار نہیں۔ شعر:

(1) گئے دونوں جہان کے کام سے ہم، نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

توتے کو اِن باتوں سے سکتہ سا ہوگیا، سوچنے لگا۔ سنبھلا تو زمین پر گر پڑا، پر نوچنے لگا۔ ملکہ مہر نگار گھبرائی کہ یہ کیا ماجرا ہوا۔ افسوس:

(2) دیکھ کر مجھ کو وہ حاضر ہوا مرجانے کو وہی غم خوار جو یاں بیٹھا تھا سمجھانے کو

گھڑی بھر میں جب حواس و ہوش اُس سبز پوش کے دُرست ہوئے، بولا کہ اے ملکہ مہر نگارِ باوقار! میں وہی توتا کم بخت، سحر گفتار، جفا شعار ہوں جس نے اُس رشکِ قمر کو دربدر کیا۔ مجھ سے انجمن آرا کا ذکر سُن کر آوارہ ہوا تھا۔ باقی حال تو آپ نے سب سُنا ہوگا۔ پھر تو ملکہ اُسے گود میں اُٹھا، یہاں تک روئی کہ بے ہوش ہوگئی۔ شہ زادے کے بین بصد شور و شین کرنے لگی۔ باغبانیاں دوڑیں، خدمت گزار جھپٹیں کہ آج ملکہ پر کیا حادثہ پڑا۔

جب دونوں کے ہوش و حواس پاس آئے، طبیعت ٹھہری؛ توتے نے سمجھایا کہ آپ دل کو تسکین دیں، خاطرِ مبارک جمع رکھیں، جانِ عالم اور انجمن آرا دونوں خیریت سے زندہ ہیں۔ میں نے یہ مقدّمہ منجّموں اور کاہنوں سے دریافت کیا تھا۔ بالاتّفاق سب کا قول ہے کہ سوائے رنجِ مفارقت، سفرِ غربت؛ جان کی خیر ہے، سب آملیں گے۔ بس اب مجھے رخصت کرو۔ صبح کو خدا جانے کس وقت بیدار ہو۔ ملکہ نے کہا: واہ! بعدِ مدّت ایک غم خوار، محرمِ اسرار ہاتھ آیا تھا، وہ بھی اتنا جلد چلا۔ طالع برسرِ کجی ہے، بے لطف زندگی ہے۔ دیکھیں یہ بُرے دن کب جاتے ہیں اور اچھے کیوں کر آتے ہیں! اُستاد:

① ایک عالم کو آزما دیکھا — جس کو دیکھا، سو بے وفا دیکھا
حالِ بد کا شریک، دُنیا میں — نہ برادر، نہ آشنا دیکھا
کیوں دِلا! ہم نہ تجھ سے کہتے تھے — جی لگانے کا کچھ مزا دیکھا
مِٹ گیا ایک دم میں مثلِ حباب — یاں ذرا جس نے سر اُٹھا دیکھا
سچ ہے، دُنیا مریض خانہ ہے — رنج میں سب کو مبتلا دیکھا
کیف میں، کم بہت نوازش ہے — عشقِ خوباں میں جو نشا دیکھا

آخرکار وہ رات باتوں میں کٹی، صبح ہوئی، پو پھٹی۔ توتا رخصت ہوا۔ چلتے وقت ملکہ نے تھوڑا حال اپنا پرچے پر تحریر کر دیا، کہا: جہاں شاہ زادے سے ملاقات ہو، یہ خط نشانی دے کر، جو کچھ دیکھا ہے، زبانی بیان کرنا۔ توتا وہ رقیمۂ شوق لے کر راہی ہوا۔ شہر بہ شہر خستہ جگر ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ ایک روز قریبِ شام وہ سرگشتہ، ناکام تھک کر، لبِ چشمہ کچھ درخت تھے، اُن پر بیٹھ کر، سیلِ سرشک

چشمِ پُرنم سے بہاتا تھا۔ اُسی دن حسبِ اتّفاق جانِ عالَم اور انجمن آرا توتے کی صورت بنائے اُسی درخت پر آئے۔ یہ توتا، ہم جنس سمجھ دیکھنے لگا۔ وہ، دونوں مُضطرِبُ الحال، پُرملال ایک ٹہنی پر بیٹھ گئے۔ توتا سمجھا کہ یہ مِنقار بستہ میری طرح سے دِل خستہ ہیں، پھر رُونے لگا۔ انجمن آرا نے کہا: جانِ عالَم دیکھنا! یہ توتا رُوتا ہے؛ شاید ہماری صورت مصیبت دیدہ، مَصائب کشیدہ ہے۔ توتا باتیں تو سمجھتا تھا، پھر بیٹھا اور بولا: خدائے رحیم تمھیں وہ رنج نہ دے، عدو بھی تمھارا یہ ستم نہ دیکھے، مجھے وہ غم ہے اور دل پر ایسا اَلَم ہے کہ ہر دم یہ دُعا ہے دشمن کا دشمن یہ صدمۂ جاں کاہ اور ایسے روزِ سیاہ نہ دیکھے۔ میر سوز:

جو دم لیتا ہوں تو شعلہ جگر کا، جی جلاتا ہے (۱)
جو چُپ رہتا ہوں تو اندر ہی اندر جان کھاتا ہے
جو کچھ احوال کہتا ہوں تو سننے والے، روتے ہیں
نہیں کہتا ہوں تو کوہِ الم سینہ دباتا ہے
جو جنگل میں نکل جاتا ہوں تو سب دشت پھنکتا ہے
کبھی جو شہر میں آتا ہوں تو گھر بھول جاتا ہے
پہاڑوں میں اگر پھرتا ہوں، ٹکڑے ہو کے اُڑتے ہیں
جو دریا پر کبھی جاتا ہوں، سر پر خاک اُڑاتا ہے

مجمعِ رنج و محن، غریقِ شطِ خفّت ہمہ تن ہوں۔ محسن میرا خانماں آوارہ ہوا، یہ ندامت ہے۔ مفارقت اُس کی ظلم ہے، قیامت ہے۔

اِس کے وَرائے، تازہ حال یہ دیکھا ہے کہ ایک عاشقِ صادق اپنے معشوق سے جُدا ہے، غیرِ جِنّسوں میں اسیرِ بلا ہے۔ اُس کے ناوَکِ آہ سے چھاتی سوراخ دار ہے۔ سِنانِ نالہ سینے کے پار ہے۔ اگر گریہ وزاری یا تڑپ اور بے قراری اُس کی بیان کروں؛ پتھر، پانی ہوکر بہ جائے۔ سیماب کی چھاتی خَجلت سے پارہ پارہ ہو؛ راہ چلتے، اَن جان کو رحم آئے۔

جانِ عالم یہ سُن کر پھڑ بیٹھا، پوچھنے لگا: وہ کون تھا جو سَرگشتہ و آوارۂ دشتِ اِدبار ہوا؟ اور وہ کون ہے جو ناجِنّسوں میں گرِفتار ہوا؟ تُوتے نے اِن کی داستانِ گُذشتہ اور ملکہ کا حال بیان کیا۔ انجمن آرا، ملکہ کا نام سُن کر شِگُفتہ خاطر ہوئی۔ دونوں نے درخت سے اُتر کے صورت بدلی۔ تُوتا، پہچان کر پاؤں پر گرا۔ شہ زادہ گلے سے لگاکر خوب رُویا، کہا: اے ہمدم! تم سے جو ہم جُدا ہوئے، کس کس رنج و مصیبت میں مُبتلا ہوئے۔ دَشت بہ دَشت، کُوہ بہ کُوہ خراب و خستہ، در بہ در محتاج پھرے؛ تم اُس دن کے گئے آج پھرے۔ پھر ملکہ کا حال پوچھا۔ اُس نے خط حوالے کیا۔ پہلے انجمن آرا نے آنکھوں سے لگایا، دل نے قرار پایا۔ مضمونِ اِضطِراب، بدحواسی کا مطلب سَرنامے سے کُھلا کہ جانِ عالم کی جگہ "ملکہ" اور ملکہ مہر نگار کی جا "رَقیمہ شوقِ جانِ عالم" لکھ دیا تھا۔ اِس اِنتشارِ طبیعت کو سوچ کے شہزادے کے ہوش گُم ہوئے۔ بس کہ نامۂ شوقیہ پیچ و تابِ دل اور اِشتیاقِ ملاقات میں تحریر تھا؛ جانِ عالم

جب اُس کو کھولتا تھا، کاغذ بولتا تھا۔ اور اثرِ شوقِ ہم آغوشی سے ہر بار خط ہاتھ میں لپٹا جاتا تھا۔ مضمونِ مکرّر سو سو حُسنِ طلب دِکھاتا تھا۔ مؤلّف:

نامۂ شوقیہ جب میں نے رقم اُس کو کیا
سو جگہ مضمون تب اُس میں مکرّر ہوگیا

آنسو دمِ تحریر، یعنی لکھنے کے وقت جو خط پر ٹپکے تھے؛ دھبّے اور نشان اُس کے دیدۂ منتظر، چشمِ حیرت زدہ کی طرح ہر سطر پر کھلے تھے، اور سرخ ہالہ ہر حرف نے نکالا تھا۔ ایک جدولِ خونی ہویدا تھی، لہو رونے کی کیفیت پیدا تھی۔ لکھا تھا، حافظ:

از خونِ دل نوشتم نزدیکِ دوست نامہ (۱)
اِنّی رَأیتُ دَھراً مِن ھجرِکَ القیامہ

شعر:

سوادِ دیدہ حل کردم، نوشتم نامہ سوی تو
کہ تا ہنگامِ خواندن چشمِ من افتد بروی تو

اے یارِ وفادار، صادِقُ الاِقرار! اللہ تجھے سلامت رکھے۔ شرحِ اشتیاق، داستانِ فراق قصۂ طول وطویل ہے؛ زندگی کا بکھیڑا، عرصہ قلیل ہے۔ اگر ہماری زیست منظور ہے، جلد آؤ، صورت دکھاؤ۔ نہیں تو تأسّف کروگے، پچھتاؤگے۔ تم نے آنے میں اگر دیر کی، تو ہم نے صدمۂ ہجر سے تڑپ کر جان دی؛ مٹّی کے ڈھیر پر رو رو کے خاک اُڑاؤگے۔ مؤلّف:

شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے
جان جاتی ہے، اجی آؤ خدا کے واسطے

کوئی دم کا سینے میں دَم مہمان ہے، نام کو جسم میں جان ہے۔ فلک نے ہماری صحبت کا رشک کھایا، بے تفرقہ پردازی ظالم کو چین نہ آیا۔ روز و شب رنجِ جدائی سے جان کو کھوتے ہیں۔ اِتنا کبھی کاہے کو کسی دن ہنسے تھے، جیسا بِلک بِلک کر فرقت کی راتوں میں روتے ہیں۔

میر: بے تابیِ دل کسے سنائیں
یہ دیدۂ تر کسے دِکھائیں

تمھاری تقریرِ دل پذیر ہر دم برنوکِ زباں ہے، بے تصوّر سے باتیں کیے چین آرام کہاں ہے۔ اُستاد:

(1) یہ جانتے، تو نہ باتوں کی تجھ سے خو کرتے
ترے خیال سے پہروں ہی گفتگو کرتے

ہمارے تڑپنے سے ہمسایہ سخت تنگ ہے۔ دَولت سَرا زِنداں سے تیرہ و تنگ ہے۔ میر:

گر یوں ہی رہے گی بے قراری تو ہو چکی زندگی ہماری

وحشت پیرا ہُنِ حال ہے۔ ہر گھڑی فرقت کی، ماہ ہے۔ جو پہر ہے، وہ سال ہے۔ میر:

(2) دل کوئی دم میں خون ہووے گا آج کل میں جُنون ہووے گا

تمھاری صورت ہر پَل رُوبہ رُو ہے۔ جس طرف دیکھا، تو ہی تو ہے۔

چشمِ فرقت، دیدۂ دریا بار ہے۔ آنکھ نہیں، چشمۂ آبشار ہے۔ افسوس تو یہ ہے جن آنکھوں کو تم پُرنم نہ دیکھ سکتے تھے، اُن سے خون کے دریا بہ گئے۔ مؤلف:

تم نے نہ ہماری، پر، خبر لی　　چھاتی پتھر کی، کیوں جی، کر لی

دن رات کی وہ صحبت تمھارے ساتھ کی جب یاد آتی ہے؛ نیند اُچٹتی ہے۔ بے چینی کی رات پہاڑ ہو جاتی ہے، کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ چارپائی تنہائی میں پلنگ بن کر کاٹے کھاتی ہے، بالش پر نیند اُڑاتی ہے۔ خواب میں سونے کا خیال نہیں۔ کھانا پانی ہجر میں حرام ہے، حلال نہیں۔ وہ سر، جو اکثر آپ کے زانو پر رہا ہے، اُس کو سَو سَو بار بالش و بالیں پر دے پٹکا ہے۔ مؤلف:

جس میں باہیں تری حمائل تھیں　　طوقِ حسرت میں اب وہ گردن ہے

میرے جاگنے کے، اے پیارے! ستارے شاہد ہیں۔ گواہِ شرعی زاہد ہیں۔ مُرغِ سحر کو بے قراری سے چونکاتی ہوں۔ مؤذن کی نیند آہ و زاری سے اُڑاتی ہوں۔ شبِ وصل یہ ہمیں جگاتے تھے، ستاتے تھے؛ اب ہجر کی رات ہم انھیں سونے نہیں دیتے ہیں، مَن مانتے بدلے لیتے ہیں۔ دل ہر ساعت گھڑی سے زیادہ نالاں ہے، ہر پہر گجر سے فزوں شور و فغاں ہے۔ چشمِ ثوابت و سیّار معائنۂ حالِ زار، پُرملال سے بہ صد حیرت وا ہے۔ چرخِ گرداں میری گردش دیکھ کر چکّر کر رہا ہے۔ اُستاد:

کھا لیجے تھوڑا زہر منگا، ہم اور کہیں تم اور کہیں①

کیا لطف ہے ایسے جینے کا، ہم اور کہیں تم اور کہیں

اِفشائے حال باعثِ ندامت، موجب دشمنوں کی خوشی کا، سبب

دوستوں کے ملال کا ہے۔ لاَاَعْلَم :

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

اگر جیتے جی کبھی مل جائیں گے، رنجِ فرقت کے دُکھڑے مُفَصَّل زَبانی کہہ سُنائیں گے۔ اور جو فلک کو یہ نہیں منظور ہے، تو انسان بہ ہر عُنوان مجبور ہے؛ یہ حسرت بھی درگور، گور میں لے جائیں گے۔ سعدؔی :

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ①

بہ خُدا نمازِ پنجگانہ میں یہ دُعا ہے، جامعُ المُتَفَرِّقین سے یہی التجا ہے کہ تم سے جلد ملاقات ہو، باہم شکوہ و شکایت ہو۔ دلِ بےقرار تسکین پائے، جانِ زار کو چین آئے۔ زیادہ دیکھنے کا اشتیاق ہے، اشتیاق ہے۔ شام و پگاہ جدائی کا صدمۂ جاں کاہ سخت شاق ہے، شاق ہے۔ خوگرِ وصل، ہجر کے الم کا مُبتدی ہے یا مَشّاق ہے۔

یہ خط کا مضمون جو پڑھا، دونوں نے رو دیا۔ اَز سَرِ نَو مع سَرنامہ سَراسَر وہ نامہ بِھگو دیا۔ اُس رات کو تو چار و ناچار وہاں مُقام کیا؛ صُبح ہوتے ہی صورت بدلی، کوچ کا سَرانجام کیا۔ آگے آگے توتا رہ بَر، پیچھے پیچھے وہ دونوں تیز پَر۔

پہنچنا شہزادۂ والاجاہ کا مَرکبِ صبا پر مع انجمن آرا ملکہ مہر نگار کے پاس بہ ہمراہیِ رفیقِ کاملِ سبز لباس۔ اور مُطّلع ہونا وہاں کے بادشاہ کا، بھیجنا سپاہ کا، پھر

بدولتِ نقش مطیع ہوجانا اُس فوج کا، داخلہ لشکرِ دریا موج کا۔

نظم:

پِلادے تو ساقی مےِ لالہ فام
ہُوا چاہتا ہے یہ قصّہ تمام
وہ مَے دے کہ ہوں دور دل سے الم
کہ ہوتے ہیں معشوق و عاشق بہم
جُدائی کے ایّام طے ہو چکے
شبِ ہجر میں خوب سا رو چکے
مچا دوں کوئی دم بھلا چہچہے
کہ رنجِ جدائی بہت سے سہے
مَثَل ہے یہ مشہور اے ذی شعور
کہ ہے رنج کے بعد راحت ضرور

مُحرِّرانِ حالِ طالب و مطلوب و حاکیانِ حکایاتِ خوب و مرغوب لکھتے ہیں کہ وہ پرندۂ ہوائے شوق یعنی جانِ عالم، مع ماہ لقا انجمن آرا اور طائرِ زمرّد ِیں لباسِ دشت پیما، آٹھویں روز ملکہ کے پاس پہنچا۔ یہاں جس دن سے توتا رخصت ہوا تھا، ملکہ مہر نگار دونوں وقت بِلا ناغہ باغ میں آتی تھی، درخت خالی دیکھ کر گھبراتی تھی۔ بیش تر صبح و شام وہ ناکام، اُس درخت کے تلے جہاں توتا ملا تھا، یہ کہتی تھی، میر سوز:

مانندِ جرس پھٹ گئی چھاتی تو فغاں سے ①
فریاد کو پہنچا نہ کوئی راہ رواں سے

اُس روز موافقِ معمول وہ دِل ملول قریبِ شام درخت کے نیچے حزین و زار، توتے کے اِنتظار میں کھڑی تھی اور آنکھ ٹہنی سے لڑی تھی۔

دیدۂ خوں بار سے دریا اُمڈا تھا، اشکِ مسلسل سے تا دامن یاقوت اور موتیوں کی لڑی تھی۔ جب دلِ سوختہ گھبراتا، تو سوزِ دروں مثلِ دُخاں لب پر آتا۔ جی بہلانے کو یہ غزل پڑھتی، مؤلّف:

آتشِ فرقت سے سینہ جب سے مجمر ہو گیا
بھُن کے لختِ دل مرا ہر ایک، اَخگر ہو گیا

باعثِ اِفشائے ذِلّت دم نہ مارا ہیں نے گاہ
ورنہ زیرِ آسماں کیا کیا نہ مجھ پر ہو گیا

نَزع تک تو آمدِ جاناں کا کھینچا انتظار
وہ نہ آیا، وعدہ اپنا یاں برابر ہو گیا

کیا ڈراتا ہے ہمیں واعظ سُنا شورِ نُشور
شامِ فرقت، یاں عذابِ روزِ محشر ہو گیا

اب جو ہنستا ہوں تو ہنستے ہنستے بھی گرتے ہیں اشک
روتے روتے، آخرش رونے کا خوگر ہو گیا

فکر پھر کس کو ہو دیواں جمع کرنے کی سُرور
جب کہ ہو مجموعۂ خاطر ہی اَبتر ہو گیا

دَفعتہً توتے نے سلام کیا۔ وہ خوش ہو کر بولی: اے قاصدِ نیک صدا و ہُدہُدِ شہرِ سَبا! میرے سُلیمانِ حُسن و خوبی کا پتا، یا اُس بِلقیسِ محبوبی کا سُراغ ہاتھ آیا؟ توتے نے کہا: اے ملکۂ عالمِ قدرداں! خبرداروں کو خِلعت و اِنعام دیتے ہیں، جب دوست کا پیغام پوچھتے ہیں، عَلَی الخصوص یہ خبرِ فرحت اثر! پہلے یہ اِرشاد ہو کہ اگر کچھ پتا بتاؤں گا، تو اُس کی اُجرت کیا پاؤں گا؟ یہ سُن کے ملکہ کی جانِ رفتہ بدن میں آئی۔ یقین ہوا، اِس نے مُفصّل خبر پائی۔ یہ کہا، اُستاد:

(۱)
پیغامِ دوست جلد تو پیغام بر سُنا
گھبرا کے دم ہی جائے نہ میرا کہیں اُلٹ

توتا عرض کرنے لگا: حضور کا اِرشاد واقعی بجا ہے، مگر ایسی خبر کا جلد کہنا، حُمق

کا مُقتضا ہے۔ اُستاد :

دفعۃً خوگرِ فرقت کو نہ دے مژدۂ وصل ①
خبرِ خوش نہیں اچھی جو یکایک ہووے

توتا تقریر کو طول دیتا تھا۔ کبھی خوش، گاہ ملول کر دیتا تھا۔ ملکہ بے چین ہوئی جاتی تھی۔ اِدھر شہ زادے سے زیادہ انجمن آرا گھبراتی تھی۔ غرض نہ رہ سکی، صورت بدلی۔ جانِ عالم بھی مجسّم ہو کے سامنے آیا۔ آپس میں عاشق و معشوق و معشوق و عاشق خوب گلے مل مل کے روئے۔ غبارِ کُلفتِ پارینہ، داغِ مہاجرتِ دیرینہ دل کھول کر صفحۂ سینہ سے دھوئے۔ رونے کی آواز سے مغلانیاں، خواصیں جمع ہوئیں۔ جس کی آنکھ اِن دونوں پر پڑی، دوڑ کر صدقے ہوئی اور پاؤں پر گر پڑی۔ جَلَّ جلالہٗ! حُسنِ خوب سے، کوئی چیز زیادہ دل کش اور محبوب نہیں۔ دوست تو دوست ہے، دشمن غش کر جاتا ہے۔ لڑکا ہو یا بوڑھا، شیدا نظر آتا ہے۔ بال تو کیا مال ہے، سوت کی انٹی بھی اگر پاس ہو، تو انٹی مارے سے خریدار بن جاتا ہے۔ جان عزیز نہیں، حُرمت کچھ چیز نہیں۔ غلام کی غلامی پر آقا فخر کرتا ہے۔ جانِ تازہ پاتا ہے جو کوئی کہتا ہے کہ : یہ اُس پر مرتا ہے۔ عِیاذاً باللہ یہ اَمرِ محمود نہیں۔ اِس میں غیرِ ضَرَر کچھ سُود نہیں۔

غَرض کہ خُرّم و خَنداں بارہ دری میں آئے۔ انجمن آرا سے ملکہ نے حال پوچھا۔ اُس نے دیو کا اُٹھا لے جانا، باغ کی

بے سروپائی؛ پھر جانِ عالم کی رسائی اور سفید دیو کا آنا، باہم کی لڑائی، پھر اُس کو قتل کر کے آفت سے چھڑانا؛ اپنی پیادہ پائی، صحرا نوردی، ہواگرم، پاؤں کا ورم؛ پھر وہ عمل جوگی کا بتایا ہوا شہزادے کا سکھانا، بادِ ہوائی سفر، توتے سے درخت پر مل جانا سنا دیا۔ پھر اُس نے جانِ عالم سے سرگزشت پوچھی، اپنی صعوبت کہی۔ گزشتہ کا حال میں ذکر کر کے، جو کچھ دھیان بندھا، پھر سب رونے لگے۔ توتا بدمزہ، خفا ہوا، کہا: صاحبو! اب یہ قصہ بکھیڑا دور کرو، سجدۂ شکر بجا لاؤ، کھیلو کھاؤ، ہنسی خوشی کا مذکور کرو۔ یاد رکھو یہ بات: گزشتہ را صلوات۔ مصحفی:

جز حسرت و افسوس، نہیں ہاتھ کچھ آتا
ایّامِ گزشتہ کو کبھی یاد نہ کیجے

ملکہ بولی: اے شیریں مقال، مبارک قدم، خجستہ فال! شہزادے کے برابر عقل کا دشمن کسی نے دیکھا نہ سنا ہوگا۔ سوز:

معلوم ہم کو دل کے سلوکوں سے یہ ہوا [1]
نادان ہے جو دوست، وہ دشمن ہے جان کا

اِس نے جتنی محنت و مشقت اُٹھائی، اپنی بدعقلی کی سزا پائی۔ بھلا عالمِ تنہائی میں جو کچھ کیا سو کیا؛ دو تین بار اپنے ساتھ ہم دونوں کو خراب، آفت کا مبتلا کر چکا ہے، آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر، دربہ روئے دشمناں بند، دوست بادلِ خرسند باہم بیٹھے اور دورِ ساغر

بے دغدغۂ فلکِ تفرقہ پسند و سفلہ پرور شروع ہوا۔ مُطرب نے ساز کی ناسازی پر گوشمالی دی، صدائے عیش و طرب بلند ہوئی۔

یہ خبر بارہ دری میں مشتہر ہوئی اور وہاں کے بادشاہ کو پہنچی کہ ایک مردِ صاحب جمال، دوسری عورت پری تمثال ملکہ کے پاس تازہ وارد ہوئی۔ کہنے لگا: اَلحَمدُ لِلّٰہ گھر بیٹھے یہ عنایتِ پروردگار ہے۔ نصیب چمکا ہوا ہے، طالع یار ہے۔ ایک موجود تھی، دو اور آئے۔ اُسی دم دو ہزار سوارِ جرّار اور دو سپہ سالارِ تجربہ کار نگہ بانی کو بھیجے۔ جانِ عالم نے یہ ماجرا سُنا، کہا: فضلِ الٰہی چاہیے، بعدِ مدّتِ مدید یہ صحبتِ ہمدیگر میسّر ہے، صبح کو سمجھ لیں گے۔ سوار تو باغ گھیرے کھڑے رہے، یہاں تمام شب جلسے بڑے رہے۔

جس وقت خسروِ خاور آرام گاہِ مشرق سے برآمد ہو کے جلوہ گرِ تختِ زنگاری ہوا اور سپہ سالارِ انجم مع سوار، پیدل ثوابت و سیارہ کے، کوہِ مغرب کی طرف فراری ہوا؛ جانِ عالم حمام سے غسل کر کے نکلا۔ اُس لوح سے اِسمِ تسخیر پڑھتا باغ کے دروازے پر آیا۔ جس کی نگاہ پڑی، دبدبۂ شوکت اور اِسم کی برکت سے آداب بجا لایا، دست بستہ رُو بہ رُو آیا۔ وہ دو ہزار سوار مع سپہ سالار فرماں بردار ہوئے؛ پھر تو دروازہ بہ کُشادہ پیشانی کھولا۔

یہ خبرِ وحشت اثر اُس بادشاہ کو پہنچی؛ اور سوار پیادے،

لڑائی کے آمادے بھیجے۔ وہ بھی جب سامنے آئے، گھبرائے، حلقۂ غُلامی کان میں ڈالا، جنگ کا خیال نہ رہا۔ پھر تو مشہور ہوا کہ ساحر ہے۔ اَلْمُختَصَر، تمام فوج آکر شریک ہوئی۔ اُس وقت وہاں کا تاج دار طَیش کھاکے سوار ہوا۔ کہاں یکّہ سوار، کُجا اَنبُوہِ بے شمار! تلوار چلی، دس بارہ زخمی ہوئے، کچھ جان سے گئے۔ اور فوج نے نرغا کر، جان سے تو نہ مارا، کمندوں میں پھنسا لیا اور جانِ عالَم کے حوالے کیا۔ شہ زادۂ عالی حوصلہ خوفِ خدا سے اور نحوستِ طالِع نارسا، کج ادا سے مثلِ بید کانپا اور فرمایا: اللہ وہ وقت کسی کو نہ دِکھائے جو اپنی فوج یا رعیّت حاکم سے ناراض ہو۔ دوست دشمن ہو جائے، عداوت سے پیش آئے۔ یہ اِرشاد کرکے اُس سے بَغَل گیر ہوا، برابر بٹھایا، قتل سے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ بے چارہ نادِم و پشیماں، سَر دَر گِریباں، گھٹنے پر گردن جُھکا، مُنفَعِل، خاموش بیٹھا۔ شہ زادے نے کہا: مسافر کُشی صِفَتِ شاہی سے بعید ہے۔ ہم تمھارے مہمان تھے، تم نے دعوت کے بدلے عداوت کی؛ اللہ کو یہ بات پسند نہ ہوئی، عبرت کا تماشا دکھایا۔ یہ تخت، یہ سلطنت آپ کو مُبارک رہے۔ بندہ غریبِ دِیار، کمر باندھے چلنے کو تیار ہے۔ اِس لڑائی کا قصّہ، فسانہ ہو جائے گا۔ اِمروز یا فَردا یہ مسافر روانہ ہو جائے گا۔ وہ اِس کی فصاحت و بلاغت اور یہ سیر چشمی دیکھ کر حیران ہوا، کہ دشمن کو گرفتار کیا، پھر مُلک بخش دیا۔ سر جُھکا کر

بولا: بہ خدائے عزّ وجل لائقِ حکومت، قابلِ سلطنت آپ کی ذاتِ فرخندہ صفات ہے۔ جانِ عالم نے کہا: آپ یہ اپنی تعریف کرتے ہیں، وگرنہ من آنم کہ خوب می دانم۔

اَلقصّہ، وہ محجوب ہوکر رخصت ہوا۔ فوج کو صُلح جو ثابت ہوئی، اپنے بادشاہ کے ہمراہ چلی گئی۔ جب یہ جنگِ زرگری ہوچکی، مکان پر آکر بہت تیّاری اور تکلّف سے دعوت کی اور عُذرِ تقصیر کرکے عفو کا اُمّیدوار ہوا۔ شہر والے یہ خبر سُن کے ایسے مشتاق ہوئے کہ غُول کے غُول آنے لگے۔ رُوز باغ کے دروازے پر میلا رہتا تھا، کسی وقت وہ کوچہ نہ اکیلا رہتا تھا۔

پھر جاسوس، شُتر سوار، ہرکارے فوج کے تجسّس میں بھیجے۔ چالیس منزل پر لشکر ملا۔ جانِ عالم کی مُفارقت سے کسی میں جان نہ تھی۔ فرمانِ مُہری دیکھ کر سب نے جانِ تازہ پائی، مُہر آنکھوں سے لگائی۔ رات دن کوچ کرتی، بیس پچیس دن میں بہ رسمِ یلغار، فوج داخل ہوئی۔ شہزادہ لشکر کو ملاحظہ کرکے مسرور ہوا، ملال بھولا، رنج دور ہوا۔ ارکانِ سلطنت نے ملازمت حاصل کی، سب نے نذر دی۔ مُوافقِ قدر و منزلت خِلعت اور انعام خاص و عام کو مرحمت ہوا۔ اور رِعایا برایا، بازاری، دُکان دار، اہلِ حرفہ کو بھی کچھ دیا۔ فوج کے سرداروں کو خِلعتِ جواہر نگار، سپر و شمشیرِ مُرصّع کار عنایت کرکے، دُو ماہہ تمام فوج کو انعام میں دیا۔ از سرِ نو لشکر چمکا دیا۔ پھر وہاں سے

کوچ ہوا۔ وہی راہ میں جلسے، اِختلاط، فسانے، حکایات، عیش و نَشاط۔ توتا ہنساتا، رمز و کنایے کرتا، لطیفے سناتا، دِل بہلاتا جاتا تھا۔ ہر صُبح باخاطرِ شگفتہ مثلِ نکہتِ گُل کوچ۔ ہر شام بسانِ فصلِ بہار بہ آسایش مُقام۔ روز و شب بہ راحت و آرام کبھی کوچ، کبھی مُقام کرتے چلے۔

وُرُودِ عساکرِ فیروزی اثر صحرائے ہمیشہ بہار میں۔ وُفُورِ سَرما، شِدّتِ بَرد دشت و کُہسار میں۔ کیفیت باہم کے جلسے کی، ترقّی شراب کے نشے کی۔ خیالاتِ فاسِد آنا، توتے کا سمجھانا، پھر شہزادے کا پچھتانا۔

ناگاہ ایک روز گُذرِ موکبِ باحشمت و جلال، فرّ و شوکت سے، ایک صحرائے باغ و بہار، دشتِ لالہ زارِ بے ملال میں ہوا۔ فِضائے صحرا قابِلِ تحریر۔ کیفیّتِ دشتِ گلشن آسا لائقِ تقریر۔ بُو باس ہر برگ و گُل کی رشکِ مُشکِ اَذفَر۔ صَفحۂ بیاباں مُعنبر و مُعطّر۔ چشموں کا پانی صفا میں آبِ گُہر سے آب دار تر، ذائقے میں بِہ از شِیر و شکر۔ چِلّے کے جاڑے، کڑاکے کی سردی تھی؛ گویا کہ زمین سے

آسمان تک منجمد ہو گئی تھی۔ پرند چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے، بھوک اور پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے، دھوپ کھانے کو باہر نہ آتے تھے، قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا، دمِ تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی، منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مارِ سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا، سردی کے باعث دُم دبا کے بانبی میں دبکا جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا۔ عاشق و معشوق بھی اگر ساتھ سوتے تھے، گھٹتے تھے، مگر گھٹنے پیٹ سے جدا نہ ہوتے تھے۔ اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا، پروانوں نے گرد پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔ شعلہ کانپتا تھا، فانوس کے لحاف میں منہ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا، پگھلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گواہِ شرعی شرر تھا، لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔ تنورِ فلکِ چارم کی چھاتی سرد تھی۔ گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر گرد تھی۔ لنجوں نے بٹیر پکڑے، لوے لولوں کے ہاتھ آئے، لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سرزمینِ ہند میں مُردے نہ جلتے تھے، زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے۔ آتشِ رخسارِ گل شبنم نے بجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اوس برگ و بار کی،

صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی، مرصّع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم، خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے برگ و بار میں الماس اور موتیوں کے سُباک آویزے تھے۔ عذارِ لالۂ حمرا رشکِ زعفران تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں، کہربائی پتّے۔ بہار میں رنگِ خزاں تھا۔ اِس سردی کا کہیں ٹھور ٹھکانا ہے، حمّام پر یہ پھبتی تھی کہ برف خانہ ہے۔ آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے، زردشت کا طریق اختیار کرتے تھے۔ اُسی سردی کا یہ وُفور ہے کہ آج تک بُتوں کی سرد مہری مشہور ہے۔ آفتاب عازمِ بُرجِ حَمَل تھا، آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زیست سمندر کے عنوان تھی، آگ میں خلقت کی جان تھی۔ عاشق تو کیا، معشوق ٹھنڈی سانس بھرتے تھے، گرمی نہ کرتے تھے۔ دانت سے دانت بجتا تھا۔ ہونٹ نیلم کو شرماتے تھے، پان کے لاکھے میں سوسن کی پنکھڑی سے نظر آتے تھے۔ عاشق تن، پریوں کو ساتھ لے کے سوتے تھے، اِس پر بچھونے گرم نہ ہوتے تھے۔ عالم اللہ کا جاڑے میں اُلمست تھا۔ جس کو دیکھا، آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اُس دشت میں ایسا پالا پڑا، تمام اہلِ لشکر کو تپ لرزے کا عالم تھا۔ بانکے ترچھے خود بہ خود اینٹھے جاتے تھے، ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے۔ تینچے، چقماق، پتھر کلے، لاٹھی سے بدتر تھے۔ بندوق میں لاگ نہ تھی، چاپڑ کے پتھروں میں آگ نہ تھی۔ اور توڑے دار کا یہ حال تھا: بوجھ کندھا توڑتا تھا، قدم اُٹھانا محال تھا۔ توڑا

ہر ایک ، گُل تھا ؛ تُوتے کی جگہ شورِ بُلبُل تھا۔ ملائم لوگوں کے حواس جَم گئے تھے ، جُگنو کو چنگاری کے دھوکے میں اُٹھانے کو تھم گئے تھے۔ اور ہوش ایسے کانپتے تھے ؛ کیچڑے کی مٹّی کو الاؤ سمجھ ، پھونکتے پھونکتے ہانپتے تھے ۔ سردی بس کہ کارفرما تھی ، ایک کو دوسرے کی تمنّا تھی۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالم گیر ہوا تھا کہ کُرۂ نار ، زمہریر ہوا تھا۔

جانِ عالم نے فرمایا : آج خیمہ ہمارا یہیں ہو۔ جس دم تمام لشکر نے مثل دَر مثل قیام کیا ، خود متوجّہِ سامانِ عیش و نشاط ہوا۔ ملکہ اور انجمن آرا سے پری پیکر محبوب۔ تُوتا مصاحبِ بے بدل ، بہ دل مرغوب۔ گردش میں دَورِ شرابِ ناب آیا ، ساغر میں آفتاب آیا ؛ اِلّا ، کشتیِ شراب کی نہ بَطِ مَے چلتی تھی ، نہ کباب بُھنتے تھے ، نہ آگ جلتی تھی۔ گلاس شراب کا برف کی قُلفی کو شرماتا تھا ؛ قطرۂ مَے اُس میں گرتے ہی جَم جاتا تھا۔ مینائے بے زباں کے منہ پر روئی تھی ، ایسی سردی ہوئی تھی۔ گلا بیٹھا تھا ؛ جب بہت غُل کرتی ، تب قُلقُل کرتی ۔ لبِ ساغر خشک ، جسم پر پسینا تھا ؛ پانی کا پیالہ فخرِ آبگینہ تھا۔ جاڑے کا لشکر میں ہر طرف شور و غُل تھا۔ بازار میں روئی کا لین دین بالکل تھا۔

جب دَورِ آفتاب ماہ جبینوں میں چمکا ؛ عالَم سُرور میں ، نشّے کے وُفور میں جانِ عالم کو خیالِ نزدیک و دور آیا ۔ دل میں سوچا کہ اِتنے عرصۂ دراز ، زمانۂ دیریاز تک ملکہ اور انجمن آرا کو ہم سے

فُرقت، غیروں سے قُربت رہی؛ رنڈی کا اِعتبار کیا ہے، یہ قوم قدیم سے بے وفا ہے۔ فِردَوسی:

اگر نیک بودے سَر انجامِ زن
زناں را "مَزَن" نام بودے نہ "زَن"

یہ نَشیب و فَراز جو ذہن میں آیا؛ جَلی کَٹی باہم ہونے لگی، کَج بحثی صُحبت کا لطف کھونے لگی۔ وہ سبز پوش، خانہ بدوش، موقع شَناس، مزاج داں، دِل سوز، ادب آموز، بے زَباں بلبلِ ہزار داستاں دل کا حال جانتا تھا، اُڑتی چِڑیا پہچانتا تھا؛ سمجھا: جانِ عالَم کی طبیعت کبیدَہ ہوئی۔ قریب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ ایسی گفتگو آغاز ہو، جس کا انجام یہ صُحبت دَرہَم و بَرہَم کرے۔ زندَگی سب کی تَلخ ہو؛ ہر کلمہ نَبات کا، کارِ سَم کرے۔ بات کو کاٹ، طبیعت کو اُچاٹ، کہنے لگا: شہ زادۂ عالَم! نشہ اِس کیفیت سے حرام ہے کہ اِس کی ترقّی میں عقل کو تَنَزُّل ہوتا ہے۔ خَیالِ بیہودہ، لاطائل آتے ہیں، احسان بھول جاتے ہیں۔ فَقَط گُمانِ بے جا اور خَیال، وہ بھی نشے کے حال کا؛ اُس پر حقِ خدمت ناحق بھول جانا، روٹھے ہو کے بگڑنا، مُنہ بنانا، گویا اِن تلوں میں تیل نہ تھا، کبھی میل نہ تھا؛ آدمیّت سے بعید ہے۔ اِن میں کوئی آپ کی زَر خرید ہے؟ ایک ساعت اِدھر مُخاطَب ہوجیے۔ اِس مدّتِ مُفارَقت میں بہت سانحے دیکھے، افسانے اپنے بیگانے کے سُنے؛ اگر بہ گوشِ ہوش انھیں سُنیے تو یہ تَخیُّلاتِ فاسد

دور ہوں۔ جانِ عالم نے کہا: ایسی بات اِس وقت واجبات سے ہے، جلد کہہ۔

حکایتِ ہوش رُبا، نقلِ عبرت خیز، حیرت افزا قاضیِ مُتَشَرِّع اور مُفتیِ صاحبِ وَرَع کی۔ قاضی کا ایمان کھونا، بھاوج پر فریفتہ ہونا۔ اُس کا انکار کرنا، قاضی کا مُفتی میں بے گناہ سنگسار کرنا۔ اُس کی جان بچ جانا، بادشاہ کا آنا۔ سب حال ظاہر ہونا، عورت کی پاک دامنی سے ماہر ہونا۔

تُوتے نے کہا: جناب امام جعفرِ صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا متدیّن، نیک طینت، باصفا، سخی، شجاع، عابد، پارسا۔ اُس کے عہدِ دولت میں دُو بھائی تھے: ایک تو شہر کا قاضی، دوسرا مفتی۔ بہ ظاہر مردِ مسلماں، صاحبِ ایماں۔ مفتی کی بی بی نہایت شکیلہ، بہت جمیلہ تھی۔ اِتّفاقاً عندالضّرورت مفتی کو بادشاہ نے کہیں دو چار منزل بھیجا۔ وہ اپنی عورت، دمِ رخصت بھائی کو سونپ گیا۔ قاضی گاہ گاہ خبر کو اُس عورت کے پاس جاتا تھا، پردہ اِسی واسطے

خوب ہوتا ہے۔ جتنا دُنیا کا قصہ بکھیڑا ہے، سب آنکھوں سے دیکھا سُنا ہے۔ وہ تو بہ درجہ حسین تھی؛ شیطانِ عَلَیہِ اللّعْن نے ورغلایا؛ قاضی کی آنکھ پڑی، فریفتہ ہوا۔ چند روز میں ولولۂ طبیعت حد سے فزوں، بلکہ قریبِ جنوں ہوا؛ مگر وہ عورت جیسی خوب صورت تھی، اُس سے زیادہ عِصمت و عِفّت رکھتی تھی۔ ایسا حُسن حُسنِ اِتّفاق سے ہوتا ہے۔

قاضی نے ایک روز اُس سے سوالِ وِصال کیا۔ اُس نے اِس اَمرِ بد سے ازحد انکار کرکے، خوشامد کا کچھ نہ خیال کیا۔ قاضی سمجھا: یہ راضی نہ ہوئی اور نہ ہوگی۔ خِفّت میں دو اندیشے ہوئے: ایک تو محرومیِ وِصال، دوسرے اِفشائے راز کا ملال؛ گھبرا کر بادشاہ سے عرض کی: دمِ رخصت میرا بھائی اپنی جورو مجھے سونپ گیا تھا؛ اُس فاحشہ نے اُس کی غیبت میں زنا کیا، مجھے ثبوتِ کامل ہوا۔ بادشاہ نے مردِ مُتَشَرِّع سمجھ، صاحبِ زُہد و وَرَع جان کر اِختیار دیا۔ قاضی نے اُس کو تنہا لے جا کر سمجھایا کہ اب تک خیر ہے، مجھ سے راضی ہو؛ نہیں، بڑا شر ہوگا، بے سود تیری جان کا ضرر ہوگا۔ دل پر جبر اِختیار کروں گا، تجھے سنگسار کروں گا۔ وہ عورت شیر صفت اُس کی گیدڑ بھبکی سے نہ ڈری، مرگ پر راضی ہوئی۔ اُس کم بخت شہوت پرست نے شہر کے باہر لے جا، اُس کو سنگسار کیا۔ خلقِ خدا عبرت کُناں، خائف و لرزاں اپنے اپنے گھر پھری۔ وہاں حافِظِ حقیقی نے شیشۂ حیات اُس نیک صِفات کا سنگِ ستمِ قاضی سے بچا لیا، ٹھیس نہ لگی۔

خواہشِ بے جا میں ایسا ہی ہو جاتا ہے، عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ شب کو عورت پتھر سرکا، ایک سمت پیادہ پا روانہ ہوئی۔

جنگل میں ایک ویرانی رہتا تھا، مردِ خدا پرست۔ بستی کو چھوڑ، اہلِ دنیا سے منہ موڑ دشت بسایا تھا، ویرانے میں گھر بنایا تھا۔ یہ جب وہاں پہنچی، اُس حق پرست نے اِس کی غریب الوطنی پر رحم کھایا۔ لڑکا اُس کا خُرد سال تھا، اُس کی خبر گیری، خدمت کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس ویرانی کا ایک غلام سخت نطفۂ حرام تھا، بد ذات، گیدی۔ مَثَل مشہور ہے: لَاخَیرَ فِی عَبِیدِی۔ رنڈی جوان دیکھ کر عاشق ہوا۔ بہت سی چاپلوسی کی، وہ ڈھب پر نہ چڑھی۔ اُس شقی نے ویرانی کا لڑکا ذبح کر کے، تہمتِ قتل اُس عورت پر کی۔ اولاد کی محبت مشہور ہے۔ امیر ہو یا فقیر، اِس میں مجبور ہے۔ ویرانی کو بہ شدت رنج ہوا، لیکن وہ صابر و شاکر تھا، عورت سے کچھ نہ کہا، بجز رَضِینا بِالقَضَا۔ اور بیس دینار زادِ راہ دے کر رخصت کیا۔

وہ بے چاری مصیبت کی ماری چل نکلی۔ ایک شہر میں وارد ہوئی۔ بازار میں بھیڑ دیکھی، شور و غل برپا تھا، اور ایک شخص کو زنجیر و طوق میں پھنسا، کشاں کشاں لوگ لیے جاتے تھے۔ عورت نے پوچھا: اِس سے کون سا جُرمِ قبیح سرزد ہوا، جو ایسی آفت میں مبتلا کیا۔ لوگوں نے کہا: یہ بیس دینار کا قرض دار ہے، ادا کی طاقت نہیں؛ اُس کے بدلے یہاں کے سردار نے دار کا حکم دیا ہے۔ عورت کو رحم آیا، وہی ویرانی کے دینار دے کر قید سے چھڑا دیا۔ وہ مکّار، بد باطن، عیّار تھا۔ رنڈی

جو خوب صورت دیکھی، جی بھر بھر آیا، کہا: تو تو میری مُحسِنہ ہے، میں تیرے ہمراہ رہوں گا، خدمت گُزاری کروں گا۔ اِس حیلے سے ساتھ ہوا۔

کچھ دور شہر سے نکلی تھی، راہ میں دریا ملا۔ یہ مدّت سے نہائی نہ تھی، کپڑے بھی کثیف ہو گئے تھے؛ ایک طرف لباس دھو کر، نہا رہی تھی۔ ناگہاں ایک سمت سے دو جہاز وہاں آئے۔ اہلِ جہاز نے دیکھا: عورت قمر طلعت ہے، اُسی حرام زادے سے حال پوچھا کہ یہ کون ہے؟ اُس نے اپنی لونڈی بتایا۔ مول تول درمیان آیا۔ غرض کہ مبالغ خطیر پر بیچ کر، کسی بہانے سے جہاز پر چڑھا دیا، روپے لے کر چل نکلا۔ وہ دو سوداگر تھے، دونوں اِس پر مائل ہوئے، قصّے فساد حائل ہوئے۔ پھر یہ صلاح ٹھہری کہ بالفعل مال کے جہاز پر یہ رہے۔ جب اسباب بِک چکے، اُس وقت عورت جسے قبول کرے، وہ لذّت حصول کرے۔ جھگڑا مٹا دیا، اُسے مال کے جہاز پر بٹھا دیا۔ ایک روز آندھی چلی، طوفان آیا۔ جس جہاز پر سوداگر تھے، وہ تو ڈوب گیا؛ مال کا جہاز اور یہ جان باز سلامت رہی، مالک ہوئی۔ چند عرصے میں جہاز اُس شہر میں آیا جہاں سے یہ سنگسار ہو کر نکلی تھی۔

دو کلمے یہ سُنو: جس شخص نے اِس کو بیچا تھا، کسی تقریب سے وہ یہاں کے بادشاہ کا بخشی ہوا۔ اور دیرانی کا غلام، بہ مَددِ اَیام پایۂ وِزارت پا گیا۔ اور مُفتی صاحب سفر سے پھر کر، مُفت جورو کے اَلَم میں مبتلا تھے۔ جس دن جہاز اُس شہر میں پہنچا، وہاں کے پیمبر کو حُکمِ اِلٰہی آیا کہ ہمارا ایک خاص بندہ جہاز پر آیا ہے، یہاں کا بادشاہ، وزیر، بخشی اور

قاضی و مُفتی کو لے کر اُس کے پاس جائے، اور اِس سال جو جو گُناہِ صَغیرہ یا کبیرہ اِن سب سے عَمدًا اور سہوًا سرزد ہوئے ہوں، اُس کے رُو بہ رُو بیان کریں۔ جو وہ خطا مُعاف کرے، تو ہم بھی دَر گُزریں؛ وگرنہ بلاے آسمانی، آفتِ ناگہانی اِس زمین پر نازِل کروں گا۔

پیمبر نے بادشاہ سے کہا۔ وہ سب کو ہمراہ لے کر، نبی کو گواہ لے کر جہاز پر آیا۔ عورت پردہ چھوڑ کر آ بیٹھی۔ تقریر شُروع ہوئی۔ پہلے بادشاہ نے کہا: میں سیہ کار، اَز سَرتاپا گُنہ گار، مَعصیت کا مُبتلا ہوں؛ مگر یہ خدشہ تازہ ہوا ہے کہ قاضی کے کہنے سے مُفتی کی جورو کو بے تحقیقات رَجم کا حکم دیا۔ عورت بولی: غَفَرَ اللہُ لَکَ۔ یعنی بخشے خدا تجھے۔

پھر مُفتی نے کہا: مجھے جورو کی طرف سے گُمانِ بد ہے۔ اُس نے کہا: تو ابھی چُپ رہ، بیٹھ جا۔ پھر قاضی نے بیان کیا: مجھ سے بہ دولتِ نَفسِ اَمّارہ یہ حرکتِ ناکارہ ہوئی کہ بے جُرم و خطا ایک بے گُناہ کو سنگسار کیا۔ اُس نے کہا: اللہ تیری مَغفِرت کرے۔ بعد اِس کے وزیر، وہ ویرانی کا غلام آیا؛ ندامت سے سر جُھکایا، کہا: بہ تحریکِ شیطان اور جوشِ شہوت، غلام سے جُرمِ قبیح ہوا کہ آقا کا لڑکا مار ڈالا، صاحبِ عصمت کا قصور ٹھہرایا، بوجھ اپنا اُس پر ٹالا۔ وہ بولی: غفور الرحیم تجھ پر رحم کرے۔

جب بخشی آیا اور بیچنے کا ماجرا زبان پر لایا، عورت نے کہا: تو مُحسِن کُش ہے، خدا تجھے نہ بخشے گا۔ اَلغرض بخشی کی جُرم بخشی نہ ہوئی۔ پھر وہ پردہ اُٹھا کے باہر آئی، مُفتی سے کہا: یہ سب بکھیڑا تو نے سُنا، تو نے

مجھے پہچانا؟ یہ سب قصّہ میری عفّت کا ہے۔ آج تک خدا کے حفظ و عنایت سے میری عزّت و آبرو بچی، اب خُلع کی اُمیدوار ہوں۔ یہ مال و متاع تو اپنے صرف میں لا، مَیں تنہا گوشۂ عزلت میں بیٹھ کے عبادتِ معبود کروں گی، اِسی شغل میں مروں گی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاضرینِ صحبت، ناظرینِ جلسہ تھرّائے۔ بادشاہ سلامت مُنفعِل گھر آئے۔ وہ عورت تو حُجرہ بنا کے طاعتِ یزداں میں مشغول ہوئی، دولتِ کونین حُصول ہوئی۔

توتا یہ قصّہ تمام کر کے بولا: جانِ عالم! جو لوگ ثابت قدم ہیں، اُن کا ہر وقت اللہ یار ہے۔ ہر بحرِ بے کنار سے اُن کا بیڑا پار ہے۔ فرد:

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد، مرد
خدا پنج انگشت یکساں نکرد

یہ نقل سن کر شاہ زادے کا نشہ ہرن ہوا۔ دونوں کی مشقّت اور ایذا اُٹھائی، خانہ ویرانی، بادیہ پیمائی، عزیزوں کی جدائی یاد آئی۔ خوفِ خُدا سے مثلِ بید کانپا۔ ندامت سے عُذر کیا کہ حالتِ نشے میں جھک مارا، قصور ہوا، اب یہ خدشہ دل سے دور ہوا۔ پھر ہنسی خوشی وہاں سے کوچ کیا۔

اب تماشا ہے نہ سیر ہے، خاتمہ بالخیر ہے۔ وطن پہنچنا اُس سیّاحِ جہاں گرد کا آرام و چین سے،

بعدِ حصولِ سعادتِ قدم بوس ملنا والدین سے۔ پھر فیروز شاہ کا جانِ عالم کو تخت وتاج دینا، آپ گوشۂ عزلت لینا۔ اور قتل وزیر زادے کا، سزائے اعمال کو پہنچنا اُس حرام زادے کا۔

اَبیات:

چل اے توسنِ خامہ منزل رَساں — کہ اب گھر پہنچتا ہے یہ کارواں
پھرا گھر کو شہ زادۂ خوش سیَر — جھگڑے کا عالم، بہت کرّوفر
وہ اِس طَرح پہنچا وطن کی طرف — بہار آئے جیسے چمن کی طرف
بڑی فکر رہتی تھی ہر صبح و شام — ہوئی فضلِ حق سے کہانی تمام
وہ بچھڑے تو سب ہو گئے ایک جا — ہوئے اپنے مطلوب سے ہم جُدا
رہی شرحِ جورِ فلک نا تمام — سُرورِ حزیں! توسنِ خامہ تمام

غَرض کہ شاہ زادۂ جانِ عالم منزل بہ منزل مسافت طے کر، مَعَ الخیر وطن پہنچا۔ دو کوس شہر سے باہر خیامِ ذوی الاحترام استادہ ہوئے، لشکرِ ظفر پیکر نے مقام کیا۔ یہ خبر فسحت آباد میں گھر گھر مشہور ہوئی کہ کوئی غنیم بے خوف وبیم فوجِ عظیم لے کر وارِد ہوا ہے، دیکھیے ہوتا کیا ہے۔ شہر کا یہ نقشہ تھا: جس روز سے جانِ عالم مفقودُ الخبر،

دَر بَدَر ہوا تھا؛ سُنسان، ویران، بے چراغ پڑا تھا اور بادشاہ گریباں چاک، سر پر خاک، نہ تخت کی خبر، نہ سلطنت سے سروکار، نہ مُلک سے مطلب، نہ دربار سے غَرض، دیوانہ وار، بادلِ بے قرار محل میں پڑا رہتا تھا۔ نہ کسی کی سُنتا تھا، نہ اپنی کہتا تھا۔ اور شہ زادے کی ماں بھی غمگین، اندوہ ناک، بے چین؛ دن رات غم کی حکایت، اَندوہ کے بَین، نصیب کی شکایت، لَب پر شُورو شَین۔ خَلِشِ نشترِ غم سے کوئی ساعت قرار نہ پاتی تھی، ہر وقت بلبلاتی تھی۔ یہاں تک دُورِیِ دِلبَند، مَہجُورِیِ فرزند میں دونوں رُوئے تھے کہ آنکھیں اُن عزیزوں کی یوسفِ گُم گَشتہ کے فِراق میں، دید کے اِشتِیاق میں ہَم چَشمِ دیدۂ یعقوب علیہ السّلام ہوگئی تھیں، بہ حُکمِ آیۂ وافی ہِدایہ: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ۔ اور سچ ہے: فراقِ نورِ چشم میں نورِ چشم کب رہتا ہے۔ رات دن آنکھوں میں یکساں، ہر وقت سَراسیمہ و پریشاں؛ مگر اَرکانِ سلطنت، نمک خوارِ قدیم کوششِ عظیم سے دَرپردہ ریاست کا نام سنبھالے تھے۔

جب وزیرِ لشکر بہ ایں کرّوفرّ، سنا، وزیرِ اعظم کو جانِ عالم کے پاس حال دریافت کرنے بھیجا۔ بس کہ شہ زادۂ با اِمتیاز کی مُفارقت کو عرصۂ دراز ہوا تھا؛ اِس کے سوا وہ سامان، جاہ و حَشم، لشکر کا چَم و خَم، فوج ہزار در ہزار، اَنبُوہِ بے شمار، خزانۂ لا اِنتہا دیکھ کر وزیر گھبرایا، اپنے شہ زادے کا وہم و گمان نہ آیا۔ دہشت بستہ عَرض کی: قبلۂ عالم! گردشِ طالعِ واژوں، نَیرنگیِ گردُونِ دُوں سے وارثِ تختِ سلطنت یہاں کا دَفعتًہ گُم ہوگیا۔ بادشاہ

آسمان جاہ ہمارا، مصیبت کا مارا جگر گوشے کی مفارقت میں دامانِ صبر، گریبانِ شکیب پارہ پارہ کرکے؛ نورِ نظر بھی اُس اپنے قرۃ العین، طاقتِ بصر کے ہجر میں گریے کی نذر کر چکا ہے۔ زیست بہ نام ہے، مر چکا ہے۔ ہنوز اُس عین الکمال کے قدم کی خاک سرمۂ چشمِ مشتاقان و کحل الجواہرِ دیدۂ منتظران نہیں ہوئی۔ بعدِ رسمِ سلام حضور کو یہ پیام دیا ہے کہ اگر خواہشِ تخت یا تمنائے تاج منظورِ خاطر ہے؛ بسم اللہ، کل نہیں آج حاضر ہے؛ مگر سامانِ جنگ و جدال، گرم بازاریِ حرب و قتال، خوں ریزیِ بندہ ہائے خدا ناحق، ناروا ہے۔ مجھے تختِ سلطنت تختۂ تابوت سے بدتر ہے، الّا معاملۂ قضا و قدر سے مجبور فردِ بشر ہے۔ ہر چند جینے سے سخت جی بیزار ہے، لیکن مر جانے کا کسے اختیار ہے۔ شعر:

مرنے کو میں تو راضی ہوں، موت کو موت آ گئی
زندگی اب گلے پڑی، اس کی میں کیا دوا کروں

شرحِ سخت جانی موجبِ پریشانیِ گوشِ حق نیوش جان کر طول کو مختصر کیا۔ جانِ عالم نے یہ سن کر رو دیا۔ وزیر کو گلے سے لگایا، خلعتِ فاخرہ عنایت کیا، پھر کہا: افسوس! تم نے گود کے پالے عرصۂ قلیل میں بھلا ڈالے۔ بعدِ آداب و کورنش عرض کرنا کہ بدولتِ کششِ الفتِ پدری و تاثیرِ دعائے سحری سے خانہ زادِ بامراد زندہ و سالم شرفِ آستاں بوس سے مشرف ہوا۔ اُس وقت وزیر نے پہچانا، قدموں پر گرا۔ پھر سر اٹھا کر بے اجازت بھاگا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، پکارا: مبارک ہو۔ اُستاد:

بوئے یوسف سوئے پیغمبرِ کنعاں آئی ①

اے شاہِ با اقبال و اے صاحبِ جاہ و جلال! بہ عنایتِ جامعُ المتفرقین اور باعثِ برکتِ دُعائے مُہاجرین وہ نیّرِ اَوجِ بختیاری، کوکبِ دَرخشندۂ سپہرِ شہریاری با فوج و لشکر اور مجمعِ حورانِ پری پیکر یہاں آیا اور اِس اُجڑے نگر کو آباد کیا، بسایا۔ مشتاقوں کا دلِ اَلَم رَسیدہ شاد کیا۔ شکر صد شکر نالۂ شب گیر باتاثیر تھا۔ بادشاہ کو تو مرتبۂ یاس حاصل تھا، وزیر سے یہ کلمہ فرمایا، میر تقی:

کوئی اور ہوگی، وقتِ سحر ہو جو مُستَجاب①
شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہیں

وزیر نے مکرر عرض کی: بہ سَرِ اَقدسِ حُضور، شبِ دَیجور ہماری یُمنِ قدم سے اُس شمعِ انجمن افروزِ سُلطانی کے روشن ہوئی۔ ہر گلی اِس شہرِ ویراں کی رشکِ گلشن ہوئی۔ اِس گفتگو میں وزیر تھا کہ جانِ عالم تنہا داخل ہوا۔ محل میں محشر کا قیام ہوا، رونا پیٹنا مچا، رنڈیوں کا اِزدِحام ہوا۔ ماں باپ نے گلے سے لگایا۔ شہ زادہ بِالرّاسِ وَالعَین آداب بجا لایا۔ عین عنایتِ الٰہی دیکھیے، اُسی دم دونوں کی آنکھوں میں بینائی آئی، جسم میں تاب و توانائی آئی۔ بادشاہ جلد سوار ہوا، بہوؤں سے لشکر میں جاکر دوچار ہوا۔ شہر والوں نے یہ ماجرا سُنا؛ صغیر و کبیر، بَرنا و پیر دوڑے۔ دونوں لشکر جلَو میں ہمراہ، آگے آگے جہاں پناہ، روپیہ اشرفی دو رویہ تصدّق ہوتا، محل سرا میں لاکر داخل کیا۔ جانِ عالم کی ماں نے انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کو دیکھا، جان و دل دونوں پر نثار کیا، بہت سا پیار کیا۔ مُبارک سلامت کی صدا در و دیوار سے پیدا ہوئی۔ جن نے

دیکھا، وہ شیدا ہوئی۔

دوسرے دن ملکہ اور انجمن آرا نے شاہ فیروز بخت سے عرض کی کہ اگر حضرت کی اجازت ہو تو شہ زادے کی محل سرائے قدیم میں ہم جائیں، ماہ طلعت سے ملاقات کر آئیں۔ بادشاہ نے فرمایا: وہ عورت بدبخت سخت مُنہ پھٹ، بڑھ بولی، فضول ہے؛ اُسے شرمندہ کرنے سے کیا حصول ہے۔ میاں مٹھو بھی حاضر تھے، بول اُٹھے: قبلۂ عالم! یگانگت مقتضیِ ملاقات خواہ نخواہ ہے، باہم رہ و رسم بڑھے گی، مدارات ہو گی، خفّت و ذلّت کی کیا بات ہو گی۔ بادشاہ چُپ ہو رہا۔ شہ زادیوں نے سواری طلب کی۔ طائرِ پرّاں نے پیش قدمی کر کے ماہ طلعت کو سلام کیا۔ اُس نے سر جھُکا لیا۔ یکایک سواریاں پہنچیں۔ اُس وقت وہ بے چاری خفّت کی ماری اُٹھی، اِستقبال کیا۔ دونوں نے گلے سے لگایا، مسند پر جا بیٹھیں۔

ملکہ بڑی مقرِّر، خوش بیان تھی؛ انجمن آرا گونگی، بے زبان تھی؛ سلسلۂ کلام بہ دل داریِ تمام کھولا کہ ہماری جانب اَور گمان نہ لانا، ہم بہ ہر حال شریکِ بشاشت، مونسِ رنج و ملال ہیں۔ توتا انجمن آرا کے سامنے آیا، پھر ماہ طلعت سے کہا: غریب نواز! اِتنا زبانِ مبارک سے فرماؤ کہ آج سچّا کون ہے، جھوٹے کے مُنہ میں کیا ہے؟ اَور تو کیا کہوں، آپ کی کج بحثی کے باعث جانِ عالم کے ہاتھ یہ لوگ مہر جبیں، ماہ سیما آئے۔ گو اِتنا چکّر ہوا، میرے سبب آپ کو ندامت ہوئی، جھوٹے کے مُنہ میں گھی شکّر ہوا۔

انجمن آرا تو سیدھی، بھولی تھی؛ توتے سے بدمزہ ہوئی، فرمایا: دیوانے!

کیا بیہودہ بکتا ہے! بے حکمِ خُدا کسی سے کیا ہو سکتا ہے! پھر ماہ طلعت سے کہا: سُنو میری جان! یہ جانور بے شعور، عقل سے دور، حیوانیت سے مجبور ہے۔ دُنیا کا کارخانہ فسانہ ہے۔ رہا یہ حُسن و خوبیِ عارِض، عارِضی شَے ہے، اِس پر کیا اِترانا ہے! یہ کیفیت، یہ جوبن، یہ سِن؛ چار دن کا ہے ناپایدار، اِس کا کیا اِعتبار! رنگِ چمنِ دُنیا جاوِداں نہیں۔ کون سی بہار ہے جسے دَغدَغۂ خزاں نہیں۔ حُسن پر غُرور بے جا ہے، سُرور یہ کہتا ہے، شعر:

بہتا دریا ہے یہ حُسن، اِس میں ارے دُھولے ہاتھ
بے خبر اِتنا ہے کیوں بَرسَرِ ساحل بیٹھا

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ۔

نظر پڑا چمنِ دَہر میں جو ہم کو مکاں ہزار خوار ہوئی دیکھی بلبلِ نالاں
ہمارے زُعم میں اُس سا کوئی نہیں ناداں جو اپنے حُسنِ دو روزہ پہ کچھ ہوا نازاں
شِکستہ رنگیِ گُل شاہدِ چمن ہے یہاں کہ اِس بہار کا انجام، آخرش ہے خزاں
گھمنڈ اِس پہ، حماقت کی بس نشانی ہے
مَقامِ عبرت و حیرت سرائے فانی ہے

آخرکار دونوں نے ماہ طلعت کو شیریں زبانی اور اپنی خوش بیانی سے شِگُفتہ خاطر، خنداں رُو کیا، معاملہ یک سُو کیا۔ دو چار گھڑی ہنسی خوشی، اِختِلاط رہا؛ مگر تُوتا نوک جُھوک، چھیڑ چھاڑ کیے گیا۔ پھر رخصت ہوئیں۔ اُس نے حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ واقعی جنھیں اللہ حُسنِ بے مثال، مرتبۂ جاہ و جلال دیتا ہے؛ اُن لوگوں کا دلِ صفا منزل غُبارِ کُلفت اور

عُجب و نخوت سے صاف، اور مرآتِ سینہ زنگِ حسد و کینہ سے شفاف ہوتا ہے۔ اَلقصہ، باہم بے رنج و الم رہنے لگے۔ شب شاد، ہر روز خنداں، خرّم و فرحاں بسر کرنے لگے۔ نئے سر سے وہ اُجڑا ہوا شہر بسا۔ بِنائے ظلم و ستم مُنہدم ہوئی۔ مُروّج عدل و داد ہوا۔ دُونا سابق سے حال میں آباد ہوا۔ خزاں چمن سے دور ہوئی۔ بلبلِ نالاں چہچہے کرنے لگی، مسرور ہوئی۔

ایک روز جانِ عالم نے تمام خلقت کو درِ شہر پناہ پر طلب کرکے، وہ بکری کا بچہ دِکھا، نمک حرامیاں اُس کی سُنا، جلّاد سے حکم کیا: اِس کے اَعضا اَعضا سے جُدا، بے دست و پا کرکے، زاغ و زغن کو، گوشت کی بوٹیاں اُڑا کر، کِھلا دو۔ شکاری کتّوں کو، لہو اِس کا بہا کر، چٹا دو۔ بہ مُجرّد فرمان اُسی آن بند بند تیغِ تیز سے جُدا ہو گیا۔ ایک عالم یہ سانحہ سُن کے حیرت کا مُبتلا ہو گیا۔ سب نے اُس بے دین پر لعنت و نفریں کی۔ جانِ عالم نے دولت سرا کی راہ لی۔ اُسی روز فیروز شاہ نے تاج و تخت بیٹے کو حوالے کیا، خود گوشۂ تنہائی لیا۔ بادشاہ شب اپنی عبادت اور بیداری میں سحر کرتا تھا؛ وہ تو قائم اللیل، صائم النہار مشہور ہوا۔ جانِ عالم ہر روز تخت پر جلوہ افروز ہو، عدل کی داد دے کے، شب کو پری پیکروں میں بسر کرتا تھا؛ یہ عادل و سخی، رحیم و شجاع، یکتائے روزگار مشہور ہوا۔ ذِکر دونوں کا تا قیامِ قیامت صفحۂ روزگار، ورقِ لیل و نہار پر اور بر زبانِ یگانہ و بیگانہ رہا۔ بات باقی رہ گئی، نہیں تو دَورِ دَوراں میں کس کا دَور رہا، کس کا زمانہ رہا!

جس طرح جانِ عالم کے مطلب ملے، اِسی طرح کُل عالم کی مُراد اور تمنائے دِلی اللہ دے۔ علی الخصوص سامعین، ناظرین، راقم و مؤلِّف کی خواہش و آرزو بہ تصدّقِ رسولِ عربی بر آئے۔ بحُرمَۃِ النَّبِیِّ وَآلِہِ الْاَمجاد بِالنُّونِ وَالصَّاد۔ بہ اسبابِ ظاہر یہ فسانہ ہے، نادرِ زمانہ ہے، مضمونِ چکیدۂ دل و تحریرِ خامہ ہے؛ اگر دیدۂ غور و نظرِ تامّل سے مُلاحظہ کرو، تو حقیقت میں کارنامہ ہے۔ مؤلِّف:

گلزار کو جہاں کے ہم نے بہ غور دیکھا ۔۔۔ کیا بے ثبات، ہے ہے! دِل چسپ یہ مکاں ہے
اک رنگ پر نہیں ہے رنگین اِس کا نقشہ ۔۔۔ ہے فصلِ گُل کبھی تو گہ موسمِ خزاں ہے
روتی چمن میں شبنم، ہنسنے پہ ہے گُلوں کے ۔۔۔ نالے سے بلبلوں کے جو گُل ہے، شادماں ہے
دیکھا بہ چشمِ عبرت ہم نے طلسمِ دُنیا ۔۔۔ رشکِ حبابِ شبنم واللہ بے گماں ہے
پابند یاں نہ ہوئے، جس کو کہ عقل کچھ ہو ۔۔۔ دُنیا ہے نام جس کا، وہ قحبۂ جہاں ہے
آتی صدا جرس سے کانوں میں ہے یہ پیہم ۔۔۔ غافل عبث ہو، رہ میں یاروں کا کارواں ہے
از بہرِ پنجتن تو سُن لے دُعا یہ خالق! ۔۔۔ جو ہے نہاں جہاں میں، تجھ پر وہ سب عیاں ہے
اہلِ دوَل کا مجھ کو محتاج تو نہ کرنا ۔۔۔ احسان کا بار اُن کے مجھ کو بہت گراں ہے
کعبہ بھی اور مدینہ دکھلا سُرورؔ کو تو ۔۔۔ وہ مدّعائے دل ہے، یہ آرزوئے جاں ہے

تاریخِ مؤلِّف:

جس نے کہ سُنا اِس کو، یہ کہنے لگا دل میں ۔۔۔ یا رب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابِل کا
تاریخ سُرورؔ اس کی منظور ہوئی جس دَم ۔۔۔ بے ساختہ جی بولا "نشتر ہے رگِ دل کا"

۱۲۴۰ ۔۔۔ ۱

جس دم یہ کہانی تمام ہوئی، بہ طریقِ اصلاح جناب قبلہ و کعبہ آغا نوازش حسین خان صاحب، عرف مرزا خانی، متخلّص بہ نوازش کی نظرِ فیض اثر سے گزری؛ اِس تاریخ سے زینت بخشی : قطعۂ اُستاد :

برای خاطرِ یاران و احباب — سُرورؔ این قصہ را چون کرد ایجاد[1]

بجستم سالِ تاریخش نوازشؔ — فلک این "گلستانِ بے خزان داد"

یہ فسانہ رائج جو ہوا؛ بندے کے دوست تھے نیک سیرت، ستودہ صفات، خجستہ افعال، اکملِ ہر کمال، تعلّقِ دہر سے مثلِ سروِ آزاد لالہ دُرگا پرشاد۔ ہنر بیں، عیب پوش، تخلّص مدہوش۔ خُمِ محبّت سے مَے ِ الفت جوش میں آئی، یہ تاریخِ مستانہ زیبِ فسانہ فرمائی، مدہوشؔ :

کہا فسانہ جو یہ عجائب سُرورِ دل خستہ و حزیں نے
کہ جس کی تاثیر سے بیاں کی، ہر ایک دل بے قرار دیکھا
جہاں پہ کچھ گُل کی گفتگو ہے، وہاں پہ کچھ اور رنگ و بو ہے
جہاں خزاں کی خلش ہے اِس میں، وہاں پہ کیا کیا نہ خار دیکھا
جہاں کیا غم نے ہے جگر خون، نظر پڑا واں شفق کا عالم
کہیں جو ہے داغ دل کا پھولا، تو اُس جگہ لالہ زار دیکھا
کہیں جو چشمے کا ماجرا ہے، دکھائی وہ آب و تاب اُس نے
کہ چشمۂ چشم سے ہر اک کے رواں ہوا چشمہ سار دیکھا
کہیں جو دریا کا ذکر آیا، تو کشتیِ دل ہے نذرِ طوفاں
جو کوہ نے سر کہیں اُٹھایا، تو جان کو سنگسار دیکھا

ہوا ہے جس جس جگہ پر اس میں بیانِ سحر و طلسم و جادو
تو قدرتِ حق سے اُس مکاں پر نئی طرح کا حصار دیکھا
جو قید میں دیو کی پھنسا ہے کسی جگہ پر کوئی پری رو
تو کیا نہ سامان چھوٹنے کا وہاں پہ بر رفعِ کار دیکھا
جہاں لکھا اِس فسانہ پیرا نے حال کچھ رنج و بے کسی کا
وہاں پہ ہمدم نہ کوئی پایا، نہ کوئی مونس، نہ یار دیکھا
کسی جگہ پر جو جوگ آسن کا جوگیوں کے بیاں ہے اِس میں
جو خوب چھانا، تو اُس جگہ کچھ نہ غیرِ مُشتِ غُبار دیکھا
شگفتگیِ بیاں کے آگے تو زرد ہے رنگ زعفراں کا
جہاں ہے کچھ روپ بستگی کا، وہاں پہ دل کو فشار دیکھا
کہیں جو آمد کی یار کی کچھ خبر کا چرچا کیا ہے اُس نے
تو دیدہ ہر اہلِ دید کا واں پہ وقفِ صد انتظار دیکھا
جو وصل کی شب کا کچھ بیاں ہے، تو جمع ہے خاطرِ پریشاں
جو روزِ ہجراں کا غم لکھا ہے، تو دل کو کیا انتشار دیکھا
جو بزم کا کچھ بیاں کیا ہے، تو کوئی مجلس نہ دیکھی ایسی
جہاں پہ کچھ رزم کا بیاں ہے، ہر اک کو اسفندیار دیکھا
جہاں سخاوت کا کچھ بیاں ہے، نہ پوچھ احوال واں کا مجھ سے
کہ حاصلِ بحر و کانِ عالم کو ایک دم میں نثار دیکھا

کہیں کھنچی ہے جو تیغِ ابرو، تو ہو گئے دل کے ٹکڑے ٹکڑے
کہیں جو تیرِ نگاہ چھوٹا، تو صاف سینے کے پار دیکھا
خرابیِ حالِ عاشق ایسی، کہ جس پہ رونا فلک کو آوے
کہیں یہ معشوق کی ہے خوبی کہ ملک تک زرنگار دیکھا
نہ پوچھو حال اِس فسانے کا تم کہ ڈھنگ کیا کیا بھرے ہیں اس میں
جو حُسن دیکھا تو زور دیکھا، جو عشق دیکھا تو زار دیکھا
ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سالِ تاریخ اِس کا لکھیے
تو کھینچ کر "آہ" دل سے نکلا "خزاں سے رنگِ بہار دیکھا"

۶   ۱۲۴۶

ضمیمۂ اُ

نثرہائے خاتمۂ کتاب

فسانۂ عجائب کی پہلی اشاعت کے آخر میں سرور کی ایک طویل نثر (شرف الدولہ کی مدح میں) شامل ہے۔ اگر نسخۂ د کو شامل نہ کیا جائے تو یہ کتاب اِس کے بعد چار بار سرور کی نظرِ ثانی کے بعد چھپی ہے اور ہر بار سرور نے خاتمے کی نثر لکھی ہے۔ اِس طرح اشاعتِ اوّل کی نثر کو ملاکر خاتمۂ کتاب کی نثروں کی تعداد پانچ ہوتی ہے۔ ذیل میں اُن کو ترتیب کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) اشاعتِ اوّل (ح)

پہلی بار یہ کتاب ۱۲۵۹ھ میں میر حسن رضوی کے مطبعِ حسنی (محلّہ محمود نگر، لکھنؤ) میں چھپی تھی؛ اِس نسخے کے آخر میں مندرجۂ ذیل طویل نثر شرف الدّولہ کی مدح میں ہے:

"برسوں یہ فسانہ کساد بازاریِ زمانہ سے تہ رہا، مشہور نہ ہوا۔ تیسری ربیع الثّانی بارہ سے ترپن (۱۲۵۳) ہجری کو نصیر الدین حیدر داخلِ فردوسِ بریں ہوئے، اور محمد علی شاہ بادشاہ، بعد ہنگامے منا جان کے، تخت نشیں ہوئے۔ زمانے کا رنگ بدلا، ہر شخص برسرِ حساب ہوا، مسدود فتنے اور فساد کا باب ہوا۔ اہلِ کمال مالا مال ہوئے، غریب غربا نہال ہوئے۔

بعدِ انتقالِ منتظم الدّولہ مہدی علی خاں، نویں شوّال سنہ مذکور کو ظہیر الدّولہ غلام یحییٰ خاں کو نیابت ہوئی۔ خدا نے رشک کھایا، حافظِ حقیقی نے چشمِ بد کی نظر سے نہ بچایا، پیمانۂ بقا بادۂ اجل سے لب ریز ہوا، پچیسویں ذی حجہ کو

دل کی تمنا دل میں رہی، نہ کسی کی سُنی نہ اپنی کہی۔

پھر اِس عہدے سے منوّر الدّولہ احمد علی خاں سرفراز ہوئے، بادشاہ کے نزدیک ممتاز ہوئے۔ لیکن یہ خدمت نبھ نہ سکی، نیابت سست رہی۔ آخر کو حق بہ مرکز قرار گرفت، اور شرف الدّولہ بہادر کو یہ عہدہ ملا۔ پھر تو نیابت یہ چمکی کہ دیکھی نہ سُنی۔ یحییٰ برمکی کا نام احیا ہوا، آصف برخیا دوسرا ہوا۔ اگر کلکِ قدرت دفترِ روزگار پر صفت اُس کی رقم کرے، نہ ہو سکے۔ بشر کی کیا مجال ہے، بہت محال ہے۔

شرفِ پایۂ وزارت، افتخارِ مسندِ حکومت و امارت، ہزبرِ معرکۂ شجاعت، ابرِ گہر بارِ میدانِ سخاوت۔ دبیرِ عطارد جاہ، وزیرِ عالم پناہ۔ ماہِ کنعاں، مہرِ تاباں۔ ہمّت نے اُس کی خوانِ جلیل صفحۂ دوراں پر بچھایا، حاتم طائی کو سب کے دل سے بھلایا۔ حوصلۂ طلب اُس کی بخشش کے روبہ رو کوتاہ ہے، کوہِ زر بدتر از پرِ کاہ ہے۔ مطلبِ سائل ہنوز دل سے زبان پر آنے نہ پایا کہ مدعا بر آیا۔ اِدھر محتاج نے لبِ سوال کھولے، اُدھر دامن میں موتی رُولے۔ چارہ سازِ درماندگاں ہے، خلقِ خدا کا حافظ و نگہ باں ہے۔ پری تمائل، فرشتہ خصائل انسان ہے، قدرتِ ربّ دو جہاں ہے۔ دمِ جود و سخا دستِ گہر بار رشحۂ ابرِ بہار ہے، یہ نامورِ زمانہ یادگار ہے۔ چرخ مطیعِ فرماں ہے، اِس کے دور میں دست بستہ دورۂ دوراں ہے۔ عنایتِ پروردگار شاملِ ہے، از سر تا پا صاحبِ جمال ہے، حُسنِ خدا داد کامل ہے۔ کاسۂ سر، جس کا ہم سر نہیں، حکمت و عقل سے معمور ہے۔ دماغ میں شوکتِ فرماں روائی، ہوائے خیر خواہیِ شاہی [ح، م: بتانی]

بلند مرتبہ عالی، عجب و نخوت سے خالی، فہم و فراست کا دفور ہے۔ سر میں سرِ الٰہی ہے، اِس بھید سے کسے آگاہی ہے۔ اللہ نے اپنی رحمت کو مجسّم کر کے بھیجا ہے، دادرسی سے پریشان نہیں ہوتا، رستم کا دل، اسفندیار کا سا کلیجا ہے۔ جبینِ انوار مطلعِ نور ہے۔ حاسد نے چیں مانی ہے، مشہور ہے۔ بلند و کشادہ پیشانی ہے، سخاوت کی دلیل، فیّاضی کی نشانی ہے۔

مہِ نو خمِ ابرو ہے، سنبلیں گیسو ہے۔ مژہ آب دار ہے، سینۂ عدو کے پار ہے۔ چشم وہ کہ جس کا ہم چشم عنقا ہے، غزالِ رعنا چہ کارہ ہے، شرم و حیا کا اُس میں سُرور ہے، رحمت کا اثر ہے، عیب پوشی عالم کی مدِّ نظر ہے۔ ہواخواہوں کے دل اِس آنکھ کے ندیدے ہیں، عین الکمال میں جریدے ہیں۔ الفِ بینی خطِ راست ہے، شمیمِ صفت بھری ہے، خود بینی سے بری ہے۔ عارضِ تاباں کی ضیا سے مہر سوزاں ہے، ماہ کو فروغ نہیں۔ سخن راست ہے، دروغ نہیں۔ گوشِ حق نیوش صدائے دردمندوں پر وا ہے، فریادِ غربا دل کے کانوں سے سُنتا ہے۔ صفت اُن کی امکانِ بشر سے دور ہے۔ پری کان پکڑتی ہے، حلقہ بہ گوش حور ہے۔ لبوں میں مسیحائی، زبان شیریں، بیان میں عقدہ کشائی ہے۔ دہنِ والا چشمۂ حیواں سے میٹھا۔ ہاتھ شجرِ سرسبز، جود و عطا کی شاخ ہائے پُر گل و بار ہیں، یا لکۂ ابرِ گہربار ہیں۔ خزانے دے ڈالے ہیں، پھر سرِ دست تیار ہیں۔ کیا کہوں صفتیں کیا کیا رکھتے ہیں، بخشش میں کفِ دست یدِ بیضا رکھتے ہیں۔

سینۂ بے کینہ گنجینۂ علم و حلم، معدنِ اسرارِ اللہ ہے۔ دلِ صفا منزل

کو منظور رضائے خدا، متصوّر خرسندیِ پادشاہ ہے۔ رشک و حسد سے پاک وصاف ہے، آئینۂ حلب بیں زنگ ہے، یہ شفاف ہے۔ مرآتِ جہان نما ہے۔ پہ جبہ کعبہ خانۂ خدا ہے۔ حلقۂ کمر کے روبرو کمربستہ چرخ اخضر ہے، کم ترین چاکر ہے۔ پاؤں جواں مردی و ثابت قدمی کے ستون ہیں۔ گردن کشانِ دہر زیر قدم، سرنگوں ہیں۔ پشتِ پا پر خلق کی پیشانی ہے۔ انھیں قدموں کی بدولت آبرو ہاتھ آئی ہے۔ طالعِ یاور بیدار، بختِ رسا مددگار ہے۔ فلک محکوم، قضا و قدر فرماں بردار ہے۔ خلق و مروّت، جرأت و ہمّت، شجاعت و سخاوت، حسن و صورت، شوکت و ہیبت از سرتاپا قدرتِ خدا ہے۔ اگر دیدۂ دل بینا و عقلِ رسا ہو تو دیکھے اور سمجھے کہ کیا ہے۔

رفیق جاں نثار، عزیز عزیز از جان جانتے ہیں؛ جاں فشانی اور اطاعت کو جزوِ ایماں جانتے ہیں۔ رعبِ عدل یہ ہے کہ کبوتر کی ایذا سے باز باز ہے، بلکہ سرگرمِ غمزہ و ناز ہے۔ اور بعض بعض جا دیکھا ہے کہ کبوتر کا بچہ جاں بازی کرتا ہے، آشیانۂ شاہیں میں بازی کرتا ہے۔ جب چمن میں بے وقت طاؤس جھنکارتا ہے، تو تنبیہاً سانپ کفچہ مارتا ہے۔ یہ رواجِ لطف و کرم ہے کہ پنجۂ گرگِ دریدہ دہن شانۂ موے سرِ غنم ہے۔ اور معدلت کا ایسا رنگ ڈھنگ ہے کہ سینۂ پلنگِ خوں خوار بچۂ آہو کا پلنگ ہے۔ آفتاب اگر نگاہِ گرم سے عارضِ گلِ تر کو دیکھے تو خطِ شعاع بسانِ نشترِ خار سینہ فگار کرے۔ پروانہ اگر دھوکے میں شعلۂ شمع سے جل جائے، تو سرِ محفل وہ بھی روتے روتے پگھل جائے۔

دزدیدہ نگاہوں پر معشوق ایسے گنہگار ہیں کہ سلسلۂ زیب و زینت میں ہر دم گرفتار ہیں۔

ایسا سخی مزاج ہے کہ احتیاج، لوگوں کی محتاج ہے۔ اور بخششِ عام اس قدر ہے کہ غنچے کی بھی گرہ میں زر ہے۔ تعریف جواہر بخشی کی محال ہے، زبان تک اِس بیان میں لال ہے۔ کیوں کر نہ حاجت روائے بشر ہو، جس کے فیضِ نظر سے شعلۂ شمع طرۂ زر ہو۔ ناوکِ غضب اگر چھوٹے، مریخ کے ہاتھ سے خنجر گر پڑے، سپرِ چرخ ٹوٹے۔ شمشیرِ عتاب عدو کو دو کرے، ایسا کاٹے، بلکہ گاوِ زمیں کا لہو چاٹے۔ سوختۂ غضب کا اُس کے کبھی نہ بیڑا پار ہوا؛ اگر سمندر میں گرا، فی النار ہوا۔ اور بحرِ رحمت جب اُبلتا ہے، شجرِ سوختہ پھولتا پھلتا ہے۔ نخلِ تمنائے خلائق برگ و بار لاتا ہے، اِس گلشن کا سرو ثمرِ آب دار لاتا ہے۔ سینۂ سنگ میں شررِ لعل ہوتا ہے، پہاڑ بھی اُس کی عنایت سے مالا مال ہوتا ہے۔ روشن ہے کہ اِس انجمن میں جھاڑ جل کے سرسبز ہوتا ہے۔ کشت کار اگر فیض اُس کا (کذا) بھنا چنا بوئے، نہال ہوتا ہے۔ آتشِ مطبخ سے لوگ فیض پاتے ہیں، کلیجا سینکنے پر جی جلاتے ہیں۔

صفتِ اسپ صرصر خرام، تیز گام میں کمیتِ خامہ لنگ ہے؛ عرصۂ وسعتِ دنیا زیرِ قدم اُس کے تنگ ہے۔ نگھی ہر ایک نور کی ہے، بلکہ پتلی دیدۂ حور کی ہے۔ آنکھوں میں جا دی ہے۔ ٹپ پردۂ چشم ہے، ہو دہ نہیں آنکھ لگا دی ہے۔ فیلانِ پُرشکوہ کا وہ جاہ و حشم ہے کہ رفعتِ فلک اُن کے روبرو کم ہے۔ اگر سر اُٹھائیں، ہاتھے آسمان سے رگڑ جائیں۔ سبک رو، بھول ایسے کہ مورانِ ضعیف زیرِ پا آزار نہ پائیں۔ شمشیرِ برق وش تیغِ قضا ہے، دشمن کا دل ہیبت سے

دو نیم ہو رہا ہے۔ خم اُس کا ہلال دم دم صور ہے۔ رنگ الماسی ہے، بدخواہ کے لہو کی پیاسی ہے، عدو کے جگر میں اس کے زخم کا ناسور ہے۔ عجائب غرائب کاٹ ہے، کھتّی سے پیلے تک اجل کا گھاٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ صد وسی سال باجاہ و اقبال فرقِ بندگانِ خاص پر سایہ اُن کا رکھے۔ عدو پامال ہو، ترقی خواہ مالا مال ہو۔

بندہ بھی خوش طالعی سے ملازمت کا شرف اندوز ہوا، ہر شب شبِ برات ہوئی، روز نوروز ہوا۔ اِس کہانی کی بھی آبرو ہوئی، ہر ایک کو خواہش ہوئی، جست و جو ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لکھی نہ گئی، چھپنے کی صلاح ٹھہری۔ فقط۔ (ص ۲۱۰)

[یہ شرح کے علاوہ م، د اور نسخۂ کریم الدین میں بھی ہے]۔

---

(۲) نسخۂ ض

سرور کی نظرِ ثانی کے ساتھ اس کے بعد یہ کتاب میر حسن رضوی کے مطبعِ حسنی ہی میں ۱۲۶۳ھ میں چھپی تھی؛ اِس اشاعت کے آخر میں سرور کی لکھی ہوئی مندرجۂ ذیل نثر خاتمۂ کتاب ہے:

"للہ الحمد والمنّۃ کہ یہ فسانۂ رنگیں بہ صد زیب و تزئین بیانِ قندِ مکرر پسندِ خاطر سراپا قصور اعنی سرور کے چھپا۔ اور جناب میر حسن صاحب نے بہ فضلِ ربِّ ذوالمنن کوئی احتیاط کا دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اور ابتدا سے انتہا تک نظرِ مولّف سے گزرا۔ نسبتِ فسانۂ سابق، اکثر جا راقم نے محل اور موقع جو پایا، اِس کو بڑھایا۔ ملاحظۂ ناظرینِ پر تمکیں میں جو آئے گا، یقین ہے کہ

لطف دکھائے گا۔

یہ نسخہ اور بزرگواروں نے بھی طبع کیا، اِلّا بہ طرزِ زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا، کم و بیش ہو گیا۔ جو فقرہ نہ پڑھا گیا، وہ اپنے طور پر گڑھا گیا۔ اِس نشیب و فراز کو امتیاز شرط ہے۔ لہذا بہ پاسِ خاطر جناب میر صاحب ممدوح کے، کہ بندے کے محسن ہیں اور صفحۂ دہر پر انتخاب ہیں، ہر ایک سے میرا سوال ہے کہ لاجواب ہیں؛ اِس کی صحت و غلطی میں بہت کد ہوئی، کوشش از حد ہوئی۔ اور جو بعض جا سہو بشریت سے ہوا، اُس کا صحیح نامہ لکھا۔

غرض کہ اِس شفافی سے اکبر علی خاں نے لکھا کہ گو خط سات ہیں، ہفت قلم کاتبوں کو کہتے ہیں؛ مگر اِس کا حُسنِ خط تو خطوں سے گوے سبقت لے گیا، دیکھنے والے حیران رہتے ہیں۔ اگر زنگِ حسد طبیعت سے دور ہو، تو آنکھ پڑتے ہی مسرور ہو۔ ہر سطر زلفِ مسلسلِ عنبریں مویاں ہے اور بین السطور سے صفاے عارضِ مہ رویاں جلوہ کُناں ہے۔ ہر ایک صفحہ آئینۂ حلب ہے، صاف باطنوں سے داد طلب ہے؛ وگرنہ بہ مجبوری یہ حرف زبان پر آجائے گا کہ جیسا منہ ہوگا، وہی نظر آئے گا۔ گواہ اِس فقرے کی مہرِ فقیر ہے، خدا شاہد ہے یہ مطبع بے نظیر ہے" (ص ۲۰۷)۔

رجب علی ۱۲۲۶
مرزا

اِس نثر سے پہلے جلی قلم سے یہ عنوان لکھا ہوا ہے:

"نثرِ خاتمہ ریختۂ قلمِ جادو نگارِ سر دفترِ سخنوراں، سر حلقۂ سخن گویاں،

خصوصاً در طرزِ نظم و نثرِ ہندی موافقِ روزمرۂ حال یکتائے زماں جناب مرزا رجب علی بیگ صاحب المتخلص بہ سرور سلمہ اللہ تعالیٰ"

ظاہر ہے کہ یہ اربابِ مطبع کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔

---

(۳) نسخۂ ک

اِس کے بعد یہ کتاب (سرور کی نظرِ ثانی کے بعد) ۱۲۶۷ھ میں "حُسنِ سعیِ حاجیِ حرمینِ شریفین محمد حسین سے مطبعِ خاص محمدی" کان پور میں چھپی تھی۔ اِس کے آخر میں سرور کی لکھی ہوئی مندرجۂ ذیل نثرِ خاتمہ ہے (عنوانِ نثر جلی قلم سے لکھا گیا ہے) :

"خاتمۂ طبع طبع زادِ مصنفِ کتاب ہے، اِس کا بھی ایک ایک فقرہ لاجواب ہے

یہ مثل زبان زدِ خاص و عام ہے، محقق کا کلام ہے کہ ع :

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد ست

چناں چہ یہ فسانۂ عجائب کئی بار چھپا، مگر اب تک لوگ اِس کی تلاش میں ہیں۔ نظر آتا نہیں، کوئی پاتا نہیں۔ کس قصے کو اِس سے ہم سری ہے، اِسی کی تمنا آج تک قدر دانوں کے سینے میں بھری ہے۔ یہ فقط عنایتِ پروردگار ہے، اِس کا رشک اور حسد بے کار ہے۔

بالفعل اِس کے چھاپنے کا خیال دلِ صفا منزل میں جناب حاجیِ حرمین مولوی محمد حسین ادام اللہ افضالھم کے آیا۔ بس کہ حاجی صاحب موصوف بہ صفاتِ پسندیدہ معروف ہیں، تحریرِ فقیر اِس مقدمے میں بے کار ہے، کالشمس

نصف النہار عالم میں آشکار ہے۔ جو کتاب اِس کارخانے کی ہے، انتخاب ہے۔ ہر کار پرداز ہوشیار، کار فرما لاجواب ہے۔ جو جو سرگرم کاروبار ہیں، نادرِ روزگار ہیں۔ اُنھوں نے مولّفِ فسانہ سے، کہ تابعِ فرماں بہ دل و جاں ہے، ارشاد کیا کہ پھر بہ نظرِ غور ابتدا سے انتہا تک اِس کو دیکھ جائے، خدشہ رہنے نہ پائے۔

حسبِ ارشاد اُس خجستہ نہاد کے نیاز مندِ قدیم نے کوششِ عظیم سے ملاحظہ کر کے، جہاں موقع پایا، کچھ اور بڑھایا۔ یقینِ کامل ہے کہ اب جس کی نظر سے یہ گزر جائے گا، تازہ لطف نظر آئے گا۔ اکثر جا، دل کو جو لگایا ہے، تازہ فقرہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقات کو بے کار نہیں کھویا ہے، دُرِ شہوار سلکِ تقریر میں پرویا ہے۔ منصفوں سے داد طلب ہوں کہ کیا کیا خونِ دل پیا، لختِ جگر کھایا ہے؛ جب اِس طرح کا مضمون ہاتھ آیا ہے۔ دو فقرے پسندیدہ لکھنا دشوار ہے، یہ تو ایک قصہ طویل، بڑا طومار ہے۔ خوشنودیِ طبع کے بعد اب امیدوارِ دعا ہوں کہ اب برسرِ منزل آ پہنچا ہوں۔ شائق اِس کو جب پڑھیں گے، دنیا میں بڑھیں گے، کم نہ ہوں گے۔ یہ فسانہ رہ جائے گا، بعدِ چندے مگر ہم نہ ہوں گے۔ جس تکلّف سے اب کے بار چھپا، ایسا کبھی نہ تھا۔ جس جس طرح سے یہ مشہور ہوا، سرورؔ کو سرور ہوا۔ فقط۔" (ص ۱۳۷)۔

(۴) نسخۂ ث

سرور کی نظرِ ثانی کے ساتھ اِس کے بعد یہ کتاب ۱۲۷۶ھ میں مولوی محمد یعقوب انصاری کے مطبع افضل المطابع محمدی (کان پور) میں چھپی تھی۔ اِس کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے سرور کی لکھی ہوئی مندرجۂ ذیل نثر خاتمہ ہے :

" اگر سوسن بہ صد زبان حمد سرائے ربِّ دوجہاں نہ ہو تو چمنِ دہر میں سرسبزی نہ پائے۔ اور غنچہ بے ہوائے نسیم نعتِ سرورِ کائنات کھل کے گُل نہ ہو، مدِّ نظرِ بلبل نہ ہو اور ایسا جوبن نہ دکھائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس کے منہ میں زبان ہے اور طلاقتِ لسان ہے، فقط فیضِ حمدِ خالقِ جنّ و بشر ہے، ذریعۂ نعتِ شفیعِ محشر ہے، وگرنہ گونگے سے بدتر ہے۔ کون سُنتا ہے، لاکھ سر دُھنتا ہے۔ شمع اگر ایک پاؤں سے کھڑی ہو کر سرِ محفل اشهد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ نہ کہے تو سحر تک اِس چمک اور روشنی سے زیبِ محفلِ اربابِ کمال نہ رہے۔ اور اشهد ان محمدا رسول اللہ کا اقرار نہ ہو تو سرِ مجلس گُل طرّۂ دستار نہ ہو۔ پروانے کو پروا نہ ہو، پاس نہ جائے، یہ ایں بے ثباتی اعتبار نہ پائے۔ لہٰذا ہر شئے کی ابتدا اور انتہا جو اس پر نہ ہو تو زیبِ دفتر نہ ہو۔

الحاصل، فسانۂ عجائب کہ اسم با مسمّٰی لاجواب ہے، کتب خانۂ کائنات میں انتخاب ہے، دوستوں کی تحریک سے، باوجودِ مکروہاتِ زمانۂ ناہنجار اور فکرِ معاش کے انتشار میں، جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع

شہرِ کان پور میں چھاپا اور مصنّف سے نظرِ ثانی کو ارشاد فرمایا۔ وہ اُن کا حکم بجالانا موجبِ مسرّت جانتا ہے۔ پھر اِس کی دیکھا بھالی ہوئی، صرف نازک خیالی ہوئی۔ فقط کارخانۂ قدرت ہے، عقل اِس میں عاری ہے؛ برسوں سے اِس کے چھپنے کا دورِ تسلسل جاری ہے۔ دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہے اور مصنّف بھی بہ شرطِ زیست نیا کردینے کا آمادہ ہے۔ مگر بہ نظرِ انصاف اور رشک و حسد سے جی صاف کرکے دیکھو؛ جو چیز نظر سے گزرے اور وہ نادر ہے، مکرّر دیکھنے میں بیش تر دیکھا ہے کہ بارِ خاطر ہے؛ مگر اِس فسانے میں یہ سحر پردازی ہے کہ جب نظر پڑے، کیفیت تازی ہے۔ یہ مصنّف کے حال پر عنایتِ پروردگار ہے، اِس کا رشک و حسد بے کار ہے۔

یہ عجب نگارخانۂ سحر طراز ہے کہ ہر دم اِس کے شوق میں سخن سنج کا دیدہ باز ہے۔ کسی طرح دل نہیں بھرتا ہے، ہر دم شوق ابھرتا ہے۔ اور جب مصنّف کی نظر سے یہ کتاب گزر جاتی ہے، زیورِ بیانِ تازہ کی چمک سے دونی رونق پاتی ہے۔ سنگ میں لعل، صدف میں دُرِ شاہوار ہے؛ نافے میں مشک، گُل میں رنگ و بو، معطّر چارسو، بے مثل یادگار ہے۔ جب چھپتی ہے، نیا ناز و انداز پیدا ہوتا ہے، دیدۂ دل شیدا ہوتا ہے۔ جن کی ناک خود بینی سے بَری ہے، اُن کے دماغ میں اِس کی بو باس بھری ہے۔ اور جو گوشِ شنوا، دیدۂ بینا رکھتا ہے؛ صاحبِ فہم، ذی ہوش ہے؛ انصاف کی راہ سے حلقہ بہ گوش ہے۔ اور حاسد کی بات نرالی ہے، لااُبالی ہے۔ خُدا و رسول کو اُن کی زبان سے نجات نہ ملی تو دوسرا کب بچتا ہے۔ اِن لوگوں کو بھونکنے کی عادت

ہے، گھی نہیں بیچتا ہے۔ دو نسخے اور مصنف نے تازہ لکھے ہیں۔ مریضانِ محبت کی دوا ہے، کیا لکھوں کہ کیا ہے۔ جب وہ دیکھنے میں آئیں گے، آنکھیں کھل جائیں گی، منصف لطف اٹھائیں گے۔

للہ الحمد کہ یہ صنمِ رعنا، محبوبِ زیبا تاریخ بارھویں ماہِ ذی‌الحجہ سنہ ۱۲۷۶ھ شہر کان پور، محلہ پٹکاپور، افضل المطابع محمدی میں چھپ کر منظورِ نظر ہوا۔ سخن شناسوں سے التماس ہے کہ کثرتِ سن سے ہوش بجا نہ ٹھکانے حواس ہے؛ اگر کچھ مزہ ملے تو راقم اور چھاپنے والے کو دعائے خیر سے یاد کریں، اپنی طبیعت شاد کریں۔ فقط۔"

---

⑤ نسخۂ ل

آخری بار یہ کتاب سرور کی نظرِ ثانی کے بعد مولوی محمد یعقوب انصاری ہی کے مطبعِ افضل المطابع (فرنگی محل، لکھنؤ) میں سنہ ۱۲۸۰ھ میں چھپی تھی۔ سرور کی لکھی ہوئی نثرِ خاتمۂ کتاب اس میں بھی شامل ہے۔ نسخۂ ف کی نثرِ خاتمہ جو اوپر نقل کی گئی ہے، اصلاً اُسی کو بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ سرور نے اِس اشاعت میں شامل کرلیا ہے، لیکن اِن ترمیمات نے اِس نثر کو مستقل حیثیت بخش دی ہے؛ البتہ منشی عنایت حسین گوپاموی کا قطعۂ تاریخِ طبع اس اشاعت کی خاص چیز ہے۔ اِس قطعے سے پہلے جو نثر ہے، وہ بھی سرور کی لکھی ہوئی ہے۔ منشی عنایت حسین کے اِس قطعے کو شامل کیے بغیر یہ نثری ٹکڑا ناقص رہتا، اس لیے اِس قطعے کو بھی آخر میں نقل

کر دیا گیا ہے۔

" اگر سوسن بہ صد زباں حمد سرائے ربِ دو جہاں نہ ہو تو چمنِ دہر میں سرسبزی نہ پائے اور غنچہ بے ہوائے نسیمِ نعتِ سرورِ کائنات، کھل کے گُل نہ ہو، مدِ نظرِ بلبل نہ ہو اور ایسا جوبن نہ دکھائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس کے مُنہ میں زبان ہے اور طاقتِ لساں ہے، فقط فیضِ حمدِ خالقِ جن و بشر ہے، ذریعۂ نعتِ شفیعِ محشر ہے؛ وگرنہ گونگے سے بدتر ہے؛ کون سُنتا ہے، لاکھ سر دُھنتا ہے۔ شمع ایک پاؤں سے کھڑی ہو کے سرِ محفل اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ نہ کہے، تو سحر تک اِس چمک اور روشنی سے زیبِ محفلِ اربابِ کامل نہ رہے۔ اور اشہد ان محمداً رسول اللہ کا اقرار نہ ہو، تو سرِ مجلس گُل طرۂ دستار نہ ہو۔ پروانے کو پروا نہ ہو، پاس نہ جائے؛ بہ ایں بے ثباتی اعتبار نہ پائے۔ لہٰذا ہر شے کی ابتدا اور انتہا جو اِس پر نہ ہو، تو زیبِ دفتر نہ ہو۔

الحاصل، فسانۂ عجائب کہ اسم بامسمیٰ اور لاجواب ہے، کتب خانۂ کائنات میں انتخاب ہے؛ دوستوں کی تحریک سے باوجودِ مکروہاتِ زمانۂ ناہنجار اور فکرِ معاش کے انتشار میں، جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع شہر کان پور میں چھاپا اور مصنّف سے نظرِ ثانی کو ارشاد فرمایا۔ وہ اُن کا حکم بجالانا موجبِ مسرّت جانتا ہے؛ پھر اِس کی دیکھا بھالی ہوئی، صرف نازک خیالی ہوئی۔ یہ فقط کارخانۂ قدرت ہے، عقل اِس میں عاری ہے؛ برسوں سے اِس کے چھپنے کا دورِ تسلسل جاری ہے۔

دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہوا اور مصنّف بھی نیا

کر دینے کا آمادہ ہوا؛ مگر بہ نظرِ انصاف اور رشک و حسد سے جی صاف کرکے دیکھو: جو چیز نظر سے گزرے اور وہ نادر ہے، مکرّر دیکھنے میں بیش تر دیکھا ہے کہ بارِ خاطر ہے؛ مگر اِس فسانے میں یہ سحر پردازی ہے کہ جب نظر پڑے، کیفیت تازی ہے۔ یہ مصنّف کے حال پر عنایتِ پروردگار ہے، اِس کا رشک و حسد بے کار ہے۔ یہ عجب نگار خانۂ سحر طراز ہے کہ ہر دم اِس کے شوق میں سخن سنج کا دیدہ باز ہے۔ کسی طرح دل نہیں بھرتا ہے، ہر دم شوق اُبھرتا ہے۔ اور جب مصنّف کی نظر سے یہ کتاب گزر جاتی ہے، زیورِ بیانِ تازہ کی چمک سے دونی رونق پاتی ہے۔ سنگ میں لعل، صدف میں دُرِ شاہوار ہے۔ نافے میں مُشک، گُل میں رنگ و بو معطّرِ چار سو، بے مثل یادگار ہے۔ جب چھپتی ہے، نیا انداز و ناز پیدا ہوتا ہے، دیدۂ دل شیدا ہوتا ہے۔ جس کی ناک خود بینی سے بری ہے، اُس کے دماغ میں اِس کی بو باس بھری ہے۔ اور جو گوشِ شنوا، دیدۂ بینا رکھتا ہے، صاحبِ فہم، ذی ہوش ہے؛ انصاف کی راہ سے حلقہ بگوش ہے۔ اور حاسد کی بات نرالی ہے، لاابالی ہے۔ خدا و رسول کو اِن کی زبان سے نجات نہ ملی تو دوسرا کب بچتا ہے۔ اِن لوگوں کو بھونکنے کی عادت ہے، گھی نہیں پچتا ہے۔

دو نسخے اور مصنّف نے تازہ لکھے ہیں۔ مریضانِ محبّت کی دوا ہے، کیا لکھوں کہ کیا لکھا ہے۔ ایک اُس میں الف لیلہ ہے۔ ہر صفحے کی تحریر میں شامِ اودھ صبحِ بنارس کا جلوہ ہے۔ الفاظ کرسی نشینِ فصاحت ہیں۔ مضامین مہرِ بلاغت ہیں۔ نقطے چمک دمک میں یدِ بیضا ہیں۔ فقرے دل چسپ، حیرت افزا

ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب اُس کے چھپنے کا اہتمام ہوگا۔ اگر فلک بر سرِ ساز رہا تو چھپے چھپنے میں انجام ہوگا۔ جس دم ملاحظۂ ناظرین میں آئے گی، جودتِ طبع کھل جائے گی۔ منصف لطف اُٹھائیں گے، مدّعی شرمائیں گے۔

الحمد للہ کہ یہ صنمِ رعنا، محبوبِ زیبا ستائیسویں رمضان سنہ ۱۲۸۰ھ شہرِ لکھنؤ محلّۂ فرنگی محل افضل المطابع میں چھپ کر منظورِ نظر ہوا۔ سخن شناسوں سے یہ التماس ہے کہ کثرتِ سن سے ہوش بجا، نہ ٹھکانے حواس ہے؛ اگر کچھ مزہ ملے تو راقم اور شائع کرنے والے کو دعائے خیر سے یاد کریں، اپنی طبیعت شاد کریں۔ اِس واسطے خاتم بر اختتام ہے کہ اِس نسخے پر حصر ہے، کمی بیشی کا قصّہ تمام ہے۔"

مرزا رجب علی بیگ سرور

قطعۂ تاریخ صنعتِ اختراعیِ دبیرِ ذی توقیر، ناظمِ بے نظیر، واقفِ اسرارِ غیبی منشی عنایت حسین صاحب گوپاموی

سلّمہ اللہ العلی

بندے کے شفیق منشی عنایت حسین صاحب گوپاموی کہ فنِ نظم و نثر میں کامل ہیں، بذلہ سنج، لطیفہ گو، امرا کی صحبت کے قابل ہیں۔ تاریخ گوئی میں یہ کمال ہے جو فقرہ منہ سے نکلا یا لفظ زبان پر آیا، جب غور کیا، پیدا سال ہے۔ راقم کے حال پر عنایت ہے، کمال الفت ہے۔ ایک دن بر سبیلِ تذکرہ فسانۂ عجائب کے چھپنے کا ذکر آیا، فی البدیہ مادّۂ تاریخ موزوں فرمایا۔ "جب غور کیا" ہر فقرہ و لفظِ فسانہ سے سالِ ہجری پیدا ہوا، عجب معاملہ

ہوا۔ ہدیۂ ناظرینِ باریک بیں سمجھ کر درجِ کتاب کیا۔ استخراج کا طریقہ نظم میں لکھ دیا۔ طرہ یہ ہے کہ آغازِ حروفِ ہر مصرعِ اوّل سے سالِ عیسوی پیدا ہے اور سرِ حروفِ ہر مصرعِ ثانی سے سمبت ہویدا ہے اور ہر مصرع کے حروفِ آخری سے سالِ فصلی کی خبر ہے۔ یہ امر بھی اعجاز کے برابر ہے :

سرورِ خاطرِ احباب، انجمن آرا	عجب فسانہ ہے دل چسپ جانِ عالم کا
زمانہ اُس کو ہوا بیس سال سے بھی سوا	چھپا تھا میر حسن کے یہ پہلے مطبع میں
سہ بارہ مہرِ مصنّف سے پھر صحیح چھپا	پھر اس نے جلوہ دیا مصطفائی مطبع کو
رہے تلاش میں جن لوگوں نے نہیں پایا	رہا نہ ایک بھی نسخہ کسی کے مطبع میں
اور اس کو حاجی محمد حسین نے چھاپا	کیا صحیح مصنّف نے پھر یہ افسانہ
مگر کسی کو ملا اور کہیں نہیں پہنچا	اگرچہ اوروں نے چھاپا بھی اس فسانے کو
اسے بھی لے گئے شائق جنھیں ملا سستا	کہیں چھپا مع تصویر بھی بہ خطِ جلی
نہ کچھ صحیح و غلط کا مگر خیال کیا	غرض کہ بیس دفعہ شہرِ لکھنؤ میں چھپا
سرور نے بھی طبیعت کا زور دکھلایا	تلاش اب جو ہوئی شائقوں کو اس کی پھر
ہوئی دو آتشہ پھر یہ مے سرور افزا	کیا درست فسانے کو اب جو چوتھی بار
جو اعتبار ہوا سب کو اس کی صحت کا	پھر اپنے ہاتھ سے اک خاتمہ یہ نثر لکھی
بجا ہے میں جو کہوں ان کو فخرِ سحباں کا	ہیں اپنے عہد میں موجد یہ نثرِ اردو کے
وہ قدرداں ہیں مرے، میں ہوں مدح خواں ان کا	نیاز مجھ کو بھی ہے خدمتِ مقدس میں
زیادہ مُہرِ مصنّف سے اعتبار ہوا	جو چھاپا مولوی یعقوب نے بہ صد صحت
ہر ایک لفظ و ہر اک حرف سے کروں پیدا	مرے بھی دل میں یہ آیا کہ سال ہجری کا

جو لفظ چاہا لیا ہم نے اِس فسانے سے — ضرب ہزار میں دے کر کیے اٹھارہ سوا
پھر اُن کو طرح دیا دس سے، جو رہے باقی — دوچند کر کے، ضرب دے کے آٹھ میں جو لکھا
بس ایک نقطۂ اوّل میں، سالِ ہجری کے — عیاں ہیں بارہ سو اسّی بہ صورتِ زیبا
ہر ایک مصرعِ اوّل کے حرفِ اوّل سے — عیاں ہیں عیسوی، سمت کا جب خیال کیا
حروف سے سرِ ہر مصرع ہائے ثانی کے — تو وہ بھی آئے نکل غور کر کے جب دیکھا
حروفِ آخری ہر ایک مصرع کے لے کر — عدد نکالے تو فصلی بھی ہو گئے پیدا

سنہ ۱۸۶۴ء — سنہ ۱۹۲۱ سمت — سنہ ۱۲۸۰ھ — سنہ ۱۲۷۱ فصلی

ضمیمہ ۲

تشریحات

ص ۱-س ۲: قرآنِ پاک میں یہ آیت "وھو الذی" سے شروع ہوتی ہے [وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ ..... سورۂ فرقان، آیت ۵۴]

ص ۱-س ۴: م میں "جلّ و علا" اور ک میں "جلّ و علا" ہے۔ اگر اس سے پہلے اور اس کے بعد کے ٹکڑوں پر نظر رکھی جائے (صانعِ بے چون و چرا، حمد و ثنا، ارض و سما) تو یہاں "جلّ و علا" مرجح معلوم ہوگا، مگر میں نے یہاں م اور ک کی مطابقت کو مرجح خیال کیا اور اس کی خاص وجہ ایک تو یہ ہے کہ بہ لحاظِ اصل صحیح اسی طرح ہے۔ اور دوسری یہ کہ قیاس کے لیے اسی قبیل کا ایک مرکب "عزّ و جلّ" موجود ہے جو عموماً اسی طرح استعمال میں آتا ہے۔

ص ۲-س ۳: ان دونوں ٹکڑوں میں دو لفظ صراحت طلب ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں لفظ "مبدر" کو بہ لحاظِ معنویت بہ فتحِ اوّل و سوم اور بہ ضمِّ اوّل و کسرِ سوم دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے (پہلی صورت میں یہ اسمِ ظرف ہوگا اور دوسری صورت میں اسمِ فاعل) مگر میں نے آخر الذکر کو ترجیح دی ہے، اس بنا پر کہ خالق، حاکم، طالع؛ تینوں اسمِ فاعل ہیں، یوں حُسنِ عبارت بہ ظاہر اسی کا متقاضی معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی اسمِ فاعل مانا جائے، یعنی صبح کو طلوع کرنے والا اور شام کو ظاہر کرنے والا۔ اسی نسبت سے "مُبدِر" لکھا گیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں لفظ "طالع" کے سلسلے میں یہ صراحت ضروری ہے کہ مصنف نے اس عبارت میں "طالع" "طلوع کرنے والا" کے معنی میں استعمال کیا ہے؛ لیکن یہ فعلِ لازم ہے اور اس کے معنی ہیں: طلوع ہونے والا۔

ص ۴-س ۴: یہاں "نریمان" بہ ترکیبِ فارسی آیا ہے، اس کے باوجود اسے "نریمان" (بہ اعلانِ نون) مرجح سمجھا گیا ہے، اس کو اگر بہ اخفائے نون رکھا جائے تو یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے کہ اصل نام "نریماں" ہوگا۔ یہاں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ ترکیبِ فارسی کی صورت میں ایمان، احسان، یقین، دین جیسے لفظوں کے آخر میں واقع نون کا اعلان اب اچھا نہیں سمجھا جاتا، لیکن یہ اساتذۂ متاخرین کا فیصلہ ہے، اساتذۂ متقدمین اور متوسطین اس التزام کے قائل نہیں تھے۔ سترویں صدی کے اُستاد نوازش بھی اس التزام کے قائل نہیں تھے، اُن کا مطلع ہے:

بیت: ابروئے صنم، گھر ہے دلِ نادان کا — اپنا کیا دل جیب مطلع ہے سرِ دیوان کا

دوسرے یہ کہ اس قاعدے کا تعلق اصلاً قواعدِ شاعری سے ہے۔ نثر میں شاعری کی طرح اس کا التزام اب بھی

نہیں کیا جاتا، اگرچہ اِس کا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے۔

اِس کتاب میں فارسی ترکیب کی صورت میں عموماً ایسے نون کو بہ اخفا مرجح سمجھا گیا ہے، البتہ خاص خاص مقامات پر ایسے الفاظ میں اعلانِ نون کو مرجح قرار دیا گیا ہے اور نون پر نقطہ رکھا گیا ہے اور عربی ترکیب کی صورت میں بالعموم نون کے اعلان کو مرجح قرار دیا گیا ہے، جیسے: خاتم المرسلین، اِسی لیے قافیے کی رعایت سے ص ۲ پر "سرحلقۂ اولین" لکھا گیا ہے۔

ص ۵ - س ۸ : ن کی اشاعتِ اوّل میں اسی طرح ہے، مگر اشاعتِ ثانی میں اِس جملے میں لفظ "حال" بھی شامل ہے: "متوطنِ حال خطۂ بے نظیر..." لفظ "حال" کسی اور نسخے میں موجود نہیں۔ بہ ظاہر یہی خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ صاحبانِ مطبع کی کارگزاری ہے۔ غالباً اِسی کارگزاری کے نتیجے میں جناب مخمور اکبرآبادی نے یہ فرض کرلیا کہ وہ لازماً اکبرآباد کے رہنے والے ہوں گے:

> "زیادہ لوگوں کا فیصلہ تو یہی ہے کہ سرور لکھنؤ کے باشندے تھے، مگر واقعہ اِس کے خلاف ہے۔ سرور کی تصانیف میں اِس قسم کی شہادت موجود ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے نہیں تھے، اِس لیے ظاہر ہے کہ اُن کا آبائی وطن اکبرآباد تھا۔" (مقدمۂ فسانۂ عجائب، مرتبۂ مخمور اکبرآبادی، شائع کردۂ رام نرائن لال، الہ آباد۔ طبع ثانی ۱۹۲۶ء)

"سرور کی تصانیف میں اِس قسم کی شہادت" سے مراد غالباً یہی "متوطنِ حال" ہے۔ اِس طرح خواہ مخواہ ایک بے اصل بحث کے لیے نقطۂ آغاز فراہم ہوگیا۔

ص ۵ - س ۱۱ : یہاں "جہان کی دید" اور "جہان کے دید" دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ لفظ قدما کے یہاں بہ تذکیر بھی ملتا ہے (میر، سودا، درد کے یہاں سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں) لیکن یہاں اِسے مونث اِس بنا پر مانا گیا ہے کہ ص ۲۶۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں واضح طور پر بہ تانیث آیا ہے: "دید دریائی جانوروں کی کرتا تھا" اِسی بنا پر یہاں بھی اِسے بہ تانیث رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ متوسطین اور متاخرین کے یہاں عموماً یہ لفظ مونث ملتا ہے۔ جلال نے بھی مفید الشعرا میں اِسے مونث ہی لکھا ہے۔

ص ۶ - س ۱۳ : متعدد مقامات پر واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قافیۂ مکتوبی سے کام لیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں (آخرِ لفظ میں واقع) یاے معروف و مجہول کی کتابت میں آج کل کی طرح امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا اور اِس طرح مکتوبی سطح پر گویا قافیے کی مناسبت برقرار رہ سکتی تھی۔

"پیپڑی" کی تعریف میں یہاں جو عبارت ہے، اُس کی بھی یہی صورت معلوم ہوتی ہے۔ بسی بسائی، ہوائی، چبائی، نہ آئی؛ اِن سب میں قافیے کی رعایت ہے، لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ "بسی بسائی" اور "ہوائی" میں یائے معروف ہے، مگر "دانت رہے" میں لازماً یائے مجہول ہے اور اِس کی نسبت سے "نوبت نہ آئے" لکھنا ہوگا اور پھر اِسی کی نسبت سے "چبائے" کو مرجح مانا جائے گا۔ معنوی نسبت کا تقاضا یہی ہے۔ اِس طرح اِس عبارت کو گویا دو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے لکھا جائے گا: "پیپڑی لذیذ، دبیز، بسی بسائی، پستہ و بادام کی ہوائی۔ مونھ سے چبائے، دانت کا اُس پر تمام عمر دانت رہے، لگانے کی نوبت نہ آئے"۔

اِس کتاب میں ایسے متعدد مقامات ہیں جہاں قافیہ مکتوبی پر جملوں کی بنیاد رکھی گئی ہے؛ اِس پہلو کو پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

ص ۷۔ س ۱ : ک میں "مزہ انگور کا" سے پہلے لفظ "مصرع" بھی ہے۔ یہ (فقرہ) دراصل مصرع ہے۔ آزاد نے آبِ حیات میں ذوق کے حالات میں ایک جگہ حافظ غلام رسول شوق کے کچھ اشعار حاشیے میں لکھے ہیں، اُن میں ایک پانچ اشعار کی غزل بھی ہے؛ اُس کے مطلعے میں یہ مصرع (معمولی اختلاف کے ساتھ) موجود ہے۔ مطلع یہ ہے:

مزہ انگور کا ہے رنگترے میں عسل زنبور کا ہے رنگترے میں

چوں کہ اِس عبارت میں مصنف نے اِس مصرعے کے لیے لفظ "فقرہ" استعمال کیا ہے، اِس لیے اِسے فقرے ہی کے طور پر لکھا گیا ہے۔

آبِ حیات کے دیباچے میں آزاد نے "رنگترے" کے متعلق لکھا ہے:

"سنگترہ کو اُس کی خوبی اور خوش رنگی کے سبب سے محمد شاہ نے رنگترہ کہا"

ص ۹۔ س ۸ : "تریاکِ مصر" کے متعلق میں معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے اِس سلسلے میں ایک اور بات اپنے خط میں لکھی ہے:

"تریاکِ مصر کے سلسلے میں ایک بات قابلِ غور ہے: "مصر" کے معنی تین انگلیوں یا انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی مدد سے دودھ یا شیرہ نکالنا ہوتے ہیں (اسٹنگاس)۔ افیون نوشی کے متعدد طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ افیون کی گولی کو روئی میں لپیٹ کر پانی کی کٹوری میں انگلیوں سے نچوڑتے ہیں۔ اِس طرح افیون روئی میں سے چھن چھن کر گھلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس طریقے سے مصفّی اور منقّط افیون تیار ہوتی ہے، جس میں کرکراہٹ کا امکان نہیں۔ "تریاکِ مصر کے

نشے کر کرے کیے" سے گمان ہوتا ہے کہ افیون کی یہی صورت سرورؔ نے مراد لی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔" (مکتوب بہ نام مرتب)

میں فی الوقت اِس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن" فیض آبادی لالے کی افیون" کے مقابلے میں قیاس یہ چاہتا ہے کہ زیرِ بحث جملے میں بھی" مصر" بہ طورِ نام آیا ہو۔ اِس کا قوی امکان ہے کہ" تریاکِ مصر"، مصر سے متعلق کسی ایسی منشی چیز کے لیے آیا ہو جو اُس زمانے میں مشہور ہو اور جس کے متعلق اِس وقت معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔

یہ کہا گیا ہے کہ فیض آباد (خاص کر گلاب باڑی) کے علاقے کی افیون نہایت عمدہ مانی جاتی تھی اور" لالہ" پوستے کے پھول کو بھی کہتے ہیں۔ لالہ اصلاً جس پھول کا نام ہے؛ وہ سُرخ ہوتا ہے اور اُس کے پیالے میں ایک سیاہ داغ ہوتا ہے۔ پوستے کا پھول بھی سرخ ہوتا ہے اور اُس کے ڈوڈے میں سیاہ مادّہ افیون جمع ہوتا ہے؛ غالباً اِسی مناسبت سے اِسے بھی" لالہ" کہنے لگے۔

ص ۹ ۔س ۹ : ح کے علاوہ اور سب نسخوں میں" تبدیلِ ذائقے" ہے۔ ح میں" تبدیلِ ذائقہ" ہے۔ قواعد کے لحاظ سے تو" تبدیلِ ذائقہ" ہی مرجّح ہے، کیوں کہ" ذائقے"، "ذائقہ" کی محرّف صورت ہے اور ایسی صورتوں میں (اب) عربی یا فارسی ترکیب کو جائز نہیں سمجھا جاتا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ایسی ترکیبوں کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً ذوقؔ کا یہ شعر:

کوسوں کیا تشنگیِ زمانے کو — کہ نہیں جائے سر اُٹھانے کو

خود سرورؔ کے یہاں اِس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اِسی کتاب میں ص ۱۷ پر اُن کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:

توڑ کر خُم اور پٹک کر آج پیمانے کو ہم — سوے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم

اِس غزل میں یہ شعر بھی ہے:

پر تنک تھا جس مکاں پہ شمع رویوں کا ہجوم — پھانتے ہیں اب وہاں پر خاکِ پروانے کو ہم

اور اِس میں" خاکِ پروانے" کی وہی حیثیت ہے جو" تبدیلِ ذائقے" کی ہے۔ ایک تو یوں کہ ایک ح کے علاوہ اور سب نسخوں میں" تبدیلِ ذائقے" ہے اور دوسرے یوں کہ حُسنِ عبارت کا بھی بہ ظاہر یہاں تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ایسی ترکیبوں کی مثالیں بہ ہر حال موجود ہیں کہ اِس خاص مقام پر اِسی خلافِ قاعدہ صورت کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔ لیکن اِس صورتِ حال کو

مستثنیات کے ذیل میں رکھا جانا چاہیے۔

ص ۹-س ۱۲ : ل میں "چُسکی" پر یہ حاشیہ ہے: "اصطلاحِ جرعہ"۔ اور "اشکِ بلبل" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "اصطلاحِ قطرۂ افیون"۔

ص ۹-س ۱۷: صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ جون پور کے ایک محلّے کا نام مفتی محلّہ ہے؛ یہ رعایت بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

ص ۱۰-س ۲ : ن میں "فصلِ بہار کی، صنعتِ پروردگار کی" ہے۔ بہ ظاہر یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ بعض اور مقامات کی طرح یہاں بھی مطبعِ نول کشور کے مصحّح نے اصل لفظ "باغ" کی جگہ "فصل" کا لفظ لکھا ہے اور غالباً اِس خیال سے یہ تبدیلی کی ہے کہ دونوں ٹکڑوں میں قافیے کی رعایت برقرار رہے اور "کی" آسکے (فصلِ بہار کی، صنعتِ پروردگار کی)۔

اس جملے کی قرائت دو طرح ہو سکتی ہے (۱) باغِ بہار کے، صنعتِ پروردگار کے۔ ح میں "صنعت" کی "ت" کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے (صنعتِ پروردگار) اِس صورت میں قافیے کی رعایت برقرار رہتی ہے، مگر جملہ بہ ظاہر ناتمام رہتا ہے، ایک لفظ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ بعض اور مقامات کی طرح یہاں بھی مصنّف نے قافیۂ مکتوبی کا فائدہ اٹھایا ہے (باغِ بہار کے۔ صنعتِ پروردگار کے) اِس صورت میں دونوں ٹکڑے ہم قافیہ نہیں رہیں گے اور اِن کو اِس طرح لکھنا پڑے گا: "باغِ بہار کے، صنعتِ پروردگار کی"۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اِس صورت میں جملہ بے مزہ ہو جاتا ہے۔

چوں کہ اِس مقام پر "صنعت" کو بہ اضافت پڑھا جا سکتا ہے (اور ح میں ہے بھی اسی طرح) اِس لیے "صنعتِ پروردگار کے" کو مرجّح سمجھا گیا ہے، کیوں کہ اِس طرح عبارت کا حُسن برقرار رہتا ہے اور ایک لفظ کی کمی کے احساس کے باوجود معنویت کارفرما رہتی ہے۔

ص ۱۰-س ۹ : "ہر قدم پر کبکِ دری چال بھول کر جبینِ نیاز رگڑتے، شاخِ سرو، سکے رو بہ زرد یہ اکڑتی"۔ لفظِ "کبک" بالاتفاق مذکر ہے، اِس نسبت سے اِس عبارت کو اِسی طرح ہونا چاہیے، یعنی "جبینِ نیاز رگڑتے" لکھا جائے؛ لیکن اِس صورت میں قافیے کا حُسن برقرار نہیں رہتا، کیوں کہ دوسرے جملے میں "شاخ" کی رعایت سے لازماً "اکڑتی" لکھا جائے گا۔ اب دو صورتیں ہیں: یا تو یہ فرض کر لیا جائے کہ سرور نے "کبک" کو بہ تانیث استعمال کیا ہے اور اُس کی نسبت سے "جبینِ نیاز رگڑتی" لکھا جائے۔ اِس طرح قافیے کا حُسن تو برقرار رہے گا، لیکن قباحت یہ ہے کہ تانیث کی کوئی اور مثال کہیں نہیں ملتی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ

اِس عبارت میں قافیۂ مکتوبی کی کارفرمائی کو مان لیا جائے (پرانی کتابت میں "رگڑتے" اور "رگڑتی" کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا) اِس صورت میں پہلے جملے میں "رگڑتے" لکھا جائے گا اور دوسرے جملے میں "نہ اکڑتی" رہے گا۔ اِسی کو مرجّح قرار دیا گیا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کتاب میں قافیۂ مکتوبی کی متعدد مثالیں موجود ہیں (اپنے اپنے مقام پر اُن کی نشان دہی کی گئی ہے) اِس طرح یہاں کوئی نئی بات نہیں ہوگی اور نہ کچھ فرض کیا جائے گا۔

اِس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے : جمہور کے خلاف صفیر بلگرامی نے رشحاتِ صفیر میں "کبک" کو بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے اور تانیث کی سند میں صرف فسانۂ عجائب کی یہی عبارت درج کی ہے (کبک جبینِ نیاز رگڑتی) لیکن اِس کی وجہ محض یہ معلوم ہوتی ہے کہ قافیۂ مکتوبی کا پہلو موٗلف کی نظر میں نہیں تھا، ورنہ روشِ جمہور (قواعد نویس، لغت نویس اور اساتذہ کے مختارات) کے خلاف وہ اِس لفظ کو مختلف فیہ نہ لکھتے۔

ص ۱۰ - س ۱۳ : ح، م، ض، ک میں "گھٹاری اوبھی گھنگھور" ہے، البتّہ ف، ل، ن میں "گھٹا رہی اوبھی گھنگھور" ہے۔ میں کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکا کہ قدیم اُردو میں یا اودھی، برج اور بھوج پوری میں "گھٹاری" کبھی مستعمل رہا ہے۔ جن حضرات سے میں نے دریافت کیا، اُنھوں نے اِس سلسلے میں ناواقفیت کا اظہار کیا۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ گھٹا کے معنی میں کسی خاص علاقے میں "گھٹاری" کا مستعمل ہونا بعید از قیاس نہیں۔ بہ ہر صورت دونوں امکانات برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی یہ بھی ممکن ہے کہ "گھٹاری" غلطیِ کتابت ہو جو مسلسل نقل ہوتی رہی اور بعد کو مصنّف نے اُس کی تصحیح کی اور اُسے "گھٹا رہی اوبھی" بنایا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "گھٹاری" گھٹا کے معنی میں کبھی مستعمل رہا ہو اور مصنّف نے اِس قدیم لفظ کو اُسی طرح استعمال کیا ہو جس طرح اِسی جملے میں، بلند ہونے اور اُٹھنے کے لیے "اوبھی" استعمال کیا ہے (اِس لفظ سے متعلق ضروری تفصیل ص ۱۵۴ نمبر دیکھی جا سکتی ہے)۔

چوں کہ "گھٹاری" کے متعلق میں کچھ معلوم نہیں کر سکا؛ نیز اِس بنا پر کہ ف اور ل میں (جو موٗخر نسخے ہیں) "گھٹا رہی اوبھی" ہے؛ اِن وجوہ سے "گھٹا رہی اوبھی" ہی کو برقرار رکھا گیا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ میری رائے میں اِس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

ص ۱۱ - س ۹ : "فرح بخش اور دل کشا"، یہ دونوں کوٹھیوں کے نام بھی ہیں؛ لیکن اِس عبارت میں

یہ لفظ بہ طورِ صفت آئے ہیں، اِس لیے اِن پر اسمِ خاص کی علامت کے طور پر خط نہیں کھینچا گیا۔

ص ۱۱ - س ۱۶ : "رومی دروازہ اِس رفعت و شان کا ہے، گذرگاہ ایک جہان کا ہے" اِس جملے میں بہ ظاہر لفظ "گذرگاہ" بہ تذکیر آیا ہے۔ دو صورتیں ہیں : یا تو یہ مان لیا جائے کہ سُرور نے یہاں اِس لفظ کو مذکر ہی مانا ہے۔ اِس میں ایک قباحت یہ سامنے آتی ہے کہ آگے چل کر (ص ۲۲۵ پر) یہ بہ تانیث آیا ہے : سوداگر جب بندر کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اُس وقت مہر نگار کے ایک سوال کے جواب میں لوگ کہتے ہیں : "حضور کے جھروکے تلے شاہراہ ہے، یہی ہر سمت کی گذرگاہ ہے"۔ یہاں واضح طور پر یہ لفظ بہ تانیث آیا ہے [فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں اِسے مؤنث ہی لکھا گیا ہے۔]

دوسری صورت یہ ہے کہ اِس جملے میں انشا کا نقص فرض کر لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ "کا ہے" رومی دروازے کی نسبت سے آیا ہے (لیکن یہ تاویل ہوگی) بہ ہر صورت دونوں جملوں کو اپنی اپنی جگہ پر اصل کے مطابق رکھا گیا ہے۔

ص ۱۱ - س ۱۹ : مراد ہے آصف الدولہ کے بنوائے ہوئے بڑے امام باڑے سے؛ اِس کے احاطے میں شان دار مسجد بھی ہے، جسے مسجدِ آصفی کہتے ہیں۔ فرقۂ شیعہ کی نمازِ عیدین اور نمازِ جمعہ اِسی مسجد میں ہوتی ہے۔

ص ۱۲ - س ۶ : یہاں اودھ سے مراد فیض آباد ہے۔

ص ۱۲ - س ۸ : شاید یہ خیال کیا جائے کہ "مجمعِ رئیسں" کو "مجمع رئیس" بھی پڑھا جا سکتا ہے، لیکن یہ درست نہیں ہوگا۔ ک میں یہ جملہ جس طرح لکھا ہوا ہے (مجمعِ امرا مسکنِ رئیس) اُس سے قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں "مجمعِ رئیس" ہے اور مرکبِ اضافی شہر کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی یہ شہر نفیس ہے اور "رئیسوں کی جائے جمع" ہے۔ (یہاں رئیس رہتے ہیں۔ یہ رئیسوں کا مسکن ہے)۔ "نفیس" اور "مجمعِ رئیس" دونوں "شہر" کی صفتیں ہیں۔

ص ۱۳ - س ۵ : "سکندر طالع، بہ صورت گدا" اِس ٹکڑے میں یہ اشتباہ دل میں گزر سکتا ہے کہ شاید یہ "بہ صورتِ گدا" ہے۔ لیکن معنوی نسبت کا تقاضا یہاں یہ ہے کہ اِسے بغیر اضافت (بہ صورت گدا) پڑھا جائے۔ مفہوم یہ ہے کہ قسمت کے تو سکندر ہیں لیکن بہ ظاہر فقیر معلوم ہوتے ہیں۔

ص ۱۳ - س ۵ : اِس عبارت میں (دل گیر کے علاوہ) ضمیر، خلیق، فصیح، مسکین، سکندر، دبیر؛ یہ سب معروف مرثیہ نگاروں کے تخلص ہیں؛ لیکن اِس عبارت میں یہ سب لفظ بہ طورِ تخلص نہیں، بہ طورِ صفت آئے ہیں (اِسی لیے اِن پر تخلص کی علامت نہیں بنائی گئی)۔ اِس کو خواہ ایہام کہیے خواہ کنایہ۔ یہ واقعی دل چسپ بات ہے کہ سُرور نے دل گیر کے علاوہ اُس زمانے کے

کسی دُوسرے مرثیہ نگار کو صراحتاً قابلِ ذکر نہیں سمجھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس عبارت میں دس مرثیہ نگاروں کے تخلّص آئے ہیں، بعض نے یہ تعداد بارہ بتائی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تعداد چودہ ہو سکتی ہے اور فہرست اِس طرح مرتب کی گئی ہے : ضمیر، دلگیر، فصیح، خلیق، مسکین، سکندر، دبیر، ناظم، گدا، کرم، نظیر، ناظم، طالع، افسردہ؛ لیکن یہ دراصل بال کی کھال نکالنا ہے۔

ایک بات اور : سُرورؔ نے دلگیر کی تعریف میں یہ جو لکھا ہے کہ : "بارِ احسان اہلِ دول کا نہ اُٹھایا"۔ ایک خیال یہ ذہن میں آتا ہے کہ کیا یہاں دوسرے مرثیہ نگاروں پر در پردہ تعریض تو نہیں کی گئی ہے۔

ص ۱۳ - س ۱۱ : "پَیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے"۔ یہاں اِس طرف توجہ دلانا شاید غیر مناسب نہ ہو کہ "آشنا" کے ایک معنی "پَیراک" بھی ہیں اور اِس طرح اِس لفظ سے ایہام کا لطف عبارت میں پیدا ہو گیا ہے۔ ص ۳۹ پر بھی ایک جملے میں یہ رعایت موجود ہے۔

ص ۱۶ - س ۶ : اِس ٹکڑے میں بہ ظاہر کچھ کمی محسوس ہوتی ہے، معنوی طور پر تکمیل نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو لفظ چھوٹ گئے ہیں۔

ص ۱۶ - س ۱۹ : اِس عبارت میں چوسر کی اصطلاحیں آئی ہیں۔ "نُنجے" مجھے کسی لغت میں نہیں ملا، البتہ ک کے حاشیے پر اِس کے معنی داؤں کا خالی جانا لکھے ہیں۔ اِس کے تلفظ کا تعیّن "پنجے" کے قیاس پر کیا گیا ہے۔ مفہوم بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیرِ بخارا (لکھنؤ کے ایک محلّے کا نام) کے شہدے کی یک رنگی کا عالم یہ ہے کہ وہ (غالباً پنجتن کی رعایت سے) ہمیشہ پنجے پر داؤں لگاتا ہے۔ داؤں خواہ ایک رُوپے کا ہو یا سو رُوپے کا۔ اُس کے سیکڑوں داؤں خالی گئے لیکن اُس نے دُوئے (یا کسی اور نمبر) پر کبھی داؤں نہیں لگایا۔ چوک، چھکّا، پنجہ،

دوا، اَدھی، ایک، سَو کی رعایت ظاہر ہے۔ اسی طرح جُوا، داؤں، بنیے، پَو کی رعایت بھی نمایاں ہے۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دُوسے پر تو یوں داؤ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ یکرنگی کے خلاف ہوتا اور تین کا عدد پانسے کے کھیل میں بُرا مانا جاتا ہے، "تین کانے" مشہور ہے۔ اس کے علاوہ، تین اور چار کے اعداد اُس معاشرت میں مذہبی اثر کے لحاظ سے بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ بس ایک پانچ کا عدد بچتا تھا جو "پنجتن" کی رعایت سے مبارک ثابت ہو سکتا تھا۔ شررؔ نے لکھا ہے: "خلفاے اربعہ کی مخالفت اور پنج تن کی محبت نے لکھنؤ کی درباری معاشرت میں چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا" (گذشتہ لکھنؤ، جامعہ اڈیشن، ص ۳۰۶)۔ "کہ دیا پَو" کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ پانسا پھینکتا تھا تو (جوسر اور چَوسر کھیلنے والوں کے قول کے مطابق) اس یقین کے ساتھ "پَو" کہتا تھا کہ یہ داؤں تو آ ہی جائے گا۔

ص ۱۸۔ س ۱ : سب نسخوں میں یہاں "دہلی" ہے۔ صفحات ۳۰، ۱۰۲، ۱۹۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں سب نسخوں میں "دلّی" ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر ان دونوں صورتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اشاریے میں بھی ان دونوں کو الگ الگ لکھا گیا ہے۔

ص ۱۸۔ س ۱۹ : دیکھیے اس ضمیمے کا آخری حصہ۔

ص ۲۱۔ س ۱۴ : قرباں رواے، ہاے، دعاے وغیرہ جملہ قوافی میں یے پر ہمزہ نہیں آنا چاہیے۔ یعنی قرباں رواے لکھنؤ، گداے لکھنؤ (وغیرہ) لکھنا چاہیے لیکن مشکل یہ ہے کہ تیسرے شعر میں "بھلائے" آیا ہے۔ یہ فعل ہے اور اس کو لازماً مع ہمزہ (بھلائے) لکھا جائے گا؛ اسی مجبوری سے ہر جگہ یے پر ہمزہ لگانا پڑا ہے۔

یہ بحث رسالہ مرقع میں بھی شروع ہوئی تھی (فروری ۱۹۲۶ء)۔ اس پوری بحث کو نقوش کے ادبی معرکے نمبر جلد اوّل میں ص ۵۰۵ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ شوق نیموی نے لکھا ہے:

"حرفِ مکتوبی کا قافیہ، اُس غیر مکتوبی کے ساتھ، جو تلفظ میں ہو، درست نہیں۔ ... شعرا نے اس قسم کے تقفیے سے بہت احتیاط کی ہے مگر نہایت تعجب ہے کہ بعض الفاظ میں کچھ ایسا دھوکا کھا گئے کہ تقفیہ مذکورہ استعمال کرنے کو کر گئے، مگر خبر تک نہیں ہوئی کہ کیا کہہ گئے۔ ... مثال کے لیے ایک شعر لکھا جاتا ہے۔ ناسخ:

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھُڑائے لکھنؤ "لکھنؤ مجھ پر فدا ہے" میں فداے لکھنؤ

ظاہر ہے کہ "چھُڑائے" میں الف کے بعد ہمزہ اور ہمزہ کے بعد یے ہے۔ اور "فداے" میں الف کے بعد صرف ایک یے ہے، جس کو بہ وجہ

انتہ نمت کسرہ ہے اور کسرے کی وجہ سے وہ یَے، لہجے میں ہمزہ سے بدل
گئی ہے اور اُس کسرے کا اِشباع کیا گیا ہے، جس سے دوسری یَے صرف
تلفظ میں پیدا ہو گئی ہے، اِس کو کتابت سے کچھ علاقہ نہیں۔ پس جس طرح
"سنوارے چمن"، "سارے چمن" کا قافیہ "بہارِ چمن" درست نہیں،
اُسی طرح "بچھڑائے لکھنؤ" کا قافیہ "فدائے لکھنؤ" ازروے انتظام
شاعری درست نہیں ہو سکتا۔" [اصلاح صـ۲۹]

ص۲۱۔س۱۸ : اِس مصرعے میں "اُن کی استغنا" اور "اُن کے استغنا" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ "اُن کی استغنا" کو اِس بنا پر مرجّح قرار دیا گیا ہے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے عموماً اِس لفظ کو مونث مانا ہے۔ امیر مینائی نے امیر اللغات میں اور جلال نے مفید الشعرا میں اِسے مونث ہی لکھا ہے۔ نور اللغات میں بھی مونث لکھا گیا ہے۔ شوق قدوائی نے ایک خط میں لکھا ہے :

" "استغنا" بھی میری زبان پر مونث ہے .... بعض اصحاب کی زبان
سے یہ لفظ تذکیر کے ساتھ بھی نکلتا ہوا سُنا ہے، مگر میں کہوں گا تو بلاشبہہ
مونث ہی کہوں گا۔" [مرقعِ ادب (مولفۂ صفدر مرزاپوری) ص۹۱]

فرہنگِ آصفیہ میں اِسے صرف مذکر لکھا گیا ہے، لیکن میر کے یہاں مونث ملتا ہے۔ میر کی وہ مشہور غزل جس کے مطلعے کا پہلا مصرع یہ ہے : "اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا" اُس میں یہ شعر بھی ہے :

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی اُن نے، جوں جوں مَیں ابرام کیا

ص۲۲۔س۱۷ : دیکھیے اِس ضمیمے کا آخری حصّہ۔

ص۲۳۔س۱۳ : دیکھیے اِس ضمیمے کا آخری حصّہ۔

ص۳۰۔س۲ : [اِس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعوئِ اردو زبان پر لائے] عربی میں جن لفظوں کے آخر میں لکھی تو یَے جاتی ہے لیکن پڑھنے میں الف آتا ہے (جیسے : دعوی، لیلی، عیسی، ادنی، اعلیٰ)، اُن میں سے کچھ لفظ فارسی و اردو میں بہ یاے معروف بھی استعمال میں آتے ہیں، اور اُس صورت میں حرفِ ماقبلِ یا (جو مفتوح ہوتا ہے) مکسور ہو جایا کرتا ہے، مثلاً :

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسٰی نہ ہوا

اور بہ صورتِ اضافت اُس "ی" پر اضافت کا زیر آجایا کرتا ہے، جیسے: عیسیٔ دوراں، موسیٔ عمراں، لیلیٔ شب۔ اِسی طرح "دعویٔ اردو" آئے گا۔ البتہ اِس لفظ "دعویٰ" میں ایک صورت یہ خاص ہے کہ تلفظ میں واو مفتوح رہتا ہے، یعنی "دعویٔ اردو" کے بجائے سننے میں "دعوَیِ اردو" آتا ہے۔ اور چوں کہ ماقبلِ یا (مکسور رہنے کے بجائے) مفتوح ہوجایا کرتا ہے، تو اِس وجہ سے قدرتی طور پر "ی" کی آواز ہلکی ہوکر ہمزہ کے قریب ہوجایا کرتی ہے۔

ص ۳۳۔س ۶: اِس عبارت میں "خلقِ خدا با خاطرِ شاد" کو ایک ٹکڑا بھی فرض کیا جاسکتا تھا، یعنی "مکانِ پایدار، خلقِ خدا با خاطرِ شاد، اُسے فسحت آباد کہتے تھے"۔ لیکن اِسے مرجح نہیں سمجھا گیا، کیوں کہ اِس صورت میں (قافیۂ مکتوبی کی رعایت فرض کرنے کے باوجود) عبارت کا حُسن اور صوتی ہم آہنگی کا تناسب ختم ہوجاتا تھا۔ لیکن یہ ضمنی بات ہے، اصل بات یہ ہے کہ ک میں یہ جملہ اِس طرح لکھا گیا تھا: "خلقِ خدا اُسے باخاطرِ شاد فسحت آباد کہتی تھی" اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ مصنف نے "خلقِ خدا" کو "کہتی تھی" کا فاعل بنایا تھا، اور اِس طرح مرادِ مصنف کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اِسی بنا پر یہاں مندرجۂ متن صورت کو مرجح مانا گیا ہے۔

ص ۳۴۔س ۱۴: "لعبت" مونث ہے، اِس لحاظ سے یہاں "ایسی لعبتِ حقیقت" ہونا چاہیے؛ لیکن "لعبت" سے مراد ہے جانِ عالم اور اِس اعتبار سے واضح طور پر تذکیر کا محل ہے اور اِسی لیے "ایسے لعبتِ حقیقت" کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

قیاس کے لیے مثالیں موجود ہیں، خواجہ وزیر کا شعر ہے:

اُس سروِ خوش خرام کا قمری ہوں اے وزیر چلتے تھے جس کے ساتھ شجر پاے لنگ سے

(دفترِ فصاحت ص ۱۹۵)

"قمری" بالاتفاق مونث ہے؛ چوں کہ لفظ قمری شاعر نے اپنے لیے استعمال کیا ہے، اِس لیے بہ تذکیر نظم کیا ہے۔ جس طرح اِس شعر میں "اُس سروِ خوش خرام کی قمری ہوں" بے جوڑ معلوم ہوگا، اُسی طرح اُس عبارت میں "ایسی لعبت" غیر مناسب نظر آئے گا۔

ایک مثال اور: امیر مینائی نے ایک خط میں ستارۂ مشتری کی تذکیر و تانیث کے

ذیل میں لکھا ہے :

" واضح ہو کہ یہ ستارہ مؤنث ہے۔ جہاں کہیں سخن دانوں اور سخن وروں نے استعمال بہ تذکیر کیا ہے، وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے.... جیسے ناسخ کے اِس مطلع پر :

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا   روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

اُن کے شاگردِ رشید مرزا محمد رضا برق نے جو مصرعے لگائے ہیں، اس میں "قمری" کو، جس کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں، بہ تذکیر استعمال کیا ہے، تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود نہیں ہے۔ وہ تضمین یہ ہے :

پروانہ ہوں ازل سے سراجِ منیر کا   قمری ہوں سروِ باغِ علیِ کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمنِ بے نظیر کا   بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا

.... قمری سے، برق کے شعر میں، عاشق یا خود متکلم مراد ہے۔"

[مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبۂ ثاقب]

ص ۳۹ - س ۱۷ : "بحرِ عجب و نخوت میں آشنا ہوئی"۔ یہاں صرف اِس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ "آشنا" کے ایک معنی "پیراک" بھی ہیں (امیر اللغات) اور اِس عبارت میں یہ لفظ اِسی نسبت کے ساتھ آیا ہے۔ نیز دیکھیے حاشیۂ ص ۱۳ - س ۱۱۔

ص ۴۰ - س ۶ : اِس ٹکڑے کو دو طرح پڑھا جاسکتا ہے اور دونوں قرائتیں بجائے خود درست ہوں گی: (۱) طائرِ زمرد لباس، سرخ رو۔ (۲) طائرِ زمرد لباسِ سرخ رو۔ دوسری صورت کو محض اِس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ اِس مکمل جملے کے آہنگ کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے [اے مرغِ خوش خود طائرِ زمرد لباسِ سرخ رو، بذلہ سنج بے رنج]۔

اِس کی تائید اِس طرح بھی ہوتی ہے کہ ک میں یہ ٹکڑا اِس طرح ملتا ہے : "اے مرغِ خوش خود طائرِ سرخ رو"۔ اور یہاں "طائرِ سرخ رو" اُسی قرائت کی تائید کرتا ہے جس کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

ص ۴۰ - س ۱۷ : اِس جملے میں "جانورِ بدتمیز" اور "جانور بدتمیز" دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ ک میں یہ ٹکڑا اِس طرح لکھا گیا تھا : "کیوں جانور بدتمیز، مشت پر، ناچیز"۔ ظاہر ہے کہ اِس ٹکڑے میں "مشت پر" کی رعایت سے "جانورِ بدتمیز" انسب ہوگا اور اِس سے یہ ظاہر

یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اِسے بے اضافت رکھا تھا۔ اِسی خیال کی بنا پر اِسے مع اضافت مرجح سمجھا گیا ہے۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ عورت کی گفتگو میں اضافت نہیں آئے گی، لیکن یہ لازم نہیں ؛ اِس بنا پر کہ اِس سے پہلے ہی جو پیراگراف ہے، اُس میں ماہ طلعت ہی کے قول میں کئی مرکبات اضافی موجود ہیں۔

ص ۴۱۔ س ۱۶ : ک کے علاوہ اور سب نسخوں میں "کہتی تھی" ہے۔ یہاں اور نسخوں کے مقابلے میں ک کے متن کو اِس لیے مرجح مانا گیا ہے کہ "شہزادی صاحب" کے ساتھ "کہتی تھیں" ہی مناسبت رکھتا ہے؛ "شہزادی صاحب کہتی تھی" بے جوڑ معلوم ہوگا۔ دیوانِ بقا میں یہ مصرع اِس طرح ہے : دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں۔ سرور نے موقعے کی مناسبت سے تصرف کیا ہے اور موقعے ہی مناسبت اِس کی متقاضی ہے کہ تصرف کی صورت میں "کہتی تھیں" پڑھا جائے۔

ص ۴۴۔ س ۱۰ : یہاں یہ لفظ اِس طرح آیا ہے کہ اِسے بہ تذکیر اور بہ تانیث دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے [کے طرزِ گفتگو۔ کی طرزِ گفتگو] ص ۱۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں واضح طور پر بہ تذکیر آیا ہے : "میر علی صاحب نے وہ طرزِ نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا"۔ لیکن ص ۱۹۱ پر سرور نے اِسے بہ تانیث نظم کیا ہے :

"زمانے کی کچھ طرز لکھتا ہے یاں عجائب غرائب ہے یہ داستاں"

یہاں سب نسخوں میں "کی" ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ تذکیر و تانیث کا اِس قسم کا اختلاف سرور کے یہاں بعض اور الفاظ کے سلسلے میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً لفظِ "گذرگاہ" (دیکھیے اِسی ضمیمے میں حاشیہ ص ۱۱)۔ ص ۱۲ پر جو عبارت ہے، اُس میں یہ لفظ قطعی طور پر بہ تذکیر آیا ہے، اور اُسی کی رعایت سے یہاں بھی اِسے بہ تذکیر رکھا گیا ہے — یہ صراحت بے جا نہ ہوگی کہ لفظِ "طرز" بہ لحاظ تذکیر و تانیث مختلف فیہ رہا ہے (نور۔ آصفیہ)۔

ص ۴۴۔ س ۱۶ : اِس عبارت میں "یہ قصدِ لاحاصل ہے" (مع اضافت) بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "یہ قصد لاحاصل ہے" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ "قصدِ لاحاصل" (مع اضافت) کو محض اِس قیاس کی بنا پر مرجح سمجھا گیا ہے کہ اِس کے انداز کا ایک مرکب "سعیِ لاحاصل" ہے اور یہ عموماً بہ ترکیب توصیفی ہی استعمال میں آتا ہے۔

ص ۵۵۔ س ۳ : اِس عبارت میں "دشتِ بلاخیز" کی رعایت سے "جنگلِ وحشت انگیز" بہ ظاہر زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ "جنگل" فارسی کا لفظ ہے اور اِس لحاظ سے بہ لحاظِ قاعدہ اِس کی اضافت درست

ہوگی، لیکن اُردو میں یہ لفظ بہ طورِ مفرد استعمال میں آتا ہے، ترکیبِ فارسی کے ساتھ اِس کو استعمال نہیں کیا جاتا؛ اِس لحاظ سے یہاں مرجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ "جنگل" کو اہلِ اُردو کے استعمال کے مطابق بغیرِ اضافت رکھا جائے اور "جنگل وحشت انگیز" پڑھا جائے۔ بہ لحاظِ معنی دونوں طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

ص ۵۵۔س ۱۶ : یہاں "اللہ رے بیخودی" اور "اللہ ری بیخودی" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ سماعت میں بھی دونوں طرح ہے، لیکن امیر مینائی نے امیر اللغات میں "اللہ رے" لکھا ہے اور حاشیے پر مزید صراحت کی ہے کہ : "قاعدہ مقتضی ہے کہ مونث کے ساتھ یائے معروف اور مذکر کے ساتھ یائے مجہول ہو، مگر فصحا کی زبان پر دونوں حالتوں میں یائے مجہول کے ساتھ زیادہ ہے۔" یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں صرف "اللہ رے" ہے، "اللہ ری" اِس میں مذکور نہیں۔ جلال نے سرمایۂ زبانِ اُردو میں زیادہ زور دے کر یہی بات لکھی ہے۔ "اللہ رے" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے : "اور اِس کلمے کو جو کسی امرِ مونث یا کسی عورت کی عظمت و بزرگی وغیرہ کے اظہار کے واسطے لوگ یائے معروف سے بولتے ہیں، مولفِ ہیچ مداں کے عندیے میں غلط بولتے ہیں۔ ایسے محل پر بھی یائے مجہول ہی سے بولنا چاہیے" (سرمایۂ زبانِ اردو)۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں جلال کے اِس قول سے اختلاف کیا ہے لیکن فصحائے متقدمین چوں کہ "اللہ رے" کے موئید ہیں، اِس بنا پر یہاں اِسی کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

ص ۵۷۔س ۸ : اِس ٹکڑے میں لفظِ "عمارت" کو مع اضافت اور بغیرِ اضافت، دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے ["باغ اور عمارت مفصل" ۔ "باغ اور عمارتِ مفصل"] آخر الذکر کو مرجح سمجھا گیا ہے، اِس وجہ سے کہ "عمارت" کو اضافت کے بغیر رکھنے کی صورت میں بہ ظاہر مطلب یہ ہوگا کہ باغ اور عمارت کو تفصیل کے ساتھ، اچھی طرح دیکھا۔ لیکن یہ مفہوم اِس لیے قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا کہ جانِ عالم ابھی عمارت کے اندر پہنچا ہی نہیں اور اِس کے بغیر وہ باغ اور عمارت کو پوری طرح کیسے دیکھ سکتا ہے (چار دیواری موجود ہے)۔ اگر "عمارت" کو اضافت کے ساتھ پڑھا جائے تو مفہوم یہ نکلے گا کہ اُس نے دیکھا کہ ایک بڑا باغ اور بڑی عمارت سامنے ہے، اور یہی مفہوم یہاں چسپاں ہوتا ہے۔

ص ۵۸۔س ۱۰ : "حوضِ مصفّیٰ پانی سے لبالب بھرا پایا"۔ یہ وضاحت شاید غیر مناسب نہ ہوگی کہ "لبالب

بھرا" سرورؔ نے فسانۂ عبرت میں بھی لکھا ہے (فسانۂ عبرت، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، ص ۴۴)۔

ص ۵۸۔ س ۱۳: "سیل" بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں ترجیح کی صراحت نہیں۔ جلالؔ نے مفید الشعراء میں اور مؤلفِ نور اللغات نے تانیث کو مرجح بتایا ہے۔ جلالؔ نے لکھا ہے: "لیکن تحقیقِ مقام یہ ہے کہ سیل کی تانیث کے بیش تر فصحا قائل ہیں اور تذکیر کے کم تر" (مفید الشعراء)۔ یہ معلوم نہیں کہ سرورؔ کا طرزِ عمل کیا تھا۔ ناسخؔ نے اسے بہ تذکیر نظم کیا ہے (سند کا شعر نور اللغات میں) اور شاگردانِ ناسخؔ نے بیش تر بہ تانیث لکھا ہے۔ میں نے ناسخؔ کے طرزِ عمل کے مطابق اسے عبارت میں بہ تذکیر مرجح فرض کیا ہے۔

ص ۶۰۔ س ۱۹: "مینا ہے بے زبان .... یہ بولی"۔ یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے "مینا" کو بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ آصفیہ اور نور دونوں میں اسے صرف مذکر لکھا گیا ہے، لیکن جلالؔ نے مفید الشعراء میں اسے صرف مؤنث لکھا ہے اور سرورؔ کے اس استعمال سے جلالؔ کے قول کی تائید ہوتی ہے اور سند ہاتھ آتی ہے۔

ص ۶۱۔ س ۵: لفظ "جاہ" بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے (نور اللغات)۔ جلالؔ نے مفید الشعراء میں اسے مختلف فیہ لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ میں اسے مذکر مانتا ہوں۔ جب یہ لفظ مع ترکیب آتا ہے تو اس صورت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ تذکیر و تانیث کا تعلق اس کے دوسرے جز پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً "جاہ و حشم" مذکر آتا ہے اور "جاہ و منزلت" مؤنث۔ اسی قیاس پر "جاہ و ثروت" کو مؤنث مانا گیا ہے ["ثروت" مؤنث ہے]۔

ص ۶۴۔ س ۴: "تسلی دے، کہا"۔ اس جملے میں "تسلی دی" بھی پڑھا جا سکتا ہے، لیکن سرورؔ کا عام اندازِ نگارش یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر عموماً مغایرِ فعل لاتے ہیں (پرانے قواعد کے مطابق ماضیِ معطوفہ کا فعل لاتے ہیں)۔ مثلاً اسی صفحے کی چھٹی سطر میں "یہ خیال کر، ساحرہ سے کہا" ہے۔ اس کی اور بہت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی بنا پر یہاں "تسلی دے، کہا" کو افضل مانا گیا ہے۔

ص ۶۷۔ س ۲: "تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا، باغ خالی کاٹے کھاتا ہوگا"۔ اس ٹکڑے میں "باغ خالی" اور "باغِ خالی" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ ک میں "خالی مکان اور باغ" ہے؛ اس سے بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ مقصودِ مصنف بغیر اضافت ہوتا تو لفظوں کی ترتیب

کیوں بدلی جاتی۔ [" خالی باغ کاٹے کھاتا ہوگا " بہ آسانی لکھا جاسکتا تھا] اِسی خیال کی بنا پر " باغِ خالی" کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہ بات بہ ہر حال واضح ہے کہ بامعنی اور فصیح دونوں طرح ہے۔

ص ۷۱۔س ۵ : " پر تلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم چھانتے ہیں اب وہاں پر خاکِ پروانے کو ہم " سب نسخوں میں " پر تلک " ہے، البتہ ن میں " کل تلک " ہے، لیکن بہ ظاہر یہ پریس والوں کی تصحیح معلوم ہوتی ہے۔ " پر " کے ایک معنی " گذشتہ " کے بھی ہیں، اِس معنی میں لغت نویسوں نے اِسے " پار " کا مخفف بتایا ہے [جیسے : پرسال] اِسی معنی کی نسبت سے یہ یہاں آیا ہے۔ شمع اور پروانے کی لفظی نسبت نے غالباً اِس غیر مانوس لفظ کے استعمال کی طرف مصنف کو متوجہ کیا ہوگا۔ " وہاں پر " کی رعایت مزید برآں۔

ص ۷۴۔س ۱۰ : یہاں " بہ صد جلوہ و شان " میں نون کا اعلان مرجّح سمجھا گیا ہے، اِس بنا پر کہ " بہ صد جلوہ و شاں " زبان پر بہت اجنبی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ بہ لحاظِ قاعدہ یہی انسب ہے۔ جیسا کہ اِس سے پہلے بھی لکھا جاچکا ہے، ترکیب کی صورت میں نون کا اخفا و اعلان درحقیقت نظم سے متعلق ہے۔ نثر میں اِس کی پابندی لازم نہیں، اگرچہ اکثر مقامات پر مناسب اور مرجّح ہوتی ہے۔

ص ۷۴۔س ۱۵ : یہاں " دید کی خراش سے " اور " دید کے خراش سے " دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے، کیوں کہ لفظِ " خراش " بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے (نور اللغات، رشحاتِ صفیر) لیکن انشا نے دریاے لطافت میں اِسے صرف مونث لکھا ہے (ترجمۂ دریاے لطافت ص ۲۵) اور آصفیہ میں بھی مونث ہے۔ شوق نیموی نے رسالۂ اصلاح میں لکھا ہے کہ پہلے یہ مذکر بھی آتا تھا " مگر اکثر فصحاے حال مونث ہی کے قائل ہیں " (ص ۲۱) اور اِس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جلال نے مفید الشعرا میں اِسے مونث ہی لکھا ہے۔ اِنھی وجوہ سے یہاں اِسے بہ تانیث مرجّح مانا گیا ہے۔

ص ۷۷۔س ۱۸ : ل میں یہ ٹکڑا اِسی طرح ہے۔ ن میں " صواب " کی جگہ " ثواب " ہے۔ " گناہ " کی رعایت سے بہ ظاہر " ثواب " بہتر معلوم ہوگا ؛ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہے کہ " ثواب " متضاد ہے " عذاب " کا ؛ یہ " گناہ " کا متضاد نہیں۔ اور " صواب " متضاد ہے " خطا " کا اور " خطا " کو " گناہ " سے جو نسبتِ قریب ہوسکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ [" صواب : خطا کا

نقیض ۔ راست، درست، جیسے : جواب باصواب ۔ راستی، درستی ۔ (۲) [ا : خوب، بہتر، بہتری" (آصفیہ)] اور ان معانی کے لحاظ سے یہاں "صواب" بے محل اور بے جوڑ نہیں معلوم ہوتا، چوں کہ معنوی مناسبت موجود ہے؛ اس بنا پر یہاں ل کے مطابق "صواب" ہی کو اختیار کیا گیا ہے۔

ص ۷۹ ۔ س ۴ : سب نسخوں میں "اساس" ہے ۔ "اساس" کے معنی ہیں : بنیاد، نیو ۔ اور "اثاث" کے معنی ہیں : گھر کا سامان (غیاث اللغات) ۔ اس عبارت میں "متاع"، "نقد"، "رونمائی" اور "نذر" جیسے الفاظ کے تلازمے کا یہ تقاضا ہے کہ "اثاث ہوش و حواس" ہو۔ "اساس" یہاں بے محل ہے؛ اس بنا پر "اثاث" کو اختیار کیا گیا ہے۔

اِس سلسلے میں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ سوداگر کی بیٹی اور انگریز کے معاشقے والی داستان میں بھی ایک جگہ یہ لفظ آیا ہے : "دیکھتے ہی متاعِ عقل، اثاثِ ہوش و حواس، گرہ سے کھو بیٹھا" (ص ۱۵۷) ۔ ح، م، ض، ف، ل میں اِس عبارت میں "اساس" ہے۔ البتہ ک میں "اثاث" ہے اور معنوی مناسبت کی بنا پر [کہ سب تلازمے تجارت اور مال و متاع کے آئے ہیں] اُس عبارت میں بھی (ک کے مطابق) "اثاث" ہی کو مرجح قرار دیا گیا ہے ۔ ص ۱۱۶ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں م کے علاوہ سب نسخوں میں "اساس" ہے ۔ وہاں بھی (م کے مطابق) "اثاث" لکھا گیا ہے۔

ص ۸۰ ۔ س ۱۸ : ک کے علاوہ اور سب نسخوں میں یہی ہے ۔ ک میں "افشانی پتھر" ہے۔ اگرچہ "افشانی کاغذ" کے قیاس پر "افشانی پتھر" بہ ظاہر مرجح معلوم ہوتا ہے، مگر معنوی طور پر دونوں طرح درست معلوم ہوتا ہے؛ اِس لیے "افشاں پتھر" ہی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

سنگِ افشاں یا افشاں پتھر غالباً وہی ہے جسے "سنگِ ابری" اور "سنگِ عجوبہ" بھی کہتے ہیں ۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں میں "سنگِ ابری" کے ذیل میں لکھا گیا ہے :

"میلے رنگ کا سفید یا ہلکا گلابی پتھر ۔ ساخت کے لحاظ سے اِس کا شمار سنگِ مرمر کی قسم میں ہے ۔ بعض پر مختلف رنگ کی بڑی بڑی چتیاں ہوتی ہیں ۔ یہ اعلیٰ درجے کی عمارتوں میں لگایا جاتا ہے اور نگینے بھی بنائے جاتے ہیں ۔ اِس کا دوسرا نام "سنگِ عجوبہ" ہے ۔"
(جلد اوّل، ص ۲۶)

ص ۹۰ ۔ س ۳ : لفظ "کتھنک" اِس جملے میں اِس طرح آیا ہے کہ بہ ظاہر نام معلوم ہوتا ہے، مگر

ایسا ہے نہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ کتھک کے جو بڑے بڑے اُستاد تھے، اُنھوں نے سم کھائے۔ [سرور کے یہاں ایسے کاواک جملوں کی کمی نہیں، اِس لیے یہاں بھی کسی طرح کا تعجب نہیں ہونا چاہیے] ص ۱۴۰ پر ایک جملہ ہے: "جا بہ جا ترپولیے اور نوبت خانے بنے، کتھک اتھک اُن پر ناچتے" اور اِس سے مکمل وضاحت ہو جاتی ہے۔

ص ۱۰۰- س ۸: یہاں "موسیٰ رضا" کے بجاے "علیِ رضا" ہونا چاہیے۔ "امام ضامن ثامن" کا نام علی ہے، رضا لقب ہے؛ اور آپ کے والد کا نام موسیٰ تھا اور کاظم لقب تھا؛ اِسی لیے امام ثامن (آٹھویں امام) کو "علیِ رضا" اور ساتویں امام یعنی آپ کے والد کو "موسیِٰ کاظم" کہا جاتا ہے۔

ص ۱۱۰- س ۸: یہاں "اُس کے وادیِ طلب میں" اور "اُس کی وادیِ طلب میں" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں "وادی" کو "مؤنث" لکھا گیا ہے لیکن جلال نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث مفید الشعرا میں اِسے مذکر لکھا ہے۔ نور اللغات میں بھی مذکر ہے، اُس میں "وادیِ ایمن" کی سند میں نوازش کا یہ شعر لکھا گیا ہے:

دل کو کس وقت خیالِ رُخِ روشن نہ ہوا ہم سے وحشت میں جدا وادیِ ایمن نہ ہوا

(یہ (غالباً) آغا خانی نوازش ہیں جو سرور کے اُستاد تھے) اِسی بنا پر (نثر اگر دے یہاں بھی) مذکر کو مرجح قرار دیا گیا ہے۔

ص ۱۱۴- س ۲: اِس جملے میں "آوارہ خانماں" اور "آوارۂ خانماں" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے، لیکن بغیرِ اضافت کو مرجح سمجھا گیا ہے اور اِس ترجیح کی وجہ محض یہ ہے کہ اِس کو "آوارہ وطن" پر قیاس کیا گیا ہے [مثلاً: رنجِ غربت کوئی آوارہ وطن سے پوچھے :: ہوش اُڑا دیتی ہے انساں کے ہواے غربت (خلیل۔ ماخوذ از امیر اللغات)]

ص ۱۲۰- س ۱۹: ک کے علاوہ سب نسخوں میں "وہ وادیِ پُرخطر میدان سراسر ضرر کو طے کر" ہے۔ ک میں "کو" موجود نہیں۔ اُس میں جملہ اِس طرح ہے: "وہ وادیِ پُرخطر میدانِ سراسر ضرر طے کر"۔ صاف ظاہر ہے کہ یہی صورت مرجح ہے اور اِسی بنا پر، یعنی صحتِ عبارت کے نقطۂ نظر سے، ک کے متن کو یہاں مرجح قرار دیا گیا ہے۔

ص ۱۲۶- س ۱۰: دیکھیے اِس ضمیمے کا آخری حصہ۔

ص ۱۲۷- س ۶ [کنٹرون میں عطرِ سہاگ، نہنگ پری: ایجادِ نصیر الدین حیدری، ارگجۂ محمد شاہی، فتنے کی بو چار سو] اِس عبارت میں خط کشیدہ الفاظ پر خط محض اِس لیے کھینچا گیا ہے کہ کسی طرح کا اشتباہ

نہ ہو، خاص کر "مہک پری" کی نسبت یہ نہ خیال کیا جائے کہ یہ صفت ہے "عطرِ سہاگ" کی۔ ک میں یہ جملہ اس طرح ہے: "کنٹروں میں سہاگ کا عطر اور مہک پری ایجادِ نصیر الدین حیدری۔ ارگجہ محمد شاہی۔ فتنے کی بو، مہک چار سو"۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس عبارت میں چار نام آئے ہیں: عطرِ سہاگ، مہک پری، فتنہ، ارگجہ۔ "ایجادِ نصیر الدین حیدری" کو 'مہک' کی بیانیہ صفت سمجھنا چاہیے؛ اسی لیے 'مہک' کے ساتھ بیانیہ کے نشان (:) کا اضافہ کیا گیا ہے۔

سرور کی کتاب شبستانِ سرور میں بھی ایک جگہ آخری تین نام آئے ہیں: "پھر عطر دان، پان دان آیا۔ ارگجۂ محمد شاہی، مہک پری ایجادِ نصیر الدین حیدری، فتنے کی بو باس نے فساد مچایا" (ص ۱۶)۔

ص ۱۳۷ - س ۷: اس عبارت میں "ارگجہ" کو مع اضافت اور بغیر اضافت دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ ض اور ف میں اضافت کا ہمزہ موجود ہے (ارگجۂ محمد شاہی) اس بنا پر اضافت کو مرجح سمجھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے ٹکڑے میں "ایجادِ نصیر الدین حیدری" کا تقابل بھی بہ ظاہر اسی کا متقاضی معلوم ہوتا ہے۔

یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ اس کا املا "ارگجہ" اور "ارگجا" دونوں طرح ملتا ہے۔ بہارِ عجم میں یہ لفظ موجود ہے اور بہ ہائے مختفی ہے۔ اس میں نعمت خانِ عالی کا یہ شعر سنداً مندرج ہے:

بیخودی تنگ در آغوشش کشید است مرا   آں قبا تا بر و دوش ارگجہ پوش آمدہ است

لیکن مولف نے یہ صراحت کر دی ہے کہ یہ لفظ ہندی نژاد ہے۔ غالباً اسی بنا پر امیر اللغات میں اسے "ارگجا" لکھا گیا ہے۔ رسالۂ معاصر (پٹنہ) کے حصۂ ۱۰ میں قاضی عبد الودود صاحب نے اس لفظ پر مفصل بحث کی ہے، مزید تفصیل کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں اضافت کی وجہ سے خاص کر اسے بہ ہائے مختفی لکھا گیا ہے اور یہ بات بھی ہے کہ اس کتاب کے سبھی نسخوں میں یہ ہائے مختفی ہے۔

ص ۱۳۹ - س ۸:
ص ۱۴۰ - س ۱:
ص ۱۴۰ - س ۶:
ص ۱۴۲ - س ۱۲:
ص ۱۴۲ - س ۱۶:
ص ۱۴۴ - س ۱۵:
ص ۱۴۴ - س ۱۶:

دیکھیے اس ضمیمے کا آخری حصہ۔

ص ۱۴۸ - س ۶: "بعد رسم چوتھی چالے کے"۔ "رسم" مونث ہے، اس کی نسبت سے یہاں "کی" آنا چاہیے، لیکن لفظ "بعد" (یا مثلاً لفظ "طرف") جب اس طرح پہلے آ جاتا ہے تو عموماً "کے" لکھتے ہیں۔ اس جملے کی نثر اس طرح ہوگی: "چوتھی چالے کی رسم کے بعد"۔ لفظ "بعد"

کو اگر مقدّم لایا جائے، جس طرح اِس عبارت میں ہے (بعد رسم ...) اُس صورت میں "کے" آئے گا (بعد رسم چوتھی چالے کے)۔ صاحبِ نور اللغات نے لفظِ "طرف" کے ذیل میں اِس قاعدے کی طرف اشارہ کیا ہے، اُنھوں نے لکھا ہے:

"یہ لفظ مونّث ہے؛ اگر اِس لفظ کو موخر کر دو تو کہیں گے: قبلے کی طرف۔
اور اگر مقدّم کر دو، تو کہیں گے: طرف قبلے کے۔"

اِسی قاعدے کے تحت یہاں "کے" رکھا گیا ہے۔

ص ۱۴۹۔س ۵: "باغبانیاں" کے لحاظ سے اِس عبارت میں بہ ظاہر "آفت کی پرکالہ" ہونا چاہیے؛ لیکن فسانۂ عجائب کے سب نسخوں میں یہاں "آفت کا پرکالہ" ہے؛ اِس بنا پر اصل متن کو برقرار رکھا گیا ہے۔

ص ۱۴۹۔س ۸: "چہ کارہ" کے معنی ہیں: بے کار، جس کی کوئی حیثیت نہ ہو (اور یہاں یہی معنی مراد لیے گئے ہیں):

"چہ پیشہ: مرادفِ چہ کارہ۔ رفیع واعظ:

آنجاکہ صبرِ ماست، بلا ہا چہ پیشہ اند جائیکہ دردِ اوست، بلاہا چہ کارہ است"

(بہارِ عجم)

اور "چکارا" ہرن کی ایک قسم ہے۔ یہاں "آہو" کی رعایت سے "چہ کارہ" بہ طورِ ایہام آیا ہے۔ اِس کتاب کی اشاعتِ اوّل (ح) میں آخرِ کتاب میں ایک طویل نثر شرف الدّولہ کی مدح میں ہے (جس کو ضمیمہ ۱ میں نقل کر دیا گیا ہے) اُس میں بھی ایک جگہ "چہ کارہ" اِسی مفہوم میں آیا ہے: "چشم وہ کہ جس کا ہم چشم عنقا ہے، غزالِ رعنا چہ کارہ ہے"۔

ص ۱۵۴۔س ۱۴: "شب کو نالہ تھا، دن کو زاری تھی۔ دن رات اُس پر سخت بھاری تھے"۔ اِس طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اِس عبارت میں بھی قافیۂ مکتوبی کی کار فرمائی ہے [زاری تھی۔ بھاری تھی] ظاہر ہے کہ اب پہلے جملے میں "تھی" رہے گا اور دوسرے جملے میں "تھے" رکھا جائے گا۔

ص ۱۵۷۔س ۲: م میں لفظ "توس" پر درجِ ذیل حاشیہ لکھا ہوا ہے:

"توس، بواوِ مجہول، لفظِ انگریزیست۔ پارۂ نانِ پاد مکھن آلودہ را گویند"۔

ص ۱۵۷۔س ۱۳: "دِن دیے لُٹ گیا عشق کا بیوپاری"۔ ن میں "دن دیے" کی جگہ "دن دہاڑے"

ہے۔ غالباً مطبع والوں نے اِس قدیم لفظ کو یہ سمجھ کر بدل دیا کہ یہ بے معنی ہے۔ یا پھر اس کو متروک سمجھ کر، جملے کو زبانِ حال کے مطابق بنانا چاہا۔ نور اللغات میں یہ لفظ نہیں، لیکن فرہنگِ آصفیہ میں موجود ہے اور فاربس اور فیلن کے لغات میں بھی ہے۔

ص ۱۵۸۔س ۳ : آصفیہ و نور دونوں میں "پند" کو مؤنث لکھا گیا ہے؛ سننے میں بھی اِسی طرح آیا ہے؛ لیکن سرورؔ نے اِسے بہ تذکیر استعمال کیا ہے۔ شبستانِ سرور میں بھی ایک جگہ یہ بہ تذکیر ملتا ہے : "بہت جلد پند پدر پیر بھلایا ' اسراف میں ہاتھ بڑھایا" (جلد سوم، ص ۱۶)۔

ص ۱۷۸۔س ۴ : "بان ' پٹے سونڈوں میں چڑھے"۔ فحوائے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ "بان" اور "پٹے" دونوں آرائشی اشیا ہیں۔ ص ۲۵۶ پر بھی "پٹے" آیا ہے : "پٹے سونڈوں میں چڑھے"۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "بان" اور "پٹے" دو مختلف لفظ ہیں اور دونوں عام آرائشی اشیا یا جنگی ہاتھیوں کی آرائش سے متعلق اشیا کے نام ہیں۔

پٹے ' پیٹے ، پٹی ، پٹّی : اِس لفظ کی یہ چاروں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کوشش کے باوجود میں اِس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا۔ میں نے کئی پرانی ریاستوں میں یہ کوشش کی کہ کسی پرانے مہاوت سے یا کسی اور صاحب سے اِس سلسلے میں کچھ معلوم ہو سکے، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

ص ۱۷۸۔س ۷ : سابق ریاستِ گوالیار کے ہیڈ فوجدار (مہاوت) مراد خاں نے بتایا کہ : "حالتِ مستی میں ہاتھی کے کانوں کے پاس دونوں جانب ایک ایک سوراخ سے پانی ہر وقت ٹپکتا رہتا ہے۔ تیسری جگہ سونڈ ہے، جہاں سے لعاب یا رال، تھوک، پھین وغیرہ ٹپکتا ہے۔ چوتھی جگہ پیشاب گاہ، کہ تھوڑا تھوڑا پیشاب ٹپکتا رہتا ہے"۔

[مراد خاں کی عمر نوے سال کے قریب ہوگی۔ یہ معلومات عزیزم صغیر احمد انصاری ایم۔ اے کے توسط سے مجھ تک پہنچی ہیں جو آج کل گوالیار میں مقیم ہیں]

ص ۱۸۱۔س ۴ : "چینے جو دشمنوں کا بُرا چیتے ' بلکہ لہو پیتے۔ سیاہ گوش در آغوشِ ہرن لڑنے والے خانہ زاد گھر کے پالے"۔ اِس عبارت میں "سیاہ گوش در آغوشِ ہرن" الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔ اِس سے کیا مراد ہے، یہ واضح نہیں۔ یہاں "شکار کے سامان" کا بیان ہو رہا ہے جیسے "میر شکار لائے" میں، اِس لیے ہرن کا الگ سے ذکر تو مطلقاً بے جوڑ ہوگا۔ مرادِ مصنف غالباً یہی ہے کہ ایسے سیاہ گوش، جو ہرن کو بہ آسانی گرفت میں لے سکیں۔ "خانہ زاد" اور "گھر کے پالے" انھی کی صفت کے طور پر آئے ہیں، یعنی سدھائے ہوئے اور تربیت

پائے ہوئے۔ اِس سے پہلے چیتے کا بیان ہے اور ہرن کے شکار کے لیے چیتوں کو سدھایا جاتا تھا۔ شیرانی صاحب نے لکھا ہے :

"اکبری عہد سے قبل چیتے کے شکار میں قاعدہ تھا کہ ہرن پر بہ یک وقت ایک ہی چیتا چھوڑا جاتا تھا... اکبر نے اِس میں یہ اضافہ کیا کہ دس دس بیس بیس چیتوں کو لے کر، انھیں الگ الگ گھات کے مقامات میں بٹھا دیا۔ جب ہرنوں کا گلّہ زد میں آیا، اُس وقت چاروں طرف سے چیتے اُن پر چھوڑ دیے گئے" [مقالاتِ شیرانی، جلدِ دوم، ص ۱۳]

مصنف کی مراد غالباً یہ ہے کہ اِسی طرح سیاہ گوش تیار کیے گئے تھے۔ [اِس میں خوبی گویا یہ ہوئی کہ سیاہ گوش جو چیتے کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہوتا ہے، وہ چیتے کی طرح کام کرتا ہے] عبارت میں بہ ہر طور کچاپن ہے، لیکن یہ عیب اور اِس طرح کا کاواک پن تو اِس کتاب میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے، اِس لیے اِس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

ص ۱۸۲۔س ۹ : "کمخواب کے مرزائی، انگرکھے" دیباچۂ کتاب میں (ص ۱۹) "مرزائی" بہ تذکیر آیا ہے : "جب بڑا تکلف کیا، گاڑھے کا مرزائی پہن لیا"۔ اِسی نسبت سے یہاں بھی "کمخواب کے مرزائی" لکھا گیا ہے۔ ["انگرکھے" بہ طورِ جمع اِس ٹکڑے میں جس طرح آیا ہے، اُس سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ "مرزائی" بھی بہ طورِ جمع ہونا چاہیے]۔

ص ۱۸۲۔س ۱۳ : یہ صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ "چقماقی بندوق" قدیم ساخت کی سنگِ چقماق سے چلائی جانے والی بندوق کو کہتے تھے۔ اِس کے گھوڑے کے منہ میں چقماق کا پتھر لگا ہوتا تھا (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں جلدِ ششم) لفظِ "چقماق" یہاں اِسی کے لیے آیا ہے اور اِس خیال سے کہ کسی طرح کا اشتباہ نہ ہو، لفظِ "رفل" کے بعد بیانیہ کے نشان (:) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ شبستانِ سرور میں بھی ایک جگہ یہ لفظ اِسی معنی میں آیا ہے :

سینگڑے، ساز سب مرصّع کار
برق چقماق، قہر توڑے دار (ص ۹۸)

ص ۲۰۲۔س ۴ : "محلسرا" کو بالعموم بہ تانیث استعمال کیا گیا ہے، آصفیہ و نور میں بھی اِس کو مونث ہی لکھا گیا ہے، لیکن سرور نے اِسے استعمالِ عام کے خلاف بہ تذکیر استعمال کیا ہے۔ سرور کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور میں بھی ایک جگہ یہ لفظ اِسی طرح آیا ہے : "بہ صنعت اپنے مکان پر لایا، محلسرا سجا سجایا فوراً خالی ہوا، اُس میں اُتارا"۔ (شبستانِ سرور، جلدِ دوم

ص ۱۸۹) اور اس مثال سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے اس لفظ کو بہ تذکیر ہی استعمال کیا ہے۔

ص ۲۲۸-س ۵ : سرور نے فسانۂ عبرت میں نصیر الدین حیدر کی موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" القصہ جب دفن سے فرصت پائی، خلقت پھر کر اپنے گھر آئی۔ پھر کسی نے یاد نہ کیا، دعائے مغفرت سے شاد نہ کیا، آنکھ چرائی۔ ...... بیبیاں موجود تھیں، کسی کو مطلق نہ خیال ہوا، دو روز بھی ایک کو نہ ملال ہوا۔ زیادہ افشائے راز کرنا داب تحریر سے بعید ہے، وگرنہ کوچہ و بازار میں اسی کی گفت و شنید ہے۔" [فسانۂ عبرت، مرتّبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، ص ۲۰]

ص ۲۲۸-س ۱۷ : سرور نے اپنی کتاب فسانۂ عبرت میں محمد علی شاہ کی موت کے سلسلے میں لکھا ہے :

"طلسم خانۂ دنیا عجیب جا ہے .... جیتے جی لطفِ تخت و سریر ہے، تمیز پلاس و حریر ہے۔ بعدِ مرگ جب گردشِ گنبدِ بے ستوں نے مقبرہ ڈھایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا، تو اتنا بھی کوئی بتانے نہ آیا کہ یہ صاحبِ تاج تھا، یا مفلس محتاج تھا۔ اور اتنی تمیز نہ کر سکا کہ گورِ شاہ یا مزارِ فقیر ہے، مدفن نوجوان یا پیر ہے .... تا زیست فکرِ سیم و زر میں رہے، تلاشِ لعل و گہر میں رہے، مگر جو دیا وہ پایا، جمع کیا ہوا ہاتھ نہ آیا ..... سرِ پُر غرور نے محتاجوں کے پاؤں کی ٹھوکر کھائی ..... مگر اہلِ حرص کو عبرت نہ آئی۔"

[فسانۂ عبرت، مرتّبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، ص ۵۷]

ص ۲۲۹-س ۶ : بہ ظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ " مقبروں " سے مراد ہے نواب سعادت علی خاں اور اُن کی بیگم کے مقبروں سے، جو قیصر باغ سے شمال کی جانب بنے ہوئے ہیں۔ ان کو غازی الدین حیدر نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ بہت شان دار اور مرعوب کرنے والی عمارتیں ہیں۔

ص ۲۵۴-س ۵ : "پیٹے سونڈوں میں چڑھے" اِس سلسلے میں دیکھیے حاشیہ ص ۱۷۸۔

ص ۲۵۶-س ۸ : اِس عبارت میں توپوں کا ذکر ہے: "فلک شکوہ، شعلہ دہان، آتش نشان" بہ ظاہر یہ سب صفاتی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ "سورج جھنکار" اگر کسی توپ کا نام ہے، تو مجھے اُس کا علم نہیں۔ یہی صورت "نانک متے" کی ہے۔ "نانک متہ" ایک مقام کا نام ہے، غالباً اُس کی نسبت سے یہ لفظ بھی بہ طورِ صفت آیا ہے۔ یہ چوں کہ پہاڑی مقام ہے اِس لیے یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ مصنف نے یہاں بلندی تک مار کرنے والی یا دور تک گولہ پھینکنے والی توپ مراد لی ہے۔ "نانک متے کے پتے کی" سے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ کسی

توپ کا بھی نام ہے، تو مجھے اِس کی خبر نہیں۔

"نانک متہ" نام کا ایک گرودوارا پیلی بھیت کے قریب ہے۔ پہلے اِس کا نام "گورکھ متہ" تھا۔ [یہ اصلاً "مٹھ" ہوگا، پٹھانوں کی زبانوں پر "متہ" بن گیا]۔ نانک متہ کا نام تاریخوں میں ملتا ہے۔ نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں لکھا ہے:

"حافظ رحمت خاں ترائی کی طرف چلے گئے اور نانک متے میں جا پہنچے، جو پہاڑ کے دامن میں ہے اور پیلی بھیت سے شمال کی جانب بارہ کوس کے فاصلے پر ہے.... اہل و عیال کو گنگا پور کے جنگل میں، جو نانک متے سے پانچ کوس کے فاصلے پر پہاڑ کی جانب ہے، بھیج دیا۔" (اخبار الصنادید۔ جلدِ اول، ص ۷۰۰) تاریخ اودھ جلدِ سوم میں بھی اِس مقام کا ذکر آیا ہے، جب حافظ رحمت خاں کے لڑکے حرمت خاں نے پیلی بھیت کو فتح کرنا چاہا ہے اور آصف الدّولہ کی فوج سے شکست کھاکر "نانک متے کے جنگل میں، جو دامنِ کوہ میں واقع ہے، چلا گیا" (ص ۱۴۳)۔

بھائی کاہن سنگھ کا مرتب کیا ہوا مہان کوش سکھوں سے متعلق قاموس کی حیثیت رکھتا ہے، اُس میں اِس مقام کے بارے میں لکھا ہے کہ: "یوپی میں ضلع نینی تال، تحصیل ستار گنج میں پیلی بھیت سے ۸ میل شمال مغرب میں یہ گردوارا، ریلوے اسٹیشن کھٹیما سے دس میل مغرب کی طرف ہے۔ پہلے اس کا نام، گورکھ پنتھیوں کے رہنے کے سبب "گورکھ متہ" تھا۔ لیکن جب سے شری گرو نانک دیو نے گورکھ ناتھ کے چیلے جھنگر ناتھ، بھنگر ناتھ وغیرہ کو.... گیان دیا، تب سے اِس کا نام "نانک متہ" ہے۔ (مہان کوش ص ۶۹۴) [مہان کوش کے اقتباس کا یہ ترجمہ جناب عابد پیشاوری نے ارسال کیا تھا، اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اِس کی نشان دہی بھی اُنھی نے کی تھی]

ص ۲۵۶۔س ۹ : "اور غباری، جس کا گولہ قصرِ چرخ میں اُتارے"۔ "غباری" کو بہ ظاہر "غبارے" بھی پڑھا جاسکتا تھا، لیکن "غباری" کو یہاں پر درست سمجھا گیا ہے، اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ "غباری" نواب آصف الدّولہ کی ایک توپ کا نام تھا۔ نجم الغنی خاں نے تاریخ اودھ میں نواب غلام محمد خاں والیِ رام پور اور آصف الدّولہ کی جنگ (جنگِ دوجوڑا) کے بیان میں آصف الدّولہ کی کچھ توپوں کے نام بھی درج کیے ہیں، اُن میں ایک نام "غباری" بھی ہے (تاریخ اودھ، جلدِ سوم، ص ۳۰۸) چوں کہ اِس عبارت میں توپوں کا بیان ہو رہا ہے، اِس بنا پر "غباری"

کا محل ہے (جو ایک توپ کا نام ہے) "غباری" اور "آتارے" میں قافیہ مکتوبی کی رعایت ہے۔ (اِس کا بیان اِس سے پہلے آچکا ہے)۔

ص ۲۵۸۔ س ۷ : "طعن" آصفیہ میں مذکر ہے۔ مولفِ نوراللغات نے وضاحت کی ہے کہ: "دہلی میں مذکر، لکھنؤ میں مونث"۔ جلال نے بھی مفید الشعرا میں اِسے مونث لکھا ہے، اِس سے مولفِ نوراللغات کی تائید ہوتی ہے؛ اسی بنا پر "تیرے کی طعن" لکھا گیا ہے۔

ص ۲۶۰۔ س ۸ : یہاں بہ ظاہر "دف دہنے اور جھانجھ بجنے لگی" کا محل معلوم ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ صفیر بلگرامی نے رشحاتِ صفیر (ص ۶) میں لکھا ہے، اساتذہ نے کبھی کبھی اِس کے خلاف بھی کیا ہے، مثلاً:

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں (غالب)

یعنی ایسی صورت میں فعل کو بہ صورتِ جمع لائے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی "دف دہنے اور جھانجھ بجنے لگے" لکھا جا سکتا ہے۔ اور اِس خاص صورت کو یہاں مرجح قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح اگلے جملے (آدھر کوس و کورگر جنے لگے) سے مکمل مناسبت کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور یہ قرینہ اِس مقام پر جواز کے لیے کافی معلوم ہوتا ہے۔

ص ۲۷۲۔ س ۶ : اِسے "کھاردے کی جھنڈی" بھی پڑھا جا سکتا ہے، لیکن مرجح "جھنڈے" ہے۔ اِس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ مٹھ یا مندر پر جھنڈا لگایا جاتا ہے، اُسے "جھنڈی" کبھی نہیں کہا جائے گا۔ "جھنڈی" دوسری چیز ہے۔ "کلمۂ شہادت ... اُس پر لکھا" میں "اُس" کا مشارٌ الیہ "گنبد" ہے۔ یعنی گنبد پر کلمۂ شہادت لکھا ہوا تھا۔ مٹھ اور مندروں کے گنبد پہ سامنے کی طرف" اوم" یا ایسا ہی کوئی اور کلمہ لکھا جاتا ہے، یا کوئی مذہبی نشان بنایا جاتا ہے۔ گنبد کے اوپر (کلس کے ساتھ) ترسول اور کھاروے کے جھنڈے، مندر و مٹ کی علامت تھے اور گنبد پر (دروازے سے ذرا اوپر، سامنے کی طرف) کلمۂ شہادت اسلام کی علامت کے طور پر لکھا ہوا تھا۔

ص ۲۷۲۔ س ۱۳ : اِس جملے میں "چشمِ حاسد کے گزند" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "چشمِ حاسد کی گزند" بھی پڑھ سکتے ہیں، کیوں کہ لفظِ "گزند" بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے (نوراللغات)۔ یہاں تانیث کو مرجح قرار دیا گیا ہے، اِس بنا پر کہ (۱) اِسی کتاب میں "برادرانِ توام" کے قصے میں ایک جگہ واضح طور پر بہ تانیث آیا ہے: "اِلّا رسنِ حیات مضبوط تھی، نہ گزند پہنچے

کی پہنچی، نہ چوٹ چپیٹ گرنے کی لگی"۔ (۲) سرورؔ کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور میں بھی یہ لفظ اِسی طرح آیا ہے: "دیر تک صدائے مبارک باد بلند رہی، لیکن سب کے دلوں میں گزند رہی" (جلدِ سوم، ص ۳۳)۔ ایک اور جملہ ہے: "ملک سے بھی آمد بند ہوئی، ہر طرح کی گزند ہوئی" (ایضاً، ص ۱۶)۔

اِس سلسلے میں جلالؔ کا ایک قول نقل کرنا بھی غیر مناسب نہ ہوگا۔ جلالؔ نے مفید الشعراء میں لفظِ "گزند" کے ذیل میں لکھا ہے: "اور "گزند" مختلف فیہ ہے ... لیکن حق یہ ہے کہ اکثر فصیح اِس کی تانیث ہی کے قائل ہیں اور مولّف کے عندیے میں بھی مونث ہے"۔

ص ۳۰۰ - س ۱۲: یہاں "سفرِ سخت" بھی پڑھا جاسکتا ہے، لیکن دوسرا ٹکڑا "نازک مسافر" بغیر ترکیب آیا ہے، اِس بنا پر بہ ظاہر حُسنِ عبارت کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِسے بھی بغیر ترکیب پڑھا جائے۔

ص ۳۰۵ - س ۱۳: اِس جملے میں پیشِ نظر سبھی نسخوں میں "لالی بے رنج و ملال ہو رہا" ہے۔ یہ ظاہر یہ کتابت کی غلطی ہے، جس کی تکرار ہوتی رہی۔ باغ میں "باغبانیاں" سرگرمِ کار ہیں، اُنھی کا بیان ہے۔ اُنھی کے لیے "لیلی والی" (رہٹ چلانے والی) آیا ہے اور اِس نسبت سے لازماً "ہو رہی" ہونا چاہیے۔ اِسی بنا پر یہاں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے اور "ہو رہی" لکھا گیا ہے۔ اِس کے بعد جو جملہ ہے، اُس میں ف کے علاوہ سب نسخوں میں "ہو رہا" ہے۔ یہ بھی غلطیِ کتابت ہے، جس کی تکرار ہوئی ہے۔ ف میں "ہو رہی" ہے اور یہی درست ہے۔ بعد کے جملوں میں فعل مونث ہی آیا ہے اور اِس سے صورتِ حال کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ص ۳۱۷ - س ۱۲: لفظ "مع" اصلاً مَعِ اضافت ہے، البتہ بول چال میں یہ اِس طرح آتا ہے کہ اضافت کا زیر ظاہر نہیں ہوتا۔ نور اللغات میں واجد علی شاہ کا یہ شعر سنداً لکھا گیا ہے:

القصّہ بہ ایں تکلّف و اوج　　راہی ہوا اُس طرف مَعِ فوج

اِس سے بہ لحاظِ قواعد جو صورتِ حال ہے، وہ سامنے آجاتی ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ جہاں یہ لفظ عربی فارسی الفاظ کے ساتھ آیا ہے (جیسے زیرِ بحث مقام پر آیا ہے) تو عَ پر اضافت کا زیر لگایا گیا ہے (اگرچہ تلفّظ میں یہ زیر نمایاں نہیں ہوگا) اور جہاں غیر عربی فارسی الفاظ کے ساتھ آیا ہے، وہاں زیر نہیں لگایا گیا (جیسے

"وہ مکڑا مع سانپ آسمان پر پہنچا" (ص ۱۶۳)۔

ص ۳۲۲۔ س ۴ : "ایک مرد صاحب جمال، دوسری عورت پری تمثال" اِس عبارت میں دو باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے : (۱) پہلے جز میں "مردِ صاحب جمال" بھی پڑھا جا سکتا ہے، لیکن پھر دوسرے ٹکڑے میں حُسنِ تناسب کا تقاضا ہوگا کہ "عورتِ پری تمثال" پڑھا جائے اور یہ حُسنِ بیان اور حُسنِ عبارت کے لحاظ سے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں اجزا کو بغیرِ اضافت پڑھا جائے اور مفہوم اِس طرح متعیّن کیا جائے کہ "ایک مرد جو صاحب جمال ہے اور دوسری عورت جو....." بہ لحاظِ قواعد یہ بالکل صحیح اور بہ لحاظِ روزمرّۂ اُردو یہ فصیح ہے، اِس لیے اِسی کو ترجیح دی گئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ لفظِ "صاحب" یہاں بغیرِ اضافت مرجّح سمجھا گیا ہے۔ اِس میں بھی "پری تمثال" کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ لفظِ "صاحب" کی صورت یہ ہے کہ وہ مع اضافت اور بغیرِ اضافت دونوں طرح آسکتا ہے (صاحبِ دل۔ صاحب دل) بلکہ صاحبِ غیاث اللغات نے تو یہ لکھا ہے کہ "صاحب" مقطوع الاضافت ہے اور بیشتر بغیرِ اضافت آتا ہے۔ بہرصورت یہاں بہ لحاظِ قواعد "صاحبِ جمال" اور "صاحب جمال" دونوں بالکل صحیح اور فصیح ہیں۔ ایک صورت کو ترجیح محض حُسنِ عبارت اور حُسنِ تناسب کے لحاظ سے دی گئی ہے۔

ص ۳۲۶۔ س ۱۶ : "لُنجوں نے بٹیر پکڑے" ن میں "بٹیر پکڑی" ہے۔ لفظ "بٹیر" بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مشترک الفاظ میں سے ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں اِسے "اسم مونّث و مذکّر" لکھا گیا ہے۔ صاحب نور اللغات نے لکھا ہے کہ : "دِلّی میں مونّث، لکھنؤ میں مذکّر و مونّث دونوں طرح بولتے ہیں" لیکن یہ درست نہیں کہ دلّی میں (صرف) مونّث ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے "بٹیر بازی" کے تحت جو طویل عبارت لکھی ہے، اُس میں ہر جگہ بٹیر کو مذکّر لکھا ہے، مثلاً: "جتنے بٹیر جال میں پھنس گئے، پکڑ لیے" (وغیرہ)۔ البتہ جمع کی صورت میں "بٹیریں" بھی لکھا ہے۔ جلال نے مفید الشعرا میں اِسے صرف مذکّر لکھا ہے۔ دلّی اور لکھنؤ دونوں جگہ استعمال میں بیش تر یہ تذکیر رہا ہے اور اِسی نسبت سے یہاں "بٹیر پکڑے" لکھا گیا ہے۔ اِس جملے میں فاعل "لُنجوں" ہے اور اُس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں "بٹیر پکڑے" لکھا جائے۔

ص ۳۳۰-س ۳ : جناب حامد اللہ ندوی کا ایک مضمون بعنوانِ "بی بی ارواح" مجلۂ شیرازہ (کشمیر) کے شمارہ جون۔ جولائی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے، جس میں مقالہ نگار نے "بی بی ارواح" نام کی ایک مثنوی کا تعارف کرایا ہے۔ اُن کی صراحت کے مطابق اِس کا واحد خطی نسخہ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مثنوی دو سو ساٹھ (۲۶۰) ابیات پر مشتمل ہے۔ شاعر کا نام "محمد شفیع ابن عبدالعزیز" ہے۔ اِس مثنوی میں یہی "نقلِ عبرت خیز" حکایت کے طور پر نظم کی گئی ہے۔ تفصیلات میں کچھ اختلاف ہے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ شاعر نے "اس کو بڑودہ میں مکمل کیا ہے .... اور یہ قصہ اُس نے روضۃ العلماء سے لیا ہے۔"

اضافے :

ص ۱۸-س ۱۹ : "شیر چائے" مشہور کشمیری چائے ہے۔ (چائے کی پتی سبز ہوتی ہے، یہ چائے بہت اہتمام کے ساتھ بنائی جاتی ہے اور اس میں بہت وقت لگتا ہے) لکھنؤ میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے کشمیری الاصل لوگ اچھی خاصی تعداد میں تھے [وہاں ایک محلّے کا نام ہی "کشمیری محلّہ" ہے] اور سرور نے برق کے مشاعرے میں "شیر چائے" کا جس طرح ذکر کیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں بھی اِس کا رواج تھا۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے اطلاع دی ہے کہ لکھنؤ میں پہلے کی طرح اگرچہ اب اس کا رواج نہیں، مگر خاص خاص تقریبات میں اب بھی یہ چائے پلائی جاتی ہے۔

ص ۲۲-س ۱۷ : اِس مطبع کا نام محمدی تھا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور مطبع تھا۔ صبا لکھنوی کا دیوان غنچۂ آرزو اسی مطبع میں بہت اہتمام کے ساتھ رجب ۱۲۷۰ھ میں چھپا تھا۔ سرور کی کتاب شگوفۂ محبت بھی یہیں چھپی تھی۔ غنچۂ آرزو پیشِ نظر ہے، لیکن شگوفۂ محبت میں نے نہیں دیکھی۔ مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے اپنے ایک مقالے میں اِس کا حوالہ دیا ہے (مشمولہ مجلۂ اکادمی (لکھنؤ) جلد ۱ شمارہ ۳) اِس مقالے میں مولانا نے مولوی محمد یعقوب انصاری کا اور اُن کے اخبارات کارنامہ اور طلسمِ لکھنؤ کا مفصّل تعارف کرایا ہے۔

مطبعِ محمدی کے بارے میں مولّفِ اخترِ شہنشاہی نے لکھا ہے :

"محمدی، لکھنؤ، محلّہ فرنگی محل، مالک محمد یعقوب انصاری، اجرا ۱۸۵۷ء" (ص ۲۲۳)

لیکن یہ سنہ درست نہیں، اِس بنا پر کہ اِس مطبع سے اِس سے پہلے کی چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں (غنچۂ آرزو۔ شگوفۂ محبت)۔ اخترِ شہنشاہی میں متعدد مقامات پر سنین کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، اور یہ مقام بھی انھی میں سے ایک ہے۔ مولانا رضا انصاری نے اپنے مذکورہ مقالے میں لکھا ہے :

"سرور کی کتاب شگوفۂ محبت جو مطبعِ محمدی واقع فرنگی محل سے شائع ہوئی تھی، اس کا سالِ طباعت اگرچہ

۱۸۵۶ء ہی ہے، لیکن طلسم لکھنؤ کے اجرا سے قبل کی تاریخ ہے یعنی شعبان ۱۲۷۲ھ (مطابق اپریل ۱۸۵۶ء) گویا انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے صرف دو مہینے بعد مطبعِ محمدی کا وجود ملتا ہے۔ کب عالمِ وجود میں آیا؟ نوابی میں کہ انگریزی میں؟ اس کا قطعی ثبوت ابھی تک فراہم نہیں ہو سکا۔"

میں عرض کروں کہ صبا کے دیوان غنچۂ آرزو کے آخر میں تاریخ طباعت لکھی ہوئی ہے: "بتاریخ بست و پنجم شہر رجب ۱۲۷۲ہجری بمطبع محمدی زینت طبع یافتہ"۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطبع نوابی میں عالمِ وجود میں آیا تھا، البتہ سنہ اجرا کا علم نہیں۔ نیز اسی سلسلے میں دیکھیے ص ۲۴ سطر ۱۳ کا حاشیہ۔

ص ۲۳۔ س ۱۳: "گردشِ تقدیر" سے مراد (غالباً) واقعاتِ ۱۸۵۷ء سے ہے۔ سرور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے زمانے میں یہ مطبع (مطبعِ محمدی) بند ہو گیا تھا یا تباہ ہو گیا تھا۔ غدر کے بعد مولوی صاحب نے طباعت کا کام پھر شروع کرنا چاہا ہوگا۔ سرور نے جو لکھا ہے کہ "دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغلِ پارینہ منظور ہوا، پہلے عزم فسانۂ سرور ہوا" (دیباچۂ فسانۂ عجائب ص ۲۴) اس سے یہی مراد ہے کہ مولوی صاحب نے غدر کے بعد مطبع پھر جاری کیا اور پہلے سرور کی کتاب فسانۂ عجائب کو چھاپنا چاہا اور سرور سے فرمائش کی کہ وہ اس پر نظرِ ثانی کریں۔ سرور نے اقرار کر لیا "انکار گوارا نہ ہوا" (ایضاً)۔ فسانۂ عجائب کا یہ اڈیشن ۱۲۷۶ھ میں مطبعِ افضل المطابع محمدی کانپور میں چھپا تھا۔ سرور نے اس اڈیشن کی عبارتِ خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے: "الحاصل فسانۂ عجائب...... جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع شہر کانپور میں چھاپا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد مولوی صاحب نے پہلے کانپور میں طباعت کا کام شروع کیا تھا اور اپنے پرانے مطبع "محمدی" کی نسبت سے نئے مطبع کا نام "افضل المطابع محمدی" رکھا تھا۔

سرور نے مولوی صاحب کی فرمائش پر اس کے بعد ایک بار پھر فسانۂ عجائب پر نظرِ ثانی کی۔ خاتمۂ کتاب میں شامل سرور کی تحریر کے مطابق یہ نسخہ "ستائیسویں رمضان ۱۲۸۰ھ شہر لکھنؤ محلہ فرنگی محل افضل المطابع میں چھپ کر منظورِ نظر ہوا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرنگی محل میں بھی "افضل المطابع" کے نام سے مطبع جاری کیا تھا۔ اس وقت کانپور والا مطبع باقی تھا یا نہیں، اس کا حال مجھے معلوم نہیں۔ مولوی صاحب کا ایک اور مطبع نجم العلوم کے نام سے بھی لکھنؤ میں تھا جہاں اُن کا ہفتہ وار اخبار کارنامہ چھپا کرتا تھا۔ میں فی الوقت یہ نہیں کہہ سکتا کہ افضل المطابع ہی کا نام بدل کر نجم العلوم ہو گیا تھا یا یہ دو مختلف مطبعے تھے۔

ص ۱۳۶۔ س ۱۸: "نکاح کے دن سے چند روز پہلے دلھن مانجھے بٹھا دی جاتی ہے جب کہ اُسے مانجھے کا زرد جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ اس وقت سے روز اُس کے اُبٹنا لگتا ہے اور بجز خاص ضرورتوں کے وہ پردے سے باہر نہیں نکلتی۔ جس دن وہ مانجھے بیٹھتی ہے اُسی روز رسم ہے کہ اُس کا جھوٹا بٹنا، اس کی جھوٹی مہندی.... اور بہت سی سینیاں ایک شان دار

جلوس اور باجے کے ساتھ دولھا کے گھر بھیجی جاتی ہیں۔ جو پینڈیاں خاص دولھا کے لیے ہوتی ہیں، وہ جداگانہ خوانوں میں ممتاز و مخصوص ہوتی ہیں۔ انھی کے ساتھ دولھا کے لیے مانجھے کا زرد جوڑا... بھی ہوتا ہے۔"
(عبدالحلیم شرر: گذشتہ لکھنؤ)

"کم سے کم سوا سو، زیادہ سے زیادہ پانچ سو پینڈیوں کے ساتھ مع سامانِ دیگر دولھا کے ہاں .... بھیجا جاتا ہے.... یہ سامان ہوتا ہے: کٹورا، تشتری، سلپچی، آفتابہ، لوٹا، تغیڑا.... گیارہ رومال، نہانے کی چوکی، سوزنی، دو لنگیاں .... تیل یعنی پھلیل کی شیشی، چادر وغیرہ۔" (سیّد احمد دہلوی: رسومِ دہلی)

ص ۱۳۹۔ س ۸: "مانجھے کے دس بارہ روز سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد اُسی شان و شوکت اور جلوس کے ساتھ دولھا کے گھر سے دُلھن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا ہے .... اور وہ زیور ہوتا ہے جس کو پہنا کر وہ رخصت کی جائے گی اور پھولوں کا گہنا ہوتا ہے ...." (عبدالحلیم شرر: گذشتہ لکھنؤ) رسومِ دہلی اور گذشتہ لکھنؤ میں مزید تفصیلات موجود ہیں۔

ص ۱۴۰۔ س ۱: "ساچق کے دوسرے ہی روز شب کو دُلھن کے گھر سے بڑے جلوس اور روشنی کے ساتھ مہندی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ غالباً یہ عربی الاصل رسم ہے۔ اِس میں دراصل دلھن والوں کی طرف سے دولھا کے لیے وہ جوڑا جاتا ہے جسے پہن کر وہ بیاہنے کو آئے گا۔ اس جوڑے میں علی العموم قدیم عہدِ مغلیہ کی درباری وضع کا خلعت، شملہ، جیغہ، سرپیچ اور مرصّع کلغی ہوتی ہے.... اِس جوڑے کے ساتھ دولھا کے لگانے کے لیے پسی ہوئی تیار مہندی بھی بھیجی جاتی ہے جس کو بہت سے طباقوں میں پھیلا کے رکھتے ہیں اور اس میں سبز و سرخ شمعوں کو نصب کر کے روشن کر دیتے ہیں، اس طرح مہندی کے بہت سے طباق روشن ہوتے ہیں.... مہندی کے ان روشن طباقوں کے ساتھ سو پچاس طباقوں میں ملیدہ ہوتا ہے جو خرموں کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے.... مہندی کے دوسرے دن دولھا کی طرف سے برات جاتی ہے۔" (عبدالحلیم شرر: گذشتہ لکھنؤ)

ص ۱۴۱۔ س ۶: "آرایش اِن چیزوں سے مراد ہے: اہلِ قلعہ کے ہاں: نشان کا ہاتھی، سپاہیوں کا تمن، رنگ برنگ کے پھولوں کی ٹٹیاں، سو سو ٹٹیوں کے بیچ میں ایک ایک نقارخانہ .... اور اس میں نوبت بجتی جاتی ہے۔ بانسوں کے ٹھاٹھر بیلوں پر بندھے ہوئے، اُن میں لونڈے ناچتے جاتے ہیں۔ بانس کی کھپچیوں کے سیکڑوں بجوگڑے، ابرک، پنی، کاغذ سے منڈھے ہوئے، ان پر چار چار مٹی کی ٹھلیاں رنگ برنگ کی نقاشی کی رکھی ہوئی۔ سیکڑوں ابرک کے کنول۔ سُہاگ پڑے کے آگے روشن چوکی بجتی ہوئی، پیچھے پیچھے سب بری کی چیزیں۔" [مولوی سیّد احمد: رسومِ دہلی (بہ ذیلِ ساچق)]

ص ۱۴۲۔ س ۱۲: ایک پُرانی رسم، جس کا رواج اب گویا اُٹھ گیا ہے۔ نکاح کے بعد جب دولھا کو اندر بُلایا جاتا ہے، اُس وقت "ٹونے گائے جاتے ہیں اور ہر ایک ٹونے پر" ٹونا میرا جگت

سلونا" کہکر دوشعر سے اقرار لیا جاتا ہے کہ یہ ٹونا مجھے لگا' یعنی اِس جادو نے مجھ پر اثر کیا اور میں اِس کا پابند ہوگیا۔ اِس موقعے کا ٹونا' اصل میں ایک قسم کا گیت ہے جس میں اکثر دولھا کی طرف سے عجز اور فرماں برداری کا اقرار لیا جاتا ہے' مثلاً ٹونا:

ڈھائی پونی کچیا سوت   میں باندھوں بیاسو کا پوت
باندھ بوندھ کر کیا غلام   دہلی بیٹھا کرے سلام

دیگر: میں تو ہریالے بنے' لاڈلے بنے ایسا ٹونا بناؤں گی
جب دیکھے جب میرا ہی مکھ دیکھے' سنگ لگائے پھردں گی

میں تو ہریالے بنے پر ٹونا بناؤں گی"۔ (رسوم دہلی)

ص ۱۴۳-س ۱۶: شادی کی ایک پرانی رسم۔ نکاح کے بعد جب دولھا کو اندر بلایا جاتا ہے' اُس وقت "نوباتیں چنواتے ہیں۔ نوبات" نبات کو بگاڑ لیا ہے' کیوں کہ مصری کی ڈلیاں ہوتی ہیں' جو دولھا کو ڈھنکا ڈھنکا کر' ہاتھ لگائے بغیر اُس کے منہ سے چنواتے ہیں۔ نوباتیں ڈومنی اِس طرح چنواتی ہے کہ پہلے دُلھن کے سر پر مصری کی ڈلی رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ دولھا میاں! اِس کو منہ سے اُٹھا کر کھا جاؤ۔ جب دولھا سر کے پاس منہ لے جاتا ہے تو وہاں سے جھٹ ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ایسا بھولا دولھا بھی نہیں دیکھا کہ ایک ڈلی کے پیچھے کہاں کہاں منہ دوڑاتا ہے۔ جب سر کی ڈلی بہ مشکل دولھا کھا لیتا ہے تو اسی طرح دو ڈلیاں دونوں مونڈھوں پر رکھ کر کھلواتی ہیں پھر پیٹھ پر' دونوں کہنیوں اور گھٹنوں پر رکھ کر اُس کے منہ سے اُٹھواتی ہیں"۔ (سید احمد دہلوی: رسوم دہلی)

ص ۱۴۴-س ۱۵: "جب دُلھن کی سواری دولھا کے گھر پہنچتی ہے تو ایک مرغا' خواہ بکرا حلال کرکے اُس کا خون دُلھن کے داہنے پاؤں کے انگوٹھے میں مل کر آنسے دودھ سے دھو دیتے ہیں"۔ (سید احمد دہلوی: رسوم دہلی)

ص ۱۴۴-س ۱۶: جب دلھن بیاہ کر سسرال آتی ہے' اُس وقت کچھ رسموں کے بعد' دولھا دلھن مسند پر بیٹھتے ہیں اور سب کُنبے قبیلے والے اپنے اپنے دستور و مقدور کے موافق دُلھن کی منہ دکھائی دیتے ہیں۔ اُسی وقت ... کھیر آتی ہے۔ پہلے دولھا دُلھن کو اپنے ہاتھ سے سات نوالے کھلاتا ہے۔ اُس کے بعد کوئی عورت یعنی بہن یا بھاوج دُلھن کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے ہاتھ سے دولھا کو سات نوالے کھلاتی ہے۔ پھر سب کو کھانا کھلایا جاتا ہے"۔ (سید احمد دہلوی: رسوم دہلی)

ضمیمہ [۵] انتسابِ اشعار

ص ۲ ① یہ رباعی ناصر علی سرہندی کی ہے (دیوانِ ناصر علی، مطبع نول کشور کان پور، اشاعتِ پنجم، ص ۱۰۶) بندرابن داس خوشگو نے اپنے تذکرے سفینۂ خوشگو میں اِس رباعی سے متعلق (ص ۱۶ پر) ایک واقعہ بھی لکھا ہے۔

ص ۵ ① ک میں اِس شعر پر "مولّف" لکھا ہوا ہے، لیکن باقی نسخوں میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ یہ خارج از امکان نہیں کہ یہ شعر مولّف ہی کا ہو۔

ص ۱۱ ① یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ منیر شکوہ آبادی کا ایک مضمون الہ آباد کے اخبار نورالابصار میں چھپا تھا، الہ آباد کی سڑکوں کے احوال میں؛ اُس میں منیر نے یہ شعر بھی (معمولی سی تبدیلی کے ساتھ) شامل کیا ہے:

"صاحبِ فسانۂ عجائب نے جو کہا ہے، وہ اس سرزمین کا ماجرا ہے:

دیکھی نئی رسم اس نگر میں جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں" (کلیاتِ منیر ص ۶۲۵)

منیر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ نثر "تاریخ یکم اگست ۱۸۷۰ء ۶ جمادی الاوّل ۱۲۸۷ھ اخبار نورالابصار میں مطبوع ہوئی۔"

ترجمۂ مقالاتِ گارساں دتاسی حصۂ اوّل (شائع کردۂ انجمن ترقیِ اُردو ہند دہلی ۱۹۴۳ء) میں دتاسی نے نورالابصار کے اِس مضمون کا ذکر کیا ہے اور یہ شعر بھی نقل کیا ہے لیکن یہاں اِس شعر میں "نئی ریت" ملتا ہے۔ دتاسی نے لکھا ہے:

"الہ آباد کی سڑکوں کا حال شاعرانہ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے، بالخصوص برسات کے موسم میں اس شہر کی سڑکوں کی جو حالت ہوتی ہے، وہ نہایت دل چسپ طریقے پر بیان کی ہے۔ اس میں فسانۂ عجائب کا ایک شعر لکھا ہے:

دیکھی نئی ریت اس نگر میں جوتا ہے گلی میں، آپ گھر میں" (حصۂ اوّل ص ۹۹)

ص ۱۷ ① یہ شعر عہدِ تغلق کے ایک ہندستانی شاعر مُطہّر کا ہے۔ مطہّر کا دیوان (خطّی) علی گڑھ یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور مکرمی پروفیسر نذیر احمد نے اطّلاع دی ہے کہ یہ شعر اُس میں موجود ہے۔ مطہّر کا ایک ترکیب بند عین الملک کی مدح میں ہے اور یہ شعر اُس کے

پہلے ہی بند میں شامل ہے۔ نذیر صاحب نے مطلع کیا ہے کہ دیوان میں یہ شعر اس طرح ہے:

غمِ دنیا دراز پے دارد — ہر چہ گیرید مختصر گیرید

یہ اعتراف ضروری ہے کہ اس انتساب کی طرف سب سے پہلے محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے توجہ دلائی تھی۔

② امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" میں یہ مصرع موجود ہے:

ہر کسے را بکارِ خویش ہش است — کس نگوید کہ دوغِ من ترش است

زنگی ارچہ سیاہ فام بود — پیشِ مادر مہِ تمام بود

(مثنوی ہشت بہشت، مطبع نول کشور، سالِ طبع ۱۸۷۳ء، ص ۱۸۰)

مصرعِ ثانی غالباً بطورِ ضرب المثل مستعمل رہا ہے۔ دہخدا نے اپنی کتاب امثال و حکم میں اس مصرعے کے ذیل میں نظامی کا یہ شعر بھی لکھا ہے:

ہر کسے در بہانہ تیز ہش است — کس نگوید کہ دوغِ من ترش است

اس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ اس (مصرع) ضرب المثل کو دونوں نے نظم کیا ہے۔ میں یہ نہیں معلوم کر سکا کہ نظامی کا شعر ان کے کس مجموعے میں ہے۔

ص ۲۴ ① دیوانِ سوز ص ۲۵۷۔

② مصرع حافظ کا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ — قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

(دیوانِ حافظ، مرتبہ قاسم غنی و قزوینی، ص ۲۷)

ص ۲۷ ① یہ شعر دیوانِ نوازش میں موجود نہیں۔

② گلستاں، بابِ دوم، حکایت ۳۱۔

③ یہ شعر سودا کے ایک مشہور قصیدے کا ہے۔ (انتخابِ سودا، مکتبہ جامعہ دہلی، ص ۵۱)

ص ۲۸ ① ② دیکھیے ص ۱۲، ۱۴ پر۔

ص ۲۹ ① یہ شعر منشی عوض راے سکینہ مسرت شاہجہان پوری (متوفی ۱۲۳۶ھ) کا ہے۔ (ان کے حالات کے لیے دیکھیے تاریخِ شاہجہان پور، مؤلفہ صبیح الدین میاں، ص ۲۳۸)۔

② کلیاتِ میر، مرتبہ آسی، ص ۴۰۰۔

ص ۳۲ ① دیوانِ نوازش (ورق ۱۹۵ ب) میں یہ شعر اس طرح ہے:

مثل ہی سے نہ الفاظِ تلازم ہی سے خالی ہے   مرا ہر شعر بے مثل اِس زمانے میں مثالی ہے

② یہ شعر منتظر شاگردِ مصحفی کا ہے۔ انتخابِ دیوانِ منتظر مرتبۂ حسرت موہانی میں یہ موجود ہے (اشاعتِ اوّل سنہ ۱۹۳۰ء، ص ۹)۔

غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں اِس شعر کو درج کیا ہے لیکن مصرعِ ثانی اِس طرح لکھا ہے: یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ (خطوطِ غالب، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد)

قاضی عبدالودود صاحب اِس انتساب اور اختلافِ متن کی نشان دہی کر چکے ہیں (معاصر حصۂ ۴، ص ۳۷)۔

ص ۳۴ ① انتخابِ مصحفی مرتبۂ حسرت موہانی میں پہلا مصرع اِس طرح ہے:

کہے تھی یہ طفلی میں دیکھ اُس کو دایہ (انتخابِ سخن، جلدِ ششم، ص ۵۶)۔

ص ۳۷ ① یہ شعر میر سوز کے ہیں۔ دیوانِ سوز ص ۴۲۱۔ دیوان میں چوتھا مصرع اِس طرح ہے:

دستِ قضا جو پھر کوئی ایسا بنا سکے

ص ۳۸ ① یہ شعر حافظ کا ہے۔ دیوانِ حافظ مرتبۂ قاسم غنی و قزوینی میں دوسرا مصرع یوں ہے:

انچہ استادِ ازل گفت بگو، می گویم (ص ۲۶۲)

ص ۳۹ ① یہ مصرع کلامِ انشا میں موجود نہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر حصۂ ۸ میں کتب خانۂ دانش گاہِ پٹنہ میں محفوظ دیوانِ انشا کے ایک خطی نسخے سے انشا کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں "جو دیوانِ مطبوعہ میں شامل نہیں"، اُن میں یہ مصرع بھی موجود ہے (ص ۱۰۰)۔ مکمل شعر معاصر میں اِس طرح ہے:

" دل دے کے، آبلہ جوں اک روٹ (کذا) مول لائے
بازار ہم گئے تھے، اک چوٹ مول لائے "

ص ۴۱ ① یہ مصرع انشا کا نہیں، میر سوز کا ہے۔ یہ ایک قطعے کا جزو ہے۔ قطعہ یہ ہے:

جا کر کہا کسی نے کہ لو سوز بھی مُوا   کہنے لگا کہ پنڈ تو چھوٹا، بھلا ہوا
پر اتنی بات کہتے ہی رو کر کہا کہ حیف!   توتا ہمارا اُڑ گیا کیا بولتا ہوا

(دیوانِ سوز، ص ۱۲۰)

سرور نے موقعے کی مناسبت سے "اُڑ گیا" کو "مر گیا" سے بدل دیا ہے۔

② بقا کا شعر یوں ہے: "

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے ہیں   اُس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

(دیوانِ بقا شائع کردۂ شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ص ۲۴)

ص ۴۲ ① یہ شعر میر کا نہیں، شاد لکھنوی (پیرو میر) کا ہے اور اُن کے دیوان سخنِ بے مثال میں موجود ہے۔ یہ اطلاع ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے دی ہے۔ حسب تحریر نیر صاحب دیوان میں پہلا مصرع یوں ہے: بے جرم رکھا تھا یہ خنجر ہی گلے کو (سخنِ بے مثال، مطبوعۂ تصویرِ عالم پریس لکھنؤ، سالِ طبع جنوری ۱۹۰۱ء)۔

ص ۴۳ ① یہ شعر تذکرۂ میر حسن میں جعفر علی خاں زکی کے نام لکھا ہوا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے (کلیاتِ سودا نول کشوری اڈیشن میں یہ موجود نہیں) تذکرے میں یہ شعر اس طرح ہے: چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہونا رفو

تا قیامت سوزنِ تدبیر اگر سیتی رہے

② دیوانِ نوازش ورق ۱۹۴ الف۔ دیوان میں پہلا مصرع اس طرح ہے:

ایک میں کیا، خوب اُسے دیکھے اگر حسن آفریں

ص ۴۴ ① یہ اشعار مثنوی یوسف زلیخا کے ہیں (مطبوعۂ مطبع تحفۂ ہند دہلی، ص ۲۰۳) فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں پانچواں مصرع اس طرح ہے: "ز دیدن ہیچ اثر سے درمیانہ"۔ اِس مصرعے کی تصحیح اصل کتاب کے مطابق کی گئی ہے۔

ص ۴۶ ① یہ شعر جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کا ہے (مطبع تحفۂ ہند دہلی، ص ۳۰۷)۔

ص ۴۹ ① دیوانِ سوز، ص ۳۳۹۔

ص ۵۰ ① یہ اشعار میر کی مثنوی دریائے عشق کے ہیں۔ (کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۲) مصنف نے شعر بے ترتیب لکھے ہیں۔ کلیات میں اس سلسلے کا پہلا شعر یہ ہے:

بے قراری نے کچھ ادائی کی   تاب و طاقت نے بے وفائی کی

پھر پانچ اشعار کے بعد یہ دو شعر اس ترتیب کے ساتھ ہیں:

ہاتھ جانے لگا گریبان تک   چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے اِک جنوں کیا پیدا   اشک نے رنگِ خون کیا پیدا

② کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۸۔

ص ۵۱ ① دیوانِ نوازش میں پہلا مصرع اس طرح ہے: وعدۂ قتل ہے کل، رات کی نیت ہو حرام

② غزلیاتِ سعدی، مرتبۂ محمد علی فروغی (طبعِ تہران) ص ۱۲۔ اِس میں مصرعِ ثانی میں "صبح" کے بجائے "روز" ہے (یا مگر روز نباشد شبِ تنہائی را)۔

ص ۵۲ ① مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۱۰۸۔

ص ۵۴ ① یہ شعر نوازش کا ہے (دیوانِ نوازش، ص ۳)۔ دیوان میں شعر یوں ہے:

اڑے یہ ترنگ جوانی کی کیا اس نے مجکو جلا وطن
ہوا ایسا کاہے کو پیش ازیں میں نکل کے گھر سے خراب تھا

② دیوانِ سوز، ص ۳۱۸۔

ص ۵۶ ① دیوانِ سوز، ص ۹۱۔ دیوان میں ردیف "ملا" کے بجائے "لگا" ہے (روزِ محشر کو نہ میری شبِ ہجراں سے لگا)۔ ② مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں یہ شعر بہ نام آشفتہ (تلمیذِ سوز) لکھا ہوا ہے (ص ۱۹) اِس فرق کے ساتھ کہ "اپنے سینے" کی جگہ "میرے سینے" ہے۔

ص ۵۸ ① یہ شعر نوازش کا ہے۔ دیوانِ نوازش میں شعر اِس طرح ہے:

گھر میں ترے کو دا کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا جو ہم سے ہوا فعل، وہ رستم سے نہ ہوگا

ص ۶۰ ① دیوانِ نوازش، ص ۲۶۔

ص ۶۱ ① دیوانِ حافظ مرتبۂ قزوینی و قاسم غنی، ص ۲۰۳۔ ② پہلے مصرعے میں تصرّف کیا گیا ہے، اصل میں پہلا مصرع یوں ہے:

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند (دیوانِ حافظ مرتبۂ قزوینی و قاسم غنی، ص ۱۲۱)

③ مجموعۂ نغز اور گلشنِ بیخار میں یہ شعر بہ نام میر فضل علی فدوی لکھا ہوا ہے؛ اِس اختلاف کے ساتھ کہ مجموعۂ نغز میں "یہ کوئی مجلس ہے" ہے اور گلشنِ بیخار (نول کشوری اڈیشن) میں "یہ کوئی محفل ہے" ہے۔

ص ۶۳ ① کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی (ص ۶۱) میں پہلا مصرع یوں ہے:

مدت سے پائے چنار رہے ہیں، مدت گلخن تابی کی

ص ۶۵ ① مجموعۂ نغز میں یہ اشعار بہ نام آصف الدولہ مندرج ہیں (ص ۳۷)۔ یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے اِن اشعار کو "رباعی" لکھا ہے، لیکن یہ رباعی کے وزن میں نہیں، قطعہ کہنا چاہیے۔ ② کلیاتِ میر مرتبۂ آسی میں پہلا مصرع اِس طرح ہے:

دل کے غم کو زبان پر لایا (ص ۹۰۶)

ص ۶۶ ① لکھنؤ کے چند نامور شعرا میں مرزا محمد تقی ہوس کا انتخابِ کلام شامل ہے، اُس میں یہ مطلع بھی موجود ہے لیکن دوسرا مصرع اِس طرح ہے :

اٹھائیں کاندھے پہ بارِ ہستی، سفر ہی بہتر ہے یاں سے ہم کو

② یہ شعر مصحفی کا ہے۔ انتخابِ مصحفی، مرتبۂ حسرت موہانی (انتخابِ سخن، جلدِ ششم) ص ۲۰۔ انتخاب میں دوسرے مصرع میں "اس قدر" کے بجائے "کس قدر" ہے۔

③ انتخابِ مصحفی، مرتبۂ حسرت موہانی، مشمولۂ انتخابِ سخن، جلدِ ششم، ص ۷۱۔

④ یہ شعر دیوانِ نوازش میں موجود نہیں۔

ص ۶۹ ① یہ ایک قطعے کا دوسرا شعر ہے جو گلستاں کے بابِ اوّل کی ایک حکایت کا جز ہے۔

قطعہ یہ ہے : یا وفا خود نبود در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نکرد
کس نیاموخت علمِ تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

② مکمل شعر یوں ہے :

کبھی پاس دولت یہ رہتی نہیں — سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۱۲۷)

③ امثال و حکم (تالیفِ علی اکبر دہخدا) میں یہ موجود ہے لیکن انتساب کی صراحت کے بغیر۔

ص ۷۰ ① مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۵۹)۔

② دیوانِ نوازش، ص ۴۸۔ دیوان میں مصرعِ ثانی میں "جس کا" کی جگہ "اپنا" ہے۔

③ کلیاتِ ناسخ (مطبعِ مولائی لکھنؤ، سالِ طبع ۱۲۹۲ھ) ص ۱۲۲۔ کلیات میں دوسرا مصرع اِس طرح ہے : دل دکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا۔

ص ۷۲ ① میر کی مثنوی دریائے عشق میں شروع کے تین شعر تو موجود ہیں مگر چوتھا شعر نہیں۔ (کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۰)۔

ص ۷۴ ① دیوانِ سوز، ص ۱۴۸۔ ② دیوانِ نوازش، ورق ۱۳۰ ب۔

ص ۷۵ ① کلیاتِ سودا (نول کشوری اڈیشن، طبعِ پنجم) ص ۳۳۳۔ اِس میں پہلا مصرع اِس طرح ہے : وہ ہم نہیں جو کریں ...... ② مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۷۰۔ دوسرا مصرع اِس طرح ہے : مرادوں کی راتیں جوانی کے دن۔ (نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں

بھی اِسی طرح ہے)۔

ص ۷۶ ① کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۳۶۱۔

ص ۷۷ ① یہ شعر نوازش کا ہے۔ دیوانِ نوازش، ص ۱۰۔ دیوان میں مصرعِ ثانی میں "ایسا یے مثل" کی جگہ "تجھ سا یے مثل" ہے۔

ص ۷۹ ① کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۲۰۹۔

ص ۸۲ ① دیوانِ حافظ (مرتبۂ قاسم غنی و قزوینی) ص ۳۔ دیوان میں "کز کجاست تا بکجا" ہے۔ پہلا مصرع یہ ہے: صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا۔ ② دیوانِ نوازش ورق ۱۲۱ ب۔

ص ۸۳ ① یہ شعر احمد یار خاں یکتا کا ہے (سروِ آزاد ص ۲۰۱۔ سفینۂ ہندی ص ۲۶۳)۔ اِن دونوں تذکروں میں پہلا مصرع یوں ہے: چہ پرسی از سر و سامانِ من عمریست چوں کاکل۔ ② یہ غزل دیوانِ سوز میں موجود ہے (ص ۲۵۵) لیکن چوتھا شعر (سوراخ چاک ....) اُس میں موجود نہیں۔ اختلافاتِ متن کی نشان دہی بہ ذیلِ اختلافِ نسخ کی گئی ہے۔

ص ۸۵ ① شعر میر سوز کا ہے۔ دیوانِ سوز ص ۱۲۵۔ ② دیوانِ درد (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۱۷۔ دیوان میں دوسرا مصرع اِس طرح ہے: دوستاں درد کو مجلس میں نہ تم یاد کرو۔

ص ۸۶ ① مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۱۰۱۔

ص ۹۰ ① کلامِ انشا ص ۱۵۴۔ اُس میں پہلا مصرع اِس طرح ہے:

گر یار مے پلا دے تو کیونکر نہ پیجیے

ص ۹۱ ① دیوانِ درد (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۱۰۴۔ ② یہ شعر ہوس لکھنوی (تلمیذِ مصحفی) کا ہے۔ انتخاب دیوانِ ہوس، مرتبۂ حسرت موہانی (مشمولۂ انتخابِ سخن جلدِ ششم) ص ۲۲۔ انتخاب میں پہلے مصرعے میں "تجھے" کی جگہ "مجھے" ہے۔ ③ انتخابِ سودا (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۳۷۳۔ ④ دیوانِ نوازش ص ۱۶۔ دیوان میں پہلے مصرعے میں "لگا" کی جگہ "لگادے" ہے۔

ص ۹۳ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۹۴ ب۔ ② دیوانِ سوز ص ۱۶۸۔ دیوان میں شعر اِس طرح ہے: جب ہیچ ہی سب بوجھ چکے وضعِ جہاں کو غم ہیچ، طرب ہیچ، عطا ہیچ، ستم ہیچ

ص ۹۴ ① یہ شعر میر سوز کا ہے، لیکن دو غزلوں کے مطلعوں کے دو مختلف مصرعوں سے شعر بنا لیا گیا ہے۔ (دیوانِ سوز ص ۱۲۰-۱۲۱) دونوں مطلعے درجِ ذیل ہیں:

رسوا ہوا، خراب ہوا، مُبتلا ہوا — وہ کون سی گھڑی تھی کہ دل سے جدا ہوا

عاشق ہوا، اسیر ہوا، مُبتلا ہوا — کیا جانیے کہ دیکھتے ہی دل کے کیا ہوا

م کے علاوہ اور سب نسخوں میں یہ شعر بہ نامِ "تیر" لکھا ہوا ہے۔ م میں یہ نامِ سوز ہے اور بہ ظاہر یہ مطبعے کے مصحح کی تصحیح ہے؛ اس بنا پر اصل نسخوں کے مطابق "میر" ہی کو متن میں برقرار رکھا گیا ہے، کیوں کہ مصنف نے اسے میر ہی سے منسوب کیا ہے۔

ص ۹۴ ② کلیاتِ میر مرتّبۂ آسی ص ۲۹۸۔

ص ۹۶ ① یہ شعر مصحفی ہی کا ہے، خوش معرکۂ زیبا (مرتّبۂ مشفق خواجہ) ص ۳۵۸۔

ص ۹۷ ① دیوانِ نوازش ص ۴۶۔ دیوان میں مصرعِ اوّل میں "مکتبہ" کی جگہ "چکنم" ہے۔

② کلیاتِ جرأت (مرتّبۂ نورالحسن نقوی) ص ۶۲۔ کلیات میں پہلا مصرع اس طرح ہے: نہ آیا اِس فلک کو اور کچھ، آیا تو یہ آیا۔

ص ۹۹ ① یہ غزل دیوانِ نوازش میں موجود نہیں۔

ص ۱۰۰ ① یہ مصرع نوازش کا ہے (دیوانِ نوازش ورق ۱۹۶ ب)۔ مکمل شعر یوں ہے:

سفر نا کردہ دل، غربت زدہ دل، جا رضا تیری — ترا موسیٰ رضا ضامن، ترا اللہ والی ہے

② دیوانِ سوز ص ۴۰۹۔

ص ۱۰۵ ① یہ شعر مثنوی سحر البیان کا ہے (مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۵۳)۔ مثنوی میں یہ شعر اس طرح ہے: یہاں کا تو قصہ میں چھوڑا یہاں — ذرا اب سنو غم زدوں کا بیاں

ص ۱۱۰ ① شعر میر درد کا ہے۔ دیوانِ درد (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۹۰۔ دیوان میں دوسرا مصرع یوں ہے: ایک بھی اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی۔

ص ۱۱۱ ① مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی ص ۷۸) میں یہ شعر اس طرح ہے:

اُسے دیکھ غصے میں، وہ ڈر گیا — کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

سرور نے مصرعِ اوّل میں تصرف کیا ہے۔

ص ۱۱۲ ① قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مقالے "آوارہ گرد اشعار" میں اس شعر کے متعلق لکھا ہے: "شعر مصحفی کا ہے اور ان کے دیوان ۳ کے متعدد نسخوں میں موجود ہے۔ مصحفی کا مطلع یہ ہے:

ہے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے

بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے" (معاصر حصہ ۹)

ص ۱۱۵ ① یہ شعر دیوانِ آتش میں موجود نہیں۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں اِسے صاحب مرزا اشاؔدر کے نام لکھا گیا ہے۔ تذکرے میں یہ اِس طرح ہے : [خوش معرکۂ زیبا، مرتبۂ مشفق خواجہ، جلدِ دوم، ص ۶۶]

کب ہے عریانی سے بہتر کوئی دنیا میں لباس — یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

ص ۱۱۸ ① دیکھیے ص ۴۱۳

ص ۱۱۸ ② اِس کا امکان ہے کہ یہ غزل سرؔور کی ہو۔ اِس سے پہلے ص ۴۴ پر یہ مقطع آچکا ہے :

خدا کو مان، نہ لے نام عاشقی کا سرؔور — کہ منفعت میں بھی اِس کی، ہیں سو ضرر پیدا

یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ یہ مقطع اِسی غزل سے متعلق ہو۔

ص ۱۲۰ ① شاہ نامہ (جنگِ رستم با اشکبوس) سازمانِ کتابہای جیبی، تہران، جلدِ سوم، ص ۶۲۔ مکمل شعر یوں ہے : قضا گفت گیر و قدر گفت دہ ؛ فلک گفت احسنت و مہ گفت زہ

ص ۱۲۳ ① دیوانِ سوز ص ۳۵۶۔ تیسرا شعر دیوان میں اِس طرح ہے :

اے ہمرہاں! غریب کے احوال پر نظر — ہے جائے گریہ یہ کہ پسِ کارواں رہے

ص ۱۲۵ ① دیوانِ نوازش، ص ۱۷۵ الف۔

ص ۱۳۰ ① یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ اشعار کس مثنوی کے ہیں۔ مثنوی سحرالبیان میں "داستان فیروز شاہ جنوں کے بادشاہ کے بیٹے کی، عاشق ہونے میں جوگن پر" کا آغاز اِس شعر سے ہوتا ہے :

کدھر ہے تو اے ساقیِ گل عذار — کہ صحرا سے اب دل ہوا خار خار

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرؔور نے اِس شعر میں لفظی ترمیم کی اور باقی دو اشعار کا اضافہ کیا ہے۔

ص ۱۳۵ ① ک میں یہ شعر بہ نامِ میر سوز ہے، مگر دیوانِ سوز میں موجود نہیں۔

ص ۱۳۸ ① علی اکبر دہخدا نے اپنی کتاب امثال و حکم (طبعِ تہران) میں اِس شعر کو بہ نامِ "مصاحب" لکھا ہے۔ میں مصاحب کے متعلق معلومات حاصل نہیں کرسکا۔ امثال و حکم میں پہلا مصرع یوں ہے : بہشت آنجاست کا زارے نباشد۔ (جلدِ اوّل، ص ۴۷۹)۔

ص ۱۴۲ ① دیوانِ سوز ص ۳۴۱۔ دیوان میں پہلا مصرع اِس طرح ہے : فلک شب کتخدائی کی تری اے سوز یوں بولا۔ ② مثنوی سحرالبیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۱۴۳۔

ص ۱۴۷ ① دیوانِ نوازش، ورق ۱۸۸ ب۔

ص ۱۵۱ ① دیوانِ نوازش، ورق ۱۵۱ الف۔ دیوان میں چوتھے مصرعے میں "کیونکر" کی جگہ "کب تک" ہے۔ سرؔور نے اپنی کتاب شبستانِ سرور میں مندرجۂ ذیل شعر اپنے نام سے لکھا ہے : "موقوف یاں تک کہ اٹھانے کا وقت اپنے قریب آیا ؛ افسوس نظر مجھ کو میرا نہ حبیب آیا" (جلدِ دوم ص ۱۸۷) گویا مصرعِ اوّل استاد اور شاگرد دونوں کے یہاں

مشترک ہے۔ ② تذکرۂ گلشنِ بیخار میں مصحفی کے انتخابِ کلام میں یہ شعر بھی موجود ہے، لیکن پہلا مصرع اِس طرح ہے: غم کھاتا ہوں جتنا، مری نیت نہیں بھرتی۔

③ شعر میر حسن کا ہے، مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۳۴۔ اصلاً شعر یوں ہے:

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار   نہ ہو تجھ سے مایوس، اُمیدوار

④ دیوانِ سوز میں یہ اشعار موجود نہیں۔

ص ۱۵۲ ① دیوانِ کاملِ امیر خسرو دہلوی، مرتبۂ سعید نفیسی، ص ۲۱۸۔ مکمل شعر یوں ہے:

بلب آمداست جانم، تو بیا کہ زندہ مانم   پس ازانکہ من نمانم، بچہ کار خواہی آمد

ص ۱۵۳ ① کلیاتِ اہلی شیرازی، مرتبۂ حامد ربانی، کتاب خانۂ سنائی (تہران) ص ۲۹۳ (اختلافاتِ متن کی نشان دہی بہ ذیلِ اختلافِ نسخ کی گئی ہے)۔ ② کلیاتِ جرأت، مرتبۂ نور الحسن نقوی، ص ۳۱۵۔

ص ۱۵۴ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۴۲ ب۔ ② دیوانِ نوازش ورق ۲۰۳ ب۔

③ یہ شعر محنت، تلمیذ جرأت کا ہے اور انتخابِ دیوانِ محنت، مرتبۂ حسرت موہانی میں موجود ہے (انتخابِ سخن جلدِ نہم)۔ نیز تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (مرتبۂ مشفق خواجہ) جلدِ اوّل، ص ۲۷۸۔ دونوں کتابوں میں پہلا مصرع اِس طرح ہے:

کل شبِ وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں

ص ۱۵۵ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۸۰ الف۔ دیوان میں دوسرا مصرع یوں ہے: دعا کرد شبِ فرقت کہیں سحر ہووے۔ ② اِس غزل کا تیسرا اور چوتھا، یہ دونوں شعر دیوانِ نوازش میں بھی موجود ہیں (ورق ۱۲۱ ب) نہیں کہا جاسکتا کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔

③ دیوانِ نوازش ورق ۱۰۰ الف۔

ص ۱۵۶ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۹۷ الف۔

ص ۱۵۷ ① کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۱۔ ② یہ شعر مصحفی کا ہے اور انتخابِ مصحفی مرتبۂ حسرت موہانی میں موجود ہے (انتخابِ سخن جلدِ ششم، ص ۷۰)۔

ص ۱۵۸ ① کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۵۔ ② یہ چاروں شعر میر کی مثنوی دریائے عشق کے ہیں، لیکن کلیات میں یہ اِس ترتیب سے نہیں ہیں۔ (کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۲)

③ دیوانِ نوازش ورق ۱۵۶ ب۔ دیوان میں "تپِ جدائی" کے بجائے "تری جدائی"

ہے۔ سرور کی کتاب شبستانِ سرور میں بھی یہ شعر، انتساب کی صراحت کے بغیر، ایک جگہ آیا ہے (ص ۱۳۹) لیکن وہاں اِس کی صورت یہ ہے:

مرض یہ بڑھ گیا آخر تپِ جدائی سے — کہ بیٹھ لگ گئی بس میری چارپائی سے

ص ۱۶۲ (1) کلیاتِ جرات میں مجھے یہ شعر نہیں ملا۔

ص ۱۶۳ (1) یہ شعر سعدی کا نہیں، صائب کا ہے اور کلیاتِ صائب میں موجود ہے۔ کلیات کے دو نسخے پیشِ نظر ہیں: ایک مطبوعۂ تہران اور ایک مطبوعۂ لاہور؛ دونوں میں دوسرے مصرعے میں "چہ حظ کند" ہے۔ یہ اُسی غزل کا شعر ہے جس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ہے:

دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ میلرزد — کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا

ص ۱۶۴ (1) بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند، گلستاں کے بابِ سوم "در فضیلتِ قناعت" کی اٹھائیسویں حکایت کے ایک شعر کا پہلا مصرع ہے۔ گلستاں کے ایک ایرانی اڈیشن مرتبۂ مرزا عبدالعظیم خاں گرگانی میں اِس مصرعے میں "طمع" کی جگہ "شَرَہ" ہے۔ مکمل شعر یہ ہے:

بدوزد شرہ دیدۂ ہوشمند — در آرد طمع مرغ و ماہی بہ بند

گلستاں (مترجم) کا ایک نول کشوری اڈیشن بھی پیشِ نظر ہے [ترجمہ: عبدالباری آسی۔ تصحیح: عبدالاحد خاں خلیل] یہ ۲۱ واں اڈیشن ہے، اِس میں بھی یہ شعر اِسی طرح ہے۔

ص ۱۶۵ (1) دہخدا نے امثال و حکم میں اِسے بہ نامِ سعدی لکھا ہے، اُس میں مکمل شعر یوں ہے:

بر سرِ اولادِ آدم ہر چہ آید، بگذرد — گوش کن پند اے پسر، از بہرِ دنیا غم مخور (جلدِ اوّل ص ۴۲۱)

لیکن کلیاتِ سعدی کے جو نسخے میرے سامنے ہیں، اُن میں مجھے یہ شعر نہیں ملا۔ (بقیہ ص ۴۱۳ پر)

ص ۱۷۰ (1) یہ شعر ابنِ یمین کا ہے۔ دیوانِ اشعارِ ابنِ یمین مرتبۂ حسین علی باستانی میں یہ اِس طرح مندرج ہے:

ز روزگار و جہاں ہم ہمیں پسند آمد — کہ زشت و خوب، بد و نیک برگذر دیدم (ص ۴۶۷)

(2) کلیاتِ مصحفی (مرتبۂ نورالحسن نقوی) ص ۱۸۸۔

ص ۱۷۱ (1) دیوانِ نوازش ورق ۲۰۸ الف۔ دیوان میں دوسرا مصرع یوں ہے:

ہجر میں گر آ جاوے عین زندگانی ہے

(2) یہ شعر دیوانِ نوازش میں مجھے نہیں ملا۔ (3) دیوانِ گویا (فقیر محمد خاں گویا) مطبع نول کشور (سالِ طبع ۱۸۸۵ء) ص ۵۱۔

ص ۱۷۲ (1) دیوانِ نوازش میں یہ شعر نہیں ملا۔

ص ۱۷۳ ① یہ مطلع دراصل میر سوز کا ہے، کیوں کہ جس غزل کا یہ مطلع ہے وہ غزل کلیاتِ جرأت میں نہیں اور دیوانِ میر سوز میں موجود ہے۔ (دیوانِ سوز، ص ۳۸۷)۔ ② یہ اشعار میر کی مثنوی دریائے عشق کے ہیں، لیکن مثنوی میں یہ اس ترتیب سے نہیں ہیں۔

ص ۱۷۴ ① یہ غزل دیوانِ نوازش میں نہیں ملی۔ ② دیوانِ نوازش ورق ۱۵ الف۔ دیوان میں دوسرے مصرعے میں "اپنا" کی جگہ "روز" ہے اور چوتھا مصرع اس طرح ہے: میں مہ سے اس لیے رکھتا ہوں ہیجان لگا۔ چھٹے مصرعے میں "جہاں" کے بجائے "چمن" ہے۔
③ یہ شعر میر کا ہے (کلیاتِ میر، ص ۸۶۷)۔

ص ۱۸۰ دیوانِ سوز ص ۳۸۹: دیوان میں یہ شعر اس طرح ہے:

ہمیشہ مہر و مہ لے کر عصائے نور ہاتھوں میں
جہاں در پر پکارے ہیں: ادب سے اور تفاوت سے

ص ۱۸۸ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۰۱ ب۔

ص ۱۹۳ ① یہ شعر میر سوز کا ہے۔ دیوانِ سوز ص ۴۹۰۔ دیوان میں دوسرا مصرع یوں ہے:
بیچ کھاتے ہیں جو یوسف سا برادر ہووے

ص ۱۹۴ ① دیوانِ نوازش میں یہ شعر نہیں ملا۔ ② دیوانِ نوازش ورق ۱۷۰ ب۔

ص ۱۹۶ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۰۱ ب۔ دیوان میں مصرعِ اوّل میں "وہ" کی جگہ "سو" ہے۔

ص ۲۰۰ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۴۳ ب۔

ص ۲۰۵ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۹۵ ب۔ دیوان میں پہلا مصرع یوں ہے: ہوئی کیا وہ اب تیری تاثیر اے آہ۔ ② یہ اشعار میر کی مثنوی دریائے عشق کے ہیں [کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۹۰۵] کلیات میں پہلے مصرعے میں "جس سے دل کی" اور چوتھے مصرعے میں "کاوشِ نمایاں" ہے اور چھٹے مصرعے میں "لہو میں" ہے۔

ص ۲۰۶ ① کلیاتِ ناسخ (مطبعِ مولائی ۱۲۶۲ھ) ص ۳۵۱۔ کلیات میں مصرعِ اوّل میں "مجھے" کی جگہ "مجکو" ہے۔

ص ۲۰۷ ① دیوانِ نوازش ورق ۵۰ ب۔

ص ۲۰۹ ① مصرع حافظ کا ہے۔ دیوانِ حافظ مرتبۂ قزوینی و قاسم غنی، ص ۲۷۔ دیوان میں "عجوز" ہے۔

ص ۲۱۰ ① مصرع سعدی کا ہے ؛ مکمل شعر یوں ہے :

وصفِ ترا اگر کنند ور نکنند اہلِ فضل

حاجتِ مشاطہ نیست روی دلآرام را (گلستاں - دیباچہ)

ص ۲۱۱ ① اِس شعر کا مصحفی سے کچھ تعلق نہیں۔ جس غزل کا یہ شعر ہے، وہ غزل کلیاتِ سودا کے نول کشوری نسخے میں موجود ہے (لیکن نسخۂ جانسن سے غیر حاضر ہے) نیز یہ شعر تذکرۂ مجموعۂ نغز میں سودا کے انتخابِ کلام میں شامل ہے۔ لیکن یہ غزل دیوانِ سوز میں بھی موجود ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ غزل سوز ہی کی ہے [مقالۂ قاضی صاحب، سویرا (لاہور) شمارہ ۲۹] اور یہی بات بہ ظاہر مرجح معلوم ہوتی ہے۔ دیوانِ سوز میں پہلا مصرع یوں ہے : "ٹک ہمرہانِ قافلہ سے کہ دے اے صبا (ص ۷۰)۔

ص ۲۱۳ ① دیوانِ سوز میں یہ شعر موجود نہیں۔ ② انتخابِ سودا (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۴۷۔ انتخاب میں مصرعِ اوّل اِس طرح ہے : عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے .....

ص ۲۲۲ ① انتخابِ سودا (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۳۶۸ - انتخاب میں تیسرا مصرع یوں ہے :

گریاں نہ شکلِ شیشہ و خنداں نہ طرزِ جام

② کلیاتِ میر ص ۹۰۴ - کلیات میں تیسرے مصرعے میں "جو" کی جگہ "کہ" ہے - چوتھے مصرعے میں "پچھٹ" کی جگہ "بن" ہے اور آخری مصرعے میں "اور کتنے تصدیعات" ہے۔

ص ۲۲۶ ① دیوانِ سوز ص ۲۵۴ - دیوان میں دوسرا مصرع یوں ہے : جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض از خود رمیدہ ہوں - تیسرا شعر دیوان میں موجود نہیں اور ساتویں مصرعے میں "لے آہ و نالہ" کی جگہ "اے اشک و آہ" ہے اور آخری مصرعے میں "سب" کی جگہ "میاں" ہے۔

ص ۲۲۸ ① کلیاتِ ناسخ میں یہ اشعار نہیں ملے۔

ص ۲۲۹ ① یہ شعر ہوس لکھنوی کا ہے۔ انتخابِ دیوانِ ہوس، مرتبۂ حسرت موہانی، ص ۲۵۔

ص ۲۳۱ ① شعر سودا کا ہے۔ کلیاتِ سودا، مطبعِ نول کشور، اشاعتِ پنجم، ص ۱۱۹۔ کلیات میں مصرعِ ثانی میں "ان پہ" کی جگہ "اُن کو" ہے۔

ص ۲۳۲ ① کلیاتِ ناسخ میں یہ رباعی نہیں ملی۔ ② دیوانِ حافظ کے کچھ نسخوں میں ایک غزل ہے، جس کا مطلع ہے : ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم

ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

یہ شعر بھی اسی غزل میں شامل ہے، لیکن دیوانِ حافظ کے جو معتبر نسخے شائع ہوئے ہیں، اُن میں یہ غزل موجود نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ غزل الحاقی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اصلاً یہ غزل کس کی ہے۔ ③ انتخابِ سودا (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۲۷۲۔ انتخاب میں دوسرا مصرع یوں ہے:
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا یہ یک قرار۔ اور تیسرے مصرعے میں "کئی دن کا ذکر ہے" کی جگہ "کوئی دن کی بات ہے" ہے۔

ص ۲۳۳ ① کلیاتِ ناسخ (مطبع مولائی) ص ۱۴۵۔ کلیات میں مصرعِ اوّل میں "ترکِ دنیا میں" ہے۔
② انتخابِ سودا (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۲۴۷۔ انتخاب میں یہ شعر اس طرح ہے:
اِس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن　　　جب چشم کھلے گل کی، تو موسم ہو خزاں کا
③ یہ دراصل رباعی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کی ہے۔

ص ۲۳۴ ① شعر میر سوز کا ہے۔ دیوانِ سوز ص ۳۶۵۔ دیوان میں دوسرا مصرع اِس طرح ہے:
کوئی تو یاد گاہ گاہ کرے۔

ص ۲۳۵ ① کلیاتِ میر ص ۹۰۴۔ کلیات میں پہلا مصرع یوں ہے: کیونکے کہیے کہ تو نہیں آگاہ۔
اور تیسرا شعر اس طرح ہے:
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز　　　اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز
آخری شعر یوں ہے:
بس تغافل ہوا، ترحم کر　　　گوشِ دل جانبِ تظلم کر

ص ۲۳۶ ① یہ شعر قائم چاندپوری کا ہے۔ دیوانِ قائم مرتبۂ خورشید الاسلام، ص ۳۰۔ دیوان میں یہ اس طرح ہے:
قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند　　　کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ص ۲۳۷ ① یہ شعر نوازش کا ہے۔ دیوانِ نوازش ورق ۱۵۰ الف۔ ② تذکرۂ نتائج الافکار میں یہ شعر بہ نامِ عبدالرحیم خانِ خاناں مندرج ہے۔

ص ۲۴۱ ① تذکرۂ میر حسن میں یہ رباعی بہ نامِ محمد علی خان مرزائی لکھی ہوئی ہے (ص ۱۶۷)۔

ص ۲۴۶ ① مثنوی سحرالبیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۹۲۔

ص ۲۴۹ ① دیوانِ سوز میں یہ شعر نہیں ملا۔ سرور کی ایک کتاب شبستانِ سرور میں ص ۱۵ پر یہ شعر "مولف" کے نام ملتا ہے۔

ص ۲۵۷ ① جس غزل کا یہ شعر ہے، وہ غزل کلیاتِ سودا کے نول کشوری نسخے اور دیوانِ میر سوز، دونوں میں موجود ہے؛ لیکن بہ قولِ قاضی عبدالودود صاحب اِس غزل کا انتساب میر سوز سے مرجح ہے [مقالۂ قاضی صاحب، سویرا (لاہور) شمارہ ۲۹] دیوانِ سوز میں پہلا مصرع یوں ہے: نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا۔ ل میں پہلے مصرعے میں "نہ سام رہ گیا" ہے۔

ص ۲۶۴ ① یہ شعر میر کی مثنوی دریائے عشق کے ہیں۔ کلیاتِ میر مرتبۂ آسی، ص ۹۰۷۔

ص ۲۶۵ ① گلستاں، بابِ اوّل، حکایت ۱۷۔ مکمل شعر یوں ہے:

بدریا در منافع بے شمار است   وگر خواہی سلامت، برکنار است

ص ۲۶۶ ① کلیاتِ حزیں (طبعِ تہران) ص ۲۰۲۔ کلیات میں "دریں طوفانِ شور افزا" ہے۔

ص ۲۶۷ ① دیوانِ نوازش میں یہ مصرع مجھے نہیں ملا۔

ص ۲۶۸ ① دیوانِ نوازش ص ۱۷۴ الف۔ دیوان میں دوسرا مصرع اِس طرح ہے:

جو اپنے خونِ جگر ہی کو ناشتا سمجھے

ص ۲۶۹ ① سرور کے اندازِ نگارش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شعر اُن کے دوست مرزا حسین بیگ کا ہے، لیکن اس کی تصدیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دیوانِ مؤید (خطّی نسخہ محزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ) میں ایک شعر ہے (ص ۱۴۲):

داغہا دارد زدستم ایں سپہر شیشہ رنگ   خانۂ ملّاح درچین است دکشتی در فرنگ

اِس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ دوسرا مصرع بہ طورِ ضرب المثل مستعمل رہا ہے۔

ص ۲۶۹ ② دیوانِ حافظ مرتبۂ قزوینی و غنی، ص ۱۳۲۔

ص ۲۷۰ ① دیوانِ نوازش، ورق ۲۲۵ الف۔

ص ۲۷۳ ① انتخابِ سودا (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۲۷۰۔ انتخاب میں دوسرے مصرعے میں "تو مجھے گبر کہے" ہے۔

ص ۲۷۵ ① مصرع حافظ کا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے [دیوانِ حافظ مرتبۂ قزوینی و غنی ص ۱۲۱]:

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند   چناں نماند، چنیں نیز ہم نخواہد ماند

① یہ مصرع مثنوی مولانا روم کا ہے، مکمل شعر یوں ہے (امثال و حکم):

در پسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست   مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست

مثنوی کے ایک اڈیشن شائع کردۂ موسسۂ انتشاراتِ امیر کبیر میں پہلا مصرع یوں ہے:

آخرِ ہر گریہ آخر خندہ ایست (ص ۴۰)

ص ۲۷۶ ① تذکرۂ میر حسن میں یہ شعر میر حسن کے انتخابِ کلام میں شامل ہے اور (غالباً) انھی کا ہے۔

تذکرے میں دوسرا مصرع اس طرح ہے : فصلِ گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے ۔ (ص ۵۸)

ص ۲۷۷ ① کلیاتِ ناسخ (مطبع مولائی) ص ۴۴ ب ۔

ص ۲۸۳ ① یہ شعر مثنوی یوسف زلیخا کا ہے ۔ مثنوی یوسف زلیخا (مطبع تحفۂ ہند دہلی) ص ۱۷۸ ۔

② یہ شعر اس صورت میں مثنوی سحر البیان میں موجود نہیں ، البتہ اس میں یہ شعر ضرور ہے :

اندھیرا پڑا تھا ، سو روشن ہوا   شبِ تیرہ میں سانپ کا من ہوا

مثنوی سحر البیان (مکتبۂ جامعہ دہلی) ص ۸۸ ۔ غالباً سرور نے ترمیم کی ہے ۔

ص ۲۸۵ ① گلستاں ، بابِ دوم ، حکایت ۳۸ ۔ یہ ایک قطعے کا تیسرا مصرع ہے ۔ قطعہ یہ ہے :

گفت عالم بگوشِ جاں بشنو   ور نماند بگفتنش کردار

باطل است انچہ مدعی گوید   خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

مرد باید کہ گیرد اندر گوش   ور نبشت است پند بر دیوار

ص ۲۸۷ ① گلستاں ، بابِ اول ، حکایت ۱۶ ۔

ص ۲۹۰ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۶۴ ب ۔ دیوان میں "مجھ سے وہ" کی جگہ "آج وہ" ہے ۔

ص ۲۹۳ ① کلیاتِ سعدی مرتبۂ محمد علی فروغی ، ص ۲۱۲ ۔ کلیات میں پہلا مصرع یوں ہے :

برگِ درختانِ سبز پیشِ خداوندِ ہوش ۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے :

دولتِ جاں پرور است صحبتِ آمیزگار   خلوتِ بے مدعی ، سفرۂ بے انتظار

ص ۲۹۴ ① ہندی شبد ساگر میں لفظ "گہرا" کے ذیل میں یہ دوہا بہ نام کبیر مندرج ہے ۔

میں اس انتساب کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا ، مگر خسرو سے اس کا انتساب بہ ظاہر

قابلِ قبول نہیں ۔ ہندی شبد ساگر میں دوسرا مصرع اس طرح ہے :

میں بوری ڈھونڈھن گئی ، رہی کنارے بیٹھ

ص ۳۰۰ ① کلیاتِ میر ، مرتبۂ آسی ، ص ۱۴۸ ۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے :

آگے ہمارے عہد سے ، وحشت کو جا نہ تھی   دیوانگی کسو کی بھی زنجیرِ پا نہ تھی

② دیوانِ سوز ، ص ۳۱۴ ۔ دیوان میں یہ مطلع اس طرح ہے :

چھڑا کر مجھ سے سارے خانماں کو   میاں دل اے چلا تو اب کہاں کو

ص ۳۰۴ ① دیوانِ نوازش ورق ۷۰ ب ۔ دیوان میں پہلا مصرع یوں ہے :

باتیں کرتے کرتے کیا کیا لوگ اٹھ گئے پیشِ چشم

ص ۳۰۶ ① دیوانِ سوز ص ۳۳۴۔ دیوان میں آخری دو شعر اِس طرح ملتے ہیں :

گل ہو شگفتہ خاطر و گلزار خندہ رو ۔۔۔ اپنا ہو قصّہ، غیر کی وھاں داستاں نہ ہو
گلشن ہو اور یارِ گل اندام اور ہیں ۔۔۔ بادِ صبا بھی ہووے ولے باغباں نہ ہو

ص ۳۰۹ ① کلیاتِ ناسخ (مطبعِ مولائی) ص ۲۲۱۔

ص ۳۱۰ ① نسّاخ نے سخنِ شعرا میں اِسے بہ نام مرزا صادق علی شرر لکھا ہے۔ اِس میں ردیف "نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے" ہے۔ ② انتخابِ دیوانِ افسوس مرتبہ حسرت موہانی میں یہ شعر اِس طرح ہے :

دیکھتے ہی اُسے، حاضر ہوئے مرجانے کو ۔۔۔ وہی اشخاص، جو یاں آئے تھے سمجھانے کو

(انتخابِ سخن، جلدِ چہارم)

ص ۳۱۱ ① دیوانِ نوازش ورق ۱۶ الف۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں "تجھ سے" کی جگہ دیوان میں "تجھ کو" ہے۔

ص ۳۱۲ ① دیوانِ سوز ص ۴۹۶۔ دیوان میں چوتھے مصرعے میں "تو کو دِ غم آئینہ دیاتا ہے" ہے۔

ص ۳۱۴ ① دیوانِ حافظ مرتبۂ قزوینی و قاسم غنی، ص ۲۹۵۔

ص ۳۱۵ ① دیوانِ نوازش، ورق ۲۰۱ الف۔ دیوان میں پہلے مصرعے میں "تجھ سے" کی جگہ "اس سے" ہے، اور مصرعِ ثانی میں "ترے خیال" کی جگہ "خیالِ یار سے" ہے۔

② کلیاتِ میر مرتبۂ آسی ص ۹۰۸۔

ص ۳۱۶ ① دیوانِ نوازش میں یہ شعر نہیں ملا۔

ص ۳۱۷ ① یہ مصرع ایک قطعے کا جزو ہے، جو دیوانِ ابنِ یمین میں موجود ہے، مکمل قطعہ یہ ہے :

گر بمانیم زندہ، بردوزیم ۔۔۔ دامنے کز فراق چاک شد است
در بمردیم، عذرِ ما بپذیر ۔۔۔ اے بسا آرزو کہ خاک شد است

(دیوانِ اشعارِ ابنِ یمین، مرتبہ حسین علی باستانی، ص ۶۱۸)

یہ ایک عربی قطعے کا ترجمہ ہے جو دیوان میں موجود ہے۔ دہخدا نے امثال و حکم میں اِسے سعدی سے منسوب کیا ہے (لیکن کلیاتِ سعدی میں یہ موجود نہیں) مجھے صحیح انتساب کا علم حمید شعاعی کی کتاب امثالِ شعرِ فارسی کے حوالے سے ہوا، جس کی اطلاع ڈاکٹر حنیف نقوی نے دی تھی۔

ص ۳۱۸ (1) دیوانِ سوز، ص ۲۲۵۔

ص ۳۱۹ (1) دیوانِ نوازش میں یہ شعر نہیں ملا۔

ص ۳۲۰ (1) دیوانِ نوازش، ورق ۲۰۹ الف۔

ص ۳۲۱ (1) دیوانِ سوز، ص ۱۰۱۔ دیوان میں یہ شعر اِس طرح ہے:

معلوم اپنے دل کے سلوکوں سے یوں ہوا
نادان جو ہوئے دوست، وہ دشمن ہے جان کا

ص ۳۲۸ (1) یہ مصرع نوازش کا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

پھر ہوا اُس کے عزیزوں میں، ہوا خواہوں میں
بوے یوسف سوے پیغمبرِ کنعاں آئی

(دیوانِ نوازش، ورق ۱۹۵ الف)

ص ۳۳۹ (1) کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۱۴۸۔ کلیات میں شعر اِس طرح ہے:

وہ اور کوئی ہوگی سحر، جب ہوئی قبول
شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہ تھی

ص ۳۴۴ (1) دیوانِ نوازش میں یہ قطعہ موجود نہیں۔

اضافہ

ص ۲۸ (1) دہخدا نے امثال وحکم میں اِس مصرعے کو درج کیا ہے، عبارت یہ ہے:
"ہرچہ از دوست میرسد، نیکواست (...گر ہمہ پوست باقلا باشد (یا)... گر ہمہ سوختۂ تنباکو است)" لیکن شاعر کا نام مذکور نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ مصرع بھی (ایسے بعض اور مصرعوں کی طرح) بہ طورِ ضرب المثل مستعمل رہا ہے اور مختلف شعرا نے اسے الگ الگ نظم کیا ہے۔ (دہخدا نے "یا" کے بعد جو مصرع لکھا ہے، وہ ناتمام معلوم ہوتا ہے)۔

(2) ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے مطلع کیا ہے کہ یہ مقطع سرور کے اُستاد بھائی اور لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو دلگیر (تلمیذ آغا خانی نوازش) کے ایک سلام کا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

مجرئی! کہتے تھے شہ: زخم بدن تھوڑے ہیں — شکرِ خالق ہے بہت اور دہن تھوڑے ہیں

اِس سلام کا ایک اور شعر ہے:

کہا عباس نے: اک مشک میں ہوں گے سیراب — خیمۂ شاہ میں اب تشنہ دہن تھوڑے ہیں

[شمعِ تعزیت (سلاموں اور خمسوں کا مجموعہ) مرتبۂ سید محمد عنایت حسین مشین سانانی سہارن پوری، مطبع روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی بریلی، سالِ طبع: ۱۲۹۲ھ، ص ۲۳۱]

ص ۱۱۰ ① یہ اشعار میر سوز کے ہیں۔ دیوانِ سوز میں مطلع اِس طرح ہے :

تجھ بن ہے عذاب زندگانی ہے میری خراب زندگانی (ص ۴۵۹)

اور دوسرا شعر دیوان میں موجود نہیں۔ سرور نے شمستانِ سرور میں اِس غزل کے پانچ شعر درج کیے ہیں (جلدِ دوم، ص ۱۶۶) وہاں یہ دوسرا شعر موجود ہے؛ لیکن مصرعِ اوّل وہاں اِس طرح ہے : اتنا نہ چھیو کہ سے کفن کا۔ سرور نے وہاں یہ وضاحت کردی ہے کہ یہ غزل سوز کی ہے :

"یہ حضرتِ سوز کی غزل آہ اب ہے مرے حسبِ حال واللہ"

بقیہ: ص ۴۰۵ - س ۱۷ :

عبدالواسع جبلی کے دیوان میں یہ مصرع (معمولی فرق کے ساتھ) موجود ہے :

گرچہ رنجوری، صبوری کن، کہ در دارِ فنا ہر چہ آید بر سرِ فرزندِ آدم، بگذرد

(دیوانِ عبدالواسع جبلی، مرتبۂ ذبیح اللہ صفا، ص ۵۲۷)

(دہخدا نے اِس کی بھی نشان دہی کی ہے (جلدِ چہارم)) اِس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرع کسی نہ کسی شکل میں بہ طورِ ضرب المثل مستعمل رہا ہے اور مختلف شعرا نے اسے تضمین کیا ہے۔

ضمیمہ ۴

[اشخاص، مقامات، عمارتیں]

آتش : خواجہ حیدر علی آتش، ابنِ خواجہ علی بخش، شاگردِ مصحفی، سلسلۂ نسب خواجہ عبداللہ احرار تک پہنچتا ہے۔ اِن کے بزرگوں نے بغداد سے نقلِ وطن کرکے دلّی میں سکونت اختیار کرلی تھی (ریاض الفصحا)۔ خواجہ علی بخش دلّی سے فیض آباد منتقل ہوگئے تھے۔ آزاد نے آبِ حیات میں اپنے خاص انداز میں لکھا ہے: "دلّی کے رہنے والے تھے۔ خواجہ زادوں کا خاندان تھا، جس میں مسندِ فقر قائم تھی اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا؛ مگر شاعری اختیار کی اور خاندانی طریقے کو سلام کرکے، اُس میں سے فقط آزادی اور بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا۔"

سالِ ولادت کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں لکھا ہے کہ اِس وقت اُن کی عمر انتیس[۲۹] سال ہے۔ ریاض الفصحا تاریخی نام ہے، جس سے (سالِ ترتیب) ۱۲۲۱ھ نکلتا ہے۔ بظاہر یہ سالِ تکمیلِ ترتیب معلوم ہوتا ہے۔ تذکرے کے آخر میں "تاریخ خاتمہ تازہ گفتہ شدہ این است" کے ذیل میں جو قطعۂ تاریخ ہے، اُس سے ۱۲۳۶ھ نکلتا ہے، لیکن میں ڈاکٹر حنیف نقوی کی اِس رائے سے متفق ہوں کہ یہ تاریخ خاتمہ (جس کے لیے مصحفی نے لفظ "تازہ" استعمال کیا ہے) نظرِ ثانی کی تاریخ ہے [شعرائے اُردو کے تذکرے]۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مصحفی نے آتش کا حال ۱۲۲۱ھ ہی میں لکھا ہوگا تو اس حساب سے سالِ ولادت ۱۱۹۲ھ کے لگ بھگ ہوسکتا ہے۔ نجابت حسین خان عظیم آبادی ۱۲۵۹ھ میں جہلم دیکھنے کے لیے لکھنؤ گئے تھے، انھوں نے اپنے سفرنامے میں آتش سے ملاقات کا حال بھی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ: "سنِ شریف قریب ہشتاد" [خلاصۂ سوانح لکھنؤ۔ معاصر (پٹنہ) حصہ ۱۰] اِس سے بھی سالِ ولادت ۱۱۹۰ سے ۱۱۹۲ھ تک قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اُن کا قطعۂ تاریخ وفات مجموعۂ دواوینِ رشک میں موجود ہے؛ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ کے دن ۲۵ محرم ۱۲۶۴ھ کو انتقال ہوا تھا، جو ۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے (مطابق تقویم شائع کردہ انجمن ترقی اردو کراچی، طبع دوم)۔

آتش کے دو دیوان ایک ہی مجلد میں ۱۲۶۱ھ میں چھپے تھے۔ اِس نسخے میں یہ صراحت موجود ہے کہ تصحیح کا فرض خود آتش نے انجام دیا تھا۔ یہ اشاعت صحیح معنی میں کم یاب ہے۔ اِس کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے اور میں نے اُسی سے استفادہ کیا ہے۔ دوسری بار ۱۲۶۸ھ میں کارخانۂ علی بخش خاں (لکھنؤ) سے یہ مجموعہ شائع ہوا، اور اِس اشاعت میں وہ بقیہ کلام بھی شامل ہے جو اشاعتِ اوّل میں نہیں۔ اب یہ بھی کم یاب ہے۔ اِس کا ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے۔ آج کل عموماً نول کشوری نسخے ملتے ہیں، لیکن اشاعتِ ثانی کے مقابلے میں اِن میں کچھ غزلیں

کم ہیں۔ نجات حسین خاں کے مذکورۂ بالا سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش نے قصیدے بھی کہے ہیں اور مصحفی نے ریاض الفصحا میں آتش کی فارسی گوئی کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن یہ اجزا اب دست یاب نہیں۔ آتش کے دیوانِ اوّل کا ایک خطّی نسخہ پٹنے میں پروفیسر سیّد حسن کے پاس ہے، جس کا سالِ کتابت ۱۲۴۸ھ بتایا گیا ہے۔ میں نے خود اس نسخے کو نہیں دیکھا۔ سیّد حسن صاحب نے جو تفصیل بیان کی، اُس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اِس خطّی نسخے میں ایک غزل ایسی بھی ہے جو مطبوعہ نسخوں میں موجود نہیں۔

آغا : مراد ہے معروف خطّاط اور نستعلیق کے مشہور اُستاد بل کہ استاذ الاساتذہ آقا عبد الرّشید دیلمی سے، جو مشہور ایرانی خطّاط، میر عماد قزوینی کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ ایران میں میر عماد کے قتل کے بعد شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں اُسی کے ایما سے ہندستان آگئے اور شہزادے داراشکوہ کی اُستادی کے منصب پر سرفراز کیے گئے تھے۔ آگرے میں ۱۰۸۱ھ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے [تذکرۂ خوش نویساں، ص ۹۵]۔ صاحبِ تذکرۂ مذکور غلام محمد دہلوی (ہفت قلم) نے لکھا ہے کہ : "بیغمبرِ ملکِ خطّاطی بود..... فوقیت و ترجیح بر خطّاطانِ ماسبق بُردہ و کسے مثلِ ایں بزرگ تا ہنوز برنخاستہ و ایں ہنرِ علم بر او ختم شد"۔

ضروری صراحت : یہ نام دیباچۂ کتاب میں دو جگہ آیا ہے (ص ۱۲۔ص ۲۳) اور دونوں جگہ "آغا" ہے۔ مطبعِ مصطفائی کے نسخے (م) میں صرف اوّل الذکر مقام پر "آغا رشید" ہے؛ لیکن "رشید" کا اضافہ بہ ظاہر اربابِ مطبع کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ جو نسخے سرورؔ کی نظرِثانی کے بعد چھپے ہیں (بہ شمولِ اشاعتِ اوّل) اُن میں صرف "آغا" ہے۔

اِس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ جب خطّاطوں کے سلسلے میں مطلق لفظ آقا (یا آغا) استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے مراد "آقا عبد الرشید" ہی ہوتے ہیں اور یہ کچھ نئی یا غیر معروف بات نہیں۔ صرف ایک مثال : تذکرۂ خوش نویساں میں ایک اُردو شاعر کی مثنوی نقل کی گئی ہے جو آقا عبد الرّشید کی مدح میں ہے، اُس کے شروع کے دو شعر ہیں : میں نے خطّاط یک قلم دیکھے لیکن آقا سے لوگ کم دیکھے

اے خوشا وقت و عہدِ شاہجہاں جس کی خدمت میں ایسے ہوں انساں (ص ۹۸)

آغا باقر کا امام باڑہ : اِس امام باڑے کے سلسلے میں، میری معلومات کی حد تک، قدیم ترین بیان میر شیر علی افسوسؔ کی کتاب آرائشِ محفل میں ملتا ہے : نوّاب شجاع الدّولہ کے زمانے میں "جوہری محلّے کے متصل باقر خاں نے ایک امام باڑہ بنایا۔ خانِ مرحوم مغل زادہ، عمدۂ روزگار تھا۔ کئی سے سوار مغل وغیرہ اُس کے رسالے میں تھے..... قبر بھی اُس مرحوم کی اُسی میں ہے" (آرائشِ محفل، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۱۵۴)۔

"آغا باقر خاں، عمو آغا اسماعیل دلاور جنگ کے تھے۔ نوّاب شجاع الدّولہ کے عہدِ دولت میں رسالدار پانچ ہزار سوار کے تھے..... آغا اسماعیل نے عمو سے کہا: تم ایک امام باڑہ بنواؤ۔ یہاں چوڑی والیاں رہتی تھیں، اُن سے بہت سے مکان لے کر امام باڑہ بنا۔ اُس زمانے میں سوائے آغا ابوطالب خاں کے امام باڑے کے دوسرا امام باڑہ شہر میں نہ تھا..... مجلس بطورِ اہلِ ایران

امام باڑے میں ہوتی تھی" (قیصر التواریخ، جلد اوّل، ص ۲۸۴)۔

"یہ لکھنؤ کا دوسرا امام باڑہ ہے .... امام باڑہ ۱۸۵۷ء کی شورش تک باقی تھا۔ ۱۸۵۸ء میں ... سب عمارتیں کھود کر میدان کر دیا تھا، امام باڑہ بھی ... مسمار ہو گیا۔ مرزا کام بخش خلف مرزا سلیمان شکوہ ... اس عزا خانے میں دفن ہیں، اس لحاظ سے اُن کے بیٹے حیدر شکوہ ..... نے انگریز حکومت سے آراضی امام باڑہ حاصل کر کے ٹین ڈلوا دیا، جس میں اُس وقت ایک خوش نما سورج مکھی بنا تھا ..... اِس امام باڑے کی سب سے پہلے راجہ شعبان علی خان مرحوم نے اپنے روپے سے مرمّت کی۔ پھر ۱۸۸۰ء میں راجہ امیر حسن خاں والیِ محمود آباد ..... نے تعمیر میں امداد کی۔ اور تیسری مرتبہ بمبئی کے کسی رئیس کے سرمایے سے درستی ہوئی۔

امام باڑے کی موجودہ شکل کمرے کی وضع کی ہے، جس کے آگے برآمدے میں آہنی سایبان ہے .... ہندستان میں محرّم کے موقعے پر جو آئین و رواسم پھیلے، اُن میں "چہل منبری" ایک قدیم رواج تھا، جو امام باڑہ آغا باقر ہی سے شروع ہوتا تھا" (سید آغا مہدی: تاریخ لکھنؤ، کراچی، ص ۱۵۲)۔ سودا کی قبر امام باڑہ آغا باقر میں ہے (گلشن ہند، تذکرۂ ہندی)

[۲۴ نومبر ۱۹۸۱ء کو راقم الحروف اس امام باڑے کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ اب اِس کے برآمدے پر "آہنی سایبان" نہیں، اُس کی جگہ پختہ چھت بن گئی ہے اور سودا کی قبر جہاں تھی، وہاں کسی شخص نے ایک پختہ کمرا بنوا لیا ہے، جس سے قبر اُس کے فرش کے نیچے دب گئی ہے۔]

سید کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق حسین آباد کا امام باڑہ اِسی امام باڑے کی وضع پر بنا ہے: "بادشاہ نے اپنے قدیم باغ جمنیا باغ میں بنائے امام باڑۂ حسین آباد بہ وضع امام باڑۂ آغا باقر خان مرحوم ڈالی، جو اب داخلِ دھس قلعۂ مچھی بھون ہو کر مسمار ہو گیا ہے" (قیصر التواریخ، جلد اوّل، ص ۳۵۴)۔

دو ضمنی باتیں: (۱) آرایشِ محفل میں بھی شاہ پیر محمد کا ٹیلہ" کے ذیل میں لکھا ہوا ہے کہ لکھنؤ کا سب سے قدیم امام باڑہ "مرزا ابو طالب خاں کا امام باڑہ" ہے جو "پچھّم طرف، بائیں اُس کے لبِ دریا ... تمام شہر کے امام باڑوں سے مقدم ہے .... ریاست اُس وقت نواب صفدر جنگ بہادر مرحوم کی تھی" (ص ۱۵۳)۔

(۲) فرہنگ میں لفظِ "چہل منبری" کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کے ذیل میں ہفت تماشائے قتیل کی یہ صراحت بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے: "بعض جاہل جو اشراف کی اولاد ہیں ..... فرقۂ امامیہ پر غلبہ دکھانے کے لیے ..... اہلِ سنّت میں بھی شبِ عاشورہ کو چہل منبر کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور ہر منبر پر حصولِ مطلب کے لیے منّت کا ڈورا باندھتے ہیں۔ امامیہ مذہب کے جوان بھی اِس رسم کے رواج حاصل کر لینے کی وجہ سے چہل منبر کی زیارت کرتے ہیں" (ترجمہ ہفت تماشا، مکتبۂ برہان دہلی، ص ۱۵۵)۔

ابراہیم (حافظ): حافظ محمد ابراہیم، عہدِ آصف الدّولہ کے معروف ترین خطّاط حافظ نور اللہ کے بیٹے اور شاگرد تھے۔ [حافظ نور اللہ کے لیے دیکھیے "تذکرۂ خوش نویساں، مؤلفۂ غلام محمد دہلوی، ص ۴۲۔ مؤلف نے حافظ صاحب

کے متعلق لکھا ہے : " بروتیرۂ آقا عبدالرشید کہ ایں بزرگوار نوشتہ است، کسے نہ نوشتہ " موٴلف نے لکھنؤ میں حافظ نور اللہ سے ملاقات بھی کی تھی اور اس ملاقات کی تفصیل بھی لکھی ہے]۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا ہے :

" حافظ ابراہیم نے بھی بہت نام پیدا کیا .... اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کرکے، اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی۔ حافظ نور اللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے، حافظ ابراہیم نے اُن میں خفیف سی بیضاویت اختیار کی ... حافظ ابراہیم کے دو شاگردوں نے بہت ہی فروغ پایا، جو اپنے زمانے میں سارے لکھنؤ کے اُستاد قرار پا گئے : ایک تو منشی منسارام کشمیری .... اور دوسرے منشی محمد ہادی علی " (گزشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۱۷۲) ۔

یہ صراحت بے جا نہ ہوگی کہ لکھنؤ میں دورِ آخر کے معروف خوش نویس اور نستعلیق کے اُستاد منشی شمس الدین اعجاز رقم بھی منشی ہادی علی کے شاگرد تھے۔ شررؔ نے لکھا ہے : " فی الحال نستعلیق میں منشی شمس الدین اور نسخ میں منشی حامد علی صاحب کو شہرت ملی اور یہ دونوں منشی ہادی علی کے شاگرد ہیں " (ایضاً ص ۱۷۳) ۔

رام بابو سکسینہ نے رجب علی بیگ سرورؔ کے متعلق لکھا ہے : " اپنے زمانے کے مشہور خطاط شمار کیے جاتے تھے، اِس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے، جن کا ذکر فسانۂ عجائب میں موجود ہے " (ترجمۂ تاریخ ادبِ اُردو، حصّۂ نثر، ص ۲۱) سکسینہ صاحب نے حسبِ معمول حوالہ نہیں دیا ؛ لیکن سرورؔ نے دیباچۂ فسانۂ عجائب میں جن تعریفی الفاظ میں حافظ ابراہیم کا ذکر کیا ہے ؛ اُس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ روایت صحیح ہوگی ۔

ایک ضمنی بات : شررؔ نے لکھا ہے کہ " حافظ نور اللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے " لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ صحیفۂ خوش نویساں (تالیفِ احترام الدین احمد شاغلؔ عثمانی) میں حافظ نور اللہ کی ایک وصلی کا عکس شامل ہے اور اُس وصلی میں دوائر ویسے ہی بیضوی ہیں جیسے آقا عبدالرشید کے یہاں ہوتے تھے یا متاخر اساتذۂ لکھنؤ کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہندستانی خطاط نستعلیق میں ایرانی اساتذہ کے پیرو رہے ہیں اور صاحبِ تذکرۂ خوش نویساں کی صراحت کے مطابق حافظ نور اللہ بھی " بروتیرۂ آقا عبدالرشید " لکھتے تھے اور آقا کے دوائر میں بیضویت ہی پائی جاتی ہے (آقا عبدالرشید کی دو تحریریں فی الوقت میرے سامنے ہیں) ۔

شررؔ کی اِسی عبارت کے حوالے سے احترام الدین شاغلؔ نے صحیفۂ خوش نویساں میں بالکل مختلف بات لکھی ہے۔ اُنھوں نے حافظ ابراہیم کے حالات میں اُن کے متعلق لکھا ہے کہ : " اُنھوں نے خطِ نستعلیق کے دائروں میں ترمیم بھی کی ہے ؛ یعنی بیضوی دائروں کو کچھ گول کرکے، آفتابی کے قریب پہنچا دیا، مگر آفتابی نہیں بننے دیا " اور حوالہ دیا ہے گزشتہ لکھنؤ کا، جب کہ گزشتہ لکھنؤ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے (اور جو اوپر منقول ہوا) وہ اِس سے بالکل مختلف ہے ۔

مزید یہ کہ شاغلؔ نے حافظ ابراہیم کے لیے یہ بھی لکھا ہے کہ : " کثرتِ مشق سے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ باپ اور بیٹے کے خط کا فرق معلوم کرنا ممکن نہ تھا " اگر موٴلف کا یہ قول درست ہے، تو پھر اُن کا منقولۂ بالا قول خود بہ خود غلط

ٹھہرے گا۔ میرے سامنے حافظ ابراہیم کی کوئی وصلی نہیں، اس لیے فی الوقت اُن کے سلسلے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ صحیح صورتِ حال کیا تھی۔

ابوتراب خاں کا کٹرا : لکھنؤ کا آباد اور معروف محلّہ ہے جو عہدِ نواب برہان الملک میں بسایا گیا تھا۔ کمال الدین حیدر نے قیصر التواریخ میں نواب برہان الملک کے احوال کے ذیل میں لکھا ہے : "اس عہدِ دولت میں فوجِ صوبۂ اودھ بائیس ہزار سوار مغلیہ وغیرہ، جن کے افسر اور رسالدار میر خدایار خاں ... ابوتراب خاں ... وغیرہ تھے، جن کے نام کے کٹرے آج تک شہر میں ہیں۔"

شرر نے نواب برہان الملک کے حالات میں لکھا ہے : "اُن کے زمانے میں یہاں کئی نئے محلّے آباد ہوگئے، مگر یہ سب محلّے اُن مغل سردارانِ فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے جہاں مستقل سکونت کے لیے لوگوں نے مکان بنانا شروع کر دیے۔ سید حسین خاں کا کٹرا، ابوتراب خاں کا کٹرا.... سب اُسی زمانے کے محلّے یا برہان الملک کے سردارانِ فوج کی لشکرگاہیں ہیں" (گذشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۶۵)۔

استری مجن : اس عمارت کا احوال معلوم نہیں ہو سکا، اس کے سوا کہ نجم الغنی خاں نے مکّا درزی کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے : "غرض ۴ ماہِ شوال ۱۲۵۲ھ کو مکّا کو استری مجن میں قید کیا" (تاریخِ اودھ، جلدِ چہارم، ص ۳۳۷)۔

اسد علی (حکیم، سید) : ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے میرے استفسار کے جواب میں ایک خط میں لکھا ہے : "حکیم سید اسد علی کے متعلق اپنے ننھیالی بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مشہور صوفی اور شاعر شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کی اولاد میں تھے۔ اُن کے پوتے حکیم سید محمد اصغر جعفری نعمت اللّٰہی میرے حقیقی نانا تھے۔ طبابت اس خاندان کا پیشہ تھا اور اسی سلسلے میں آغا میر کے خاندان سے بھی ان لوگوں کے راہ و رسم تھے۔"

اکبر ثانی : ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ پسر شاہ عالم۔ ولادت : ۲۲ اپریل ۱۷۶۰ء مطابق ۷ رمضان ۱۱۷۳ھ۔ مسند نشینی : ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء مطابق ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ۔ انتقال : ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ۔

[اورینٹل بایوگریفیکل ڈکشنری، مؤلفہ ٹامس ولیم بیل]

اکبری دروازہ : "اکبر کے آخری عہد میں یہاں کے صوبے دار جواہر خاں تھے... اُن کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اُس سے ملے ہوئے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے اور اُن کے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کیا۔" (شرر : "گذشتہ لکھنؤ") یہ دروازہ آج بھی موجود ہے لیکن اب شکستگی کے آثار بے طرح ظاہر ہیں۔ ماضی میں اس کی تاریخی اہمیت رہی ہے۔ نواب برہان الملک

کے داخلۂ لکھنؤ کے سلسلے میں اِس دروازے کا نام آتا ہے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عہدِ شاہی میں بعض مجرموں کے سر یہاں لٹکا دیے جاتے تھے ۔" اور جو نالا اکبری دروازے کے پیچھے بہ رہا ہے اُسے " سرکٹا نالا " آج تک کہتے ہیں" (سید آغا مہدی : تاریخِ لکھنؤ، ص ۸۰) ۔ نجات حسین خاں عظیم آبادی ۱۲۵۹ھ میں جہلم کے تعزیے دیکھنے کے لیے لکھنؤ آئے تھے؛ اُنھوں نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے : "اکبری دروازہ کہ دروازہ ایست بس مرتفع و کشادہ و بطرفِ جنوبِ آں نالہ واقع کہ از مجرمانِ بادشاہی ہر کسے کہ بعلّتِ خونریزی یا دیگر فتنہ انگیزی مستحقِ سزای قتل و کشیدنِ دار ... می شود، درہماں نالہ بسزای اعمالِ خود میرسد و سر و دست و تنِ آنرا در محرابِ آں دروازہ می آویزند" [خلاصۂ سوانحِ لکھنؤ، معاصر (پٹنہ) حصہ ۱۰] ۔

عماد السعادت کی بھی ایک عبارت ایسے ہی مفہوم پر مشتمل تاریخِ لکھنؤ میں نقل کی گئی ہے جس سے اِس روایت کی قدامت کی تائید ہوتی ہے ۔ ظریف کا یہ شعر بھی اِسی کتاب میں درج کیا گیا ہے :

تمنا ہے، کسی کی تیغ ہو اور اپنی گردن ہو ۔۔۔ پھر اُس کے بعد یارب سرکٹے نالے میں مدفن ہو

چوک کی آبادی گول دروازے اور اکبری دروازے کے درمیان واقع ہے ۔" اب اِس دروازے کو چوک کی آبادی کے لحاظ سے چوک کی آخری حد کہو ۔ یہ دروازہ زمین کے نشیب و فراز کے لحاظ سے پست زمین پر واقع ہے، مگر گول دروازے سے رفعت میں اونچا ہے .... اکبری دروازے میں دونوں طرف بلند کرسی کی دکانیں ہیں، جن میں سلف سے آج تک مٹی کے کھلونے اور تصویریں فروخت ہوتی ہیں ... مٹی کا دوسرا سامان بھی اِن دکانوں پر ملتا ہے" (تاریخِ لکھنؤ، ص ۸۰) ۔ ابھی تک یہ روایتی صورت موجود ہے ۔ جرأت کے اُستاد جعفر علی حسرت کی عطاری کی دکان اِسی علاقے میں تھی : " دکان اُس کی متصل اکبری دروازے کے تھی" [خوش معرکۂ زیبا، مرتبۂ مشفق خواجہ، ترجمۂ حسرت] ۔ "دکانِ عطاری در لکھنؤ متصلِ اکبری دروازہ چیدہ" (تذکرۂ ہندی، ص ۴۷) ۔

ہاں یہ صراحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ اب " سرکٹا نالا " کے نام سے " اکبری دروازے کے بعد ایک محلّہ آباد ہے اور آدھے شہر کا گندا پانی نالیوں سے ہوکر یہاں گرتا ہے ۔ حکیم عبدالعزیز ودڈ تے .... دونوں بخشی .... محلّے کی آبادی کی پہلی بنیاد یہ سڑک ہے" (تاریخِ لکھنؤ) ۔

امام باڑہ : مراد ہے نوّاب آصف الدّولہ کے بنوائے ہوئے امام باڑے سے، جس کو " امام باڑۂ آصفی " اور " بڑا امام باڑہ " بھی کہتے ہیں ۔ ۱۲۰۵ھ میں اِس کی عمارت مکمل ہوئی تھی ۔ مرزا ابوطالب (لندنی) نے اپنی کتاب تفضیح الغافلین (وقائعِ زمانِ نوّاب آصف الدّولہ) میں " وقائعِ ۱۲۰۵ھ " کے ذیل میں لکھا ہے : "دریں سال عمارتِ امام باڑہ باتمام رسید ... مشتمل است بر دو دالان .... کہ طولِ دالانہا شصت گز و عرض سی گز است .... و از آں سال ہر سال چہار پنج لکھ روپیہ صرفِ تزئینِ آں می شود " [تفضیح الغافلین : مرتبہ

ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ص ۱۱۵]

"دریا کے کنارے، مچھی بھون کے مغرب طرف اینٹ اور نہایت اعلا درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی، جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے ... لداو کی چھت جو کڑا دے کے بنائی گئی ہے، اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداو کی چھت ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے.... نواب آصف الدولہ کے بعد یہ عمارتیں کس مپرسی میں پڑی رہیں۔ غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر قبضہ کرکے، گرد و پیش کے مکانوں کو منہدم کر دیا... امام باڑے کو قلعہ اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنالیا.... اس کے بڑے ہال میں سلح خانہ تھا" (گذشتہ لکھنؤ)۔ "۲۰؍ جون ۱۸۸۳ء کو فوج انگریزی ہٹی اور یہ مقامات واگذار ہوئے" (تاریخ لکھنؤ، ص ۲۲۸)۔ "امام باڑے کی عمارت گویا تعمیراتِ لکھنؤ میں سب سے بہتر و اعظم ہے" (نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد سوم، ص ۲۹۷)۔

اندراسن : اِس عمارت کا مفصل بیان مجھے نہیں ملا۔ سرور نے فسانۂ عبرت میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ منشی نول کشور کی مرتبہ کتاب تواریخ نادر العصر میں ایک جگہ بس اِس کا نام آیا ہے: "انگریزی عمل داری سے پہلے بادشاہی مکانات کی بڑی طیاریاں رہتی تھیں .... فرح بخش، مبارک منزل، اندراسن، موتی محل ... لائقِ دید تھے۔ اب بھی جو کچھ مسماری و منہدمی سے محفوظ رہے .... قابلِ دید ہیں"۔ [اِس کتاب کا نام تاریخی ہے، جس سے سالِ ترتیب ۱۸۶۳ء برآمد ہوتا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے اور یہ عبارت میری درخواست پر برادرم اکبر علی خاں نے نقل کرکے بھیجی ہے۔ اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے]۔

نجم الغنی خاں کی تاریخ اودھ جلد چہارم میں بھی ایک جگہ نصیر الدین حیدر کے حالات کے ذیل میں صرف اِس کا نام آیا ہے: "سلطان الاخبار میں کوٹھی دلکشا، مکان اندراسن، گلستانِ ارم، درشن بلاس و فرح بخش کی تیاری کو بھی ان کی طرف منسوب کیا ہے، اور کچھ اِس میں غلطی ہے"۔

تواریخ نادر العصر کی عبارت سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ یہ عمارت بھی (شاید غدر میں) مسمار اور منہدم ہو گئی۔

انوار (مولوی) : مولوی انوار الحق بن مولوی احمد عبد الحق فرنگی محلی لکھنوی۔ سالِ ولادت: ۱۱۵۰ھ۔ اپنے زمانے کے معروف عالم اور درویش تھے۔ اعلا درسی کتابیں مولانا عبد العلی بحر العلوم سے پڑھی تھیں۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے والد سے بیعت کی۔ زندگی بھر آدابِ طریقت پر کاربند رہے اور توکل و پرہیزگاری کے ساتھ اُن پر ثابت قدم رہے۔ ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی۔ لکھنؤ ہی میں اپنے باغ "باغ مولوی انوار" میں دفن ہوئے۔ [نزہۃ الخواطر، جلد ہفتم۔ تذکرۂ علمائے ہند] اِن سے کشف و کرامات بھی منسوب ہیں، جن کو شیخ ولی اللہ لکھنوی نے الاغصان الاربعہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اِن کا مزار آج بھی مرجعِ عوام ہے۔ لکھنؤ سے مکرمی صباح الدین عمر صاحب نے اطلاع دی ہے کہ "جس لڑکے، لڑکی پر جن، آسیب، بھوت سوار ہو جاتا ہے، اُس کی مرمت کرانے والے یعنی اُسے اُتروانے والے اب بھی

برابر وہاں جاتے رہتے ہیں۔ باغ مولوی انوار صاحب، فرنگی محل کا قبرستان ہے۔ یہیں مولانا حسرت موہانی کا بھی مزار ہے، کیوں کہ فرنگی محل کے وہ بڑے عقیدت مند تھے .... چھوٹا سا قبرستان ہے، اسی کے احاطے میں ایک مسجد ہے۔ یہ محلّہ تو نہیں ہے، مگر اس کے آس پاس کے مکانوں کا پتا اکثر اسی نام پر لکھ دیا جاتا ہے"۔ باغ مولوی انوار، رکاب گنج سے میڈیکل کالج کی طرف جانے والی سڑک کے وسط میں ایک جانب واقع ہے۔

ایسری پرشاد (مہاراجا) : ایسری پرشاد نارائن سنگھ، اودت نرائن سنگھ (لاولد) کے بھتیجے اور جانشین تھے۔ ۱۸۳۵ء میں مسند ریاست پر بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مدد کی تھی، جس کے صلے میں اُن کو مہاراجا بہادر اور G. C. S. I. کے خطابات دیے گئے۔ یہ علم و ادب کے قدرداں تھے۔ ۱۸۵۹ء میں سرورؔ بھی ان کے متوسلین میں شامل ہوئے تھے اور اُن کی تنخواہ سو روپے مہینا مقرر ہوئی تھی (نیر مسعود رضوی: رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے، ص ۱۰۸)۔ ۱۳؍جون ۱۸۸۹ء کو انتقال ہوا۔ [سینٹ ڈاکٹر حکم چند نیر اور ڈاکٹر حنیف نقوی نے تاریخ بنارس (مولفہ مولوی سید مظہر حسن) سے نقل کر کے بھیجے ہیں، اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے]۔

بابر : ظہیر الدین محمد بابر، ابن عمر شیخ مرزا۔ ہندستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بانی تھا۔ ولادت: ۱۵؍فروری ۱۴۸۳ء، مطابق ۱؍محرم ۸۸۸ھ۔ جنگِ پانی پت: جمعہ ۲۰؍اپریل ۱۵۲۶ء، مطابق ۷؍رجب ۹۳۲ھ۔ انتقال: آگرہ، دوشنبہ ۲۶؍دسمبر ۱۵۳۰ء، مطابق ۶؍جمادی الاول ۹۳۷ھ۔ [اورینٹل بایو گرافیکل ڈکشنری]

باغ وبہار : دیکھیے میرامن۔

بخشو : طبلہ بجانے میں لکھنؤ میں اپنے عہد کا باکمال اُستاد تھا۔ محمد کرم امام خاں نے ۱۲۷۲ھ میں اپنی قابلِ قدر کتاب معدن الموسیقی مرتب کی تھی، اُس میں لکھا ہے: "طبلے میں اوّل بخشو ڈھاری اِس باج کا اُستاد ہوا۔ مسمّیٰ مِتّو بیٹا اُس کا کتیا اچھا ہے۔ اور سلاری خاں پسر ثانی گت پرن ہیں۔ چناں چہ دونوں اپنے کام میں اُستاد ہیں۔ بخشو و مکھو خاں راوی کے سامنے فوت ہوئے۔ اور مسمّیٰ بُجّو ڈیرے دار طبلے میں شاگردِ بخشو، الّا سب سے گوے سبقت لے گیا" (معدن الموسیقی، ص ۴۸)۔

برق : فتح الدولہ، بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، ابن مرزا کاظم علی، شاگردِ ناسخ (تذکرۂ نادر، شعلۂ جوالہ)۔ تاریخِ ولادت کا علم نہیں۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کی عمر "تخمیناً قریب بہ سی" لکھی ہے۔ [ریاض الفصحا کے زمانۂ ترتیب کے لیے دیکھیے اِسی ضمیمے میں آتش کے حالات] مصحفی نے مرزا کاظم علی کو "سرآمدِ صلحاے فرقۂ اثناعشریہ" لکھا ہے۔ کلکتے میں واجد علی شاہ کے ساتھ تھے اور وہیں انتقال ہوا۔ کمال الدین حیدر نے لکھا ہے: "بعد کئی مہینے کے جب عوارضِ لاحقہ سے اُن کا حال غیر ہوا، مردہ بہ دستِ زندہ ہو کر کوٹھی موچی کھولہ میں آ کے، دو تین دن کے بعد مر گئے۔ میرا (میرزا؟) احمد سوداگر کے باغ میں دفن ہوئے" (قیصر التواریخ، جلدِ دوم، ص ۴۰۹)۔ کلیاتِ منیر میں قطعۂ تاریخ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۷۴ھ میں مرے تھے۔

برق کا دیوان اُن کی زندگی میں ۱۲۶۹ھ میں مطبع سلطانی (لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ رضا لائبریری رام پور میں اِس اشاعت کا جو نسخہ محفوظ ہے، اُس کے سرورق پر برق کی ایک تحریر ہے، جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ : "حضرت سلطانِ عالم خلّد اللہ ملکہ نے ازراہ پرورشِ دقانہ زاد پروری کے اِس مجموعۂ پریشان کو چھپوا دیا۔" (اِس تحریر کے نیچے دستخط نہیں، لیکن یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ اُنھی کے قلم کی ہے)۔" واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی حزنِ اختر میں اُن کی وفات کا ذکر کیا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، اُن کی وفاداری کی تعریف کی ہے ...... ایک شہر آشوب جو اودھ کے انگریزی مقبوضات میں داخل ہونے کے بعد کا لکھا ہوا ہے، اُن کے دیوان میں نہیں۔ صفیر نے اِس کے جو منتخب اشعار جلوۂ خضر میں درج کیے ہیں، ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں" [قاضی عبدالودود۔ حواشیِ تذکرۂ شعرا ابنِ امین اللہ طوفان، ص ۳۹]۔ قاضی صاحب نے اس مسدس کے ۳۲ بند نقل کیے ہیں۔

پراچیوں کی گلی : اِس نام کی کسی گلی کا پتا نشان میں معلوم نہیں کر سکا، البتہ چوک کے علاقے میں "پارچے والی گلی" ضرور ہے۔ اِس کا امکان قوی ہے کہ اِس کا پرانا نام "پراچیوں کی گلی" ہو۔ اِس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ سرور نے چوک کا بیان کرتے ہوئے اِس گلی کا نام لیا ہے اور جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، فی الوقت اِس نام کی چوک میں یہی گلی ہے۔ "پراچہ" کے متعلق قتیل نے لکھا ہے : "اور پراچہ بھی ایک فرقہ ہے۔ یہ لوگ خیمے، خوان، زنبیاں وغیرہ شادیوں میں کرایے پر دیتے ہیں۔ کرایے کا وہ لباس بھی جو داماد کو شبِ عروسی میں پہنایا جاتا ہے، اُنھی لوگوں سے ملتا ہے" (ترجمۂ ہفت تماشا، مکتبۂ برہان دہلی، ص ۱۳۵)۔ "چوک میں گول دروازے سے گزرتے ہوئے بائیں ہاتھ پر جو موڑ ہے، اُس کو 'پارچے والی گلی' اِس لیے کہتے ہیں کہ ٹوپیوں کے بے سلے پلّے، کڑھی ہوئی ٹوپیاں، کڑھے ہوئے کرتے، چکن کے پارچے فروخت ہوتے ہیں۔ یہی گلی فرنگی محل کو جاتی ہے" (سید آغا مہدی : تاریخ لکھنؤ، ص ۵۶)۔ اِس میں بھی ایک طرح کی نسبت پائی جاتی ہے پراچہ سے۔ سرور کے زمانے میں اِس گلی میں کسی کھجور فروش کی مشہور دکان ہوگی۔ سرور کی کتاب فسانۂ عبرت (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی) میں ص ۶۲ پر "پارچیوں کی گلی" ہے۔ بظاہر یہ غلطیِ کتابت ہے، یہاں بھی "پراچیوں کی گلی" ہوگا۔

پکّا پُل : مراد ہے گومتی پر نواب آصف الدّولہ کے بنوائے ہوئے پُل سے (قیصر التواریخ، جلد اوّل ص ۱۱۲)۔ یہ پُل ۱۲۰۶ھ (۹۲-۱۷۹۱ء) میں بنا تھا۔ "پُلِ استوار و متیں" مادّۂ تاریخ ہے (تاریخِ اودھ، جلد سوم، ص ۲۹۶)۔ یہ پُل انگریزی زمانے میں کھدوا دیا گیا تھا اور اس کی جگہ "۱۹۱۴ء میں وہ پُل بن کر تیار ہوا جو اِس وقت ہمارے سامنے موجود ہے ..... یہ پُل اصل جگہ سے ہٹ کر بنایا گیا ہے" (تاریخ لکھنؤ، ص ۳۲۹)۔ اِس نئے پُل کو بھی "پکّا پُل" ہی کہا جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ "لوہے والا پُل" اِس سے مختلف پُل ہے۔

پیر بخارا : لکھنؤ کا قدیم محلّہ ہے۔ چوک کے گول دروازے سے امام باڑہ حسین آباد کو جو سڑک گئی ہے،

اُس پر ذرا نشیب میں واقع ہے۔" کاکوری جانے والی سڑک نے راستہ بلند ہونے سے اِس محلّے کو پست کر دیا۔ اِس وقت پیر بخارا دو سڑکوں کے بیچ میں ہے، کاکوری روڈ اور حسین آباد جانے کا راستہ دو طرف سے اِس محلّے کو گھیرے ہوئے ہے" (تاریخِ لکھنؤ، ص ۱۹۱)۔ ایک زمانے میں یہاں شُہدوں کے گھر بھی تھے اور یہاں کے شُہدے مشہور تھے۔ " اگر کسی شریف کا لڑکا آوارہ ہو جاتا ہے تو آج بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تو پیر بخارا کا شُہدا ہے" (تاریخِ لکھنؤ، ص ۱۹۱)۔ "پیر بخارا کا مشہور تعزیہ خانہ کالا امام باڑہ ہے، جس کو عہدِ آصفی میں نواب قاسم علی خاں خلیفِ سالار جنگ نے تعمیر کیا.... میاں مشیر کا مزاحیہ کلام اِسی محلّے اور محفل سے دُنیا میں نشر ہوا" (ایضاً)۔ آبِ حیات میں میر مستحسن خلیق کے ذیل میں اُن کے سفرِ لکھنؤ کے سلسلے میں اِس محلّے کا نام آیا ہے۔

پیر محمّد : دیکھیے شاہ پیر محمد۔

جدھا : دیکھیے کھجوا۔

جلوخانہ : اصلاً اِس کے معنی ہیں "وہ صحن جو سلاطین و امرا کے درِ دولت کے سامنے ہوتا ہے"۔ کمال الدین حیدر نے قیصر التواریخ میں غازی الدین حیدر کے متعلق لکھا ہے کہ "جلوخانہ بہت وسیع بنوایا" (جلد اوّل، ص ۲۳۸)۔ اِسی طرح شررؔ نے گذشتہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے: "قیصر باغ کا اندرونی صحن جس میں چمن بندی تھی، جلوخانہ کہلاتا تھا"۔ آصف الدولہ یا سعادت علی خاں کے احوال میں "جلوخانہ" کا تذکرہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ آصف الدولہ کے احوال میں قدیم محل "دولت خانے" کا ذکر آتا ہے جس میں آصف الدولہ رہا کرتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں بھی "روزِ مسند نشینی سے ۵ برس تک دولت خانے میں رہے" (قیصر التواریخ، جلد اوّل، ص ۱۷۱) جب سعادت علی خاں نے اپنا قیام "فرح بخش" میں مقرر کیا تو یہ مکانات خالی رہے اور اِس سبب سے خستہ و شکستہ ہو گئے" (تاریخِ اودھ، جلد سوم، ص ۲۹۹)۔ میرا خیال ہے کہ سرورؔ کی مراد غازی الدین حیدر کے بنوائے ہوئے جلوخانے سے ہے۔

چار درویش : دیکھیے میر امّن۔

چھجّو خاں : محمد کریم امام خاں نے اپنی کتاب معدن الموسیقی میں لکھا ہے کہ: "بہ عہدِ نواب شجاع الدولہ بہادر اور آصف الدولہ بہادر فیض آباد سے تا لکھنؤ یہ چند شخص بہت اچھے بجانے روزگار تھے: میاں جانی و غلام رسول .... میاں شوری، میاں چھجّو خاں کلاونت گوراری، میاں جیون خاں برادرِ کوچک چھجّو خاں.... اُسی عہد میں یہ سب فوت ہوئے" (ص ۳۲)۔ "چھجّو خاں قوم ڈھاڑی، ساکنِ لکھنؤ" (ایضاً، ص ۴۰) "پیار خاں و باسط خاں و جعفر خاں ولد چھجّو خاں مرحوم، برادرانِ حقیقی؛ بجانا رباب کا اِن پر ختم ہوا" (ایضاً ص ۳۳)

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے معروف موسیقی داں اور سوز خواں میر علی، دھرپد میں جھجّو خاں کے شاگرد تھے (ص ۳۸)۔

حسن : دیکھیے خواجہ حسن۔

حُسین : دیکھیے خواجہ حسین۔

حسین بیگ (مرزا) : "سرورؔ کے مختلف خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حسین بیگ اُن کے بہت گہرے دوست تھے .... بہت کچھ چھان بین کرنے کے باوجود اُن کے بارے میں کسی اور ذریعے سے کچھ نہ معلوم ہوسکا .... اتنا معلوم ہوجاتا ہے کہ مرزا حسین بیگ کا مکان لکھنؤ کے محلّے مفتی گنج میں تھا اور ان کا انتقال ۲۲ محرم ۱۲۸۲ھ ۱۷ جون ۱۸۶۵ء کو ہوا .... خیال ہوتا ہے کہ مرزا حسین بیگ سرورؔ کی مالی مشکلوں کے حل میں ہاتھ بٹاتے تھے" (ڈاکٹر نیر مسعود رضوی : رجب علی بیگ سرور، ص ۴۱۳)۔ سرورؔ نے مرزا حسین بیگ کے نام سے دو شعر فسانۂ عجائب میں لکھے ہیں (ص ۱۱۲۔ ص ۲۶۹)۔ اُردو کا شعر (حسرت پہ اُس مسافر بے کس کی روئیے ....) دراصل مصحفی کا ہے۔ دوسرا فارسی شعر ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ بھی اُن کا نہیں۔

حسین علی خاں : یہ قاسم علی خاں کے بیٹے اور نواب سالار جنگ کے پوتے تھے (سالار جنگ، آصف الدولہ کے ماموں تھے) موسیقی کے باکمالوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا: "نواب حسین علی خاں صاحب ٹپا گانے میں یکتائے روزگار اپنی طرز کے تھے .... اور خوش آوازی کے استاد تھے" (معدن الموسیقی، ص ۳۹)۔ موسیقی سے شغف ان کا خاندانی وصف تھا : "نواب سالار جنگ بہادر نیشاپوری .... ہولی، دھرپد گانے میں یکتائے روزگار تھے۔ نواب قاسم علی خاں بہادر پسر نواب سالار جنگ میراثِ پدری رکھتے تھے .... نواب سلطان علی خاں صاحب ولد نواب قاسم علی خاں صاحب دھرپد کے اُستاد تھے" (ایضاً، ص ۳۲۔ ص ۳۹)۔ محلّہ پیر بخارا میں کالا امام باڑہ، قاسم علی خاں نے بنوایا تھا اور حسین علی خاں کو اُس کا متولی بنایا تھا۔ غازی الدین حیدر نے ان کا ایک ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا اور "چاہے پانی پر کرسی تیشنوں میں بیٹھتے تھے" (قیصر التواریخ، ص ۲۴۰)۔ دیباچے میں سرورؔ نے جس طرح ان کا ذکر کیا ہے، اُس سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ حسین علی خاں، مشہور سوز خواں اور ماہر موسیقی میر علی کے شاگرد تھے۔ مجموعۂ دواوینِ رشک میں ان کا قطعۂ تاریخ انتقال موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کو انتقال ہوا تھا (مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۲۱۷)۔

خاص بازار : غالباً اِس سے مراد وہ بازار ہے جسے نواب سعادت علی خاں نے اُس زمانے میں بنوایا تھا جب وہ قدیم محل "دولت خانہ" سے کوٹھی فرح بخش میں منتقلاً منتقل ہوگئے تھے۔ نجم الغنی خاں نے لکھا ہے : "دو رویہ دکانیں کلکتے کی وضع پر تعمیر کرائی تھیں" (تاریخ اودھ، چہارم، ص ۸۶)۔ کمال الدین حیدر

نے فرح بخش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : "خاص بازار اور سڑک پر آب پاشی دونوں وقت کی مقرر ہوئی" (قیصر التواریخ، اوّل، ص ۱۷۳)۔ "خاص بازار: قیصر باغ کے پھاٹک سے پہلے جو بازار تھا ...... مقبرۂ سعادت علی خاں خاص بازار ہی میں تعمیر ہوا اور غازی الدین حیدر بہادر کی رہایش زمانۂ ولی عہدی میں اسی بازار میں تھی" (تاریخ لکھنؤ، ص ۳۸۸)۔ یہی بات کمال الدین حیدر نے لکھی ہے : "خاص بازار میں بڑے مرشد زادے نواب غازی الدین حیدر کے مکان میں دفن کیا" (قیصر التواریخ، اوّل، ص ۲۰۰)۔

خواجہ باسط : اپنے زمانے کے معروف درویش خواجہ محمد باسط، خواجہ محمد جعفر کے بیٹے اور امیر الامرا، صمصام الدولہ، خانِ دوراں خواجہ محمد عاصم کے بھتیجے تھے جو میر تقی میر کے اوّلیں مربّی تھے۔ خواجہ باسط ہی میر کو اُن کے پاس لے گئے تھے۔ صمصام الدولہ جنگِ نادر شاہ میں کام آئے تھے۔ اِن کے اجداد بدخشاں سے آئے تھے اور اکبر آباد (آگرے) میں متوطن ہو گئے تھے۔ خواجہ باسط وہیں پیدا ہوئے لیکن لڑکپن ہی میں اپنے چچا صمصام الدولہ کے اصرار پر دہلی چلے آئے تھے۔ اِن کے والد خواجہ محمد جعفر درویش تھے۔ خواجہ باسط اُنھی کے مرید ہوئے اور اُن کے انتقال کے بعد اُن کے خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے۔ دہلی کے حالات سے پریشان ہو کر نواب شجاع الدولہ کی فرمایش پر لکھنؤ چلے گئے تھے، وہیں ۱۱۷۸ھ میں انتقال ہوا تھا۔ "شیخ مومنین باسط" مادۂ تاریخ وفات ہے۔ لکھنؤ میں معالی خاں کی سرائے کے قریب رہتے تھے۔ خواجہ باسط کا ٹیلا اُنھی کے نام سے مشہور ہوا۔ سیر المنازل (مخطوطۂ میوزیم لال قلعۂ دہلی) سے معلوم ہوتا ہے کہ "درمیانِ ترکمان دروازہ و دہلی دروازہ .... حویلی ہائے خواجہ باسط" تھیں۔ خواجہ باسط کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ سفینۂ ہندی میں اُن کا ایک شعرِ فارسی مندرج ہے۔ لکھنؤ کے مشہور سوز خواں اور ماہرِ موسیقی میر علی، خواجہ باسط کے نواسے تھے۔ مزید تفصیلات اور خاندانی حالات کے لیے دیکھیے : مآثر الامرا، جلدِ اوّل، ص ۸۱۹ - ۸۲۵۔ سفینۂ ہندی، ص ۳۷، ص ۲۰۲۔ عماد السعادت (نول کشوری نسخہ) ص ۲۳۔ تاریخِ محمدی، ص ۷۷، ص ۱۰۶، ص ۱۹۸۔

خواجہ حسن : "حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بیٹے خواجہ ابراہیم .... کے ہیں .... اور ساکن پہاڑ گنج ہیں" (علی لطف : گلشنِ ہند)۔ خواجہ حسن مودودی اپنے زمانے کے مشہور صوفی تھے۔ اپنے چچا شیخ علی اکبر مودودی سے خرقۂ خلافت پایا اور سلسلۂ چشتیہ و قادریہ میں مختلف واسطوں سے اجازتِ بیعت پائی (نزہۃ الخواطر، جلدِ ہفتم)۔ "اکثر مسائلِ صوفیہ را کہ مراد از وحدتِ وجود باشد، بدلائل و براہین ...... از روے نقل و حدیث باثبات رسانیدہ و در ریختہ موزوں ساختہ" (مصحفی : تذکرۂ ہندی، ص ۷۲)۔ شاعری میں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ "بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں۔ علمِ موسیقیِ ہندی سے بہ خوبی ماہر ... علمِ نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں اور فقر و درویشی میں تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علومِ متداولہ سے بھی خوب

آگاہ ہیں، بخصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔ تو سُّل امورات دنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں سے ہے" (گلشن ہند)۔ "باوجود این ہمہ بزرگی، شوخ طبع و ظریف مزاج و تماشا دوست ... سرے بہ نسوان ہم دارد و قدم در راہ طلسم شعبدہ بازی نیز می گذارد" (تذکرۂ ہندی)۔ "بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے، اُس پر مرتے ہیں اور اکثر نام اُس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں" (گلشن ہند)۔ ۱۲۴۱ھ میں انتقال ہوا (نزہۃ الخواطر، جلد ہفتم، ص ۱۲۹-۱۳۰)۔

خواجہ حسین : خواجہ حسین چشتی مودودی، خواجہ حسن کے چھوٹے بھائی تھے (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) یہ نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کا قابل لحاظ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ خواجہ حسین سے متعلق ایک طویل واقعہ نجم الغنی خاں نے تاریخ اودھ (جلد چہارم، ص ۸۰-۸۴) میں لکھا ہے۔ رقعات قتیل میں بھی ایک جگہ ان کا نام آیا ہے (رقعات قتیل، مطبع محمدی، ص ۱۰۵)۔

خیر اللہ : دیکھیے شاہ خیر اللہ۔

دلکشا : "اس کوٹھی کو نواب سعادت علی خاں نے اپنے سیر و شکار کے واسطے بنوایا تھا اور جنگل گرد و پیش کو صاف کروا کر ایک چراگاہ مقرر کی تھی اور اس میں جانوران شکاری مثل ہرن وغیرہ چھڑوا دیے تھے۔ اس کوٹھی میں اکثر بیگمات بھی سیر کے واسطے آیا کرتی تھیں" (تواریخ نادر العصر، ص ۱۳۸)۔ نواب سعادت علی خاں مسند نشینی کے بعد شروع میں قدیم محل دولت خانے ہی میں رہا کرتے تھے، جب کوٹھی فرح بخش میں رہنا شروع کیا، تب اس کے قریب یہ عمارت بنوائی تھی (قیصر التواریخ، اول، ص ۲۷۱)۔ نیز دیکھیے : فرح بخش۔

دلگیر : "چھنو لال، طرب تخلص، ولد منشی رسوا رام، قوم کایستھ سکسینہ، وطن بزرگانش شمس آباد ..... خودش در لکھنؤ تولد شدہ وہم این جا نشو و نما یافتہ" (مصحفی : ریاض الفصحا)۔ شروع میں روش عام کے مطابق غزل گو تھے اور طرب تخلص تھا، بعد کو مرثیہ گوئی شروع کرنے کے بعد دلگیر تخلص اختیار کیا۔ مصحفی نے ان کا ذکر "طرب" کے ذیل میں کیا ہے، لیکن ان کے ایک شاگرد ذہین کے ترجمے میں یہ صراحت کر دی ہے کہ : "چھنو لال طرب کہ حالا دلگیر تخلص می گزارد و مرثیہ و سلام می گوید و نامے در مرثیہ گوئی پیدا کردہ" (ایضاً)۔

شروع میں مرزا خانی نوازش کے شاگرد تھے اور اس رشتے سے سرور کے استاد بھائی ہوئے۔ صاحب تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کی صراحت کے مطابق ناسخ سے بھی استفادہ کیا تھا : "جب مرزا خانی صاحب نے سکونت کان پور کی اختیار کی، حسب الارشاد اپنے استاد کے (وہ) شیخ ناسخ سے مستفید رہا" (خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، ص ۴۲۹)۔ صاحب تذکرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "سال یک ہزار و دو صد و سی ہجری [۱۲۳۰] میں شرف اسلام سے مشرف اور شیعۂ امیر المومنین سے ہم طرف ہوا"۔ مؤلف نے ان کا اس زمانے کا نام "غلام حسین" لکھا ہے۔ یہ بات ذہن میں

رہے کہ مؤلفِ تذکرہ ذاتی طور پر ان سے واقف تھا اور مراسم بھی تھے، نوازش کے ترجمے میں اُس نے لکھا ہے: "یہ چند شعر اُن کی بیاض سے میاں دلگیر کی معرفت دست یاب ہوئے تھے" (ایضاً ص ۲۲۴)۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اُس زمانے کے لکھنؤ میں کسی سُنّی کا شیعہ ہو جانا یا کسی ہندو کا شیعہ مذہب اختیار کر لینا کوئی عجیب بات نہیں تھی، اِس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

دلگیر اپنے زمانے کے معروف مرثیہ گو تھے۔ ۱۲۶۳ھ (۴۸-۱۸۴۷ء) میں انتقال ہوا۔ اسیر کا کہا ہوا مصرعِ تاریخ ہے: "وائے دلگیر عاشقِ شبیر" (تاریخ لطیف (خطی) رضا لائبریری، رام پور)۔

دوازدہ امام کی درگاہ: "نصیر الدین حیدر نے فرح بخش میں محل زنانے کے قریب ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا، جس میں بارہ کمرے نہایت شان دار اور وسیع رکھّے اور اُس کا نام "درگاہِ دوازدہ امام" مشہور تھا۔ قیمتی شامیانے زربفت کے پُرتکلف، جن میں آبدار موتیوں کی جھالریں کلابتون اور بادلے کی ٹنکی ہوئی تھیں، چاندی کے ستونوں پر، جن پر طلا کا کام تھا، اِستادہ تھے اور جھاڑ جن میں چالیس کنول شمع دار روشن رہتے تھے .... وہاں رکھّے گئے ...... اور ہر جگہ ضریح سونے چاندی کی رکھی گئی اور ہر امام کی ولادت کی تاریخ پر اُس امام کے .... مکان میں خوشی کا جلسہ ہوتا۔ اِسی طرح ہر امام کی شہادت اور وفات کی تاریخ میں حسبِ قاعدہ عزا مجلس برپا ہوتی" (نجم الغنی: تاریخ اودھ، جلدِ چہارم، ص ۳۹۵)۔

دھنیا کہاری: نصیر الدین حیدر کے محل میں "دھنیا کہاری دو سَو کہاریوں کی افسر تھی۔ بادشاہ کی ڈیوڑھیوں کی نظارت اور خواصوں وغیرہ کو جزا و سزا دینا، اہلِ محل کو ہدایت کرنا اس سے متعلق تھا.... افضل النسا خانم خطاب تھا اور چودہ پارچے کا خلعت مع سپر و شمشیر بادشاہ نے اُس کو دیا تھا۔ بادشاہ اور بڑے آدمی اُس کو "خانم" کہتے تھے" (تاریخ اودھ، چہارم، ص ۳۴۴)۔

سرور نے فسانۂ عبرت میں لکھا ہے: "ڈلہی و دھنیا کہاریاں دیکھیں، اُن کی دھوم دھڑکے کی سواریاں دیکھیں۔ دس پانچ لاکھ روپیہ خاطر میں نہ آیا، آشناؤں کو کھلایا" (فسانۂ عبرت، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، ص ۱۳)۔ اِس کے عروج اور رسوخ کی داستان پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کی چیز ہے۔ نواب نقی محمد خاں گویا اور راجا روشن سنگھ جیسے اہم افراد اِس کی ناراضی کا شکار ہو کے نصیر الدین حیدر کے عتاب کا نشانہ بنے تھے اور ذلیل ہوئے تھے (تفصیل تاریخ اودھ میں موجود ہے)۔ بے حد مال دار عورت تھی، متعدد عمارتیں اس نے تعمیر کرائی تھیں۔ من جملہ ان کے "دھنیا مہری کا پُل" مشہور ہے "سعادت گنج سے عالم نگر جانے میں یہ پل پڑتا ہے" (تاریخ لکھنؤ، ص ۱۴۶)۔ یہ پُل اب تک موجود ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر کو زہر دے کر ہلاک کرنے میں دھنیا مہری کا بھی ہاتھ تھا (تاریخ اودھ، چہارم، ص ۱۴۳)۔

رومی دروازہ : یہ عالی شان اور سر بہ فلک دروازہ نواب آصف الدولہ کا بنوایا ہوا ہے۔ اِسے امام باڑۂ آصفی کا بیرونی پھاٹک کہنا چاہیے "۔ یہ دروازہ اور امام باڑۂ کلاں دونوں اُس زمانے میں بننا شروع ہوئے تھے جب لکھنؤ میں قحط سالی تھی ..... جس سے غربا باشندۂ شہر پرورش پائیں" (تاریخِ اودھ، سوم، ص ۲۹۸)۔

" رومی دروازہ ایک عالی شان محراب دار پھاٹک ہے .... محراب پر ایک خوش نما بُرجی ہے اور گلائی پر سرتاسر کنگورہ دار کنگرے ہیں۔ اِس محراب کو نیچے کی طرف تین دروازوں میں تقسیم کیا گیا ہے ..... پہلوے رومی دروازہ میں اِس قدر وسعت اور سہ منزل نیچے سے اوپر تک اتنے کمرے ہیں کہ مدت تک شیعہ اسکول قائم رہا .... اندر ہی اندر اوپر جانے کا راستہ بھی ہے" (تاریخِ لکھنؤ، ص ۲۳۲)۔

سرِ راہ کی بارہ دری : نواب سعادت علی خاں نے بنوائی تھی۔ اُن کو "جب فرح بخش میں رہنا منظور ہوا، نواح اُس کا بہت پسند فرما کے بِنائے مبارک منزل اور کوٹھی دل آرام ہوئی .... اور بارہ دری سرِ راہ مقابلِ فرح بخش بنوائی" (قیصر التواریخ، اوّل، ص ۱۷۳)۔ اِس کو "لال بارہ دری" بھی کہتے تھے (گزشتہ لکھنؤ، ص ۱۸)۔ مگر سرِ راہ کی بارہ دری یا بارہ دری سرِ راہ متعارف نام ہے، مثلاً "اُس وقت بادشاہ ..... بارہ دری سرِ راہ میں ٹہلنے لگے" (قیصر التواریخ، اوّل، ص ۲۹۳)۔ غازی الدین حیدر کو جب انگریزوں نے بادشاہت دی تھی، تو "جلوسِ شاہی بھی اُسی میں ہوا اور آج تک دربارِ عام نواب گورنر جنرل کا اُسی میں ہوتا ہے" (قیصر التواریخ، اوّل، ص ۱۷۳)۔ غازی الدین حیدر نے فرح بخش اور بارہ دری کے درمیان نہر بنوائی تھی (ایضاً)۔

سلاری : دیکھیے : بخشو۔

سیّد حُسین خاں کے کٹڑے کا دروازہ : سیّد آغا مہدی نے تاریخِ لکھنؤ میں لکھا ہے : "سیّد حسین خاں عہدِ برہان الملک کے افسرِ فوج تھے، اُن کے کٹڑے میں حیدر حسین خاں نے چوک میں آنے والوں کے لیے ایک پھاٹک بنوایا، جو بجائے محراب دار ہونے کے صرف ایک چھت ہے .... نیچے دکانیں ہیں .... چوک سے پُرانے بزازے جانے کا قدیم راستہ یہی ہے۔ پچاس برس پہلے کے لوگ اِس کو "سیّد حسین خاں کا پھاٹک" کہتے ہیں" (ص ۱۷)۔ نیز دیکھیے ابو تراب خاں کا کٹڑا۔

سیّد محمّد (مجتہد) : سلطان العلما سیّد محمّد ابنِ مولانا سیّد دلدار علی غفران مآب۔ ولادت : لکھنؤ، ۱۷ صفر ۱۱۹۹ھ۔ علومِ عقلیہ و نقلیہ اپنے والد سے حاصل کیے۔ ۱۲۱۸ھ میں اپنے والد سے اجتہاد کا اجازہ حاصل کیا۔ امجد علی شاہ کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ آپ کے اختیار سے ایک مدرسۂ دینیہ (سلطان المدارس) بڑے پیمانے پر جاری ہوا اور آپ کے حکم سے تمام قلمرو میں مفتی مقرر ہوئے۔ سلطنت سے جو زکات نکالی جاتی تھی وہ آپ کے اختیار سے تقسیم ہوتی تھی اور آپ کو سرکارِ اودھ سے سلطان العلما کا خطاب ملا تھا، عام لوگ "بڑے قبلہ و کعبہ" کہتے تھے۔ وفات : ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ۔

امام باڑۂ غفراں مآب (لکھنؤ) میں دفن ہوئے (تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلما، ص ۳۴۲)۔ اپنے زمانے کے نہایت معروف و محترم عالم اور ادیب تھے۔ مرزا غالب سے آپ کے اچھے مراسم تھے۔

شاہ پیر محمد : شیخ پیر محمد۔ جون پور کے ایک گانو اماوان میں سنہ ۱۰۲۶ھ میں ولادت ہوئی۔ دہلی، مانک پور اور لکھنؤ میں کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ شیخ عبداللہ سیاح دکنی چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ پیر کی وصیت کے مطابق ساری عمر اشاعتِ علم میں مصروف رہے۔ بہت سے علمانے اِن سے علم حاصل کیا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ سنہ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی۔ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے مزار ہے اور یہ جگہ "ٹیلا شاہ پیر محمد" کے نام سے معروف ہے (نزہۃ الخواطر، جلد پنجم۔ تذکرۂ علماے ہند)۔ "شہر کے اتر رُخ گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد کا ٹیلا ہے۔ آگے وہی دارالعلم تھا۔ اکثر طلبہ و علما وہاں پڑھتے پڑھاتے تھے .... شیخ موصوف کو سوائے نعمتِ فقر کے، دولتِ علم بھی تھی .... زندگی میں وہ مقام اُس کا مسکن تھا، بعدِ مرگ مدفن ہوا (آرایشِ محفل، مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور، ص ۱۴۹)۔ یہاں ایک مسجد بھی ہے جو "ٹیلے والی مسجد" کہلاتی ہے۔ یہ قدیم عمارت ہے۔ شرر کا خیال یہ ہے کہ اِس مسجد کو اورنگ زیب نے بنوایا تھا (گذشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۶۱) "امام باڑۂ آصفی کے ساتھ اِس مسجد پر ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ ماتم کدے کو قلعہ اور خانۂ خدا کو ڈسپنسری بنایا اور ایک مدت کے بعد امام باڑے کے ساتھ واگذار ہوئی" (تاریخِ لکھنؤ، ص ۳۲۲)۔

شاہ خیر اللہ : مولوی خیر اللہ لکھنوی ابنِ مولوی محمد احمد۔ حافظ قرآن تھے۔ کتبِ رسمیہ پڑھ کر اشغال و اذکار کی جانب متوجہ رہے۔ ابتداے سن میں مولانا انوار الحق سے بیعت کی تھی، بعد کو مولانا عبدالوالی کے ہاتھ پر تجدیدِ بیعت کی۔ باغ مولوی انوار کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ باغ مولوی انوار کی مسجد کا صحن اور باغ کا کنواں انھی کا بنوایا ہوا ہے (مولوی عنایت اللہ انصاری فرنگی محلی: تذکرۂ علماے فرنگی محل، ص ۵۸)۔

شاہ خیر اللہ کے متعلق میں معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ لکھنؤ سے عزیزِ مکرم رئیس نعمانی صاحب نے تذکرۂ علماے فرنگی محل کے حوالے سے مولوی خیر اللہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ درج کیا گیا۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شاہ خیر اللہ وہی ہیں جن کا ذکر سرور نے کیا ہے، البتہ دیباچے میں سرور نے "مولوی انوار" کا ذکر کیا ہے اور یہ شاہ خیر اللہ، مولوی انوار کے مرید تھے؛ اس لیے امکان کا ایک پہلو تو نکلتا ہے اور اِسی بنا پر یہ عبارت درج کی جا رہی ہے۔

شاہ مینا : محمد، بن قطب الدین بن عثمان صدیقی لکھنوی، معروف بہ شاہ مینا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے (تاریخِ ولادت کا علم نہیں)۔ مختلف علما سے دینیات کی تکمیل کی۔ خرقۂ خلافت شیخ سارنگ سے حاصل کیا۔ اپنے زمانے کے معروف درویش تھے۔ زہد و عبادت میں دور دور تک شہرت تھی۔ وفات: ۲۲ ذی قعدہ سنہ ۸۷۳ھ یا سنہ ۸۸۰ھ یا

سنہ ۸۸۴ھ (نزہۃ الخواطر، جلد سوم ۔ اخبار الاخیار) ۔ آپ کا مزار لکھنؤ میں میڈیکل کالج کے متصل ہے اور اُس سڑک کا نام "شاہ مینا روڈ" ہے ۔ پہلے اِس جگہ کو "مینا نگری" کہتے تھے : "جس محلّے میں شیخ مینا کی درگاہ ہے اُسے "مینا نگری" کہتے ہیں ۔ اکثر لوگ شیخ شفیے کو فاتحہ کے واسطے وہاں جاتے ہیں اور بیشتر عوام النّاس فاتحہ ان کی گرمبے پر دلاتے ہیں" (آرایشِ محفل) ۔ شاہ مینا کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے (نزہۃ الخواطر اور اخبار الاخیار کے مندرجات لکھنؤ سے جناب رئیس نعمانی نے بھیجے ہیں، اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے) ۔

شوری : غلام نبی شوری، معروف موسیقار غلام رسول لکھنوی کا بیٹا تھا (جس کا نام فسانۂ عجائب کے دیباچے میں آیا ہے) " آگے اِس ملک میں رواج گانے ٹپّے کا نہ تھا، مسمّی غلام نبی متخلّص شوری نے اِس کا زمین زبانِ پنجاب ملائم و خوب صورت تصوّر کر، راہیِ پنجاب ہوا، وہاں چندے قیام کر، زبانِ پنجاب حاصل کر کے پھر واپس لکھنؤ ہوا اور ہر ایک راگ راگنی میں ٹپّا گایا اور بنایا ۔ چونکہ شوری از حد لایزدا تھا، لہٰذا قدر و منزلت اُس کی زیادہ ہوئی ۔ پیشہ گانے کا نہ کرتا، مجذوبانہ گزرتی .... الا شوری لاولد فوت ہوا ۔ مسمّی گاموں شاگرد رشید چھوڑا " (معدن الموسیقی، ص ۳۹) ۔ " بہ عہدِ نواب آصف الدّولہ .... مسمّی غلام نبی متخلّص شوری ولد میاں غلام رسول قوّال ساکنِ لکھنؤ بہ زبانِ پنجاب ٹپّے کا ایسا موجد ہوا کہ ہر ایک گانے کا رنگ مٹ گیا ۔ فقط آستائی اور انترا اس میں ہوتا ہے اور تحریر و زمزمہ و فقرۂ ولایتی شامل کر کے رواج دیا .. (ایضاً ص ۱۶۲) ٹپّا " ملکِ پنجاب میں بہ زبانِ ملک، از دو مصرع تا چہار مصرع، قافیہ جدا جدا، مضمون مرگ و افسونِ جاں پرورِ عشقِ دیگر " (ایضاً ص ۱۶۶) ۔

ظہور اللہ (مولوی) : مفتی ظہور اللہ ابنِ محمّد ولی ابنِ غلام مصطفیٰ انصاری لکھنوی ۔ ولادت : سنہ ۱۱۲۴ھ ۔ اپنے والد اور چچا مُلّا حسن سے تحصیلِ علم کی ۔ اپنے دور کے جیّد عالم تھے، فقہ میں خاص ملکہ حاصل تھا ۔ ہمیشہ تدریس و تالیف میں مشغول رہے ۔ متعدّد تصانیف ہیں ۔ نوّاب سعادت علی خاں کے عہد میں عہدۂ افتا پر فائز ہوئے تھے، پھر معزول کر دیے گئے تھے ۔ غازی الدین حیدر نے عہدے پر بحال کر دیا تھا ۔ وفات : سنہ ۱۲۵۶ھ ۔ (نزہۃ الخواطر ۔ تذکرۂ علمائے ہند) ۔

عبدالرحمٰن (مولوی) : مولوی عبدالرحمٰن ابنِ مولوی محمّد حسن ۔ چشتیہ سلسلے کے مشہور مشائخ میں سے تھے ۔ شکارپور (سندھ) کے نواح میں ایک گانو میں سنہ ۱۱۶۱ھ یا سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ متعدد علما سے تحصیلِ علم کی ۔ اور آخر میں مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی سے تکمیل کی ۔ درس و تدریس میں بھی مشغول رہے اور پھر اپنے بھائی سے سلوک کی تعلیم حاصل کی اور مختلف اولیا کے مزارات پر مقیم رہے ۔ آخر میں شاہ مینا کے مزار پر سات سال تک گوشہ گزیں رہے، پھر مسجد پنڈائن میں منتقل ہو گئے اور آخر تک وہیں رہے ۔ متوکّل اور گوشہ نشین تھے ۔ مسجد کو گھر کی طرح استعمال کرتے تھے

اور مسجد کے اندر بھی مزامیر کے ساتھ سرود و غنا کی محفل منعقد کیا کرتے تھے۔ وحدت الوجود کے مسئلے میں اپنے مخالفوں کو کافر سمجھتے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نزہتہ الخواطر، جلد ہفتم۔ ترجمہ تذکرۂ علمائے ہند، کراچی۔

عطا حسین خاں (صفحہ ۳۰) : محمد حسین عطا خاں تحسین، ابن میر باقر خاں شوق۔ اٹاوہ (یو۔پی) وطن تھا۔ اپنے زمانے کے معروف خوش نویس تھے، "مرصع رقم" خطاب تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن اُن کی اصلی شہرت صاحبِ نوطرزِ مرصع کی حیثیت سے ہے۔ یہ کتاب فارسی کے قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ "۱۷۶۸ء سے شروع ہو کر ۱۷۷۵ء میں تمام ہوئی اور دو ایک سال بعد کچھ عبارتیں اور مدحیہ قصیدے میں شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ کا نام لکھ کر ان کے حضور میں پیش کر دی گئی ہوگی۔ تحسین " شجاع الدولہ اور ان کے بعد آصف الدولہ کے دربار سے منسلک رہے۔" ان کے مزید حالات کے لیے دیکھیے مقدمۂ نوطرزِ مرصع، مرتبۂ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ وادین کی عبارتیں وہیں سے منقول ہیں۔ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے سرورق پر میر امّن کی یہ عبارت درج ہے : " باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امّن دلّی والے کا، ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع، کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصۂ چہار درویش سے۔"

عمدو (مولوی) : حالات نہیں ملتے۔ گذشتہ لکھنؤ میں ایک جگہ بس ان کا نام آیا ہے : "پتنگ بازی کے پُرانے نامی استاد لکھنؤ میں میر عمدو، خواجہ منّھن، شیخ امداد تھے" (گذشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۲۲۱)۔

عیش باغ : نوّاب آصف الدولہ نے بنوایا تھا۔ بہت بڑا رقبہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ساری پُرانی عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ "جس کوٹھی میں آصف الدولہ رونق افروز ہوتے تھے، اُسی میں بعد غدر، جب مارشل لا قائم ہوا ہے تو ہزاروں آدمی وہیں قتل کیے گئے اور غدر کے بعد لوگ اسے "خونی کوٹھی" کہتے تھے .... نوّاب ملکہ جہاں کی کربلا بھی عیش باغ کی زمین پر بنائی گئی تھی .... (یہ کربلا اب بھی موجود ہے۔ مرتّب) عیش باغ میں ایک میلہ دن میں ہوتا تھا۔ اُس کی بنا نوّاب آصف الدولہ بہادر نے ڈالی تھی۔ لوگ ساون کے چار جمعے تک جمع ہو کر میلہ کرتے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد جمعے کے ساتھ ہفتہ بھی شریک ہو گیا۔ میلہ نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ منشی شیو نرائن دہبی .... ساون کے آخری ہفتے میں اسی میلے کے وسط میدان میں ایک مختصر سا مشاعرہ اپنے دوست احباب کا کرتے تھے" [خواجہ عبد الرؤف عشرت : اودھ کے شاہی میلے، رسالۂ زمانہ (کانپور) جولائی ۱۹۲۶ء] واٹر ورکس کا محکمہ آج کل اسی علاقے میں ہے۔ نیز دیکھیے موتی جھیل۔

غازی الدّین حیدر : نوّاب سعادت علی خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں مسندنشینِ وزارت ہوئے۔ انگریزی حکومت کے اشارے پر بادشاہت کا اعلان کیا اور ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ (۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء) کو تخت نشین ہوئے۔ خطابِ بادشاہی ابو المظفر معز الدّین شاہِ زمن غازی الدّین حیدر بادشاہِ غازی مشہور ہوا۔

کروڑ روپے خزانۂ اندوختۂ جنّت آرام گاہ (سعادت علی خاں) سے تیاریِ تخت و سامانِ بادشاہی و اسبابِ جلوس میں صرف ہوا" (کمال الدین حیدر : قیصر التواریخ)۔ یہ بادشاہت انگریزوں کی عطا کردہ تھی اور اُن کی وسیع ۔ لاذیل حکمتِ عملی کی ایک کڑی تھی۔ انتقال : ۲۷ ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء)۔ اپنی ہی بنوائی ہوئی عمارت شاہ نجف میں دفن ہوئے۔

غلام رسول : اپنے زمانے کے مشہور ماہرِ موسیقی تھے۔ غلام نبی شوری، جو ٹپّے کا موجد کہلایا، انھی کا بیٹا تھا (معدن الموسیقی ص ۲۳)۔ لکھنؤ کے مشہور سوز خوان اور موسیقی دان میر علی خیال میں غلام رسول کے شاگرد تھے (ایضاً، ص ۳۸)۔ محمد کرم امام خاں مؤلفِ معدن الموسیقی نے اِن کے کمال کی بہت تعریف کی ہے (ص ۲۳)۔ "چند لوگ جو نامی گرامی تھے، اسم نویسی اُن کی بدیں تفصیل ہے : اوّل میاں جانی و غلام رسول، قوّالانِ نہایت خوش سلیقہ و خوش فکر، بے مثلِ زمانہ و باوضع و مہذب تھے اور تعظیم طلب۔ چناں چہ حسن رضا خاں صاحب نے نواب آصف الدولہ بہادر سے التماس کر کے اپنے مکان میں دونوں کو بلایا۔ وقتِ ملاقات کے فرمایا کہ میں بیمار ہوں، اُٹھ نہیں سکتا، آپ عنایت فرما کے بیٹھیے .... ہنوز وہ بیٹھے نہ تھے، رخصت تھہری کی اور یہ کہا کہ جب آپ کو صحت ہوتی، اُس وقت ہم کو طلب کرتے اور مکان اپنے سے استعفا حضور میں بھیج دیا۔ نواب صاحب نے سبب پوچھا۔ کہا کہ جب تک اِس سرکار میں ہماری قدر و منزلت تھی، ہم جاں نثار تھے، اب امّیدوار آزادی ہیں۔ نواب حسن رضا خاں نے ہماری تعظیم نہ کی، اب ہمارا گزارا غیر ممکن" (ایضاً، ص ۳۱)۔

فرح بخش : کپتان مارٹین کی کوٹھی تھی، جسے پچپن ہزار میں سعادت علی خاں نے اُن کے مرنے کے بعد مول لے کر اپنی عمارت میں ملا لیا اور فرح بخش نام رکھا اور اُس میں ایسی عمدہ تعمیرات اپنی طرف سے کیں جو قابلِ دید تھیں۔ نواب سعادت علی خاں قدیم محل دولت خانہ میں رہتے تھے۔ ایک بار بیمار ہوئے، "ڈاکٹر نے تبدیلِ آب و ہوا کے واسطے نقلِ مکان کو عرض کیا۔ کوٹھی جنرل مارٹین، جو کنارِ دریا تھی، اُس میں رونق افروز ہوئے ..... شفائے کلّی حاصل ہوئی۔ غسلِ صحت فرمایا، اِس جہت سے کوٹھی کا نام "فرح بخش" رکھا۔ جب اِس کا نیلام ہوا، پچپن ہزار کو مول لی" (قیصر التواریخ) "اِس میں نواب ہمیشہ اجلاس کرتے۔ اِس کوٹھی میں ایک نہر کاٹ کر تہ خانوں کے اندر لائی گئی تھی اور نہر کے اندر صحن میں کوڑیاں منقّش اور رنگین اِس طرح بچھائی تھیں کہ دو انگل بلندی سے پانی اُن پر ریزش کرتا تھا۔ اور مخمل اور اطلس کے پردے کارچوبی کام کے نہایت مکلّف اُس مکان میں لگے تھے ..." (تاریخ اودھ، جلدِ چہارم) اِسی کے نواح میں "سر راہ کی بارہ دری" تعمیر کرائی تھی۔ (اِس کا ذکر آچکا ہے)۔ اور اِسی کے پاس (زنانہ حصّے کے قریب) نصیر الدین حیدر نے "دوازدہ امام کی درگاہ" بنوائی تھی، جس کا ذکر آچکا ہے۔

فرنگی محل : یہ علمائے اہلِ سنّت کا سب سے اہم مرکز رہا ہے۔ "عہدِ اکبری میں ... لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ

بن گیا تھا .... ایک فرانسیسی تاجر نے، جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا، یہاں قیام کر کے .... سندِ مستامنی حاصل کر کے، یہاں اپنا اصطبل قائم کیا اور پہلے ہی سال اس قدر پھولا پھلا کہ چوک سے متصل چار عالی شان مکان تعمیر کر لیے .... اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی .... حکام شہر نے اُس کے مکانات ضبط کر کے نزولِ سرکار کر لیے .... وہ چاروں مکانات مدت تک سرکار کے قبضے میں رہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں، جب ملّا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادوں سے عاجز آ کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان انھیں دے دیے گیے .... جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک " فرنگی محل " کہلاتے ہیں۔ ملّا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز .... بن گیا .... ملّا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا نصابِ تعلیم، جو سلسلۂ نظامیہ کہلاتا ہے، مدتِ دراز سے ہندستان ہی کا نہیں، سارے ایشیا کا نصابِ تعلیم ہے" (شرر : گذشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۵۸-۵۹)۔

افسوس نے آرایشِ محفل میں لکھا ہے : " اور چوک سے متصل دکھن طرف فرنگی محل .... اورنگ زیب کے وقت میں .... مکانِ مسطور ملّا قطب الدین شہید کے فرزندوں کو ملا، چناں چہ اب تک بھی ان کی اولاد کی سکونت وہیں ہے، لیکن وجہِ معاش جو اُن کی بند ہوگئی، یہ صرف قصور طالع کا ہے ورنہ آج نواب وزیر کی سرکار سے ہزاروں پرورش پاتے ہیں" (آرایشِ محفل، مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور، ص ۱۵۵)

فرنگی محل کا میلا : میرے محترم جناب حیات اللہ انصاری (فرنگی محلی) نے میرے استفسار پر اپنے خط میں لکھا ہے : " فرنگی محل کے پاس سے ایک سڑک گزرتی ہے، اُس پر ایک میلا لگا کرتا تھا، جو بھنگیوں (لال بیگی بھنگیوں) کا میلا کہلاتا تھا۔ اس میں وہ لوگ اونچے اونچے بانس لے کر آتے تھے جن پر جھنڈے لگے ہوتے تھے اور ناریل لٹکتے ہوتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ یہ شاہ مدار کے نام کے ہیں۔ میلا اب بھی لگتا ہے لیکن اب بہت معمولی ہوتا ہے۔ جب میلا زوروں پر تھا، تب یہاں شوقین حضرات گھومتے پھرتے دکھائی پڑتے تھے .... اس میں کچھ طوائفیں بھی آتی تھیں اور کھیل تماشے بھی ہوتے تھے۔"

اِس میلے کا ذکر خواجہ عبدالرؤف عشرت نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے [" اودھ کے شاہی میلے" رسالۂ زمانہ (کان پور) جولائی ۱۹۲۶ء] ۔ سرور نے دیباچے میں فرنگی محل کے میلے کا ذکر اس سلسلے میں کیا ہے کہ سیکڑوں گھامڑ، بدگل، کندۂ ناتراش، اطراف و جوانب سے آ آ کے، گومتی میں غوطہ لگا کے وضعدار ہو گئے۔ ایسے ہی ایک تماش بین کو انھوں نے فرنگی محل کے اِس میلے میں بھیجا ہے [" میلے کے یار ہیں .... پہن لے، چلا جا فرنگی محل کے میلے کو"] ظاہر ہے کہ ایک بیرونی اور کندۂ ناتراش تماش بین کی تفریح کے لیے یہی میلا مناسب ہو سکتا تھا۔ (وہی مثل : جیسی روح، ویسے فرشتے) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کی مراد اِسی میلا سے ہے۔

جسے اب وکٹوریہ اسٹریٹ کہتے ہیں، یہاں بھی ہر منگل کو ایک بازار لگا کرتا تھا۔ لیکن وہ اصلاً میلا نہیں ہوتا تھا، ہفتے کا بازار ہوتا تھا۔ اِس کا حال آغا سید مہدی نے تاریخ لکھنؤ میں لکھا ہے (ص ۱۶۸)۔

قدسیہ محل : "بسم اللہ بیگم زنِ غریب، نواب بادشاہ محل کی پیش خدمتوں میں نوکر تھی ["بادشاہ محل ... یہ عورت بھی ایک کسبی تھی اور اس کا نام حسینی تھا ... مورد شفقت بادشاہی ہوئی ... بادشاہ محل خطاب پایا" تاریخ اودھ، چہارم، ص ۳۵۹] دفعۃً میلِ کلی شاہی اِس جانب ہوا۔ ان کی ترقی جاہ و حشمت سب سے بڑھ کر ہوئی ... ان کا خطاب " مخدرۂ زماں، مہد علیا، بلقیس دوراں، ملکۂ آفاق قدسیہ سلطان بانو بیگم" ہوا ... ظفر الدولہ اکثر اپنی صحبت میں کہتے تھے کہ اگر نواب معتمد الدولہ وزیر اعظم اور نواب قدسیہ محل جیتی رہتیں، اِن دونوں کے اخراجات سے غالب ہے کہ سلطنتِ اودھ بک جاتی" (قیصر التواریخ، اوّل، ص ۳۱۵)۔ قدسیہ محل نے (۱۲۵۰ھ = ۱۸۳۴ء میں) خودکشی کر لی تھی۔ نجم الغنی نے اِس واقعے کی تفصیل اِس عنوان سے لکھی ہے: "قدسیہ محل کا اپنے اگلے شوہر سے نطفہ بادشاہ کے نام سے بہم پہنچانا ... اس حمل حرام کا بھانڈا پھوٹنا، قدسیہ محل کا خودکشی کرنا" [تاریخ اودھ، چہارم، ص ۳۶۱]۔

کاظم علی (مرزا) : مرزا کاظم علی لکھنوی اپنے عہد کے معروف عالم تھے۔ غفران مآب مولانا سید دلدار علی (مجتہد) کے "ارشد تلامذہ میں سے تھے ... کتب دینیہ و تدریس و علم فقہ و اصول میں اشتغالِ تام رکھتے تھے ... اور صلاح و تقدس میں اپنے امثال و اقران پر فوق رکھتے تھے اور لکھنؤ کے رؤسا و امرا میں تھے" (تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلماء، ص ۲۹۵-۹۶)۔ ~~۱۲۴۰~~ ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی۔ کلیاتِ ناسخ میں قطعاتِ تاریخِ وفات موجود ہیں۔ اُردو کے مشہور شاعر مرزا محمد رضا برق اِنھی مرزا کاظم علی کے بیٹے تھے۔ رقعاتِ قتیل (مطبع محمدی) میں ایک جگہ مرزا کاظم علی کا جس طرح ذکر آیا ہے، اُس سے اُس زمانے میں اُن کی اہمیت کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ فرمایشِ کتابہای امامیہ کے سلسلے میں قتیل نے لکھا ہے: "اینگونہ نسخ درینہمیں زمانہ عزیز شدہ است، بیش تر کسے نمی رسید ... خلاصہ اینکہ ... ہر فروشندہ نسخۂ سادہ بر کاغذ کہ می آرد، بست روپیہ یا سی روپیہ قیمت آں میکند و میگوید کہ ایں نسخہ خیلے صحیح و محشّی و از نظرِ مرزا کاظم علی صاحب شاگرد مولوی دلدار علی صاحب گذشتہ است" (ص ۱۲۳)

کولی (شیخ) : رقعاتِ قتیل (مطبع محمدی) میں کئی جگہ اس کا نام آیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں لکھنؤ کا مشہور ترین حلوائی تھا۔ مثلاً قتیل نے ایک خط میں یہ اطلاع دی ہے کہ: "چون درین روزہا شاہزادہ مرزا جہانگیر دریں ملک آمدہ است، دیروز صاحب عالم بہادر از دمن شیرینی دکانِ کولی ... برای اِو بہ کان پور فرستادہ اند" (رقعۂ پنجاہ و یکم)۔ ایک خط میں کولی کی دکان کے پیڑے کا ذکر کیا ہے (رقعۂ صد و چہلم)۔ ایک خط میں لکھا ہے: "لیکن تا لب و دہنِ یاران آشنای مصنوعات کولی علیہ اللعن نگردد، چکیدنِ شیرۂ جان بر در فقر است۔

حلاوت آمیز از نے خامۂ جادو طراز محال است" (رقعۂ چہارم)۔

کھجوا : عیش باغ میں جدھا" ایک جھیل تھی، جس کے قریب تمام میووں کے درخت تھے اور اس سے کچھ فاصلے پر کھجوا، یہ بھی ایک جھیل کا نام ہے، جس میں اب تک تھوڑا بہت پانی رہتا ہے۔ اس جھیل کی تمام زمین کالی مٹی کی ہے اور یہاں کی مٹی برتنوں کے کام آتی ہے" [خواجہ عبدالرؤف عشرت : اودھ کے شاہی میلے، رسالۂ زمانہ (کان پور) جولائی ۱۹۲۶ء]

حیات اللہ انصاری صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا ہے : "میرے بچپن میں گلیوں میں لوگ گھومتے تھے اور آواز لگاتے تھے : کھوے کی مٹی، کھوے کی مٹی۔ یہ مٹی کالے رنگ کی ہوتی تھی اور عورتیں اس سے بال دھوتی تھیں، یعنی شیمپو کا کام دیتی تھی۔ کوئی تال تھا جس سے یہ مٹی نکالی جاتی تھی، اب وہاں محلہ بس گیا ہے"۔ کھجوا اب لکھنؤ کا مشہور محلہ ہے، جہاں معروف کتب خانہ "کتب خانۂ ناصریہ" ہے اور ان چشموں کا اب بس نام باقی ہے۔

گلاب باڑی : فیض آباد میں ہے۔ نواب شجاع الدولہ کا شاندار مقبرہ وہیں ہے۔ نواب صفدر جنگ کی لاش "پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جاکے زمین کے سپرد کی گئی، پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہڈیاں دہلی میں لے جاکے دفن کی گئیں" (گذشتہ لکھنؤ)۔ اس علاقے کی افیون اپنی عمدگی کی وجہ سے بہت اچھی سمجھی جاتی تھی۔

گلشنِ ارم : اس نام کی کسی کوٹھی یا باغ کا احوال نہیں ملا، البتہ "گلستانِ ارم" کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں ایک ہی عمارت کے نام ہوں۔ سرور نے فسانۂ عبرت میں نصیر الدین حیدر کے احوال میں لکھا ہے : "بادشاہ باغ پرفضا مرغوب تھا، گلستانِ ارم کا ہر کمرہ خوب تھا"۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ عمارت انھی کی بنوائی ہوئی ہوگی۔

گھنٹا بیگ کی گڑھیا (ص ۲۵۳) : لکھنؤ کا ایک محلہ ہے جو درگاہِ حضرت عباس کی پشت پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہاں گڑھیا ہوگی، گڑھیا پاٹ کر درمیان سے سڑک نکالی گئی، جس سے وہ زمین دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور دونوں طرف نشیب اب بھی موجود ہے۔ اس گڑھیا کے پاٹے جانے سے متعلق صاحبِ تاریخ لکھنؤ نے ایک روایت درج کتاب کی ہے (ص ۱۱۸)۔ اس "محلے کے رہنے والوں میں وارثِ تاج و تخت نواب مصطفیٰ خاں بہادر تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے : بڑے صاحب عالم اور چھوٹے صاحب عالم.... سڑک پر "چھوٹے صاحب عالم روڈ" لکھا ہے" (ایضاً، ص ۱۱۸)۔

سید آغا مہدی نے تاریخ لکھنؤ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "فاصل نگر" اور "گھنٹا بیگ کی گڑھیا" ایک ہی محلے کے دو نام ہیں لیکن "منصور نگر" کے ذیل میں شرر کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ عہدِ شاہ جہاں میں منصور نگر اور فاضل نگر دو محلے آباد کیے گئے تھے اور علاقہ یہی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ یا تو

"فاضل نگر" کا نام کسی وجہ سے "گھنشا بیگ کی گڑھیا" مشہور ہوگیا یا پھر "فاضل نگر" کی آبادی اس محلّے میں اِس طرح مل گئی کہ اُس کا علاحدہ وجود باقی نہیں رہا۔ لکھنؤ میں ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو "فاضل نگر" کے نام سے آشنا ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ گھنشا بیگ کی گڑھیا کا پرانا نام "فاضل نگر" تھا۔

للّو جی : اپنے زمانے میں کتھک رقص کا مشہور اُستاد تھا۔ "ناچنے میں اوّل للّو جی اور پرکاش کتھک، گت بھاؤ اور ارتھ بھاؤ میں بڑے اتھک، لکھنؤ میں اُستاد" (معدن الموسیقی، ص ۴۹)۔

مبین (مولوی) : ملا مبین فرنگی محلی لکھنوی۔ اکابر فقہائے حنفیہ میں تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ مجھ سے شیخ محمد نعیم بن عبد الحکیم لکھنوی نے بیان کیا کہ شیخ قطب الدین کی اولاد میں پہلے شخص تھے جنھوں نے فرنگی محل میں وعظ کی محفل آراستہ کی۔ اِن کی متعدد تصانیف نے شہرت پائی۔ وفات : ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ہفتم) [نزہۃ الخواطر کا یہ حوالہ لکھنؤ سے عزیزی رئیس نعمانی صاحب نے ترجمہ کرکے بھیجا ہے، اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے]۔

محمّد (آقا محمّد تبریزی۔ قاری) : اِن کے حالات مجھے نہیں ملے، البتہ اِن کے ایک مشہور شاگرد قاری جعفر علی جارچوی تھے [دہلی میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر سے اور قاری جعفر علی سے مذہبی امور میں ایسی بحث چھڑی تھی کہ وہاں "باقریہ" اور "جعفریہ" دو گروہ بن گئے تھے] تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلما میں اُن کے حالات میں لکھا ہے : "قراءت میں جناب قاری آغا محمد اصفہانی تبریزی وارِدِ لکھنؤ کے شاگرد تھے" (ص ۱۱۵)۔

محمد رضا (اخوند) : "آپ جناب غفراں مآب (مولوی دلدار علی) کے معاصرین میں تھے اور بڑے زاہد و عارف باللہ تارکِ دنیا تھے" (تذکرۂ بے بہا، ص ۲۰۲)۔ صاحبِ تذکرہ نے ان کے کئی واقعات لکھے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نواب سعادت علی خاں ایک بار آپ سے ملنے آئے تو آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔

محمد یعقوب انصاری (مولوی) : سرور کے عزیز دوست اور محسن تھے۔ سرور کی بیش تر کتابیں انھی نے چھاپی تھیں اور سرور کی مدد بھی کی۔ سرور نے اِن کو "سرخیلِ سروران کوچۂ صادق الاقراری" لکھا ہے (دیباچۂ شبستانِ سرور، ص ۵) نیز اُس کے خاتمت الطبع میں لکھا ہے : "حقِ تصنیف و تالیف اس مجموعۂ دل فریب کا جناب مولوی محمد یعقوب صاحب انصاری کو بعوضِ نقد محنت و امداد و اعانت ہبہ و بحل کیا اور چھاپنے ...... کا کامل اختیار دیا ہے ...... یہ چند کلمے بہ طریق ہبہ نامۂ حقِ تصنیف لکھ دیے کہ سند رہیں ......"

مولوی محمد یعقوب انصاری کئی مطبعوں اور اخباروں کے مالک تھے (اخترِ شہنشاہی ص ۱۹۵) ان میں سے ایک ہفتے وار اخبار "طلسم لکھنؤ" تھا جس کا "پہلا شمارہ ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء کو نکلا تھا" (مقالۂ مولانا رضا انصاری فرنگی محلی۔ مجلّہ اکادمی (لکھنؤ) جلد ۱ شمارہ ۳) دوسرا ہفتے وار اخبار "کارنامہ" تھا جس کا "پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۵ء کی تاریخ کا ہے ...... ہر شمارے کے ساتھ دو یا چار صفحات کسی دیوان یا کسی کتاب کے بالاقساط چھپا کرتے تھے جو اخبار کی تعداد سے زیادہ چھاپ لیے جاتے اور مکمل ہوجانے پر دیوان

یا کتاب کی شکل میں فروخت کیے جاتے۔ میرے پاس ایسی کئی کتابیں موجود ہیں" (ایضاً) مولانا رضا انصاری نے تذکرۂ علماے فرنگی محل (مؤلفہ مولانا محمد عنایت اللہ فرنگی محلی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان کی وفات ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۲۵ھ .... کو طویل علالت کے بعد ہوئی۔"

مولوی صاحب مطبع محمدی (فرنگی محل لکھنؤ) کے مالک تھے (اخترِ شہنشاہی ص ۲۲۳)۔ انھوں نے ۱۲۷۶ھ میں فسانۂ عجائب کا ایک اڈیشن مطبعِ افضل المطابع محمدی (محلۂ پٹکاپور، کان پور) سے شائع کیا تھا اور پھر ۱۲۸۰ھ میں اسی کتاب کو مطبعِ افضل المطابع (فرنگی محل لکھنؤ) میں چھاپا تھا۔ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مطبعے انھی کے تھے۔ اس کے علاوہ مطبعِ نجم العلوم (لکھنؤ) کے مالک بھی غالباً یہی تھے۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے، نطق تخلص تھا۔ صبا لکھنوی کا دیوان غنچۂ آرزو انھوں نے اپنے مطبعِ محمدی میں ماہِ رجب ۱۲۷۲ھ میں چھاپا تھا، اُس کے آخر میں اُنھوں نے لکھا ہے: "عاصیِ پُرمعاصی .... محمد یعقوب انصاری متخلص بہ نطق" اُنھوں نے "قطعۂ تاریخِ ترتیبِ دیوان" بھی لکھا ہے، جس کا شعرِ آخر یہ ہے:

بلبلِ طبع نے اے نطق عجب موسم میں ۔۔۔ کہی تاریخ تمامی کی "گلستانِ سخن"
۱۲۷۱

(نیز اسی سلسلے میں دیکھیے ضمیمہ۲ میں ص ۲۲ اور ص ۲۳ کے حواشی)۔

مخدوم (مولوی، سیّد) : مولوی مخدوم لکھنوی ابنِ حافظ محمد نواز۔ اِن کے دادا مشہد سے دہلی آئے، وہاں سے آکر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ مُلّا نظام الدین (بانیِ درسِ نظامیہ) کے شاگرد تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ لکھنؤ میں ۱۲۲۹ھ میں انتقال ہوا۔ کلیاتِ ناسخ میں قطعۂ تاریخِ وفات موجود ہے، (تذکرۂ علماے ہند) "مخدومِ زمانہ مُردِ صد حیف" مصرعِ تاریخ ہے۔

مدہوش : لالا درگا پرشاد مدہوش، لالا جے نراین کے بیٹے اور راجا رام رتن کے پوتے تھے۔ مدہوش کے دادا محمد شاہ کی سرکار میں اور اُن کے باپ (جے نراین) شاہ عالم کی سرکار میں ملازم تھے۔ مدہوش دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن جوانی میں کان پور چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔" از دوستان و شاگردانِ قاضی محمد صادق اختر"۔ ۱۲۵۵ھ میں انتقال ہوا۔ "در سنہ خمس و خمسین از مأۃ ثالث عشر ازین جہان کوچید" (تذکرۂ صبحِ گلشن، ص ۳۹۸)۔

مرزائی صاحب : .. مراد ہے مشہور خطّاط میرزا محمد علی ابنِ میرزا خیراللہ فرمان نویس سے۔ دہلی میں نوّاب عماد الملک کی سرکار میں مدّت تک ملازم رہے۔ پھر فرخ آباد گئے اور وہاں سے لکھنؤ آکر سکونت اختیار کی۔ غلام محمد دہلوی (ہفت قلم) نے اپنے تذکرۂ خوش نویساں میں اِن کا مفصّل حال لکھا ہے۔ عہدِ حکومتِ آصف الدّولہ میں مؤلفِ تذکرہ نے مرزا محمد علی سے لکھنؤ میں ملاقات کی تھی، اُسی زمانے میں مرزا محمد علی "براستادیِ مرزا وزیر علی خاں برای اصلاحِ خطِ نستعلیق مقرر شدہ بودند"۔ اُنھوں نے مزید لکھا ہے کہ: "بردتۂ آقا عبدالرشید یکتای زمانہ"۔

مسجد (ص۱۱): مراد ہے امام باڑۂ آصف الدولہ کی مسجد سے، جسے مسجدِ آصفی بھی کہتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اِسی مسجد میں حضراتِ شیعہ کی نمازِ جمعہ ہوتی ہے۔

معتمد الدّولہ : سیّد محمد عرف آغا میر۔ "نوّاب غازی الدین حیدر کے یہاں ایّامِ صاحب زادگی اور ولی عہدی سے پیش خدمتوں کے زمرے میں ملازم تھے" (تاریخِ اودھ، چہارم)۔ غازی الدین حیدر نے مسندِ وزارت پر بیٹھنے

کے بعد ان کو "خلعتِ نیابت ...... دیا۔ خطاب نواب معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خان بہادر ضیغم جنگ ملا" (قیصر التواریخ) نواب غازی الدین حیدر جب بادشاہ ہوئے تو یہ وزیرِ اعظم بنائے گئے۔ شیخ ناسخ ان کے متوسلین میں سے تھے اور مرزا غالب نے بھی ان کا توسّط حاصل کرنا چاہا تھا۔

آغا میر کے عروج و زوال کی داستان اور ان کے زمانۂ اقتدار کے واقعات حیرت آفریں بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ ان کی تفصیل تاریخ اودھ جلد چہارم اور قیصر التواریخ جلد اوّل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر کو "نطفۂ ناتحقیق" مشہور کر دیا تھا (تاریخ اودھ)۔ نصیر الدین حیدر نے بہت احتیاط اور اہتمام کے بعد ان پر عتاب نازل کیا۔" یہ واقعہ ۱۲۴۳ھ کا ہے" (تاریخ اودھ)۔ انگریزی رزیڈنٹ کی دخل اندازی کی بنا پر رسوائی سے بچ گئے اور خانہ نشین کر دیے گئے۔ اس پر بھی یہ عالم تھا کہ" اگرچہ یہ مجال نہ تھی کہ مکان سے باہر قدم رکھیں، لیکن دونوں وقت گھر میں ایک دربارِ عظیم برپا رکھتے تھے اور دریاے انعام و اکرام نے آگے سے زیادہ تموّج شروع کی" (ایضاً)۔ آخر کار" رزیڈنٹ نے .... بادشاہ کو .... اس بات پر رضا مند کیا کہ وہ تمام نقد و جنس سمیت کان پور چلے جائیں .... معتمد الدولہ اکتوبر ۱۸۳۱ء میں کان پور میں اقامت گزیں ہوئے .... دو شنبہ ۵ ذی الحجہ ۱۲۴۷ھ مطابق ۷ مئی ۱۸۳۲ء کو دنیا سے انتقال کیا، کان پور میں دفن ہوئے" (تاریخ اودھ، چہارم)۔

مقبرے (ص ۱۲) : مراد ہے نواب سعادت علی خان اور ان کی بیگم کے عالی شان مقبروں سے، جو قیصر باغ کے شمال میں آج بھی موجود ہیں [مفصّل حالات کے لیے دیکھیے سید آغا مہدی کی تاریخ لکھنؤ ص ۳۰۴ سے ۳۰۸ تک]۔

مکّا (خیّاط) : "مکّا درزی خیر آباد کا رہنے والا، نصیر الدین حیدر کے اوائلِ جلوس میں بادشاہی درزیوں کے زمرے میں نوکر ہوا .... تمام درزیوں کا .... داروغہ ہوتے ہوتے مصاحبت کے رتبے کو پہنچ گیا اور" مکّا خان" کہلا کر مشمولِ عواطفِ شاہانہ ہوا .... چند سال میں لاکھوں روپے حساب میں باندھ لیے .... بہت سے علاقے کا مالک ہو گیا۔ لکھنؤ میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں .... ایک کٹرا تعمیر کیا اور مکّا گنج .... دریاے گومتی کے اس پار بنایا اور مسافروں کی سرائے بھی بنائی .... اس کی سواری کا جلوس اُمرا کی سواری سے کم نہ ہوتا تھا، کسی سردار کو خیال میں نہ لاتا تھا .... جس قدر بادشاہی لباس اور محلاتِ شاہی کی فرمایشات میں روپیہ صرف ہوتا، اس قدر آمدنی کا مُلک اس کو دیا گیا تھا" (تاریخ اودھ، چہارم)۔ آخر کار اُمرا اور اہلکاروں نے تنگ آ کر ایسی تدبیر کی کہ نصیر الدین حیدر کو اس کی طرف سے برگشتہ کر دیا اور اس کی گرفتاری اور حساب فہمی کا حکم ہوا۔" ۴ ماہِ شوال ۱۲۵۲ھ کو مکّا کو استری منجن میں قید کیا" (ایضاً، ص ۳۲۷)۔ سرور نے فسانۂ عبرت میں لکھا ہے : "مکّا خیاط کی قطع سب سے نرالی رہی .... ہزار روپے روز گری کے پوشاک کے مقرر تھے۔ صبح نواب کی خدمت میں آیا، صورت دیکھ کے توڑا منگایا۔ اور جاڑے کی پوشاک کے سوا لاکھ ملا کیے۔ اس نے کئی لاکھ روپے کی عمارت اپنی ویران بستی میں بنائی اور لکھنؤ میں گنج، سرا، مسجد تعمیر کی" (فسانۂ عبرت

مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، ص ۱۴)۔

منصور نگر : لکھنؤ کا مشہور محلّہ ہے۔ "عہد شاہ جہانی میں یہاں کے (لکھنؤ کے) صوبے دار سلطان علی شاہ قلی خاں تھے، اُن کے دو بیٹے تھے : مرزا فاضل اور مرزا منصور۔ انھی دونوں کے نام سے اُنھوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دو نئے محلّے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کیے" (گذشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۵۹) [اور "محمود نگر" کے متعلق شرر نے لکھا ہے : "اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبے دار جواہر خاں تھے .... اُن کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں، اُس سے ملے ہوئے، داہنی طرف "محمود نگر" اور بائیں طرف "شاہ گنج" آباد کیے"۔

یہ صراحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ میر حسن رضوی کا مطبع حسنی (جہاں سے فسانۂ عجائب پہلی بار ۱۲۵۹ھ میں اور پھر ۱۲۶۳ھ میں چھپی تھی) محمود نگر ہی میں تھا۔ نیز محمد مصطفیٰ خاں کا مطبع مصطفائی (جہاں سے فسانۂ عجائب ۱۲۶۲ھ میں چھپی تھی) اسی محلّے میں تھا]۔

مگہ : دیکھیے مہوبا۔

موتی جھیل : عیش باغ میں تھی۔ سرور نے فسانۂ عبرت میں لکھا ہے : "عیش باغ میں بنائے آصفی موتی جھیل ہے"۔ صاحب نور اللغات نے لکھا ہے : "عیش باغ میں ایک تالاب تھا۔ اب اس تالاب میں پانی نہیں ہے بلکہ زراعت ہوتی ہے۔ اس سرزمین کا نام موتی جھیل اب تک ہے۔ ناسخ :

جب سے ہے پنہاں نظر سے عیش باغ چشمِ گوہر بار موتی جھیل ہے"۔

سرور نے جو "بنائے آصفی" لکھا ہے، اُس سے صاحب نور اللغات کے اس قول کی بہ ظاہر تائید ہوتی ہے کہ دراصل یہ ایک بڑا تالاب (یا چشمہ) ہوگا۔

مولوی : سوز خوانی میں میر علی کے شاگرد تھے۔ صاحب معدن الموسیقی نے میر علی کے احوال میں لکھا ہے : "اور مولوی شاگرد اُن کے، قوم قوّال، ساکنِ لکھنؤ استادِ کامل تھے۔ اب اچھے صاحب ولد مولوی صاحب، و امداد حسین نواسۂ مولوی ولد غلام عباس ..... بہت اچھے ہیں" (ص ۵۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِس کتاب کی تصنیف کے وقت (یعنی ۱۲۷۲ھ میں) مولوی مر چکے تھے۔ سرور نے یہ جو لکھا ہے کہ "مولوی سب میں پری زاد ہوا" اس سے بہ ظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولوی حُسنِ صوت کے ساتھ ساتھ حُسنِ صورت کے بھی مالک تھے۔ اگر اس میں کوئی تلمیح بھی ہے تو اُس کا علم نہیں، امکان ضرور ہے بل کہ قوی ہے۔

مہوبا : مگہ اور مہوبا مشہور شہروں کے نام ہیں، جہاں کے پان مشہور رہے ہیں۔ سرور نے فسانۂ عبرت میں لکھا ہے : "شہر کے تنبولی اس اسیٹھ میں سیٹھ ہو گئے، مہوبے اور مگہ میں پان نہ رہے" (ص ۱۵)۔ فسانۂ عجائب کے نسخۂ محمدی کان پور (م) کے حاشیے پر غالباً اربابِ مطبع نے لکھا ہے : "مگہا : شہر کا نام ہے عظیم آباد کے قریب اور

ہوبا، بندیل کھنڈ میں ہے۔ پان خوب ہوتے ہیں۔" مگہ کے پان کو "مگھئی" اور مہوبا کے پان کو "مہوبا" کہا جاتا تھا۔ "حق تو یوں ہے کہ مگھی نہایت نفیس و لطیف و خوش بو ہوتا ہے۔" (آرائشِ محفل، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۲۲)۔

میر امّن : میر امّن نام، لطفؔ تخلّص، دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو "ماتحت منشی" کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازم ہوئے۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ نے فارسی کی کتاب قصّۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بہت مشکل اور مسجّع و مقفّا عبارت میں تھا۔ گل کرسٹ نے میر امّن سے فرمایش کی کہ وہ اس کو بول چال کی زبان میں لکھیں۔ میر امّن نے نو طرزِ مرصّع کو بنیاد بنایا اور اصل فارسی کتاب کو بھی سامنے رکھا اور اس طرح جدید اُردو نثر کی پہلی کتاب عالمِ وجود میں آئی جو آج بھی زبان کے حقیقی حسن اور تاثیر کی طاقت سے معمور ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۲ء سے پہلے (ازا) مکمل ہوئی تھی۔ "باغ و بہار" تاریخی نام ہے، جس سے سالِ (۱۲۱۷ھ) نکلتا ہے۔ شروع میں اس کتاب کا نام "چہار درویش" ہی تھا اور پہلی بار اس کے ۱۰۲ صفحے اسی نام سے چھپے تھے جو گل کرسٹ کی مرتبہ کتاب ہندی مینول میں شامل ہیں۔ یہ انتخابی مجموعہ ۱۸۰۲ء میں چھپا تھا۔ مکمل کتاب باغ و بہار کے نام سے پہلی بار ۱۸۰۴ء (۱۲۱۸ھ) میں ہندستانی پریس کلکتہ میں چھپی تھی۔ میر امّن نے ملّا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب اخلاقِ محسنی کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا تھا، جو گنجِ خوبی کے نام سے دوبار چھپ چکا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے عتیق صدیقی کی کتاب گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ سنینِ ولادت و وفات کا علم نہیں؛ بس یہ معلوم ہے کہ وہ ۴ جون ۱۸۰۶ء تک کالج میں ملازم تھے۔ [عتیق صدیقی : ہماری زبان (علی گڑھ) ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء]

میر علی (خطّاط) : خواجہ میر علی تبریزی۔ ان کو خطِ نستعلیق کا استاذ الاساتذہ کہنا چاہیے۔ "پیش تر ہم خطِ نستعلیق می نوشتند، لیکن این مردِ بزرگوار قواعد در خطِ نستعلیق مقرر نمودہ و نزاکتے بہم رسانیدہ۔ در زمانِ امیر تیمور صاحبقران خواجہ میر علی شہرت پیدا کرد۔" (غلام محمد دہلوی : تذکرۂ خوش نویساں، ص ۴۲)۔

تذکرۂ خوش نویساں کے حاشیے پر مصحّح نے لکھا ہے : "قاضی نور اللہ شوستری در مجالس المومنین اشعارے چند ... از رسالۂ منظومۂ مولانا سلطان علی مشہدی نقل کردہ ....."۔ ۱۳ شعر نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے چار شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں :

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است ،، واضع الاصل خواجہ میر علی است
نے کلکش از آں شکر ریز است ،، کاصلش از خاکِ پاکِ تبریز است
کاتبانیکہ بہتر و نویسند ،، خوشہ چینانِ خرمنِ او بیند
در جمیعِ خطوط بودہ شگرف ،، زاوستادان شنیدہ ام این حرف

میر علی (سوز خواں) : میر نصیر کے بیٹے اور خواجہ باسط کے نواسے تھے۔ اپنے زمانے کے معروف ترین سوز خواں

تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ معدن الموسیقی کا مرتب کرم امام خاں اِن کا شاگرد تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ اِن کے کمالات کا اور ان کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے (ص ۵۱-۵۲) اور اِن کو موسیقی میں اپنے عہد کا "نائک" بتایا ہے۔ موسیقی میں اِن کی ایجادات کا بھی ذکر کیا ہے (ص ۱۴۴-۱۴۵)۔ اِس کے ساتھ ساتھ بے نیازی میں بھی بے مثال تھے: "ایسے پابندِ وضع رہے یعنی ہر عہد میں بجز مکان اپنے، دوسری جگہ تشریف نہ لے گئے .... اور جناب میر علی صاحب شاگرد دھرپد میں جھجو خاں کے، اور خیال میں میاں غلام رسول خان کے .... اور ٹپّے میں میاں شوری، اور مقاماتِ فارسی میں مُلّا محمد صاحب کے تھے" (معدن الموسیقی، ص ۳۸)۔ لکھنؤ کے محلۂ تحسین گنج میں رہتے تھے (تاریخِ لکھنؤ، ص ۲۲۷)۔ ۱۲۵۸ھ میں انتقال ہوا (مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۴۱۳)۔

میرک جان: عہدِ نصیر الدین حیدر میں تھے اور اپنے زمانے کے مشہور پیراک تھے۔ "جل یانک" کے ذیل میں شررؔ نے گذشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے کہ "لکھنؤ میں پیرنے کے ایک استاد میرک جان نے اسے ایجاد کیا ___ مقصد یہ تھا کہ گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کریں اور اسے باندھ لائیں۔" لکھنؤ کے ایک پیراک مرزا اکبر حسین نے ۱۹۰۸ء میں "ایجادِ اکبری یعنی رسالۂ پیراکی" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی (مطبوعہ تصویرِ عالم پریس لکھنؤ) اُس میں نصیر الدین حیدر کے اُستاد اور اُس عہد کے مشہور پیراک میر مچھلی اور میرک جان کے دل چسپ مقابلے کا حال تفصیل سے لکھا ہوا ہے، جس میں میرک جان کامیاب رہے تھے۔ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی، اِس کے مندرجات سے ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی نے مطلع کیا ہے اور بہ قولِ نیّر مسعود صاحب: "تعجب کی بات یہ ہے کہ شررؔ لکھنؤ کے باکمالوں میں نصیر الدین حیدر کے اُستاد میر مچھلی کے بجائے، اُن کے حریف میرک جان کا ذکر کرتے ہیں۔" اِس کی بس یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ سرورؔ نے دیباچۂ کتاب میں میرک جان کا نام بعد کو شامل کیا ہے۔

میر نصیر: لکھنؤ کے مشہور سوزخوان اور ماہرِ موسیقی میر علی کے والد اور مشہور صوفی خواجہ باسط کے داماد اور خلیفہ تھے۔ نواب آصف الدولہ کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔

ناسخ: شیخ امام بخش ناسخؔ، شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن خود دبستانِ لکھنؤ کے اوّلین اُستاد تھے۔ ناسخؔ کی اہمیت کا اندازہ اِس سے کیا جاسکتا ہے کہ مصحفیؔ جیسے پُرانے اُستاد کو آخر آخر میں لکھنؤ کے مشاعروں میں سرسبز ہونے کے لیے طرزِ ناسخؔ میں شعر کہنا پڑے تھے۔ ناسخؔ کے تلامذہ میں سے رشکؔ نے خاص کر زبان اور قواعدِ شاعری کے مباحث کو عام کیا۔ اس کی مفصل بحث کے لیے دیکھیے مقدمۂ انتخابِ ناسخ، مکتبۂ جامعہ، دہلی۔ ناسخؔ کا کلیات پہلی بار ۱۲۵۸ھ میں مطبعِ محمدی لکھنؤ میں چھپا تھا۔ دوسری بار یہ کلیات شہزادہ مرزا فرخندہ بخت کی فرمایش پر مطبعِ مولائی لکھنؤ سے ۱۲۶۲ھ (۴۶-۱۸۴۵ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مصطفیٰ خاں کی فرمایش سے کارخانۂ علی بخش خاں (لکھنؤ) سے ۱۲۶۷ھ میں شائع ہوا تھا۔ انتقال: پنجشنبہ ۲۴ر جمادی الاوّل ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء)۔

نصیر الدین حیدر: ابنِ غازی الدین حیدر۔ "ستائیسویں شہرِ ربیع الاوّل یوم شنبہ ۱۲۴۳ھ اور بیسویں اکتوبر ۱۸۲۷ء تھی کہ مرزا نصیر الدین حیدر نے .... جلوس .... سریرِ سلطنت پر کیا" (رجب علی بیگ سرورؔ، فسانۂ عبرت)۔ اور "تیسری ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ مطابق ۷ر جولائی ۱۸۳۷ء جمعے کو چار گھڑی رات گئے .... روح اس جانِ جہاں کی

بہشت برین کو بلند پرواز ہوئی" (ایضاً، ص ۱۷)۔ ان کو زہر دیا گیا تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس میں دھنیا کہاری بھی شامل تھی۔

نوازش : نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی "خلف الصدق حسین علی خان ابن نواب ناصر خان صوبہ دار کابل۔ متخلص نوازش ۔۔۔ شاگرد بلکہ قائم مقام میر سوز۔ بندہ اُن کی ملاقات سے گاہے گاہے بہرہ اندوز۔ ادا بندی کا اختتام نزاکت شعر خوانی اُن پر تمام ۔۔۔ چند روز سے بہ سبب خرید کرنے دیہات نیلام کے کان پور میں تشریف رکھتے ہیں گاہے گاہے لکھنؤ میں بھی آجاتے ہیں" (خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ)۔

مصحفی نے لکھا ہے کہ: "خود در اکبر آباد تولد شدہ و در لکھنؤ نشو و نما یافتہ (ریاض الفصحا)۔ نیز دیکھیے مقالۂ قاضی عبدالودود صاحب: نوازش لکھنوی؛ رسالۂ آجکل (دہلی) جولائی سنہ ۱۹۶۲ء۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے: "میرا خیال ہے کہ نوازش ۱۱۹۲ھ کے لگ بھگ متولد ہوئے ہوں گے۔ دیوانِ شہید (نسخۂ کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ نوازش کا سالِ وفات ۱۲۷۱ھ ہے۔"

نوازش اپنے زمانے کے معروف شاعر تھے۔ دلگیر اور سرور دونوں اِن کے شاگرد تھے اور وہ خود میر سوز کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان چھپا نہیں؛ اس کا ایک خطی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے اور میں نے اُس سے استفادہ کیا ہے۔

نہر (ص ۲۱) : اِس نہر کی کھدائی نصیر الدین حیدر نے شروع کرائی تھی۔ "راجا بختاور سنگھ نے یہ امر بادشاہ کے گوش گزار کر دیا تھا کہ اس نہر سے پانی گنگا کا لکھنؤ تک آئے گا اور اس کے سبب سے تجارت اور زراعت کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ چوں کہ کسی انجینیر کی صلاح و مشورہ اس میں نہ تھا، اس لیے یہ امر اختتام کو نہ پہنچا اور اکثر ٹھیکے داروں کو ۔۔۔ دولت مند کر دیا۔ یعنی وہ لوگ روپیا لے کر بھاگ گئے اور اس نہر کو ناتمام چھوڑا"۔ (تاریخ اودھ، چہارم، ص ۲۴۹)۔ "نہر جدید کا انتظام، گنگا سے لانا اٹھائیس کوس کے فاصلے سے، راجہ بختاور سنگھ کو دیا۔ ٹرکٹ صاحب تجارنا دانستگی سے اِس کے کھدوانے پر مامور ہوئے۔ ع: کار ہر مرد نیست نجاری۔ وہ کیا جانیں کام مہندس کا ۔۔۔۔ ہے ۔۔۔۔ اٹھائیس ہزار زمینِ زراعت گئی اور مقام پناہ دزد اور درندوں کے ہو گئے ۔۔۔ بادشاہ کو بھی منظور تھا کہ اِس کی تکمیل ہو جائے مگر نہ ہوئی" (قیصر التواریخ، جلدِ اوّل)۔

نیریز : میر احمد نیریزی۔ بارھویں صدی ہجری کے معروف ایرانی خوش نویسوں میں سے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب پیدائشِ خط و خطاطان۔

یاقوت رقم : خطِ نسخ کے معروف استاد تھے۔ عبداللہ نام تھا مگر "عبدالباقی حداد" کے نام سے مشہور تھے۔ ایران سے ہندستان آئے تھے۔ اورنگ زیب نے ان کو "یاقوت رقم" خطاب دیا تھا۔ صاحب تذکرۂ خوش نویساں نے لکھا ہے: "در دورۂ اخیر گوی سبقت از نسخ نویسان بردہ، خطِ نسخ را عروس الخطوط کردہ آرایش و زینت دیگر بخشید" (ص ۱۲۵)۔

ضمیمہ ۵ تلفظ اور املا

آتو (ص ۱۳۱) اصل لفظ "آتون" ہے (فرہنگِ رشیدی۔ برہانِ قاطع) لیکن اُردو لغت نویسوں کی صراحت کے مطابق اُردو میں زبانوں پر بیش تر بغیرِ نون (آتو) ہے۔ فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں کہیں "آتو" چھپا ہوا ہے اور کہیں "آتون"۔ مثلاً ف میں ص ۵۱ پر "آتون" ہے اور ص ۵۲ پر "آتو" اور "آتو جی صاحب" ہے۔

امیر اللغات میں "آتو" موجود ہے اور اِس کو اُردو مانا گیا ہے اور "آتون" کو "ترکی" لکھا گیا ہے۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کے نزدیک ترکی لفظ "آتون" اُردو میں "آتو" بن گیا۔ یہی بات صاحبِ آصفیہ نے لکھی ہے۔ اُنھوں نے اصل لفظ "آتون" لکھ کر، صراحت کی ہے کہ: "عورتیں اکثر بغیرِ نونِ غنّہ اور بہ واوِ مجہول زبان پر لاتی ہیں"۔

اِن حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبانوں پر، خاص کر عورتوں کی زبان پر "آتو" تھا۔ اِس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ منیر شکوہ آبادی نے اپنی مثنوی حجابِ زناں میں کئی جگہ اِس لفظ کو نظم کیا ہے اور ہر جگہ نون کے بغیر آیا ہے۔ (کلیاتِ منیر ص ۵۷۹، (تین بار) ۵۸۰) فسانۂ عجائب میں یہ لفظ عورتوں ہی کی زبان سے ادا ہوا ہے، اِس بنا پر "آتو" کو مرجّح سمجھا گیا ہے اور ہر جگہ اِسی طرح لکھا گیا ہے۔

آصفیہ میں اِسے بہ واوِ مجہول بتایا گیا ہے، لیکن نور اللغات میں واو پر معروف کی علامت بنی ہوئی ہے (آتُو) اور منیر نے اپنی مذکورہ مثنوی میں اِسے دو جگہ قافیے میں اِس طرح نظم کیا ہے کہ کسی اشتباہ کے بغیر اس کا بہ واوِ معروف مستعمل ہونا متحقق ہو جاتا ہے۔ اشعار یہ ہیں:

ہر مزنی کو لیے ہوئے آتو دیکھتی بھالتی چلیں ہر سو (کلیاتِ منیر ص ۵۸۲)

گئیں جس خانے کی طرف آتو دیکھتی بھالتی ہوئی ہر سو (" ص ۵۸۶)

بہ ظاہر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ دہلی میں بہ واوِ مجہول اور لکھنؤ میں بہ واوِ معروف مستعمل رہا ہوگا۔ اربابِ لکھنؤ کے استعمال اور صراحت کے مطابق۔ اِس کتاب میں اِسے بہ واوِ معروف (آتُو) رکھا گیا ہے۔

آخرکار (ص ۶۴) نظم میں بیش تر "آخرِ کار" (مع اضافت) ملتا ہے، مثلاً:

آخرِ کار نہ پیدا ست کہ در تن فسرد — کفِ خونیکہ بداں زینتِ دارے بدہی (غالبؔ)

آخرِ کار جب جہان سے گیا — ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا (میرؔ)

لیکن گفتگو میں عموماً بغیرِ اضافت آتا ہے۔ امیر اللغات میں صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "زبانوں پر بلا اضافت زیادہ ہے"۔ اور یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے۔ اِسی بنا پر اس نثری کتاب میں "آخرکار" بغیرِ اضافت کو مرجح قرار دیا گیا ہے۔

آخون (ص ۱۴) [ت، ن، ل: اخوند ــــ ض: آخوند ــــ ج، ک، م: آخون]

فارسی میں "آخوند" ہے۔ مولفِ غیاث اللغات نے لکھا ہے: "آخوند بالفِ ممدودہ و فتحِ خاے معجمہ کہ بوی ضمہ دارد و واوِ معدولہ و سکونِ نون، بمعنیِ استاد و معلّم۔ و بضمِ خا نیز آمدہ۔ و کسانیکہ بالفِ غیرِ ممدودہ و سکونِ خا و فتحِ واو خوانند، غلطست"۔ اُردو لغات میں اِس لفظ کے سلسلے میں سب سے مفصّل اندراج امیر اللغات کا ہے اور اُس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں (بیش تر) "آخون" مستعمل رہا ہے۔ امیر اللغات کی عبارت یہ ہے:

"آخون۔ ھ۔ معلم۔ میاں جی۔ صحیح لفظ فارسی میں "آخوند" ہے، اُس سے اُردو میں "آخون" ہو گیا۔ جانصاحب:

یہ نہیں پڑھنے کی اِس آتو سے، فتنہ انگیز — اِس پہ آخون معیّن کوئی جلّاد کرو

معروف: آخون جی! الف ہی کہوں گا ہزار بار — کِس واسطے کہ ہے یہ قدِ یار کی شبیہ

اور غایتِ تعظیم سے "آخون جی صاحب" بھی بولتے ہیں۔ انشا:

بھلا آخون جی صاحب کو آنے دو، کہوں گا میں — کہ اے حضرت سلامت! آپ سنیے، یہ حقیقت ہے"

[مثالیہ اشعار کم کر دیے گئے ہیں] اِسی بنا پر "آخون" کو مرجح سمجھا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں ضمنی طور پر یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کم سہی، لیکن اُردو میں "آخوند" استعمال ضرور کیا گیا ہے۔ مثلاً محمد بخش مہجور نے نورتن میں کئی جگہ مقفا ٹکڑوں میں "آخوند" لکھا ہے: "ایک اخوندِ خود پسندِ بے معنی لایعنی" [نورتن، نول کشور، ۱۸۸۰ء، ص ۹۵] "اخوندِ عقل مند" (ص ۹۶) "اخوندِ دولت مند" (ص ۹۶) اور ایک شعر میں بھی نظم کیا ہے: "غرض قاضی نے اُس اخوند کو خوب، کیا نفریں سے لوگوں میں محجوب" (ص ۹۵)۔ لیکن بات وہی ہے کہ اُردو میں بیش تر "آخون" مستعمل رہا ہے۔

آذر (ص ۳۴) [ض، ف، ک، ل: آذر ــــ ج، م: آزر]

"آذر" اور "آزر" دو مختلف لفظ ہیں۔ "آذر" کے کئی معنی ہیں: آگ۔ ایک فرشتے

کا نام جو "موکّلِ آفتاب" ہے (وغیرہ)۔ تفصیل کے لیے دیکھیے برہانِ قاطع (طبع تہران) اِن سب معنوں میں اِس لفظ میں ذال ہے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا کا نام "آزر" ہے (بہ زاے معجمہ) اور یہاں یہ لفظ اِسی معنی میں آیا ہے، اِس لیے اِس کو زے سے لکھا گیا ہے۔

آمدہٗ (ص ۲) اِس رباعی کی ردیف "آمدہٗ" ماضیِ قریب کا صیغۂ واحد حاضر ہے۔ آج کل رجحان یہ ہے کہ صیغۂ واحد حاضر کو مثلاً "آمدہ ای" اور "رفتہ ای" لکھا جائے؛ لیکن پہلے یہی طریقہ مروّج تھا کہ ہ کے اوپر ہمزہ لکھ دیا جائے (آمدہٗ، کردہٗ)۔ یہاں اِس سلسلے میں غالب کی ایک اصلاح کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا عرشی نے "املاے غالب" کے ذیل میں لکھا ہے:

"ایک بار جنون بریلوی نے فارسی کے ماضیِ قریب کے صیغۂ واحد حاضر کو "ی" کے ساتھ لکھا.... اُس کی اصلاح میں ارشاد فرمایا ہے:

پروردہٗ، رفتہٗ، یہ جتنے الفاظ ہیں، اِن میں یاے تحتانی نہیں لکھتے، بس وہی ہاے اپنا ے حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے تو تو "رفتہ، بودہ" اِس صورت پر رہے گی۔ اور اگر اُس کو حرکت لازم آئے تو علامتِ حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا: رفتہٗ، آمدہٗ۔ اور اِن مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے۔" [مکاتیبِ غالب، ص ۲۱۹]

فسانۂ عجائب کے نسخوں میں بھی ایسے الفاظ کا یہی املا ملتا ہے، اِس بنا پر اِس کتاب میں ہر جگہ اِسی املا کی پابندی کی گئی ہے۔

اَتَم (ص ۵۷) اصلاً م مشدّد ہے (اَتَمّ)؛ عربی کے ایسے متعدد دو حرفی لفظ ہیں جن کا حرفِ آخر مشدّد ہے، لیکن فارسی اور اُردو میں وہ تشدید کے بغیر مستعمل ہیں؛ یہ لفظ بھی اِسی فہرست میں شامل ہے۔ ترکیب کی صورت میں یا ضرورتِ شعری کی بنا پر کبھی ایسے لفظ مع تشدید بھی آسکتے ہیں (اور آتے ہیں)؛ لیکن مفرد لفظ گفتگو میں اور نثر میں عموماً بغیرِ تشدید ہی مستعمل ہیں؛ اِسی لحاظ سے یہاں م پر تشدید نہیں لگائی گئی۔

اَچنبھا (ص ۲۰۶) اِس کتاب کے سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ یہ پُرانا املا ہے اِس لفظ کا "اچمبھا" بعد کی صورت ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور جلالؔ کے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں "اچنبھا" ہی ہے۔ (البتہ امیر اللغات میں "اچمبھا" ہے) اِس لفظ کے اِسی قدیم املا کو محفوظ رکھا گیا ہے۔

اِحاطَہ۔ (ص ۱۲) امیر اللغات میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، لیکن فرہنگِ آصفیہ میں الف پر

زیر لگا ہوا ہے اور نور اللغات میں صراحتاً "بہ کسرِ اوّل" لکھا گیا ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے مزید صراحت کی ہے کہ: "عوام بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں اور کبھی الف کو حذف بھی کر دیتے ہیں"۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فصیح بہ کسرِ اوّل ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

ادنیٰ (ص ۴) [ح: ادنا۔ م، ض، ف، ک، ل: ادنیٰ]

"ادنیٰ" اور "اعلیٰ" جیسے الفاظ، جن کے آخر میں عربی کے قاعدے کے مطابق الفِ مقصورہ (الف بہ صورتِ یَی) لکھا جاتا رہا ہے، فسانۂ عجائب کے نسخوں میں بیش تر مع الفِ مقصورہ ہی ملتے ہیں۔ اوپر "ادنیٰ" کے ذیل میں اختلافِ نسخ کی جو نشان دہی کی گئی ہے، اُس سے اِس تناسب کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً ص ۱۹ پر ایک جملے میں یہ دونوں لفظ آئے ہیں: "ایک ایک کنجڑن ادنیٰ، اعلیٰ ہفت ہزاری بنائی"۔ یہاں ح، م، ض، ف، ک، ل؛ سب میں "اعلیٰ" ہے۔ ح، ض میں "ادنا" ہے لیکن م، ف، ک، ل میں "ادنیٰ" ہے۔ یا مثلاً "مصفّیٰ": "اصل تو یہ ہے عسلِ مصفّیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اُترا"۔ م میں "عسلِ مصفّا" ہے، لیکن ح، ض، ف، ک، ل میں "عسلِ مصفّیٰ" ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اب سے پہلے عموماً ایسے الفاظ کو (اصل کے مطابق) الفِ مقصورہ ہی سے لکھا جاتا تھا، اِسی وجہ سے اِس کتاب میں ایسے الفاظ کو اُس زمانے کے چلن کے مطابق (اور اِس بنا پر بھی کہ پیشِ نظر نسخوں میں بھی بیش تر یہی املا ملتا ہے) مع الفِ مقصورہ ہی لکھا گیا ہے، جیسے: ادنیٰ، اعلیٰ، مصفّیٰ، نصاریٰ، عیسیٰ، لیلیٰ۔

آدھر سا (ص ۲۲۸) [ح، م، ض، ک: آدھر۔ ل، ف: ادھر سا]

امیر اللغات میں صرف "آدرسا" ہے، اور اِس کے معنی لکھے ہیں: "ایک قسم کا سوتی سفید اور باریک کپڑا، جس کی بناوٹ میں جھر جھراپن ہوتا ہے"۔ نور میں بھی صرف "ادرسا" ہے (اُس میں دراصل امیر اللغات ہی کے اندراج کو بہ ادنا تصرف نقل کر دیا گیا ہے)۔ البتہ پلیٹس نے "آدرسا" اور "ادھرسا" دونوں لفظ درجِ لغت کیے ہیں اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "ادرسا" اور "ادھرسا" دونوں صورتیں بجائے خود درست ہیں۔ چوں کہ ل، ف اور ن میں "ادھرسا" ہے اور پلیٹس کے لغت میں یہ موجود ہے، اِس بنا پر اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

انشا نے سلکِ گہر میں ایک جگہ اِس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ [اُس کے

مطبوعہ نسخے (مرتبۂ مولانا عرشی) میں "ادرسہ" ہے] "اور سارا محل سراطورِ طاؤس ہوا دار، اور ہر ہر در اور ہر ہر کھم کو سوہا ململ اور سوہا ادرسہ لگا ہوا" [سلکِ گہر، مرتبۂ مولانا عرشی، ص ۳۸]۔ میر حسن نے بھی ایک شعر میں اِسے نظم کیا ہے :

کئی دن تیرے چپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسا ہے نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسا ہے
نہیں ملبوس بہتر کوئی اِس عریاں تنی سے بھی یہی ہے اپنی محمودی، یہی اپنا ادرسا ہے

[کلیاتِ میر حسن، عکسِ مخطوطہ برٹش میوزیم، ورق ۲۱۳]

البتہ "ادھر" کسی لغت میں نہیں ملا، نہ کہیں اور نظر سے گزرا۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ "ادھرسا" کی ایک صورت "ادھر" بھی ہو اور کسی زمانے میں یہ لفظ اِس طرح مستعمل رہا ہو۔ قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ کتابت کی غلطی بھی ممکن ہے۔

آرْجُمَنْد (ص ۱۵۹) فارسی میں جَ موقوف ہے (برہانِ قاطع) بلکہ صاحبِ غیاث اللغات نے تو صراحت بھی کر دی ہے کہ "بہ ضمِّ جیم خواندن خطاست"۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور اللغات میں ہے اور فارسی کے مطابق جیم کو موقوف بتایا گیا ہے [مولّف نے دراصل غیاث اللغات کی عبارت کا اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے] لیکن امیر اللغات میں جَ پر پیش لگا ہوا ہے اور اُردو میں زبانوں پر اِسی طرح ہے؛ اِسی لیے یہاں بھی جَ پر پیش کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

اِزْدِحام (ص ۱۰۸) [ح : ازدہام۔ م : اژدحام۔ ص، ت، ل : اژدہام۔ ن : ازدحام] اِس لفظ کا صحیح املا "ازدحام" ہے۔ مولّفِ آصفیہ نے وضاحت بھی کر دی ہے کہ: "زاے فارسی اور ہاے ہوّز سے لکھنا غلط ہے" اِسی بنا پر ن کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اِسْرار (ص ۷۶) مولّفینِ امیر اللغات و نور اللغات نے صراحت کی ہے کہ (جن و پری کا) سایہ اور آسیب کے معنی میں یہ لفظ "بالکسر اور بجاے واحد مستعمل ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی "آسیب، جن و پری کا سایہ، بھوت پریت" کے معنی میں اِس لفظ کو "بالکسر" ہی لکھا گیا ہے؛ اِسی بنا پر الف پر زیر لگایا گیا ہے۔

اِسْفَنْدِیار (ص ۵۹) غیاث اللغات میں برہانِ قاطع کے حوالے سے اِس کو "بکسرِ اوّل و سوم و دالِ مہملہ موقوف" لکھا ہے۔ امیر اللغات میں "اِسْفَنْدِیار" ہے اور یہ اُردو والوں کے تلفظ سے قریب تر ہے؛ اِسی بنا پر اِس لفظ پر امیر اللغات کے مطابق اعراب لگائے گئے ہیں۔

اَش اَش (ص ۲۰۲) فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں یہی املا ملتا ہے۔ یہاں صراحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ کچھ لوگ (غلطی سے) اس کا املا "عش عش" صحیح سمجھتے ہیں۔ امیر مینائی نے امیر اللغات میں "اش اش" کے حاشیے میں لکھا ہے کہ: "اور جو لوگ اس کو "عش عش" لکھتے ہیں، اُس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ اس کا کہیں سے پتا نہیں چلتا"۔ جلال نے مزید وضاحت کی ہے کہ: "پس جو لوگ اس کلمے کو بجائے دو الف، دو عین سے لکھتے ہیں، مؤلفِ ہیچمداں کے نزدیک خطا پر ہیں" (سرمایۂ زبانِ اُردو)۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے بھی "اش اش" کو صحیح بتایا ہے۔

اَشَرفی (ص ۳۵) یہ لفظ اصلاً بہ فتحِ اول و سکونِ دوم (اَشْرَفی) ہے۔ نور اللغات اور آصفیہ میں بھی اِسی طرح لکھا گیا ہے، لیکن زبانوں پر بیش تر "اَشَرفی" ہے۔ انشا نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے:

مانی ہوں منّتیں بھی سوسو کروڑ ڈھب کی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دھو دھو روپے اشرفی نذریں اٹھائیاں ہوں

جمع کی صورت میں تو سبھی بہ فتحِ دوم "اَشَرفیاں" کہتے ہیں۔ اِس لفظ کے دونوں تلفظ بجائے خود درست ہیں لیکن استعمالِ عام میں چوں کہ بیش تر "اَشَرفی" اور "اَشَرفیاں" ہے، اِسی بنا پر شین پر زبر لگایا گیا ہے۔

اَصْطَبَل (ص ۵۱) بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ کسرِ اول و سکونِ چہارم (اِصْطَبْل) ہے۔ اُردو شعرا نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے، لیکن بول چال میں یہ بہ فتحِ اول و چہارم (اَصْطَبَل) ہے۔ کیا خواص کیا عوام سبھی اِسی طرح بولتے ہیں۔ امیر اللغات اور نور اللغات میں اِس لفظ کو اصل حرکات ہی کے ساتھ (اِصْطَبْل) لکھا گیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے نور اللغات کے اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"صحیح یوں ہی ہے جس طرح لکھا ہے اور شاعر بھی زیادہ تر اِسی طرح نظم کرتے ہیں مگر کیا خواص کیا عوام، بولتے اَصْطَبَل ہیں بہ فتحِ اوّل و سکونِ صاد و فتحِ طا و با و سکونِ لام"۔
[فرہنگِ اثر، ص ۷۴]

اِسی سے ملتی جلتی بات صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے لکھی ہے: "لیکن شعرائے ہند نے اِس بے کو متحرک و موقوف، دونوں طرح باندھا ہے"۔ چنانچہ ایک ایک مصرع لکھا جاتا ہے۔ سودا: بدیمن یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار ــــ میر انیس: خالی ہوا اصطبل، چلے

آتے ہیں گھوڑے "۔ بہ ہر حال، بول چال میں " آصْطَبَل " آتا ہے اور نثر میں بھی اِسی طرح مرجّح سمجھا جانا چاہیے؛ اِسی نسبت سے اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و چہارم لکھا گیا ہے۔

اصیل۔ اسیل (ص ۲۰) [ح، ض، ک، ف، ل : اسیلوں ۔ م : اصیلوں]

"اصیلیں" ص ۱۴۱ پر بھی آیا ہے اور وہاں ح، ض، ف، ل میں "اسیلیں" ہے اور م، ک میں "اصیلیں" ہے۔

لغت نویسوں نے بالعموم " اصیل " لکھا ہے اور یہی مستعملِ عام لفظ ہے۔ " اسیل " (غالباً) اِسی کی بدلی ہوئی صورت ہے، لیکن اِس نے رواجِ عام نہیں پایا۔ امیر مینائی نے امیر اللغات میں اِس لفظ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ " اصیل " کی ایک صورت " اسیل " ہو سکتی ہے۔ لفظِ "اصیل" کے حاشیے پر اُنھوں نے لکھا ہے :

"چوں کہ ماما اصیلوں پر اکثر باتوں میں اعتبار کیا جاتا ہے اور معتبر و معتمد ہونا اصالت کی دلیل ہے؛ اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ اِن معنوں میں عربی ہے۔
اور دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ اِن معنوں میں " شِیل " سے بنا ہے۔
" شِیل " کے معنی سنسکرت میں " نیک چال چلن " ہیں اور الف نفی کا ہے۔
چوں کہ ماما ئیں اچھے چال چلن میں پردہ نشین عورتوں کی مثل نہیں ہوتیں، اکثر باہر پھرتی ہیں؛ اِس لیے اُن پر " اَشِیل " کا اطلاق ہو سکتا ہے؛ مگر اِس صورت میں چاہیے کہ اِس کا املا بجائے صاد، سین سے ہو۔
اگرچہ اِس اشتقاق اور اشتقاقِ اولیٰ میں مخالفت ہے؛ مگر دونوں خیال مختلف حیثیتوں سے ٹھیک معلوم ہوتے ہیں "

اشتقاق کی صحیح صورت جو بھی ہو، دو باتیں صاف ہیں : ایک تو یہ کہ اِس کا املا "اسیل" بھی ہو سکتا ہے (فسانۂ عجائب کے بیش تر نسخوں میں " اسیل " کا وجود بھی اِس پر دلالت کرتا ہے)۔ دوسری بات یہ ہے کہ " اسیل " کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا۔ لغت کی کتابوں میں اور عام تحریروں میں اِس کا املا " اصیل " ہی ملتا ہے؛ اِسی بنا پر اِس کتاب میں ہر جگہ " اصیل " کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

اَکاسی دیا (ص ۱۸۶) ک میں " اگاسی دیا " ہے، لیکن اور سب نسخوں میں " اکاسی دیا " ہے اور اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اصل لفظ "آکاشن دیا" ہے (ہندی شبد ساگر) اور "اکاسن دیا" بھی مستعمل ہے (ایضاً)
ہندی میں "اکاسن" کی ایک صورت "اگاسن" بھی ہے (ایضاً)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ ک
میں "اگاسی دیا" کتابت کی غلطی نہیں۔

ہندی میں "آکاش دیا" اور "اکاسن دیا" ہے۔ "اکاسی دیا" اُردو کا اضافہ ہے۔
امیر اللغات اور نور اللغات میں آکاش دیا، آکاس دیا، اکاسن دیا، اکاسی دیا، کوئی
لفظ موجود نہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "اکاسن دیا" ہے، "اکاسی دیا" اُس میں بھی نہیں۔
کراچی سے ترقیِ اُردو بورڈ کے لغت کی جو پہلی جلد آئی ہے، اُس میں "اکاسن دیا" ہے لیکن "اکاسی دیا"
اُس میں بھی موجود نہیں؛ البتہ فیلن نے "اکّاسن دیا" اور "اکّاسی دیا" دونوں لفظ درج لغت
کیے ہیں (بہ تشدید کاف)۔ "اکاس دیا" کے مختلف معانی لغات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ک
کے حاشیے پر اِس لفظ کے جو درج ذیل معنی لکھے ہوئے ہیں وہ اِن لغات میں نہیں ملتے:

"اگاسی دیا: بالفتح، چراغیکہ بر درِ دولت متصلِ اردوی معلّیٰ روشن کنند"

اور اِس عبارت میں بھی معنی زیادہ کھپتے ہیں۔

اَلَیّا (ص ۱۴۳) فسانۂ عجائب کے سبھی پیشِ نظر نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود
نہیں۔ امیر اللغات اور نور اللغات میں "الہیا" ہے۔ ہندی شبد ساگر میں "الہیا" اور "الیّا"
دونوں لفظ موجود ہیں، اگرچہ اصل لفظ "الہیا" کو مانا ہے لیکن اُس کی ایک صورت "آلیّا"
بھی درج کی ہے۔ چوں کہ "الیّا" ہندی لغت میں موجود ہے اور فسانۂ عجائب کے نسخوں میں
بھی "الیّا" ہے؛ اِس لیے اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اِمام باڑہ (ص ۱۱) سب نسخوں میں "امام باڑہ" ہے۔ پُرانے زمانے میں بہت سے ہندی الفاظ
کے آخر میں فارسی کے اثر سے الف کے بجاے ہاے مختفی لکھی جاتی تھی، اِس لیے "باڑا"
کو بھی "باڑہ" لکھا جاتا تھا؛ اِسی نسبت سے شعرا نے "امام باڑہ" کو بہ اضافت بھی نظم کیا
ہے۔ ناسخ کے کلّیات میں بھی اِس کی مثالیں موجود ہیں؛ دو مختلف قطعوں کے دو مصرعے
بہ طورِ مثال لکھے جاتے ہیں:

۱۔ بابِ امام باڑۂ والا بنا نمود (کلّیاتِ ناسخ، طبع اوّل ۱۲۵۵ھ، ص ۳۶۳)

۲۔ امام باڑۂ گردوں بنای سلطانیست (ایضاً، ص ۳۶۴)

اِس بنا پر اِس کتاب میں اِس لفظ کے پُرانے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ [امیر اللغات اور

آصفیہ میں "امام باڑا" ہے اور اب بیش تر اسی طرح لکھا جاتا ہے]۔

اِمَرتی (ص ۷) نظم میں یہ لفظ بہ سکونِ دوم ملتا ہے۔ امیراللغات میں سند کا شعر مندرج ہے، وہی شعر نوراللغات میں نقل کیا گیا ہے۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مولفین کے نزدیک یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہے [فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں] لیکن زبانوں پر بہ فتحِ دوم ہے اور نثر میں بھی اِسی کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔ یہ صراحت کردی جائے کہ ہندی شبد ساگر میں اِسے بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم (اِمَرتی) لکھا گیا ہے۔ فیلن نے بھی "اِمَرتی" لکھ کر، لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ "اِمَرتی" ہے؛ اِسی نسبت سے مَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

اِندَر (ص ۹۰) اصلاً یہ لفظ بہ کسرِ اوّل و سکونِ دوم و چہارم ہے، مگر اُردو میں بہ کسرِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم مستعمل ہے۔ آصفیہ و امیراللغات میں اِسی طرح اعراب لگائے گئے ہیں (اِندَر) امیراللغات میں انشا کا ایک شعر بھی سنداً لکھا گیا ہے، جس میں "اِندَر" آیا ہے، متعلق مصرع یہ ہے:

نہیں یہ لکھنؤ، اک راجا اندر کا اکھاڑا ہے

اِسی بنا پر دال پر زبر لگایا گیا ہے۔

اُوبھی (ص ۱۰) قدیم اُردو لغات میں "اوبھنا" اِس معنی میں موجود نہیں لیکن یہ معلوم ہوا کہ اودھی اور راجستھانی میں اِس مصدر کے مشتقات (اُٹھنے، بلند ہونے کے مفاہیم میں) مستعمل ہیں۔ ترقیِ اُردو بورڈ کراچی سے اُردو لغت کی جو پہلی جلد آئی ہے، اُس میں یہ لفظ موجود ہے اور اُس میں دکنی کی دو مثالیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایک مثالیہ شعر کا پہلا مصرع یہ ہے: "پدم تراو اوبھا ہوا چھات لگ"۔ ہندی شبد ساگر میں (ऊभी) موجود ہے اور اُسی کی بنا پر اِسے بہ واوِ معروف رکھا گیا ہے۔ یادوں کی برات میں جوش نے ایک جگہ لکھا ہے: "صبح سات بجے سے آدھی رات کے بعد بھی مسلسل پی رہے تھے اور دو بجے رات کے قریب اوبھی اوبھی سانسیں لے رہے تھے" (ص ۵۱۴)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں یہ لفظ مستعمل رہا ہے۔

اَورَگی (ص ۱۵) فرہنگِ آصفیہ، نوراللغات اور امیراللغات میں "آوگی" ملتا ہے اور "اورگی" کا اِن لغات میں نام نشان نہیں پایا جاتا۔ شعرا نے بھی "اوگی" نظم کیا ہے، سند کے اشعار امیراللغات میں موجود ہیں؛ البتہ جلال نے سرمایۂ زبانِ اُردو میں "اورگی" کو اصل لفظ کے طور پر درج کیا ہے اور "اوگی" کو اُس کی ایک شکل بتایا ہے:

" اورگی : اُس ٹاٹ بافتہ کو کہتے ہیں جس سے جوتوں کو سیتے ہیں اور کبھی یہ لفظ بہ حذفِ
رائے مہملہ بھی بولا جاتا ہے، یعنی ادگی ۔"

جلالؔ کے اندازِ تحریر سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اصل لفظ " اورگی " ہے۔
فسانۂ عجائب کے نسخوں میں " اورگی " کا وجود بھی اِسی پر دلالت کرتا ہے۔

ایزد (ص ۳۱) یہ لفظ فارسی میں بہ کسرِ سوم اور بہ فتحِ سوم، دونوں طرح ہے۔ (برہانِ قاطع۔ فرہنگِ فارسی)
غالبؔ نے اِسے بہ فتحِ سوم نظم کیا ہے:

در احمد الف نامِ ایزد بود ز میمم آشکارا محمد بود

(کلیاتِ فارسیِ غالب، نول کشور، طبعِ دوم، ص ۱۵۱)

فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ امیر اللغات اور نور اللغات میں اِس کو صرف بہ کسرِ سوم لکھا گیا ہے
لیکن اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ سوم ہے۔ اثرؔ لکھنوی مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا تھا: " ایزد فارسی
میں بہ کسرِ سوم ہے، اُردو میں بہ فتحِ سوم بولتے ہیں " [رسالہ الحمرا (لاہور) جنوری ۱۹۵۲ء] اُردو کی
حد تک یہی بات صحیح ہے اور اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

اینٹھے [" سر پر گلنار اینٹھے طرح دار "] (ص ۱۸۲) م اور ن کے علاوہ سب نسخوں میں " اینٹھے "
ہے۔ م اور ن میں " پھینٹے " ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ نسخۂ م اور نسخۂ ن، دونوں مصنّف کے
نظرِ ثانی کردہ نسخے نہیں۔ جن نسخوں پر مصنّف نے نظرِ ثانی کی ہے، اُن سب میں " اینٹھے " ہے۔ اُردو اور
ہندی لغات میں یہ لفظ نہیں ملتا، لیکن اِس کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ بجائے خود بھی یہ کوئی لفظ
نہیں ہو سکتا۔ ایسے قدیم الفاظ کے سلسلے میں یہ امکان ہمیشہ کارفرما رہتا ہے کہ کسی زمانے میں کسی
خاص علاقے میں یا کسی خاص حلقے میں وہ مستعمل رہے ہوں۔ اِس کی کئی مثالیں اِسی کتاب میں موجود
ہیں [مثال کے لیے دیکھیے " اوجھی " اور " پاہنی "] مصنّف کی نظر سے گزرے ہوئے سبھی پانچ
نسخوں میں یعنی اشاعتِ اول (ح) سے لے کر اشاعتِ آخر (ل) تک سبھی میں اِس لفظ کا
وجود اِسی پر دلالت کرتا ہے۔ اِس بات کا قوی امکان ہے کہ کسی خاص طرح کی پگڑی کو کسی
زمانے میں " اینٹھا " کہتے ہوں۔ " اینٹھنا " بل دینے کے معنی میں مستعمل ہے، اور پگڑی کے پیچ
کی رعایت سے یہ بخوبی ممکن ہے کہ بل دار پگڑی کو " اینٹھا " کہتے ہوں۔ میرے رفیقِ کار
پنڈت ترلوچن شاستری نے بتایا کہ انھوں نے اودھ کے مضافات میں یہ لفظ سُنا ضرور ہے۔
اُن کا کہنا ہے کہ سادہ لپیٹ کی پگڑی کو " مُریٹھا " اور بل دار لپیٹ والی پگڑی کو " اینٹھا "

کہا جاتا تھا۔ یہ قطعی طور پر قرینِ قیاس ہے؛ اِسی بنا پر اِس لفظ کو صحیح سمجھا گیا ہے اور برقرار رکھا گیا ہے۔

بادشاہ (ص ۴) فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں اِس لفظ کا املا مختلف ملتا ہے، مثلاً ح ف اور ل میں عموماً "بادشاہ" ملتا ہے اور ک اور م میں "پادشاہ"۔ ض میں کہیں "بادشاہ" ہے (مثلاً ص ۴) اور کہیں "پادشاہ" (مثلاً ص ۲)۔ فارسی میں "پادشاہ" ہے اور بہ قولِ صاحبِ نور اللغات "بادشاہ" اُس کی مہنّد صورت ہے۔ مولف نے مزید وضاحت کی ہے کہ "یہ لفظ باے فارسی سے صحیح ہے لیکن اِس وجہ سے کہ باے فارسی سے جُزوِ اوّل بہ معنیٰ ریح ہے، عموماً زبانوں پر بادشاہ ہے" اور یہ بالکل درست ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے چراغِ ہدایت میں اِس کی وضاحت کی تھی: "پادشاہ بہای فارسی ..... و این کہ در ہندستان بہای تازی شہرت دارد، ظاہراً ازجہتِ استکراہِ حرفِ اوّل از کلمۂ مذکور کہ بزبانِ ہندی قبیح است" ــــــ اِسی وجہ سے اِس لفظ کا املا "بادشاہ" رکھا گیا ہے۔

بارِبَد (ص ۸۹) فرہنگِ رشیدی کے مطابق اِسے بہ فتحِ چہارم مرجّح سمجھا گیا ہے۔

باروت (ص ۱۶۳) [ح، م : بارود ــــ ض، ک، ف، ل : باروت]

آگے چل کر یہ لفظ ایک اور جگہ آیا ہے۔ شہپال جادو سے لڑنے کے لیے جانِ عالم کی فوج آراستہ ہو رہی ہے، وہاں ایک جملہ ہے: "کہیں سرنگ کا رنگ جمایا، باروت کو بچھایا" یہاں ح، ض، ک میں "بارود" ہے اور م، ف، ل میں "باروت" ہے۔

فارسی میں "بارود" اور "باروت" دونوں مستعمل ہیں (برہانِ قاطع۔ بہارِ عجم)؛ یہی صورت اُردو میں ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں دونوں لفظ موجود ہیں۔ رشک نے نفس اللغۃ میں "بارود" کے ذیل میں وضاحت کی ہے کہ: "و بجای دالِ مہملہ، تای فوقانی نیز گویند" اور فسانۂ عجائب کے اختلافِ نسخ سے بھی اِس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر معین نے برہانِ قاطع کے حاشیے میں لفظ "بارود" کے ذیل میں لکھا ہے کہ "باروت" ترکی ہے اور "بارود" اِسی سے بنا ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو میں بھی یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے، اگرچہ آج کل عموماً "بارود" لکھتے اور بولتے ہیں۔ فسانۂ عجائب کے موخّر نسخوں (ف اور ل) میں چوں کہ "باروت" ہے، اِس لیے اِسی قدیم شکل کو دونوں جگہ برقرار رکھا گیا ہے۔

بِھاس (ص ۱۴۳) [م: بھبھاس۔ ح، ض، ک، ف: بھباس]

نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ ہندی میں "دو بھاشن" ہے۔ ہندی کے ایسے الفاظ میں "د" اور "ب" کا تبادلہ ہو سکتا ہے، اِس لیے یہ "بِبھاشن" بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرا حرف بہ ہر طور "بھ" ہے۔ فیلن کے لغت میں "بِبھاشن" ہے اور یہی صورت مرجّح معلوم ہوتی ہے؛ اِسی کے مطابق "بِبھاشن" لکھا گیا ہے۔

بحری (ص ۱۸) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے، لیکن عام طور پر اِسے "بہری" لکھا جاتا ہے۔ لغات میں بھی بہ ہاے ہوز ملتا ہے۔ آصفیہ میں بھی "بہری" ہے، لیکن اُس کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ: "بعض ترکی لغات میں بھی یہ لفظ حاے حطّی سے پایا جاتا ہے"۔ اِس بنا پر بھی اور اصل کی مطابقت کے خیال سے بھی اِس کا املا بہ حاے حطّی برقرار رکھا گیا ہے۔

برآمدہ (ص ۲۲۵) سب نسخوں میں "برآمدہ" ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی "برآمدہ" ہے۔ پڑھنے میں "برامدہ" آتا ہے، لوگ اب اِس طرح لکھنے بھی لگے ہیں؛ لیکن قدیم تحریری صورت "برآمدہ" ہی ہے اور یہاں اُسی قدیم صورت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہی صورت "درآمد" اور "برآمد" کی ہے کہ لکھیں گے (اور لکھتے ہیں) الفِ ممدودہ؛ لیکن بولتے ہیں "درامد" اور "برامد"۔ "درآنا" اور "برآنا" کو بھی اِسی طرح مع الفِ ممدودہ لکھتے ہیں، خواہ بولیں کسی طرح۔ اِس کتاب میں اِن سب الفاظ میں قدیم املا کے مطابق الفِ ممدودہ کو برقرار رکھا گیا ہے۔

بِرچھک (ص ۱۳۶) [ح، م: برچھیک]

فرہنگِ آصفیہ میں بِرَچِھک (بہ کسرِ اوّل و فتحِ سوم) ہے۔ فیلن کے لغت میں "بِرچِھک" اور "بِرچھک" دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ نور اللغات میں یہ لفظ موجود نہیں۔ یہ لفظ عام بول چال میں نہیں آتا، خاص خاص لوگ ہی اِسے استعمال کرتے ہیں (مثلاً جوتشی)؛ اِس بنا پر اِس کو اصل حرکات کے مطابق "بِرچِھک" مرجّح قرار دیا گیا ہے۔ اِس کی تائید اِس سے بھی ہوتی ہے کہ ح اور م میں "برچھیک" ہے اور یہ املا لازماً بہ کسرِ سوم پر دلالت کرتا ہے۔

بِرنجی (ص ۱۰۶) بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ کسرِ اوّل و دوم (بِرِنجی) ہے۔ نور میں بھی اِسی طرح ہے لیکن آصفیہ میں "بِرَنجی" لکھا ہوا ہے اور زبانوں پر بھی اِسی طرح ہے؛ اِس لیے اِسی کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

بُقراط (ص ۱۳) اصلاً یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے (غیاث اللغات) لیکن زبانوں پر بہ ضمِ اوّل ہے۔ مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ نے اِس کی صراحت کی ہے: "بقراط ... صحیح بہ فتحِ موحّدہ، اور زبانِ خاص و عام

بہ ضمِ موحدہ" اِسی بنا پر ب پر پیش لگایا گیا ہے۔

بَکتَر (۱۷۹) فارسی میں "بَگتَر" (بہ کافِ فارسی) ہے (برہانِ قاطع، غیاث اللغات) اُردو میں زبانوں پر "بکتر" ہے، فرہنگِ آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے اور فسانۂ عجائب کے نسخوں میں بھی اِسی طرح ہے؛ اِسی لیے "بکتر" رکھا گیا ہے۔

بَل (ص ۹) فسانۂ عجائب کے سبھی پیشِ نظر نسخوں میں "بل" ہے۔ نور اللغات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ سہارا، رُخ، جانب جیسے معانی میں اہلِ لکھنؤ "بھل" بولتے ہیں اور اہلِ دہلی "بل" کہتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں صرف "بل" ہے اور اِس سے اُن کے قول کی تصدیق ہوتی ہے لیکن یہ تخصیص بعد کی بات معلوم ہوتی ہے۔ فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "بل" کی موجودگی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ "بل" اور "بھل" کی دبستانی تقسیم بعد کی ہے۔

بَلَند (ص ۲) فارسی میں حرفِ اوّل کی حرکت میں اختلاف ہے (بہ کسرِ اوّل، بہ ضمِ اوّل، بہ فتحِ اوّل) تفصیل غیاث اللغات میں ہے۔ مولّف نے البتہ یہ ضرور وضاحت کی ہے کہ: "فتحہ افصح است"۔ فرہنگِ رشیدی میں اِس کو بہ فتحتین (بَلَند) لکھا گیا ہے۔ نور اللغات میں فارسی کے مطابق "بہ ضم و کسر و فتحِ حرفِ اوّل" لکھا ہوا ہے لیکن یہ صراحت نہیں کہ اُردو میں مرجّح کیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اِسے صرف بہ فتحِ اوّل و ثانی "بَلَند" لکھا گیا ہے اور اِس کے جملہ مرکبات میں التزام کے ساتھ ب پر زبر لگایا گیا ہے؛ اِس سے صاحبِ غیاث اللغات کے اِس قول کی تائید ہوتی ہے کہ "فتحہ افصح است"۔ اِسی بنا پر ب پر زبر لگایا گیا ہے۔

بِلّوْر (ص ۴۳) فارسی میں ب پر زبر بھی آتا ہے اور زیر بھی۔ لام مشدّد بھی ہے اور مخفّف بھی (غیاث اللغات)۔ اُردو میں شعرا نے اِسے (۱) بہ لامِ مشدّدِ مفتوح ("غور" کے قافیے میں) (۲) بہ لامِ مشدّد و واوِ معروف (۳) بہ لامِ مخفّف و واوِ معروف ("نور" کے قافیے میں) نظم کیا ہے۔

مصنّف نے اِس عبارت میں "بلور" کو "نور" کے قافیے کے طور پر کھپایا ہے، اِس سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے اِس لفظ کو بہ لامِ مضموم و واوِ معروف (بلُور) مانا ہے؛ اِسی لحاظ سے واو کو معروف رکھا گیا ہے۔

گفتگو میں عموماً ب مکسور رہتی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی ب پر زیر لگا ہوا ہے (بِلّور) اِسی نسبت سے اِس کتاب میں ہر جگہ ب پر زیر لگایا گیا ہے۔

بنبئی (ص ۹) یہاں ک اور ل دونوں میں یہی املا ہے [اور نسخوں میں یہ عبارت موجود نہیں] اور اسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ لفظ ص ۱۵۶ پر بھی آیا ہے اور وہاں ح، ض، ک میں "بنبئی" ہے اور م، ف، ل میں "مُبئی" ہے۔ "مُبئی" پرانا نام ہے۔ بعض اور قدیم تحریروں میں بھی نظر سے گزرا ہے [آج کل یہ خبر اخباروں میں آرہی ہے کہ "بمبئی" کا نام "ممبئی" رکھنے کی تجویز حکومت کے زیرِ غور ہے] یکسانی کے خیال سے دونوں جگہ "بنبئی" ہی لکھا گیا ہے۔ صراحت اِس لیے کی گئی ہے کہ صورتِ حال سامنے آجائے۔

بَندرابن (ص ۲۰۲) اصلاً "وِرِندا وَن" تھا، اُسی کی ایک مستعمل عام صورت "بِندراوَن" یا "بِندرابن" ہے اور "برِندابن" بھی کہتے ہیں۔ سرور نے یہ جو لکھا ہے کہ: "اُس زمانے میں "بَندرابن" بالفتح تھا، اب عرصۂ دراز گزرا، وہ بندروں کی کثرت جو نہ رہی، اِس کسر سے یہ لفظ بالکسر خلقت کہنے لگی" یہ محض لفظی رعایت پیدا کرنا ہے۔ "بَندرابن" کوئی لفظ نہیں، اسی طرح "بِندرابن" بھی درست نہیں۔ یہ دونوں صورتیں محض رعایتِ لفظی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تراشی گئی ہیں۔ چوں کہ اِس کے بغیر سرور کا مفہوم اِس جملے میں مکمل نہیں ہوتا، اِس لیے یہاں "بَندرابن" ہی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

بَنَفْشَہ (ص ۱۰۶) اُردو والے "بَنَفْشَہ" کہتے ہیں اور آصفیہ میں بھی اسی طرح لکھا ہوا ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ فارسی میں "بُنَفْشَہ" اور "بِنَفْشَہ" ہے (غیاث، برہان) اور اِس کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

بہادُر (ص ۱۸) اصلاً یہ لفظ بہ ضمِّ دال ہی ہے، اگرچہ کبھی کبھی سننے میں بہ فتحِ دال بھی آجاتا ہے۔ مولفِ غیاث اللغات نے صراحت کی ہے کہ "بفتح گفتن خطاست"۔ فیلن نے اپنے لغت میں لکھا ہے کہ بے پڑھے لوگ "بہادَر" (بہ فتحِ دال) کہتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ اُردو میں بھی اِس لفظ کا ادبی اور معیاری تلفظ بہ ضمِّ دال ہی ہے، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ زبانوں پر بہ فتحِ دال بھی ہے اور سننے میں برابر آتا رہتا ہے۔ لکھنؤ میں بھی میں نے "بہادَر" بولتے ہوئے لوگوں کو سنا ہے؛ البتہ یہ تلفظ (بہ فتحِ دال) بول چال تک محدود ہے، شعرا نے ہمیشہ اِسے "تہوُّر" اور "تکبُّر" کے قوافی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی، شہادتِ حُر سے متعلق انیس کے مشہور مرثیے کے پہلے ہی بند میں یہ لفظ "تہوُّر" اور "دُر" کے قوافی کے ساتھ آیا ہے:

بہ خدا، فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر   ایک، دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر

آصفیہ و نور میں بھی بہ ضمِ دال ہی ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے، اور ترکی میں بھی بہ ضمِ دال ہے۔

اِنھی وجوہ سے دال پر پیش لگایا گیا ہے۔

بِیاباں (ص ۵۵) یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح ملتا ہے لیکن بہ کسرِ اوّل کو "اصح" بتایا گیا ہے۔ تفصیل غیاث اللغات میں۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے بھی حاشیۂ ص ۳۳۰، جلدِ اوّل میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے بھی بہ کسرِ اوّل کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ مولّفِ فرہنگِ آصفیہ نے بھی بہ کسرِ اوّل کو "افصح" لکھا ہے؛ اِنھی وجوہ سے ب پر زیر لگایا گیا ہے۔

بَیپاری (ص ۱۵۷) [ح، م، ک: بیوپاری ـ ض، ف، ل: بیپاری]

اِس سے پہلے ص ۱۰۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں فسانۂ عجائب کے سب نسخوں میں "بیوپاری" ہے، اِس لیے وہاں "بیوپاری" ہی لکھا گیا ہے۔ یہاں چوں کہ ل میں "بیپاری" ہے، اِس لیے یہاں "بیپاری" لکھا گیا ہے۔ "بیوپاری" اور "بیپاری" دونوں لفظ صحیح، فصیح اور مستعمل ہیں اور یہ اختلافِ نگارش بھی اِسی پر دلالت کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک بحث لفظ "خونچہ" اور "خوانچہ" کے ذیل میں بھی آچکی ہے۔ جس طرح اپنے اپنے مقام پر اُن دونوں لفظوں کو برقرار رکھا گیا ہے، اُسی طرح اِن دونوں لفظوں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا گیا ہے۔

بے وَقوف (۱۹۵) بہ لحاظِ اصل واو پر پیش آنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سبھی اِس لفظ کو بہ فتحِ واو ہی بولتے ہیں۔ تنہا لفظ "وُقوف" تو بہ ضمِ واو بولا جاتا ہے لیکن "بے وقوف" میں واو کا پیش، زبر سے بدل جاتا ہے؛ یہ اُردو کی کارفرمائی ہے۔ نور اللغات میں حرکات کی صراحت نہیں کی گئی ہے، لیکن فرہنگِ آصفیہ میں "بے وَقوف" اور "بے وَقوفی" لکھا گیا ہے اور استعمالِ عام کے لحاظ سے یہی درست ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

پاؤں (ص ۴۴) [ح، ن: پانوں ـ م، ک، ل: پاوں ـ ف، ض: پاؤں۔]

اِس لفظ کے املا میں اچھا خاصا اختلاف رہا ہے۔ شوق نیموی نے لکھا ہے:

"پاؤں۔ اِس کا املا مختلف فیہ ہے۔ دلّی والے "پانو" لکھتے ہیں اور ردیفِ واو میں

لاتے ہیں اور لکھنؤ والے "پاؤں" لکھتے ہیں اور ردیفِ نون میں لاتے ہیں۔ اور بعضے "پانوں" بھی لکھتے ہیں۔" [رسالۂ اصلاح]

یہ قول اِس لحاظ سے درست ہے کہ مثلاً آتش کی وہ غزل جس کا مطلع ہے:

باہر نہ پایچے سے ہوں اس گلبدن کے پانوں ۔۔۔ پھیریں چھری نہ پنجۂ قصاب بن کے پانوں

نون کی ردیف میں ملتی ہے اور غالب کی یہ غزل:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو ۔۔۔ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

واو کی ردیف میں ملتی ہے۔ مولفِ نور اللغات نے "پاؤں" لکھ کر، مزید لکھا ہے:

"نوٹ: حضراتِ لکھنؤ آخر میں نون (پاؤں) اور حضراتِ دہلی آخر میں واو (پانو) لکھتے ہیں۔"

اِس کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ جلال نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث مفید الشعراء میں "پاؤں" کو اُن الفاظ کے ذیل میں شامل کیا ہے "جن کے آخر میں نون ہے۔"

بہ ہر صورت۔ اِس اختلاف کے پیشِ نظر فسانۂ عجائب میں اِس لفظ کا املا (ف اور ض کے مطابق اور صاحبِ نور اللغات اور صاحبِ مفید الشعراء کی صراحت کے مطابق) "پاؤں" مرجح قرار دیا گیا ہے۔

پاہُنی (ص ۲۴۲) [ح، م، ض، ک: پاوہنی — ف: پاہونی — ن: پانوہنی]

نور اللغات میں "پاہنی" موجود نہیں، اِس کی جگہ "پاہُونا" ملتا ہے:

"پاہُونا: (ہ۔ مہمان۔ واو غیر ملفوظ ہے) مذکر۔ وہ گیت جو ڈومنیاں، عروس کی رخصتی کے وقت گاتی ہیں۔ بابل۔ مثنوی عالم ہے

ڈومنی پاہونے جو گانے لگی ۔۔۔ سننے والوں کی جان جانے لگی"

مولف نے سند میں جس شعر کو پیش کیا ہے، اُس میں "پاہنی" بھی پڑھا جا سکتا ہے [قدیم طریقِ کتابت کے مطابق واو لازماً اظہارِ حرکتِ ماقبل کے لیے آیا ہے، وہ شاملِ لفظ نہیں] اس لیے اِس شعر کو "پاہنے" کی سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے لکھا ہے:

"پاؤنی۔ یا۔ پاہنی: اسم مونث۔ ہندی۔ مہمان عورت (۲) پورب: وہ گیت جو دلہن کے رخصت ہوتے وقت گایا جاتا ہے، جسے دہلی میں "منڈھا" کہتے ہیں۔"

اِس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل لفظ "پاہنی" ہے۔ ہندی میں "پاہُنا"

مہمان کو کہتے ہیں اور بہ طورِ مجاز داماد کو کہا جاتا ہے۔ "پاہنی" مہمان عورت ہوئی [فارِس کے لغت میں یہ لفظ اِس معنی میں موجود ہے] غالباً اِس نسبت سے کہ لڑکی بھی شادی سے پہلے تک ایک طرح سے مہمان ہوا کرتی ہے؛ رخصتی گیت کے معنی میں یہ لفظ مستعمل ہو گیا۔ فسانۂ عجائب کی عبارت میں اِس جملے کا دوسرا ٹکڑا "سب کی چھاتی بھر آئی" بہ ظاہر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ قافیے کی رعایت سے اِس سے پہلے کے ٹکڑے میں فعل "گائی" ہو۔ اگر اِس بات کو مان لیا جائے تو پھر "پاہنی گائی" پڑھنا پڑے گا اور اِس عبارت میں یہی مرجّح معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ اصل لفظ "پاہنا" ہے، لہٰذا اُس سے "پاہنی" بنے گا۔ "پادھی" یا "پانوہنی" بہ ظاہر نہیں بن سکتا۔ ل اور ف میں "پاہونی" ہے۔ واو اُس زمانے کی روشِ تحریر کے مطابق بہ ظاہر اظہارِ ضمّہ کے لیے آیا ہے؛ اِس طرح اِسے "پاہُنی" پڑھا جا سکتا ہے اور صاحبِ فرہنگِ آصفیہ اور فارِس کی صراحت کے مطابق "پاہنی" ہی صحیح لفظ ہے۔

پتا (ص ۸۷) سب نسخوں میں "پتا" ہے اور اِس لفظ کا صحیح املا بھی یہی ہے۔

پَذیرا (ص ۵) فارسی لغات میں "پذیرفتن" کو بہ فتحِ اوّل و بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ چوں کہ آصفیہ اور نور اللغات میں "پَذیرا" (بہ فتحِ اوّل) ملتا ہے؛ اِس بنا پر بہ فتحِ اوّل کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں "پَذیر" کو بر وزنِ "وزیر" لکھا ہے، یہ ترجیح کا ایک اور پہلو ہوا۔

پَرِندے (ص ۵۷) نور میں "پَرَند" اور "پَرَندہ" کو بہ فتحِ دال لکھا گیا ہے۔ شعرا نے بھی عموماً "پرند" کو بَنْد، پَسَنْد کے قوافی کے ساتھ باندھا ہے، لیکن بول چال میں رِ مکسور رہتی ہے (پَرِند)۔ فارسی میں اسمِ فاعل قیاسی اِس طرح بنتا ہے کہ امرِ حاضر کے آگے "ندہ" بڑھاتے ہیں اور امرِ حاضر کا آخری حرف مکسور ہو جاتا ہے، جیسے: بخش سے بخشِندہ۔ اِسی طرح آیِندہ، رَوِندہ، دَوِندہ۔ [آصفیہ میں "آیندہ" کی ی پر زیر لگا ہوا ہے] اِس لحاظ سے بھی "پریدن" سے "پَرِندہ" اور "چریدن" سے "چَرِندہ" بننا چاہیے۔ غالب نے پنج آہنگ میں لکھا ہے: "اسمِ فاعل از نفسِ مضارع می خیزد، و روشِ آں این است کہ ہر حرفیکہ بہ دال پیوستہ است، از دال بگسلند و بحرکتِ کسری بہ نون زنند ....."۔ آصفیہ میں اصل لفظ کے طور پر تو "پَرِندہ" ہی لکھا گیا ہے اور توضیح میں لکھا گیا ہے کہ "مشہور بہ فتحِ رائے مہملہ" اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً رَ پر زیر تھا۔ بہ فتحِ را کو استعمالِ شعرا سے متعلق

سمجھنا چاہیے۔ "پرندے" کو "پَرِندے" "آیندہ" کو "آیِندہ" اور "نمایندہ" کو "نمایِندہ" کہنے پر شاید ہی کوئی آمادہ ہو سکے۔ اسی نسبت سے "پَرِندے" اور "دَرِندے" کو بہ کسرِ دوم رکھا گیا ہے۔ آگے چل کر ایک عبارت میں "چرِند پرِند" آیا ہے، وہاں بھی حرفِ دوم کو مکسور رکھا گیا ہے۔ اِسی طرح اسمِ فاعل قیاسی جہاں بھی آئے ہیں، وہاں "ندہ" سے پہلے جو حرف آیا ہے، اُسے مکسور رکھا گیا ہے، جیسے: آیِندہ، زِندہ، بخشِندہ۔

پَژمُردہ (ص ۲۱۳) برہانِ قاطع میں بہ کسرِ اوّل ہے۔ مولّفِ غیاث اللغات کی روایت کے بہ موجب خانِ آرزو نے سراج اللغۃ میں بہ کسرِ اوّل و بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح لکھا ہے لیکن اُردو میں زبانوں پر صرف بہ فتحِ اوّل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں پ پر زبر لگا ہوا ہے اور صاحبِ نور اللغات نے صراحتاً لکھا ہے کہ: "اُردو میں زبانوں پر بالفتح ہے"۔ اسی بنا پر پ پر زبر لگایا گیا ہے۔

پِسا فقرہ (ص ۸۹) ف: ہر پسی فقرے پر۔ اور سب نسخوں میں "ہر پسے فقرے پر" ہے اور یہی درست ہے۔ پسے فقرے سے مراد ہے ایسے فقرے سے جس کو گانے والا راگ میں شامل کر لیتا ہے اور وہ اِس طرح منجھا ہوا ہوتا ہے کہ راگ کا جز بن جاتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم نے اپنی کتاب گنجینۂ گوہر میں استاد بندو خاں کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے: "راگ اِس طرح پسنا چاہیے جیسے کھرل میں موتی پِستا ہے"۔ اِس سے "پِسنا" کا مفہوم واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ میر حسن کے اِس شعر سے بھی اِس لفظ کا مفہوم واضح ہوگا:

دل اب تو بات بات پہ پستا ہے اے حسن   کیا جانیے اِس میں کس کی نزاکت سما گئی

پسینا (ص ۳۰۲) ح، م میں "پسینہ" ہے لیکن ض، ک، ف، ل میں "پسینا" ہے اور اِس لفظ کا یہی صحیح املا ہے اور اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہ لفظ نہ عربی ہے نہ فارسی، اِس لیے اِس کے آخر میں الف ہی آنا چاہیے، "پتا" کی طرح [دیکھیے "پتا"]۔

پُلَنبہ (ص ۵) فارسی میں یہ لفظ بہ ضمِ اوّل (بہارِ عجم) اور بہ فتحِ اوّل (برہانِ قاطع) دونوں طرح ہے۔ یہی بات صاحبِ غیاث اللغات نے لکھی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں پ پر پیش لگا ہوا ہے؛ اِس سے معلوم ہوا کہ اُردو میں اِسے بہ ضمِ اوّل مانا گیا ہے اور سننے میں بھی اِسی طرح آیا ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

پنج شاخہ (ص ۱۴۰) [ح، م: پنشاخا۔ ض، ک: پنجشاخا۔ ف، ل: پنجشاخہ]

اصل لفظ "پنج شاخہ" ہے اور "پنشاخا" اُس کی بدلی ہوئی (مہنّد) صورت ہے۔ دونوں لفظ بجائے خود صحیح اور مستعمل ہیں؛ نور میں اِس کی صراحت موجود ہے۔ یہاں اصل لفظ "پنج شاخہ" کو ترجیح دی گئی ہے۔ آصفیہ اور نور میں "پنج شاخہ" کو فارسی بتایا گیا ہے اور اِسی نسبت سے اِس کے آخر میں ہائے مختفی لکھی گئی ہے۔ فارسی لغات میں یہ لفظ مجھے نہیں ملا؛ بہ ظاہر ہندستانی فارسی کا تحفہ معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ نور و آصفیہ میں "پنجشاخہ" ہے اور ف اور ل میں بھی اِسی طرح ہے؛ اِس بنا پر اِسے بہ ہائے مختفی لکھا گیا ہے۔

پنْشوہی (ص ۱۶۴) ج، ض، ک، ف، ل میں "پنسوہی" ہے، م اور ن میں "پنسوئی" ہے۔ گویا مصنّف کی نظرِ ثانی کے بعد جو نسخے چھپے ہیں، اُن سب میں "پنسوہی" ہے۔ ص ۲۰۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی یہی صورت ہے کہ اوّل الذکر سب نسخوں میں "پنسوہی" ہے۔ اُردو اور ہندی لغات میں صرف "پنسوئی" ملتا ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں یہ دونوں امکانات برابر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ (۱) مصنّف نے اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا ہو (یہ بھی بہ خوبی ممکن ہے کہ کسی زمانے میں یا کسی علاقے میں اِس کا یہ تلفظ بھی رہا ہو)۔ (۲) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محض لغزشِ قلم ہو؛ لیکن مصنّف کی نظرِ ثانی کے بعد چھپنے والے سبھی نسخوں میں "پنسوہی" کی تکرار سے اوّل الذکر امکان کی تائید کا پہلو نکلتا ہے اور اِسی بنا پر اِسی صورت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ چوں کہ ایسی اور کئی مثالیں اِس کتاب میں موجود ہیں (مثال کے طور پر دیکھیے اِسی ضمیمے میں جماہی اور جمائی کی بحث)، اِس سے اِس قیاس کی تائید کے لیے ایک قرینے کا اضافہ ہوتا ہے۔ سرور کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور کی جلدِ اوّل میں ص ۸۵ پر "پنسوئیاں" اور ص ۸۸ پر "پنسوئی" چھپا ہوا ملتا ہے، (مطبوعہ مطبع نجم العلوم کارنامہ) لیکن یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ کتاب سرور کے مرنے کے بعد چھپی ہے۔

پِنْگھیرُو (ص ۳۳) اُردو لغات میں عام طور پر "پکھیرو" (نونِ غنّہ کے بغیر) ملتا ہے۔ فیلن اور فاربس کے لغات کا بھی یہی احوال ہے؛ لیکن فسانۂ عجائب کے سبھی پیشِ نظر نسخوں میں "پنکھیرو" ہے۔ ہندی شبد ساگر میں "پکھیرو" اور "پنکھیرو" دونوں لفظ موجود ہیں اور اِس سے اِس قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ ایک زمانے میں "پنکھیرو" مع نونِ غنّہ بھی لکھا جاتا تھا؛ اِسی بنا پر اِس لفظ کے اِس قدیم املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

پینگ (ص ۱۰) فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات، دونوں میں صراحت نہیں ملتی کہ اِس لفظ میں "ی" معروف ہے یا مجہول۔ فیلن کے لغت میں اِس کو دونوں طرح لکھا گیا ہے (پینگ - پینگ)۔ فاربس کے لغت میں صرف بہ یائے مجہول (پینگ) ہے۔ سننے میں دونوں طرح آتا ہے (یہ علاقائی اختلاف ہے)۔ جناب نیّر مسعود رضوی نے اطلاع دی ہے کہ لکھنؤ میں زبانوں پر بہ یائے مجہول ہے (اور ذرائع سے بھی اِس کی تصدیق ہوئی)۔ اِسی بنا پر اِس کو بہ یائے مجہول

(پینگ) رکھا گیا ہے۔

تجھ کو (تجھے، تجھ سا، تجھ پر، تجھ میں) قدیم تحریروں میں "مجکو، تجے، تجا" جیسے الفاظ ہائے مخلوط کے بغیر بھی ملتے ہیں اور مع ہائے مخلوط بھی۔ البتہ تجھ اور تجھ اور مجھے اور تجھے عموماً مع ہائے مخلوط ملتے ہیں۔ فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں کا بھی یہی احوال ہے۔ مثلاً ف میں "تجکو" بھی ہے اور "مجھکو" بھی ہے (ص ۶۵) اسی طرح تجھے (ص ۶۵) تمھیں (ص ۶۵) تجھپر (ص ۶۶) اور تجھین (ص ۵۹)۔ چوں کہ اصل لفظ "مجھ" اور "تجھ" عموماً مع ہائے مخلوط ملتے ہیں؛ اس لیے ایسے جملہ الفاظ کو اس کتاب میں مع ہائے مخلوط لکھا گیا ہے؛ جیسے: مجھے، مجھ کو، تجھے، تجھ کو، تجھ سا، مجھ سا، تجھ پر، مجھ پر، تجھ میں، مجھ سے، تجھ سے۔

تحتُ الثّریٰ (ص ۵۹) قاعدے کے لحاظ سے "تَحتَ الثّریٰ" (بہ فتحِ سوم) ہونا چاہیے، لیکن اُردو میں زبانوں پر عموماً "تحتُ اللفظ" اور "تحتُ الثّریٰ" ہیں۔ نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ دونوں میں ان مرکبات میں "تحت" کی دوسری ت پر پیش لگا ہوا ہے [تحتُ الثّریٰ۔ تحتُ اللفظ] اور یہ استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

ترپُولیا (ص ۱۴۰) فرہنگِ آصفیہ میں "ترپَولیا" ہے (بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم و سکونِ پنجم)۔ فیلن نے اپنے لغت میں "ترپَولِیا" درج کیا ہے۔ یعنی پ پر تو زبر ہے لیکن لام مکسور ہے۔ لیکن نور اللغات میں "ترپُولیا" لکھا ہوا ہے اور یہ استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ نور اللغات کے اندراج کے مطابق "ترپُولیا" کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

تشتری (ص ۱۳۸) [ح، م، ص، ف، ل: طشتری ــ ک، ن: تشتری]

فارسی میں "تشت" ہے (برہانِ قاطع) اور لغات میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ "طشت" معرب صورت ہے "تشت" کی۔ اُردو میں "تشت" اور "طشت" دونوں املا ملتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں ط کی فصل میں "طشت" اور ت کی فصل میں "تشت" ملتا ہے۔ یہی صورت "تشتری" کی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "طشتری" اور "تشتری" دونوں لفظ اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں، لیکن مؤلف نے صراحت کی ہے کہ یہ لفظ "اُردو" ہے اور اس لحاظ سے "تشتری" کو ترجیح حاصل رہے گی۔ اسی بنا پر ک کے مطابق "تشتری" کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

تنباکو (ص ۸) آج کل اِس کو "تمباکو" بھی لکھا جاتا ہے، لیکن پہلے "تنباکو" ہی لکھتے تھے۔ چوں کہ فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "تنباکو" ہے، اِس لیے اِس لفظ کے پُرانے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ [ک میں "تماکو" ہے]

تَنْبولی (ص ۷) اِسے "تَنبولی" اور "تنْبولی" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے، لیکن (استعمالِ عام کے مطابق) "تنبولی" رکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "تَنْبول" (بہ سکونِ دوم) ہے۔ "برگِ تَنْبول" میں یہ تلفظ برقرار رہتا ہے لیکن "تنبولی" اور "تنبولن" میں تلفظ کی یہ تبدیلی ہوتی ہے کہ نونِ ساکن کی جگہ نونِ غنہ آجاتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں یہ لفظ موجود ہے لیکن تلفظ کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے، البتہ فیلن نے اپنے لُغت میں "تنّبولی" لکھا ہے اور سند میں جان صاحب کا یہ شعر لکھا ہے، جس سے تلفظ کا تعین قطعیت کے ساتھ ہو جاتا ہے:

"اجی باجی بھی ڈھونڈھ کے یار کریں، توے تیلی تنبولی کو پیار کریں
مری اِس سے زناخی ہزار کریں، مری جوتی سے چوڑے چمار کریں"

مصحفی کی ایک مثنوی کا شعر ہے:

کہ کسی نگری میں بہ طرفِ شمال اک تنبولی بچہ تھا بدر مثال

(دیوانِ مصحفی ص ۱۴۷)

[اسی کی ایک صورت "تمولی" اور "تمولن" بھی ہے]

توان (ص ۷۰) فارسی لغات میں اِس کو بہ ضمِ اول لکھا گیا ہے لیکن برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اِس لفظ کے حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ: "لغۃً بضمِ اول، در تداولِ امروز بفتحِ اول"۔ یہی صورت اُردو میں ہے کہ تواں، توانائی، توانا؛ یہ سب بہ فتحِ اول مستعمل ہیں۔ صاحبِ نور اللغات نے اِس کی صراحت کی ہے: "تواں: بہ ضمِ اول صحیح ہے۔ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی "توانا" اور "توانائی" کی تے پر زبر لگا ہوا ہے۔ اِسی بنا پر تے پر ہر جگہ زبر لگایا گیا ہے۔

توبہ (ص ۱۴) یہ لفظ اصلاً بہ فتحِ اول ہے لیکن کچھ لوگوں کی زبان سے بہ ضمِ اول بھی سنا گیا ہے۔ مؤلفِ غیاث اللغات نے بہ فتحِ اول لکھ کر صراحت کی ہے کہ: "و عوام بالضم گویند"۔ نور اللغات میں "توبہ" لکھ کر لکھا گیا ہے: "بالضم بولتے ہیں، صحیح بالفتح ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں اِس کو صرف بہ فتحِ اول (تَوبہ) لکھا گیا ہے اور اِس کے جملہ مرکبات میں التزام کے ساتھ تے پر

زبر لگایا گیا ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

ٹوتا (ص ۳۸) [ک، ف: طوطا — ح، م، ض، ل، ن: توتا]
"توتا" کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔ اُردو میں اِس کو "طوطا" بھی لکھا جاتا رہا ہے لیکن اصح یا پھر یوں کہیے کہ مرجّح املا ت سے (توتا) ہے۔ موٴلفِ نور اللغات نے "توتا" کے ذیل میں صراحت کر دی ہے کہ: "اِس کا املا "طوطا" صحیح نہیں ہے"۔ موٴلفِ فرہنگِ آصفیہ نے "طوطا" کے ذیل میں لکھا ہے: "دیکھو توتا"۔ اِسی طرح اِس کے دوسرے مرکبات کے ذیل میں لکھا ہے۔ مثلاً "طوطا پالنا" لکھ کر لکھا ہے: "دیکھو توتا پالنا"۔ اِس کا مطلب واضح طور پر یہی ہوا کہ موٴلف کے نزدیک بھی مرجّح املا "توتا" ہے۔ جلال نے بھی سرمایۂ زبانِ اُردو میں اِس کو ت کی فصل میں لکھا ہے۔ اِس کتاب میں ہر جگہ اِس لفظ کو "توتا" لکھا گیا ہے۔ فسانۂ عجائب کے بیش تر نسخوں میں (بہ شمولِ ل) "توتا" ہی ہے اور اِنھی وجوہ سے اِس کتاب میں ہر جگہ "توتا" لکھا گیا ہے۔

تیاری (ص ۱۱) "تیار" اور "تیاری" کے املا میں اِس کتاب کے مختلف نسخوں میں اختلاف ملتا ہے۔ مثلاً ل میں اِس مقام پر "طیاری" ہے اور ک میں "تیاری" ہے۔ اِس کے برخلاف، ل میں ص ۳۷ پر "تیار" ہے اور ک میں اِس مقام پر "طیار" ہے۔ [یہ اختلاف اُس زمانے میں تھا اور آج بھی اِس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی ہے] "تیار" اور "طیار" سے متعلق ضروری تفصیل بہارِ عجم میں موجود ہے۔ بعد کے لغت نویسوں نے وہیں سے اُس کو نقل کیا ہے۔ غالب نے بھی ایک خط میں وہی باتیں لکھی ہیں (خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۱۸۳)۔
چوں کہ فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں اختلافِ املا پایا جاتا ہے، اور اُردو میں بیش تر "تیار" اور "تیاری" ہی لکھا جاتا ہے؛ اِس بِنا پر اِس کتاب میں ہر جگہ "تیار" اور "تیاری" لکھا گیا ہے۔ [آصفیہ میں تیار، تیاری، تیار کرنا، تیار ہونا؛ سب کو ت کی فصل میں لکھا گیا ہے اور اِس سے ترجیح کا مزید فائدہ حاصل ہوتا ہے]

ٹکا (ص ۱۸۲) سب نسخوں میں "ٹکا" (بغیر نونِ غنہ) ہے۔ نور اللغات میں "ٹکنا" بہ معنی "سیا جانا، ٹانکا جانا" کے ذیل میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ: "اِن معنوں میں "ٹنکنا" بولتے ہیں"۔ اِس کے بعد "ٹکوانا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "اِس جگہ بیش تر "ٹنکوانا"

بولتے ہیں۔" اِس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مصدر نونِ غنّہ کے بغیر بھی مستعمل رہے ضرور ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "ٹکنا" بغیرِ نونِ غنّہ ہے، مع نونِ غنّہ مذکور نہیں۔ اِس سے مزید تصدیق ہوتی ہے کہ یہ مصدر (مع مشتقات) بغیرِ نونِ غنّہ مستعمل رہا ضرور ہے۔ فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "ٹکا" بغیرِ نونِ غنّہ ہے اور اس سے مزید تائید ہوتی ہے؛ اِسی بنا پر اِسے بغیرِ نونِ غنّہ ہی رکھا گیا ہے۔

اِس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ بہت سے لفظوں میں نونِ غنّہ کی آواز سیّال حالت میں رہی ہے، اِس لیے ایسے کسی لفظ کے متعلّق اِس سلسلے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ مشکل ہی سے کہی جاسکتی ہے۔

ٹُکٹکی (ص ۱۷۴) اِس لفظ کے تلفّظ میں اختلاف ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "ٹِکٹِکی" (بہ کسرِ اوّل و سوم) ہے۔ اِس کے برخلاف نور اللغات میں اِسے "بالفتح و فتحِ سوم و کسرِ چہارم" (ٹَکٹَکی) لکھا گیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں نور اللغات کے اِس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے اِس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ: "لکھنؤ میں بہ کسرِ اوّل و سوم ہے" لیکن اوحد الدّین بلگرامی کے معروف لُغت نفائس اللغات میں (جو انّیسویں صدی عیسوی کے ربعِ ثانی کی تالیف ہے) اِسے (نور اللغات کے مطابق) "بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ تای ہندی و کسرِ کافِ تازی و سکونِ تحتانیِ معروف" لکھا گیا ہے۔

نفائس اللغات (اور پھر نور اللغات) کے اندراج سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اودھی کے علاقے میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و سوم مستعمل تھا۔ بعد کو بہ کسرِ اوّل و سوم کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اثر مرحوم کا اختلاف اِسی بدلتے ہوئے رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ دلّی کے اطراف میں غالباً شروع ہی سے یہ لفظ بہ کسرِ اوّل و سوم مستعمل رہا ہے۔

نفائس اللغات کے اندراج کی بنیاد پر اِس کتاب یعنی فسانۂ عجائب میں، جس کا زمانۂ تصنیف اُسی عہد سے تعلّق رکھتا ہے، اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و سوم مرجّح سمجھا گیا ہے۔ نور اللغات کا اندراج اِس کی توثیق کرتا ہے۔

جُرأت عربی قاعدے کے مطابق صحیح املا یہی ہے۔ ایسے متعدد لفظ ہیں جن میں الف (یا واو) پر عربی کے لحاظ سے ایک ہمزہ لکھا جانا چاہیے۔ اُردو میں ایسے اکثر لفظ تو ہمزہ کے بغیر لکھے جانے لگے جیسے: تاثر، متاثر، تامل، توام (وغیرہ) لیکن "جرأت" عربی املا کے

مطابق عموماً مع ہمزہ لکھا جاتا رہا ہے۔ قدیم تحریروں میں اکثر یہی املا ملتا ہے۔ فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں کا حال یہ ہے کہ اُن میں اکثر مقامات پر "جرأت" ہے اور "جرات" کم مقامات پر ہے۔ اِس لحاظ سے اِس کتاب میں ہر جگہ "جرأت" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ البتہ "تامّل" اور "توام" جیسے الفاظ اِن سب نسخوں میں ہمزہ کے بغیر ہی ملتے ہیں (اور ویسے بھی اُردو میں اِن کو ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے)۔ اِس لیے اِن الفاظ کو ہمزہ کے بغیر (تامّل، توام) لکھا گیا ہے۔

یہی صورت "مؤلّف" کی ہے کہ بہ لحاظِ اصل اِس میں واو کے اوپر ہمزہ لکھا جانا چاہیے اور پہلے اکثر لوگ اِسی طرح لکھا کرتے تھے [اگرچہ اب بیش تر "مولّف" لکھتے ہیں] اِس کتاب کے مختلف نسخوں میں "مؤلّف" اور "مولّف" دونوں املا ملتے ہیں، لیکن "مولّف" کم اور "مؤلّف" زیادہ۔ اِسی بنا پر اِس کتاب میں "مؤلّف" کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

جمائیاں (ص ۱۴۵) فسانۂ عجائب کے سبھی پیشِ نظر نسخوں میں "جمائیاں" ہے۔ اُردو لغات میں "جماہی" ملتا ہے، "جمائی" نہیں ملتا؛ بل کہ جلال نے سرمایۂ زبانِ اُردو میں لکھا ہے کہ جو لوگ "جمائی" بولتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ شعرا نے اِسے بہ اِسے ہنوز (جماہی) نظم کیا ہے اور لغت نویسوں نے بھی اِسی طرح لکھا ہے، لیکن "جمائی" بھی استعمال میں رہا ضرور ہے، کم سہی۔ خود جلال کا قول اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس زمانے میں کچھ لوگ "جمائی" بولتے تھے۔ بہ ہر حال اُردو میں "جماہی" اصل لفظ ہے اور "جمائی" اُس کی ایک صورت ہے؛ قلیل الاستعمال سہی لیکن اُس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مثل کا پہلا ٹکڑا ہے: "آئی جمائی نیند کی ماتی"... اِس میں "جمائی" مُنے میں آیا ہے اور "ماتی" کی رعایت بھی اِسی کی متقاضی ہے۔ چوں کہ فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "جمائی" ہے، اِس لیے اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے [نیز اِس سلسلے میں دیکھیے "پنسوہی" کی بحث]۔

جَوار (ص ۱۰۵) المنجد میں بہ کسرِ اوّل ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ بہ کسرِ اوّل اور بہ ضمِّ اوّل، دونوں طرح صحیح ہے، لیکن یہ قولِ صاحبِ نور اللغات "اُردو میں بہ فتحِ اوّل ہے اور یہ بالکل درست ہے"؛ اِسی لیے "ج" پر زبر لگایا گیا ہے۔

جُوکیں (ص ۲۵۹) [ح، م، ض، ت، ل: جوکیں ــــ ک: جونکیں]

لغات میں عموماً یہ لفظ مع نونِ غنّہ ملتا ہے، لیکن ک کے علاوہ اور سب نسخوں میں بغیر

نونِ غنّہ (جوکیں) ہے۔ پلیٹس اور فیلن نے اپنے لغات میں "جوک" کو بھی درج کیا ہے اور اِس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ لفظ بغیرِ نونِ غنّہ تھا ضرور، خواہ استعمال میں کم آیا ہو اور اِس لحاظ سے "جوک" کو ایک قدیم صورت مان لینا چاہیے۔ اِسی بنا پر [بیش تر نسخوں کے مطابق] اِس جگہ "جوکیں" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ نونِ غنّہ کی آواز عجیب سیّال حالت میں رہی ہے۔ بہت سے لفظ ہیں جو مع نونِ غنّہ اور بغیرِ نونِ غنّہ دونوں طرح ملتے ہیں (مثلاً: گھانس۔ گھاس۔ سپنیرا۔ سپیرا۔ سونچنا۔ سوچنا وغیرہ) اِس لفظ کو بھی اُسی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔

جہل خانہ (ص ۱۱) [ن، م: جیل خانہ — ح، ض، ک، ت، ل: جہل خانہ]

"جہل خانہ" جیل خانہ کی قدیم صورت ہے۔ لغات میں یہ لفظ نہیں ملتا، لیکن اُس زمانے میں مستعمل ضرور تھا۔ سند میں مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

دانا تھی وہ، جہل خانے آئی　　بگڑی ہوئی کو بنانے آئی

(مثنوی گلزارِ نسیم، اشاعتِ اوّل، مطبعِ میر حسن رضوی لکھنؤ)

"دانا" کی رعایت اِس کی مقتضی ہے کہ اِس کو "جہل خانہ" پڑھا جائے۔ سرور کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور (ترجمۂ الف لیلہ) میں بھی ایک جگہ "جہل خانہ" آیا ہے: "سواروں کو ساتھ لیا، شہ زادوں کو جہل خانہ دکھایا" (جلدِ سوم، ص ۳۶) اِنھی وجوہ سے "جہل خانہ" لکھا گیا ہے۔

جِہَنْدَہ (ص ۳۲) غیاث اللغات میں "جہانیدن" اور "جہاں" کو بہ کسرِ اوّل لکھا ہے۔ اِس لغت میں "جہندہ" موجود نہیں، لیکن "جہاں" سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بہ کسرِ اوّل ہوگا۔ برہانِ قاطع میں "جہندہ" تو موجود نہیں لیکن "جہاں" ہے اور اِس کو بہ کسر و بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح لکھا ہے لیکن ڈاکٹر محمد معین نے فرہنگِ فارسی میں جہیدن، جہاں، جہندہ؛ سب کو جیم کے زبر کے ساتھ درجِ لغت کیا ہے۔ میں نے فرہنگِ فارسی کے اندراج کو ترجیح دی ہے اور "جَہَنْدَہ" رکھا ہے۔

جھونپڑا (ص ۸۲) [ح، م، ض، ف: جھونپڑا — ک، ن: جھوپڑا]

یہ لفظ مع نونِ غنّہ اور بغیرِ نونِ غنّہ، دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ جلال نے سرمایہ میں اِسے بغیرِ نونِ غنّہ لکھا ہے، لیکن آصفیہ و نور میں مع نونِ غنّہ ہے۔ چوں کہ فسانۂ عجائب

کے بیش تر نسخوں میں مع نونِ غنّہ ہے، اِس لیے اِسی کو ترجیح دی گئی ہے۔

جَہیز (ص ۱۴۳) عربی میں جَ بکسور ہے (جِہیز)۔ نور میں بھی اصل کے مطابق جَ مکسور ہے، لیکن آصفیہ میں جَ پر زبر لگا ہوا ہے اور فیلن اور فاربس کے لغات میں بھی جَ مفتوح ہے، سماعت میں بھی اسی طرح آتا ہے؛ اِنھی وجوہ سے جَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

چرا (ص ۱) اِس لفظ کے تلفظ میں ذرا سا اختلاف ہے، اگرچہ مرجّح قول یہ ہے کہ یہ لفظ "کیوں" کے معنی میں بہ کسرِ اوّل ہے۔ برہانِ قاطع میں اِس کو اِس معنی میں کسی اختلاف کے بغیر بہ کسرِ اوّل ہی لکھا گیا ہے۔ اُس میں صراحت کی گئی ہے کہ "چَرا" بہ فتحِ اوّل "چریدن" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: چرنا ["چراگاہ" میں یہی "چَرا" ہے] اور "چِرا" کلمۂ استفہام ہے۔ یعنی "چَرا" اور "چِرا" دو مختلف لفظ ہیں۔ فرہنگِ رشیدی میں صرف "چَرا" (بہ فتحِ اوّل) ہے اور اس کے معنی "کلمۂ استفہام و چرندہ" دونوں لکھے ہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ غیاث اللغات کی عبارت یہاں نقل کر دی جائے، اِس سے صورتِ حال وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی:

> "چرا بفتحِ اوّل، بمعنیِ چریدن و چراگاہ و بکسرِ اوّل، بمعنیِ برای چہ، زیرا کہ این لفظ مرکّب است از کلمۂ "چہ" کہ برای استفہام است، و از لفظِ "را" کہ بمعنیِ برای باشد و صاحبِ مؤیّد و کشف و لطائف و برہان و ابراہیمی و دیگر محققان بکسرِ اوّل تحقیق کردہ نوشتہ اند۔ و سراج الدین علی خان آرزو در چراغِ ہدایت و خیابان نوشتہ کہ لفظِ "چرا" موافقِ قاعدہ بکسر است، مگر چوں صاحبِ رشیدی وغیرہ بفتح نوشتہ اند، لہجۂ دیگران و زبانِ قوم مخصوص است، پس باین معنی بفتح ہم غلط نباشد، اگرچہ مخالفِ قیاس و محاورۂ بعض مردم است۔
> و در سراج نوشتہ کہ "چرا" بکسرِ اوّل بمعنیِ "برای چہ" در لہجۂ عراقیان است و لہجۂ دیگران بفتحِ اوّل۔ و قیاسِ مؤلف مطابقِ عراقیان است۔"

اِس پوری بحث سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بہ لحاظِ تلفظ یہ لفظ مختلف فیہ ہے، البتہ بیش تر ہندستانی لغت نویسوں نے اصل کی نسبت سے "چِرا" کو بہ کسرِ اوّل مرجّح قرار دیا ہے، "برای چہ" کے معنی میں اور "چَرا" کو مصدر "چریدن" کا مشتق مانا ہے۔ یہ امتیاز

مناسب معلوم ہوتا ہے، اور یہاں بھی اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں یہ لفظ موجود نہیں۔

چھاؤں (ص ۱۷۹) [ح : چھاؤں — ک : چھاوں — م، ض، ف : چھاؤں]
لفظ "پاؤں" کے ذیل میں یہ بحث آچکی ہے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے اِس لفظ کے آخر میں نون مانا ہے۔ "پاؤں" کے قیاس پر اِس کتاب میں اِس لفظ کا املا بھی "چھاؤں" مانا گیا ہے۔ اِس عبارت میں "پاؤں" اور "چھاؤں" بہ طورِ قافیہ آئے ہیں اور اِس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ "پاؤں" کی طرح اِسے بھی "چھاؤں" لکھا جائے۔

چَھبڑِیاں (ص ۱۳۹) [ح، ض : چھبڑیاں — م : چھپڑیاں — ک، ف، ل : چھبڑیاں — ن : چھبڑیاں]
"چَھبڑا" ٹوکرے کو کہتے ہیں۔ یہ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات دونوں میں موجود ہے۔ "چَھبڑی" ٹوکری کو کہیں گے۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں لیکن نور اللغات میں موجود ہے۔ نفائس اللغات میں "چَھبڑا" اور "چَھبڑی" دونوں لفظ موجود ہیں۔ اُس میں "چھبڑی" کو بہ فتحِ اوّل و سکونِ ثانی لکھا گیا ہے۔ "چَھبڑی" کی جمع "چَھبڑِیاں" ہوگی۔ اِسی نسبت سے حرکات اور املا کا تعیّن کیا گیا ہے۔ نوادر الالفاظ میں "چھابڑی" ہے۔

چِھپنا (ص ۷۶) جلالؔ نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں لکھا ہے کہ یہ لفظ "فصحاے لکھنؤ کی زبان پر بالکسر ہے، اور اہلِ دہلی کی زبان پر بالضم"۔ یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے۔ ناسخؔ کے شاگرد بحرؔ لکھنوی نے بھی اپنے رسالے بحر البیان میں "پوشیدہ شدن" کے معنی میں "چِھپنا" بہ کسرِ اوّل لکھا ہے اور "چُھپنا" کے معنی لکھے ہیں : " رخنۂ خرد یا کلاں بند شدن از گل در مکان چوں سوراخِ موش یا دیوارِ شکستہ را " [بحر البیان، مخطوطۂ رضا لائبریری رام پور]۔
فرہنگِ آصفیہ میں "چُھپنا" ہے اور اس سے جلالؔ وغیرہ کے اِس قول کی تصدیق تو ہوجاتی ہے کہ دہلی میں بہ ضمِ اوّل ہے، لیکن انشاؔ نے جو کچھ لکھا ہے، اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں (یا یہ کہ انشاؔ کے نزدیک) یہ لفظ فصحاے دہلی کی زبان پر بہ کسرِ اوّل تھا (ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۲۵)۔ نیز ص ۲۲۲ پر لکھا ہے کہ : "چِھپنا اور چُھپنا میں کسرے اور ضمّے کی مخالفت ہے۔ فصیح بالکسر ہے اور ضمّے کے ساتھ اہلِ مغل پورہ کا

لہجہ ہے، اہلِ اُردو کی زبان نہیں۔ لیکن غالب نے مجروحؔ کو ایک خط میں لکھا ہے: "مجموعۂ نثرِ اُردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اُس مجموعے کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا، بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں" (عودِ ہندی، مطبع مجتبائی میرٹھ، طبع اوّل، ص ۱۲۷)۔ ایک اور خط میں اُنھی کو لکھا ہے: "اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم" (ایضاً ص ۱۲۵)۔ اِس کے برخلاف میر امّن کی کتاب گنجِ خوبی کا مخطوطہ اُنھی کے قلم کا لکھا ہوا رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں محفوظ ہے اور اُس کا عکس میرے سامنے ہے؛ اُس میں میر امّن نے حرفِ اوّل پر زبر لگایا ہے: "جس درخت کے پیچھے چھپنے کو جاتے" (ص ۲۷)۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں یہ لفظ بہ ضمِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ بہرصورت اہلِ لکھنؤ "چھپنا" کہتے ہیں۔ ہاں، سرورؔ نے اپنی کتاب شگوفۂ محبت میں ایک جگہ لکھا ہے: "یہ قصّہ یوسف جمال.... یا تو چھپا تھا، اب چھپا۔ جب یہ زیر زبر ہوا، تب مدِ نظر ہوا" (یہ حوالہ نیّر مسعود صاحب نے بھیجا ہے)۔ اِس سے مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

چھوچھو (ص ۱۸۴)۔ نور اللغات میں واو پر معروف کی علامت موجود ہے لیکن اثرؔ مرحوم نے اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ: "لکھنؤ میں واوِ مجہول سے بولتے ہیں" (فرہنگِ اثر، ص ۲۳۳)۔ مہذب لکھنوی نے بھی مہذب اللغات میں یہی لکھا ہے کہ لکھنؤ میں بہ ہر دو واوِ مجہول مستعمل تھا اور فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی بہ واوِ مجہول ہے؛ اِسی بنا پر اِسے بہ واوِ مجہول رکھا گیا ہے۔

حاتم (ص ۴)۔ اصلاً یہ لفظ بہ کسرِ سوم ہی ہے [المنجد]۔ فارسی شعرا نے اِسے دَم اور خَم کے قوافی میں بہ فتحِ سوم بھی نظم کیا ہے اور اُنھی کی تقلید میں اُردو شعرا نے بھی لکھا ہے؛ مگر بہ فتحِ تا کو ضرورتِ شعری کا کرشمہ سمجھنا چاہیے؛ اصل لفظ بہ کسرِ تا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "حاتِم" ہے اور نور میں بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ اب مستعمل بہ کسرِ تا ہے؛ اِن وجوہ سے اِسے بہ کسرِ تا (حاتِم) مرجح قرار دیا گیا ہے۔

حمل (ص ۳۵)۔ ایک برجِ آسمانی کا نام ہے اور اِس معنی میں بہ فتحِ دوم (حَمَل) ہے اور عورت کے پیٹ میں جو بچہ ہوتا ہے، اُس معنی میں بہ سکونِ دوم (حَمْل) ہے۔ یہ لفظ اِس عبارت میں اِس طرح آیا ہے کہ ایہام کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے؛ برج کا لفظ اِس کے ساتھ آیا ہے؛ اِس بنا پر بہ فتحِ اوّل و دوم ہی مرجح قرار پائے گا۔

خاتم (ص ۴)۔ یہ لفظ بہ فتحِ تا اور بہ کسرِ تا دونوں طرح صحیح ہے (المنجد)۔ قرآنِ پاک میں

بہ فتحِ تا "خاتَم النبیین" آیا ہے : ماکان محمد أبا أحد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتَم النبیین (سورۂ احزاب) یہ لفظ یہاں اِس کتاب میں بھی بہ ترکیب عربی آیا ہے (خاتَم المرسلین) اِس نسبت سے یہاں بہ فتحِ تا کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

خاکہ (ص ۱۱) فسانۂ عجائب کے بعض نسخوں میں "خاکا" ہے اور بعض میں "خاکہ" (ل میں "خاکہ" ہے) یہ لفظ دونوں طرح لکھا جاتا رہا ہے۔ آصفیہ میں "خاکا" ہے اور نور میں "خاکہ" ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اب سے پہلے ایسے بیش تر لفظوں کو عموماً بہ ہاے مختفی لکھا جاتا تھا۔ نور میں سند کا جو شعر لکھا گیا ہے، اُس میں یہ لفظ مع اضافت آیا ہے، شعر یہ ہے :

کھنچا نقشہ جو نقاشِ ازل سے روے زیبا کا اُڑا پھر خوب خاکہ خاکۂ تصویرِ لیلیٰ کا

اور اِس سے اِس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قدما بیش تر اِسے بہ ہاے مختفی لکھا کرتے تھے۔ امام باڑہ، نقشہ اور خاکہ : اِس کتاب میں اِن لفظوں کا قدیم مروج املا برقرار رکھا گیا ہے۔

خانُماں (ص ۳۰۰) اصلاً "خان و ماں" تھا : "خان مخففِ خانہ و ماں بہ معنیِ رخت" (غیاث اللغات) "نون کا پیش اِس واسطے ہے کہ واو تحریر میں نہیں ہے" (نور اللغات)۔

خِراج (ص ۳۵) عربی میں بہ فتحِ اوّل (خَراج) ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اصل کے مطابق "خَراج" ہی لکھا ہوا ہے، لیکن مولفِ غیاث اللغات نے خانِ آرزو کے حوالے سے اِس لفظ میں تصرف کی نشان دہی کی ہے، اور مولفِ نور اللغات نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے؛ اُنھوں نے اِس لفظ کو "بفتحِ اوّل" لکھ کر صراحت کی ہے کہ : "فارسی اور اُن کی تقلید میں اُردو والے بہ کسرِ اوّل بولتے ہیں"۔ یہی صحیح صورتِ حال ہے اور اِسی بنا پر اِس لفظ کو "خِراج" لکھا گیا ہے۔

خَرّاد (ص ۸) اِس لفظ کے ذیل میں صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ "خَرّاد" بہ راے مشدد، یہاں بہ طورِ اسمِ فاعل آیا ہے : "لکڑی کو تراش کر برابر کرنے والا" (نور) "خَراد" (بہ راے مخفف) کے معنی ہیں "وہ آلہ جس سے لکڑی کو چھیل کر صاف کرتے ہیں اور گول بناتے ہیں"۔ معنوی مناسبت کی بنا پر اِس عبارت میں "خرّاد" ہی کا محل ہے۔ یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ ح، م، ن میں ر پر تشدید بھی لگی ہوئی ہے۔

خِرمَن (ص ۱۸) فارسی لغات میں معمولی سے معنوی فرق کے ساتھ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل،

دونوں طرح ہے۔ برہانِ قاطع میں صرف بہ کسرِ اوّل ہے اور صاحبِ غیاث اللغات نے خانِ آرزو کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے بہ کسرِ اوّل کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ اُردو لغات میں یہ صرف بہ کسرِ اوّل ہے اور زبانوں پر بھی اِسی طرح ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

خَرُوش (ص ۱۱۳) اصلاً خ پر پیش ہے۔ نور اللغات میں بھی اِسے بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی خ پر زبر لگا ہوا ہے (خَروش) اور یہ استعمالِ عام کے عین مطابق ہے؛ اِسی نسبت سے خ پر زبر لگایا گیا ہے۔

خِزاں (ص ۱۴۸) فارسی لغات میں عموماً اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "خِزاں" ہے یعنی خ پر کسرہ لگا ہوا ہے اور یہ عام اُردو والوں کے تلفّظ کے مطابق ہے۔ فیلن اور فاربس نے بھی اپنے لغات میں اِسے بہ کسرِ اوّل ہی لکھا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کے اندراج کے مطابق اِسے بہ کسرِ اوّل مرجّح سمجھا گیا ہے۔ (عُلما سے قطعِ نظر) عام لوگوں کی زبانوں پر بھی اِسی طرح ہے۔

خَفَقان (ص ۲۲۰) اصلاً یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و دوم (خَفَقان) ہے۔ فارسی میں اساتذہ نے اِسے بہ سکونِ دوم بھی نظم کیا ہے (اسناد بہارِ عجم میں مندرج ہیں)۔ اُردو میں شعرا نے اکثر بہ فتحِ دوم نظم کیا ہے لیکن زبانوں پر (ایسے اور الفاظ کی طرح) یہ بہ سکونِ دوم ہی ہے۔ فارسی کے تصرّف اور اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق اِسے بہ سکونِ دوم مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

خَلْجان (ص ۲۲۰) اصلاً یہ بھی (خفقان کی طرح) بہ فتحِ اوّل و دوم ہے لیکن زبانوں پر بہ سکونِ دوم ہے۔ "خفقان" کی طرح اِسے بھی استعمالِ عام کے مطابق بہ سکونِ دوم رکھا گیا ہے۔

خُلْطَا (ص ۱۶۸) یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اصلاً اِس لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہے (خُلْطَہ) یہاں چوں کہ یہ "لیکا" کے قافیے میں آیا ہے، اِس لیے قواعدِ قافیہ کے مطابق اِسے "خلطا" لکھا گیا ہے۔

خواجہ خِضر (ص ۱۸۱) فارسی میں "خِضْر، خَضِر، خِضَر" تینوں طرح ملتا ہے۔ (بہارِ عجم۔ غیاث اللغات) اُردو میں عموماً "خِضْر" اور "خِضَر" سننے میں (اور نظم میں) آیا ہے، اور

"خواجہ خِضَر" میں لفظِ "خِضَر" صرف بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم (خَضِر) زبانوں پر ہے؛ اِسی لیے ض پر زبر لگایا گیا ہے۔

مولّفِ نوراللغات نے لکھا ہے کہ "لکھنؤ میں اب بہ فتحِ اوّل وکسرِ دوم، و بالکسر زبانوں پر ہے۔" اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خضر کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے کہ لکھنؤ میں اب بہ فتحِ اوّل وکسرِ دوم و بالکسر زبانوں پر ہے۔ بہ فتحِ اوّل وکسرِ دوم بول چال میں ہرگز مستعمل نہیں، بہ کسرِ اوّل و سکونِ دوم و سوم ہے۔ یہ مردوں کے متعلق کہا۔ عورتیں خالی "خضر" بولتی ہی نہیں، "خواجہ خِضَر" کہتی ہیں۔ خِضَر بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم۔"

انشا کے اِس شعر سے اِس کی مزید تائید ہوتی ہے:

ایسے میں چلیے کیجے تماشا، سیر کو پریاں آئی ہیں
ندی کے اندر خواجہ خِضَر کی نذر کے بیڑے پڑتے ہیں (کلامِ انشا ص ۱۳۹)

خوانچہ (ص ۱۳۸) سب نسخوں میں یہاں "خوانچہ" ہے، اِس لیے اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ دیباچۂ کتاب (ص ۹) میں بھی ایک جگہ یہ لفظ آیا ہے اور وہاں سبھی نسخوں میں "فرنی کے خونچے" ہے؛ وہاں "خونچے" ہی رکھا گیا ہے۔ اِس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ "خونچہ" اور "خوانچہ" دونوں لفظ بجائے خود درست اور مستعمل ہیں اور اِن دو مختلف مقامات پر املا کا یہ اختلاف، اِن دونوں صورتوں کے اختلاف اور استعمال کی نمایندگی کرتا ہے؛ اِسی لیے اِن کو اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا گیا ہے (دیکھیے "خونچے")۔

خونابہ (ص ۷۲) [خ، م، ض، ف، ل: خوننابہ —— ن: خونابہ]
اِس لفظ کا صحیح املا خونابہ ہے۔ "خوناب" مرکّبِ مقلوب ہے "آبِ خوں" کا (جیسے "زہراب" مقلوب ہے "آبِ زہر" کا) اِس لیے لازماً اِس میں ایک نَ آئے گا۔ ایک اور مرکّب ہے "خونِ ناب" اور "خونِ ناب" کے معنی ہیں: خالص خون۔ "خوناب" اور "خونِ ناب" دو مختلف لفظ ہیں؛ اِسی لیے یہاں "خونابہ" لکھا گیا ہے۔

خُونچے (ص ۹) ن: خوانچے۔ اور سب نسخوں میں "خونچے" ہے۔ لکھنؤ میں "خونچے" مستعمل تھا اور جناب حیات اللہ انصاری، صباح الدین عمر صاحب اور ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی

نے اطلاع دی ہے کہ اب بھی مستعمل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں یہ لفظ موجود نہیں۔ چوں کہ سبھی اہم نسخوں میں "خونچے" ہے، اِس لیے یہاں اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

داؤں (ص ۱۶) [ج : داؤں ــــ م : داؤں ــ ض : داؤ ــ ک : داوں ــــ ف ، ل ، ن : داو]

فارسی میں "داو" ہے (برہانِ قاطع) اُردو والوں کے تلفظ میں نونِ غنّہ شامل رہتا ہے۔ نور اللغات میں اِسے "داؤں" لکھا گیا ہے۔ چوں کہ فسانۂ عجائب میں اِس گروپ کے دو اور لفظوں کو ہر جگہ "پاؤں" اور "چھاؤں" لکھا گیا ہے (اور اُن پر بحث کی گئی ہے، اُسے دیکھا جائے) اِسی بنا پر اِس لفظ کا املا بھی "داؤں" رکھا گیا ہے۔

دَرَخْشِندہ (ص ۳۴) برہانِ قاطع میں "درخش" کو بہ ضمِّ اوّل و ثانی لکھا ہے۔ غیاث اللغات میں بھی کئی لغات کے حوالے سے "درخشاں" اور "درخشیدن" کو "بضمّتین" لکھا ہے (دُرُخشاں۔ دُرُخشیدن)۔ غالباً اِسی کی تقلید میں نور اللغات میں بھی "درخشاں" کو "بہ ضمِّ اوّل و دوم" لکھا گیا ہے لیکن فرہنگِ جہانگیری میں "درخش" کو "با اوّل و ثانیِ مضموم" لکھ کر، یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ: "و بعضے با اوّل و ثانی مفتوح نیز تصحیح کردہ اند" اور ڈاکٹر معین نے فرہنگِ فارسی میں "دُرُخش، دُرَخش، دَرَخش" تینوں طرح لکھا ہے۔ اُردو میں اِس کے مشتقات آخری صورت میں مستعمل ہیں، یعنی: دَرَخشندہ اور دَرَخشاں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "درخشاں" (بہ فتحِ اوّل و ثانی) ہے اور یہ اُردو میں استعمال کے عین مطابق ہے؛ اِسی بنا پر دال پر زبر لگایا گیا ہے۔

دُرُود (ص ۱۰) یہ لفظ اصلاً بہ ضمِّ اوّل ہے، اِس طرح سننے میں بھی آیا ہے؛ لیکن کچھ لوگ بہ فتحِ اوّل (دَرود) بھی بولتے ہیں۔ نور اللغات میں صراحت کر دی گئی ہے کہ "بہ فتحِ دال غلط ہے" اور فرہنگِ آصفیہ میں بھی "دُرود" لکھا ہوا ہے۔ چوں کہ یہ خاص لفظ ہے اور بہ ضمِّ اوّل بھی مستعمل ہے؛ اِس بنا پر اور نور و آصفیہ کے اندراج کی بنا پر اِسے بہ ضمِّ اوّل ہی مرجّح سمجھا گیا ہے۔

دَرِیغ (ص ۱۷۵) فارسی لغات میں اِسے بہ کسرِ اوّل و دوم "دِرِیغ" لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے لیکن حرکات کی صراحت نہیں کی گئی، البتّہ نور اللغات میں اِسے فارسی

کے مطابق " بہ کسرِ اوّل و دوم " ہی لکھا گیا ہے۔ اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اوّل ہے۔ پلیٹس نے اِسے بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح درج کیا ہے، لیکن فیلن نے صرف بہ فتحِ اوّل لکھا ہے اور یہ اُردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے اور اِسی بنا پر اِسے بہ فتحِ اوّل رکھا گیا ہے۔

دستارخوان (ص ۱۶) صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ اصل لفظ " دستار خوان " ہے اور فارسی میں مستعمل ہے۔ لغت نویسوں نے یہ صراحت کردی ہے کہ " دسترخوان " اِسی کا مخفف ہے۔ (غیاث اللغات، بہارِ عجم، نور اللغات) سرور کی کتاب شبستانِ سرور میں بھی یہ لفظ متعدد جگہ آیا ہے۔

دست آویز (ص ۷۸) سب نسخوں میں اسی طرح ہے، یہ اِس لفظ کا قدیم املا ہے۔ فارسی میں تو عموماً " دست آویز " ملتا ہے، اگرچہ اب اُردو والے " دستاویز " لکھتے ہیں۔ اِس لفظ کے اِس قدیم املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

دَفعَۃً (ص ۲۱) عربی میں قاعدہ یہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں تاے غیر اصلی (یا تاے مدوّر) ہوتی ہے تو زبر کی تنوین کی صورت میں اُسی ۃ پر دو زبر لگائے جاتے ہیں، جیسے: دفعۃً، نسبۃً وغیرہ۔ اور جن الفاظ کے آخر میں تاے اصلی (یا تاے دراز) ہوتی ہے تو تنوین کی صورت میں اُس کے آخر میں الف کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے وقت سے وقتاً۔ اب رجحان یہ ہے کہ ایسے سبھی لفظوں میں، کسی طرح کے امتیاز کے بغیر، الف کا اضافہ کیا جائے تاکہ یکسانی رہے، مثلاً: دفعتاً، نسبتاً، مروّتاً وغیرہ؛ لیکن پہلے مذکورہ قاعدے کی پابندی کی جاتی تھی اور اِسی بنا پر قاعدے کے مطابق " دفعۃً " رکھا گیا ہے۔ آیندہ بھی ایسے الفاظ میں اِسی مسلّمہ قاعدے کی پابندی کی جائے گی۔ یہ بھی وضاحت کردی جائے کہ فسانۂ عجائب کے نسخوں میں یہی قدیم املا پایا جاتا ہے۔

دِلَدّر (ص ۲۰۳) " دِلَدّر " اور " دَلِدّر " دونوں طرح سُننے میں آیا ہے، لیکن " دِلَدّر " بیش تر اور " دَلِدّر " کم۔ صاحبِ آصفیہ نے " دَلِدّر " لکھ کر یہ صراحت کی ہے کہ " دِلَدّر زیادہ بولتے ہیں"؛ اور یہی بات اثر مرحوم نے لکھی ہے: " لکھنؤ میں بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم لکھتے ہیں" (فرہنگِ اثر، ص ۳۶۳) اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

دِیر یاز (ص ۳۲۸) [ج، م، ض، ف، ن: دیر باز — ک: دیر یاز]
فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں یہ لفظ موجود نہیں۔ برہانِ قاطع میں اِسے " دیر باز " لکھا

گیا ہے اور صراحت بھی کردی گئی ہے کہ یہ "بابا ے ابجد" ہے۔ لیکن فرہنگ رشیدی میں "دیریاز" ہے۔ موّلف نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس کا دوسرا جز "یاز" ہے جس کے معنی "حرکت" کے ہیں: "یاز بہ معنی حرکت است، چنانکہ گویند: شب دیر یاز"۔

بہارِ عجم کے موّلف نے بھی یہ وضاحت کی ہے کہ صحیح لفظ "دیریاز" ہے اور مزید لکھا ہے کہ "دیر باز" قطعاً غلط ہے، انھوں نے لکھا ہے:

"دیریاز بہ تحتانی بالف کشیدہ، کنایہ از زمانِ دراز۔۔۔ چہ "یاز" حرکت را گویند۔ و "دیر باز" بموحدہ، بجاے تحتانیِ دوم، چنانکہ شہرت گرفتہ، غلطِ محض بلکہ خطاے فاحش است۔"

چوں کہ صحیح لفظ "دیریاز" ہے، اس لیے یہاں ک کے املا کو ترجیح دی گئی ہے۔

ڈاڑھی (ص ۵۵) یہاں ل کے علاوہ اور سب نسخوں میں "ڈاڑھی" ہے۔ صرف ل میں "داڑھی" ہے۔ ص ۱۲۵ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں م، ح، ل میں "داڑھی" ہے اور باقی نسخوں میں "ڈاڑھی" ہے۔ ص ۲۶۰ پر بھی یہ لفظ موجود ہے اور وہاں ل میں بھی "ڈاڑھی" ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ "ڈاڑھی" قدیم املا ہے اور اس کتاب کے نسخوں میں بیش تر وہی پایا جاتا ہے؛ اس بنا پر اسی قدیم املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

ڈانواں ڈول (ص ۱۴۹) [ح، ک: ڈاماڈول — م، ض، ف، ل: ڈانواں ڈول]

آصفیہ، سرمایہ اور نور میں صرف "ڈانواں ڈول" ملتا ہے۔ فیلن نے اصل لفظ کے طور پر "ڈانواں ڈول" ہی لکھا ہے، اس کے بعد "ڈاماڈول" (بغیرِ نونِ غنہ) بھی لکھا ہے لیکن اسے بے پڑھوں کی زبان بتایا ہے۔ ہندی شبد ساگر میں "ڈاماڈول" (بغیرِ نونِ غنہ) ہے لیکن اس کے سامنے لکھا ہوا ہے کہ: "دیکھو ڈاواں ڈول"۔ بہ ہر صورت ہندی شبد ساگر میں بھی اصل لفظ "ڈاواں ڈول" ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہندی میں (وہ "ڈانواں ڈول" ہو یا "ڈاواں ڈول") نونِ غنہ صرف ایک جگہ ہے، جب کہ اردو میں وہ دو جگہ ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے "ڈانواں ڈول" لکھ کر مزید لکھا ہے کہ: "ہر دو نونِ غنہ"۔ اس سے قطعی طور پر تعین ہو جاتا ہے۔ مندرجۂ بالا اندراجات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو میں مستعمل لفظ "ڈانواں ڈول" ہے (اور م، ض، ف، ل میں ہے بھی اسی طرح)؛ اس بنا پر اسی املا کو مرجح سمجھا گیا۔

رَضا (ص ۱۷۵) عربی میں "رَضا" اور "رِضاء" دونوں لفظ ہیں (اختلافِ معنی کے ساتھ)۔ اُردو میں عام طور پر "رَضا" کہتے ہیں اور اِس کے مرکبات مثلاً رضامند، رضاکار، رضامندی، رضاورغبت میں "رَضا" بہ فتحِ اوّل ہی بولا جاتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "رِضا" لکھا ہوا ہے، یعنی ر پر زبر اور زیر دونوں موجود ہیں، کسی وضاحت کے بغیر۔ استعمالِ عام کی بنا پر "رَضا" کو ترجیح دی گئی ہے۔

رِعایا (ص ۱۶۷) اصلاً ر پر زبر ہے (رَعایا) اور یہ "رعیّت" کی جمع ہے لیکن بہ قولِ مولّفِ نوراللغات: "اُردو میں بہ طورِ مفرد، بہ کسرِ اوّل مستعمل ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی ر پر زیر لگا ہوا ہے۔ اِسی وجہ سے "رِعایا" لکھا گیا ہے۔

رَکاب (ص ۱۶۲) اصلاً ر پر زیر ہے (المنجد۔ برہانِ قاطع) فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات دونوں میں اصل کے مطابق اِسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن استعمالِ عام میں بہ فتحِ اوّل ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں "رکاب" کے ذیل میں نوراللغات کے اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اُردو میں بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں۔ کون رَکاب دار کو رِکاب دار (بالکسر) کہے گا۔"

اور یہ بالکل درست ہے، اِسی بنا پر "رکاب" کو بہ فتحِ اوّل رکھا گیا ہے۔

رُوزن (ص ۴) لغات میں یہ لفظ بہ ضمِ اوّل و بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح ملتا ہے۔ برہانِ قاطع میں بہ فتحِ اوّل ہے۔ بہارِ عجم میں لکھا ہے:

> "روزن، بواوِ مجہول، دراصل بمعنی سوراخیکہ شعاعِ آفتاب از راہِ آں درونِ خانہ درآید۔ چرا کہ مرکب است از "روز" دیکے از کلماتِ نسبت۔ وبکثرتِ استعمال بمعنی مطلق سوراخ شہرت گرفتہ۔"

اِس طرح یہ "رُوزن" ہوا۔ اُردو میں بھی یہی اختلاف ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "رَوزن" ہے لیکن نوراللغات میں صراحت کے ساتھ "بالضمّ و فتحِ سوم" لکھا ہوا ہے۔ نوراللغات کے اندراج کے مطابق یہاں بہ ضمِّ اوّل رکھا گیا ہے۔

رُوشنی (ص ۲) فارسی میں بہ ضمِ اوّل ہے (برہانِ قاطع)۔ عربی میں "رَوشن" بہ معنی روزن ہے (المنجد)۔ "روشن" کو "رُوشن" کا معرّب کہا گیا ہے (غیاث اللغات)۔ فرہنگِ آصفیہ میں

"روشن" پر اعراب موجود نہیں، لیکن "بَروشنی" اور "بَروشنائی" پر زبر لگا ہوا ہے۔ مؤلفِ نوراللغات نے لکھا ہے: "روشن، ف، بالضم و فتح سوم: تاباں۔ عربی میں رَوشن بالفتح بہ معنی روزن ہے۔" اِس سے بہ ظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ "روشن بہ معنی تاباں" کو انھوں نے بہ ضمِ اوّل ہی مرجح خیال کیا ہے اور بہ فتحِ اوّل کو عربی اور بہ معنی روزن مانا ہے۔ بہ ہر صورت، اصل لفظ کے مطابق اِس کو بہ ضمِ اوّل ہی مرجح سمجھا گیا ہے۔

زَبان (ص ۱) فارسی میں بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل، دونوں طرح ہے (برہانِ قاطع) مزید تفصیل غیاث اللغات میں ملے گی۔ نوراللغات اور فرہنگِ آصفیہ میں بھی اِسے کسی صراحت کے بغیر بہ ضمِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ البتہ نفائس اللغات میں اِسے صرف بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اِسی طرح "زَبان نکالنا" اور "زَبان بند ہونا" میں زِ پر زبر لگا ہوا ہے، اِس سے مؤلفِ لغت کی ترجیح کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور جناب نیّر مسعود رضوی نے اطلاع دی ہے کہ لکھنؤ میں فصحا "زَبان" (بہ فتحِ اوّل) بولتے ہیں؛ اِن وجوہ سے اِس کتاب میں بہ فتحِ اوّل ہی کو مرجح قرار دیا گیا ہے۔

زِرَہ (ص ۱۷۹) فارسی میں زے اور رے، دونوں پر زیر ہے (زِرِہ)۔ نوراللغات میں اِس لفظ کو فارسی کے مطابق ہی لکھا گیا ہے (بہ کسرِ اوّل و دوم)۔ اُردو شعرا نے قوافی میں فارسی کے مطابق بہ کسرِ اوّل و دوم بھی نظم کیا ہے لیکن زبانوں پر بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم ہی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "زِرَہ" ہے اور فیلن کے لغت میں بھی اِسی طرح ہے اور یہ اُردو کے عام تلفظ کے عین مطابق ہے۔ اِس طرح نظم بھی کیا گیا ہے:

فقیرانہ ہے دل مقیم اُس کی رَہ کا غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا
خدنگ آہ کا اے فلک بے طرح ہے بھروسا تو تاروں کی مت کر زِرَہ کا

(انشا، کلامِ انشا، ص ۲۳)

"گرہ" اور "زرہ" یہ دو لفظ ایسے ہیں کہ اصلاً تو بہ کسرِ اوّل و دوم ہیں لیکن اُردو میں زبانوں پر بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم ہیں۔ آصفیہ کے اندراج اور استعمالِ عام کے مطابق اِن دونوں لفظوں کو بہ فتحِ دوم مرجح سمجھا گیا ہے۔

زُعم (ص ۲) اِس لفظ کو بہ ضمِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح فصیح بتایا گیا ہے۔ مؤلفِ غیاث اللغات نے لکھا ہے: "بہر سہ حرکتِ حرفِ اوّل و سکونِ عینِ مہملہ"، لیکن

فتح وضم افصح است"۔ یہی بات مولّفِ فرہنگِ آصفیہ نے لکھی ہے۔ البتہ نور اللغات میں کسی صراحت کے بغیر" بالضّم ونیز بالفتح" لکھا ہوا ہے۔ البتہ ترتیب کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو قیاساً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولّف کے نزدیک مرجّح بہ ضمِّ اوّل ہے۔ سماعت میں بھی بیش تر بہ ضمِّ اوّل آیا ہے، اِسی بنا پر یہاں زَ پر پیش لگایا گیا ہے۔

زُمرّد (ص ۴۰) عربی میں "زُمُرُّد" ہے (المنجد) فارسی میں بہ فتحِ رَا بھی ہے (بہارِ عجم) مگر حرفِ اوّل وثانی مضموم ہی ہے۔ اُردو میں مزید تصرف یہ ہوا ہے کہ پہلا اور تیسرا حرف، دونوں مفتوح ہو گئے۔ زبانوں پر اِسی طرح ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے، مگر حرکات کی صراحت نہیں کی گئی ہے، البتہ نور اللغات میں لکھا گیا ہے: "اُردو میں بہ فتحِ اوّل وضمِ دوم وتشدیدِ سوم مفتوح مستعمل ہے" اور یہ بالکل درست ہے؛ اِسی نسبت سے اِسے بہ فتحِ اوّل وسوم لکھا گیا ہے۔

ساچَق (ص ۱۳۹) مولّفِ غیاث اللغات کی تصریح کے مطابق یہ لفظ ترکی ہے اور بہ کسرِ سوم (ساچِق) ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے بہ کسرِ سوم لکھ کر، صراحت کی ہے کہ: "اُردو میں بہ فتحِ سوم زبانوں پر ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی " ساچَق" لکھا گیا ہے اور قوسین میں یہ عبارت ہے: "صحیح بہ کسرِ جیمِ فارسی" نیز مولّفِ آصفیہ نے اپنی کتاب رسومِ دہلی میں "ساچق" کے ذیل میں لکھا ہے: "ایک ترکی لفظ بکسرِ جیمِ فارسی مگر بہ فتحِ جیمِ فارسی رسمِ شادی میں مستعمل ہے"۔ اِسی اعتبار سے چَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

سِٹھَنیاں (ص ۱۴۲) [ح: سٹھینیاں۔ ض، ف، ل: سیٹھنیاں۔ م، ک: سٹھنیاں۔ ن: سوہنیاں]

ک میں "سٹھنیاں" پر حاشیہ لکھا گیا ہے: "سٹھنیاں: بالکسر، گالیاں"۔ م میں بھی اِس لفظ پر بین السطور "گالیاں" لکھا ہوا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اِس لفظ کے ذیل میں یہ عبارت ملتی ہے:

"سِٹھنی (ہ) اسمِ مونث، وہ گالیاں جو بیاہ میں سمدھنیں ایک دوسری کو باہم دیتی ہیں اور نیز وہ فحش بنائے ہوئے گیت جو بیاہ میں ڈومنیاں، سمدھنوں کی طرف سے ایک دوسری کی نسبت سناتی ہیں [اصل میں یہ لفظ پنجابی زبان کا ہے۔ اِس کی اصل "سیٹھا" بمعنی "کسیلا" ہے۔ چوں کہ گالی، کڑوی کسیلی بات کو کہتے ہیں، اور اِس سے غرض مزاح کے طور پر دوسرے کو چڑانا ہوتا ہے؛ پس اِس لحاظ اُس گالی کو ایک سُریلی آواز

کے ساتھ گا کر سمدھن کو دی جائے "سیٹھنی" کہنے لگے] انشا:

"سُن مصحفی زشت و بد اطوار کی گالی کہتا ہوں یہ گالی نہیں کچھ عار کی گالی
سٹھنی کے عوض تو نے جو تیار کی گالی گالی ہے وہ کچھ اور ہی اسرار کی گالی"

مؤلف نے اِس لفظ کی اصل کی بابت جو کچھ لکھا ہے، اُس سے قطعِ نظر کرتے ہوئے یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فیلن کے لغت میں "سیٹھنا" (بہ یائے معروف) اور "سیٹھنے دینا" ملتا ہے۔ نیز مغل بادشاہ شاہ عالم آفتاب کے ایک مجموعۂ کلام نادراتِ شاہی میں مختلف عنوانات کے تحت جو کلام ہے، اُس میں ایک عنوان "سیٹھنے" (सीठने) بھی ہے۔ چوں کہ اِس مجموعے میں کلام اور عنوانات کو اُردو رسمِ خط کے ساتھ ساتھ ناگری رسمِ خط میں بھی لکھا گیا ہے، اِس لیے تلفظ کا قطعی طور پر تعین ہو جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُس زمانے میں دلّی میں "سیٹھنے" مستعمل تھا [متعارف معنی: ایسے فحش گیت جنھیں ڈومنیاں براتوں میں گاتی ہیں]۔ مذکورہ مجموعے میں اِس عنوان کے تحت شاہ عالم کے کہے ہوئے ۲۶ "سیٹھنے" مندرج ہیں؛ بہ طورِ نمونہ ایک "سیٹھنا" نقل کیا جاتا ہے:

سمدھن تیری تنگ بہت ہے سندر، سگھڑ، انوٹھی انگری جات نہیں ہے وا میں، ایسی لال انگوٹھی

فارس کے لغت میں "سیٹھنا" اور "سٹھنی" مندرج ہے اور نور اللغات میں "سٹھنی" ہے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ مختلف التلفظ رہا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے اطلاع دی ہے کہ "سٹھنیاں کے متعلق خواتین سے معلوم ہوا کہ س کا زیر مجہول آواز ["بہتر" کی طرح] دیتا ہے۔ علاوہ بریں "طعنے سٹھنے" ایک محاورہ ہے جس میں "سٹھنے" کا یہی تلفظ ہے"۔

انشا کے جو شعر فرہنگِ آصفیہ میں منقول ہیں، یہ اُس معرکے کی یادگار ہیں جو مصحفی سے لکھنؤ میں ہوا تھا۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ مشفق خواجہ) میں یہ پوری غزل موجود ہے۔ انشا نے "سٹھنی" نظم کیا ہے۔ کن کے حاشیے پر جو صراحت ہے اُس سے بھی اِس لفظ کی یہی صورت سامنے آتی ہے۔ یہ سب حوالے اِس پر دلالت کرتے ہیں کہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں "سٹھنی" مستعمل تھا؛ اِسی بنا پر "سٹھنیاں" کو مرجح مانا گیا ہے۔

پنجاب، جموں اور مشرقی یو۔پی کے متعدد حضرات سے معلوم ہوا کہ اِن علاقوں میں "سٹھنیاں" اب بھی انھی معنوں میں سُننے میں آتا ہے، اور اِسے تائیدِ مزید قرار دیا جا سکتا ہے ——— ہاں اِن میں جو "سوہنیاں" ہے یہ بہ ظاہر تحریف ہے اور اربابِ مطبع کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے۔

سجدہ (ص ۷۰۵) عربی میں بہ کسرِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح ہے (المنجد)۔ غیاث اللغات میں اختلافِ حرکت کی مزید تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں س پر زبر اور زیر دونوں لگے ہوئے ہیں، لیکن یہ صراحت کی گئی ہے کہ: "قرآن شریف کی ایک سورۃ کا نام۔ بعض فرہنگ نویسوں کی رائے ہے کہ بہ فتح سین جملہ اسی کے واسطے ہے، ورنہ بہ کسر ہے"۔

اور نور اللغات میں اس کو صرف "بالکسر و فتحِ سوم" لکھا گیا ہے؛ اسی بنا پر اسے بہ کسرِ اوّل رکھا گیا ہے۔

سَخُن ۔ سُخَن (ص ۳۲) فرہنگِ رشیدی میں اسے "سَخُن" اور "سُخَن" دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں اسے چار طرح درست بتایا گیا ہے: سُخن، سَخُن، سُخُن، سَخَن۔ غیاث اللغات میں اسے سُخُن، سَخَن، سَخُن لکھا گیا ہے۔

نور اللغات میں اس کو غیاث اللغات کے مطابق لکھا گیا ہے، اور کسی طرح کی صراحت نہیں پائی جاتی۔ فرہنگِ آصفیہ میں اس کو برہانِ قاطع کے مطابق درج کیا گیا ہے، لیکن اس صراحت کے ساتھ: "مگر افصح بہ فتحِ اوّل و ضمِ ثانی" اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ مؤلف کے نزدیک (اُردو میں) "سَخُن" فصیح تر ہے۔ زبانوں پر بھی بیش تر اسی طرح ہے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ صاحبِ بہارِ عجم کے نزدیک بہ فتحِ دوم (سُخَن) صرف قافیے کی حد تک جائز ہے: "و بفتحِ دوم، ہمچنیں جائز نیست لیکن قافیۂ آں با من و تن و امثالِ آن جائز است"۔ اس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ متاخرین ہندستانی اساتذہ کے نزدیک "سُخَن" صرف قافیے کے طور پر آ سکتا ہے۔

اس کتاب میں جہاں جہاں لفظِ "سخن" کسی ایسے لفظ کے قافیے کے طور پر آیا ہے جو بہ فتحِ دوم مستعمل ہے (جیسے: چمن) تو خ پر زبر لگایا گیا ہے۔ بہ صورتِ دیگر، حسبِ قولِ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ (اور صاحبِ بہارِ عجم) اس کو "سَخُن" لکھا گیا ہے۔

سُڈَول (ص ۳۰۵) سب نسخوں میں اس کا املا "سوڈول" ہے، لیکن صحیح لفظ واو کے بغیر "سُڈَول" ہے۔ [اس میں پہلا جز سنسکرت کا "سُ" ہے، جس کے معنی ہیں: اچھا (ہندی شبد ساگر)] غالباً اظہارِ ضمہ کے پرانے اندازِ تحریر کے مطابق یہاں بھی پیش کے اظہار کے لیے واو لکھا گیا [جیسے "اُس" کو "اوس" یا "دُکان" کو "دوکان" لکھا جاتا تھا] اُردو لغات میں بھی "سڈول" ہے [فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، سرمایۂ زبانِ اُردو، فیلن کا لغت] اسی بنا پر اسے واو کے بغیر لکھا گیا ہے۔

سیر (ص ۲۸۹) فارسی میں بہ فتحِ اوّل (سَیر) ہے، اسی لیے فارسی عبارت اور فارسی مرکبات میں اسے بہ فتحِ اوّل پڑھا جاتا ہے اور اسی طرح پڑھنا چاہیے۔ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح ہے۔ اُردو شعرا نے بھی اسے دونوں طرح نظم کیا ہے،

یعنی "ترّ" اور "پِھر" دونوں طرح کے قوافی کے ساتھ نظم کیا ہے، لیکن بہ فتحِ اوّل کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں (اِس کو ضرورتِ شعری بھی کہا جا سکتا ہے)۔ فرہنگِ آصفیہ میں "سَر" کو فارسی اور "سِر" کو ہندی لکھا ہے اور اِس سے ترجیح کا پہلو واضح ہے۔ نور اللغات میں وضاحت موجود ہے: "فارسی معانی اور فارسی ترکیبوں میں "سَر" بالفتح ہے۔ اُردو محاورات میں بالکسر ہی فصیح ہے۔"

یہی بات اثرؔ لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھی ہے (ص ۹۲) — اِس بنا پر جب یہ لفظ فارسی عبارت میں یا فارسی ترکیب کے ساتھ آیا ہے تو اِسے "سَر" لکھا گیا ہے؛ جیسے: سَرفروش، سَر بہ زانو وغیرہ۔ اور مفرد لفظ کو "سِر" لکھا گیا ہے؛ جیسے: سِر اُٹھانا۔

سَرِشْت (ص ۲۸۹) فارسی میں سِن اور رے، دونوں پر زیر ہے (سِرِشت)۔ فارسی کے ایسے متعدد لفظ ہیں جو اصلاً بہ کسرِ اوّل و دوم ہیں (جیسے: بِہِشت، فِرِشتہ وغیرہ) لیکن اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم ہیں اور یہ لفظ بھی اُسی فہرست میں شامل ہے۔ عام طور پر لوگ "سَرِشت" کہتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات، دونوں میں اِسے فارسی کے مطابق ہی لکھا گیا ہے، البتہ فیلن نے اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا ہے اور یہ اُردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے؛ اِسی بنا پر سِن پر زبر لگایا گیا ہے۔

سَرَطان (ص ۱۳۶) عربی میں بہ فتحِ اوّل و دوم (سَرَطان) ہے (المنجد)۔ اُردو میں شعرا نے اِسے بہ سکونِ دوم بھی نظم کیا ہے، مثلاً ذوقؔ کے ایک قصیدے کا پہلا مصرع ہے:

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن

نور اللغات میں محسنؔ کاکوروی کا یہ شعر سنداً مندرج ہے:

اُڑ جائے نہ سطحِ ارضِ الٰہی　　　سرطاں پہ کرے نہ چوٹ ماہی

بول چال میں تو بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے اور اِسی لیے یہاں اِس کو بہ سکونِ دوم مرجّح سمجھا گیا ہے۔

سُرُود (ص ۱۳۱) آصفیہ و نور، دونوں میں صراحت کی گئی ہے کہ نغمہ و راگ کے معنی میں "سُرود" بہ ضمِّ اوّل ہے اور "ایک قسم کا باجا" کے معنی میں بہ فتحِ اوّل (سَرود) ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں اِسی امتیاز کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور نغمہ و راگ کے معنی میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، وہاں اِسے "سُرود" لکھا گیا ہے اور اِسی بنا پر ص ۱۴۲ پر "سَرودیے" (سَرود

بجانے والے) لکھا گیا ہے۔

سرھانا (ص ۱۶۱) نور اللغات میں "سرہانا" ہے، حرکات یا حروف کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "سِرہانا" ہے، یعنی س پر زیر لگا ہوا ہے اور ر پر جزم؛ لیکن تلفظ میں بہ ہائے مخلوط "سرھانا" آتا ہے۔ اِن دونوں لغات میں سند کے جو اشعار لکھے گئے ہیں، اُن میں بھی "سرھانا" ہے نہ کہ "سِرہانا":

عشق ہے آنکھوں کو تلووں سے مجھے ملنے کا　پائنتی یار کی ہو میرا سرھانا شبِ وصل (آتش)

تیرے مہجور کے پہلو ہی میں پائے ہم نے　سرِ بستر کبھی تکیے نہ سرھانے پائے (داغ)

گفتگو میں بھی یہی صورت ہے کہ تلفظ میں "دھ" کی آواز نکلتی ہے۔ ہندی میں یہ ہکار آواز موجود نہیں، اِس لیے ہندی میں "سِرہانا" کہا جاتا ہے لیکن اُردو میں یہ آواز موجود ہے اور اِس لفظ میں بھی کارفرما ہے؛ اِس لیے اُردو میں "سرھانا" کہتے ہیں اور اِسی طرح لکھا بھی جائے گا۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

سِمت (ص ۵۰) یہ لفظ اصلاً بہ فتحِ اوّل (سَمت) ہے، لیکن جیسا کہ صاحبِ نور اللغات نے لکھا ہے: "اُردو میں بالکسر ہی زبانوں پر ہے" اِسی کی پابندی کی گئی ہے اور س پر زیر لگایا گیا ہے۔

سُنگَرنیں (ص ۶) ح، م، ک میں س پر پیش لگا ہوا ہے۔ ک میں حاشیے پر اِس لفظ کے متعلق یہ وضاحت بھی ملتی ہے: "سنگرنیں، بالضم، ترہ فروش"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی "سُنگر" کے س پر پیش لگا ہوا ہے لیکن اِس کے معنی "میوہ فروش" لکھے ہیں۔ "سنگرنیں" اُس میں موجود نہیں اور یہ نور اللغات میں بھی موجود نہیں، البتہ اصل لفظ "سنگر" موجود ہے، لیکن اُسے "بالفتح و فتحِ سوم" لکھا گیا ہے۔ اِس کے برخلاف نفائس اللغات میں اِسے "بہ ضمِ اوّل" ہی لکھا گیا ہے اور معنی لکھے گئے ہیں: "کسیکہ میوہ فروشد"۔ اِن اندراجات سے واضح ہوتا ہے کہ اصلاً س پر پیش ہے۔ "سُنگرنیں" مونث کے لیے بہ طورِ جمع آیا ہے، اِسی بنا پر س پر پیش لگایا گیا ہے۔

سِنّمار (ص ۲۰) یہاں صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ یہ نام سُرور کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور میں بھی آیا ہے: "سِنمار کی صنعت کا اظہار تھا" (ص ۱۶۱) یہاں حاشیے پر لکھا ہوا ہے: "نامِ معمارِ چینی"۔ برہانِ قاطع میں یہ لفظ موجود ہے اور اِسے "رُومی" بتایا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عرب اِسے "سِنّمار" (بہ تشدیدِ نون) کہتے ہیں۔ اِس سے متعلق ایک واقعہ بھی اِس کتاب میں

مندرج ہے [ص ۱۸۱ اور اس کا حاشیہ]۔

سنہ (ص ۲۹) [ح، ض، ف، ل : سن — ص، ک : سنہ]

سال کے معنی میں صحیح لفظ "سنہ" ہے۔ "سن" بہ کسرِ سین بمعنی سال و مقدارِ عمر ہے [جیسے: کم سن۔ یا جیسے : ہم سن] "سنہ" کے معنی میں "سن" لکھنا صحیح نہیں، اِسی بنا پر یہاں ص اور ک کے مطابق "سنہ" لکھا گیا ہے۔

سوچ (ص ۳۵) [ح، م، ک : سوچ بچار کر — ض، ف، ل : سونچ بچار کر]

اِس سلسلے میں یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سرور کے زمانے میں "سونچنا" مستعمل ضرور تھا۔ صاحب نور اللغات نے اِس لفظ کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "اِس کا املا نون کے ساتھ یعنی "سونچنا" ناجائز ہے"۔ لیکن اِس سے صورتِ حال صحیح طور پر سامنے نہیں آتی۔ یہ صحیح ہے کہ اب اِس مصدر کو نونِ غنّہ کے بغیر ہی لکھتے ہیں، لیکن پہلے یہ مع نونِ غنّہ بھی مستعمل تھا، بل کہ بعض کے نزدیک تو صرف مع نونِ غنّہ صحیح تھا۔ ناسخ کے معروف شاگرد بحر لکھنوی نے اپنے رسالۂ لغت بحر البیان میں اِس مصدر کو صرف مع نونِ غنّہ لکھا ہے :

"سونچنا" بہ واوِ مجہول و نونِ غنّہ: خیال کردن و بیاد آوردن چیزے را۔"

لکھنؤ کے معروف استاد اور لغت نویس جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں لکھا ہے:
"سونچنا" نونِ غنّہ کے ساتھ، "اندیشیدن" کا ترجمہ ہے۔ جو لوگ اِس کو بدون نونِ غنّہ کے پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، مؤلف کے نزدیک غلط ہے۔"

اِس کے برخلاف "نفائس اللغات" میں (جو اُسی عہد کی تالیف ہے اور جس کا مؤلف دبستانِ لکھنؤ ہی سے تعلق رکھتا تھا) "سوچنا" نونِ غنّہ کے بغیر لکھا گیا ہے۔

ایک مثال اور : غالب کا ایک خط بہ نامِ نواب کلب علی خاں، "مکاتیبِ غالب" (مرتبہ عرشی صاحب) میں موجود ہے، اِس خط کا نمبر شمار ۵۳/۹ ہے؛ اصل خط کا عکس مرقعِ غالب (مرتبہ پرتھوی چند) میں شامل ہے؛ اُس میں ایک جملہ اِس طرح لکھا ہوا ہے:

"اور یہ سونچ کر کہ آج کے آٹھویں دن جواب آئے گا"۔

اِس سے معلوم ہوا کہ غالب بھی "سونچنا" لکھا کرتے تھے۔ چوں کہ خود فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں اِس لفظ کے املا میں اختلاف پایا جاتا ہے، اِس لیے ح، م، ک کے مطابق بغیر نونِ غنّہ کو اختیار کیا گیا ہے۔

سُوسَن (ص ۱۱) عربی میں بہ فتحِ اوّل ہے (المنجد) فارسی میں بہ ضمِّ اوّل (برہانِ قاطع)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بہ فتحِ اوّل مُعرب ہے [غیاث اللغات۔ برہانِ قاطع حاشیۂ مرتّب]۔
فرہنگِ آصفیہ میں "سوسَن" ہے، یعنی دوسرے سین پر تو زبر لگا ہوا ہے لیکن پہلے سین پر حرکت موجود نہیں۔ نور اللغات میں قوسین میں "ف۔ بہ فتحِ اوّل و سوم" لکھا ہوا ہے۔ اِس سے صحیح معنی میں وضاحت نہیں ہوتی، یعنی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُردو میں تلفّظ کیا ہے لیکن یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ "بہ فتحِ اوّل و سوم" کو قوسین میں لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تلفظ اُردو کا نہیں، ورنہ قوسین میں کیوں لکھا جاتا۔ فیلن کے لُغت میں اِسے بہ ضمِّ اوّل لکھا گیا ہے۔ فارسی کے تلفّظ، نور اللغات کے اندازِ نگارش، اور فیلن کے اندراج کے مطابق اِسے بہ ضمِّ اوّل مرجّح سمجھا گیا ہے۔

شُتَری (ص ۱۸۰) فارسی میں "شُتُر" بہ ضمِّ اوّل و دوم ہے۔ اُردو میں بہ فتحِ دوم بھی استعمال کیا گیا ہے۔ طبیب کی ہجو میں سودا کی جو مثنوی ہے، اُس کا شعر ہے:

لکھ دیا مجنوں کو شیرِ شُتَر کہ دیا مُستسقی سے جا فصد کر

"شتری" کو اگر اصل کے مطابق بہ ضمِّ اوّل و دوم (شُتُری) پڑھیں تو اُردو میں بہت نامانوس معلوم ہوگا؛ اِس لیے اِسے "شُتَری" پڑھنا مناسب ہوگا، اور اِسی رعایت سے تَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

شَحنَہ (ص ۴) بیش تر اہلِ لغات نے اِسے بہ کسرِ شین لکھا ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے اِسے بہ کسرِ اوّل لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے؛ اِسی بنا پر شؔ پہ زبر لگایا گیا ہے۔

شُعبَدہ (ص ۲۶) عربی میں "شَعبَذَہ" اور "شَعوَذَہ" تھا (المنجد) فارسی میں "شعبدہ" مستعمل ہے لیکن شؔ مفتوح رہا۔ صاحبِ آصفیہ نے "شَعبَدہ" لکھا ہے؛ لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ "مشہور بہ ضمِّ اوّل ہے" اور یہی بات صحیح ہے۔ اُردو میں زبانوں پر "شُعبدہ" ہے، بہ فتحِ اوّل شاید ہی کوئی بولتا ہو اور بؔ عموماً موقوف رہتی ہے (اگرچہ اصلاً بہ فتح یا ہے) اِسی نسبت سے شؔ پر پیش اور بؔ پر جزم لگایا گیا ہے۔

شُعور (ص ۳۹) عربی میں "شُعور" (بہ ضمِّ اوّل) ہے (المنجد)۔ نور اللغات میں اِس لفظ کو عربی کے مطابق "بہ ضمِّ اوّل و دوم" ہی لکھا گیا ہے، لیکن فرہنگِ آصفیہ میں شؔ پر زبر

لگا ہوا ہے۔ فیلن نے بھی اپنے لغت میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا ہے۔ اُردو کے لحاظ سے اِسی طرح مرجّح ہے اور اِسی لیے شؔ پر زبر لگایا گیا ہے۔

شِکْوَہ (ص ۲۳۰) عربی کے مطابق اصل لفظ شکویٰ (بہ فتحِ اوّل) تھا۔ فارسی میں یہ تصرف ہوا کہ آخر میں ہائے مختفی لگی اور "شکوہ" (مثلاً شکوۂ بے مہریِ احباب) لکھنے لگے۔ بہارِ عجم میں "شکوہ آشوب" کے ذیل میں اسناد مذکور ہیں۔ اُردو میں زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے۔ مؤلفِ نور اللغات نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ اسے "بالکسر و فتحِ سوم" (شِکوَہ) لکھ کر صراحت کی ہے کہ: "عربی میں شکویٰ بروزنِ دعویٰ"۔ اِسی لیے شؔ پر زیر لگایا گیا ہے۔

شَکیب (ص ۷۲) لغات میں اسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن استعمالِ عام میں بہ فتحِ اوّل ہے اور اِسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ بہ کسرِ اوّل کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

شِگُفتہ (ص ۵۳) فارسی لغات میں "شگفت" (مع گافِ) اور "شکفت" (مع کاف) دونوں صورتیں ملتی ہیں (برہانِ قاطع۔ بہارِ عجم۔ غیاث اللغات) اور بہ کسرِ اوّل و ضمِّ ثانی نیز بہ ضمِّ اوّل و ثانی، دونوں طرح درست بتایا گیا ہے۔ اُردو میں "شگفتن" اور اِس کے مشتقات صرف بہ کافِ فارسی اور بہ کسرِ اوّل و ضمِّ ثانی مستعمل ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "شِگُفتہ" اور "شِگُفتگی" میں شین پر زیر اور گاف پر پیش لگا ہوا ہے۔ نور اللغات میں بھی "شِگُفت" ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

شَلَّک (ص ۱۳۳) صاحبِ غیاث اللغات نے صراحت کی ہے کہ یہ لفظ ترکی ہے اور شؔ پر زیر ہے؛ لام مشدد ہے اور اُس پر بھی زیر ہے (شِلِّک)۔ اُنھوں نے مزید وضاحت کی ہے کہ: "از لغاتِ ترکی نوشتہ شد"۔ نور اللغات میں اِس کو اصل حرکات کے مطابق ہی لکھا گیا ہے لیکن فرہنگِ آصفیہ میں شؔ پر زبر لگا ہوا ہے۔ مؤلف نے قوسین میں لکھا ہے: "صحیح شِلِّک"۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مؤلف کے نزدیک ترکی لفظ تو بہ کسرِ اوّل ہے لیکن اُردو میں یہ بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے؛ لیکن لام پر زبر ہے یا زیر، اِس کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ البتہ فیلن نے اپنے لغت میں اِس لفظ کو اصل حرکات کے مطابق لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ اِس کا مقبولِ عام تلفظ "شَلَّک" ہے، یعنی شین اور لام دونوں پر زبر ہے؛ اِسی بنا پر "شَلَّک" کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

شَمشاد (ص ۳۷) فارسی میں بہ کسرِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل دونوں طرح ہے (غیاث اللغات) لیکن صاحبِ برہانِ قاطع کے اندازِ نگارش سے مترشح ہوتا ہے کہ فارسی میں مرجح بہ کسرِ اوّل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں ش پر زبر اور زیر دونوں ہیں (شِمشاد) مگر اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے اور صاحبِ نور اللغات نے بھی یہی لکھا ہے؛ اِسی نسبت سے ش پر زبر لگایا گیا ہے۔

شِمّہ (ص ۳۰) عربی میں بہ فتحِ اوّل (شَمّہ) ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی ش پر زبر لگا ہوا ہے اور صاحبِ نور اللغات نے بھی اصل کے مطابق اِس کو بہ فتحِ اوّل ہی لکھا ہے، بل کہ صراحت کی ہے کہ: "اِس کا تلفظ بہ کسرِ اوّل غلط ہے" لیکن اثرؔ لکھنوی مرحوم نے مولّف کے اِس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے، اِس سے اختلاف کیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ استعمالِ عام میں یہ لفظ بہ کسرِ اوّل ہے (فرہنگِ اثر ص ۴۲۸) فیلن نے بھی اپنے لغت میں اِسے (استعمالِ عام کے مطابق) بہ کسرِ اوّل ہی لکھا ہے، سُننے میں بھی "شِمّہ" بیش تر آیا ہے؛ اِن وجوہ سے بہ کسرِ اوّل کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

شمّۂ۔ ذرّۂ (ص ۳) یہاں "شمّۂ" اور "ذرّۂ" میں یائے وحدت ہے جس کو پُرانے املا کے مطابق لکھا گیا ہے۔ جدید املا میں اِن کو "ذرّہ اے" اور "شمّہ اے" لکھا جاتا ہے۔

شَناس (ص ۱۴)

برہانِ قاطع کے ایرانی اڈیشن کے مرتب ڈاکٹر محمد معین نے "شناختن" کو بہ کسرِ اوّل لکھا ہے (جلدِ سوم ص ۱۲۹۰) اِس لحاظ سے "شِناختن" سے "شِناس" بنے گا۔ آصفیہ میں "شناس" اور "شناسا" اور "شناسائی" کے ش پر زیر لگا ہوا ہے [شِناس، شِناسا، شِناسائی] نور اللغات میں "شناخت"، شناس اور شناسا پر زبر زیر نہیں ملتا، نہ حرکات کی صراحت کی گئی ہے، لیکن "شناسائی" کو "بہ فتحِ اوّل" لکھا ہے اور اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مولّف کے نزدیک یہ سب لفظ بہ فتحِ اوّل ہیں۔ بہ ہر صورت یہ سب لفظ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہیں [شَناخت، شَناس، شَناسائی، شَناسا] اِسی بِنا پر یہاں "شَناس" رکھا گیا ہے۔

صاحبِ فراش (ص ۱۵۰) یہ مرکب مع اضافت اور بغیرِ اضافت، دونوں طرح

سُننے میں آیا ہے۔ آصفیہ و نور میں اضافت سے متعلق کچھ صراحت نہیں ملتی لیکن ذوق کا یہی ایک شعر دونوں لغات میں بہ طورِ سند درج کیا گیا ہے، جس میں یہ لفظ بغیرِ اضافت نظم ہوا ہے:

اُٹھے جہاں ہی سے، جو بستر سے وہ اُٹھے
تیرا مریضِ عشق، جو صاحب فراش ہے

لفظِ "صاحب"، جن مرکبات کے ساتھ آتا ہے، اُن میں سے بہت سے مرکبات کی صورت یہ ہے کہ وہ بغیرِ اضافت اور مع اضافت، دونوں طرح مستعمل ہیں (جیسے: صاحب دل۔ صاحبِ دل) لیکن فصحائے لکھنؤ کی زبان سے یہ مرکب (صاحب فراش) عموماً مع اضافت ہی سُننے میں آیا ہے، لکھنؤ کے متعدد حضرات نے اِس کی تصدیق کی؛ اِس بنا پر اِسے مع اضافت مرجّح سمجھا گیا ہے۔ اِس ترجیح کے لیے ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ سرورؔ کے اُستاد نوازش لکھنوی کے ایک شعر میں یہ مع اضافت آیا ہے:

جدا ہوا ہے تو برسوں ہی ہو کے ہم بستر
مریض کیونکے ترا صاحبِ فراش نہ ہو

(دیوانِ نوازش، ورق ۱۳۳ الف)

ہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اِس مرکب میں "فِراش" بہ کسرِ اوّل ہے، بہ فتحِ اوّل نہیں۔

صَلْوات (ص ۱۷۰) "صلوٰۃ" عربی کا لفظ ہے، نماز، درود وغیرہ کے معانی ہیں، اور صَلَوات (بہ فتحِ اوّل و دوم) اِس کی جمع ہے۔ فارسی میں اِسے بہ سکونِ دوم (صَلْوات) بھی استعمال کیا گیا ہے، بہارِ عجم میں متعدد اسناد مذکور ہیں۔ اُردو میں یہ لفظ "کسی چیز یا فعل سے دست بردار ہونے، باز آنے، بیزار ہونے" کے معانی میں بھی مستعمل ہے، اور اِن معانی میں یہ بہ طورِ مفرد اور بہ سکونِ دوم استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً:

دل بتوں کو دے کے، دین کا دھیان بھی جاتا رہا
دین کو صلوات ہے، ایمان بھی جاتا رہا (ظفرؔ)

اِسی طرح بُرا کہنے (یا گالی دینے) کے مفہوم میں بھی آتا ہے، جیسے:

حالِ دل تم سے کہیں گے تو سنو گے، توبہ
اور منہ پھیر کے صلوات سناؤ گے ہمیں (سوزؔ)

فسانۂ عجائب کے اِس جملے میں یہ لفظ اُردو میں مستعمل اوّل الذکر مفاہیم میں آیا ہے، اِس لیے اِسے بہ سکونِ دوم رکھا گیا ہے۔

طَرَفَین ـ طَرَفَین (ص ۱۳۸) یہ لفظ اصلاً بہ فتحِ دوم (طَرَفین) ہے، لیکن اُردو میں بیش تر زبانوں پر بہ سکونِ دوم ہے۔ سرورؔ نے ایک شعر میں اِسے اِس طرح نظم بھی کیا ہے:

عشق میں طَرفَین سے الفت برابر چاہیے
جو بہ دل بندہ ہو، اُس کو بندہ پرور چاہیے (ص ۱۹۱)

جب یہ لفظ بہ ترکیبِ عربی یا بہ ترکیبِ فارسی آتا ہے تو صورتِ حال بدل جاتی ہے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جہاں یہ لفظ ترکیب کے بغیر آیا ہے، وہاں اِس کو استعمالِ عام کے مطابق بہ سکونِ دوم (طَرفین) مرجّح سمجھا گیا ہے اور جہاں مع ترکیب آیا ہے، وہاں اصل کے مطابق "طَرَفَین" رکھا گیا ہے اور اِسی بِنا پر اِس جملے میں "بہ رضامندیِ طَرَفَین" لکھا گیا ہے۔

طَیِّ منازل (ص ۵۳) عربی میں اصل لفظ "طیّ" ہے۔ فارسی میں اِس کو عموماً بہ یائے مخفّف (طے)، بر وزنِ "مے" استعمال کیا گیا ہے۔ یہی صورت اُردو میں ہے۔ عموماً یہ لفظ مفرد آتا ہے اور "طے" لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اِس جملے میں ترکیب کے ساتھ آیا ہے اور ترکیب کی صورت میں اگر کہیں یہ آیا ہے تو اِس کو اصل کے مطابق بہ یائے مشدّد لایا گیا ہے۔ نور اللغات میں مندرج سحرؔ کا یہ شعر اِسی کی تائید کرتا ہے:

"گھوڑا نہیں، عمل ہے کوئی طیِّ ارض کا یا اسپ بے نظیر ہے لیکن یہاں کہاں"

یؔ کو اگر مشدّد کیا جائے تو انسب یہ ہوگا کہ اُس صورت میں "یے" کے بجائے "ي" لکھی جائے، تاکہ تشدید کا عمل صحیح طور پر بروے کار آسکے؛ اِس بِنا پر یہاں "طَیّ" مرجّح سمجھا گیا ہے۔ اِس ٹکڑے کے بعد والے ٹکڑے میں "قَطعِ مراحل" آیا ہے اور صوتی آہنگ کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ "قطعِ مراحل" کے مقابلے میں "طیِّ منازل" ہو۔ اگر اِس کو "طےِ منازل" لکھا جائے تو یہ غلط تو نہیں ہوگا لیکن اِس عبارت میں صوتی آہنگ کے لحاظ سے بے محل معلوم ہوگا۔

عبیر ـ ابیر (ص ۷) سب نسخوں میں "عبیر" ہے، اِس لیے اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے، لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ معنوی مناسبت کی بِنا پر یہاں "ابیر" ہونا چاہیے۔ یہاں مصنّف کی مراد رنگ سے ہے، نہ کہ خوش بو سے۔ "عبیر" ایک خوش بو دار مرکّب کا نام ہے اور "گلال" کے ساتھ (ہولی میں) جو چیز استعمال میں آتی ہے، اُسے

"ابیر" کہتے ہیں۔ "گلال" کی طرح یہ بھی ہندی الاصل ہے۔ یہ "ابیر" جو بہ طور رنگ ہولی میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، عربی والے "عبیر" یعنی خوش بودار مرکب سے مختلف چیز ہے۔ جلالؔ نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں "ابیر" کے ذیل میں وضاحت کی ہے کہ: ""اور اِس لفظ کو بجائے الف، عین مہملہ سے لکھنا، مولف کے عندیے میں غلط ہے؛ اِس لیے کہ یہ لغت ہندی ہے۔"

[حافظ محمود خاں شیرانی نے آئینِ اکبری کے حوالے سے "عبیر" کا نسخہ یہ لکھا ہے:
"تین پاد صندل، چھتّیس تولے عود (اگر) دو تولے اور آٹھ ماشے مشک؛ سب کو پیس کر سایے میں خشک کرلیں اور استعمال میں لائیں"] (مقالاتِ شیرانی جلد ہفتم ص ۱۳۹)

علیہما السّلام (ص ۳۷) [ح، ض: علیہ السّلام ــ ف، ل: علیہم السّلام ــ م: علیہما السّلام ــ ک میں یہ لفظ موجود نہیں]

بہ لحاظِ قاعدہ یہاں "علیہما السّلام" درست ہے۔ "علیہ السّلام" ایک آدمی کے لیے اور "علیہم السّلام" تین یا تین سے زیادہ افراد کے لیے آئے گا۔ دو آدمیوں کے لیے "علیہما السّلام" آئے گا؛ اِسی بنا پر یہاں م کے املا کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

عَمامَہ (ص ۵۵) ح: عمامہ ــ اصلاً حرفِ اوّل مکسور ہے لیکن اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ میم ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے اِس تغیّر کی نشان دہی کی ہے: "اردو میں بہ فتحِ اوّل زبانوں پر ہے۔" فارسی میں بہ تشدیدِ میمِ دوم بھی نظم کیا گیا ہے اور یہی صورت اردو میں ہے۔ بول چال میں عموماً بغیر تشدیدِ میم آتا ہے؛ اِسی نسبت سے اِسے "عَمامَہ" لکھا گیا ہے۔

عَیادت (ص ۹۸) اصلاً ع پر زیر ہے (عِیادت) آصفیہ میں بھی اصل کے مطابق ع پر زیر لگا ہوا ہے لیکن زبانوں پر بہ فتحِ عین (عَیادت) ہے۔ اِس لفظ کا احوال بھی "عیان" اور "عیال" جیسا ہے، کہ عربی میں یہ دونوں لفظ بہ کسرِ اوّل ہیں لیکن اردو میں خاص و عام سبھی اِنھیں بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں۔ فیلن نے اپنے لغت میں "عَیادت" کو بہ فتحِ اوّل ہی درج کیا ہے؛ اور یہ استعمالِ عام کے مطابق ہے؛ اِسی نسبت سے ع پر زبر لگایا گیا ہے۔

عَیاں (ص ۴۰) عربی میں بہ کسرِ اوّل (عِیاں) ہے (المنجد)۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اِس

لفظ کو بہ کسرِ اوّل لکھ کر یہ بھی لکھا ہے کہ : " و بفتح خطاست "۔ یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی عؔ پر زیر لگا ہوا ہے (عِیاں) لیکن اُردو میں کیا عالم کیا عامی، سبھی " عَیاں " بولتے ہیں اور اُردو میں اِسی طرح صحیح اور فصیح مانا جائے گا۔ اِس سلسلے میں مولانا نظم طباطبائی کا یہ قول پیشِ نظر رہنا چاہیے :

" فارسی و عربی کے بعض الفاظ اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں اور اُن کو غلط ہی بولنا چاہیے۔ اُن کو صحیح کرکے بولنا ہندیوں کی زبان پر ثقیل ہے، جیسے : عیادت، عیال، عیاں ؛ بہ کسرِ عین ہیں، مگر بولتے بہ فتحہ ہیں۔

ایک نقل میں نے سُنی ہے کہ حکیم میر ضامن علی مرحوم جلالؔ سے نوّاب کلبِ علی خاں مرحوم والیِ رام پور نے پوچھا کہ آپ " عَیاں " کو " عِیاں " کہیں گے ؟ تو اُنھوں نے جواب دیا کہ " عِیاں " تو ہم کبھی نہ کہیں گے "۔ [رسالۂ اُردوے معلّیٰ۔ بابت فروری و مارچ ۱۹۱۲ء]

غَدَر (ص ۱۸۳) اصلاً دال پر جزم ہے (غَدْر) فرہنگِ آصفیہ میں دال پر جزم لگا ہوا ہے، لیکن عام طور پر لوگ مفرد لفظ " غدر " کو بہ فتحِ دوم بولتے ہیں۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں " غدر پڑنا " اور " غدر مچانا " کے ذیل میں لکھا ہے کہ بول چال میں " بہ فتحِ اوّل و دوم ہے " اور یہ بالکل درست ہے ؛ اِسی کے مطابق دال پر زبر لگایا گیا ہے۔

غِلاف (ص ۱۸۲) اصلاً غؔ پر زیر ہے (المنجد) اِس طرح سُننے میں بھی آیا ہے۔ کچھ لوگ " غَلاف " بھی کہتے ہیں۔ فیلن کے لغت میں " غِلاف " اور " غَلاف " دونوں طرح ملتا ہے اور اِس سے اختلاف کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غؔ کے زبر اور زیر کا اختلاف مقامی حیثیت رکھتا ہے۔ اہلِ لکھنؤ (یعنی فصحاے لکھنؤ) اِسے بہ کسرِ اوّل ہی بولتے ہیں، مختلف حضرات سے اِس کی تصدیق کی گئی اور میں نے خود بھی اِسی طرح سُنا ہے ؛ اِسی لیے غؔ پر زیر لگایا گیا ہے۔

نور اللغات میں یہ لفظ موجود ہے لیکن حرکات کی صراحت نہیں ملتی، البتہ فرہنگِ آصفیہ میں غؔ پر کسرہ لگا ہوا ہے اور اِس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کی طرح، فصحاے دہلی میں بھی یہ لفظ بہ کسرِ اوّل ہی مستعمل رہا ہے۔

غَلْطاں (ص ۵۹) " غلطیدن " کو اصولاً " غلتیدن " لکھنا چاہیے تھا اور اِسی طرح اِس کے مشتقات میں بھی تؔ لکھنا چاہیے تھی (جیسے : غلتاں) کیوں کہ طؔ عربی کے خاص حروف

میں سے ہے اور فارسی الاصل الفاظ میں اِسے داخل نہیں کیا جانا چاہیے؛ غالب نے پنج آہنگ میں اِس کی صراحت بھی کی ہے؛ لیکن فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "غلطان" ہے اور پہلے عموماً اِسی طرح لکھا جاتا تھا؛ اِس بنا پر اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

غَلغَلَہ (ص ۳۸) عربی میں غین پر دونوں جگہ زبر ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں دونوں جگہ پیش لگا ہوا ہے (غُلغُلہ) اور اُردو کے لحاظ سے یہی صحیح صورت ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

فَراواں (ص ۱۸۸) غیاث اللغات میں بہ کسرِ اوّل ہے۔ غالباً اِسی کے زیرِ اثر نور اللغات میں "فِراواں" لکھا گیا ہے اور فرہنگِ آصفیہ میں بھی "فِراواں" ہے۔ برہانِ قاطع میں یہ لفظ موجود نہیں تھا؛ اُس کے ایرانی مصحح ڈاکٹر معین نے حاشیے پر اِس کا اضافہ کیا ہے اور اِسے "بہ فتحِ اوّل" لکھا ہے اور اِسی کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

فَرِشتہ (ص ۱۹۹) فارسی میں "فِرِشتہ" ہے (برہانِ قاطع)؛ اِسی نسبت سے فرہنگِ آصفیہ میں بھی "فِرِشتہ" لکھا گیا ہے۔ نور اللغات میں لفظ تو موجود ہے، حرکات کی صراحت نہیں کی گئی۔ اُردو میں عوام و خواص سبھی کی زبانوں پر "فَرِشتہ" ہے۔ فیلن نے "فَرِشتہ" ہی لکھا ہے، بل کہ اُس نے تو "فِرِشتہ" کو جُہلا کا تلفظ بتایا ہے۔ خیر یہ بات تو درست نہیں، لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے اور اِسی نسبت سے فے پر زبر لگایا گیا ہے۔

فَروغ (ص ۲۴) فارسی میں فے پر پیش ہے (فُروغ)، لیکن جیسا کہ مولفینِ آصفیہ و نور نے لکھا ہے، اُردو میں بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے؛ اِسی بنا پر فے پر زبر لگایا گیا ہے۔

فَریدوں (ص ۳) غیاث اللغات میں اِسے بہ کسرِ اوّل و دوم "فِرِیدوں" لکھا گیا ہے اور غالباً اِسی کی رعایت سے صاحبِ نور اللغات نے بھی اِسے صرف بہ کسرِ اوّل و دوم لکھا ہے۔ برہانِ قاطع کے مولف نے لکھا ہے کہ یہ لفظ "بفتحِ اوّل و بکسرِ اوّل، بہر دو طور آمدہ است" اور اِس لغت کے ایرانی مصحح ڈاکٹر معین نے اِس سے اختلاف نہیں کیا؛ اِس سے معلوم ہوا کہ "فِرِیدون" بھی درست ہے اور "فَرِیدوں" بھی صحیح ہے۔ اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اوّل ہے؛ اِس بنا پر فے پر زبر لگایا گیا ہے۔

فَریفتہ (ص ۶۷) فارسی میں بہ کسرِ اوّل (فِریفتہ) ہے؛ اِسی لیے "فِریب" بھی فارسی میں بکسرِ اوّل

ہے (برہانِ قاطع) اُردو میں یہ دونوں لفظ زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہیں۔ نوراللغات میں "فریفتہ" کو اصل حرکات کے مطابق "بہ کسرِ اوّل و دوم" لکھ کر یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ "یہ لفظ زبانوں پر بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم ہے" اور یہی صحیح بات ہے؛ اِسی نسبت سے ف پر زبر لگایا گیا ہے۔

فُرْدُوں (ص ۵۰) یہ لفظ کبھی کبھی بہ فتحِ اوّل (فَرْدوں) بھی سُننے میں آتا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اِس کو بہ ضمِّ اوّل لکھ کر، لکھا ہے: "وقیل بفتحِ اوّل"۔ اِس سے معلوم ہوا کہ بہ فتحِ اوّل ہے تو لیکن قولِ بعض ہے، مرجّح بہ ضمِّ اوّل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات میں بھی "فُردوں" ہے اور اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

فِشاں (ص ۳۳) نوراللغات اور فرہنگِ آصفیہ میں اپنی جگہ پر یہ لفظ موجود نہیں۔ برہانِ قاطع میں اِسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اِس لغت کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے حاشیے میں "فشاندن" کو "بہ فتح و کسرِ اوّل" لکھا ہے [گویا "فَشاں" اور "فِشاں" دونوں طرح درست ہوگا] برہان کی طرح غیاث اللغات میں بھی صرف بہ کسرِ اوّل ہے، سماعت میں بھی زیادہ تر بہ کسرِ اوّل آیا ہے؛ اِسی بنا پر اِسے "فِشاں" لکھا گیا ہے۔

فِضا (ص ۱۰) یہ لفظ بہ لحاظِ اصل بہ فتحِ اوّل ہے۔ مولّفِ غیاث اللغات نے صراحت بھی کر دی ہے کہ "و بکسر خطاست"۔ لیکن اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل دونوں طرح ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اِس کو "فَضا" لکھا گیا ہے۔ مولّفِ نوراللغات نے "فَضا۔ ع۔ بفتحِ اوّل صحیح، بکسرِ اوّل غلط" لکھ کر یہ بھی لکھا ہے کہ: "اُردو میں زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے"۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مولّف نے جو "بہ کسرِ اوّل غلط" لکھا ہے، اُس کا تعلق عربی سے ہے اور اُن کے قول کے مطابق اُردو میں (یا یوں کہیے کہ لکھنؤ میں) زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے۔ اِس کی تائید جلیل مانک پوری (تلمیذِ امیر مینائی) کے ایک خط سے ہوتی ہے:

"فضا: بالفتح، مگر اُردو بول چال میں بالکسر مستعمل ہے۔ اگر کوئی صاحب صحت کے خیال سے بالفتح کہیں تو مضائقہ نہیں"۔ [مکتوبِ جلیل۔ ماہنامہ الحمرا (لاہور) نومبر ۱۹۵۶ء]

جلیل کی عبارت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اُردو میں مرجّح بہ کسرِ اوّل ہے؛ اِسی بنا پر اِس کتاب میں (جس کا تعلق لکھنؤ کے ایک مصنّف سے ہے) اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل

مرجّح سمجھا گیا ہے۔

فُوّارہ (ص ۸۷) یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِّ اوّل، دونوں طرح ملتا ہے۔ مؤلفِ غیاث اللغات نے نہایت تفصیل سے اِس پر بحث کی ہے اور اُن کی تحریر سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہ ضمِّ اوّل کو ترجیح حاصل ہونا چاہیے۔

"فوّارہ" کی ایک عوامی شکل "پھُوارا" ہے اور یہ بہ ضمِّ اوّل ہے۔ زبانوں پر بھی بیش تر "فُوّارہ" بہ ضمِّ اوّل ہے، اِسی لیے بہ ضمِّ اوّل کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

فی زمانہ (ص ۲۵) [ک، ن: فی زماننا۔ ج، م، ض، ت، ل: فی زمانہ]

اصل لفظ "فی زماننا" ہے، مگر اُردو میں زبانوں پر بیش تر "فی زمانہ" ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "فی زماننا" اور "فی زمانہ" دونوں لفظ کسی صراحت کے بغیر لکھے ہوئے ہیں اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف کے نزدیک دونوں لفظ بجائے خود صحیح اور فصیح ہیں، اور یہی صحیح صورتِ حال ہے۔ چوں کہ بیش تر نسخوں میں "فی زمانہ" ہے اور استعمالِ عام میں بھی یہی ہے، اِس لیے اِسی کو مرجّح مانا گیا ہے۔

قَطار (ص ۱۳۹) عربی میں بہ کسرِ اوّل ہے (المنجد)۔ صاحبِ نوراللغات نے وضاحت کی ہے کہ اُردو میں بہ فتحِ اوّل ہے: "قطار۔ ع۔ صحیح بہ کسرِ اوّل ہے۔ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی "قطار" لکھ کر یہ صراحت کی گئی ہے کہ: "مشہور بہ فتحِ اوّل"۔ اِسی بنا پر ق کو مفتوح رکھا گیا ہے۔

قَطعہ (ص ۱۲) عربی میں بہ کسرِ اوّل ہے (المنجد) لیکن اُردو میں عموماً زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے۔ صاحبِ نوراللغات نے اِس لفظ کو اصل کے مطابق بہ کسرِ اوّل لکھ کر، مزید لکھا ہے: "بعض فصحاے متاخرین نے بالفتح بھی جائز رکھا ہے"۔ میں یہ عرض کردوں کہ "متاخرین" کی تخصیص درست نہیں: انشا نے دریاے لطافت میں "قِطعہ" (بہ کسرِ اوّل) کو مغل پورے والوں کی زبان لکھا ہے اور بہ فتحِ اوّل کو اہلِ اُردو (یعنی فصیحوں) کی زبان لکھا ہے (ترجمۂ دریاے لطافت ص ۴۴)۔ فرہنگِ آصفیہ میں اصل کے مطابق "قِطعہ" ملتا ہے، لیکن فیلن نے "قَطعہ" لکھا ہے اور یہی استعمالِ عام ہے اور انشا کا قول بھی اِسی پر دلالت کرتا ہے؛ اِسی نسبت سے اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل مرجّح سمجھا گیا ہے۔

ایک بات اور: اِس عبارت میں "قَطَع" کی مناسبت کا بھی تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ

"قَطعہ" پڑھا جائے (اِس قطع کا قطعہ لکھا) یہ بھی ترجیح کا ایک پہلو ہوا۔

قُورمہ (ص ۱۳۸) صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ یہ لفظ ترکی ہے؛ اِس اعتبار سے تو اِسے "قورما" لکھنا چاہیے؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ غیاث اللغات، فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، سبھی میں "قورمہ" ہے اور فسانۂ عجائب کے پیشِ نظر نسخوں میں بھی ہر جگہ "قورمہ" ہے؛ گویا عام طور پر اِس لفظ کے آخر میں ہائے مختفی لکھی جاتی رہی ہے؛ انھی وجوہ سے اِسی املا کی پابندی کی گئی ہے۔

کَرَشمہ (ص ۳۲) بیش تر فارسی لغات میں اِس کو بہ کسرِ اوّل و ثانی (کِرِشمہ) لکھا گیا ہے لیکن فرہنگِ رشیدی میں بہ فتحتین (کَرَشمہ) کو "اصح" بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے بھی فرہنگِ فارسی میں بکسرتین اور بفتحتین، دونوں طرح لکھا ہے (کِرِشمہ۔ کَرَشمہ)۔
فرہنگِ آصفیہ میں "کِرِشمہ" ہے لیکن نور اللغات میں جس طرح اِس لفظ کو لکھا گیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کے نزدیک بہ فتحِ اوّل و دوم (کَرَشمہ) مرجح ہے اور اُردو میں زبانوں پر اِسی طرح ہے، "کِرِشمہ" کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے؛ اِسی بنا پر کاف اور رے پر زبر لگایا گیا ہے۔

کمخواب (ص ۱۷۸) [ح، ض، م، ک: کمخواب۔ ث: کمخاب]
فارسی میں بھی اِس لفظ کے املا میں اختلاف ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے بہارِ عجم۔ غیاث اللغات) اُردو میں بھی اِس کو "کمخاب" اور "کمخواب" دونوں طرح لکھتے ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ "خواب" کا لفظ یہاں "روئیں" کے معنی میں آیا ہے ——
—— اور لفظ "خواب" کے متعارف معنی "نیند" ہیں۔ اُردو نظم میں جگہ جگہ ایہام کے طور پر "کم خواب" نظم کیا گیا ہے اور ایسے مقامات پر "خواب" سے متعلق مناسبات اِس طرح آئے ہیں کہ کسی طرح کا شک نہیں رہتا۔ مثلاً:

نک تکیے پہ سر دھر کے رہے سو، تو لگائی — صاحب نے ہمیں مسندِ کمخواب کی چوری (انشا (کلامِ انشا ص ۲۴))
قصّہ خواں! نیند جو تھوڑی سی بھی آجائے تو دوں — جوڑی سونے کے کڑوں کی تجھے کمخواب پہ رکھ (" (" ص ۱۹))
یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا (غالب (نسخۂ عرشی ص ۱۳۷))
اور مؤید کے اِس شعر سے مکمل طور پر وضاحت ہو جاتی ہے:

خفتہ خار است، بیدار دو کون — خفتہ مخمل، گرفتارِ دو خواب
(دیوانِ مؤید، مخطوطۂ خدا بخش لائبریری، پٹنہ)

اِس طرح اندازہ یہ ہوتا ہے کہ "کمخواب" خاص طور پر استعمال میں رہا ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اِس استعمال سے استناد نہ کیا جائے اور "کمخواب" کو مرجّح نہ سمجھا جائے۔

کُنجشک (ص ۴) [ض، م : گنجشک]

بیش تر فارسی لغات میں یہ لفظ بہ کافِ فارسی (گنجشک) ملتا ہے۔ اُردو میں عموماً اِسے "کنجشک" بولتے اور لکھتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی "کنجشک" ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے بھی اِسے کاف کی فصل میں لکھا ہے اور قوسین میں لکھا ہے کہ: "ف بالضّم و کسرِ سوم و سکونِ چہارم و کافِ فارسی۔ بہ کافِ تازی غلط"۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مولّف کے نزدیک فارسی میں "گنجشک" ہے اور اردو میں "کنجشک"۔ اِسی بنا پر اِسے "کنجشک" لکھا گیا ہے۔

فارسی میں حرفِ سوم مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی (تفصیل غیاث اللغات میں) اُردو میں اِسے بہ کسرِ جیم ہی سنا گیا ہے اور فرہنگِ آصفیہ میں بھی ج پر زیر لگا ہوا ہے؛ اِس لیے ج پر زیر لگایا گیا ہے۔

کنکر (ص ۲۵۵) [ح، م، ف، ل : کنکڑ ــ م، ض، ک، ن : کنکر]

اُردو میں مستعمل لفظ "کنکر" ہے۔ اِسی سے "کنکری" اور "کنکریلا" بنا ہے۔ شعرا نے پتھر، گوہر وغیرہ کے قوافی میں "کنکر" نظم کیا ہے، اسناد نور اللغات میں دیکھی جا سکتی ہیں؛ اِسی لیے "کنکر" کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

کِنّیاں (ص ۱۳۶) فسانۂ عجائب کے پیشِ نظر سبھی نسخوں میں "کنیاں" ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں "کنّیا" ہے؛ لیکن ہندی لغات میں "کنیا" اور "کنیاں" دونوں صورتیں ملتی ہیں (ہندی شبد ساگر۔ مانک ہندی کوش)۔ "کنیاں" استعمال میں رہا ضرور ہے؛ اِس کی ایک اور مثال بھی میرے سامنے ہے: غیاث اللغات میں "فصولِ چہارگانہ" کے ذیل میں "بیانِ سالِ ہندیان" کے سلسلے میں بارہ بُرجوں کے ہندی نام بھی لکھے گئے ہیں اور وہاں "کنّیاں" (مع نونِ غنّہ) ہے؛ اِنھی وجوہ سے "کنّیاں" کو برقرار رکھا گیا ہے۔

کُور "کوس و کور گرجنے لگے" (ص ۱۴۱)

[ح، ک، ن : کور ــ ف، ل : گور ــ م : گوزکہ ــ ض : گوزکہ]

آگے چل کر شہپال جادو سے جنگ کے بیان میں بھی یہ مرکب آیا ہے : " ادھر کوس و کور گرجنے لگے" اور وہاں سب نسخوں میں "کوس و کور" ہے۔ سرور کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور (ترجمۂ الف لیلہ) میں بھی ایک جگہ "کوس و کور" آیا ہے : "یہ سب سامان جاہ وحشم... کوس و کور، لوا و پرچم کا بیان کیا" (جلدِ چہارم ص ۱۳۲) اِسی نسبت سے یہاں بھی "کوس و کور" رکھا گیا ہے۔

اِس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اصل لفظ "کوُرگا" ہے (فرہنگِ رشیدی) صاحبِ فرہنگ کی صراحت کے مطابق یہ لفظ ترکی ہے اور نقارے کو کہتے ہیں اور مولفِ غیاث اللغات کی صراحت کے مطابق "نقارۂ کلاں" کو کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "کوُرگا" تخفیف کے عمل سے دوچار ہوکر "کور" بن گیا "کوس" کے وزن پر، اور "کوس و کور" ہلکا پھلکا مرکب استعمال میں آگیا۔

اصل لفظ "کورگا" میں کاف پر زبر ہے، لیکن ح اور ک میں "کُور" ہے یعنی کاف پر پیش لگا ہوا ہے؛ غالباً "کوس" کی رعایت سے اِسے بھی "کُور" مان لیا گیا ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ آصفیہ و نور میں "کورگا" یا "کور" موجود نہیں۔

کُوس (بہ معنیِ نقارہ ـ ص ۲۵) صاحبِ نور اللغات نے اِسے فارسی لکھ کر بہ واوِ معروف لکھا ہے؛ لیکن فارسی لغات میں عموماً اِسے بہ واوِ مجہول لکھا گیا ہے (بہارِ عجم، فرہنگِ رشیدی، برہانِ قاطع، غیاث اللغات) آصفیہ میں معروف و مجہول کی صراحت نہیں ملتی، لیکن پلیٹس نے اپنے لغت میں اِسے (نقارہ کے معنی میں) بہ واوِ مجہول ہی لکھا ہے اور سُننے میں بھی یہ لفظ بہ واوِ مجہول آیا ہے؛ اِنھی وجوہ سے "کُوس" (بہ واوِ مجہول) رکھا گیا ہے۔

گھُڑ بیچ (ص ۴۷) [ح : گھڑ بیچ] نور اللغات میں "کھڑبیچ" موجود نہیں البتہ "گھڑبیچ" ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں دونوں لفظوں میں سے ایک بھی موجود نہیں۔ چوں کہ فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "بیچ" بغیر یا ہے، اِس لیے اِس کو اِسی طرح (گھڑ بیچ) رکھا گیا ہے، کیوں کہ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ یہ لفظ دونوں صورتوں میں (گھڑبیچ۔ گھڑ بیچ) مستعمل رہا ہو۔

گُہَن (ص ۳۲) فارسی میں یہ لفظ بہ ضمِ اوّل و دوم اور بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم (گُہُن۔ گُہَن) دونوں

طرح ہے : "کہن، بضمِ اول و دوم (در قدیم) و نیز بفتح دوم" (محمد معین، حاشیۂ برہانِ قاطع، جلد سوم، ص ۱۷۳۷)۔ اُردو میں بہ فتح دوم مستعمل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں صرف "کُہَن" ہے۔ نور اللغات میں جس طرح حرکات کی صراحت کی گئی ہے، اُس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "کُہُن" فارسی سے مخصوص ہے اور اُردو میں "کُہَن" ہے۔ اِسی نسبت سے اِسے "کُہَن" لکھا گیا ہے۔

کیونکے (ص ۱۵۳) پیشِ نظر سبھی مطبوعہ نسخوں میں "کیونکہ" ہے؛ لیکن یہ صحیح نہیں، "کیونکے" کا محل ہے۔ یہ دو مختلف لفظ ہیں۔ عام لوگ اور کاتب صاحبان اِن کو گڈمڈ کر دیا کرتے ہیں۔ "کیونکہ" مرکب ہے "کیوں" اور "کہ" سے اور یہ "کہ" بیانیہ ہے۔ "کیونکے" محرف صورت ہے "کیونکر" کی۔ "کر" محرف صورت میں "کے" بن جاتا ہے، جیسے: "جاکر" اور "جاکے"۔ اِسی طرح "کیونکر" سے "کیونکے" بنے گا "کس طرح" اور "کیسے" کے معنی میں۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی (مرحوم) نے اپنے مقالے "اُردو املا" شائع شدہ رسالۂ ہندستانی (الہ آباد) میں لکھا تھا:

"کیونکر" کی جگہ اگلے وقتوں میں "کیونکے" بولتے تھے اور یے کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے "کیونکہ" (یعنی "کیوں کہ" جس میں "کہ" کافِ بیانیہ ہے) لوگوں نے "کر" اور "کے" کے معنوں میں فرق نہ کرکے "کیونکے" کو "کیونکہ" بنا دیا.... پس نہ صرف پرانے اساتذہ کے کلام میں، بلکہ بول چال کی بنا پر اِس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اِس لفظ سے کہیں نہ کہیں دوچار ہوں گے۔ اِس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر "کر" کا قائم مقام ہو تو "کے" اور نہیں تو "کہ" لکھا جائے۔ جیسے: نہ جانوں کیونکے مٹے داغ طعنِ بدعہدی (غالب)"۔ اِسی نسبت سے یہاں "کیونکے" لکھا گیا ہے۔

گاڑھا (ص ۱۷۸، س ۶) ک کے علاوہ دیگر نسخوں میں "گاڑہ" چھپا ہوا ہے۔ اِسے "گاڑھ" اور "گاڑہ" دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں؛ لیکن ک میں "گاڑھا" ہے۔ اِس کا یہی املا دو وجوہ سے مرجح مانا گیا ہے: ایک تو یہ کہ لغات میں "جنگی اور مست ہاتھی" کے معنی میں "گاڑھا" ہی ملتا ہے [آصفیہ، نور، سرمایۂ زبانِ اُردو] "گاڑھ" دوسرا لفظ ہے جس کے معنی "مصیبت، مشکل" کے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مہاوتوں سے بھی یہی معلوم ہوا ہے۔ ایک پرانے مہاوت مُراد خاں نے بتایا کہ: "یہ لفظ گاڑھا ہے"۔

غصّے ناک اور تیز مزاج والے ہاتھی کو "گاڑھا" کہتے ہیں" (مراد خاں کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۲، ص ۸۷، س ۶ کا حاشیہ)۔

گجباگ (ص ۸۷) [ح، م، ک : گجبانگ ۔ ض، ل : گجباگ ۔ ف، ن : گجباک]

اِس لفظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری ہے۔ نور و آصفیہ میں "گجباگ" کے معنی "آنکس" لکھے ہوئے ہیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے "ہاتھی کے آنکس کا نام گج باگ رکھا۔ آئینِ اکبری میں لکھا ہے: گیتی خداوند گجباگ نام نہاد" [مقالاتِ شیرانی جلدِ دوم، ص ۱۳] اِس کے برخلاف فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں میں "گج باگ" کے معنی لکھے ہیں: " ہاتھی کی باگ ڈور، جو ایک خاص طرح سے پھندے لگا کر بنائی جاتی ہے اور اُس کی گردن میں ڈالی جاتی ہے۔ پھندوں میں مہاوت اپنے پیر ڈال لیتا ہے اور پیروں کی انگلیوں سے ہاتھی کے کانوں کے پیچھے ٹھوکے لگا کر چلنے یا دوڑنے کو اشارے دیتا ہے۔ یہ لفظ "گج" اور "باگ" سے مرکب ہے"۔

یہی بات اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھی ہے؛ لفظ "آنکس" کے ذیل میں لکھا ہے: "میں نے اپنے بزرگوں کو اِس لفظ کی جگہ "گجبانک" بولتے سُنا۔ فسانۂ عجائب میں بھی یہی استعمال ہوا ہے: کمر میں پیش قبض یا کٹار، ہاتھ میں گجبانک جواہر نگار" (فرہنگِ اثر، ص ۱۱۸)۔ قیاس تو یہی کہتا ہے کہ "آنکس" کے معنی میں "گج بانک" ہونا چاہیے۔ "بانک" کے لفظی معنی "کج"، "ٹیڑھا" ہیں اور "ہلالی شکل کی چھوٹی چھُری" کو بھی کہتے ہیں۔ آنکس بھی بھالے نما آہنی ٹکڑا" ہوتا ہے، "جس کی نوک سے ہاتھی کی گردن پر اور کانوں کے برابر گدگدایا جاتا ہے"۔ غالباً پہلے اِس معنی میں "گجبانک" ہی اصل لفظ ہوگا، اور جب اِس کو "گجباگ" کہا گیا تو پھر یہ لفظ بھی اِس معنی میں رائج ہوگیا۔ فسانۂ عجائب کی عبارت میں واضح طور پر یہ لفظ آنکس کے معنی میں آیا ہے۔ اور ل میں "گجباگ" لکھا ہوا ہے؛ اِس بنا پر یہاں اِسی شکل کو برقرار رکھا گیا ہے۔

گُذری (ص ۳۸) صاحبِ نور اللغات نے یہ صراحت کی ہے کہ لکھنؤ میں یہ بہ فتحِ دوم ہے اور دلّی میں بہ سکونِ دوم؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہ فتحِ دوم کو ضرورتِ شعری کا کرشمہ سمجھنا چاہیے؛ دلّی و لکھنؤ سے تخصیص روا نہیں۔ آصفیہ میں ذوق اور داغ کا ایک ایک شعر سنداً مندرج ہے، ذوق کے یہاں بہ سکونِ دوم آیا ہے اور داغ کے یہاں بہ فتحِ دوم۔ اثر لکھنوی مرحوم نے

لکھا ہے: "اور امرِ واقع یہ ہے کہ صحیح لفظ بمعنی بازار ... بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم اور بول چال
میں ... بہ ضمِ اوّل و سکونِ دوم۔ صاحبِ نوراللغات کی یہ زیادتی ہے کہ بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم
کو لکھنؤ سے مخصوص کرتے ہیں اور بہ ضمِ اوّل و کسرِ سوم یا بہ ضمِ اوّل و سکونِ دوم کو دہلی سے"
(فرہنگِ اثر ص ۴۹۸)۔ بول چال میں اور نثر میں بہ سکونِ دوم ہی آئے گا اور اسی لیے ذال
پر جزم لگایا گیا ہے۔ "گذری" ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت "گُدڑی" ہے (گدڑی بازار)
"گذری" "گذر" سے بنا ہے جو "گذشتن" سے مشتق ہے۔ اِس بنا پر اصولاً اسے ذال
سے لکھا جانا چاہیے اور فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں ذال ہی سے ملتا ہے؛ اسی کی پابندی
کی گئی ہے۔ ["گذری" اُس بازار کو کہتے ہیں جو شام کو رہ گذر پر لگتا ہے:

پیری میں کریں سیرِ جوانی تو مزہ ہے — دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا (ناسخ)
بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزار ہا — گذری ہے اس کی راہ گذر پر لگی ہوئی (ذوق)]

گذشتگاں (ص ۵) فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "گذشتگاں" مع ذال ہے اور بہ لحاظِ قاعدہ بھی
اسی طرح درست ہے؛ اسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں قاعدے
کی بھی وضاحت کر دی جائے: فارسی کے مصادر "گذشتن"، "گذاشتن" اور "پذیرفتن"
میں ذال ہے؛ اس لیے اِن مصدروں کے سب مشتقات کو مع ذال لکھا جائے گا، جیسے:
گذشتہ، گذرگاہ، راہ گذر، پذیرائی، پذیرا وغیرہ۔

اور "گزاردن" ایک مصدر ہے جس کے معنی ہیں: ادا کرنا، پیش کرنا؛ اس مصدر میں زے
ہے، اس لیے اس کے جملہ مشتقات میں زے آئے گی، جیسے: گزارش، عبادت گزار وغیرہ۔
اِس کتاب میں اسی قاعدے کی پابندی کی گئی ہے اور "پذیرفتن"، "گذشتن" اور "گذاشتن"
کے سب مشتقات کو مع ذال لکھا گیا ہے اور "گزاردن" کے مشتقات میں زے لکھی گئی ہے۔

گِرِہ (ص ۱۸) فارسی میں "گِرِہ" ہے (بہ کسرِ اوّل و دوم)، مگر اردو میں زبانوں پر بہ کسرِ اوّل و دوم
ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "گِرَہ" ملتا ہے اور مؤلفِ نوراللغات نے بھی اصل حرکات لکھ کر
صراحت کی ہے کہ: "بول چال میں بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم ہے"۔ اسی لیے اسے بہ فتحِ دوم
رکھا گیا ہے۔ انشا کے یہاں ایک غزل میں یہ بہ فتحِ دوم نظم بھی ہوا ہے:

فقیرانہ ہے دل مقیم اُس کی رہ کا — غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا
تری آشنائی میں کیا میں نے پایا — دیا نقدِ دل اور اپنی گرہ کا (کلامِ انشا ص ۲۳)

گُمَک (ص ۸۹) یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل، دونوں طرح سُننے میں آیا ہے۔ ہندی شبد ساگر میں بھی دونوں طرح ہے لیکن اندازِ نگارش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرجّح بہ فتحِ اوّل ہے۔ نور میں اِسے "بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم، نیز بہ فتحِ اوّل" لکھا گیا ہے، اور یہاں اندازِ تحریر سے بہ ظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک مرجّح بہ ضمِ اوّل ہے۔ آصفیہ میں "گمک" لکھ کر قوسین میں لکھا ہے کہ: "صحیح بفتحتین"۔ اِس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک اصلاً بہ فتحِ اوّل و دوم ہے، لیکن مستعمل بہ ضمِ اوّل ہے اور بہ ظاہر یہی صورت مرجّح معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ فنِ موسیقی سے متعلق جن لوگوں سے میں نے دریافت کیا، اُنھوں نے یہی کہا کہ طبلے والے عموماً "گُمک" کہتے ہیں؛ اِنھی وجوہ سے گ پر پیش لگایا گیا ہے۔

گھانْس (ص ۳۷) پیشِ نظر سب نسخوں میں "گھانْس" ہے۔ ایک زمانے میں اِس لفظ کا یہ املا رائج تھا۔ جلالؔ نے اپنے لُغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں لکھا ہے:

"گھانس، پھانس کے وزن پر ..... اور جو اِس لغت کو بعد الف کے نونِ غنّہ کے ساتھ نہیں بولتے، یا نہیں لکھتے؛ مولّفِ ہیچ مداں کے نزدیک اُن کی غلطی ہے۔"

نفائس اللغات میں بھی اصل لفظ کے طور پر "گھانس" ہی درج کیا گیا ہے، اگرچہ آخر میں یہ بھی لکھا ہوا کہ "و بہ حذفِ نون ہم آمدہ"۔ اِن حوالوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک زمانے میں "گھانْس" مستعمل تھا اور اِسے ترجیح بھی حاصل تھی۔ سرورؔ کی کتاب فسانۂ عبرت میں بھی ایک جگہ "گھانْس" آیا ہے [فسانۂ عبرت، مرتّبۂ پروفیسر مسعود حسن رضوی ص ۴۶] اِنھی وجوہ سے اِس کتاب میں اِسے مع نونِ غنّہ برقرار رکھا گیا ہے۔

گھونْٹنا (ص ۶۱) فرہنگِ آصفیہ میں "گھونٹنا" موجود ہے "گلا دبانا، دم رُکنا" کے معنوں میں؛ لیکن یہ صراحت نہیں ملتی کہ واو معروف ہے یا مجہول۔ البتہ جلالؔ نے یہ صراحت کی ہے کہ واو معروف ہے اور اُس کے بعد نونِ غنّہ ہے: "گھونٹنا، واوِ معروف اور نونِ غنّہ کے ساتھ: کسی کے گلے کو ہاتھوں سے خوب دبانا۔ ف: گلو فشردن" (سرمایۂ زبانِ اُردو) نور اللغات میں بھی واوِ معروف کی صراحت موجود ہے۔

لَتّہ فارسی کا لفظ ہے (برہانِ قاطع۔ بہارِ عجم)۔ صاحبِ نور اللغات نے اِسے ہندی لکھا ہے، غالباً اِسی لیے آخر میں الف لکھا ہے (لتّا)۔ دونوں باتیں درست نہیں۔ آصفیہ میں صحیح طور پر اِسے "لتّہ" لکھا گیا ہے اور فارسی بتایا گیا ہے۔ فارسی میں "لتّہ چیں" بھی

آتا ہے۔ (اس کی سند بہارِ عجم میں مندرج ہے) اردو کی اس مشہور مثل سے معنی اور املا دونوں کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے: "تن پہ نہیں لتّہ، پان کھائیں البتّہ"۔

لَلَت (ص ۱۴۳) ہندی میں بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم (لَلِت) ہے۔ نور اللغات میں اصل حرکات لکھ کر، مزید لکھا گیا ہے کہ: "بیش تر زبانوں پر بہ فتحِ دوم ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں دوسرے لام پر زبر لگا ہوا ہے (لَلَت) نیز مولف نے یہ صراحت کی ہے کہ: "سنسکرت میں بہ فتحِ اوّل و بہ کسرِ دوم مستعمل و صحیح ہے"۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے نزدیک بہ کسرِ دوم کا تعلق سنسکرت (یا ہندی) سے ہے اور اردو میں بہ فتحِ دوم ہے۔ عم میں دوسرے لام پر زبر لگا ہوا ہے۔ ذوق نے اپنے اُس قصیدے میں جس کے قوافی راحت، حکمت وغیرہ ہیں "للت" کا قافیہ بھی نظم کیا ہے (نور اللغات میں بھی اس شعر کو نقل کیا گیا ہے):

لے کے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی   مَلتی مَلتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت

ان وجوہ سے اسے بہ فتحِ دوم رکھا گیا ہے۔

لِلّٰہِ الحمد (ص ۱۰۷) اس لفظ کے سلسلے میں یہ صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اصل لفظ "لِلّٰہ" ضرورتِ شعری کی بنا پر کبھی کبھی "لِلَہ" (بروزنِ فعلن) بھی آتا ہے۔ یہاں بھی یہ بہ فتحِ لامِ ثانی (لِلَہ بروزنِ فعلن) آیا ہے، اس لیے اُس پر زبر لگایا گیا ہے۔ اگر اس کو "لِلّٰہ" (بروزنِ مفعول) لکھا جائے گا تو مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا۔ ایسے مقامات پر اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

لوَن (ص ۵۷) پیشِ نظر سبھی نسخوں میں "لون" ہے اور یہ قدیم صورت ہے۔ متوسطین کے یہاں بھی یہ لفظ ملتا ہے، مثلاً انیس کے مرثیوں میں۔ متاخرین کے یہاں بیش تر "لَو" ملتا ہے (نور اللغات میں تفصیل موجود ہے)۔ اس لفظ کے قدیم املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

لَہو (ص ۱۴۴) فرہنگِ آصفیہ میں "لَہو" لکھا ہوا ہے، یعنی لام پر زبر بھی لگا ہوا ہے اور پیش بھی اور صراحت موجود نہیں؛ البتہ نور اللغات میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ: "بہ فتحِ اوّل بول چال میں ہے"۔ فیلن نے بھی لَہو (بہ فتحِ اوّل) لکھا ہے اور "لُہو" (بہ ضمِ اوّل) کو ناشستہ یا دیہاتی تلفظ بتایا ہے۔ عُنّے میں بھی بیش تر بہ فتحِ اوّل آیا ہے۔ انھی وجوہ سے لَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

مانند (ص ۵۵) بہ لحاظِ اصل "مانند" ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی اسی طرح ملتا ہے، شعرا نے اس طرح

نظم بھی کیا ہے؛ لیکن بہ قولِ مولفِ نور اللغات : "اُردو میں زبانوں پر بہ کسرِ سوم ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے؛ اسی بنا پر اسے بہ کسرِ سوم (مانند) مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

مِٹّی (ص ۱۰) یہ لفظ بہ کسرِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح مستعمل رہا ہے (مِٹّی۔ مَٹّی) انشا نے دریائے لطافت میں دونوں کو فصیح لکھا ہے: "مَٹّی بالفتح اور مِٹّی بالکسر، دونوں فصیح ہیں" (ترجمۂ دریائے لطافت ص ۲۲۲) لیکن بعد کے لغت نویسوں نے بہ کسرِ اوّل کو مرجّح بتایا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "مِٹّی" لکھا ہوا ہے لیکن یہ صراحت بھی ہے کہ "عوام مَٹّی، بہ فتحِ اوّل" اس سے معلوم ہوا کہ مولف کے نزدیک فصیح بہ کسرِ اوّل (مِٹّی) ہے۔ اس کے جملہ مرکبات میں مؔ پر التزام کے ساتھ زیر لگایا گیا ہے اور اس سے مزید وضاحت ہوجاتی ہے۔ نور اللغات میں بھی بہ کسرِ اوّل کو مرجّح بتایا گیا ہے: "مِٹّی۔ مؤ۔ یہ لفظ بالکسر اور بالفتح، دونوں طرح استعمال میں ہے، لیکن بالکسر زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے"۔ اسی بنا پر مؔ پر زیر لگایا گیا ہے۔

مجھے، مجھ سے، مجھ کو : دیکھیے "تجھ کو"۔

مَجَنّس (ص ۳۵) یہ لفظ بہ فتحِ با اور بہ کسرِ با، دونوں طرح درست ہے (المنجد۔ فرائد الدریہ) چوں کہ اُردو لغات (نور، آصفیہ) میں اسے بہ فتحِ با لکھا گیا ہے: اس بنا پر اُردو میں اسے بہ فتحِ با ہی مرجّح مانا گیا ہے۔

مرغِ آبی (ص ۴۷) ن میں "مرغابی" ہے لیکن ن کے علاوہ اور سب نسخوں میں "مرغِ آبی" ہے۔ فارسی میں "مرغابی" اور "مرغِ آبی" دونوں لفظ مستعمل ہیں (بہارِ عجم)۔ اب اُردو میں عموماً اسے "مرغابی" لکھتے ہیں، لیکن فارسی کے اثر سے پہلے "مرغِ آبی" بھی لکھا جاتا ہوگا۔ فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "مرغِ آبی" کا ہونا اسی پر دلالت کرتا ہے؛ اسی لیے "مرغِ آبی" کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مسالا (ص ۱۴۹) یہ لفظ اس کتاب میں دو جگہ آیا ہے (ص ۱۴۹۔ ص ۱۸۲) اور مختلف نسخوں میں "مصالح" اور "مسالا" اس کا املا ملتا ہے۔ ج میں "مسالا ٹکا" اور "مسالے کی کرتی انگیا" ہے (ص ۹۴۔ ص ۱۱۴) یعنی دونوں جگہ سؔ آیا ہے۔ ض، ک، ف، ل؛ ان سب نسخوں میں پہلی عبارت میں تو "مصالحے کی کرتی انگیا" ہے اور دوسری عبارت میں "مسالا ٹکا" ہے۔ اس اختلاف کے پیشِ نظر اس لفظ کے سلسلے میں وضاحت ضروری

معلوم ہوتی ہے۔

پُرانا لفظ "مصالح" ہے۔ یہ فارسی میں (بہ کسرِ لام) مستعمل ہے: "مصالح، جمع مصلح، کہ آں نیز بکسرِ لام است، و فارسیاں بمعنی مفرد و بمعنی ضروریاتِ تیاریِ عمارت مثل چوب و خشت وغیرہ، یا تیاریِ چیزے دیگر مثلِ افادیہ برای طعام، ولہذا آنرا مصالح گرم تیز گویند، استعمال نمایند" (بہارِ عجم)۔

مؤلف نے متعدد اشعارِ اسناد درج کیے ہیں۔ نیز دیکھیے: نفائس اللغات اور غیاث اللغات۔ موخر الذکر میں مزید لغات کا حوالہ ملتا ہے اور مزید تفصیلات ملتی ہیں۔

دہلی میں "مصالح" مستعمل رہا ہے اور بہ قولِ مولفِ فرہنگِ آصفیہ: "یہ لفظ کہیں بہ فتحِ لام، کہیں بہ کسرِ لام مستعمل ہے"۔ م مع س کی فصل میں مولف نے "مسالا" بھی لکھا ہے لیکن یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "صحیح مصالح" ہے اور اس کے جملہ مرکبات و متعلقات کو "مصالح" کے ذیل میں درج کیا ہے۔ آزاد نے دیباچۂ آبِ حیات میں بھی اِس کا ذکر کیا ہے۔ اہلِ دہلی کی تصانیف میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے لیکن متاخر اساتذۂ لکھنؤ نے اِس کا املا "مسالا" مانا ہے۔ امیر مینائی نے ایک خط میں اِس لفظ کے متعلق تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اِس خط میں ضروری تفصیلات آگئی ہیں، اِس لیے ذیل میں اُس کے ضروری حصّے نقل کیے جاتے ہیں:

"مسالا، معلوم ہوتا ہے کہ "مصالح" کا مہنّد ہے، جو عربی میں "مصلحت" کی جمع ہے اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی محلِّ استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے، جیسے: عمارت کے لیے چونا، سرخی وغیرہ..... دھنیا مرچ، بال دھونے کا مسالا.....

دلّی والے اصل کی طرف جاتے ہیں، مگر چوں کہ زبانوں پر "مصالح" نہیں ہے، یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پلیں لیا، گرم مصالح ہوگیا، کرتی میں مصالح کم پڑا... اِس لیے میری رائے ہے کہ اُردو میں جو بولیں، وہی لکھیں۔ جس طرح "مسالا" بولتے ہیں، اُسی طرح لکھا بھی جائے۔ اور یہی مشربِ متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے، جیسا رشک نے اپنے لغت میں لکھا ہے..... اور اسی کی تقلید جلالؔ نے بھی اپنے لغت گلشنِ فیض میں کی ہے۔ منیرؔ مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے:

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحتِ دل پر جو دیکھے آپ کے موباف کا مسالا سانپ

"کالا سانپ" اور "پالا سانپ" زمین ہے۔ جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محلاتِ لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی :

اے جان! ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا"

[مکتوبِ امیر بنامِ نورالحسن نیر (مولفِ نوراللغات) مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبۂ احسن اللہ خاں ثاقب]

منیر کی ایک رباعی میں بھی "مسالا" قافیے میں آیا ہے :

ہے قحط میں مشکل اک نوالا کھانا رکھتا ہے نہ گھی نہ کچھ مسالا، کھانا
ہر لقمۂ خشک حلق میں پھنستا ہے تیار ہوا ہے کیا اُبالا کھانا

(کلیاتِ منیر، مطبع ثمرِ ہند لکھنؤ؛ ص ۴۷۵)

فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں "مسالا" اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت تک یہ اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ اِس بنا پر کہ اِن نسخوں میں "مسالا" موجود ہے اور اساتذۂ متاخرینِ لکھنؤ کا اسی لفظ پر اتفاق ہے؛ اِسی املا کو ترجیح دی گئی ہے اور دونوں جگہ اِسے مع سین لکھا گیا ہے۔

مُقام۔ مَقام (ص ۱۹۶) بہ ضمِّ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں کے معنی ہیں : کھڑا ہونا (قیام کرنا) اور کھڑے ہونے کی جگہ۔ مولفِ نور نے اِس سلسلے میں یہ صراحت کی ہے کہ : "اُردو میں بیش تر ٹھہراؤ، قیام کے لیے بہ ضمِّ اوّل، اور دیگر معانی میں بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے"۔ یہ امتیاز نہایت مناسب ہے اور اِسی نسبت سے جہاں یہ لفظ قیام کرنے، ٹھہرنے کے معنی میں آیا ہے [جیسے : "نہ کوچ کی طاقت نہ یارائے مُقام" (ص ۶۹)] وہاں اُسے "مُقام" (بہ ضمِّ اوّل) لکھا گیا ہے اور جہاں جائے قیام کے معنی میں آیا ہے، وہاں "مَقام" (بہ فتحِ اوّل) رکھا گیا ہے۔

مَقنَعَہ (ص ۱۴۵) المنجد میں "مِقنع" اور "مِقنعہ" دونوں بہ کسرِ اوّل ہیں۔ مولفِ نور نے لکھا ہے : "مقنع : ع میں بالکسر و فتحِ سوم صحیح ہے۔ اُردو میں بالفتح و فتحِ سوم ہے"۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے اور یہ اُردو کے تلفظ کے عین مطابق ہے؛ اِسی لیے م پر زبر لگایا گیا ہے۔

نور میں صرف "مقنع" ہے [اُردو میں عام طور پر "مقنع" ہی مستعمل ہے] لیکن فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "مقنعۂ مہتاب" ہے، اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مَنگَہ (ص ۷) [ح، م د : منگھی — ض : منگھیں — ن : منگھٹی — ک : منگھا — ف، ل : مکھہ]

ہندی لغات میں اس کو "منگہ" (मगह) لکھا گیا ہے۔ ف میں جس طرح لکھا ہوا ہے، اُس کی قرائت "مَگھ" یا "مَگَہ" ہوگی۔ باقی اور صورتیں قابلِ قبول نہیں، کیوں کہ "مگھئی" یا "مگہئی" اسمِ منسوب ہے، یہ پان کے نام کے طور پر تو مستعمل ہے، لیکن شہر کے نام کے طور پر نہیں۔ سرور کی کتاب فسانۂ عبرت میں بھی یہ لفظ آیا ہے اور مرتّب نے اسے "مگھ" لکھا ہے (فسانۂ عبرت، مرتّبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم ص ۱۵)۔ اگر اس کی قرائت "مَگَہ" (م گ ہ) مانی جائے تو یہ اصل کے مطابق ہوگی۔ اسی بنا پر ل اور ف کے اندراج "مگہ" کی قرائت "مَگَہ" مرجّح قرار دی گئی ہے۔ (بقیہ حصہ اس ضمیمے کے آخر میں)

منہدی (ص ۸۷) [ح: مہدی ــ م، ص، ک، ف، ل، ن: منہدی]

اِس لفظ کا صحیح املا یہی ہے [یعنی نونِ غنہ ہائے ہوز سے پہلے۔ اِس کی مفصل بحث راقم الحروف کی کتاب اُردو املا میں دیکھی جا سکتی ہے] نور اللغات میں "منہدی" کے ذیل میں مولف نے صراحت بھی کر دی ہے: "ہائے ہوز سے پہلے نون لکھنا چاہیے"۔ فسانۂ عجائب کے بیش تر نسخوں میں بھی اسی کے مطابق املا ملتا ہے (منہدی)۔ اصل بات یہ ہے کہ اس گروپ کے جتنے لفظ ہیں، اُن سب میں نونِ غنہ، ہائے ہوز سے پہلے آتا ہے، جیسے: منہ، رِنہہ، سِنہہ، مَنہگا، مَنہگائی (وغیرہ)۔ یہ الفاظ اِس کتاب میں جہاں بھی آئے ہیں، اُن کو اسی طرح لکھا گیا ہے۔

منہگے (ص ۱۴۹) دیکھیے "منہدی"۔

مُوتْرا (ص ۱۸۰) [م: موترا ــ ح، ص، ک، ف، ل: موترا]

فیلن کے لغت، فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں "موتھرا" ہے۔ غالباً اصل لفظ یہی ہے۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں میں "موترا" کو اصل لفظ کے طور پر لکھا گیا ہے اور قوسین میں "موتھرا" لکھا گیا ہے۔ اِس سے تائید ہوتی ہے اِس خیال کی کہ اصل لفظ تو "موتھرا" تھا، استعمالِ عام میں "موترا" ہو گیا۔ فسانۂ عجائب کے پیشِ نظر بھی نسخوں میں اِس لفظ میں ھ موجود نہیں، اور اِس سے فرہنگِ اصطلاحات کے اندراج کی تائید ہوتی ہے؛ اِسی بنا پر اِسے ھ کے بغیر مرجّح سمجھا گیا ہے۔ فیلن کے لغت میں اِسے بہ واوِ مجہول لکھا گیا ہے اور فرہنگِ آصفیہ میں بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ واو مجہول ہے؛ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

موچھ (ص ۲۵۸) یہ لفظ اب کتابت میں بغیر نونِ غنّہ اور مع نونِ غنّہ (موچھ ۔ مونچھ) دونوں طرح آتا ہے۔ نور و آصفیہ دونوں میں "موچھ" کو اصل لفظ مانا گیا ہے اور اس کے متعلقات کو "موچھ" کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ نیز "مونچھ" کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ "دیکھو موچھ"۔ اِس سے ترجیح کی بہ خوبی وضاحت ہو جاتی ہے اور فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "موچھ" ہے؛ اِنھی وجوہ سے "موچھ" کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مَوسَم (ص ۹) یہ لفظ بہ لحاظِ اصل بہ کسرِ سین ہے (مَوسِم)۔ اُردو میں تصرف یہ ہوا ہے کہ اِس کو بہ فتحِ سین استعمال کیا گیا ہے۔ نوراللغات میں بھی اِس تصرف کی نشان دہی کی گئی ہے اور ذوق کے یہاں سے سند پیش کی گئی ہے۔ اِس کی اور بہت سی سندیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ زبانوں پر بھی عموماً بہ فتحِ سین ہے؛ اِس لیے اِسے بہ فتحِ سین مرجّح مانا گیا ہے۔

مُؤلّف : دیکھیے جُرأت۔

مُہار (ص ۱۷۹) غیاث اللغات میں اِسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے اور برہانِ قاطع میں بہ فتحِ اوّل ہے۔ اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ ضمِّ اوّل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اِسے "مُہار" لکھا گیا ہے اور صراحت بھی کی گئی ہے کہ "اُردو والے بہ ضمِّ میم بولتے ہیں"۔ مولفِ نوراللغات نے بھی یہی بات لکھی ہے: "زبانوں پر بہ ضمِّ اوّل ہے"۔ فیلن نے اِسے صرف بہ ضمِّ اوّل لکھا ہے۔ اِسی نسبت سے مَ پر پیش لگایا گیا ہے۔

مُہِمّ سخت (ص ۹۹) لفظ "مُہِم" اصلاً (مُہِمّ) بہ تشدیدِ میم ہے (المنجد)۔ مفرد لفظ عموماً بغیرِ تشدید مستعمل ہے؛ لیکن ایسے الفاظ جب اضافت کے ساتھ آتے ہیں تو بالعموم حرفِ آخر مشدد ہو جاتا ہے [جیسے : خطِّ شکستہ، فنِّ شعر، ردِّ سحر، حدِّ ادب] اِسی بنا پر یہاں مَ پر تشدید لگائی گئی ہے۔

مَہمیز (ص ۱۶۷) لغات میں عام طور پر اِسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے؛ البتہ برہانِ قاطع میں بہ کسرِ اوّل لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "و بفتحِ اوّل ہم آمدہ است"۔ فارسی میں یہ بہ فتحِ اوّل آیا ہو یا نہ آیا ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہی ہے۔ آصفیہ میں "مَہمیز" لکھا ہوا ہے اور یہ صراحت کی گئی ہے کہ: "عوام بہ فتحِ میم اوّل و یائے مجہول ساکن"۔ ممکن ہے کہ اُس زمانے میں "عوام" ہی بہ فتحِ اوّل کہتے ہوں، لیکن اب کیا خواص کیا عوام، سبھی بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں؛ اِسی نسبت سے اِسے بہ فتحِ اوّل رکھا گیا ہے۔

مُہیب (ص ۱۶۲) اصل میں میم پر زبر ہے (المنجد) اسی رعایت سے مولّفِ نوراللغات نے لکھا ہے کہ: "مہیب بہ فتحِ اوّل صحیح و بہ ضمِ اوّل غلط" لیکن زبانوں پر بہ ضمِ اوّل ہی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں مَ پر پیش لگا ہوا ہے (مُہیب) اور یہ استعمالِ عام کی نمایندگی کرتا ہے۔ فیلن نے بھی اسے استعمالِ عام کے مطابق بہ ضمِ میم ہی لکھا ہے۔ اسی لحاظ سے مَ پر پیش لگایا گیا ہے۔

مہینا (ص ۲۸۶) سب نسخوں میں "مہینا" ہے اور بہ لحاظِ قواعد بھی یہی صحیح املا ہے۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے [اس سلسلے میں مزید دیکھیے "پتا" اور "پسینا"]۔

نا (نہ) (ص ۴۸) سب نسخوں میں "نہ" ہے، لیکن یہ حرفِ نفی ہے، اور یہاں نفی کا محل نہیں، تاکید کا محل ہے اور تاکید کے لیے "نا" آتا ہے (جیسے: تم جاؤ نا، اٹھو نا وغیرہ) اسی لیے یہاں "نہ" کے بجاے "نا" رکھا گیا ہے۔

نَخوَت (ص ۳۹) المنجد میں بہ فتحِ اوّل ہے۔ غیاث اللغات میں بہ کسرِ اوّل۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی نَ پر زبر لگا ہوا ہے (نَخوت) لیکن صاحبِ نوراللغات نے بجا طور پر لکھا ہے کہ: "اردو میں زبانوں پر بالفتح ہے"۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

نَرَک (ص ۲۰۷) [ف، ض، ل: نرگ — ک: نرک]

اصل لفظ "نرک" (بہ کافِ عربی) ہے۔ نوراللغات میں تو یہ لفظ موجود نہیں، لیکن فرہنگِ آصفیہ میں اور فیلن کے لغت میں مندرج ہے اور مع کافِ۔ ہندی میں بھی یہی صورت ہے (ہندی شبد ساگر)۔ اسی بنا پر ک کے مطابق اسے "نرک" (مع کاف) لکھا گیا ہے۔

نژاد (ص ۳۲) [ح، م، ض، ف، ل: نزاد — ک: نژاد]

اصل لفظ "نژاد" ہے (فرہنگِ جہانگیری۔ برہانِ قاطع)۔ اردو لغات (آصفیہ و نوراللغات) میں بھی صرف "نژاد" ہے۔ اسی بنا پر ک کے املا کو اختیار کیا گیا ہے۔

برہانِ قاطع میں اسے بہ کسرِ اوّل (نِژاد) لکھا گیا ہے، لیکن صاحبِ غیاث اللغات نے بہ فتحِ اوّل (نَژاد) لکھا ہے۔ نوراللغات میں اسے "بروزنِ نشاط" لکھا گیا ہے یعنی "نَژاد" مانا گیا ہے، لیکن فرہنگِ آصفیہ میں "نِژاد" ہے۔ ڈاکٹر معین نے اپنے قابلِ قدر لغت فرہنگِ فارسی میں بھی اسے بہ کسرِ اوّل "نِژاد" لکھا ہے۔ برہانِ قاطع، فرہنگِ فارسی اور

فرہنگِ آصفیہ کے اندراج کے مطابق اسے بہ کسرِ اوّل (نِژاد) مرجّح سمجھا گیا ہے۔

نَشتر (ص ۲۲۹) فارسی میں بہ کسرِ اوّل ہے۔ اِس کو "نیشتر" کا مخفّف بتایا گیا ہے (برہانِ قاطع) اُردو میں عام طور پر زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے۔ مولّفِ نور اللغات نے لکھا بھی ہے کہ: "عموماً بول چال میں بالفتح ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی نؔ پر زبر لگا ہوا ہے۔ اِسی نسبت سے ن پر زبر لگایا گیا ہے۔

نَشَست (ص ۹) فارسی میں "نِشستن" (بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم) ہے، اِس لحاظ سے اصولاً اِس مصدر کے جملہ مشتقّات میں نؔ کو مکسور رہنا چاہیے، لیکن اُردو میں زبانوں پر "نَشَست" اور "نَشیں" ہے۔ مثلاً "شہ نَشیں" کہا جاتا ہے نہ کہ "شہ نِشیں"۔ اِسی طرح "مسند نَشینی" بولتے ہیں۔ "مسند نِشینی" شاید ہی کوئی کہتا ہو۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں اِس مصدر کے مشتقّات میں نؔ کا زیر، زبر میں بدل گیا ہے؛ اِسی لحاظ سے اِس کتاب میں "نَشَست" اور "نَشیں" کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

نور اللغات میں "نشست" اور "نشیں" موجود ہیں، لیکن حرکات کی صراحت کے بغیر۔ فرہنگِ آصفیہ میں دونوں لفظوں میں نؔ پر زیر لگا ہوا ہے (یہ نری فارسی کی تقلید ہے) اور فیلن کے لغت میں "نِشست" (بہ کسرِ نونؔ) اور "نَشیں" (بہ فتحِ نونؔ) ہے۔

نَشیب (ص ۱۳۴) فارسی میں بہ کسرِ اوّل و دوم ہے (برہانِ قاطع) لیکن اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم (نَشِیب) ہے۔ مولّفِ نور اللغات نے اصل اعراب لکھ کر یہ بھی لکھا ہے کہ: "زبانوں پر بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم ہی ہے" اور یہی صحیح ہے؛ اِسی کے مطابق نؔ کو مفتوح رکھا گیا ہے۔

نَقاب (ص ۲۴۵) اصلاً بہ کسرِ اوّل (نِقاب) ہے اور فرہنگِ آصفیہ میں اِسے (اصل کے مطابق) "نِقاب" ہی لکھا گیا ہے، لیکن اُردو والے عموماً بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں اور مولّفِ نور اللغات نے بجا طور پر وضاحت کی ہے کہ: "صحیح بہ کسرِ اوّل ہے، ہندستان میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے"۔ اِسی بنا پر نؔ پر زبر لگایا گیا ہے۔

نقشہ (ص ۱۱) [ح: م، ض، ک: نقشہ — ف، ل: نقشا]

پہلے اِس لفظ کو عام طور پر "نقشہ" لکھا جاتا تھا اور فارسی ترکیبوں میں بلا تکلّف استعمال کیا جاتا تھا۔ قتیلؔ نے ایک خط میں لکھا ہے: "نقشۂ زمین و مکانِ نو بایں صورت است"

[رقعاتِ قتیل، مطبعِ محمدی لکھنؤ، سالِ طبع ۱۲۷۵ھ، ص ۱۲۸] سرور کی ایک کتاب شبستانِ سرور میں بھی کئی جگہ "نقشۂ تصویر" آیا ہے (جلدِ اوّل ص ۱۹، ۱۵۹۔ جلدِ چہارم ص ۱۲۳)، اس سے معلوم ہوا کہ سرور نے "نقشہ" لکھا ہے، اور اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

نُقل (ص ۱۳۹) متعلقہ معنی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل، دونوں طرح ملتا ہے (المنجد)۔ غیاث اللغات میں مختلف لغات کے اختلافات کو یک جا کر دیا گیا ہے، اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے لکھا ہے: "عربی میں بالفتح، فارسی اُردو میں بالضّم ہے"۔ اس قول کا آخری ٹکڑا ہمارے کام کا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک اُردو میں بہ ضمِ اوّل ہے، اور یہی صحیح بات ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اسے "نُقل" لکھ کر، لکھا گیا ہے: "بعض نے اس کو بہ فتح بھی لکھا ہے"، اور اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک بھی مرجّح بہ ضمِ اوّل ہے؛ اسی لیے ن پر پیش لگایا گیا ہے۔

نِکپسا (ص ۸۹) فارسی لغات میں "نگپسا" بہ کافِ فارسی ملتا ہے (برہانِ قاطع۔ غیاث اللغات) لیکن برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے اس کے حاشیے میں اس کی ایک صورت "نکپسا" بھی لکھی ہے اور فسانۂ عجائب کے سبھی نسخوں میں "نکپسا" ہے؛ اس لیے اسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے: "وفقیر مولّف گوید کہ اگرچہ اہلِ لغت یائی مجہول نوشتہ اند مگر ہر گاہ کہ معروف خواندہ شود، فصیح می نماید، و مجہول را معروف خواندن جائز است"۔ اسی قول کی بنا پر اس کو بہ یائے معروف مرجّح سمجھا گیا ہے۔

نُمود (ص ۱۷۸) فارسی کے بیش تر لغات میں "نمودن" اور اُس کے مشتقات کو بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن برہانِ قاطع میں "نمودار" کو بہ فتحِ اوّل لکھا ہے۔ "نمودار" اگر بہ فتحِ اوّل ہے تو "نمود" کو بھی بہ فتحِ اوّل مان لینے میں کچھ قباحت نہیں ہو سکتی۔ نور اللغات میں "نمود" کو بہ ضمِ اوّل و دوم "نُمُود" لکھا گیا ہے، لیکن "نمودار" کے ذیل میں صراحت کی ہے کہ: "فارسی میں بہ ضمِ اوّل و دوم، اُردو میں بہ فتحِ اوّل و ضمِ دوم زبانوں پر ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں "نمودن" کے جملہ مشتقات زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "نمود" اور "نمودار" دونوں لفظوں کے ن پر زبر لگا ہوا ہے اور اُردو میں اسی طرح مستعمل ہے؛ اسی بنا پر ن پر زبر لگایا گیا ہے۔

نوالہ (ص ۶۲) فرہنگِ آصفیہ میں "نَوالہ" (بہ فتحِ نون) لکھا گیا ہے لیکن یہ صراحت بھی ہے کہ "مشہور بہ کسرِ اوّل"۔ صاحبِ نور اللغات نے بھی صراحت کی ہے کہ "اُردو میں بہ کسرِ اوّل ہی زبانوں پر ہے" اور یہی بات درست ہے؛ اسی بنا پر اس لفظ کو بہ کسرِ اوّل مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

نِہنگ (ص ۵۸) فارسی میں بہ فتحِ اوّل ہے (برہانِ قاطع) لیکن مولّفِ نور اللغات نے صراحت کی ہے کہ زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے اور اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

نَیَّر (ص ۳۴) اصلاً یَ پر زیر ہے (نَیِّر)۔ فرہنگِ آصفیہ میں اسی طرح ملتا ہے، لیکن مولّفِ نور اللغات نے تصرّف کا ذکر کیا ہے: "فارسیوں نے بہ فتحِ دوم کہا ہے.... اُردو میں زبانوں پر اسی طرح ہے"۔ کلّیاتِ غالب فارسی میں کئی جگہ یہ لفظ "دیگر" اور "منظر" وغیرہ کے قوافی کے ساتھ آیا ہے؛ مثلاً وہ قصیدہ جس کا پہلا مصرع یہ ہے: باز باطرافِ باغ آتشِ گُل درگرفت، اس میں "نَیَّر" ملے گا — جیسا کہ مولّفِ نور اللغات نے لکھا ہے، اُردو میں زبانوں پر "نَیَّر" ہے اور اسی نسبت سے یَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

وَرغلانا (ص ۳۳۱) اس عبارت میں "ورغلانا" بہ طورِ ماضیِ مطلق آیا ہے۔ "ورغلانا" اس کا مصدر ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور جلالؔ کے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں صرف "ورغلانا" ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ مستعمل صورت تھی (اب عموماً "ورغلانا" مستعمل ہے) "ورغلانا" کا ماضی "ورغلانا" ہوگا (جیسے "مانا" کا "مانا" اور "جانا" کا "جانا") فسانۂ عجائب میں "ورغلانا" کا بہ طورِ ماضیِ مطلق پایا جانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ "ورغلانا" لکھنؤ میں بھی ایک زمانے میں مستعمل رہا ہے (جلالؔ کا اندراج بھی اسی پر دلالت کرتا ہے)۔

ہَراوَل (ص ۲۵۶) غیاث اللغات میں اسے بہ کسرِ اوّل وضمِ واو (ہِراوُل) لکھا گیا ہے۔ مولّف نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ "از لغاتِ ترکی"۔ فرہنگِ آصفیہ میں "ہَراوُل" ہے، یعنی ہ پر زبر بھی ہے اور زیر بھی؛ لیکن واو پر پیش ہی ہے۔ مولّف نے مزید لکھا ہے کہ: "اُردو میں "ہَرولْ" بولتے ہیں۔ یہاں ہ پر زبر ہے اور اس سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اُردو میں ہ کا زبر مرجّح ہے۔ نور اللغات میں "ت: بہ کسرِ اوّل وضمِ چہارم۔ اُردو میں بہ فتحِ اوّل وچہارم، نیز بہ کسرِ اوّل"۔ مطلب یہ ہوا کہ ترکی میں تو "ہِراوُل" ہے اور اُردو میں "ہَراوَل" ہے اور "ہِراوَل" بھی کہتے ہیں۔ مولّف کے اندازِ تحریر سے بہ ظاہر

یہ مترشح ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اُردو میں مرجح صورت "بہ فتحِ اوّل و چہارم" ہے؛ اور فیلن کے لغت میں صرف بہ فتحِ اوّل و چہارم (ہراوَل) ہے؛ بہ ظاہر اس سے صاحب نور اللغات کے قول کی تائید ہوتی ہے؛ اسی بنا پر "ہراوَل" لکھا گیا ہے۔

ہِرَن (ص ۵۳) یہ لفظ لغات میں بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح ملتا ہے۔ سننے میں بھی دونوں طرح آتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "ہِرَن" لکھا ہوا ہے اور کسی طرح کی صراحت مذکور نہیں۔ انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ "ہرن" میں حرفِ اوّل مفتوح بھی ہے اور مکسور بھی (ترجمۂ دریائے لطافت ص ۲۲۲) اس کے برخلاف نفائس اللغات میں اسے صرف "بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم" لکھا گیا ہے اور اس سے علاقۂ اودھ کے تلفظ کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نور اللغات میں "ہرن" کو "بہ فتحِ اوّل و دوم نیز بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم" لکھا ہے لیکن "ہرنی" اور "ہرنوٹا" کو صرف "بہ کسرِ اوّل" لکھا ہے؛ اس سے بھی ترجیح کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جناب نیر مسعود نے اطلاع دی کہ لکھنؤ میں ہِرن (بہ کسرِ اوّل) زبانوں پر ہے، بعض دیگر حضرات نے بھی اس کی تصدیق کی؛ اس سے نفائس اللغات کے اندراج کی تائید ہوتی ہے۔ ان وجوہ سے اس کتاب میں اس لفظ کو بہ کسرِ اوّل مرجح سمجھا گیا ہے۔

ہزارداستاں۔ ہزاردستاں (ص ۱۴) [ج، م: ہزار دستاں ض، ک، ف، ل، ن: ہزار داستاں]
اس کتاب کی دوسری داستان کے آغاز ہی میں یہ لفظ پھر آیا ہے اور وہاں سب نسخوں میں "ہزار دستاں" ہے ("بلبل نوا سنج ہزار دستاں" ص ۲۷)۔ اس بنا پر کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے:

فارسی لغات میں بلبل کے ساتھ بہ طورِ صفت "ہزار دستاں" اور "ہزار داستاں" دونوں لفظ ملتے ہیں (برہانِ قاطع۔ بہارِ عجم) لیکن فارسی نظم میں عموماً "ہزار دستاں" اور "دستاں سرا" ملتے ہیں۔ فارسی میں "دستاں" کے کئی معنی ہیں، من جملہ ان کے "سرود و نغمہ و حکایات و افسانہ" بھی ہیں (برہانِ قاطع)۔ اُردو میں "داستان" کا لفظ حکایت و افسانہ کے مفاہیم میں مستعمل ہے، "نغمہ و سرود" کا مفہوم اس میں شامل نہیں؛ اس لحاظ سے "دستاں" وسیع المعنی لفظ ہے۔

فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں صرف "ہزار داستاں" ہے۔ مؤلفِ آصفیہ نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ "شعرائے عجم نے ہزار دستاں باندھا ہے"؛ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ

مولف کے نزدیک " ہزار دستاں" فارسی سے مخصوص ہے اور اُردو میں " ہزار داستاں" ہے۔ یہی بات نور اللغات کے اندراج سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ آج کل " ہزار داستاں" ہی مستعمل ہے، لیکن فارسی کے اثر سے اُردو میں بھی " ہزار دستاں" مستعمل ضرور تھا، اور اس کا اندازہ فسانۂ عجائب ہی کے منقولۂ بالا اندراجات سے کیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ خود فارسی لغات میں دونوں طرح ملتا ہے اور اس مقام پر اس کتاب کے بیش تر نسخوں میں " ہزار داستاں" ہے؛ اس بنا پر یہاں اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اور چوں کہ ص ۳۷ پر اس کتاب کے سب نسخوں میں " ہزار دستاں " ہے، اِس لیے وہاں اُسی کو رکھا گیا ہے۔ لفظ دونوں طرح صحیح، دونوں طرح مستعمل؛ اِس لیے اِس کی دونوں صورتوں کو اپنے اپنے مقام پر برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ وہی طریقہ کار ہے جو لفظ " خونچہ" اور " خوانچہ" کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے (خونچہ کے ذیل میں صراحت کر دی گئی ہے)۔

اِس سلسلے میں مرزا غالب کی رائے معلوم کرنا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غالب نے قاضی عبدالجمیل جنوں کو ایک خط میں لکھا ہے:

" اور یہ جو بلبل کو ہزار داستاں کہتے ہیں، سوقی اور فرومایہ لوگ کہتے ہیں۔ صحیح ہزار دستاں ہے، یعنی بہت طرح کی آوازیں بولتا ہے" (خطوطِ غالب، مرتبۂ مہیش پرشاد)۔

لیکن غالب کی یہ رائے انتہا پسندی پر مبنی ہے، کیوں کہ اُردو والے بیش تر " ہزار داستاں" لکھتے اور بولتے ہیں۔

ہِنْدَسَہ (ص ۱۳۶) عربی میں " ہَنْدَسَہ " ہے (المنجد) غیاث اللغات میں اِس کو بہ فتحِ اوّل اور " اندازہ" کا معرّب لکھا گیا ہے لیکن برہانِ قاطع میں بہ کسرِ اوّل و ثالث (ہِنْدِسَہ) لکھا ہوا ہے۔ فیلن نے اپنے لُغت میں " ہِنْدَسَہ" لکھا ہے (بہ کسرِ اوّل و فتحِ ثالث)۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی ہ پر زیر لگا ہوا ہے لیکن دال پر زیر ہے یا زبر، اِس کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ مولف نے مزید لکھا ہے:

" ہماری رائے میں یہ لفظ " اندازہ " کا مُعرّب نہیں ہے۔ چوں کہ ہند سے یہ علم نکلا ہے؛ اِس سبب سے ہندسہ نام رکھا گیا"۔ یہ گویا توجیہ ہوئی بہ کسرِ اوّل کی (ہند سے ہِندسہ) بہ ہر صورت، یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مولفِ آصفیہ کے نزدیک اُردو میں یہ کسرِ اوّل ہے اور یہی بات ٹھیک بھی ہے۔ فیلن نے استعمالِ عام کے مطابق " ہِنْدَسَہ" لکھا ہے اور اُسی کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

ہندی کی چندی (ص ۱۳) نور اللغات میں "چ" پر پیش لگا ہوا ہے [ہندی کی چندی] اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس سے اختلاف کیا ہے، اِس اندراج کے ذیل میں لکھا ہے: "چندی کو صاف صاف بالضم لکھا ہے، حالاں کہ بہ کسرِ اوّل ہے"۔ فرہنگِ آصفیہ اور فیلن کے لغت میں بھی بہ کسرِ اوّل ہی ہے اور اسی طرح نسخے میں آیا ہے۔ اسی بنا پر "چندی" کو بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے [ہندی شبد ساگر میں "چُندی" کے معنی ہیں: (۱) بالوں کی چوٹی، جو ہندو سر پر رکھتے ہیں۔ (۲) کٹنی۔]۔

ہَنُوز (ص ۱۷۰) فارسی لغات میں اِسے بہ فتحِ اوّل و واوِ معروف (ہَنوز) لکھا گیا ہے۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے البتہ یہ صراحت کی ہے کہ اِس کا پُرانا تلفظ بہ واوِ مجہول تھا۔ فرہنگِ آصفیہ میں "ہ" پر زبر لگا ہوا ہے لیکن واو کے متعلق صراحت نہیں ملتی۔ نور اللغات میں "بہ فتحِ اوّل و واوِ معروف" لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "اُردو میں بہ کسرِ اوّل و واوِ مجہول بول چال میں ہے"۔ اِس کے برخلاف فیلن نے بہ کسرِ اوّل (ہِنوز) کو بے پڑھے لوگوں کا تلفظ بتایا ہے؛ اُس نے اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و واوِ مجہول لکھا ہے۔ اُردو میں واو کے مجہول ہونے پر تو اتفاق ہے (قدیم فارسی تلفظ کے مطابق) لیکن حرفِ اوّل میں فتحے اور کسرے کا اختلاف ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور فیلن کے لغت کے مطابق اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل مرجح سمجھا گیا ہے اور "ہَنوز" لکھا گیا ہے۔

ہونٹ (ص ۶) [م، ل: ہونٹھ — ج، ض، ک، ف: ہونٹ]

اِس لفظ کی قدیم صورت "ہونٹھ" ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن کے آخر میں ہائے مخلوط تھی، لیکن رفتہ رفتہ اُس کی آواز کم زور پڑنے لگی، یہاں تک کہ کچھ لفظوں میں ایک مدت کے بعد اُس کا وجود کلیتاً تحلیل ہو گیا۔ یہ ایک طرح کا لسانی رجحان ہے۔ اِس لفظ کو بھی تخفیف کے اِس عمل سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اوپر اختلافِ نسخ جو درج کیا گیا ہے، اُس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ میر و درد میں تخفیف کا عمل بڑی حد تک بروئے کار آ چکا تھا؛ یہاں تک کہ اساتذۂ متاخرین کے یہاں صرف "ہونٹ" رہ گیا۔ اِس کا کچھ اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ جلالؔ نے سرمایۂ زبانِ اردو میں لکھا ہے کہ "اِس لفظ کے آخر میں جو بعضے ہائے مخلوط التلفظ بڑھا کر "ہونٹھ" بولتے ہیں اور لکھتے ہیں، مولفِ ہیچ مدان کے عندیے میں نادرست ہے"۔ خیر "نادرست" والی بات تو اُس زمانے میں ٹھیک نہیں تھی [نفائس اللغات

میں صرف " ہونٹھ" ہے] شوقؔ نیموی نے بھی رسالۂ اصلاح میں اِس طرف توجہ دلائی ہے؛ لیکن یہ ضرور ہے کہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں ہاے مخلوط کی آواز تحلیل ہونا شروع ہوگئی تھی، اور بیش تر " ہونٹ " مستعمل تھا اور اِس کتاب کے چار نسخوں میں " ہونٹ " اِسی پر دلالت کرتا ہے؛ اِسی بنا پر " ہونٹ " کو مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

ہیچ (ص ۵) آج کل ایرانی اور اُن کے اثر سے جدید فارسی سے آشنا ہندستانی بھی ہر لفظ میں یاے معروف کے قائل ہیں، اِسی لیے " ہیچ " کو بھی " ہیچ " کہتے ہیں۔ یہ ایرانی رجحان نو آمدہ ہے، جب کہ پُرانے زمانے میں ایران اور ہندستان دونوں ملکوں میں واوِ مجہول اور یاے مجہول کی آوازیں کارفرما تھیں۔ لغات میں ایسے الفاظ کے متعلق صراحت ملتی ہے۔ ہندستان میں اکثریت کا اب بھی وہی لہجہ ہے اور اُردو میں تو لازماً وہی رہے گا۔ اِس لیے ایسے فارسی الفاظ جن میں یاے مجہول یا واوِ مجہول کی آواز مسلّمات میں سے تھی، اُن کو بہ یاے مجہول اور بہ واوِ مجہول ہی رکھا گیا ہے اور اِسی اصول کے تحت " ہیچ " (بہ یاے مجہول) لکھا گیا ہے قدیم فارسی میں یہ بہ یاے مجہول ہی تھا (برہانِ قاطع) اور اُردو والے بھی اِسی طرح بولتے ہیں؛ اِس لیے اِسے بہ یاے مجہول ہی ہونا چاہیے۔

ہیزُم (ص ۱۵۸) مولّفِ غیاث اللغات نے اِس لفظ کو " بہ فتحِ اوّل " لکھا ہے اور حوالہ دیا ہے بہارِ عجم کا؛ لیکن بہارِ عجم میں فتحے کا ذکر نہیں؛ بل کہ اِسے " بہ یاے مجہول " لکھا گیا ہے اور یہ صریحاً اِس پر دلالت کرتا ہے کہ حرفِ اوّل مکسور ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے جلدِ چہارم کے ص ۲۴۰۰ کے حاشیے میں اِس لفظ کا اضافہ کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اِس کا قدیم تلفظ بہ کسرِ ہا و یاے مجہول ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

یہاں (ص ۹۱) [ت : یاں ــ ح، م، ض، ک، ل : یہاں]
ایک زمانے میں (اور کم سے کم عہدِ غالب تک) دہلی میں " یھاں " اور " وھاں " مستعمل رہے ہیں۔ مرزا غالبؔ کی ایک اصلاح سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ " یھاں " کو فصیح تر سمجھتے تھے۔ (مقدمۂ مکاتیبِ غالب طبعِ ششم ص ۲۲۹)۔
انشا نے دریاے لطافت میں جہاں اُردو کے حروفِ تہجی سے بحث کی ہے، وہاں " ھ سے مخلوط حروف " کے ذیل میں " یھ " اور " وھ " کی اِس طرح نشان دہی کی ہے : " واو اور

یَ کے اختلاط کی مثال ہے "یھاں" اور "وھاں"۔ [ترجمۂ دریائے لطافت ص ۱۳]
لکھنوی اساتذہ کے یہاں ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی جس سے "یہاں" کے مخفف کو "یھاں" مانا گیا ہو۔ جن لوگوں نے متروکات کی بحث کے تحت اِن لفظوں کا ذکر کیا ہے، انھوں نے اِن کو "یاں" اور "واں" لکھا ہے (اور آج کل بھی یہی صورت ہے)۔ اِس بنا پر یہ التزام کیا گیا ہے کہ اساتذۂ دہلی (میر، درد، سودا، میر حسن، مصحفی، سوز، جرأت وغیرہ) کے اشعار میں "یہاں" اور "وہاں" کے مخفف کو "یھاں" اور "وھاں" لکھا جائے گا۔

ص ۵۰۶ کا بقیہ:

"مہوبا" شہر کا بھی نام ہے اور وہاں کے پان کو بھی "مہوبا" کہتے ہیں۔ اِس کے برخلاف "مگھئی" پان کو کہتے ہیں اور شہر کا نام "مگہ" ہے۔ گویا "مہوبا" تو ذو معنیین ہے اور اِس طرح ایہام کا فائدہ اِس سے حاصل ہو سکتا ہے، مگر "مگہ" اور "مگھئی" دونوں میں یہ پہلوداری نہیں، صرف ایک معنوی تعیین نمایاں رہے گا۔ اِس لفظ کے ذیل میں جو صراحت کی گئی ہے، اُس سے معلوم ہوگا کہ شروع کے نسخوں (ح، م، ض، د) میں "مگھئی" ہے اور بعد کے نسخوں (ک، ف، ل) میں "مگہ" ہے۔ نسخۂ ک میں اِس مقام پر حاشیے میں یہ عبارت ہے: "مگہا شہر کا نام ہے عظیم آباد کے قریب اور مہوبا بندیل کھنڈ میں ہے، پان خوب ہوتے ہیں"۔ اِس سے بظاہر یہی مطلب نکلتا ہے کہ مصنف کی مراد یہاں "مگہ" (شہر) سے ہے، "مگھئی" (پان) سے نہیں۔ اِسی طرح نسخۂ ف میں اِن دونوں لفظوں کے نیچے (بین السطور) "نام شہر" لکھا ہوا ہے، اِس طرح: "مگہہ (نام شہر) مہوبا (نام شہر)"۔ ل میں "مگہ" کے نیچے تو کچھ نہیں لکھا ہوا ہے، مگر "مہوبا" کے نیچے (بین السطور) "نام شہر" لکھا ہوا ہے اور اِس طرح خود یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ "مگہ" بھی شہر کے نام کے طور پر آیا ہے۔ اِن وجوہ سے "مگہ" اور "مہوبا" کو شہروں کے نام کے طور پر ترجیح دی گئی ہے۔ چوں کہ معنویت دونوں صورتوں میں (یعنی "مگہ" لکھا جائے یا "مگھئی") برقرار رہتی ہے، اِس بنا پر موخر نسخوں کے اندراجات کو مرجح قرار دیا گیا ہے — یہ ضرور عرض کردوں کہ ذاتی طور پر مجھے "مگھئی" بہتر معلوم ہوتا ہے، پان کی رعایت سے اور اِسی کو مرجح سمجھنے کو دل چاہتا ہے، مگر محض مذکورۂ بالا دو وجوہ سے یہاں "مگہ" کو ترجیح دی گئی ہے: ایک تو یہ کہ موخر نسخوں میں اِسی طرح ہے اور دوسرے یہ کہ اِس طرح بھی معنویت برقرار رہتی ہے، یوں اصولی طور پر ترجیح "مگہ" کو حاصل ہے۔ میں نے اپنے ذوق پر اصول کو ترجیح دی ہے۔

ضمیمہ ۶

الفاظ اور طریقِ استعمال

دوسرا اِس عہدے سے کب برآئے۔ ص ۱

طالع (طلوع کرنے والا)۔ ص ۲

فہم (مذکر)۔ ص ۳

کبک (مذکر)۔ ص ۱۰

گذرگاہ (مذکر)۔ ص ۱۱ (مگر ص ۲۲۵ پر مونث ہے)۔

طرز (مذکر)۔ ص ۱۳، ص ۳۳، ص ۱۶۷ (مگر ص ۱۹۱ پر بہ تانیث آیا ہے۔ اِس کی بحث کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۲، حاشیہ ص ۳۳)۔

پند (مذکر) "پند کیا"۔ ص ۱۵۸، ص ۲۲۳

مرزائی (مذکر) "گاڑھے کا مرزائی پہن لیا"۔ ص ۱۹

مینا (مونث)۔ ص ۲۰ — زعفران (مونث)۔ ص ۲۰۷

نشوونما (مونث)۔ ص ۴۳

خراش (مونث)۔ ص ۴۴

تاب و تواں (مذکر)۔ ص ۴۹

وادی (مذکر)۔ ص ۱۱۰

خلش (مذکر)۔ ص ۱۲۱

زین (مذکر) "کسی پر جڑاؤ زین بندھا"۔ ص ۱۸۰

التماس کیا۔ ص ۱۸۹، ص ۲۸۹

عرض کیا۔ ص ۲۸۵ — کشمیر (مونث) ص ۲۲۶

محلسرا (مذکر)۔ ص ۲۰۲

سانس (مونث)۔ ص ۲۱۰

فکر (مذکر)۔ ص ۲۲۳

گزند (مونث)۔ ص ۲۸۳

جو عجز میں نہ در آئے۔ ص ۲

بہ معرضِ بیاں لائے۔ ص ۳

صحبتِ بزم اُس کی انشا کردوں۔ ص ۴

بہ چشم ... ہزاروں نے دیکھا ہے۔ ص ۴

شیر پلاتی تھی۔ ص ۴

عادتِ جبلی۔ ص ۴

ہر شخص ... باوضع، قطع دار ہے۔ ص ۵

غنودگی میں اونگھے۔ ص ۶

متصل (بہ معنیِ مسلسل)۔ ص ۶

سُنکارنیں۔ ص ۶

محاورے اُن کے دیکھے نہ سُنے۔ ص ۶

زور (بہت، عجیب)۔ ص ۶، ص ۴۴

آپ بھی کچھ زور ہیں۔ ص ۸

زور چیز ہو۔ ص ۸۴

گھر میں زور رقم، طرفہ تُوم تھی۔ ص ۱۵۶

یہ زور تماشا ہوا۔ ص ۱۸۸

جوبن کی جھمک۔ ص ۷

رنگترا۔ ص ۷

شکرِ خدا کر کر۔ ص ۸

یہ شہر خرّاد ہے۔ ص ۸

بدگل (مرد کے لیے)۔ ص۸ ـــــ بدرُجی (عورت کے لیے) ص۹۱

رنگتیں نرالیاں۔ ص۹

کہا تو یہ کہا، دیوانیاں ہو۔ ص۸

مغلانیاں پرانی پرانیاں۔ ص۱۲۳

کہاریاں پیاری پیاریاں۔ ص۱۸۲

نشۂ حسن میں متوالیاں۔ ص۱۸۲

مغلانیاں غم کی ماریاں۔ ص۲۴۰

فرنی کے خونچے۔ ص۹

بنیٹی کا پونڈا، نرم، گندہ۔ ص۹

جھگڑا بادۂ ارغوانی ... کا پیدا۔ ص۹

پیدا ہے (ظاہر ہے)۔ ص۳۰۷

ایک دھما کا پیدا ہوا۔ ص۱۶۳

چسکی پی۔ ص۹

اشکِ بلبل کا دورِ تسلسل ہوا۔ ص۹

مفتی میں (مفت میں)۔ ص۹

گھٹا رہی ادبھی گھنگھور۔ ص۱۰

دخل کیا جو وہ جائیں کہیں۔ ص۱۰

دخل کیا دروازے سے باہر قدم رکھے۔ ص۱۰

کیچڑ کا چھپکا۔ ص۱۰

چہلے سے پھنسے۔ ص۱۰

جہل خانہ (جیل خانہ)۔ ص۱۱

ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا۔ ص۱۳

سیکڑوں لونڈی غلام نے زبانِ آزادی پایا۔ ص۳۵

ہزارہا شخص ... سربرار آیا۔ ص۱۶۳

ہزارہا قیدی ... اپنے گھر آیا۔ ص۳۵

کیا کیا جملہ بڑھایا ہے۔ ص۲۳

سو سو جہاز ایک ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ ص۱۵۹

ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ ص۱۲

ارکانِ سلطنت نے ملازمت حاصل کی۔ ص۲۲۴

داروغہ کو احکام ملا۔ ص۱۳۸

اموراتِ سلطنت۔ ص۱۴۵

اوقات بسر کرنے لگا۔ ص۱۴۹

اور کچھ ہدایا بادشاہ کو روانہ کیا۔ ص۲۱۱

لاکھ غلام حلقہ بگوش ہے۔ ص۲۰۰

تمام قلمرو، نقد و جنس، اشیائے بحری و بری اِن کے
تحتِ حکومت، قبضۂ تصرف میں آیا۔ ص۲۱۳

ضعف و نقاہت زنجیرِ پا تھا۔ ص۲۰۴

انعام ہر اقسام کا۔ ص۲۴۲

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں۔ ص۲۱۳

اور چند وصیت کیں۔ ص۲۹۲

کہاں زبان و دست کا یارا جو شمہ لکھنا۔ ص۱۴

لبِ معشوق موزوں سے، یعنی ہم پہلو۔ ص۱۴

تیرِ دعا ہدفِ اجابت سے لبِ معشوق ہوا۔ ص۱۵۵

رنڈیاں (بمعنی طوائف)۔ ص۱۴

طائفہ (رنڈیاں)۔ ص۱۳۵

رنڈی (عورت)۔ ص۸، ص۴۳، ص۹۶، ص۵۵ (وغیرہ)

اور گی۔ ص۱۵

باہر بندہ۔ ص۱۵

دستار جوان۔ ص۱۶

جو چیز ایک دن روبرو آئی تو دوسرے دن تکرار

نہ ہونے پائی۔ ص۱۶

ٹمٹا سا (حقیر سا)۔ ص۱۶

سیکڑوں داؤں منجھے گئے۔ ص۱۶

وہاں بھی ایک چوک لگا رہتا ہے۔ ص۱۷

نہ چولھے آگ، نہ گھڑے میں پانی۔ ص۱۸

دلی کی آبادی ویران تھی۔ ص۱۸

جلسہ۔ ص۱۸

صحبتِ مشاعرہ .... معین ہے۔ ص۱۸

لوگ اُن سے، وہ لوگوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ ص۱۸

مشیر چاہیے۔ ص۱۸

ہر چند سب لوگ یہاں کے قہر ہیں، پر یہ بزرگوار زینتِ شہر ہیں ص۱۹

کھپ کر جل مرتے ہیں۔ ص۱۹

ہاتھی پالکی کو جلو میں پھرایا۔ ص۲۰

مطبع ... اکثر سنگ کے ہیں۔ ص۲۲

ذریں والا۔ ص۲۴

انتہا کی کد کی (بہت کوشش کی)۔ ص۲۴

بڑی جد و کد سے اُترا۔ ص

شعر اُن کے واسطے، وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں۔ ص۲۵

جہاں لفظ استاد ہو، وہ آپ کا شعر سمجھو۔ ص۲۶

وہ شخص باہم نہیں دیکھ سکتا۔ ص۲۷

نقشے کے طور پر زبانِ اُردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظورِ نظرِ اہلِ بصر ہو۔ ص۲۸

ثقت سے صاف ہو (مشکل لفظ نہ ہوں)۔ ص۲۸

رنگینیٔ عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں ص۲۸

یہ بستی ویران، پوچ و لچر ہے۔ ص۲۹

چھوٹی اُمت۔ ص۲۹

حار و بارد زمانہ دیدہ، تجربہ رسیدہ۔ ص۲۹

ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں۔ ص۲۹

اپنے منہ سے دھتا بائی۔ ص۳۰

خاطر خطیر۔ ص۳۰

عاصی دعائے خیر سے یاد ہو۔ ص۳۰

اور جو کلمہ سہلِ ممتنع، محاورے کا تھا۔ ص۳۱

مکان نازک، پایدار۔ ص۳۳

آنکھ چرانے سے ہم چشم چشمک کرتے تھے۔ ص۳۳

امیروں کا چور محل نہ ہونے پاتا تھا۔ ص۳۳

شرابِ عشق کے نشے سے چکنا چور۔ ص۳۴

نشۂ شباب سے چکنا چور ہے۔ ص۷۷

بڑھاپے کے دن ہیں۔ ص۳۴

بادشاہ کو نہ ملول ہوا۔ ص۳۶

چند عرصے میں۔ ص۳۶، ص۲۸۶

اُس شہر کا چندے سے یہ دستور تھا۔ ص۲۸۴

بسانِ یوسف و یعقوب۔ ص۳۷

چودھواں برس بھر گیا۔ ص۳۷

شادی کی تجویز ہوئی .... ایک شہزادی ... دور مانِ والا سے مقرر ہوئی (منتخب ہوئی)۔ ص۳۷

مقرر (لازماً)۔ ص۸۴

اور لباس مکلف سے جسم آراستہ، زیورِ پُرتکلف سے پیراستہ ہو۔ ص۳۹

بحرِ عجب و نخوت میں آشنا ہوئی۔ ص۳۹

کوئی بولی، خدا جانتا ہے، دیدہ ہو نہ شنیدہ ہو۔ صـ۴۰
حسن کا جھگڑا۔ صـ۴۰
یہاں تو یہ حیص بیص تھی۔ صـ۴۱
بحث رہی ہے (بحث کر رہی ہے)۔ صـ۴۱
روکھی صورت بنائی۔ صـ۴۲
وہ اور مجوز ہوئی (اصرار کیا)۔ صـ۴۲
شہزادی صاحب۔ صـ۴۲
آتو جی صاحب۔ صـ۱۳۴
مجھے سچ نہ بلوائیے۔ صـ۴۲
اس سے بچنا نیک ہے (اچھا ہے)۔ صـ۴۳
برس دن کی راہ۔ صـ۴۳
خوب حالی ہوا۔ صـ۴۴
بڑھا جن سر چڑھا۔ صـ۴۴
سوا (زیادہ)۔ صـ۴۵، صـ۵۵، صـ۲۲۸
بہ مجرد ارشاد (حکم دیتے ہی)۔ صـ۵۱
بہ مجرد نگاہ (دیکھتے ہی)۔ صـ۵۶
بہ مجرد زبان۔ صـ۳۴۲
توے۔ صـ۴۹
جستہ جستہ... قدرداں ہیں۔ صـ۴۹
دل، بر سے نکل بھاگا۔ صـ۴۹
گھر بیچ۔ صـ۴۹
شہزادے کو مرگ کا مستعد کیا۔ صـ۵۰
اتنی جلدی موقوف کیجیے (اتنی جلدی نہ کیجیے)۔ صـ۵۱
تا عزیمِ سفر ہو (تاکہ.....)۔ صـ۵۱
تا تسکین ہو۔ صـ۶۵

تا ملازمت حاصل کرے۔ صـ۵۱
تا اس کی شراکت سے۔ صـ۵۱
آخر شب۔ صـ۵۱ (متعدد جگہ آیا ہے)
ظلمتِ شب بہ نورِ روز منور ہوئی۔ صـ۵۱
جن کی جھپٹ نسیمِ تند رو کو کھنڈل ڈالے۔ صـ۵۱
بعد طیِ منازل۔ صـ۵۳
بیہودہ کیوں قدم دھرتا ہے۔ صـ۵۳
مجبور (بہ معنی مجبوراً)۔ صـ۵۳، صـ۱۸۳، صـ۳۰۳
اے کس بے کساں۔ صـ۵۴
جہاں بوئے عمارات نہیں آتی۔ صـ۵۵
دو گام قدم نہ چلتے تھے۔ صـ۵۶
ملتبس۔ صـ۵۸
عمارتِ مفصل (وسیع عمارت)۔ صـ۵۹
باغبانیاں۔ صـ۵۹، صـ۸۸، صـ۱۴۴، صـ۱۴۹، صـ۱۸۹
باغبانیاں الست۔ صـ۵۷
تابیں گرگ کو کباب کی۔ (تعقید) صـ۶۰
تو نے اُن دو بھائیوں کا، جو توام پیدا ہوئے تھے، ان کا قصہ بتا نہیں۔ (تعقید) صـ۳۲۶
زاغ و زغن کو، گوشت کی بوٹیاں اُڑا کر، کھلا دو۔ (تعقید) صـ۳۴۲
شکاری کتوں کو، لہو اس میں بہا کر، چٹا دو۔ (تعقید) صـ۳۴۳
بریز بریز کہتا۔ صـ۱۲
جامِ لب ریز بریز بریز کہتا۔ صـ۹۱
ہزار انگریز بریز بریز کرتے اُس پر شیفتہ... تھے۔ صـ۱۵۶

وہ دورۂ بے سرانجام .... گردش میں آیا۔ ص۶۱

گردش میں دورِ شرابِ ناب آیا۔ ص۳۲۸

بدرُخی (عورت کے لیے)۔ ص۶۱

ایک شخص کا نام خراب کر کے (بدنام کر کے)۔ ص۶۳

زر نگار جانا کیا پشم ہے (معمولی بات ہے)۔ ص۶۳

تسلّی دے کہا۔ ص۶۴

یہ خیال کر، ساحرہ سے کہا۔ ص۶۴

اس پہ دم کر پھونک دے۔ ص۶۵

اِلّا حیلہ شرط ہے۔ ص۶۳

اِلّا ہماری نادانی تھی۔ ص۱۹۵

چُرط مرانی۔ ص۶۴

جو دم تیری صورت پُرکدورت .... نہ دیکھیے، غنیمت
ہے۔ ص۶۵

وڈوں (بہ معنی اُس طرح)۔ ص۶۶

افیون کا چرچا ہو جاتا ہے۔ ص۱۸

اکل و شُرب کا چرچا مچا۔ ص۶۶

چرچا مچایا۔ ص۱۵۶

چرچا مچا۔ ص۲۲۳

برخاستہ خاطر (بددل)۔ ص۶۷

بند ہوئی (خاموش ہوئی)۔ ص۶۷

نقشِ سلیمانی، جو بزرگوں کی امانت اور نشانی تھی...
اس کے بازو پہ باندھا۔ ص۶۷

بادِ مخالف کا گزر محال ہے۔ ص۶۷

یہ سانحہ اُس میں دیکھ کے، قریب تھا شہزادے کو
شادیِ مرگ ہو۔ (اپنے مطلب کی تحریر کتاب میں دیکھ کر) ص۶۸

عجب سانحہ تھا (عجیب منظر تھا) ص۱۶۲

وہ سانحہ یاد آیا (واقعہ) ص۲۸۸

ایک عالم یہ سانحہ سُن کے حیرت کا مبتلا ہو گیا۔ ص۳۴۲

ہستی سے فانی ہو گئے۔ ص۶۹

قضیۂ اتفاقیہ۔ ص۶۹

چند روز میں پھر اُسی حوض پہ وارد ہوا۔ ص۷۰

پاؤں اُٹھانا کالے کوس ہوا۔ ص۷۰

حکایتِ شکایت بیر۔ ص۷۰

ملاقات ہوئی۔ ص۷۲

خبرِ بدسنانی نہ تھی۔ آفت ... لاتی نہ تھی۔ ص۱۱۱

بات جانی کب گوارا ہے۔ ص۲۴۶

گھانس۔ ص۷۳

قدرتِ حق مدِّنظر کیجیے (دیکھیے) ص۷۳

مدِّنظر ہوا (وقعت بڑھ گئی) ص۱۹۵

خوش فعلی کی سیر، کلیل میں وحش و طیر۔ ص۷۳

پہاڑ کی ڈانگ۔ ص۷۳

کبھی نمود ہونا ماہ کا۔ ص۷۴

دھوکا پا چکا تھا۔ ص۷۵

بندوقِ چقماقی خاص لندن کی۔ ص۷۵

ہوش خطا ہوتے ہیں۔ ص۷۵

دل کی دست بُردی کو۔ ص۷۵

دست بُردی، ہاتھا پائی تھی۔ ص۱۴۷

انکارِ دست بُردی۔ ص۲۸۵

حضرتِ عشق کی مدد ہوئی (مدد ملی)۔ ص۷۹

تیور پہ مَیل نہ آیا۔ ص۸۰

یہاں آفت زدے آتے ہیں۔ ص۳

چہل کبنچی کا کٹورا۔ ص۳

چہل منبری۔ ص۲۴۳

مشکل کشا کا گھڑا دونا۔ ص۲۴۸

ملکہ کو بیچ میں گھیرو۔ ص۵

کڑا نقرہ زبان پر آیا۔ ص۸۱

امرائیت کو کام نہ فرماؤ۔ ص۸۲

مقرر (لازماً)۔ ص۸۲

میری ہم صحبتی کر یہ جانتا ہے۔ ص۸۳

خاک نشینوں کی ہم بستری اختیار کرو (ہم نشینی)۔ ص۸۳

خواصوں نے بہت بھیانک ہو کے کہا۔ ص۸۴

تجھے اپنے دیدوں کی قسم۔ ص۸۴

ہر کلمہ ناوک کا تیر ہے۔ ص۸۴

دبکاؤ (رعب میں لاؤ)۔ ص۸۵

مہمانی ہم پر واجب ہوئی۔ ص۸۵

جادۂ اعتدال سے زبان کو باہر گام فرسا نہ فرماؤ۔ ص۸۵

انجام کار سوچنا سراسر خلاف ہے۔ ص۸۶

ذو معنی۔ ص۸۶

نوک چوک۔ ص۸۶

دم تسطیر ص۸۷

کسی ضابطہ، اپنے ولولے میں خود غلط۔ ص۸۸

زنخ گل عذاروں کی کیفیت۔ ص۸۸

ملک بیگانے میں بادشاہت کروں۔ ص۱۱۴

اپنے زمرۂ کنیزوں میں۔ ص۱۹۰

تنبیہ غافلوں کو۔ ص۲۲۹

گلاس شراب سے بھر کر... دیا کہا اسے آشن
کر دیجیے۔ ص۹۰

تنہائی خوش آتی ہے۔ ص۱۰۳

پر (بہ معنی لیکن)۔ ص۱۰۳، ص۱۹

طبیعت نفرت کھاتی ہے۔ ص۱۰۳

دل کی تمنا ہے کہ بے قراری کرے۔ ص۱۰۲

ایک کھیلی کھائی، عشق کے نیرنگ دیکھی، وصل کے ہجر
میں صدمے اٹھائی، قریب آئی۔ ص۱۰۳

چھاؤنی کے طور پر لیتیں ہیں۔ ص۱۰۹

راک پیچھے (بگڑیاں)۔ ص۱۰۶

چھولداریاں۔ ص۱۰۷

ہوش برجا نہ آتا تھا۔ ص۱۰۸

نہایت متوجہ ہو کر پوچھا۔ ص۱۰۹

موجد آبادی۔ ص۱۱۰

معرکہ اٹکا تھا۔ ص۱۱۴

شیشۂ عصمت سنگ ہوا و ہوس سے سالم رہا (جہانِ عالم
اپنے لیے کہتا ہے)۔ ص۱۱۶

بے قراریاں ستاتیں۔ ص۱۱۸

چشم مشتاقاں میں نور طور... تجلی کر گیا۔ ص۱۱۸

دگر۔ ص۱۱۹

آنکھ کی پتلی اتنا جلد نہ پھرتی تھی۔ ص۱۲۱

بہ درجہ ہیبت تھی (زاس قدر)۔ ص۱۲۲

بہ مرتبہ ڈرتا ہوں۔ ص۲۱۵

بہ درجہ ظلم پیشہ نکلا (بہت)۔ ص۲۱۷

وہ تو بہ درجہ حسین تھی۔ ص۲۳۱

میں تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا، نہ معشوقوں کے دفتر
میں آپ کا چہرہ لکھوں گا۔ ص۱۲۵
آپ کو خالق نے بادشاہ کیا ہے، انصاف کو ہاتھ سے
نہ دیجے۔ ص۱۲۶
ہنسی میں رو دیا۔ ص۱۲۶
بناوٹ سے ہنس دیا۔ ص۱۲۶
کسی نے چھینکا تھا۔ ص۱۹۸
جانِ عالم نے .... رو دیا۔ ص۲۶۸
بادشاہ نے رو دیا۔ ص۳۰۳
دونوں نے رو دیا۔ ص۳۱۷
جانِ عالم نے یہ سخن کر رو دیا۔ ص۳۳۸
گزرا، سکے پر نام جاری ہوا۔ ص۲۱۳
رگڑا جھگڑا تختِ طاؤس پر بیٹھا نذریں دیں (اصرار
کرکے)۔ ص۲۱۳
لٹورا۔ ص۲۱۳
قبضۂ تصرف۔ ص۲۱۳
تشکک۔ ص۲۱۴
محل والیوں نے کہرام مچایا (خوشی کے موقعے پر)۔ ص۱۲۸
تم سمجھوں کی۔ ص۱۲۸
تم نے میری چڑ نکالی، اپنی دانست میں دیوانی
بنالی۔ ص۱۲۸
اس قدر زر و جواہر، محتاج فقیروں کو عنایت و امداد
ہوا۔ ص۱۲۹
جانِ عالم نے یہ سخنِ ہوش ربا، کلمۂ حیرت افزا
گوش سُنن۔ ص۳۴۰

انجمنِ بیان میں یہ زمزمہ سنج ہوئے ہیں (یوں)۔ ص۱۳۱
حقوق اور احسان جیسے جانِ عالم کے ہمارے ذمے ہمت
ہیں۔ ص۱۳۱
اِس کے قطعِ نظر۔ ص۱۳۱
مناسب کیا، ضرورت ہے کہ جلد سامانِ شادی درست کر،
منعقد کرو۔ ص۱۳۱
محل داریں۔ ص۱۳۱
خدمت گزاریں۔ ص۱۲۹
وارے اِن باتوں کے۔ ص۱۳۲
اِس کے ورائے۔ ص۲۱۳
سر کھپی اور جان جوکھوں کی۔ ص۱۳۲
جانی (بیٹی کے لیے)۔ ص۱۳۲
بُروں سے اچھوں کی تمیز ہے۔ ص۱۳۳
میری بند چھڑاتا۔ ص۱۳۳
اپنے منہ سے میاں مٹھو۔ ص۱۳۳
شہزادہ ہونے کا سب میں غل مچایا ہے (مشہور
کیا ہے)۔ ص۱۳۳
صاف صاف کہوایا چاہتی ہو۔ ص۱۳۵
محل میں نہاتے بچے۔ ص۱۳۵
تم اُمورات محل میں مستعد رہو، ہم اُس کا سامان
سرانجام کریں۔ ص۱۳۵
بوڑھے بڑے کے روبرو۔ ص۱۳۵
سرکار کا کام بنانا۔ ص۱۳۸
راجا بابو۔ ص۱۳۸
لا بیان۔ ص۱۳۹

بے بیان ۔ ص۱۲۵

روشنی بہ روشن تھی ۔ ص۱۴۰

زنانے ۔ ص۱۴۱

طبلے بھڑ بھڑاتیں ۔ ص۱۴۱

سٹھنیاں ۔ ص۱۴۲

نوبات ۔ ص۱۴۲

ڈومنیوں نے پانمنی گائی، سب کی چھاتی بھر آئی ۔ ص۱۴۲

باختہ حواس ۔ ص۱۴۵

لیکن اِن ڈردل پر چپ بہ رہے ۔ ص۱۴۵

جگت رنگی کے حرف وحکایات ۔ ص۱۴۶

بعد رسم چوتھی چالے کے ۔ ص۱۴۸

وہ وہ درخت پھلے پھولے، جسے دیکھ کر انسان کی
عقل بھولے ۔ ص۱۴۸

نثارانِ دل خون ۔ ص۱۵۰

ایک شخص تھا ... نہایت اہلِ دِدل ۔ ص۱۵۹

متاعِ ہر دیار، تحفۂ جوار جوار ۔ ص۱۵۶

توس ۔ ص۱۵۷

دن دیے (دن دہاڑے) ۔ ص۱۵۷

پسند کیا ۔ ص۱۵۸

مجھ چھٹ (میرے سوا) ۔ ص۸

تنہا چھٹ ۔ ص۲۴۹

بدنامی چھٹ ۔ ص۲۵۱

صاحب بہادر ... صاحب فرایش ہوا ۔ ص۱۵۸

اپنے کس دکو پر نظر کر ۔ ص۱۵۹

جب بارہ برس کا سن ہوا، نشیب و فراز دیکھنے کا

دن ہوا ۔ ص۱۶۰

شہرِ عظیم الشان بہت آباد ۔ ص۱۶۱

میں نے اس کو تیر مارا ۔ ۱

تجھ کو اس آفت سے نجات ہوں ۔ ص۱۹۳

تین دن کو مجھے سلطنت کرنی ہے ۔ ص۲۰۸

میری عورت کو درد زہ ہو رہا ہے ۔ ص۲۱۰

دھوپ کھانے کو باہر نہ آتے ۔ ص۲۲۶

اگر اپنے حال کو سوچے ۔ ص۲۳۳

خط پوشیدہ جوان کو حوالے کیا ۔ ص۲۸۹

تاج وتخت بیٹے کو حوالے کیا ۔ ۲۴۱

اور یہ صحبت ہے (یہ خیال ہے) ۔ ص۱۶۲

بہت تردد سے (تلاش سے) ۔ ۱۶۲

کلمات شکریہ اُس سے کرنے لگا ۔ ۱۶۱

یہ مقدمہ اُس پر حالی کیا ۔ ص۱۶۶

زمین یہاں کی زرریز ۔ ص۱۶۷

مجبور ہوجائے گی، بہت پچھتائے گا ۔ ص۱۶۷

گھوڑا پچھکارا ۔ ص۱۷۰

جنازہ درست کر ۔ ص۱۷۲

جلوسِ سواری ۔ ص۱۷۷

پرے پرے ۔ ص۱۷۸

روشنی نمود ہوئی ۔ ص۱۷۸

پائتین سٹین سجی سجائیں ۔ ص۱۷۹

لمبیاں بھرتے ۔ ص۱۸۰

گلڈ اٹیک ۔ ص۱۸۱

لالٹین ۔ ص۱۸۱

رَفل۔ ص۱۸۲

چوپڑ کا بازار پڑا۔ ص۱۸۶

دو دو نوکیں ہو گئیں۔ ص۱۹۰

خواہ نخواہ۔ ص۱۹۱

جھونٹک جھانٹا۔ ص۱۹۱

حرفِ رخصت ... درمیان آیا۔ ص۱۹۲

دشمنِ مادر زاد۔ ص۱۹۳

نقارہ نواز نے ڈنکے پر چوب دی۔ ص۱۹۳

اِس وضعی حرکت سے بہت رضامند ہوا (خوش ہوا) ص۱۹۵

دابِ سلطنت۔ ص۱۹۵

اپنے کا اعتبار نہ مانے۔ ص۱۹۵

اتنا نہ قیاس کیا (یہ نہیں خیال کیا)۔ ص۱۹۵

خاطر کی نہ لیجیے (طرف داری نہ کیجیے)۔ ص۱۹۵

اِس وقت ظلم کا حادثہ ہوا (بڑا حادثہ)۔ ص۱۹۸

آج کی حرکتیں شہزادے کی غور کرو۔ ص۱۹۸

ہمیں روزِ اول ... شک آیا تھا۔ ص۲۰۰

ملکہ کے ڈر سے وہ ... بھی خوف ناک (خوف زدہ)۔ ص۲۰۱

دل میں سوچا۔ ص۲۰۳

بتدر سوچا۔ ص۲۰۶

وہ غدار حیلہ سوچا۔ ص۲۱۰

بادشاہ دل میں سوچا۔ ص۲۰۸

گردن مارا جائے گا۔ ص۱۳۷

اب صبح کو جب ہم گردن مارے جائیں گے۔ ص۲۰۷

وہ لٹورا گردن مارا جائے گا۔ ص۲۱۳

خونِ بے گناہ کی جزا (سزا کے معنی میں)۔ ص۲۰۷

لاچار۔ ص۲۱۱

ڈھبڈھبانا۔ ص۲۱۲

دریا میں در آیا۔ نصف پانی بہ صد گرانی طے کیا تھا، کنارے کا لڑکا بھیڑیا اٹھانے چلا۔ ص۲۱۲

پَرَہیں۔ ص۲۱۳

نالہ و فریاد مچاتے تھے۔ ص۲۱۳

نہ تقاضائے سن سے لڑکوں نے باپ جانا اور نہ یہ سمجھ آئی کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ ص۲۱۴

تھوڑے دن میں۔ ص۲۱۴

بچشمِ انصاف و نظرِ غور سے دیکھے۔ ص۲۶

یہاں کے پہلے بادشاہ سے رسائی رکھتا تھا۔ ص۲۱۵

بادشاہ سے اطلاع کروں گا۔ ص۲۲۱

گرد نے تیرے حال سے خبر دی تھی۔ ص۲۴۵

بادشاہِ تازہ (نیا بادشاہ)۔ ص۲۱۵

تحفہ تحفہ تحائف لے کے۔ ص۲۱۵

جو احتیاج ہو، اِس کے جلدو میں لو۔ ص۲۲۱

اَدھرسا۔ ص۲۲۵

تنبیہِ غافلوں کو۔ ص۲۲۹

قلق جی پر لیا۔ ص۲۳۰

گاہ دھونی رمائی گنشت و دیر کی۔ ص۲۳۰

مانعِ ملتِ صنم؛ حظِ نفس کا دشمن تھا (بہ معنی ملاقات)۔ ص۲۳۰

مفسدے۔ ص۲۳۱

پافتادہ کی مددگاری کرے۔ ص۲۳۱

تیرھویں صدی ہے، نیکی کا بدلا بدی ہے۔ ص۲۳۶

ایک بکری کا بچہ ... ہمیں بھیج دو۔ ص ۲۴۹

مجھ پر جو مشکل ہے (میرے لیے)۔ ص ۲۵۰

آڑ واڑ۔ ص ۲۵۳

کھونبڑ۔ ص ۲۵۴

ڈھل گنڑوں کا عجب ڈول ہوا۔ ص ۲۵۸

صنف کی صف دھر دھکی۔ ص ۲۶۱

خوب لوہا برسا۔ ص ۲۶۱

زندگی سے دل سیراب اور اچاٹ تھا۔ ص ۲۶۲

ذرہ نہ چھوٹا (ذرا نہ چھوٹا)۔ ص ۲۶۲

گوشت کے پچے۔ ص ۲۶۳

فصل کے دن (جدائی کے دن)۔ ص ۲۷۵

آنکھ لیس۔ ص ۲۱۹

شب گزری، روز ہوا۔ ص ۲۸۰

اگر اپنے شہر چل کر یہ امر کریں گے۔ ص ۲۸۰

ان کی رائی دہائی نزدیک و دور ہوگئی۔ ص ۲۸۱

دہائی پھر گئی (اعلان کر دیا گیا)۔ ص ۲۸۳

عجب کی جا ہے۔ ص ۲۸۸

ان روزوں (ان دنوں)۔ ص ۲۸۸

آج تک ایسے غرق ہوئے ابھرتے نہیں۔ ص ۳۰۴

حکومت نہ کرو (جبر نہ کرو)۔ ص ۳۰۴

اونچا ٹیکرا تجویز کر، خیمہ بنا گیا۔ ص ۳۱۰

تازہ حال یہ دیکھا ہے (نئی بات)۔ ص ۳۱۳

من مانتے بدلے۔ ص ۳۱۴

خیام ذوی الاحترام استادہ ہوئے۔ ص ۳۲۶

غم ناک حکایت، اندوہ کے بین۔ ص ۳۲۷

ملائم لوگوں کے جو ان جم گئے تھے۔ ص ۳۲۸

زمانہ دیر یاز تک۔ ص ۳۲۸

نشہ اس کیفیت سے حرام ہے (اس لیے)۔ ص ۳۲۹

شیطان نے ورغلانا (ورغلایا)۔ ص ۳۳۱

اس امر بد سے از حد انکار کریں گے۔ ص ۳۳۱

جنگل میں ایک ویرانی رہتا تھا۔ ص ۳۳۲

قرض دار ہے، ادا کی طاقت نہیں۔ ص ۳۳۲

جی بھر بھر آیا۔ ص ۳۳۳

دو کلمے پیوستہ۔ ص ۳۳۳

حالت نشے میں جھٹک مارا۔ ص ۳۳۵

مشتاقوں کا دل الم رسیدہ شاد کیا۔ ص ۳۳۹

محل میں محشر کا قیام ہوا۔ ص ۳۳۹

جس طرح جان عالم کے مطلب ملے۔ ص ۳۴۳

خجستہ افعال، اکمل ہر کمال۔ ص ۳۴۳

ضمیمہ ۷

اختلافِ نسخ

ص ۱: ۱؎ ح، ض، ف، ل، د، ن: علی۔ ۲؎ د: تختۂ دنیا۔ ۳؎ ک میں "و" موجود نہیں۔ ۴؎ ک، د: یہ خدا فریفتگی کا۔ ۵؎ د میں "نالہ" موجود نہیں۔ ۶؎ ک، د: زبان اس بیان میں لال ہے۔

ص ۲: ۱؎ ح، م، ض، ف، ن، د: نعت سرور کائنات محبوب خدا برگزیدہ انبیا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ۲؎ ح: مبداء۔ ک، م: مبدأ۔ ف، ل، ن، د، ض: مبدأ۔ ۳؎ د: کیا کیا مرتبہ رفیع وبلند پائے۔ ۴؎ د: کور باطن کو۔ ۵؎ ح، م، ض، ف، د، ن میں "وہم باطل" موجود نہیں۔ ک: فہم ناقص کی کجی زعم باطل وہم فاسد نے۔ ۶؎ ح، م، ض، ف: روز سیہ۔ ن: دور سیہ۔ ۷؎ د، ن: یہ حکم آیا ہے۔ ۸؎ د میں "تو" نہیں۔ ۹؎ ح، م، ض، ف: کسی اور نے بھی یہ رتبہ پایا ہے۔ د: کسی اور نے ایسا رتبہ رفیع پایا ہے۔ ن: اور کسی نے بھی یہ رتبہ پایا ہے۔ ۱۰؎ ک: سر حلقۂ اولین باعث نمود آخرین خاتم المرسلین مظہر صنعت کریم احمد بے میم شفیع روز جزا۔ ح، م، ض، ف: سر حلقہ اولین خاتم المرسلین صفت کریم احمد بے میم محمد مصطفی۔ ن: سر حلقہ اولین خاتم المرسلین مظہر صنعت کریم احمد بے میم محمد مصطفی۔ ۱۱؎ د: صفت کریم احمد بے میم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم لا اعلم بیش از ہمہ...۔ ۱۲؎ ک: روز جزا۔ ۱۳؎ ح، ض: اصحاب۔ ۱۴؎ ک میں "وسلم" نہیں۔ ۱۵؎ ک: کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے رباعی۔ ۱۶؎ ن: ان کی۔ ۱۷؎ ح: لا اعلم۔ ۱۸؎ ن: فہم وادراک۔

ص ۳: ۱؎ د: یہی۔ ۲؎ ک: کہ۔ ۳؎ ک: کہ ولا اور محبت ان کی ایمان کی دلالت ہے بر حدیث فریقین میں ہے مثل اہل بیتی....۔ ۴؎ ح، ض، م: دلالت ہے۔ ۵؎ ح، ض، م: ہر فرد بشر کو بہ این حدیث واجب مثل اہل بیتی.....۔ د میں یہ مقام کرم خوردہ ہے، صرف آخری لفظ "بہ این حدیث واجب مثل اہل بیتی....." پڑھنے میں آتے ہیں۔ ۶؎ ل کے علاوہ اور کسی نسخے میں لفظ "حدیث" موجود نہیں۔ ۷؎ ح، م، ض، ف، ن: مذکور شاہ غیور قباد شوکت نوشیرواں معدلت غازی الدین حیدر بادشاہ غازی وارث دودمان سعادت۔ ک: زمزمہ پردازی عندلیب خامہ نغمہ سرائی گلشن حال سلطان ابو المظفر شاہ زمن میں ـــــــ د میں عنوان کی کوئی عبارت موجود نہیں۔ ۸؎ "پس از حمد... اولی الامر منکم" یہ پوری عبارت ک میں موجود نہیں۔ ۹؎ ح، م، ض: ضرور ہے۔ ۱۰؎ ح، م، ض، ف: اگرچہ صفت شاہ زبان گدا کا بیان کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر نام نامی.....۔ ن: اگرچہ صفت شاہ زبان گدا کو بیان کرنا چھوٹا منہ.....۔ د: اگرچہ صفت شاہ زبان گدا کا بیان کرنا

چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر نام نامی...... ۱۱؎ د: شاہان نامدار۔ ۱۲؎ ک: خسرو اقتدار۔

۱۳؎ د: ابو المظفر مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل محمد امجد علی شاہ پادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و اید اللہ بالنصر والظفر جل جلالہ۔ اگر معرکۂ رزم......

ص ۴: ۱؎ ح، م: اید اللہ۔ ۲؎ ک: صفحۂ دہر پر۔ د: صفحۂ روزگار ورق لیل و نہار پر نہ لکھ سکوں۔ ۳؎ د میں "لرزاں" موجود نہیں۔ ۴؎ ک: سخا و عطا ہے۔ ۵؎ د، ن: زہرہ و مشتری۔ ۶؎ د میں "و" موجود نہیں۔ ۷؎ ک، د: یہ ایک ادنی عنایت کا ذکر ہے۔ ۸؎ ک: شعر۔ د میں یہاں چیپی لگی ہوئی ہے۔ ۹؎ ص، ک، ف، ن، ل: دوشالہا۔ ۱۰؎ د میں اس سے پہلے (یعنی "شعر" کے بعد) یہ عبارت بھی ہے: قائم اللیل صائم النہار عابد شب زندہ دار اکل حلال کا ہر دم خیال ہے دنیا کو خواب پریشان سمجھ مد نظر مآل ہے۔ ۱۱؎ ح، م، ص: روز شب۔

۱۲؎ د: شہر میں سائل کا نام نہیں ہے عبادت راحت و آرام نہیں (اس کے بعد ایک لفظ کے بقدر جگہ کرم خوردہ ہے) ہزار روپیا ایک دن حوالے کر دیا مجتہد کو سونا حرام ہے چاندی سے گھر بھر دیا عدل مزاج میں ایسا ہے کہ کسی اور کا اعتبار نہ کیا مجتہد کو عدالت کا مختار کر دیا رعب عدل سے سب خوش و خرم جیتے ہیں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں باز تیز پرواز بچۂ کنجشک کا نگہبان ہے بلی کی جبلی یہ کہ کبوتر سے ہراساں ہے دود دل اندوہناک ..... ۱۳؎ "رہتا ہے" ح، م، ص، ف، ن میں نہیں۔ ۱۴؎ "بکر ... بہتا ہے" یہ عبارت ح، م، ص، ک، ف، ن میں موجود نہیں۔ ۱۵؎ ک: عدل یہ ہے کہ۔ ۱۶؎ ک: اس کے عہد میں۔ ۱۷؎ "ہے" ل کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ ۱۸؎ ح، م، ص، ف، ن: دودھ۔ ۱۹؎ ک: کنار شفقت میں۔ ۲۰؎ ح، م، ک: بلی کی جبلی یہ کہ۔ ۲۱؎ م، ح: ہر خانے سے۔ ۲۲؎ ح، م، ص میں "تعالی" نہیں۔ ۲۳؎ یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں "اوس" ہے، اسی لیے الف پر پیش لگایا گیا ہے۔ ۲۴؎ د: ایسے امیدگاہ عالم کو اپنے حفظ و اماں میں سلامت رکھے دور اُس کا تا قیامت رکھے۔

ص ۵: ۱؎ ک: اس صاحب افسر والا جاہ کے ——— د: اس صاحب سریر والا جاہ کے۔ ۲؎ م: بحق ذوالمنن۔ ۳؎ ک: و بتصدق پنجتن۔ ۴؎ ح، م، ص، ف: بیان مولف درباره لکھنؤ و ذکر صنعت مردمان خجستہ رو و تذکرہ ہر صاحب علم و کمال علی قدر حال و نمونۂ مکانات این شہر ——— د: بیان مولف دربارۂ لکھنؤ و ذکر صفت مردمان خجستہ و تذکرہ ہر صاحب علم و کمال علی قدر حال و نمونہ مکانات این شہر ——— ل میں بھی یہ عبارت اسی طرح ہے، مگر لفظ "رو" اور "این" اُس میں موجود نہیں ——— ک: تقریر مورخ دل پذیر کیفیت شہر اور ندی کمال بے مثال ہر علم و فن کے کچھ اہل حرفہ دکان دار یادگار۔ ۵؎ ک: ہیچ میرز۔ ۶؎ ح، م، ص، ف:

مقلد گزشتگاں رجب علی بیگ تخلص سرور۔ (ض کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اس میں "گذشتگاں" کا نصفِ اوّل پڑھنے میں آتا ہے، باقی حصّہ کرم خوردہ ہے۔ اِس کا امکان ہے کہ "گذشتگاں" کے بعد یہاں کوئی اور لفظ بھی ہو) ——— ن: مقلد گذشتگاں سراپا قصور رجب علی بیگ تخلص سرور۔ [۷] ک: متوطن خطہ دل پذیر بے نظیر۔ [۸] د: گلشن جہاں۔ [۹] ک: یہاں کے باشندے ذکی عقل کے تیز۔ [۱۰] م: فہم (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ [۱۱] ک: اگر نظر انصاف و دیدہ غور سے۔ [۱۲] د: دیکھیے۔ [۱۳] ح، م، ض، د، ن میں "ہر بار یہ کہے" موجود نہیں، اِس کی جگہ "آنکھ بند کرلے" ہے (یعنی: جہان کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کرلے)۔ [۱۴] ک: مولف۔ م: بیت۔ [۱۵] ح، م، ض، ف، د، ن: ہر گلی کوچہ دل چسپ باغ و بہار ہے۔ [۱۶] ح، م، ض، د: ہر شخص اپنے طور پر قطع دار ہے ——— ن: ہر شخص اپنے طور پر با وضع قطع دار ہے۔ [۱۷] ح، م، ض، د، ن: ہر چند۔

ص ۶: [۱] د میں "کہ" نہیں۔ [۲] ح، م، د، ض، ن میں "بلکہ" موجود نہیں۔ [۳] ک: جی۔ [۴] "مست ہو جائے... اونگھے" یہ عبارت ح، م، ض، ف، د، ن میں موجود نہیں۔ [۵] ک: مست ہو جائے اونگھے۔ [۶] ح، م، ض، ک، ف، د: ذرہ۔ [۷] ح، م، ض، ف، ن: دیکھے سے۔ [۸] م، د: جھنکار۔ [۹] ح، م، ض، ف، د، ن: مرغ و ماہی کا دل سیخ آہ پر حسرتِ محرومی سے کباب (اِس فرق کے ساتھ کہ ح اور ض میں "مرغ ماہی" ہے)۔ [۱۰] ک میں "میاں" نہیں۔ [۱۱] ح، م، ض، ف، د: دکان کا کنزا با ضم باریک نایاب۔ [۱۲] د: عجب۔ [۱۳] ک: جس کی۔ [۱۴] ح، م، ض، ف، د: پپڑی دبیز لبس بسائی ہونٹ سے کھائی دانت کا... ——— ن: پپڑی دبیز لبسی بسائی لذیذ ہونٹ سے.... [۱۵] ک: کنجڑن۔ [۱۶] ک: کہ آدمی۔ [۱۷] ح، م، ض، ف، د، ن: کبھی کوئی پکار اٹھی میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی مزہ انگور کا.... (ح میں اِس عبارت میں "فقر" ہے، مگر صاف طور پر یہ غلطیِ کتابت ہے)۔ [۱۸] ک: بیٹھے بیٹھے۔

ص ۷: [۱] ک: جھپک۔ [۲] د: آئی (بہ ظاہر غلطیِ کتابت)۔ [۳] ک: چبا چبا کر بولی ٹھولی میں۔ [۴] "کیا خوب... کھولی ہے" یہ ٹکڑا ح، م، ض، ف، د، ن میں نہیں۔ [۵] ح، م، ض، ف، د، ن: کتھے چونے سے ادھی میں مکھڑا لال ہے۔ [۶] ک: گجرے پیش تر گھر گھر یہ آواز آتی شیر مال ہے گھی اور دودھ کی کدھر لینے والے ہیں نمش کی قفلیاں کھیر کے پیالے ہیں مفلس کا دل اچاٹ ہے ٹکوں کی چاٹ ہے کیا خوب بکتے..... [۷] د: چھوڑے۔ [۸] د: جو کھائے۔ [۹] ن: زیادہ ہوگا گرمی لقوے فالج میں مرے۔ (صاف ظاہر ہے کہ یہ اختلاف نہیں، محض غلطیِ کتابت ہے کہ "ہوگا" تو "ہوگا" بن گیا اور "کرے" کی شکل بگڑ کر "گرمی" بن گئی)۔ [۱۰] ک: لقوے اور فالج۔ [۱۱] ذ میں "ہمیشہ" نہیں۔ [۱۲] "کھوئے نے ہوش کھوئے وہ اُس کا" یہ عبارت ح، م، ض، ف، د، ن میں موجود نہیں۔ (یعنی اِن نسخوں میں یہاں عبارت یوں ہے: برفی کی نفاست

بو باس در درا پن لفری ورق کا جوبن)۔ ۱۳؎ "جب تک جلتا رہے" یہ ٹکڑا ح، م، ض، ف، د، ل میں موجود نہیں۔ ۱۴؎ ک: کاٹ کاٹ کھائیے۔ ۱۵؎ ض، ک: پیچ و تاب۔ ۱۶؎ ح، م، ض، ف، د، ن: یا قوتی مفرح کا مزا۔ ۱۷؎ ک: یہ ہے کہ۔

ص ۸: ۱؎ "پراچیوں کی گلی .... ہم خرما ہم ثواب" یہ پوری عبارت ح، م، د میں موجود نہیں ــــ ک: پرلیچیوں کی۔ ۲؎ ض: پشکی۔ ۳؎ "بہتر از انگور" یہ ٹکڑا ک میں موجود نہیں۔ ۴؎ ح، م، د: بالائی جس دکان پر نظر آئی بے قند و شکر شکر کر کر چھری سے کاٹ کر کھائی ــــ ض، ن: بالائی نورا کی دکان پر جب نظر آئی بے قند و شکر شکر کر نور علی نور کہہ کر چھری سے کاٹ کر کھائی ــــ ف: نورا کی دکان کی بالائی جب نظر آئی بے قند و شکر شکر کر نور علی نور کہہ کر چھری سے کاٹ کر کھائی۔ ۵؎ ک: نوراً علیٰ نور۔ ۶؎ "سب کو پسند ہوا" سے لے کر "نقل کو اصل میں ملایا" تک آٹھ سطریں ح، م، د میں موجود نہیں۔ "سب کو پسند ہوا ... دو روپے کو میسر نہ ہوا" یہ عبارت ض، ن، ک میں موجود نہیں۔ ۷؎ "پیسے کا مدار یا ... میسر نہ ہو" یہ عبارت ل کے سوا کسی اور نسخے میں موجود نہیں ــــ (اس عبارت کے سلسلے میں ایک صراحت ضروری ہے: ل میں یہ عبارت اس طرح ہے: پیسے کا مدار یہ کہیں دنیا میں مدنظر نہوا دو روپے کو میسر نہو" (ل ص۵) یعنی پہلے جملے کا آخری لفظ "نہوا" ہے اور دوسرے جملے کا آخری لفظ "نہو" ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک جگہ کتابت کی غلطی ہے۔ قطعی طور پر تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن انداز عبارت پر غور کرنے کے بعد میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ کتابت کی غلطی پہلے جملے میں ہے، یعنی وہاں "نہوا" میں الف زائد لکھ گیا ہے "نہو" ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر دونوں جملوں میں "نہ ہو" لکھا گیا ہے۔) ۸؎ ک: پٹھانا کی دکان کا تماکو۔ ۹؎ "آغا باقر ... خاص و عام ہے" یہ عبارت ل کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ ۱۰؎ "رنگ ریز ... گل کھلایا" یہ عبارت ک اور ل کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ ۱۱؎ "نقل کو اصل میں ملایا" یہ ٹکڑا ل کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ ۱۲؎ ن: یہاں ہر فن کا۔ ۱۳؎ ح، م: ناتراشیدہ۔ ۱۴؎ "زعم باطل میں عیاش" یہ ٹکڑا ح، م، ض، ف، ن، د میں موجود نہیں۔ ک: اپنے زعم میں عیاش۔ ۱۵؎ ح، م، ک: آآ۔ د: آآ (ظاہرا غلطیِ کتابت)۔ ۱۶؎ "گومتی میں ... آدمی ہو گئے" یہ عبارت ح، م، ض، ف، ن، د میں موجود نہیں۔ ک: گومتی میں غوطہ لگایا دل میں مزا سمایا دھبے دھو گئے ابوتراب خاں۔ ۱۷؎ ح، ض، م، ف، ن، د: جب ابوتراب خاں ..... ۱۸؎ ک میں "کسی کی" نہیں۔ ۱۹؎ ح، م، ض، ف، ن، د: بارہ برس کے سن کا گاؤں سے مزا (م: مزہ) آیا چار پہر کھونٹی ٹھٹولی بتانہ پایا۔ ۲۰؎ ل: گڑدن (ظاہرا غلطیِ کتابت)۔

ص ۹: ۱؎ ح، م، ض، د، ن: سید حسین خاں کے دروازے پر ــــ ک: سید حسین خاں کے کٹہرے کا دروازہ ہے وہاں عبداللہ عطر فروش کی دکان جائے نشست ہر وضع دار نوجوان ہے۔ ۲؎ ک: بیلے اور چنبیلی کا تیل یا

حنا کا ریل پیل ـــــــ ح، م، ص، ف، د، ن: بیلے چنبیلی کا تیل ریل پیل۔ ۳ ح، م، ص، ف، د، ن: ہوا۔
۴ ح، م، ص، ف، د، ن: ہوا۔ ۵ ک: پھر عطر کی۔ ۶ ح، م، ص، د: پھر ٹھہرا ـــــ ن: پھر جا بیٹھا۔
۷ ح، م، ص، ف، د، ن: افیون فیض آبادی لالے کی وہ رنگین۔ ۸ ح، م، ص، ف، د، ن میں اس کے
بعد یہ عبارت لکھی ہے: زیادہ پی جانے والوں کو جان کے لالے ہوتے ایسے متوالے ہوتے۔ ۹ "یاقوت
رشک سے ہیرا کھاتا" یہ جملہ ل کے سوا کسی نسخے میں نہیں۔ ۱۰ د، ن: خوانچے۔ ۱۱ ح، م، ص، ف، د،
ن: پستے کی ہوائی چھڑکی ہوئی بہتا چسکی پی ایک دم کے بعد دم حقے کا کھینچا آنکھوں میں سرور موجود ہوا
وہاں سے بڑھا کان میں آواز آئی بیلے کے ہار ہیں ...... ۱۲ ک: نرم ملائم گندہ۔ ۱۳ ک: بیلے کے ہار پُر
بہار ہیں۔ ۱۴ ص میں "چلا" نہیں۔ ۱۵ ح، م، ص میں "یہ" نہیں "یہ بھولا" د میں موجود نہیں۔ ۱۶ م:
بھولا۔ ۱۷ ص، ن: راہ و رسم۔ ۱۸ ح، د: آآ۔ ۱۹ ح، م، ص، ف، د، ن میں "ہیں" موجود نہیں۔ ۲۰ "جمع
پونجی ... کھو گئے ہیں" یہ ٹکڑا ح، م، ص، ف، د، ن میں موجود نہیں۔ ۲۱ ح، م، ص، ف، د: برسات کے
موسم میں شہر کا یہ عالم ہے ـــــ ن: برسات کا اگر موسم ہے شہر کا یہ عالم ہے۔ ۲۲ ح، م، د: ایدھر۔
ک میں "ادھر" موجود نہیں۔

ص ۱۰: ۱ ح، م، ص، ن، د: جابجا بہ گیا۔ ۲ ک: ہو کر رہ گیا۔ ۳ ک: یہن کے۔ ۴ "سلیقہ شرط ہے"
یہ ٹکڑا ح، م، ص، ف، د، ن میں نہیں۔ ۵ ک: کیچڑ کیا مٹی پاتوں میں نہ کھرے۔ ۶ ن: فصلِ بہار
کی صنعت پروردگار کی۔ ۷ ک: چمن کی دید کا۔ د: چمن کا۔ ۸ د میں "کی" موجود نہیں (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔
۹ ک: ادھر بار سنگار کے۔ ۱۰ ک میں "چمن پر" نہیں۔ ۱۱ ح، م، ص: وہ بندہ ہائے خاص۔ ک: بندہ
ہائے خاص کی آموں کے تلے سبک سیری خرام ناز۔ ۱۲ د: سبک رو (ظاہراً غلطیِ کتابت) ح: سُبکروی۔
۱۳ ح، م، ص، ف، ن، د: شاخ سروان کے روبرو نہ اکڑتی۔ ۱۴ د: بیٹھی (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ۱۵ د:
گھاڑی اودی۔ ک، ص، ح، م: گھٹاری اودی۔ ۱۶ ک، ن: سالون (اس صفحے کی پہلی سطر میں بھی ن میں
"سالون" ہے مگر ک میں "ساون" ہے)۔ ۱۷ ک: جب۔ ۱۸ ح، ص، م، ف، د، ن: ہوتا ہے۔ ۱۹
م: کانہیہ پور۔ ۲۰ ح، م، ص، ف، د، ن: دھرے۔ ۲۱ ک: کیا دخل جو جا بیٹھیں کہیں۔

ص ۱۱: ۱ ح، م، ص، ف، د: ان کے حق میں برسات حوالات گھر جیل خانہ (م: جیلخانہ) کہیں جانا نہ آنا۔
ن: ان کے حق میں برسات حوالات گھر جیل خانہ کہیں آنا نہ جانا۔ ۲ ک: اور گھر۔ ۳ ک: نہ کہیں جانا نہ آنا۔
۴ ک: اٹھے۔ ۵ ک: جوتی۔ ۶ ک میں "اور" نہیں۔ ۷ د: خاص بازار شہر کہ وسیع و خوش قطع ہے۔ ۸
ک میں "و" نہیں۔ ۹ ح، م، ص، ف: خوش قطعہ۔ ۱۰ ن، ف: نہ کھینچا۔ ک: نہ کھچا۔ ۱۱ ک میں "و" نہیں۔

۱۲ ک : شاہ منزل اور استری متجن نشاط افزا توبہ شکن۔ ۱۳ ک : دیکھ کے سکتہ ہو جاتا ہے کچھ کہ نہیں سکتا کام ان کا وہم اور قیاس میں نہیں آتا ہے۔ ۱۴ ک : ہزار زبان۔ ۱۵ ک : سمٹتا۔ ۱۶ ک : رفعت اور شان۔

ص ۱۲: ۱ ک : روز و شب مشعل مہ و خور روشن کیے۔ ۲ د : روشن کی ۳ ک : ہر بار نہر کی لہر آتی ہے طبیعت لہراتی ہے ۴ صبح و شام وہ بہار ہے جس پر شام اودھ بنارس کی سحر نثار ہے۔ ح، م، ص، ت، د، ن : صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے۔ ۵ ح، ص، د : مجمع رئیس۔ ک : شہر نفیس مجمع امرا مسکن رئیس۔ ۶ ک : حافظ محمد ابراہیم سا۔ ۷ ک : کہ اگر۔ ۸ م : آفتاب رشید۔ ۹ ک : تو اپنے۔ ۱۰ ح، م، ص، ف، ن، د : مرزائی صاحب کا یہ حال تھا کوئی پرچہ ان کا اُن کی نظر پڑ جاتا۔ ۱۱ ک میں "کوئی" نہیں۔ ۱۲ ک : کرتا۔ ۱۳ ک : مرثیہ خواں میر علی صاحب وہ نیا طرز ایجاد کیا کہ ۱۴ ک میں "علم" نہیں۔ ۱۵ ک : اس طرح کا دھرپت اور خیال اور ٹپہ گایا بنایا جو کبھی ۔۔۔ ر ۔۔۔ ح، م، ص، ف : اس طرح کا دھرپت خیال ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ د : ایسا دھرپت خیال ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ۱۶ ن : نہ آیا تھا۔ ۱۷ "امک رنگین ۔۔۔ بدرنگ ہوا" یہ عبارت ک میں موجود نہیں۔ ۱۸ د : کھنچا ہے۔ ۱۹ ک : زندہ ہوتا کان پکڑتا۔

ص ۱۳: ۱ ک : سیکڑوں۔ ۲ ح، م، د : ہزار دستاں۔ ۳ ک : مکروہات زمانہ سے افسردہ نہ پایا۔ ۴ ک : عرصۂ قلیل میں دیوان کثیر مرثیے سلام کا مرتب فرمایا۔ ۵ "شہر ہیں ۔۔۔ جلیس تھے" یہ عبارت ل کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ ۶ ک : فخر۔ ۷ ک، ن : مردم بحر و بر۔ ۸ ک : وہ کہ۔ ۹ ن : فصیح اور بلیغ۔ ۱۰ "جوہر دیکھے" ح، م، ص، د، ف، ن میں نہیں۔ ۱۱ ک : شاگردوں کو۔ ۱۲ ک : خواجہ حیدر علی آتش کی شرر بیانی سے دل جلوں کے۔۔۔ ۱۳ ک : فرنگی محل کا حال کیا لکھوں، مولویان فاضل عدیم المثال جامع الکمال، سب علم میں استاد کتب درسی ابتدا سے ۔۔۔ ۱۴ ن : کو۔

ص ۱۴: (۱ کے تحت جو عبارت تھی، اُسے نکال دیا گیا ہے) ۲ ک : دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ۳ ح، م، ص، ف، ن، د : مولوی انوار کا پر توفیض جہان میں روشن مولوی مبین دور بیں سراج انجمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ ایسے فقیہ ۔۔۔ ۴ ک : مولوی مخدوم جامع علوم۔ ۵ ک : اُدھر رکن دین بلا کہ میرن صاحب اور میر سید محمد مجتہد مرزا کاظم علی نرے ولی۔ آخون محمد رضا رضائے خدا کا جویا دیکھا نہ سنا حامل قرآن ہمہ داں۔ ۶ ح، م، د میں "مستند" نہیں۔ ۷ ح، م، د، ک : آخون۔ ف، ل، ن : آخوند۔ ص : آخوند۔ ۸ ک : وہ جو مثل مشہور ہے نیک اندر بدیہ اصل مذکور ہے۔ ۹ ح، م، ص، ف، ن : لب معشوق مولویوں سے وہ رنڈیاں پری شمائل زہرہ پیکر مشتری خصائل اس ناز و انداز سحر کرامات غمزہ عشوہ ادا گات (ح، م، د : گھات)

یان کی کہ ہاروت اور ماروت۔ [۱۰] ک: فرشِ زمیں۔ [۱۱] ح، م، ص، ف، د: کوئی چرخ ان پر نثار ہے ہر ایک حور کردار ہے خوش مزاج مردم شناس۔ [۱۲] ک: بلاگرداں ہے۔ [۱۳] "خوش... رمز و کنایہ" ک میں یہ عبارت نہیں۔ [۱۴] ن: اس۔

ص ۵۱۵: [۱] ح، د: کلاونت۔ [۲] ک: کلانوت اور قوّال جیسے چھجو خاں یا غلام رسول یکتائے زمانہ اور معقول شوری کی.... [۳] ح، م، ص، ف، ن، د: شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے۔ [۴] ح: تلاری۔ د: سالاری۔ [۵] ک: کہ پکھاوج کا دم بند کیا اتنا ہاتھ بڑھایا۔ [۶] ک: اور ایسا لڑا۔ [۷] ح، ک: نزدیک دور۔ [۸] ک: چھنگا یا خیراتی کے ہات کا۔ [۹] "رستم کی عافیت تنگ کرنے والا" ک میں نہیں۔ [۱۰] ک: کھڑایا۔ [۱۱] "اس بیچ میں" ح، م، ص، ف، ن، د میں نہیں۔ [۱۲] "مرزا انظر علی.... ہاتھ نہ آیا" یہ عبارت ل اور ک کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ [۱۳] ل اور ک دونوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے، اسی کو برقرار رکھا گیا ہے (صراحت خاص کر یوں کی گئی کہ اب اِسے "پیچھے" بھی لکھا جاتا ہے اور اب یہی مرجح صورت ہے)۔ [۱۴] ک: ایسا جلد دست دیکھا نہ بھالا۔ [۱۵] ک: غرضیکہ جو چیز یہاں نئی بنی اور کاریگروں نے طبیعت سے ایجاد نکالی سلف سے آج تک نہ ہوئی تھی۔ [۱۶] م، ن: نکالیں سلف سے آج تک نہ ہوئی تھیں۔ (بہ ظاہر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ "نئی بنیں" کی رعایت سے یہاں بھی (م اور ن کے مطابق) "نکالیں" مرجح ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ اور سب نسخوں، یعنی ح، ص، ف، ل، د میں یہاں "نکالی" ہے اور اگلے جملے میں "نہ ہوئی تھی" ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً اِس ٹکڑے میں "نکالی" ہی ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر اِس عبارت میں، پہلے جز میں "نکالیں" اور دوسرے جز میں "نہ ہوئی تھیں" لکھا جائے، تو پہلے جملے میں "ایجادِ طبیعت سے" پڑھنا ہوگا، یعنی لفظِ "ایجاد" کو مع اضافت پڑھنا ہوگا۔ اور اگر پہلے جز میں "نکالی" اور اُس کی نسبت سے دوسرے جملے میں "نہ ہوئی تھی" رکھا جائے، تو اِس صورت میں اضافت نہیں آئے گی، بل کہ "ایجاد" کو مفعول مانا جائے گا اور اسے یوں لکھا جائے گا: "اور ایجاد، طبیعت سے کاریگروں نے نکالی"۔ یہی مرجح صورت ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ک میں اِس ٹکڑے کو یوں لکھا گیا ہے: "طبیعت سے ایجاد نکالی" اور یوں بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنّف نے قطعیت کے ساتھ "ایجاد" کو اِسی طرح جملے میں استعمال کیا ہے۔ اِسی بنا پر لفظِ "ایجاد" کے بعد کاما لگایا گیا ہے)۔ [۱۷] ن: ایسی۔ [۱۸] ک: کہ اورنگ کی بنتی باہر ہندو جو پائیں۔ ن: باہر ہندو اس کے بیتے جو پائیں۔ [۱۹] ح، م، ص، ف، ن، د میں "اپنے" نہیں۔ [۲۰] "انتہا سے حیرت..... اورنگ" یہ عبارت ح، م، ص، ف، ن، د میں موجود نہیں۔

ص ۱۶: ۱ ح، م، ص، د، ف، ن میں "اور" نہیں۔ ۲ ح، م، ص، ف، د، ل: جوتہ (ک، ن: جوتا)۔ ۳ ح، د، ک: خورد۔ (ف، م، ص، ن، ل: خرد)۔ ۴ ک: میاں ببر علی۔ ۵ "پانچ اشرفی ... جوتا سجوایا" یہ عبارت ح، م، ص، ف، ن میں موجود نہیں۔ ک: ایسا تکلف بہم پہنچایا پانچ اشرفی ادنیٰ کہاری دھیلاتے دے کر۔ ۶ "چالیس سال ... امیر نہ ہوں گے جیسے تھے" یہ عبارت ک میں موجود نہیں۔ ۷ ن میں "جہان کی" نہیں۔ ۸ "چنانچہ ... امیر نہ ہوں گے جیسے تھے" یہ مکمل عبارت ل کے سوا کسی اور نسخے میں نہیں۔ ۹ ک: سید الشہدا کے نام کا شیدا برس روز میں جو جمع کیا ماہ محرم میں نذر حسین محتاجوں کو دیا۔ ۱۰ م، ک، ن: بیکھ رنگی۔ ح، د: ایک رنگی۔ ص، ف، ل: اکرنگی۔ ۱۱ ح: آدھی۔ ۱۲ ح، م، ک، د، ن: روپیا۔ ص: رُپیا۔ ۱۳ ک: یا۔ ۱۴ ضمیمۂ تلفظ و املا میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ اس عبارت میں "منجے" اور "پنجے" (دونوں مع یائے مجہول) محض قیاساً متعین کیے گئے ہیں۔ ک کے حاشیے پر "منجے" کے معنی اس طرح لکھے ہوئے ہیں: "منجی اصطلاح قمار یا زاں خالی رفتن"۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ لفظ "منجی" ہے یا "منجے"۔ اسی طرح میں قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس عبارت میں دوسرا لفظ "پنجی" ہے یا "پنجے"۔ چوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ سرور نے بعض مقامات پر قافیۂ مکتوبی سے بھی کام لیا ہے، یوں ایسے مقامات پر قطعیت کے ساتھ کوئی حکم لگانا بہت مشکل ہے۔ اور یہ بات بھی ہم سب کو معلوم ہے کہ اُس زمانے میں یائے معروف و مجہول کی کتابت میں صورت کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ مختلف نسخوں میں یہ عبارت جس طرح ملتی ہے، اُس کی نشان دہی کی جاتی ہے: ح، م، ص، ک، د: سیکڑوں داؤ منجی گئی منہ سے نہ پنجی گئی ـــــ ل، ن، ف: سیکڑوں داؤ منجی گئے منہ سے نہ پنجے گئے۔

ص ۱۷: ۱ ک: ایسے۔ ۲ ک: حقیقت میں یہی لوگ جیتے ہیں۔ ۳ م: اشیاے لطیف۔ د: اشیاے لطیف کھاتے ہیں (د میں "پینتے ہیں" نہیں)۔ ۴ د: مولوی عبدالرحمٰن صاحب۔ ۵ ک: بے مثل۔ ن: اکمل۔ ۶ ک: اور خواجہ حسین اور حسن۔ ۷ ک: لیکن طبیعت معروف اختصار ہے وگرنہ ان لوگوں کی صفت فزوں از حد شمار ہے شعر۔ ۸ ک: اس قول پر عمل کیا۔ ۹ ک: آگے۔ ۱۰ ک: بالفرض اگر۔ ۱۱ ک: یہ شہر ایسا تھا مر گئے یہیں رہے اور یوں تو مصرعہ۔ ۱۲ ک: کہیں لکھی دیکھی ہو۔ ۱۳ ک: عہد دولت بابر سے تا سلطنت شاہ عالم کہ دہلی کی آبادی ویران تھی خلقت مضطر و حیران تھی سب بادشاہوں کے عصر کے روزمرے لکھے۔ ۱۴ م میں اضافت کا زیر موجود ہے۔

ص ۱۸: ۱ "مثل ... گھڑے میں پانی" یہ عبارت ح، م، د میں نہیں۔ ۲ ن: نہ چولھے میں۔ ۳ ح، م، ص، ف، د: ویرانی۔ ۴ "خلقت ... تھی" ح، م، ص، ف، د، ن میں نہیں۔ ۵ ح، ص، ف: آئندے جلا

۶؎ ح، م: شعرای۔ ص میں "شعرا" کے بعد جگہ خالی ہے۔ ۷؎ ک: غور کیا تو یہ لطافت اور بلاغت کبھی نہ تھی نہ اب تک ہے۔ ۸؎ د: ک اب تک۔ ۹؎ ک: اس کے قطع نظر لوگ اس خلقت کے ہیں گرہ سے کھوئیں پر جلسہ کریں۔ ۱۰؎ د: جلسے۔ ۱۱؎ ک، ن میں "جناب" نہیں۔ د: جناب فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں فتح جنگ مجمع خوبی از پا تا فرق۔ ۱۲؎ ک: فی الحقیقۃ ان کا کلام صاعقہ ...... ۱۳؎ ک میں "بھائی بند" نہیں۔ د: نہای بند۔ ۱۴؎ د میں "صحبت" موجود نہیں ــ ک: شب ماہ صحبت مشاعرہ معیّن ہے رئیس شہر صغیر و کبیر تشریف لاتے ہیں لطف لے حد اٹھاتے ہیں اس مکان وسیع میں ... ــ ۱۵؎ ک: ہوا بھی۔ ۱۶؎ "سخن سنج ... لطف اٹھاتے ہیں" ک میں موجود نہیں۔ ۱۷؎ ن: حنظ۔ ۱۸؎ ک: گلوریاں بسی متواتر (" ورق ..... مرمر کا" یہ عبارت ک میں موجود نہیں)۔ ۱۹؎ ص، ف، ل: ہووے۔ ۲۰؎ ک: تو فوراً دودھ پینے بچے تک شیر چاے موجود کی۔ ۲۱؎ ک: ہمیشہ شام سے صبح ہوئی کسی کی طبیعت نہ گھبرائی گھر جانے والوں کو صداے مرغ سحر نداے اللّٰہ اکبر سدا آئی اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں .... ــ

ص ۱۹: ۱؎ ن: نہیں گھبراتی ہے۔ ۲؎ "ہرچند ... زینتِ شہر ہیں" یہ عبارت ک میں موجود نہیں۔ ۳؎ ک: کس ملک میں ایسے۔ ۴؎ ک: دلال تک۔ ۵؎ ک: اور شہروں کے سیٹھ یا کروڑپتی۔ ۶؎ ص: کڑوڑپتی۔ م: کروڑپتی۔ (ح، ف، ک، د، ل، ن: کروڑپتی)۔ ۷؎ "لاکھ اسیٹھ سے" یہ ٹکڑا ح، م، ص، د، ن میں نہیں۔ ۸؎ م: گانڈ۔ ۹؎ د: توقفہ ہونا۔ ۱۰؎ ن: کوتاہ ہیں۔ ۱۱؎ ک: بیہودہ افترا پردازی۔ ۱۲؎ اس لفظ کے متعلق ک کے حاشیے میں لکھا ہے: "کھپنا مجحوب شدن"۔ ۱۳؎ ک میں اس جملے کے بعد یہ عبارت عنوان کے طور پر جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے: "مذکور عہد حاتم دوراں سلطان ابن سلطان میرزا نصیر الدین حیدر پادشاہ نوجوان" اور اس کے بعد یہ عبارت شروع ہوتی ہے: اچھے آغاز کا انجام ..... ۱۴؎ ح، م، ص، د: نیک ہوتا ہے۔ ۱۵؎ ک: کسی کی مشقّت۔ ۱۶؎ ح، م، ص، ف، د، ن: یہ فسانہ بعہد دولت (ح: بعہد و دولت) شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام یہ عصر سلطان بن سلطان ابو النصر نصیر الدین حیدر دام ملکہ ہوا۔ ک: یہ فسانہ شروع زمانۂ غازی الدین حیدر بادشاہ میں ہوا تھا اور تمام عصر میں سلطان ابن سلطان ابو النصر نصیر الدین حیدر خلد اللّٰہ ملکہ کے ہوا۔ ۱۷؎ ک میں "یہ" نہیں۔ ۱۸؎ ح، م، ص، د: یہ عجب شاہ جم جاہ ہوا۔ ۱۹؎ ک: صفحۂ دہر سے مانند حرف غلط مٹا یا فقیروں کو امیر بنایا۔ ۲۰؎ ح، م، د: مثال۔ ۲۱؎ ک: عیش و عشرت۔ ۲۲؎ ح، م، ص، د: ایک ایک کنجڑن ادنا (م: ادنیٰ) اعلیٰ ہفت ہزاری بنائی محمد شاہ کی گور ٹھکرائی۔ ۲۳؎ ن میں اس جملے کے بعد "محمد شاہ کی گور ٹھکرائی" ہے۔

ص ۲۰: ۱؎ "ہاتھی ...... جلو میں کھرا یا" یہ عبارت ک اور ل کے سوا کسی نسخے میں نہیں۔ ۲؎ ک: کچھ دایا ــ

۳ ن: سو۔ ۴ ح، م، ص، د: برق صفت۔ ۵ ک میں اس کے بعد "نور کا عالم" بھی ہے۔ ۶ ص: جواہر میں غرق (ر "دریا ے" موجود نہیں)۔ ۷ ح، م، ص، د، ن میں "ہردم" نہیں۔ ک: دست بستہ ہردم روبرو کھڑی رہی۔ ۸ م: اکڑوروں۔ ص: کڑوڑوں (لیکن اگلی سطر میں "کروروں") ح، ف، ک، ل، د: کروروں۔ ۹ ل: بادشاہت کی جبین کی۔ ۱۰ ک: کئی کرور روپے چند روز میں اس منظور نظر نے صرف کیے طرفۃ العین میں خزانے خالی کرکے...... ۱۱ "تجربہ کاروں..... بادشاہ ہوگا" یہ عبارت ک اور ل کے سوا کسی نسخے میں نہیں۔ ۱۲ ح، م، ص، ف، د، ن: ہر وقت راجہ اندر کا جلسہ رہا۔ ۱۳ ک: مکان وہ ہوائے کہ فلک کو بہ ایں گردش نظر نہ آئے اندرا سن گلشن ارم دل آرام اور کس کس کا نام لوں یہ باغ اور کوٹھیاں چشم وگوش معمار خرد نے دیکھیں نہ سنیں۔ ۱۴ د: ہوکے۔ ۱۵ ح، م، ص، ف، د، ن: کہ ایسا (ن میں "کہ" نہیں) باغ اور اس طرح کی کوٹھی چشم وگوش عالم نے دیکھی نہ سنی دوازدہ امام۔ ۱۶ "دوازدہ امام..... بھٹکتا رہا" یہ عبارت ک میں نہیں۔ (۱۷ کا نوٹ نکال دیا گیا ہے) ۱۸ د: کترن۔ ۱۹ ح، م، ص میں "خاصے" نہیں ۲۰ ک: لونگ الائچی اور زعفران کے خاصے خاصے ڈھیر لگاتے۔ ۲۱ ک: مکان درزی امارت کرتا ہے ٹانکا نہیں بھرتا ہے روز تو لتہ.....

ص ۲۱: ۱ "بجز غم حسین..... ہوتا ہے" یہ عبارت ک میں موجود نہیں۔ ۲ ح: شاداد خورم۔ ص، م: شاداورخرم۔ د: شادوخورم۔ ۳ ح، م، ف، د، ل: روپیا۔ ۴ ح، م، ص، ف، د، ن: آس کی ہمت کے آگے۔ ۵ د: حسن وصورت۔ ۶ ک: جاہ وثروت شوکت وحشمت جتنی خوبیاں دنیا کی ہوتی ہیں۔ ۷ ک میں اس کے بعد یہ عبارت ہے: تا اربعین عزاداری ہوتی ہے ہزارہا روپے کا روز صرف امام باڑوں کی تیاری ہوتی ہے چالیس شب جاگنا اور رونا تخم عمل نیک مزرعۂ آخرت میں بونا۔ ۸ ک: دفعتہً بیسر دریا کی لہر جو آئی — د: بیسر دریا کی جو دفعتاً لہر آئی۔ ۹ ک: غریب غربا۔ ۱۰ ح، م، ص، د میں "موئلف" نہیں۔ ۱۱ ن میں "مگر" نہیں۔ ۱۲ ن: لکھے۔ ۱۳ ح، م، ک، ص، د: لہذا اس غزل پر اختتام یہ جملہ تمام کیا العاقل تکفیہ الاشارہ۔ (اس کے بعد غزل ہے)۔ ن: لہذا اس غزل پر اختتام کیا یہ جملہ تمام کیا غزل۔ ۱۴ م، ک: مولف۔ ص میں یہاں کوئی لفظ نہیں۔ ۱۵ د: بادشاہ ہے۔ ۱۶ ح، م، ص، د: ہردم کہہ کے۔ ن: چونکہ اٹھتا ہوں میں ہردم کہہ کے۔ ۱۷ یہ شعر ک میں نہیں۔ ۱۸ ح، م، ص، د: پہ۔

ص ۲۲: ۱ ک: ہو۔ ۲ یہ شعر ک اور د میں نہیں۔ ۳ یہ شعر بھی د میں موجود نہیں۔ ۴ ح: تاپدر دری منزی (ظاہرا غلطی کتابت)۔ ۵ م: اور والی ملک کو۔ ۶ ک: سریر سلطنت پر۔ ۷ ک: مولف۔ د میں "فرد" سے لے کر ص ۲۲ پر "رہ آپ کا شعر سمجھو" تک تقریباً چار صفحوں کی عبارت موجود نہیں۔ ۸ ک: یہ شہر

۹ے ج، ص: "اور مقتدی میں یہاں کے لوگ صاحب کمال ہیں۔ باریک بیں، دقیقہ رس، زود فہم، نازک خیال ہیں۔ یہ عجب ان صاحبوں کا لکھا ہے، مقتدی میں موجد سے بہتر ہو جانے انھیں کو دیکھا ہے۔ اس شہر میں کئی مطبع سنگی ہیں، گواہِ نیرنگی ہیں، لیکن ایک ہمارے عنایت فرما ہیں جناب میر حسن صاحب صاحبِ حسن و جمال، جوان خوش رو، صاف باطن، حمیدہ خصائل۔ حسنِ خُلق ان کا خلق میں مشہور ہے، عجب و نخوت اُن کے نزدیک سے دور ہے۔ موسمِ شباب ہے، چہرے پر جوانی کی آب و تاب ہے۔ بیت ابرو کاکل مشک بو، صفحۂ رخسار گلِ بے خار۔ ا۔ سرتا پا ہر شے دیوانِ وجاہت میں انتخاب ہے۔ محمود نگر میں ان کا چھاپے خانہ جدید ہے، عیاذاً باللہ بھولا (کذا) گلشنِ بے خزاں ہے کہ دیدہ نہ شنیدہ ہے۔ عقل دنگ ہے، کارخانہ کیا ہے، تختۂ ارژنگ ہے۔ ایک سمت خوش نویس ثانیِ آغا و میر، ہفت قلم، ایک طرف فاضل صاحبِ درس و تدریس، ہر ایک بے نظیر، شیر و شکر کی طرح باہم۔ ایک جا ولایتی کل جسے دیکھ کر جی بے کل ہو گیا ہے۔ کیسا ہی جوانِ قوی ہیکل ہو، اگر چاہے پہاڑ اٹھا لے، مگر ایک کا نپی میں ہاتھ کانپے۔ کیا دخل ہے جو بے دریافت کیے دس فرمے نکالے۔ اُس کی ہر کمانی کو اگر کار رمانی کہوں، بدگمانی ہے۔ بہزاد کی عقل کو حیرانی ہے۔ پرزے پرزے پر جلا ہے، صفا ہے، یدِ سحر کا ڈھلا ہے۔ کہیں پتھر صاف صاف شفاف، جن کے سنگ کا فرسنگوں نظر نہ آئے۔ مردم دیدہ اگر اُس کی صفا کو نظر بند کریں، آنکھ پھسل جائے۔ ہر پتھر ہم سنگِ کوہِ طور ہے۔ کسی پر جلی لکھا، کوئی قلم مو سے مسطور ہے۔ کاریگر ہر ایک سرگرم فرماں روائی ہیں (ص: ہے۔) کتب کہن از سرِ نو زندہ ہوتی ہیں، ثبوتِ اعجازِ مسیحائی ہے۔ سبک دست، چست و چالاک استاد ہیں، طبع بلند اُن کا مطبوع، دل پسند، اپنے کام میں ذی استعداد ہیں۔ بے لن ترانی کہتا ہوں، نئی تشبیہ ہاتھ آئی ہے، بیلن کی سیاہی میں صاف کیفیتِ روشنائی ہے۔ فریم ہر ایک مرقع کی تصویر ہے، لکھا مٹتا نہیں، گویا نوشتۂ تقدیر ہے۔ الٰہی جب تک فلک کی کل چلتی رہے اور کارخانۂ چرخ زنگاری رہے (ص: ہے) یہ کارفرما سلامت رہے، کارخانہ جاری رہے۔" اس کے بعد یہ عبارت شروع ہوتی ہے:

بندہ کم ترینِ تلامذہ اور خوشہ چینِ خرمنِ سخن جناب قبلہ و کعبہ..

ک میں یہاں سے لے کر ص ۲۵ کے نصف میں "کام جاری رہے" تک کی مکمل عبارت موجود نہیں۔ ص ۲۵ پر جو شعر ہے: الٰہی لکھنؤ بستا رہے۔ . . اس کے فوراً بعد ک میں یہ عبارت آتی ہے: "بندہ کم ترینِ تلامذہ اور خوشہ چیں۔ . ." (باقی نسخوں سے متعلق ضروری باتیں مقدمۂ مرتب میں آگئی ہیں)۔

ص ۲۴: ۱؎ ف: یا نہ پڑھا گیا۔ ۲؎ "حاسد ۔۔۔ راہ چلتے ہیں" یہ عبارت ف میں موجود نہیں۔ ۳؎ ف: کیا
کیا جملہ پڑھاپے میں بڑھایا ہے۔ ۴؎ "طبیعت نے ۔۔۔ خار ہے" یہ عبارت ف میں موجود نہیں۔

ص ۲۵: ۱؎ "باریک ہیں ۔۔۔ ہم نہ ہوں گے" یہ عبارت کسی نسخے میں موجود نہیں (یعنی یہ عبارت صرف ل میں ہے)۔
۲؎ ح، ن: بندہ ـــــ "بندہ ۔۔۔ وہ آپ کا شعر سمجھ" یہ مکمل عبارت (جو ص ۲۶ کے وسط میں
ختم ہوتی ہے) د میں موجود نہیں۔ ۳؎ ک: معزز ممتاز۔ ۴؎ "مجمع ۔۔۔ فرخندہ خصائل" یہ عبارت
ک میں موجود نہیں۔ ۵؎ ن میں "آغا" نہیں۔ ۶؎ ح، م، ک، ن: نوازش کا ہے۔ ۷؎ ک: فی الحقیقتہ
طرز ریختہ اور روزمرہ اردو کا۔ ۸؎ ن: مقام (بہ ظاہر غلطیِ کتابت)۔ ۹؎ ک: زبان۔ ۱۰؎ ح، م، ک:
وائل سحبان ہو۔ ۱۱؎ ک: فی زماننا۔ ۱۲؎ ل میں "جو" موجود نہیں۔ (بہ ظاہر یہ کتابت کی فروگذاشت
معلوم ہوتی ہے۔ باقی سب نسخوں (ح، ف، ص، م، ک، ن) میں "جو" موجود ہے۔ اِسی بنا پر یہاں "جو"
کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ ۱۳؎ ک: دس پانچ شعر مثالی یا صنائع بدائع کے ہوں گے جن پر وہ نازاں تھے۔
۱۴؎ ک: انھیں سند۔

ص ۲۶: ۱؎ ک: یا اس فن سے مناسبت حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو آپ کا دیوان بہ چشم انصاف دیکھے
دخل کیا جو کوئی شعر کیفیت سے خالی ہو۔ ۲؎ ح، م، ص، ف، ن: جو ان کیفیتوں سے۔ ۳؎ ن: ہر مصراع۔
ک: ہر مصرعہ گواہ ہزار صنعت شعر شاہد معنی باکیفیت مطلع سے مقطع تک پری کی صورت اکثر اشعار تبرکاً
وتیمناً بہ طریق یادگار ذرہ بے مقدار نے لکھے ہیں جہاں لفظ اسناد ہو وہ شعر آپ کا سمجھو۔ ۴؎ ح، م، ص،
ن: ہر شعر شاہد لاکھ صفت۔ ۵؎ ح، م، ص: مرقّع کی صورت۔ ۶؎ ح، م، ص، ن: جہاں لفظ استاد ہے
وہ آپ کا شعر ہے یاد رہے۔ ۷؎ ح، م، ص، ف، ن: باعث تحریر اجزائے پریشاں ذکر گذشت مجمع دوستاں
مکلف ہونا محبوب کا بیان دوستان مرغوب کا ـــ د: باعث تحریر اجزائے پریشان مکلف ہونا دوستان
محبوب کا بیان داستان مرغوب کا۔ ۸؎ ک میں "لکھا سرور کا" موجود نہیں۔ ۹؎ ح، م، ص، د، ن:
مع چند دوست صادق و محبان صفاکیش و موافق باہم بیٹھا تھا ـــ ف: مع چند دوست صادق و محب
موافق باہم بیٹھے تھے۔ ۱۰؎ ن: د۔ ۱۱؎ ح، م، ص، ف، د: سفلہ پرور دوں شعار سے سبب سے
۱۲؎ ک میں "سب" نہیں۔ ۱۳؎ د: اور ہجوم و یاس اور کثرت۔ ۱۴؎ ک میں "یہ" نہیں۔ ۱۵؎ ح، م، ص،
د میں "دل گرفتہ" نہیں۔ ۱۶؎ ح، م، ص، ن، د: انھوں نے کہا شعبدہ بازیِ ۔۔۔۔ ۱۷؎ ک: چرخ
نیلی فام چنبری۔ ح، م، ص، ف، د، ن: چرخ مکار از آدم تا ایں دم لو کہیں چلی آتی ہے اور تفرقہ پردازی
اس کی سوائے رنج و محن زیادہ مشہور ہے یہ اور برائی ہے مگر (ن: اب) یہی غنیمت جانیے اور لازم

ہے کہ اس کا بھی احسان مانیے کہ تم ہم اس دم۔ [18] ک: زیادہ۔ [19] ک: وہ۔ [20] ک: کہ اس دم تم ہم باہم تو ہیں بقول استاد۔

ص ۲۷: [1] ح، م، ض، د، ن: بیان واقعی ہے اگر (ن: اور واقعی ہے اگر) شدت رنج والم میں دوست صادق یار موافق ہم نشیں ہو الم (ن: توالم) خیال میں نہیں آتا ہے اور صحبت غیر جنس میں تخت (ن: اگر تخت) سلطنت میسر آئے تو تختہ تابوت کی طرح کاٹے کھاتا ہے سعدی۔ [2] ف: ہم نشیں۔ [3] ک: دل بہر کیف بہل جاتا ہے۔ ح، م، ض، ف، د، ن میں "دل بہل جاتا ہے" موجود نہیں۔ [4] ک: بدتر کاٹے کھاتا ہے۔ [5] "لیکن زمانے کی... یا ہم نہیں دیکھ سکتا" یہ جملہ ک میں موجود نہیں۔ [6] د: دو شخص کو۔ [7] ک: رقیع سودا۔ [8] د: جب کہ۔ [9] ک میں "تک" نہیں۔ [10] ح، م، ض، د، ف، ن: آشنائے باصفا پر مزہ — ک: ایک آشنائے بامزہ فقیر کے تھے وہ بولے کہ اس وقت تو کوئی قصہ...... [11] ح، م، ض، د، ن میں "تو" نہیں۔ [12] ن: ایسا۔ [13] "جو سموم حوادث سے مضمحل ہے" یہ ٹکڑا ح، م، ض، ف، د، ن میں موجود نہیں۔ [14] ح، م، ض، ف، د، ن: مناسب وقت۔ [15] ح، م، ک میں "ہم" نہیں۔ [16] ک: اس نظر سے کہ۔

ص ۲۸: [1] ح، م، ض، د، ن: یہ فسانہ انھیں بہت پسند آیا کہا اگر بدل جمعی تمام تو اس قصہ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں۔ [2] ح، م، ض، د: لیکن اگر معاف ہو۔ [3] د: اور ہنر پوشی۔ [4] ک میں لفظ "شعر" موجود نہیں۔ [5] ک میں "کسی سے" نہیں۔ [6] د: جیسی۔ [7] ک: نکتہ چینی اور دقت طلبی۔ [8] ح، م، ض، د، ن: بندے نے کہا۔ [9] ک: فرصت میں لکھوں گا۔ [10] ک: وہ یار شاطر۔ [11] ح، م، ض، د، ن: کہا اچھا۔ [12] ح، ض، د، ن: فقیر کو اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا — م: فقیر کو اسی دن سے ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ ک: اس دن سے ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ [13] د: آخر کو۔ [14] ک: فلک تفرقہ پرداز گردون عربدہ ساز نے تلاش معاش کے حیلے میں مفارقت کی صورت دکھائی۔

ص ۲۹: [1] ح، م، ض، ف، د، ن: مہاجرت استقبال کو آئی۔ [2] ک: ربیع الآخر کے مہینے میں سنہ ہجری بارہ سے چالیس تھے۔ [3] د: بارہ سو۔ [4] ح، م، ض، ف، د، ن: یہ بستی پوچ دلچسپ ہے۔ [5] ح، ض، د، ن: احباتاً جو ہوں گے تو گوشہ نشیں — م میں بھی یہی ہے مگر اس میں "تو" نہیں۔ [6] ح، م، ض، د: بڑی کثرت تھی۔ [7] ح، م، ض، د: یہ طور دیکھ — ن: یہ طور دیکھ کر۔ [8] ح، م، ض، ف، د، ن: دل وحشت منزل سخت گھبرایا — ح، م، ض، د، ن میں اس کے بعد یہ جملہ بھی ہے: کلیجہ منہ کو آیا۔ [9] ح، ض، م، ف، د، ن: تیرہ بختی سے روز سیاہ پیش آئے۔ [10] د میں "بقراط حکمت" نہیں۔ [11] "عارو باد زمانہ دیدہ تجربہ رسیدہ" یہ ٹکڑا ک اور ن کے سوا کسی نسخے میں نہیں۔ [12] ن میں "سید" نہیں۔

۱۳ ف: سخن فہم خوش خصال۔ ح، م، ص، د: معدن قال ومقال طبع سودا خیز اور...... ۱۴ ک: دہ۔ ۱۵ ک: سرجوں انگیز کو تسکین حاصل ہوئی۔ ۱۶ ح، م، ص، ن: دہ۔ ک: اکثر حال فقیر پر لطف فرماتے تھے تشریف لاتے تھے تدابیر احسن دافع رنج دمحن بناتے تھے۔ ۱۷ ح، م، ص، ف، ن: ایک روز اُن سے۔ ۱۸ د میں لفظ "فسانہ" موجود نہیں۔ ۱۹ "حسب وعدہ" ک اور ل کے سوا کسی نسخے میں نہیں۔ ۲۰ ک: سن کے یہ فرمایا مصرعہ۔ ن: سن کر فرمایا:

ص ۳۰: ن: یہ کلمہ سن طبع کو ناز یانہ ہوا (ظاہرا غلطیِ کتابت)۔ ۲۱ "تحریر کا بہانہ ہوا" یہ ٹکڑا ح، م، ص، ف، د، ن میں موجود نہیں۔ ۲۳ ک: جو شاہ جہان آباد کہ۔ ۲۴ ح، م، ص، ف: اور بیت السلطنت ہندوستان کبھی تھا۔ د: اور بیت السلطنت ہندوستان کہن تھا۔ ۲۵ ح، م، ص، ف، ن، د: تو فصاحت کا مقر دم بھرتا (ن: تو فصاحت کا دم بھرتا) جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن چھٹے ہیں (د: ذہنے چھٹے ہیں۔ ف، ن: ذہن چھٹے ہیں) یہ زبان آئی ہے دلّی کے روڑے ہیں (ح: ڑروڑے ہیں) محاوروں کے (ف، ن: محاوروں کے) ہاتھ منہ (ف: ہاتھ پاؤں) توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ ۲۶ ل: باغ بہار۔ ۲۷ ک: ذہن کے چھٹے ہیں۔ ۲۸ ک: اس سمجھ پر۔ ۲۹ ح، ص، م، د میں "بلکہ" نہیں۔ ۳۰ ک میں "مشک" سے پہلے جلی قلم سے لفظ "مثل" لکھا ہوا ہے۔ "مشک آنست ...... دھتا پائی" یہ عبارت ح، م، د میں موجود نہیں۔ ۳۱ ن: مبو ید۔ ۳۲ ص: یہ وہ مثل۔ ۳۳ "لیکن تحریر...... بے نظیر ہے" یہ عبارت ک میں یہاں پر نہیں، ذرا آگے (آخری سطر میں) "خطا سے خالی ہو" کے بعد آئی ہے۔ ۳۴ ک: الفقرا امید ہے۔ ۳۵ ن: فرماکر۔ ۳۶ ک: اصلاح سے۔ ۳۷ ک میں اس کے بعد یہ عبارت ہے: تحریر اس کی الفاے تقریر ہے قصہ یہ دلچسپ بے نظیر ہے۔ ۳۸ ح، م، ص، د، ن: اس کے مطالعہ سے خاطر عاطر شاد کریں عاصی کو دعائے خیر سے یاد کریں۔ ک: مطالعے سے خاطر خطیر اگر شاد ہو تو عاصی دعائے خیر سے یاد ہو۔ ف: اس کے مطالعے سے خاطر عاطر اگر شاد ہو عاصی دعائے خیر سے یاد ہو۔

ص ۳۱: ک: اس کے لکھنے میں نمود نظم ونثر کا خیال نہ تھا شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ۔ ۲ ص: وجودت طبع۔ ۳ ک: عربی یا فارسی کا مشکل نظر آیا۔ ۴ ک: اس کو۔ ۵ م: سہل غیر ممتنع۔ ۶ ک: روزمرے یا محاورے کا تھا۔ ۷ ح، م، ص، د، ن: وہ رہنے دیا۔ ۸ د: فسانۂ عجیب اس کا نام وانّہ المبدء...... (د: "نام" کے بعد "رکھا" غالباً کتابت میں چھوٹ گیا ہے)۔ ۹ ک میں اس کے بعد یہ جملہ ہے: بعنایت ایزدی تمام ہوئی ——— اس کے بعد عربی کی عبارت ہے۔ ۱۰ ح، م، د، ک: وَاِنَّہٗ۔

فرہنگ

(الف)

آبِ آتش رنگ : شراب

آبی (صفحہ ۱۳) : ایک قسم کی میدے کی روٹی جو تنور میں پکائی جاتی ہے۔ چوں کہ روغنی روٹی کے خمیر میں گھی اور دودھ ڈالتے ہیں اور اس کے خمیر میں صرف پانی؛ اسی واسطے اس کو آبی روٹی کہنے لگے۔ یہ روٹیاں شیرمالوں کے ساتھ جوڑا لگاکر اکثر مُردے کی رسموں میں تقسیم ہوا کرتی تھیں۔

آتش پرست : آگ کو پوجنے والا۔ آتش پرستی ایک مذہب ہے، جس میں آگ کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس مذہب کا موجد زردشت تھا۔ ہندستان میں یہی قوم "پارسی" مشہور ہے۔

آتو : اُستانی، وہ عورت جو لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھی۔

آخر الامر : آخر کار۔

آخون : اُستاد، معلّم۔

آرام پائی (صفحہ ۱۶) : ایک قسم کا خوب صورت، ملائم گھیتلا جوتا، جس کی ایڑی اونچی اور پنجہ جڑا ہوتا تھا۔ جان صاحب کے اس شعر سے اس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

دوگانا! تیسری کے چاند پر پھبتی کہی میں نے
کسی محبوب کی اُتری ہوئی آرام پائی ہے

آرایش کے تخت : کاغذ اور ابرک کے وہ چھوٹے چھوٹے تخت، جن پر آرایش کے پھل پھول سجے ہوتے ہیں۔

[آرایش : کاغذ اور ابرک سے ٹٹیاں، درخت اور پھول پھل بناتے ہیں؛ ہندوؤں میں برات کے ساتھ اور مسلمانوں میں ساچق کے ساتھ دلھن کے گھر لے جاتے ہیں (امیر اللغات)]

آزر : حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا کا نام۔

آسا : طرح۔

آسن مارے (صفحہ ۲۶۲) : آسن : ہندو فقیروں اور جوگیوں کے بیٹھنے کا خاص ڈھنگ۔

آسن مارنا : فقیروں اور جوگیوں کا عبادت کے واسطے کسی جگہ ایک ہی بیٹھک سے بیٹھنا، دو زانو چار زانو یا آلتی پالتی مار کے بیٹھنا۔

آشنا : تیراک۔ جاننے والا، واقف کار، جس سے شناسائی ہو۔

آغشتۂ خاک : خاک میں آلودہ۔

آفریں : تعریف کا کلمہ : واہ واہ؛ سبحان اللہ؛ شاباش۔

آلا (صفحہ ۱۳۱) : ایسے زخم کی صفت کے طور پر یہ لفظ آتا ہے جو بھر تو گیا ہو لیکن ابھی کچھ کچا پن باقی ہو۔

آلام : الم کی جمع؛ غم۔

آماج گاہ : نشانہ۔

آنکھوں میں گُل کھلا (صفحہ ۹) آنکھوں میں نشے کی کیفیت چھا گئی۔

آویزہ : کان کی لَو میں پہننے کا زیور جو مختلف وضع کا

بنایا جاتا ہے۔ اِن سب میں نیچے کے رُخ جھولنے والی ایک مشترک چیز ہوتی ہے جو آویزہ یا بُندا کہلاتی ہے اور یہی اِس کی وجہِ تسمیہ ہے۔ آویزہ یا بُندا، موتی کا بھی ہوتا ہے اور نگ کا بھی، جو عام طور پر لمبوترا یعنی صراحی نما پسند کیا جاتا ہے۔

آہو : ہرن۔

آیندہ روندہ : آنے جانے والا۔

آیہ : قرآن کی آیت۔

آیۂ وافی ہدایہ : ہدایت اور راہ نمائی کو پورا کرنے والی آیت۔

ابلق : دو رنگا، خاص کر سفید اور سیاہ۔ بیشتر گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا رنگ سفید اور سیاہ ہو۔

ابلقِ ایام : رات دن (کی گردش) سے مراد ہے۔

ابلقِ لیل و نہار : ایضاً۔

اَبنائے زمانہ : دُنیا کے لوگ۔

اُپج : نئی بات۔ ایجاد۔ گاتے گاتے نئے انداز سے تان لینا۔ طبیعت کی جودت سے اُستادوں کے مقررہ قاعدے سے ہٹ کر (لیکن اصولوں کے مطابق) کوئی نئی تان لگانا۔

اپنے ڈیل سے ڈانواڈول رہیے (ص۲۶) : اکیلا حیران پریشان پھرے۔

اپنے مُنہ سے دھنّا بائی (ص۳) : یہ مثل اُس محل پر بولتے ہیں جہاں کوئی خود اپنی دولت مندی یا اپنے علم و فضل کا اظہار کرتے۔

اُتھک : نہ تھکنے والا۔ بہت محنتی۔

اٹکل پچّو : بے ٹھکانے، بے نشان، یوں ہی بے سمجھے بوجھے، قیاساً، اٹکل پچو۔

اَثاث : سامان (تجارت کا یا گھر کا)۔ سرمایہ۔

اثبات (ص۱۹) : ثابت کرنا۔ تصدیق۔

اِجابت : منظوری، قبولیت۔

اجتماعِ نقیضَین : دو ایسی مخالف چیزوں کا جمع ہونا جن کی یک جائی ممکن نہ ہو، جیسے سپیدی اور سیاہی۔ (اجتماعِ ضدّین)۔

اجل رسیدہ : جس کی موت آیا چاہتی ہو۔ موت کے پھندے میں پھنسا ہوا۔

اُچھال چھکّا : شوخ اور بدوضع عورت، فاحشہ، چھنال۔

اِحتمال : شک، گمان۔

احتیاج : حاجت، ضرورت، غرض، خواہش۔

احتیاجِ شُست و شُو نہیں (ص۱۱) : دھونے کی ضرورت نہیں۔

اَحسن : بہت اچھا۔

اِحیا : زندہ کرنا۔

اِحیائے اَموات : مُردوں کو زندہ کرنا۔

احمر : سُرخ۔

اَحمق الّذی : بے وقوف آدمی۔

احیاناً : اتفاقاً۔

اِختلاط : محبت، دوستی، ربط ضبط۔ دوستانہ چھیڑ چھاڑ۔ بے تکلفی۔

اِختلاط تھا (ص۱۴) : مذاق تھا۔

اخترشناس : نجومی۔ جوتشی۔
اخگر : چنگاری۔
اِخوان الشیاطین : (شیطانوں کے بھائی بند) بُرے لوگ۔ بہکانے والے لوگ۔
اُداسا : آزاد فقیروں کی بولی میں بوریا بستر، اوڑھنا بچھونا۔
اِدبار : اقبال کی ضد، افلاس، بدنصیبی، نحوست۔
اَدقچہ : پلنگ کی پُرتکلف سفید چادر، جس کے حاشیے پر کارچوبی یا کلابتونی کام بنا ہوتا ہے۔ یہ چادر، پلنگ پوش اور توشک کے نیچے بچھائی جاتی ہے، جس کا حاشیے دار کنارہ آدھ آدھ گز نیچے لٹکتا رہتا ہے (امیراللغات)۔
اَدھرسا : ایک طرح کا عمدہ باریک کپڑا، جس کی بناوٹ میں جھرجھرا پن ہوتا ہے۔
اَدہم : سیاہ رنگ کا گھوڑا۔
اَدھی : پرانے پیسے کا آٹھواں حصہ۔
اَذفر : خالص۔ جس کی خوش بو تیز ہو۔
[مشکِ اذفر: خالص اور تیز خوش بو والا مشک]
ارادت : اعتقاد۔ عقیدت۔
اربابِ نشاط : ناچنے گانے والے۔
اربعین (صفحہ۲۱) : چالیس۔ یہاں مراد ہے حضرت حسینؓ کے چہلم سے جو ۲۰ صفر کو ہوتا ہے۔
[اربعین تک : ۲۰ صفر تک، چالیس دن]
اَرجَل : وہ گھوڑا جس کا پچھلا دایاں یا بایاں پیر گھٹنے تک سفید ہو اور باقی جسم کسی اور رنگ کا ہو۔ ایسا گھوڑا بہت منحوس سمجھا جاتا ہے۔
اردوے معلّٰی (ص۲۱) : فصیح اور مستند اُردو۔
اُردوے معلّٰی (ص۳۱) : شاہی لشکر۔
ارسطو : مشہور یونانی دانش مند اور فلسفی، اس کو "معلّمِ اوّل" بھی کہا جاتا ہے۔ سکندر بادشاہ کا مشیر تھا۔
اَرغوانی : سُرخ۔
اَرگجہ : صندل، گلاب، کافور، مُشک، عنبر کو چنبیلی کے تیل میں حل کر کے خوش بو دار مرکب تیار کیا جاتا تھا۔
اِرم : بہشت۔
اَرمغان : تحفہ۔
اریکہ : آراستہ کیا ہوا تخت۔
اڑواڑ : وہ لکڑی جو چھت (وغیرہ) کے گر پڑنے کے اندیشے سے لگا دیتے ہیں۔ ٹیکن، روک۔ مثلاً کسی چھت کی کوئی دھنی ٹوٹ گئی ہو یا خراب ہو گئی ہو تو اُس کے نیچے ٹیکن کے طور پر مضبوط لکڑی لگا دی جاتی ہے۔
ازپاتافرق : سر سے پیر تک۔
ازخود رفتہ ہوا (صفحہ۲۱) : عاشق ہو گیا۔
ازخود رمیدہ : آپ سے باہر، بےخود، جو اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو۔
اِزدحام : بھیڑ، ہجوم۔
استخواں : ہڈی۔
اِستغنا : بے پروائی، بے نیازی۔
اسد : شیر۔ آسمان کے بارہ بُرجوں میں سے پانچویں بُرج کا نام [بُرجِ اسد]۔

اسد اللہ الغالب : مراد ہے حضرت علیؓ سے۔

اِسرار (۷۶) : آسیب، جن اور پری کا سایہ۔

اَسرار (۱۹۷) : (سِر کی جمع) بھید۔

اسفل السافلین : دوزخ کے سب سے نیچے والے طبقے کا نام ہے۔

اسفندیار : ایرانی بادشاہ گشتاسپ کا لڑکا، یہ روئیں تن تھا، اس لیے اس کے جسم پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا تھا۔ آخرکار رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اسمائے ردِ سحر : وہ (خدا کے) نام (یا دعائیں) جن کو پڑھنے سے جادو ٹوٹ جاتا ہے۔

اسمِ ذات (۲۵۰) : خدا کے ناموں میں "اللہ" کو اسمِ ذات کہتے ہیں اور باقی ناموں کو صفاتی نام کہتے ہیں۔

اشکِ بلبل : افیون کی خفیف مقدار۔

اَشہب : ہر سیاہ چیز جس میں سفیدی کی جھلک نمایاں اور غالب ہو۔ سبزہ گھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس کے سیاہ بالوں پر سفید بالوں کا رنگ غالب ہو۔

اصحابِ فیل : وہ لوگ جو (رسول اللہ کی ولادت سے ذرا پہلے) ابرہہ والیِ یمن کے ساتھ خانۂ کعبہ کو ڈھانے کے لیے ہاتھی لے کر آئے تھے۔

اِصرافِ کثیر سے (۲۲۶) : بہت خرچ کرنے سے یا بہت دولت دے کر۔

اصفہان : وسطِ ایران کا ایک مشہور شہر جو علم و ادب کے بڑے مرکز کی حیثیت سے مشہور رہا ہے۔ یہاں کا سرمہ اور تلوار بھی مشہور چیزوں میں شامل تھیں۔

اصیلیں : اصیل کی جمع۔ اصیل : ماما، خادمہ، کھانا پکانے والی عورت۔

اضافت (۲۹۹) : لگاؤ، نسبت۔

[ضیافت کی اضافت کی (۲۹۹) : دعوت کا بھی اہتمام کیا]

اضطرار : بے قراری۔ بے اختیاری۔

اظلم : بہت بڑا ظالم۔

اِغماض : چشم پوشی۔ کسی کے گناہ یا بُرائی کو نظر انداز کر دینا، اُس کی طرف توجہ نہ کرنا۔

اُفتاں و خیزاں : گرتا پڑتا۔

اِفترا : بہتان، تہمت۔

اِفترا پردازی : بہتان لگانا۔

افراسیاب : قدیم زمانے میں توران کا ایک بادشاہ جو تُور ابنِ فریدوں کی نسل سے تھا، حکومتِ ایران کا بہت بڑا حریف۔ بہادری میں ضرب المثل۔

افراط تفریط : حد سے بڑھی ہوئی زیادتی اور کمی۔

افسر : تاج۔

اِفشا : ظاہر کرنا۔ ظاہر۔

افشاں : مقیش یا گوٹے کی باریک کترن، جس کو آرائش کے لیے عورتیں ماتھے پر چُنتی ہیں اور بالوں پر چھڑکتی ہیں۔

افشاں پتھر (۸۵) : میلے رنگ کا سفید یا ہلکا گلابی پتھر۔ ساخت کے لحاظ سے اس کا شمار سنگِ مرمر کی قسم میں ہے۔ بعض پر مختلف رنگ کی بڑی بڑی چتیاں ہوتی ہیں۔ یہ اعلا درجے کی عمارتوں میں لگایا جاتا ہے اور نگینے بھی بنائے جاتے ہیں۔ اس کو سنگِ ابری اور سنگِ عجوبہ بھی کہتے ہیں۔

افعی : سانپ۔

اِقلیم : پُرانی جغرافیائی تقسیم کے مطابق آباد زمین کا ساتواں حصّہ ۔ ملک ۔

اکاسی دیا (صـ۱۵۱) : معمول سے زیادہ بلندی پر روشن کیے جانے والا چراغ، جگہ کی نشان دہی کے لیے ۔ وہ بڑا چراغ جو جہازوں کی رہ نمائی کے لیے بلند مینار پر روشن کیا جاتا تھا۔

اَک بیچا : ایک خاص وضع کی ترچھی پگڑی جو بانکے ترچھے لوگ باندھا کرتے تھے ۔

اکتارا : تنبورے سے ملتا جلتا ایک تار کا باجا، جس پر اکثر ہندو فقیر بھجن وغیرہ گایا کرتے ہیں ۔

اَکفر (صـ۲۲۶) : بہت ظالم ۔

اکل وشرب : کھانا پینا ۔

اکّے : اکّا کی جمع ۔ اکّا : شاہی فوج کا وہ عہدے دار جو اپنے ماتحتوں کو پہرا چوکی تقسیم کرتا ۔ اس کے سوا کوئی خدمت اس سے متعلق نہیں ہوتی تھی ۔
ایسے (خاندانی) سپاہی (یا عہدے دار) جو کسی خدمت کی تخصیص کے بغیر اچھی تنخواہ پایا کرتے تھے ۔

اِلتہاب : شعلہ بھڑکنا، آگ کا بھڑکنا ۔

اِلحان : اچھی آواز سے پڑھنا یا گانا ۔

اُلش : کسی بزرگ یا معزز آدمی کا جھوٹا کھانا یا پانی ۔

الش کردیجیے (صـ۹۰) : اس میں سے ذرا سا پی لیجیے ۔

اللہ کے ولی (صـ۲۱) : سیدھے، نیک، مکر فریب نا آشنا ۔

الماس : ہیرا ۔

الیا : ایک راگنی کا نام ۔

اَلیل : گھوڑے کی شوخی، اُچھل کود ۔

امارت کی لی (صـ۸۹) : اپنی دولت و بادشاہت جتائی ۔

امام ضامن ثامن : حضراتِ شیعہ کے عقیدے کے مطابق آٹھویں امام حضرت علی رضا ابن موسیٰ کاظم ۔ جب کوئی سفر کو جانے لگتا ہے تو آپ کے نام کا روپیا (یا کوئی بھی رقم ہو) بازو پر باندھا جاتا ہے تاکہ مسافر بہ عافیت واپس آئے ۔

اُمرائیت : امیری، بادشاہت ۔

امرِ شُدنی : ہونے والی بات ۔

اَنّا : وہ عورت جو بچّوں کے دودھ پلانے کے لیے نوکر رکھی جاتی تھی ۔

انبوہ : ہجوم، بھیڑ ۔

اَنٹی : سوت یا ریشم کی لچھی ۔

اَنٹی ماری (صـ۳۲) : چالاکی، فریب، دغا بازی ۔

اَنچھر : جادو کے بول ۔ پُر تاثیر بات ۔

اندام : جسم، بدن ۔

انشا کروں (صـ۲) : لکھوں ۔

انگیا : دیکھیے کُرتی ۔

انوری : ایران کا مشہور قصیدہ گو شاعر

اَنیلا (صـ۵۲) : ناتجربہ کار ۔

اُوپچی : ہتھیار بند سپاہی، پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے سپاہی ۔

اَوج : بلندی ۔

اودھ بنگلہ (صـ۳۰۳) : فیض آباد ۔

اورگی : کارچوبی کام کے اُن مختلف قطع کے ٹکڑوں کو کہتے تھے جو زنانے یا مردانے جوتوں پر آرایش کے لیے لگائے جاتے تھے ۔

اہتزاز : خوش گوار ہوا کا چلنا۔ فرحت، خوشی، شگفتگی۔ وجد کی کیفیت۔
اہلِ بصر : آنکھوں والے، اربابِ نظر۔
اہلِ حرفہ : پیشہ ور۔
اہلِ دُوَل (ص۱۵۹) : مال دار۔
اہلِ قبور : مُردے۔
ائمّہ : امام کی جمع۔
ایاغ : پیالہ، شراب پینے کا پیالہ۔
ایلیا : گھوڑے کی طویل تیز رفتاری۔
ایزد : خدا۔
ایوان : محل، مکان، شاہی محل۔
ایہا النّاس : اے لوگو!
باب : دروازہ۔
بابل : عراق کے ایک مشہور شہر کا نام، یہ شہر ایک زمانے میں جادو اور شراب خوری کی کثرت کے لیے مشہور تھا۔
باج : ٹیکس۔ زمین کا محصول جو بادشاہ کو دیا جاتا تھا۔ خراج۔
باج ستاں : خراج لینے والا۔
باج گزار (ص۹۳) : خراج ادا کرنے والا۔
باچھیں : باچھ کی جمع۔ باچھ : ہونٹھ کا سرا۔
بادِ سموم (ص۵۰) : بہت گرم ہوا۔ لُو۔
بادلا : سونے چاندی کے تار جو گوٹا بننے اور کلابتون بٹنے میں کام آتے ہیں۔ زری کا کپڑا جو ریشم اور چاندی کے تاروں سے بنا جاتا ہے۔

بادِ مراد : موافق ہوا۔
بادہ پیمائی : شراب پینا۔
باد ہوائی سفر (ص۲۱۱) : فضول سفر، جس کا کوئی مقصد و مدعا نہ ہو۔
بادیہ : جنگل، بیابان۔
بار : پھل (ص۵۹)۔ بار : دیر (ص۱۵۱)۔
باربد : ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کے دربار کا مشہور گانے والا۔
بارِ ہستی سے سبک دوش کیا (ص۲۱) : قتل کرا دیا۔
باری دارنیاں : وہ عورتیں جو شاہی محلوں میں چوکی پہرے پر رہتی تھیں۔
باریک بیں : معاملے پر غور سے نظر کرنے والا، تیز فہم۔
باریکی چھٹنا : نازک باتیں نکلنا، لطافت و نزاکت پیدا ہونا۔
باشا : ایک شکاری پرندہ۔
باغبانِ قضا و قدر (ص۵۳) : خدا۔
بال : بازو۔
بالچہ : پرانے زمانے میں توپوں کے ساتھ ایک لوہے کی ڈولچی سی ہوتی تھی، جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔
بالرّاس والعین (ص۲۳۹) : بہت ادب کے ساتھ۔
بالش : تکیہ۔
بالفتح : زبر کے ساتھ (جیسے : بَ)۔
بالکسر : زیر کے ساتھ (جیسے : بِ)۔
بالیں : سرہانا۔
بان : چنگا، ایک خاص قسم کی آتش بازی جو تیر کی شکل کی ہوتی ہے اور شتابہ لگانے سے تیر کی طرح اڑی چلی جاتی ہے۔ جنگ کے موقع پر دشمن کی طرف

آگ لگانے کے لیے بھی استعمال کی جاتی تھی۔

[بان دار: سواری میں ہاتھی کے ساتھ رہنے والے وہ ملازم جو اپنے ساتھ آتشی تیر رکھتے تھے۔ راستے میں اگر ہاتھی مست ہو جاتا یا مستی کے آثار ظاہر ہوتے تو یہ گروہ آتشی تیروں سے اُسے ڈرا کر قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا]

بانات: بغیر بُناوٹ کا اُونی کپڑا، جو اون کے روؤں کو جما کر، کاغذ سازی کے طریقے پر بنایا جاتا ہے اور پتلا، دبیز، ادنا، اعلا ہر قسم کا ہوتا ہے۔

باناتِ پُر زر: وہ بانات جس پر سنہرا کام ہو۔

بانبی: سانپ کا بل۔

باہر بندد: مراد ہے دیہاتی، گنوار آدمیوں سے۔

باہمہ بے ہمہ: ایسے شخص کے لیے کہتے ہیں جو سب سے میل جول رکھے اور لڑائی جھگڑے سے الگ رہے۔

بائی تپکی (ص۲۴۴): ڈر کے مارے پیٹ میں اینٹھن شروع ہو گئی۔

بایاں: وہ طبلہ جو بائیں طرف رہتا ہے۔ یہ بعض آواز کی سنگت کے لیے اور گونج پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

بِبھاس: ایک راگنی کا نام۔

بَتَر (ص۱۰۱): بدتر۔

بُٹنا: ابٹن، ایک خوش بودار مسالا، جس سے جسم خوشبودار اور ملائم رہتا ہے۔ بیاہ شادی میں اکثر دولھا دلھن کے ملا جاتا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے فرہنگِ آصفیہ)۔

بجرا: دریا میں سیر کرنے کی ہلکی پھلکی تیز رفتار کشتی جس کو ایک آدمی یا خود سوار کھے لے۔

بجلی (ص۱۴۹): کان کی لو میں پہننے کا ہلال کی شکل کا ایک زیور۔ کان کی لو میں لٹکتا اور ہلنے میں چمکتا ہے، اس لیے بجلی نام پڑ گیا۔

بحری (بہری): ایک شکاری پرندہ جو اکثر کبوتروں کا شکار کرتا ہے۔

بختِ نافرجام (ص۸۳): بدنصیب۔

بُختی: ایک قسم کا بڑا اونٹ جو خراساں سے آتا تھا۔ بڑا اونٹ۔ تیز رفتار اونٹ۔

بخشی: شاہی زمانے میں فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے اور حساب کتاب رکھنے والا وزیر، افسرِ اعلا۔

بد رُچی (ص۱۱): مراد ہے اُس عورت سے جو دل کو نہ بھائے، جس سے نفرت ہو۔

بدکیش: بے دین، بد مذہب۔

بدگِل: بدصورت، کریہ صورت۔

بدیہہ جواب دیا (ص۲۹۱): فوراً جواب دیا۔

بذلہ: لطیفہ، دل چسپ بات۔

بذلہ سنج: دل چسپ باتیں کرنے والا۔ لطیفہ گو۔

بَر (ص۴۹): بغل، گود، پہلو۔

برایا: خلقِ خدا، رعیت۔

برائے چندے: کچھ دنوں کے لیے۔

بربری (ص۲۲): ایک قسم کی عمدہ بکری۔

بُرج: ستاروں کی رفتار اور اُن کے مقامات سمجھنے کے لیے آسمان کے بارہ حصے کیے گئے ہیں، ہر حصے کو برج کہتے ہیں۔ ہر حصے میں جو ستارے واقع ہیں، اُن کی

کوئی فرضی شکل فرض کر کے، اُس حصے کا وہی نام
رکھ لیا ہے، جیسے: برجِ حمل۔
بُرجِ اسد: آسمان کا پانچواں برج۔
بُرجِ حمل: آسمانی دائرے کے بارہ برجوں میں سے
پہلا برج، جس کی شکل مینڈھے کی سی ہے۔ جس
دن سورج اس میں آتا ہے، شرفِ آفتاب کا دن
ہوتا ہے اور وہی دن ایرانی تہوار نوروز کا ہوتا
ہے، جس سے موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے۔
بُرچھک: آسمان کا آٹھواں برج (برجِ عقرب) جو
بچھو کی شکل کا ہے۔
برخاستہ خاطر ہوگا (ص۶۱): گھبرائے گا، اُلجھن ہوگی۔
برخود پیچیدہ ہو (ص۲۶): غصّے میں آکر۔
بَرد: سردی۔ جاڑے کا موسم۔
بَردہ: غلام، کنیز۔
بَردہ فروش: لونڈی غلام بیچنے والا۔
برکھ: آسمان کا دوسرا برج (برجِ ثور) جس کو بیل
کی شکل کا بتایا گیا ہے۔
برن: جیسی۔
برنا: جوان۔
برنجی (ص۱۰): پیتل کا۔
برودت: ٹھنڈ، سردی۔
بَرید: قاصد۔
بریز بریز کرنا یا کہنا: بار بار شکوہ شکایت کرنا۔
بَسان: طرح، مثل۔
بست در بست کا نقش (ص۲۰): ایک قسم کا نقش جو
علمِ تکسیر کے قاعدے سے بھرا جاتا ہے۔
[تکسیر: اعداد کو تقسیم کر کے تعویذ کے خانوں میں
اس طرح لکھنا کہ ہر طرف کا مجموعہ برابر ہو۔]
بِسیار: بہت۔
بَطے: شراب کی صراحی جو بطخ کی شکل کی بنائی گئی ہو۔
بُعد: فاصلہ، دوری۔
بُقچہ: کپڑوں کی چھوٹی گٹھری۔
بُقراط: مشہور یونانی دانش مند اور حکیم۔
بُکا: رونا، ماتم۔
بکتر: موٹی اور مضبوط نیم آستین (لوہے کی باریک
کڑیوں سے بنی ہوئی) پوشش، جو دشمن سے
مقابلے کے وقت، زرہ یا ریشم کے لبادے کے
اوپر پہن لی جاتی تھی۔
بگٹٹ: سرپٹ، بہت تیز (گھوڑے کے لیے)۔
بل (ص۲۳۲): بل کہ۔
بلاریب: شک کے بغیر۔
بلاگردان: صدقے ہونے والا، وہ شخص جو دوسرے
کی بلا اپنے سر لے۔
بلبلِ شیراز (ص۲۳): شیخ سعدی۔
بلقیس: قدیم شہر سبا کی ملکہ، جو حضرت سلیمانؑ کے
نکاح میں آگئی تھی۔
بلّور: ایک نہایت شفاف پتھر سا جوہر، جو کان سے
نکلتا ہے، بیش تر سفید ہوتا ہے۔
بناتُ النعش: وہ سات ستارے جو قطبِ شمالی کے
قریب ہیں اور قطب کے گرد پھرا کرتے ہیں۔

بُناگوش : کان کی لَو۔

بَنَت : کپڑے کی لمبی چٹ پر رُوپہلے تاروں کا کام۔
ایک طرح کی توئی (کپڑے پر بنی ہوئی بیل) جس میں
گوکھرو، سلما ستارہ لگا ہوتا ہے۔

بندر (ص ۲۲۵) : بندرگاہ۔

بندوقِ چقماقی (ص ۸۲) : دیکھیے پتھر کلا۔

بند ہوئی (ص ۶۲) : فکر کے مارے چپ ہوگئی، کچھ نہ کہہ سکی۔

بُنیان : نیو، بُنیاد۔

بودار : وہ کتّا جو بو سونگھ کر شکار کو تلاش کرے۔

بوڑی : نیزے کی نوک۔

بوڑی بردار : نیزہ بردار۔ بلّم بردار۔

بوقلموں : رنگا رنگ، طرح طرح کا۔

بوتا : سانس، دم۔

بوتا نکل گیا (ص ۲۹۲) : روح نکل گئی۔

بِہ : بہتر۔

بَہا : قیمت۔

بہ ایں ریش و فش : یہ معقول صورت اور ایسی بیہودہ حرکات۔
[ریش : داڑھی ۔ فش : پگڑی کا طرّہ]

بہ ایں ہیئتِ کذائی (ص ۵۲) : اِس وضع قطع سے۔

بھجنگا : ایک کالے رنگ کا پرندہ جو کوئل سے مشابہ ہوتا ہے۔

بہ درجۂ اتم : حد سے زیادہ، مکمل طور پر۔

بہ درجۂ مہیب تھی (ص ۱۲۲) : بہت زیادہ ہیبت ناک تھی۔

بھر بھرانا : مائل ہونا، فریفتہ ہونا۔

بہزاد : اوائلِ دورِ صفوی اور اواخرِ عہدِ تیموری کا نہایت مشہور ایرانی مصوّر۔

بھسونڈے : شیر علی افسوس نے آرایشِ محفل میں تعریفِ فیل کے ذیل میں لکھا ہے : "دانت اس کے طول میں ایک گز سے کچھ کم و زیاد، غارِ دہن سے لگے ہوئے، ایک بھسونڈے کے اِدھر ایک اُدھر۔" اِس سے معلوم ہوا کہ اِس لفظ کے صحیح معنی ہیں سونڈ کے اوپر کا وہ حصہ جو مستک سے جُڑا ہوا ہوتا ہے۔

بھگتیا : سوانگ بھرنے والا، ناچنے والا۔ عورتوں کے سے کپڑے پہن کر ناچنے والا۔

بہ مجردِ ارشاد : حکم دیتے ہی، کہتے ہی۔

بہ مجردِ فرمان : حکم ملتے ہی۔

بہ مجردِ نگاہ (ص ۵۶) : دیکھتے ہی۔

بہ مجردِ ورودِ رقیمۂ وداد (ص ۲۸۹) : محبت بھرا خط ملتے ہی۔

بہ مرتبہ (ص ۱۱۳) : بہت زیادہ۔

بہم ہونا : جمع ہونا، ملنا، ساتھ ہونا۔

بھنڈارا : سنیاسیوں اور جوگیوں کی ضیافت۔

بھوانی : پاربتی، شیوجی کی بی بی۔

بھونری : گھوڑے کی کھال کے بالوں کا چکّر، جو بالوں کی جڑوں میں مختلف شکل کا ہوتا ہے۔ اُن میں سے بعض کو سخت منحوس سمجھا جاتا ہے۔

بھونریاں آٹھ شکل کی ہوتی ہیں : سیپ کی شکل، گلاب کی کلی کی شکل، بھنور کی شکل، گائے کی زبان کی شکل، ہرن کے ناخن کی شکل، کھنکھجورے کی شکل، کھڑاؤں کی شکل، سانپ کی شکل۔

بِہی : امرود سے مشابہ ایک ایرانی پھل، جس کے بیجوں کو بہدانہ کہتے ہیں۔

بھیانک ہوکے کہا (ص۲۵) : گھبرا کر کہا۔

بہیر بنگاہ : فوج کے ساتھ کے ملازم، ڈیرا خیمہ، بنیے بقال وغیرہ۔

بھیرو ں : ایک دیوتا کا نام۔ ایک راگ کا نام۔

بیت السلطنت : پایۂ تخت، راجدھانی۔

بیت الصنم : بت خانہ۔

بیجا (ص۲۵۲) : کاغذ یا مٹی کی بنائی ہوئی ڈراونی صورت۔ میلوں میں اکثر ایسے چہرے بکتے ہیں اور بچے خریدتے ہیں۔

بید مشک : ایک درخت، جس کے پھول نہایت نازک اور خوشبودار، زرد رنگ کے مگر مائل بہ سبزی و سیاہی ہوتے ہیں۔ اس کا عرق مفرح قلب ہوتا ہے۔

بیرق : فوج کا نشان یا علم جو چھوٹا ہو۔

بیستوں : ایک پہاڑ کا نام، جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ فرہاد نے خسرو پرویز کی فرمائش پر اس میں سے ایک نہر نکالی تھی۔

بیشہ : جنگل، بیابان۔

بے منقا : بھنگ چھاننے کا کپڑا (صافی)۔ وہ دو شاخہ لکڑی جس میں صافی باندھ کر بھنگ چھانتے ہیں۔

بین العدمین (ص۲۳۳) : دو عدموں کے درمیان۔ اس دنیا کے دونوں طرف عدم (فنا) ہے۔ (پیدا ہونے سے پہلے اور مرنے کے بعد)۔

بیہڑ : ناہموار زمین جو اونچی نیچی ہو۔

پارینہ : پرانا۔

پا فتادہ : مراد ہے کمزور، ضرورت مند اور مجبور آدمی سے۔

پاکھر : لوہے کی باریک کڑیوں سے بنی ہوئی ایک پوشش (زرہ کی طرح) جو جنگ کے موقع پر سواری کے گھوڑے کے پٹھے پر ڈالی جاتی تھی، تلوار کی ضرب سے پٹھے کی حفاظت کے لیے۔ امن کے زمانے میں بادشاہوں اور امیروں کے گھوڑوں پر زینت کے لیے سونے یا چاندی کی پاکھر بھی لگائی جاتی تھی۔

پالیں (ص۲۶۶) : پال کی جمع۔ پال: کشتی کا پردہ، جس میں ہوا بھرتی ہے تو کشتی تیز چلتی ہے۔

پا ہنی : وہ گیت جو ڈومنیاں دلہن کی رخصت کے وقت گاتی ہیں۔

پپڑی : خستہ، بھربھری ایک مٹھائی، جو عموماً چوکور ٹکڑوں (ٹکیوں) کی صورت میں بنائی جاتی ہے۔ یہ حلوا سوہن کی قسموں میں سے ہے۔ [حلوا سوہن کی چار قسمیں ہیں: پپڑی، جوزی، حبشی، دودھیا]۔

پت : عزت، آبرو۔

پتھر کلا : چقماقی بندوق۔ پرانی ساخت کی اس بندوق کو کہتے تھے جو چقماق سے چلائی جاتی تھی۔ اس بندوق کے گھوڑے کے منہ پر چقماق پتھر لگا ہوتا تھا، جب گھوڑا گرایا جاتا تھا تو پتھر رگڑ کر آگ دیتا تھا۔

پٹا (ص۱۸۱) : گھوڑے کے چہرے کا ساز، جس کو سر دوالی بھی کہتے ہیں۔ اس میں دہانہ، سینس (ڈیگا)، گل تھنی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

پراگندہ تقریر (ص۲۸) : وہ شخص جس کی باتوں میں (گھبراہٹ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے) ربط نہ ہو۔

پر بیں : ہوشیار، فن کا کامل۔

پرتلک (ص۳۰) : کل تک، چند روز پہلے تک۔

پَرتَو : روشنی کا عکس، شعاع، جھلک۔

پرتھمی : زمین، جہان، دُنیا۔

پرکاہ : گھاس کا تنکا۔ مراد ہوتی ہے ذرا سی چیز سے۔

پروانہ (ص۱۳۵) : حکم نامہ، شاہی فرمان۔

پرویز : مشہور ایرانی بادشاہ خسرو پرویز، جو شیریں کے عاشق اور فرہاد کے رقیب کی حیثیت سے مشہور ہے۔

پرئیاں : چھے چھوٹے ستاروں کا نام جو آپس میں ملے ہوئے ہیں، عقد ثریا۔

پریتی لوگ (ص۳۶) : عزیز، دوست۔

پُڑیاں (ص۱۲۹) : "بی بی کی پُڑیاں" بھی کہتے ہیں جو عورتیں منت مانتی ہیں، وہ منت پوری ہونے پر حضرت فاطمہ کی نیاز کراتی ہیں۔ عموماً پانچ پڑیاں ہوتی ہیں جن میں شکر یا برفی ہوتی ہے۔ انھیں صرف نیک بیبیاں کھا سکتی ہیں۔ پرانے زمانے میں عام لوگوں میں سوا دمڑی سے پانچ پیسے تک کی نیاز دلائی جاتی تھی۔

پسافقرہ (ص۸۹) : دیکھیے ضمیمہ ۵۔

پکھاوج : طبلے کی وضع کی لمبوتری ڈھولک۔

پکھراج : ایک قسم کا قیمتی پتھر، جس کا رنگ زیادہ تر زرد اور بہت روشن ہوتا ہے۔ اسے زبرجد بھی کہتے ہیں۔

پکھروٹا : چاندی یا سونے کا ورق جو پان کے بیڑے پر لپیٹ دیتے تھے۔ وہ گلوری جس پر چاندی یا سونے کا ورق لپٹا ہوا ہو۔

پگاہ (ص۱۳۵) : صبح کا وقت۔

پلنگ (ص۳۱۲) : ایک مشہور درندہ۔

پنبہ : روئی۔

پنبہ دہاں (ص۱۰) : شراب کے شیشے کے منہ پر روئی لگا دی جاتی تھی کہ شراب گر نہ سکے، اسی نسبت سے کم سخن اور خاموش کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔

پنج شاخہ : وہ لوہے کا پنجہ، جس کو بانس پر لگا دیتے ہیں، اس میں پانچ فلیتے روشن کر دیے جاتے ہیں۔

پنجۂ مرجاں : مرجان (مونگا) سمندر (دریائے شور) کی تہ سے نکلتا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ (بعض دفعہ) یہ آدمی کے پنجے سے کچھ مشابہت رکھتا ہے، اسی نسبت سے اُسے "پنجۂ مرجاں" کہا جاتا ہے۔

پنجیری : ایک قسم کی مٹھائی، جو چوتھی کی صبح کو دلھن کے میکے سے آتی ہے اور تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ اس طرح بنائی جاتی ہے کہ سوجی کو گھی میں بھون کر اس میں شکر، چھوارے، سونٹھ اور گھی میں بُھنے ہوئے گوند، مکھانے ملا دیتے ہیں۔ انھی پانچ اجزا کی نسبت سے اس کا نام پنجیری پڑ گیا۔

پنسوہی : چھوٹی کشتی۔

پنکھیرو : پرندہ۔

پنّی : جوتی کا اوپر کا وہ حصہ جس پر کلا بتون کا کام کیا ہوا ہوتا ہے۔

پوتھی : ہندوؤں کی مذہبی کتاب۔ علمِ نجوم کی کتاب۔

پوزی : وہ چمڑے کا حلقہ جو گھوڑے کے کانوں میں سے نکال کر دہانے کے گرد اگرد لگا دیتے ہیں۔

پَونڈا : ایک قسم کا موٹا گنّا، یہ دو قسم کا ہوتا ہے : سفید اور سیاہ۔ اس میں بہت رس ہوتا ہے اور نرم ہوتا ہے۔

پَھٹکی : چھوٹے پرندوں کے پکڑنے کا ایک خاص طرح کا بنا ہوا ٹاپا یا پٹارا، جس کے مُنہ کا ڈھکنا پرندے کے اندر جاتے ہی پھٹ سے بند ہوجاتا ہے۔ پھٹکی میں ایک طرف پلے ہوئے پرند بند ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر جنگلی پرند پھٹکی میں داخل ہوجاتا ہے۔

نئے پکڑے ہوئے جانور بند کرنے کا ٹوکرا۔

پہلوتہی کرتے ہیں (ص۹) : انکار کرتے ہیں۔

پیٹا توڑنا : اُڑتے ہوئے پتنگ کی ڈور کو بیچ سے توڑ لینا۔

پیچوان : ایک قسم کا حقہ، جس کی نے بہت لمبی اور بہت لچک دار ہوتی ہے تاکہ دور بیٹھ کر یا لیٹ کر جس طرح چاہیں، بہ آسانی پی سکیں۔ اسے "نَلکی" بھی کہتے ہیں (آصفیہ)۔

پیدا (ص۹) : ظاہر۔

پیرامون : آس پاس۔

پیر زال : بوڑھی عورت۔

پیرِ نابالغ : وہ بوڑھا جو ناسمجھ بچوں جیسی باتیں کرے۔

پیش خدمت (ص۲) : خادم۔

پیش خیمہ : وہ خیمہ جو بادشاہوں اور امیروں کے سفر میں آگے آگے لے جایا جاتا تھا، تاکہ منزل پر پہنچنے کے بعد انتظار نہ کرنا پڑے۔ کنایتاً کسی کام کے ہونے کا سامان ظاہر ہونا۔

پیش قبض : خنجر۔

پیغمبرِ کنعان : یعقوب علیہ السلام۔

پَیک : قاصد۔

پیکاں : تیر کی انی، برچھی کی نوک، نیزے کی نوک۔

پینڈیاں : ایک قسم کے لڈو، میدے کو گھی میں بھون کر اور اُس میں شکر، میوہ وغیرہ ڈال کر بنائے جاتے ہیں۔ دستور تھا کہ بیاہ میں ساچق کے ساتھ دلھن کی طرف سے دولھا کو پینڈیاں بھیجی جاتی تھیں۔

تازی (ص۹) : عربی گھوڑا۔ شکاری کتا (ص۱۱)

تازیانہ ہوا (ص۳) : دل میں نیا ولولہ پیدا ہوگیا۔

تان آہنج : ایک سُر کے تحت بولوں کو بار بار نئے انداز سے دہرانا۔ "طریق الاپ یوں ہے کہ... بول الاپ کے اور سُر راگ کے قائم رہے، توحسبِ لیاقت... تان آہنج کرے، یعنی گھٹے بڑھے" (معدن الموسیقی)۔

تبار : خاندان۔

تحت الثریٰ : زمین کا سب سے نیچے کا طبقہ۔

تحریر : دیکھیے : گٹکری۔

تحریرِ کربلا : کفن کے لیے کربلا سے لایا ہوا کپڑا، جس پر آیاتِ قرآنی چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

تحیّت (ص۲) : سلام کرنا، سلام۔

تختِ رواں : وہ تخت جس پر شادیوں میں ناچنے والے ناچتے ہوئے نکلتے ہیں۔ وہ تخت جس پر بادشاہ سوار ہوکر نکلتا تھا، ہوادار۔

تختِ زنگاری (ص۳۳۲) : آسمان۔

تختِ طاؤس : شاہ جہاں بادشاہ کا بنوایا ہوا مشہور تخت۔

تختہ بندی : لکڑی کے تختوں کا فرش۔ کیاریوں کا باقرینہ

اور خوش اسلوب ہونا۔

تدرو : ایک قسم کا جنگلی مرغ جو ایران میں ہوتا ہے۔ یہ نہایت خوش رنگ اور خوش رفتار ہوتا ہے۔

ترپولیا : تین بڑے در جو بازاروں میں اِس طرح بنائے جاتے تھے کہ ہر در سے شاہی جلوس کے ہاتھی وغیرہ بہ آسانی نکل سکیں۔

تردد سے (ص۱۴۴) : بہت کوشش سے۔

ترسا : آتش پرست، جن کو ہندستان میں "پارسی" کہتے ہیں۔

ترشح : ہلکی پھوار۔

تریاک : افیون۔

تریل : ست ہاتھی کی مادہ۔

تسبیح سلیمانی : سنگِ سلیمانی کے دانوں سے بنی ہوئی تسبیح۔ اِس پتھر کا رنگ اکثر دو رنگا ہوتا ہے۔ اِس کے بیچ میں ایک آڑی سفید لکیر ہوتی ہے (جسے زنار کہتے ہیں)۔

تسطیر : لکھنا۔

تشہیر کرنا (ص۲۰۶) : کسی کی رسوائی کو شہرت دینا۔ پہلے دستور تھا کہ جس مجرم کی تشہیر کرنا ہوتی، اُس کا منہ کالا کر کے اور اُلٹا گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراتے۔

تصدیعات : تکلیفیں۔

تصرفی باورچی خانہ (ص۱۳۰) : جہاں نوکروں چاکروں (یا عام لوگوں) کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔

تصویرِ آذری سی (ص۲۴۶) : بے جان سی۔ پتھر کے بت کی طرح بے حرکت۔

تضرع : گریہ وزاری، منت سماجت۔

تعب : تکلیف، سختی۔

تفاوت : فرق۔ فاصلہ، دوری۔

تفاوت اور قرینے کا شور (ص۳۶) : "دور رہو" اور "ادب سے چلو" کا شور۔

تفتہ جگر : دل جلا۔

تکا : بغیر پھل کا تیر۔ اس میں نوک کے بجائے گھنڈی ہوتی تھی اور یہ تیر اندازی کی مشق کے کام آتا تھا۔

تگاپو : دوڑ دھوپ۔

تلا : آسمان کا ساتواں برج (برج میزان) جو ترازو کی شکل کا ہے۔

تلازم (ص۳۲) : شعر یا فقرے میں کسی خاص مضمون کی رعایت سے الفاظ لانا۔

تلاطم : دریا کا موجیں مارنا۔

تلامذہ : (تلمیذ کی جمع) شاگرد۔

تلوار کا گھاٹ : وہ جگہ جہاں سے تلوار میں خم شروع ہوتا ہے۔

تمامی (ص۳۶) : ایک قسم کا ریشمی کپڑا، جس کی بناوٹ میں سنہرے یا رُپہلے بادلے کا چارخانہ بُنا جاتا تھا۔ اِسے "زری پارچہ" بھی کہتے ہیں۔

تمثال : پیکر، صورت۔

تنبول (ص۱۴۱) : ایک پرانی رسم، جس میں چوتھی کی صبح کو میکے سے سٹھورے کے ساتھ پان کے مرکب کا عرق (شیشے میں) دلھن کے پینے کے لیے آتا تھا۔ یہ عرق اِس ترکیب سے بنایا جاتا تھا کہ بہت سے پان اور کتھا چونا اندازے کے موافق ڈال کر پانوں کو گل لیا

جاتا تھا، پھر چھوٹی الائچی، لونگ اور شکر گھول کر شربت سا بنا لیا جاتا تھا۔ خیال تھا کہ اس کے پینے سے جسم میں طاقت آجاتی ہے۔

تنت منترا: دنیاوی تعلقات، دنیا کے جھگڑے بکھیڑے۔ وہ حلقہ جو کن پھٹے جوگی کانوں میں پہنتے ہیں۔

تنگ (ص۲۶۲): گھوڑے کی زین کسنے کا چمڑے کا تسمہ۔

تنویرِ فلکِ چارم (ص۳۲۲): سورج۔

توام: جڑواں۔

توبۂ نصوحا: سچی توبہ۔

توتا (ص۳۲۵): توڑے دار بندوق کا وہ لوہے کا آلہ جس میں فتیلہ رکھ کر بارود کو آگ دیتے تھے۔

توجہ پڑنا: مرشد کا اثر کی طرف مرید کا تصور بندھ جانا۔ مرشد کی اندرونی کیفیت مرید کے دل پر وارد ہونا۔

تودہ: ڈھیر۔ وہ مٹی کا ٹیلا جس پر تیر انداز نشانے کی مشق کیا کرتے تھے۔

توڑا: فلیتا، تتابہ جو پرانی وضع کی توڑے دار بندوق چلانے کے لیے گھوڑے کے ذریعے استعمال کیا جاتا تھا۔ اشرفی یا روپوں کی تھیلی۔

توسن: گھوڑا۔

توشہ: وہ کھانا جو مسافر اپنے ساتھ لے جائے۔ زادِ راہ۔

تو تُبا: ایک قسم کا کدو، جس کو اندر سے صاف کر کے فقیر اپنا کشکول بناتے ہیں۔

تہمتن: بہت تن و توش کا، بہت بہادر۔ رستم کا لقب۔

تیرہ بخت: بدنصیب۔

تیز بال (ص۳۱۱): تیز اڑنے والا۔

تیمناً: برکت کے لیے۔

ٹانٹھا: طاقت ور، موٹا تازہ، مسٹنڈا۔

ٹپا: دیکھیے ضمیمہ ۳ بہ ذیل "شوری"۔

ٹپکا لگنا: چونا، رسنا، چھت سے برابر پانی کی بوندیں گرنا۔ پھلوں کا ایک کر درختوں سے متواتر گرنا۔

ٹٹی (ص۲۰۲): بانس یا سرکنڈوں سے بنی ہوئی شکار کھیلنے کی آڑ، جو شکاری اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

ٹکسال باہر: غیر معتبر، غیر مستند۔ وہ محاورہ جسے اہلِ زبان نہ بولتے ہوں۔

ٹکور: نوبت اور نقارے کی آواز۔

ٹمٹا: ٹھنگنا، دُبلا پتلا، کم رو۔

ٹوم: زیور، خوب صورت عورت، مال دار عورت۔

ٹونے (ص۱۴۲): ایک طرح کے گیت جو شادی بیاہ میں ڈومنیاں آرسی مصحف کے وقت گاتی ہیں اور دولھا سے ٹونا لگنے کا اقرار کراتی ہیں۔

ٹونا: جادو، منتر۔

ٹھاٹھر: ڈھانچ، ٹٹی۔ شادی یا دیوالی کے موقعے پر روشنی کرنے کے لیے ٹٹیاں بنائی جاتی ہیں۔

ٹھنڈی گرمیاں: اوپری محبت، دکھاوے کی محبت کی باتیں، بے پروا شیخیاں۔

ثابت و سیارہ: ثابت: وہ ستارہ جو گردش نہ کرے۔ سیار: وہ ستارہ جو گردش کرتا رہے۔

ثمود: حضرت صالحؑ کی امت، جو تباہ کر دی گئی تھی۔

ثورِ فلک: آسمان کے دوسرے برج کا نام جو بیل کی شکل کا

ہے۔ (ثور: بیل)۔

جادہ: پگڈنڈی۔ وہ پتلا سا راستہ جو لوگوں کی آمد و رفت سے بن جاتا ہے۔

جالینوس: یونان کا مشہور حکیم۔

جامِ جم (ص۲۱): ایک پیالہ تھا، جسے جامِ جمشید اور جامِ جہاں نما کہتے ہیں، جس کے لیے یہ مشہور ہے کہ اس میں دُنیا کا احوال معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جام جمشید کے پاس نہیں، بلکہ ایک دوسرے بادشاہ کیخسرو کے پاس تھا۔

جامع المتفرقین: بچھڑوں کو ملانے والا۔

جان جوکھوں کی (ص۱۳۲): اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا۔

جاں گزا: جان کو گھٹانے والا۔ جان کو نقصان پہنچانے والا۔

جُبّہ: لمبے کُرتے کی صورت کا ایک خاص لباس۔

جھجھ پڑیں (ص۲۶): لڑائیاں ہوں۔

جدّ و آبا: باپ دادا۔

جدّ و کد سے (ص۲۶۷): بہت کوشش سے۔

جدولِ آبِ رواں (ص[illegible]): باغ کے چاروں طرف نہر جاری تھی۔ جدول: صفحے کے چاروں طرف جو رنگین خط کھینچا جائے۔

جدی: آسمان کے ایک بُرج کا نام۔

جرس: گھنٹا جو قافلے والے کوچ کے وقت بجایا کرتے تھے۔

جُرّہ: ایک شکاری پرندہ۔

جریب: ہندستانی ساٹھ گز اور انگریزی پچپن گز کی زنجیر جو زمین ناپنے کے کام آتی تھی۔

جریب زمین پر پڑتی (ص۱۵۳): پرانے زمانے میں شاہی جلوس میں ہاتھی کے پیچھے ریشم کی ڈوری پڑی ہوتی تھی، دربان اس کو ہاتھ میں لپیٹتا جاتا تھا، جب ایک کوس پورا ہو جاتا تھا تو ایک جھنڈی لے کر بادشاہ کو مجرا کیا کرتا تھا، جس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ سواری کوس بھر آئی۔ اس ریشم کی ڈوری کو جریب کہتے تھے۔

جریدہ: تنہا۔

جَست و خیز: اُچھل کود۔

جستہ جستہ (ص۴۹): کہیں کہیں۔

جشنِ جمشیدی (ص۱۲۹): بہت بڑا جشن۔

جعد: چوٹی۔

جَفْر (ص۳۵): ایک علم کا نام جس کے ذریعے غیب کا احوال دریافت کیا جاتا ہے۔

جگت رنگی: دنیا کا احوال۔

جگر بند: بیٹا۔

جلادِ سپہر (ص۲۱۶): سورج۔

جلدو (ص۲۲۱): محاوضہ، انعام۔

جلسے والی (ص۲۰): نصیر الدین حیدر کے محلات میں پچاس صاحبِ مرتبہ اور دولت مند عورتوں کا گروہ تھا جن کو "جلسے والیاں" کہا جاتا تھا۔ ہر ایک نوبت بہ نوبت صحبت نصیر الدین حیدر میں باریاب اور ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتی تھی۔ (تاریخ اودھ)

جِلَو: سواری کے ساتھ کا ٹھاٹ باٹ۔ سواری کے ساتھ۔

جلو خانہ (ص۱۸۶): شاہی دروازے کے سامنے بنایا ہوا میدان یا سبزہ زار۔

جلودار (ص۱۵۱): وہ شخص جو گھوڑے کی باگ پکڑ کر سواری کے ساتھ چلے۔ خدمت گار۔

جلیسیں (ص۱۳۱) : سہیلیاں۔

جم : جمشید، ایران کا مشہور بادشاہ۔

جمِّ غفیر : بہت ہجوم۔

جملۂ معترضہ : گفتگو کے درمیان ایسا جملہ (ایسی بات) لانا جو اگر نہ ہوتا تب بھی گفتگو میں خلل نہ پڑتا۔ زائد بات۔

جناح (ص۲۵٦) : آگے رہنے والی فوج جسے ہراول بھی کہتے ہیں۔

جناں : جنّت کی جمع۔

جنگِ زرگری : مصنوعی لڑائی، دوسرے کو دکھانے یا دھوکا دینے کے لیے آپس میں لڑنا۔

جَوار (ص۲۰۱) : پڑوس، اطراف۔

جوتا خُرد نوک کا : لال نری، کاشانی مخمل اور کیمخت کے بنے ہوئے سبک جوتے، لکھنؤ کی خاص ایجاد۔ اس میں سلیم شاہی کے برعکس نوک نکلی ہوئی نہیں ہوتی تھی، فقط ذرا سا ابھار ہوتا تھا۔

جوُد : سخاوت۔

جَودت : ذہن کی تیزی، بات کو فوراً سمجھ لینے کی طاقت۔

جوڑے دار پگڑیاں : [جوڑا: کلغی، طُرّہ] طرّے دار پگڑیاں۔

جوزا : آسمان کے تیسرے بُرج کا نام، جو دو جُڑواں لڑکوں کی شکل کا ہے۔

جَوزی : حلوا سوہن کی ایک قسم۔

جَو فروشِ گندم نما : فریبی، دھوکے باز، منافق۔

جَولاں کرنا : گھوڑا دوڑانا۔

جون پور سے دل سرد ہو گیا : جون پور کے عطر کی قدر و قیمت نہیں رہی۔

جون پور کا قاضی : بے وقوف۔

جوینده : ڈھونڈنے والا۔

جھاڑی جُھنڈی : جھاڑی: چھوٹے کانٹے دار درخت۔
جُھنڈی: وہ کھونٹی جو پودوں کو کاٹ لینے کے بعد کھیت میں کھڑی رہ جاتی ہے۔

جھانکی (ص۲۵٦) : اس کے اصل معنی ہیں: پالکی یا ڈولی کے پردے میں سواری کے جھانکنے کے لیے بنا ہوا سوراخ۔ یہاں مراد ہے ایسی آڑ سے جس کے پیچھے سپاہی چھپ کر دشمن کی فوج کو دیکھ سکیں۔

جہت (ص۲۰۱) : سبب۔

جھجکنا : چونکنا، بھڑکنا۔

جھلا بور : چمکیلا، جگ مگاتا۔

جہل خانہ (ص۱۱) : جیل خانہ۔

جھمکڑا : کرّوفر، شان و شوکت، رونق۔

جہندہ : کودنے والا۔

جھونٹک جھانٹا : لڑائی میں ایک دوسرے کے سر کے بال پکڑ کر کھینچنا اور مارنا۔

جیغہ : ایک جڑاؤ زیور کا نام، جسے پگڑی پر باندھتے تھے۔ یہ مخمل کی ۴ انچ لمبی اور ۲ انچ چوڑی پٹی ہوتی تھی، اس پر زردوزی کا کام ہوتا تھا اور سونے کا ایک پتر ٹنکا ہوتا تھا، جس پر جواہر جڑے ہوتے تھے۔

چادر پھراتے (ص۲٦۳) : ہتھیار ڈال کر پناہ مانگتے۔

چار آئینہ : ایک قسم کی زرہ جس میں چار لوہے کی تختیاں، بانات اور مخمل میں منڈھ کر سینے اور پیٹھ کی طرف

لگاتے تھے۔

چار جامہ: موٹے کپڑے یا نمدے کی گدّی جو معمولی ضرورت کے لیے، زین یا کاٹھی کی جگہ گھوڑے پر کسی جائے۔

چارقُب: امیروں کا ایک طرح کا لباس۔

چانپ (ص۳۲۷): بندوق کا وہ پرزہ جس کے ذریعے کُندہ نال سے جڑا رہتا ہے۔

چانپ کے پتھر (ص۳۲۷): دیکھیے چقماقی بندوق۔

چاندنی نے مارا (ص۹۵): فالج ہو گیا ہے۔

چاؤش: نقیب، چوب دار۔

چت (ص۳۶): خیال، دھیان۔

چرخِ چنبری: گردش کرنے والا آسمان۔

چرسا: چمڑے کا بڑا ڈول۔

چرکٹا: جنگل یا کھیت سے ہاتھی کے لیے چارا کاٹ کر لانے والا ملازم۔ یا ہاتھی کے لیے چارا بنانے والا ملازم۔

چُسکی: وہ افیون جو افیونی خلافِ وقت پیتے ہیں۔

چشمِ خوں پالا (ص۱۰): خون سے بھری ہوئی آنکھ۔ غم و الم میں ڈوبی ہوئی آنکھ۔

چشم داشت: امید۔

چشمک زن (ص۳۳): طعنہ دینے والا۔

چشمک کرتے تھے (ص۲۳): بچتے تھے، انکار کرتے تھے۔

چشمۂ حیواں: آبِ حیات کا چشمہ۔

چشمۂ زندگانی: ایضاً۔

چقماق (ص۱۶۲۔ ص۳۲۷): دیکھیے پتھر کلا۔

چلّہ (ص۱۱): چالیس دن۔

چم و خم (ص۱۸۱): چمک دمک۔

چندے بود و باش کرتا (ص۳): کچھ دن رہنا۔

چنڈول: (چوڈول، یعنی چاروں طرف باڑ والا) تام جھام کی قسم کی ایک سواری، جس کو کہار اٹھاتے تھے۔ چوپہلا۔

چنگ: ایک باجا جو ستار کی قسم سے ہے۔

چنگال: جانوروں اور شکاری پرندوں کا پنجہ۔

چنوَر: وہ بالوں کا بنا ہوا گچھا، جس سے مکھیاں اڑاتے ہیں۔

چو اگن: چاروں سمتوں میں جلنے والی آگ۔ ایک قسم کے جوگی، جنھیں ہٹ جوگی کہتے ہیں، وہ تپسیا کے لیے چاروں سمتوں میں آگ جلا کر بیچ میں خود بیٹھتے ہیں۔

چوپڑ کا بازار: وہ بازار جس میں ایک دوسرے کے مقابل چار راستے ہوں اور ہر راستے پر دکانیں ہوں۔

چوپہلا: دیکھیے چنڈول۔

چو محل (ص۳۳): وہ بی بی جو بیاہتا بی بی کے سوا ہو۔

چوک لگا رہتا ہے: بہت مجمع رہتا ہے۔

چوگانی: حقّے کی سیدھی نلی، جس سے دھواں کھینچتے ہیں۔

چوگھڑے: دیکھیے ساچق۔

چونڈا: وہ بالوں کا گچھا جو عورتیں سر پر لا کر باندھتی ہیں۔

چھانڈا: حصہ۔ بخرا۔

چھبڑی: ٹوکری۔

چھپکا: پانی کا بڑا چھینٹا۔

چھچکارا (ص۱۱): گھوڑے کو آگے بڑھایا۔

پچھرہ لکھنا (ص۱۲۵) : بھرتی کرنا، حلیہ لکھنا نئے ملازم کا۔

پچھلا : کیچڑ کی زمین، وہ زمین جو پانی اور دلدل سے پُر ہو۔

چہل کنجی کا کٹورا : ایک بڑا کٹورا جس میں اوپر کی طرف چالیس سوراخ ہوتے ہیں اور اُن میں چھلّے پڑے ہوتے ہیں اور اُن چھلّوں میں چالیس چابیاں یا چابی نما کوئی چیز ہوتی ہے۔ کٹورے کے اندر قرآن کی آیتیں کندہ ہوتی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ اس میں پانی پینے سے بیمار کو یا آسیب زدہ لوگوں کو شفا ہوتی ہے۔

چہل منبری (ص۲۴۵) : یہ پُرانی رسم ہے۔ حاجت مند منّت پوری کرنے کے لیے عشرے کی رات کو ہر امام باڑے میں منبر پر دو شمعیں روشن کرتا تھا اور چالیس منبروں پر شمعیں روشن کرنے کے بعد، خاموشی کے عالم میں دُعا مانگ کر اپنے گھر واپس جاتا تھا، کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ امام باڑہ آغا باقر سے چودھرائن کے امام باڑے تک چہل منبری ختم ہو جاتی تھی۔ (تاریخ لکھنؤ)۔

چھوچھو : دایہ، کھلائی، وہ عورت جو بچوں کی خدمت کے لیے رکھی جاتی ہے۔

چھوٹی اُمّت : نیچ قوم، ذلیل لوگ۔

حاجبان : حاجب کی جمع۔ حاجب : دربان۔

حار و بارِد زمانہ دیدہ (ص۲۹) : زمانے کا گرم و سرد دیکھے ہوئے، تجربے کار۔

حاضری (ص۱۲۹) : وہ کھانا جس پر شہدائے کربلا خاص کر حضرت عبّاس کی فاتحہ دی جاتی ہے۔ اس میں کباب، شیرمال، پیاز، مولی، پودینہ، پنیر اور حلوا خاص طور پر ہوتا ہے۔

حاکیان : حاکی کی جمع، حکایت بیان کرنے والے۔

حبشی : حلوا سوہن کی ایک قسم۔

حرف ہے (ص۲۱) : اِس کی سخاوت کے سامنے پُرانے سخی بادشاہوں کی کچھ حقیقت نہیں۔

حرماں : بدنصیبی۔

حشری : وہ گھوڑا جو اور گھوڑوں کے ساتھ مل کر رہے۔

حصار : چہار دیواری، شہر پناہ۔

حصن : قلعہ۔

حصنِ حصین : مضبوط قلعہ۔

حضّار : حاضرین۔

حظ : خوشی، مزہ، عیش۔

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات : حاکم کا حکم ناچار ماننا پڑتا ہے۔ موت کی طرح اس سے بھی مفر نہیں۔

حکومت نہ کرو (ص۳۰۲) : جبر نہ کرو۔

حلقہ بہ گوش : غلاموں کے کان میں سونے یا چاندی کا حلقہ ڈال دیا جایا کرتا تھا۔ مجازاً : تابعدار۔

حمرا : سرخ۔

حواصل : ایک سفید آبی پرندے کا نام۔ اس کا پوٹا بہت بڑا اور آگے کو نکلا ہوا ہوتا ہے۔ مجازاً اُس شخص کو کہتے ہیں جو بہت کھانا کھاتا ہو، پیٹو۔

حوت : مچھلی۔ آسمان کا بارھواں برج (برجِ حوت)۔

حول : طاقت، قوت۔

حیّ : زندہ۔

حیص بیص : حجتا حجتی، تکرار۔

خاتم المرسلین : تمام نبیوں کی نبوت ختم کرنے والے آخری نبی۔ مراد ہے رسول اللہؐ سے۔

خاشاک : کوڑا کرکٹ۔

خاص بردار : ایک قسم کے سپاہی جو شاہی سواری کے آگے آگے کندھوں پر بندوقیں رکھ کر چلتے تھے۔

خاصہ (ص۶۲) : اُمرا اور بادشاہوں کا کھانا۔

خاصیاں (ص۱۸۲) : اُمرا کی خاص بندوقیں۔

خاصے والیاں (ص۲۰) : شاہی کھانے سے متعلق اہتمام کرنے والی عورتیں۔

خاقانی : فارسی کا مشہور ایرانی شاعر، جس کے قصیدے معنوی مشکلات کی بنا پر بہت مشہور ہیں۔

خاکدانِ پست بنیاد (ص۲) : یہ زمین، دُنیا۔

خام پارا : مکّار عورت۔

خامہ : قلم۔

خانماں : خاندان۔

خانہ جنگ : وہ شخص جو معمولی سی بات پر لڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔

خانہ خانۂ شماست : یہ گھر آپ ہی کا گھر ہے۔

خانہ زاد : غلام۔

خاور : پورب۔

خُتن : ایک شہر تھا مشرقی ترکستان (چینی ترکستان) میں۔ کبھی کبھی ختن سے تمام مشرقی ترکستان مراد لیا جاتا تھا اور شمالی چین کو ختا کہتے تھے۔

خجستہ فال : مبارک شگون والا۔

خجلت : شرمندگی۔

خجلت دہِ بے قراریِ سیماب (ص۸) : پارے کی بے قراری کو شرمانے والا۔ پارے سے بڑھ کر بے قرار۔

خدنگ : تیر۔

خدیو : بادشاہ۔ مصر کے بادشاہ کا لقب تھا۔

خدیوِ گیہاں : آسمان مرتبہ بادشاہ۔

خراج : زمین کا محصول۔ وہ رقم جو بادشاہ کو بطورِ محصول ادا کی جائے۔

خُرد نوک کا جوتا : دیکھیے : جوتا خرد نوک کا۔

خرقہ : پیوند لگا ہوا کپڑا، پُرانا لباس، درویشوں کا لباس، گُدڑی۔

خرمن : کھلیان۔ غلّے کا ڈھیر جس سے بھوسا الگ کیا گیا ہو۔

خروس : مُرغ۔

خزانہ (ص۹۹) : وہ جگہ جہاں حوض اور فوارے کے پانی کا ذخیرہ رہتا ہے۔

خسران : نقصان۔

خسران مآل : جس کا انجام نقصان ہو۔

خسرو : خسرو پرویز، ایران کا مشہور بادشاہ جو شیریں پر عاشق تھا۔

خسروِ انجم : چاند۔

خسروِ رنگیں کلاہ (ص۲۲۵) : سورج۔

خسوف : چاند گہن۔

خسوفِ سفر : سفر میں پہنچنے والی تکلیفیں، مصیبتیں۔

خشت : اینٹ۔

خَشم : غصہ

خطِ ریحاں : اِسے خطِ گلزار بھی کہتے ہیں، جلی حرفوں کے بیچ میں نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔

خطِ شکستہ : خطِ نستعلیق کے خلاف گھسیٹ میں لکھا جانے والا خط۔

خطر : بہتا۔

خفقان : دل دھڑکنا، گھبراہٹ، مالیخولیا، دحشت اور وہم۔

خُلطا : میل جول۔

خُلع : عورت کا اپنے مہر کے عوض شوہر سے طلاق لینا۔

خُلق : خوش مزاجی، ملنساری۔ عادت خصلت۔

خِلقت : فطرت، پیدائش۔

خَلقت : مخلوق، لوگ۔

خم خانہ : شراب خانہ۔

خم خانۂ الم کے جرعہ نوش (ص۱۹) : سب غم والم میں گرفتار تھے۔

خنجری : چھوٹا دف، ڈفلی۔

خندۂ دنداں نما : خندۂ زیرلب (مسکراہٹ) کے برخلاف ایسی ہنسی جس میں دانت کھل جائیں۔

خواب و خور : سونا اور کھانا۔

خواجہ سرا : وہ نامرد غلام (خصّی) جو امرا اور بادشاہوں کے محلوں میں آجا سکتے تھے۔

خواص (ص۲۳) : خاص ملازم، امیروں کی کنیز۔

خواصی (ص۲۳۸) : ہاتھی پر عماری اور ہودج کے پیچھے کی وہ جگہ جہاں امرا کی سواری کے وقت ان کا خاص ملازم بیٹھتا تھا۔

خَود : لوہے کی ٹوپی جو لڑائی کے موقع پر پہنی جاتی تھی۔

خود اسپے : وہ سوار سپاہی جو گھوڑے کے مالک ہوں۔

خود رفتہ : آپے سے باہر، بے خود۔

خورش : کھانا، خوراک۔

خوشہ چیں : فیض حاصل کرنے، فائدہ اٹھانے والا۔

خونابہ : پانی ملا ہوا خون، خون کے آنسو۔

خون گرفتہ : قتل کیے جانے کے لائق۔

خیار : کھیرا، ککڑی۔

خَیّاط : درزی۔

خیام : خیمے۔

خیر الانام : رسول اللہؐ۔

خیل : گروہ۔

خَیلا : پھوہڑ، بے وقوف عورت۔

داب (ص۶) : طور، طرز، ڈھنگ۔

دارا : ایران کا مشہور بادشاہ جس کو سکندر نے شکست دی تھی۔

دارِ مکافات : بدلے کا گھر۔ مراد ہے دنیا۔

دامن کشیدہ : دور۔

داؤں منجھے گئے : داؤ خالی گئے۔

دَبِیت ہو (ص۳۶) : عاشق ہو۔

دَدا : وہ عورت جو بچوں کی پرورش کے واسطے نوکر ہو، کھلائی۔

دَرَب : نقد رقم۔

دُرج : ڈبّا۔ زیور یا جواہر رکھنے کا ڈبّا۔

درگور (ص۲۹) : نفرت کا کلمہ، قبر میں جائے، مرے، غارت ہو۔

درماہہ : تنخواہ۔

دُرِ ناسفتہ : وہ موتی جس میں سوراخ نہ کیا گیا ہو۔ مجازاً کنواری عورت۔

دریائے شور : کالا پانی، سمندر۔

دُرِ یتیم صدقِ راستی (ص۲۸۶) : بہت سچا آدمی۔

دریں ولا (ص۱۴۲) : اس مدت میں۔

دُردِ حنا (ص۳۲) : مہندی لگانے کے بعد ہاتھوں میں جو سفیدی رہ جاتی ہے۔

دست بُردی (ص۲۸۵) : چوری، لوٹ مار، چھین لینا۔

دست پاچہ ہوا : سٹپٹایا۔

دستیاں : مشعلیں۔ لالٹینیں۔

دشت پیما : جنگل میں سفر کرنے والا، جنگل کو طے کرنے والا۔

دشت نوردانِ وادیِ سخن (ص۱): اِس داستان کو بیان کرنے والے۔

دشنہ : خنجر۔

دگلہ : روئی دار انگرکھا۔

دل دوزی : دل دکھانا۔

دل ریش : جس کا دل زخمی ہو چکا ہو، مجازاً : عاشق۔

دُلکی : گھوڑے کی ایک چال جس میں وہ قدم پر قدم ڈالتا ہوا چلتا ہے اس طرح کہ سامنے کے سیدھے پیر کی جگہ اُلٹا پیر ڈالتا ہوا لمبا اور تیز قدم چلے۔ دوگاما۔

دلو : ڈول۔ آسمان کا گیارھواں بُرج۔

دمامہ (ص۲۵۷) : نقارہ

[دمامۂ تندر نہیب : رعد کی طرح گرجنے والا نقارہ]

دُمچی : ساز کا وہ تسمہ جو گھوڑے کی دُم کے نیچے رہتا ہے۔

دمدمہ باندھنا : لڑائی کے میدان میں مورچہ باندھنا، ریت کی بوریوں وغیرہ سے دھس بنانا۔

دَمَن : مشہور راجا نل کی معشوقہ جو ہندستان کے ایک راجا کی بیٹی تھی۔

دن دہیلے : دن دہاڑے، سب کے سامنے۔

دنگل : ایک طرح کی کرسی نما نشست، جس پر کئی آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔

دُوا : تاش کا ایک پتا جسے دُگی کہتے ہیں۔ جوے کے ایک داؤ کا نام، چوک کا متضاد۔

دَوّار : بہت گھومنے والا۔

دوالگو : گھوڑے کی زین کے بغلی چمڑے، جو گھوڑے کی پسلیوں پر رکاب کے تسموں کے نیچے پھیلے رہتے ہیں۔

دُود : دھواں۔

دُودمان : خاندان۔

دودھ کے کوزے (ص۲۴۸) : دودھ کے کوزوں پر حضرت سکینہ اور حضرت اصغر کی نیاز دلوا کے بچوں میں تقسیم کرنا۔

دودھیا (ص۶) : حلوا سوہن کی ایک قسم، جس میں دودھ زیادہ ڈالا جاتا ہے اور وہ نرم ہوتا ہے۔

دَورِ مشتری (ص۲۲) : مراد ہے کہ ہمیشہ آباد رہے

دوسار ہوا (ص۱۱۹) : تیر بدن کے پار ہو گیا۔

دوگاما : دیکھیے : دُلکی۔

دوماہہ (ص۳۲۴) : دو مہینے کی تنخواہ۔

دول : کیس۔

دوندہ (ص۱۱۶) : دوڑنے والا۔ یہاں یہ لفظ "پرندہ" (ہوا میں اُڑنے والا) کے مقابل آیا ہے، مراد ہے : زمین پر چلنے والا۔

دَونے (ص۱۲۹) : منت پوری ہونے پر دونے میں شیرینی لاکر حضرت علیؓ کی نیاز دی جاتی ہے۔ اِسے "کھڑا دونا" کہتے ہیں۔ نیاز کھڑے کھڑے دی جاتی ہے اور اسی طرح کھڑے کھڑے اُسے کھایا جاتا ہے۔

ڈھرپت : راگ کی ایک قسم۔
دھرم مورت (ص۳۳۳) : بہت ایماندار، بہت انصاف کرنے والا۔
دہقان : کسان۔
دہل : ڈھول۔
دھن : آسمان کا نواں برج جو کمان کی شکل کا ہے، برجِ قوس۔
دہن دریدہ : منہ پھٹ۔
دھونسا : بڑا نقارہ۔
دیجور : تاریک۔ اندھیری رات۔
دیدبانِ چارم (ص۱۳۱) : مراد ہے سورج سے۔ [دیدبان: وہ شخص جو کسی اونچی جگہ پر بیٹھا ہو دشمن کے آنے کی خبر دینے کے لیے]
دید وا دید : ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے جانا۔
[دید : ملاقات۔ وادید : دوسرے شخص کا ملاقات کے لیے آنا، بازدید]
دیر یاز : طویل زمانہ۔
دیگ تیگ (ص۳۵) : دولت اور حکومت (تیگ : تیغ)۔
ڈاب : چمڑے کا پرتلا، جس کے حلقے میں تلوار لٹکائی جاتی تھی۔
ڈانگ (ص۲۰) : پہاڑ کی اونچی چوٹی۔
ڈاہ : حسد، جلن۔
ڈبرا (ص۲۶) : گڑھا جس میں پانی بھر جاتا ہے۔
ڈگڈگا کے پانی پینا : بڑے بڑے گھونٹوں سے پانی پینا۔ ایک دم میں بہت سا پانی پینا۔
ڈنک اجاڑ : گھوڑے کے کولے پر مقعد کے قریب کی بھونری، جس کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ [دیکھیے بھونری]

ڈونگی : چھوٹی ناؤ جو بڑی کشتی یا جہاز کے ساتھ بندھی رہتی تھی۔
ڈھبڑ ھبانا : پیرنے میں ہاتھ پاؤں مارنا۔
ڈھڈو : بے شرم (بوڑھی) عورت۔
ڈہڈہا : شاداب، سرسبز، شوخ رنگ۔
ڈھک (ص۳۶) : پاس۔
ڈھل گنڈے (ص۲۵) : بزدل۔
ذکی : ذہین، ہوشیار، تیز فہم۔
ذو معنی (ص۵۰) : پہلودار بات، ایسی بات جس میں دو پہلو ہوں۔
ذوی الاقتدار : اقتدار والا۔
ذی حیات : جان دار۔
راکب (ص۱۸۲) : سوار۔
رام کلی : ایک راگنی کا نام۔
ربابیا : رباب بجانے والا۔ رباب : سارنگی کی قسم کا ایک ساز۔
ربِ ذوالمنن : احسان کرنے والا خدا۔
رجال الغیب : وہ فرضی وجود جو دنیا کے دائرے میں حرکت کرتا رہتا ہے، آسمان کا وہ نشان کہ جس طرف وہ واقع ہو، اس طرف ان دنوں سفر کرنا نجومیوں کے مطابق منحوس ہوتا ہے۔
رجم : (اسلامی شریعت کے مطابق زنا کی سزا کے طور پر) پتھر مار مار کر ہلاک کرنا۔
رخش : گھوڑا۔
ردّ و قدح : بحث اور تکرار۔

رَس (ص۱۸۱) : گھوڑے کے سُم کی ایک بیماری جس میں سُم کی گدّی پھول جاتی ہے اور اُس میں مواد پڑ جاتا ہے۔

رسّامان (ص۱۸۱) : رسّام کی جمع۔ مصوّر، نقّاش۔

رستگار : نجات دینے والا۔

رستمِ دستاں : رستم ایران کا مشہور پہلوان اور زابلستان کا حاکم۔ "دستاں" اُس کے باپ زال کا لقب تھا۔

رسن : رسّی۔

رضوان : جنّت کے داروغہ کا نام۔

رضینا بہ قضا : ہم خدا کے حکم پر راضی ہوئے۔

رطب و یابس : تر اور خشک، مجازاً : بُرا بھلا۔

رعد : بجلی کی کڑک۔

رَقَم : جواہرات، قیمتی چیز۔

رمّال : علم رمل کا جاننے والا۔ جوتشی۔

رمل : ایک علم کا نام جس میں کچھ خط کھینچ کر، ہندسوں کی مدد سے غیب کی باتیں بتلاتے ہیں۔ مجازاً : جوتش، نجوم۔

رَمنا : چراگاہ۔ شاہی شکارگاہ۔

رمیدگی : وحشت۔

رنڈی (ص۳۳) : عورت۔

رنگترا : سنترا۔

روباہ خصال : مکّار (لومڑی کی طرح)۔

رَوزن : روشن دان۔

روشن چوکی : چار آدمیوں کا گروہ، جو دولھا (یا بادشاہ) کی سواری کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس میں دو شہنائی بجانے والے ہوتے تھے اور ایک طبلچی اور ایک منجیرے بجانے والا۔

رونْد (ص۱۸۶) : سپاہیوں یا چوکیداروں کا پہرے کے طور پر رات کا گشت۔

رونمائی : وہ رقم جو دولھا کے رشتے دار دُلھن کا مُنہ دیکھ کر اُسے دیتے ہیں۔ مُنہ دکھائی۔

روئیں تن : ایسا شخص جس پر تلوار، تیر، وغیرہ کا اثر نہ ہو۔ (اسفندیار کا لقب)۔

رہ نورد : تیز چلنے والا۔ مجازاً : مسافر۔

رہ نوردِ بادیۂ حرماں (ص۱۱۶) : بدنصیبی کے میدان میں سفر کرنے والا۔

رہوار : گھوڑا۔

ریاضی : ایک علم کا نام جس میں علم حساب، علم نجوم، جبر و مقابلہ وغیرہ شامل ہیں۔

رَیب : شک۔

ریزہ : ریشمی کپڑے کا تھان۔

رِیش : زخم۔

ریش و فش : دیکھیے : بہ ایں ریش و فش۔

زاغِ شب : رات۔

زال : رستم کے باپ کا نام۔

زبان لال ہے (ص۱) : لفظی معنی : گونگا ہے۔ مجازاً : مفصّل بیان سے زبان عاجز ہے۔

زبوں شمائل : بدصورت۔

زحل : ایک ستارے کا نام جسے منحوس سمجھا جاتا ہے، سنیچر۔

زَخّار : موجیں مارتا ہوا۔

زربفت : بادلے (سونے چاندی کے تاروں) کے تانے

اور ریشم کے بانے سے بُنا ہوا کپڑا۔ کمخواب میں اور
اس میں یہ فرق ہے کہ کمخواب میں زری کے بجائے
ریشمی بوٹی زیادہ ہوتی ہے اور کپڑا بھی ذرا موٹا
ہوتا ہے۔

زردشت: مشہور ایرانی دانش مند اور مذہب آتش پرستی
کا بانی۔ مجوسی (پارسی) اسے پیغمبر مانتے ہیں۔

زرہ: لوہے کی باریک کڑیوں کا بُنا ہوا نیم آستین کرتا
جس کو جنگ کے موقعے پر پہنتے تھے۔

زریں کمر: کمر میں سنہرا پٹکا باندھے ہوئے۔

زغن: چیل۔

زمرہ: گروہ۔

زمزمہ (ص۸۹): موسیقی کی ایک اصطلاح، ایک یا دو
سُروں کی ہلکی تکرار آواز میں ہلکے سے ارتعاش کے
ساتھ۔ مجازاً: نغمہ۔

زمہریر: سخت جاڑا۔ کرۂ ہوا کا وہ طبقہ جو نہایت سرد ہے۔
(یہ کرۂ زمین کے اوپر اور کرۂ ہوا کے وسط میں ہے)۔

زنبق: ایک طرح کا سفید پھول جو نرگس کی قسم سے اور دھتورے
کے پھول سے مشابہ ہوتا ہے۔ شاعروں نے معشوق کی
ناک کو اس سے تشبیہ دی ہے۔

زنخ: ٹھوڑی۔

زنگ: گھنٹی۔ گھنگرو۔

زور: بہت، عجیب۔

زورق: چھوٹی کشتی۔

زیرانداز: وہ کپڑا یا چمڑا جو حقے کے نیچے حفاظت کے
لیے بچھا دیتے ہیں۔ غالیچہ۔

زیردست: کمزور، ماتحت۔

ژولیدہ مُو: بکھرے ہوئے بال والا۔

سابق ازیں: اس سے پہلے۔

ساٹھ تار کا پتنگ: جس کی ڈور ساٹھ باریک تار
سے بٹی گئی ہو۔

ساچق: جس دن دلھن کے گھر سے دولھا کے یہاں مہندی
جاتی تھی، اس سے ایک دن پہلے، دولھا کے یہاں
سے دلھن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا تھا۔ اسی
کے ساتھ دلھن کے لیے سنہری منقش کا سہرا، چاندی
کا چھلا، سونے کی انگوٹھی، دو ایک چیزیں اور
ہوتی تھیں اور وہ زیور ہوتا تھا جس کو پہن کر وہ
رخصت کی جائے گی۔ پھولوں کا گہنا بھی ہوتا تھا۔
جوڑے کے ساتھ شکر کے نُقل، شکر کے قُرص اور
میوہ بھیجا جاتا تھا۔ اس کے لیے منقش اور رنگین گھڑے
تیار کرائے جاتے تھے، پھر بانس اور کاغذ کے
رنگا رنگ تختوں میں چار چار گھڑے لگا کے، چوگھڑے
بنا دیے جاتے، دولت مندی اور امارت کے لحاظ
سے ان کی تعداد بڑھتی رہتی تھی۔ ان کے منھ گھڑوں
پر عموماً سرخ کپڑا تاگے سے باندھا جاتا تھا جلوس
میں سب سے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی ہوتی
تھی جس میں دہی بھرا ہوتا تھا۔ اس کے منھ پر بھی
سرخ کپڑا بندھا ہوتا تھا۔ اچھے شگون کے لیے
اس کے گلے میں دو ایک مچھلیاں بھی بندھی ہوتی
تھیں۔

ساحر شب گشت (ص۲۵۵): چاند۔

ساحرِ فلکِ چہارم (ص۲۵۹) : سورج۔
ساقہ (ص۲۵۶) : فوج کا وہ حصہ جو بالکل پیچھے رکھا جاتا ہے۔
سام : رستم کے دادا کا نام۔
سامری : اس شخص (جادوگر) کا نام جس نے حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں سونے چاندی کا ایک بچھڑا بنا کر لوگوں کو گمراہ کیا تھا اور اُس کی پرستش کرائی تھی۔
ساں : طرح۔
سائیں : گھوڑے کی گردن کے بالوں کی جڑ کے قریب کی بھونری، اگر صرف ایک طرف ہو تو منحوس سمجھی جاتی ہے۔ دیکھیے : بھونری۔
سانٹھ مار : ہاتھی کے نگہبانوں کا ایک گروہ، جن کے پاس چھوٹے چھوٹے ڈنڈے (سانٹے) ہوتے ہیں، جب کبھی ہاتھی مستی میں آکر بے قابو ہوتا ہے تو یہ لوگ سانٹوں کی مدد سے اُس کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔
سانحہ (ص۶۸) : عجیب بات، کام کی بات۔
سبا : یمن کے ملک میں ملکہ بلقیس کے شہر کا نام، جس سے حضرت سلیمانؑ نے نکاح کر لیا تھا۔
سبحہ : تسبیح۔
سبز قدم : منحوس۔
سبک جست : نہایت تیزی کے ساتھ جست لگانے والا۔ (تیز رفتار کے مفہوم میں)۔
سبک دست (ص۹) : جلدی کام کرنے والا، پھرتیلا۔
سبو : گھڑا۔
سپہ سالارِ انجم (ص۳۲۲) : چاند۔
سترِ عورتین : دونوں طرف کے مقاماتِ مخصوص جن کا چھپانا شرم کا تقاضا ہے۔
سٹھنیاں : وہ گالیاں جو بیاہ میں سمدھنوں کو دی جاتی ہیں۔ فحش گیت جو سمدھنوں کو مخاطب کر کے اُس موقعے پر ڈومنیاں گاتی ہیں۔
سجادہ نشینِ چرخِ اوّل (ص۲۵۰) : چاند۔
سجدہ گاہ : خاکِ شفا یا لکڑی کی (گول، مستطیل، محرابی) ایک ٹکیا، حضراتِ شیعہ نماز پڑھتے وقت سجدے کے لیے پیشانی اُس پر رکھتے ہیں۔
سٹپٹا کر (ص۱۹۹) : ہچکچا کر۔
سحبانِ وائل : عرب کا ایک مشہور فصیح و بلیغ خطیب۔
سراج : چراغ۔
سرائے سپنج : مراد ہے دُنیا سے۔
سرپیچ : سونے چاندی یا ہیرے موتی کا ایک زیور، جسے پگڑی میں سامنے کے رُخ پر باندھا جاتا تھا۔ بعض اوقات اس میں سونے کے چوکور پتر ہوتے تھے جو آپس میں بندھے ہوتے تھے اور ہر ایک میں قیمتی جواہر جڑے ہوتے تھے۔
سرحلقہ : سردار۔
سرطان : کیکڑا۔
سرطانِ فلک : آسمان کا چوتھا برج۔
سرفروکنندۂ گردن کشاں : مغروروں کا سر جھکانے والا۔
سُر کا پلٹا (ص۸۹) : سُر کو اُلٹ پلٹ کر ایک خاص طریقے پر بار بار کہنا۔
سرکھپی کی (ص۱۳۲) : بہت کوشش کی، جان لڑا دی۔

سرو چراغاں : لکڑی کے ٹکڑوں سے سرو کی شکل بناتے ہیں اور اس کی شاخوں میں چراغ روشن کرتے ہیں۔
سرو بستاں ہوا : بھولی بات یاد دلا دی۔
سری (ص۱۲۱) : ہاتھی کی مستک کے اوپر ایک کارچوبی کپڑا بطور آرایش ڈالا جاتا تھا۔
سریر : تخت۔
سریع السیر رہے : دن رات دوڑتے بھاگتے کوشش کرتے رہے۔
سعد اکبر : بہت مبارک، ستارۂ مشتری۔
سفلی (ص۹۵) : وہ منتر یا جادو جس میں پلید روحوں سے یا شیطان سے مدد کی درخواست کی جائے۔ اسے سفلی عمل کہتے ہیں۔
سفیہ : کم عقل، نادان۔
سقائے سکینہ : حضرت عباسؓ۔
سقر : جہنم۔
سقراط : یونان کا مشہور فلسفی اور دانش مند۔
سقرلات : بانات کی قسم کا پشمینہ، شاہی گھوڑوں کے استر کے لیے بنایا جاتا تھا۔
دیکھیے : بانات۔
سقفِ بے ستون : آسمان۔
سکھپال : خواتین کی نہایت معزز سواری۔ یہ ایک سرخ گنبد نما ڈولی ہوتی تھی۔ ایک لمبے چوڑے کھٹولے پر ایک شان دار لال برج بنا دیا جاتا تھا، جس میں سونے چاندی کے کلس لگے ہوتے تھے۔ چار دن طرف پردے لٹکے ہوتے تھے۔ اس میں بھی آگے پیچھے دو دو ایک ایک ڈنڈے لگے ہوتے تھے اور بہت سے کہار اس کو اٹھا کر چلتے تھے۔ یہ سواری عالی مرتبہ بیگمات کے لیے خاص تھی۔
سلاسل : زنجیریں۔
سلطانِ اریکۂ زنگاری (ص۱۵۱) : سورج۔
سلطانِ خاور : سورج۔
سم کھائے (ص۹) : بے تال ہو گئے۔
سمند : گھوڑا۔ وہ گھوڑا جس کا رنگ سونے کے رنگ سے مشابہ ہو اور دم سیاہ ہو۔ نقرہ سے کم درجہ سمجھا جاتا ہے۔
سمندر (ص۲۲۶) : چوہے کی شکل کا ایک وہمی جانور، جو آتش کدے میں پیدا ہوتا ہے اور اگر آگ سے باہر نکلے تو مر جاتا ہے۔
سمندِ سبز فام (ص۱۷۹) : آسمان۔
سموم : تیز گرم ہوا۔ لو۔
سنان : برچھی، بھالے یا تیر کی نوک۔
سنبلہ : آسمان کے چھٹے برج کا نام۔
سنگترین : میوہ فروش عورتیں۔
سنگ (ص۲۰۵) : وزن۔
سنگ پشت : کچھوا۔
سنگسار کرنا : دیکھیے : رجم۔
سنگوٹیاں : وہ پیتل یا سونے کے بنے ہوئے خول جو ہرن یا بیل کے سینگوں پر خوب صورتی کے لیے چڑھاتے ہیں۔

سنگھ : آسمان کا پانچواں برج، بُرج اسد۔

سنیچر پاؤں پڑے گا (ص۳۵) : بُرا وقت پڑے گا، مصیبت پڑے گی۔

سُوا : توتا۔

سوادِ چشم : آنکھوں کی سیاہی۔

سوزن : سوئی۔

سوسن : ایک قسم کا پھول جو نیلا ہوتا ہے۔ شعرا نے اسے زبان سے تشبیہ دی ہے۔

سوفار : تیر کا وہ سوراخ یا شگاف جو تیر کے گز میں اُس طرف ہوتا ہے جدھر سے اُسے کمان کے چلّے میں رکھتے ہیں۔ تیر کی چٹکی، دہانِ تیر۔

سہ ماہی کے روزے : سنت کے وہ روزے جو رمضان سے پہلے (جمادی الآخر سے شعبان تک) تین مہینوں کے اندر رکھے جائیں۔

سہی بالا : سیدھے اور موزوں قد والا۔

سیاہ گوش : ایک درندے کا نام جو بلّی سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اس کے کان سیاہ ہوتے ہیں۔

سِیَر : سیرت کی جمع۔

سیماب وشی (ص۸۶) : بے قراری، اضطراب۔

سیمرغِ زرّیں جناحِ طلا بال : سنہرے بازوؤں والا سیمرغ۔ مراد ہے سورج سے۔

سینگڑا : سینگ کا بنا ہوا باجا جسے منہ سے بگل کی طرح بجاتے ہیں۔ بارود رکھنے کا سینگ۔

سیہ تاب : ایک رنگ جو سیاہ اور بنفشی رنگ کا مرکب ہوتا ہے۔

شامِ اودھ (ص۴۲) : فیض آباد کی شام۔

شبدیز : کالے رنگ کا گھوڑا، مشکی۔

شب زندہ دار : رات بھر جاگنے والا۔

شب کور : وہ گھوڑا جو رات میں سیاہ اور سفید چیز میں تمیز نہ کر سکے۔

شبنم (ص۱۴۲) : ململ کا ایک نام، روزمرہ کے استعمال کا سادہ باریک، ملائم اور سفید کپڑا۔

شدہ شدہ : ہوتے ہوتے۔ رفتہ رفتہ۔

شست و مُشت برابر کر (ص۱۱۹) : نشانہ درست کر کے اور تیار ہو کر۔

شش جہت : مراد ہے تمام عالم۔

شطّ : نہر؛ دریا کا کنارہ۔

شطرنجی : بغیر روئیں کا خالص سوتی، دونوں طرف سے یکساں، دری کی وضع پر تیار کیا ہوا قالین۔ فرشِ زمین پر بچھانے کی لمبی چوڑی موٹی دری۔

شعلۂ جوّالہ (ص۸۶) : مراد ہے اگن چرخ سے، چاک یا چکّر کی شکل کی آتش بازی، جس کے دور پر بانس کے ٹکڑے تیز قسم کی بارود سے بھر کر باندھے جاتے ہیں اور شتابے کے ذریعے باہم ملا دیے جاتے ہیں۔ جب ان میں آگ لگائی جاتی ہے تو بارود کی اُڑان سے چکّر کیلی پر تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔ چھوٹے چرخ کو چرخی کہتے ہیں۔

شلّک : بندوقوں یا توپوں کی باڑھ، جو سلامی کے واسطے یا کسی خوشی کے موقعے پر چھوڑی جائے۔

شلنگ : چھلانگ، جست۔

شمع کا چور (ص۳۳) : وہ رخنہ (کشادہ) جو جلنے میں شمع کے ایک طرف گُھل جانے سے پڑ جاتا ہے۔

شملہ : طُرّہ۔ ایک قسم کی خاص لکھنوی دستار : یہ شملہ اِس طرح بنایا جاتا تھا کہ پھر اُس میں کپڑے کا ایک چوڑا اگر دار حلقہ سر کی ناپ کے برابر بنایا جاتا جو بیچ میں خالی اور کُھلا رہتا۔ پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پتلی پتلی بہت لمبی پتی بنا کے اُس کے بیسیوں پیچ اُس کپڑے کے حلقے پر نیچے اور اوپر برابر لپیٹ کے ٹانک دیے جاتے۔ اسی حلقے میں اوپر کی جانب ایک چوڑی پتی ویسے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی تاکہ وہ اُس حلقے کو نیچے اُترنے سے روکے رہے۔ اُس کے نیچے کوئی معمولی دو پلڑی یا چوگوشیا ٹوپی ضرور رہتی۔ (گذشتہ لکھنؤ)

شناور : پیرنے والا۔

شنگرف : ایک سرخ رنگ کا مرکب جو گندھک اور پارے سے تیار کیا جاتا ہے اور نقاشی، مصوری وغیرہ میں کام لایا جاتا ہے۔

شورِ نشور : قیامت کے دن جیسا شور، بہت شور غل۔

شہاب (ص۱۲۷) : تیز سُرخ رنگ۔ نیز وہ سرخ رنگ جو کسم کو بھگو کر ٹپکانے کے بعد نکلتا ہے۔

شہدے : ایک فرقہ تھا جس کے لوگ اکثر ننگے سر ننگے پاؤں رہتے تھے، شادیوں میں دلھن کا پلنگ اُٹھاتے تھے۔ مُردے کا تابوت بھی اُٹھایا کرتے تھے۔ یہ لوگ گالی گلوچ میں مشہور تھے۔ لکھنؤ کے محلے پیر بخارا میں یہ بڑی تعداد میں اُس زمانے میں رہتے تھے۔

شہ گام : گھوڑے کی نہایت عمدہ اور سدھی ہوئی چال جس میں وہ لمبا اور زمین سے ملا ہوا قدم اُٹھاتا ہے جو سواری کے لیے باعثِ راحت ہوتا ہے۔ شاہی سواری کے لیے یہ چال گھوڑوں کو خاص کر سکھائی جاتی تھی۔

شیر بچہ (ص۱۴۱) : ایک قسم کی چھوٹی بندوق۔

صاحب نوبت کیا (ص۱۲) : دیکھیے : نوبت۔

صاعقہ : بجلی جو زمین پر گرے۔

صانع : بنانے والا، پیدا کرنے والا۔

صانعِ بے چون و چرا : خُدا۔

صانعِ حقیقی : خُدا۔

صائم النہار : دن کو روزہ رکھنے والا۔

صباح و مسا : صبح شام۔

صحنک : حضرت فاطمہ کی نیاز اور اُس نیاز کے کھانے کو بھی صحنک کہتے ہیں۔ آج کل عام طور پر سفید چاول ہوتے ہیں جن پر دہی ڈال دیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نور اللغات۔

صد برگ : گیندا۔

صریر : قلم چلنے کی آواز۔

صیغۂ اخوت پڑھا (ص۲۹۹) : بھائی بنا لیا۔

ضعیف بنیان : جس کی بنیاد کم زور ہو۔

ضلالت : گم راہی۔

طالعِ واژون : بُرا نصیب۔

طباشیرِ صبح : صبح کی سفیدی۔

طبلہ : ڈبا، صندوقچی۔

طبلۂ عطّار (ص۱۸۱) : وہ چھوٹا سا صندوقچہ جس میں عطر فروش عطر رکھتا ہے۔

طرفۃ العین : پل بھر میں، فوراً۔

طشت از بام افتادہ ہوا (ص۲۸۲) : حال سب پر کھل گیا۔

طعمہ : لقمہ، نوالہ، خوراک۔

طلاقت : چرب زبانی۔

طوطیِ پسِ آئینہ : وہ شخص جو آئینے کے پیچھے بیٹھ کر طوطی کو جو کچھ سکھانا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے۔ آئینے میں طوطی اپنا عکس دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ کوئی اور (حریف) طوطی بول رہا ہے۔

ظلم کا حادثہ ہوا (ص۱۹۵) : بہت بڑا حادثہ ہوا۔

عاد : ایک قوم کا نام، جس کی ہدایت کے لیے حضرت ہودؑ کو بھیجا گیا تھا۔

عاطفت : مہربانی۔

عاملِ صبح (ص۲۵۵) : سورج۔

عبّاسی : ایک پھول کا نام۔

عبیر : ایک خوشبودار مرکب جو مشک، گلاب، صندل وغیرہ سے بنایا جاتا تھا، کپڑوں پر چھڑکا جاتا تھا۔

عتبہ : دہلیز، آستانہ۔

عدیل : برابر، نظیر۔

عذار : رخسار۔

عذرا : مشہور عربی عاشق وامق کی محبوبہ کا نام۔

عربدہ جو : لڑاکا، جنگ جو۔

عرصۂ جزا : قیامت کا دن۔

عرصۂ شہود (ص۵) : دنیا۔

عرض بیگی : وہ شخص جو لوگوں کی درخواستیں بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا۔

عرق ریزی (ص۲۳) : محنت۔

عزّ و جلّ : عزت والا اور جلال والا (خدا کے لیے)۔

عساکر : عسکر کی جمع۔ عسکر : لشکر۔

عسل : شہد۔

عطارد : دوسرے آسمان کا ایک ستارہ جسے دبیرِ فلک اور منشیِ فلک بھی کہتے ہیں۔

عُظم : عظمت، بڑائی۔

عقدِ ثریا : چھ ستاروں کا غنچہ جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

عقدۂ مالاینحل : وہ مشکل مسئلہ جو حل نہ ہو۔

عقرب (ص۱۸۱) : گھوڑے کی پیشانی پر سفید بالوں کی چتی، جو ہاتھ کے انگوٹھے کے سرے کے نیچے چھپ جائے۔ ایسا گھوڑا منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

عقوبات : عذاب، تکلیفیں۔

علمِ ہیئت : وہ علم جس کے ذریعے سے آسمانی شکلوں کو اور اُس کے متعلقات کو معلوم کریں۔ علمِ نجوم۔

علوی (ص۹۵) : وہ عمل جو فرشتوں یا موکلوں کے ذریعے سے یا خدا کے ناموں کے ذریعے سے حاصل کیا جائے۔ سفلی کا متضاد۔

علی الدّوام : ہمیشہ۔

عماری : اونٹ کا محمل۔ چھتری دار ہودا جو ہاتھی پر بیٹھنے کے واسطے اُس کی پشت پر باندھ دیا جاتا ہے۔

عُمّان : ایک دریا کا نام۔ عام دریا، سمندر۔

عمرانات (ص۵۹) : مراد ہے جان داروں سے۔

عناں تابی (ص۲) : عناں تاب : گھوڑا جو اشارے پر چلتا ہے۔ یہاں مراد ہے حمد کے بعد نعت کی طرف توجہ کرنے سے۔

عنبرِ سارا : خالص عنبر۔ عنبر : ایک معروف خوش بو دار چیز، جس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے، آگ پر موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ دواؤں میں بھی ڈالی جاتی ہے۔

عوج بن عنق : ایک عظیم الجثہ، طویل قد وقامت کے آدمی کا نام، جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک زندہ رہا۔

عودِ غرقی : ایک لکڑی کا نام جس کا دھواں خوشبو دیتا ہے۔ یہ لکڑی پانی میں ڈوب جاتی ہے، اسی نسبت سے یہ نام پڑ گیا۔

عینُ الکمال (ص۲۳۰) : بری نظر۔

غریو : شور۔

غلام گردش : کوٹھی یا محل کے چاروں طرف کا برآمدہ۔

غَنچہ (ص۳۰۵) : ہجوم، جھرمٹ۔

غُول : بھوت پریت۔ بھیڑ، گروہ۔

غَیبت : غیر موجودگی۔

فتادۂ تلاطم (ص۳۰۲) : مصیبت میں گرفتار۔

فتنہ (ص۱۳۷) : ایک قسم کا عطر۔

فراخور : لائق، مطابق۔

فراسن : ایک خاص عقیدے کے لوگوں کا فرقہ جو باہمی اتحاد اور بھائی چارے کا مدعی ہے۔ فری میسن۔

فَرَق (ص۳) : سر۔

فرہاد کش بڑھیا : وہ بڑھیا جو شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر لے کر فرہاد کے پاس آئی تھی اور جس کو سن کر فرہاد تیشہ مار کر مر گیا تھا۔

فریدون : ایران کا مشہور بادشاہ۔

فغفور : چین کے بادشاہوں کا لقب۔

فنس : پالکی کا دوسرا نام۔

فی الجملہ (ص۲۱۵) : بہت کچھ۔

فیلسوف (ص۱۹۰) : مکّار۔

قاب : بڑی پلیٹ۔

قارون : حضرت موسیٰ کے زمانے کا ایک نہایت مال دار یہودی، جو زکات نہ دینے پر حضرت موسیٰ کی بددعا سے مع دولت زمین میں دھنس گیا۔

قاشِ زین : گھوڑے کی کاٹھی کے آگے اور پیچھے کے ٹکڑے۔

قافلہ باشی : قافلے کا سردار۔

قاقُم : نہایت نرم اور سفید بالوں والا سنجاب کی قسم کا جانور، جس کی کھال پوستین بنانے کے کام آتی ہے۔

قائم اللیل : عبادت کے واسطے رات بھر جاگنے والا۔

قُباد : مشہور ایرانی بادشاہ۔

قُبور (ص۱۹) : پستول رکھنے کا چمڑے کا خانہ، جو گھوڑے کی کاٹھی میں بنا ہوتا ہے۔

قحبہ : بدکار عورت۔ فاحشہ۔

قدر انداز : وہ تیر انداز جس کا نشانہ خطا نہ ہو۔

قدومِ میمنت لزوم (ص۸) : برکت سے بھرا ہوا آنا، تشریف آوری۔ قدوم : آنا

قرابین : ایک طرح کی بندوق جس کی نال کا منہ نفیری

کی طرح پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ شیر دہاں نال بندوق۔
قِرانُ السعدین : دو اچھے ستاروں کا ایک برج میں جمع ہونا۔ مجازاً : دو اچھے آدمیوں کا یک جا ہونا۔
قربوس : گھوڑے کی زین کے آگے کا حصہ جو اُٹھا ہوا ہوتا ہے۔
قرۃ العین : آنکھ کی ٹھنڈک۔ مجازاً : بیٹا یا بیٹی مراد ہوتی ہے۔
قرطاس : کاغذ۔
قرعہ : تانبے، پیتل، ہاتھی دانت وغیرہ کا بنا ہوا پانسا، جس کی مدد سے رمّال غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔ شرط لگانے یا کسی بات میں پہل کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی طریقے سے (مثلاً پرچی ڈال کر) نام نکالنا۔
قرقرے : ایک قسم کے پرندے۔
قرنا : ترہی، سینگ کا بنا ہوا بگل۔
قصرِ زنگاری (ص۳۱) : آسمان۔
قضارا : اتفاقاً۔
قضا و قدر : حکمِ الٰہی، خدا کی مرضی۔
قلب : لشکر کا درمیانی حصہ۔
قلماقنیں : وہ عورتیں جو ہتھیاروں سے مسلح شاہی محلوں میں سپاہیوں کی طرح چوکی پہرا دیتی تھیں۔
قور : فیتا جو کپڑوں کے حاشیے پر لگاتے ہیں۔ ہتھیار؛ لیکن سرورؔ نے اسے "ساتھ" کے معنی میں استعمال کیا ہے : قور میں : جلو میں، شاہی سواری کے ساتھ۔
قوس : کمان۔ آسمان کے نویں برج کا نام، جس کو کمان کی شکل کا فرض کیا گیا ہے۔

قہر ہیں (ص۱۹) : غضب کے ہیں، بڑی صفات کے مالک ہیں۔
کاٹھیاوار کا دکھنی (ص۱۴۶) : کاٹھیاوار کا گھوڑا مشہور ہے۔
کارد : چاقو، چھری۔
کاکل : سر کے بڑے بڑے آگے کو لٹکے ہوئے بال۔ لٹ۔ زلف۔
کانون : انگیٹھی، آتش دان۔
کاہشِ بدر (ص۴۰) : چودھویں رات کا چاند جس کے سامنے بے نور تھا۔
کاہن : غیب کی باتیں بتانے والا۔ نجومیوں کی طرح یہ بھی ایک خاص گروہ تھا۔
کاہ درکہربا ہوگئی (ص۳۰) : اس کی طرف کھنچ گئی، عاشق ہو گئی۔
کاہیدہ : گھٹا ہوا، دُبلا۔
کاؤس : ایران کا ایک مشہور بادشاہ۔
کبرِ سن : بڑھاپا۔
کبکِ دری : ایک قسم کا بڑا چکور جو پہاڑوں میں پایا جاتا ہے (کبک کی رفتار سے شعرا معشوق کی چال کو تشبیہ دیتے ہیں)۔
کتخدائی : شادی۔
کحل : سرمہ۔
کد : اصرار، ضد۔
کدخدائے خانہ : گھر کا مالک۔
کر : بہرا۔
کرتی : شررؔ نے گذشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے : سینے کا ایک لباس ... جو بلندیِ ہند میں انگیا اور جنوبی ہند میں چولی کہلاتا ہے .... آخر زمانے میں چولی اور انگیا کی تفریق یوں ہوئی کہ دکن میں ایک جھول دار چٹی سی پیچھے سے

آگے کی طرف لاکے، دونوں چھاتیوں کے درمیان گرہ دے کے یا بوتام لگا کے کس دی جاتی ہے۔ بلند پی بند میں انگیا یوں بنتی ہے کہ پستانوں کے مناسب ناپ کی دو کٹوریاں بنائی جاتیں، جو دو تین انگل تک باہم سی کے جوڑ دی جاتیں۔ اور ان کے بالائی کونوں پر جالی کی دو چھوٹی چھوٹی آستینیں لگا دی جاتیں۔ اور ان آستینوں کے نیچے دونوں پہلوؤں پر دو دو بند لگا دیے جاتے ہیں اور اس طرح ... دونوں ہاتھوں کو آستینوں میں ڈال کے یہ انگیا پہن لی جاتی ہے۔ آستینیں ... آدھے بازوؤں سے بھی کم رہتی ہیں ... برخلاف چولی کے، انگیا چھاتیوں کو اصل سے زیادہ اُبھار کے نمایاں کر دیتی ہے ....

لکھنؤ میں مسلمان بیگموں کی وضع ابتداءً تو یہی تنگ مہری کا کھنچا ہوا پاجامہ، سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینوں کی کھنچی ہوئی انگیا اور پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لیے ایک عجیب و غریب کرتی، جو آگے کی طرف اُس حد تک کاٹ دی جاتی جہاں تک جسم پر انگیا کا تصرف رہتا۔ اس میں نہ آستینیں ہوتیں اور نہ سینے پر اس کا کوئی حصہ رہتا۔ دو لمبے بندوں کے ذریعے سے، جو شانوں پر سے ہو کے آتے، پیٹ اور پیٹھ پر معلق ہوتی۔

کردھنی : ایک طرح کی ڈوری یا زنجیر جسے ہندو کمر میں باندھتے ہیں۔

کرک : آسمان کے ایک برج کا نام۔ برج سرطان۔

کرنا : نفیری۔

کرّوبیاں : فرشتے۔

کرۂ نار : آگ کا گھیرا، جو پرانے خیالات کے مطابق کرۂ ہوا کے اوپر ہے۔

کسگر : کمہار۔

کسوف و خسوف : کسوف : سورج گرہن۔
خسوف : چاند گرہن۔

کس و کو : یار دوست، رشتے دار۔

کلابتون : بادلا ملا ہوا ریشمی یا سوتی تار، جو زردوزی کے کام کے لیے تیار کیا جاتا ہے (دیکھیے: بادلا)۔

کلاونت : خاندانی گویا۔ علم موسیقی کو بہت اچھی طرح جاننے والا گائک۔

کلبہ : چھوٹا سا گھر جو تنگ و تاریک ہو۔

کلبۂ غم : غموں کا گھر، ماتم کدہ۔

کلّہ : جبڑا، گال۔

کلیس : رُکھ۔

کمانِ کیانی : مراد ہوتی ہے نہایت عمدہ کمان سے۔

کُمبھ : آسمان کے گیارھویں برج (برج دلو) کا نام۔

کمپا : لاسا لگی ہوئی لمبی چھڑی یا بانس، جس سے پرندوں کو پکڑتے ہیں۔

کمخواب : بوٹی دار ریشمی کپڑا۔ اس میں مُردان نہیں ہوتا۔ یہ زربفت سے کم درجے کا ہوتا ہے۔ اس میں کلابتون کی بوٹیاں کم اور ریشمی بوٹیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ (مشروع اس سے بھی کم درجے کا ہوتا ہے)۔

کمری : وہ گھوڑا جو چڑھائی پر نہ چڑھ سکے یا مشکل سے چڑھے۔

کُمَیت : وہ گھوڑا جس کا رنگ عناب یا تازی کھجور کے مانند سیاہی مائل سرخ ہو۔ گھوڑے کے رنگوں میں یہ رنگ سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

کُنام : جنگلی جانوروں کے رہنے کی جگہ۔

کنٹھ بیٹھ گیا (ص۱۵۱) : موت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

کُنجشک : گوریا، جو عام طور پر گھروں میں رہتی ہے۔

کُندۂ ناتراش : بے تمیز۔ بے سلیقہ۔

کُنشت : آتش کدہ۔ یہودیوں کی عبادت گاہ۔

کنوتی : گھوڑے (یا ہرن) کے کان۔

کنوتیاں : کنوتی کی جمع۔

کنوتیاں بدل (ص۱۳۵) : چوکنے ہوکر۔

کُوَر : بڑا نقارہ۔

کُور باطن : طبیعت کا گُھنّا۔ دل میں کینہ رکھنے والا۔

کُوردِہ (ص۲۹) : جاہلوں کی بستی۔

کُور نمک : نمک حرام۔

کورۂ آہنگر : لُہار کی بھٹی۔

کوس : نقارہ۔

کوسِ رحیل : کوچ کا نقارہ۔

کوس کا پہیا (ص۱۸۳) : شاہی سواری کے ساتھ جس طرح جریب سے زمین کی پیمائش ہوتی تھی اُسی طرح ایک پہیا ہوتا تھا جس کے چکروں سے کوس کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ (دیکھیے : جریب۔)

کوسِ لمن الملکی بجانا (ص۲۵) : یکتائی کا دعوا کرنا۔

کوکلا : کوئل۔

کَول (ص۲۴۲) : لکڑی (یا زمین) کا ذرا بڑا سوراخ۔

کونڈے (ص۱۲۹) : بزرگوں کی نذر نیاز۔ کھانے پر کسی خاص بزرگ کی فاتحہ دلانا۔

کِہ : چھوٹا، کم رتبہ۔

کھاجا : خوراک، غذا۔ ایک قسم کی پرت دار مٹھائی۔

کھاردا : ایک طرح کا سُرخ، موٹا سوتی کپڑا۔

کھپنا : شرمندہ ہونا۔

کُھٹائی کرے (ص۳۶) : دغا کرے۔

کھڑا دَونا (ص۲۴۳) : دیکھیے : دونا۔

کُھڑ پیچ (ص۲۹) : ناحق کی تکرار، کینہ، بغض۔

کھڑکھڑیا : ایک قسم کی پالکی، غالباً پالکی سے ذرا بڑی۔ قتیل نے ایک خط میں لکھا ہے کہ مولوی مصاحب علی صاحب کی کھڑکھڑیا اس قدر بھاری ہے کہ دس بارہ کہاروں کے بغیر اسے نہیں اُٹھایا جاسکتا۔

کھنڈری : توشک کی طرح کا کوئی کپڑا، جس کے درمیان کوئی نرم چیز بھر کر نگندے ڈال دیے جائیں۔ فقیروں کی گدڑی۔ بچوں کا نہالچہ۔

کُہنہ لنگ : پیدائشی لنگڑا کر چلنے والا گھوڑا، جس کا یہ عیب لاعلاج ہو۔

کھوٹا : شریر گھوڑا۔

کھونبڑا : ناہموار چیز یا راستے کو کہتے ہیں، یہاں مراد ہے بدہیئت چہرے سے رخساروں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، گال پچکے ہوئے۔ ہیبت ناک صورت۔

کھونٹا اُکھاڑ : گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کے گھٹنے کے اوپر کی وہ بھونری، جس کا منہ گھوڑے کے سُم کی طرف ہو، مبارک سمجھی جاتی ہے اور جس کا منہ سوار کی طرف ہو، وہ منحوس سمجھی جاتی ہے اور کھونٹا اکھاڑ کہی جاتی ہے۔ (دیکھیے : بھونری)

کید : مکر و فریب۔

کیف (ص۳۱۱) : نشہ، سرور۔

کیلی والی (ص۳۰۶) : کیلی والا اُس شخص کو کہتے ہیں جو کنویں سے، بیلوں کی مدد سے، چمڑے کے بڑے ڈول کے ذریعے سے پانی نکالتا ہے۔

کیواں : ستارۂ زحل جو ساتویں آسمان پر ہے۔ مجازاً: ساتواں آسمان۔

گاڑھا (ص۴۴۱) : مست جنگی ہاتھی۔

گام (ص۱۸۱) : گھوڑے کی ایک چال کا نام۔ گھوڑے کی ہلکی رفتار۔

گام فرسا : چلنے والا، تیز چلنے والا۔

گاوِ ثری : وہ گائے جس کے سینگ پر زمین قائم ہے۔ پرانا خیال یہ تھا کہ پانی کے اوپر ایک بڑی مچھلی ہے اور اس مچھلی پر ایک گائے کھڑی ہے اور اُس کے ایک سینگ پر یہ زمین قائم ہے۔

گاوِ زمیں : دیکھیے: گاوِ ثری۔

گاو زوریاں (ص۱۴۳) : زور آزمانا، طاقت دکھانا۔ پہلوانوں کا آپس میں زور آزمانا۔

گبر : آگ کو پوجنے والا، مجوسی، پارسی۔

گت کا ہاتھ (ص۹) : زور کا ہاتھ، طبلے پر کوئی خاص گت زور سے ہاتھ مار کر بجانا۔

گٹکری : زمزمے کو اُلٹ کر ایک خاص ڈھنگ سے کہنا۔ وہ پیچیدہ آواز جو گانے والے کے گلے سے لہرا کر نکلتی ہے۔ زمزمہ اور گٹکری ایک ہی چیز ہے۔

گجباگ (ص۱۸۱) : انکس، لوہے کا آنکڑا، جس سے فیلبان ہاتھی کو قابو میں رکھتے ہیں۔

گجر دم : صبح تڑکے۔

گجگاہ : سُراگائے کی دُم، جو ہاتھی کے منہ کے دونوں طرف سجاوٹ کے لیے لٹکائی جاتی ہے۔

[سُراگائے : وہ جنگلی گائے، جو تبّت کے یاک اور ہندستانی گائے کے میل سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوؤں میں متبرک سمجھی جاتی ہے۔]

گذری (ص۳) : وہ بازار جو شام کے وقت سرِ راہ لگتا ہے۔

گردان : گُرد کی جمع۔ پہلوان۔

گردن کش : مغرور۔

گردنی : گردن سے پٹھوں تک گھوڑے پر ڈالنے کا ایک طرح کا باریک جال یا کپڑا، جو مکھیوں سے بچاؤ کے لیے اُس پر ڈالا جاتا ہے۔

گردونِ دوّار : گھومتے رہنے والا آسمان۔

گردونِ واژوں (ص۲) : اوندھا آسمان۔ مجازاً: مصیبتیں دینے والا آسمان۔

گرم عناں : تیز دوڑنے والا۔

گرد کی چھتری (ص۲۴۳) : کسی سادھو یا رشی، منی کی سمادھی پر گنبد یا ویسی ہی چھت دار عمارت۔

گرہ (ص۳۵) : ستارہ۔ جوتش میں ۹ گرہ مانے گئے ہیں: سورج، چاند، منگل، بدھ، برہسپت، شکر، شنی، راہو، کیتو۔ بچّے کی پیدائش کے وقت جنم کنڈلی (زائچہ) انھی گرہوں کے حساب سے بنائی جاتی ہے۔

گلبدن (ص۱۸۵) : مختلف وضع کا دھاری دار اور بوٹی دار

ریشمی اور سوتی کپڑا، جو کسی زمانے میں وسط ایشیا کے علاقے سے کابل کے راستے ہندستان آیا کرتا تھا۔

گُلبن: گلاب کا درخت۔ کنایتاً: پھلواری۔

گلخن تابی کی (ص۶۳): بھاڑ جھونکنا، یعنی دنوں تک رنج و مصیبت میں زندگی گزاری۔

گلڈ انگ: ایک خوں خوار کتا، "بلڈاگ" کی بگڑی ہوئی شکل۔

گُلِ شب‌بو: ایک پھول کا نام، جو رات میں کھلتا ہے۔

گلشنِ زنگاری (ص۲۸): آسمان۔

گُل گیر: شمع یا چراغ کی بتی کو کترنے کی قینچی۔

گُلنار: انار کے پھولوں کا سا رنگ، سرخ شوخ رنگ۔

گُمک: طبلے اور پکھاوج کی آواز۔

گندہ (ص۹): دبیز، موٹا، باریک کی ضد۔

گنڈا (ص۱۸): گھوڑے کے گلے میں ڈالنے کا پٹا۔ کوڑیوں یا گھنگھروؤں کا حلقہ جو جانور کے گلے میں ڈالتے ہیں۔

گواہِ شرعی: معتبر گواہ۔

گوسالہ: گائے کا ایک سال کا بچہ، بچھڑا۔

گوگردِ سرخ: سرخ گندھک، جو بہت کم یاب ہے۔ مجازاً: اکسیر۔

گویہ: کسی قدر، کچھ، ذرا سا۔

گوہرِ غلطاں: اعلا قسم کا موتی۔

گہ: (گاہ کا مخفف) کبھی۔

گھاتے میں: جو چیز مول لی ہو، اس پر کچھ اوپر (بلا قیمت) لے لینے کو کہتے ہیں۔

گھٹنا (ص۱۲۱): تنگ موری کا پاجامہ۔

گھڑیال (ص۱۵۴): پیتل کا گھنٹا جو امرا کے دروازوں پر لٹکا رہتا تھا اور گھڑیوں کے حساب سے بجایا جاتا تھا۔

گھڑیالی: گھڑیال بجانے والا۔

گھڑی نہیں ڈوبی (ص۱۴۱): پرانا حساب یہ تھا کہ دن اور رات کے آٹھ پہر ہوتے تھے، چار پہر دن کے اور چار پہر رات کے۔ ہر پہر کی آٹھ گھڑیاں ہوتی تھیں۔ نوبت خانے میں ایک پتیلے میں پانی بھرا رہتا تھا۔ اس میں ایک کٹورا جس کے پیندے میں باریک سا سوراخ ہوتا، ڈال دیا جاتا تھا۔ وہ پانی پر تیرتا رہتا تھا۔ اس سوراخ سے آہستہ آہستہ اس میں پانی آتا رہتا تھا۔ سوراخ اس حساب سے بنایا جاتا تھا کہ ایک گھڑی بھر میں پانی سے بھرتے بھرتے ڈوب جاتا تھا۔ پہر شروع ہونے کے بعد جب پہلی مرتبہ کٹورا ڈوبتا تو ایک گھڑی بجائی جاتی تھی۔ جب دوبارہ ڈوبتا تو دو گھڑیاں۔ اسی طرح مسلسل آٹھ گھڑیاں بجائی جاتی تھیں۔ اور آٹھویں گھڑی کے ساتھ گجر بجایا جاتا تھا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہر پورا ہو گیا اور گھڑیوں کا سلسلہ پھر ایک سے شروع ہو جاتا تھا۔

گھنٹا بیگ کی گڑھیا: دیکھیے: ضمیمہ ۳

گھیتلا: پرانا کفش نما جوتا۔ بہت نازک اور سبک بنتا تھا۔ آگے سے ہلکا سا مڑا ہوا ہوتا تھا۔ بعد کو ایک لمبی سونڈ نما نوک نکال کر اور پیچ دے کر موڑ دی جاتی تھی۔ اس پر کارچوبی کا کام بھی بنایا جاتا تھا۔ اس کی

ایڑی میں نعل نہیں لگائے جاتے تھے۔

گیدی : بے غیرت، بے عزت۔

گیہاں : جہان؛ زمانہ۔

لاب : (لابھ) فائدہ۔

لابیان (ص۱۳۹) : بیان سے باہر۔

لات، منات (ص۶۳) : عرب کے اُن مشہور تین بتوں میں سے دو بتوں کا نام، زمانۂ جاہلیت میں جن کی پرستش کی جاتی تھی۔

لافتیٰ : مراد ہے مشہور قول "لافتیٰ اِلّا علی لاسیف اِلّا ذوالفقار" سے : نہیں ہے کوئی جوان سوا حضرت علی کے (اور) نہیں ہے کوئی تلوار سوا ذوالفقار کے۔

لاف دگزاف : بڑائی، ڈینگ۔

لاکھا : پان کا سرخ رنگ جسے عورتیں خوب صورتی بڑھانے کے لیے ہونٹوں پر جماتی تھیں۔

لالہ : معروف پھول کے علاوہ، افیون کے پودے میں جو سرخ پھول آتا ہے اور جس کے پیالے میں افیون جمع ہوتی ہے، اسے بھی کہتے ہیں۔

لبِ حیرت بہ دنداں (ص۳۰۲) : حیران۔

لبِ معشوق (ص۱۲) : یہاں مقابل، ساتھ ساتھ کے مفہوم میں یہ لفظ آیا ہے۔

لبِ معشوق ہونا (ص۵۵) : تیر کا نشانے کے اندر بیٹھ جانا۔ مراد ہے دعا کا تیر قبولیت کے نشانے پر پہنچ گیا۔ دعا قبول ہوگئی۔

لٹورا (ص۲۱۳) : ایک پرندے کا نام جو فاختہ سے چھوٹا ہوتا ہے اور گرگٹوں کا شکار کرتا ہے۔ یہاں مراد ہے

نازِ زبان سے جس میں حقارت کا مفہوم بھی شامل ہے۔

لجّہ : سمندر کے بیچ میں، دریا کے بیچ کا سب سے گہرا مقام۔

لخلخہ : کئی خوشبوؤں کا مجموعہ جیسے عنبر، مشک، عود قماری، کافور وغیرہ سے بناتے ہیں اور تقویتِ دماغ کے واسطے سنگھاتے ہیں۔

لطائف الحیل : طرح طرح کے حیلے بہانے، وہ بہانے جو دوسروں کو ناگوار گزرتے ہیں۔

لطمہ : طمانچا، تھپیڑا۔

لطمہ پیدا ہوئی (ص۲۶۵) : دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی۔

لعبت : گڑیا۔

لعبتِ حقیقت (ص۲۴) : جیتی جاگتی سچ مچ کی گڑیا (خوب صورت بچے کے لیے)۔

لعلِ سپید : کنایہ ہے نایاب چیز سے۔

لغت سے صاف ہو (ص۲۷) : مشکل لفظ اس میں نہ ہوں۔ (لغت : اصطلاحاً وہ الفاظ جن کے معنی مشہور نہ ہوں)۔

لکّہ : ٹکڑا۔ عموماً ابر اور دھوئیں کے لیے آتا ہے۔

للت : ہنڈول راگ کی ایک راگنی کا نام۔

لمبیاں بھرنا : گھوڑے کا بہت تیز دوڑنا۔

لمؤلفہ : یہ شعر بھی مؤلف ہی کا ہے۔

لوح : لکھنے کی تختی، اصطلاحاً مراد ہے ایسی تختی سے جس پر کسی طلسم کو فتح کرنے کی ترکیب لکھی ہوئی ہو اور اس لوح کو حاصل کیے بغیر اس طلسم کو فتح نہ کیا جاسکے۔

لولی : ناچنے گانے والی عورت، رنڈی، رقاصہ۔ "لولیِ فلک" ستارۂ زہرا کو کہتے ہیں۔

لونا چماری : بنگال کی ایک مشہور جادوگرنی کا نام۔

جادو ٹونے کے منتروں میں اِس کا نام خاص طور پر
جپا جاتا ہے۔

لوہا برسا : تلوار چلی۔

لہو و لعب (ط۱۱) : تفریح کے کام کھیل کود، سیر تماشا۔

لیل و نہار دیدہ : تجربے کار۔

مار : سانپ۔

مانجھے کا جوڑا : وہ زرد رنگ کا جوڑا جو دولھا اور دلھن کو پہنایا جاتا تھا۔

ماہی مراتب : وہ نشان جو شاہی سواری کے آگے ہاتھیوں پر چلا کرتے تھے۔ یہ سات شکلیں، سات سیاروں کی نسبت سے ہوا کرتی تھیں یعنی سورج کا نشان، پنجے کا نشان، نشانِ میزان، اژدہا پیکر، سورج مکھی، مچھلی، کُرہ یعنی ایک گولا۔

مبادا : ایسا نہ ہو۔

مبالغِ خطیر : بہت زیادہ نقد رقم۔

مُبدءِ شام : شام کو ظاہر کرنے والا: خدا۔

متاخرین : بعد کے لوگ، متقدمین کے مقابل۔

متدیّن : دیانت دار۔ ایمان دار۔

متشرّع : شریعت کا پابند، پکا دین دار۔

متھن : آسمان کے تیسرے برج کا نام، برج جوزا۔

متھا : وہ گھوڑا جو چلنے میں سست رفتار ہو۔

مثل در مثل (ص ۳۴۸) : کئی طرح کے لوگ ترتیب کے ساتھ کھڑے کیے جائیں تو ایک قسم کی جماعت کے لوگوں کو "مثل" کہیں گے۔ مراد ہے: مختلف گروہ ترتیب کے ساتھ الگ الگ کھڑے ہوگئے۔

مجمر : انگیٹھی۔ عود سوز، یعنی وہ ظرف جس میں خوشبودار چیزیں سُلگائی جاتی تھیں۔

مچوز ہوئی (ص ۴۲) : اصرار کرنے لگی۔

مجیب الدّعوات : دعائیں قبول کرنے والا۔

مچھے (ص ۲۶۴) : گوشت کے بڑے ٹکڑے۔

محافہ : بڑی ڈولی کو میانہ اور محافہ کہتے ہیں۔ یہ معمولی ڈولی سے بڑا اور کسی قدر عمدہ اور آرام دہ ہوتا ہے۔

محبس : قید خانہ۔

محمودی : سوتی یا ریشم اور سوت کا ملواں بُنا ہوا ایک رنگ سادہ کپڑا "بافتا" کہلاتا تھا اور عمدہ قسم کے باریک بُنے ہوئے کپڑے کو محمودی کہا جاتا تھا۔

مِحَن : بلائیں، تکلیفیں۔

محیط : دریا۔

مخبرِ صادق : مراد ہے رسول اللہ سے۔

مخلب (ص ۱۸۱) : شکاری پرندوں کا اور شیر کا پنجہ۔

مدار یا حقّہ : ایک طرح کا چھوٹا حقہ۔ پیندے میں گٹّے کے پاس دو بیدھے نرکل جوڑ دیے جاتے تھے۔ جس پر چلم رکھی جاتی تھی وہ بالکل سیدھا ہوتا تھا اور دوسرا ترچھا لگایا جاتا تھا۔ پیندا عموماً مٹی کا ہوتا تھا۔ خاص لکھنؤ کی ایجاد۔ اُس زمانے میں ایک پیسے اور دو پیسے کو بک جاتا تھا۔

مدید : طویل، دراز۔

مرآت : آئینہ۔

مرافعہ : حاکم کے سامنے اپنا دعوا پیش کرنا۔ اپیل۔

مراقبہ : گردن جھکا کر حضورِ دل سے خدا کا دھیان کرنا۔

مراقبے کا حلقہ : مریدوں کو دائرے کی صورت میں

بٹھاکر مراقبے کے ذریعے توجہ دینا۔

مردک : حقیر، ذلیل آدمی۔

مردمِ دیدہ : آنکھ کی پتلی۔

مرزبوم : آباد اور قابلِ زراعت زمین۔ وہ جگہ جہاں کوئی آدمی پیدا ہوا ہو۔

مُرسَل : پیغمبر۔ وہ نبی جو صاحبِ کتاب ہو۔

مرشدوں کے ڈھیر (ص ۲۷۳) : مسلمان فقرا اور اولیا کی قبریں۔

مرصّع کار : زیوروں میں نگینے یا جواہرات جڑنے والا۔

مرفّہ حال : خوش حال۔

مرقّع : تصویروں کی کتاب، البم۔

مرکب : گھوڑا۔

مرگ چھالا : ہرن کی بالوں دار کھال، اکثر جوگی یا عابد جس کو آسن کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مرّیخ : ایک ستارے کا نام، جس کو جلادِ فلک بھی کہتے ہیں۔ اسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔

مزرعہ : کھیتی۔

مستجاب : قبول۔

مُستعار : مانگا ہوا، اُدھار لیا ہوا۔

مستول : کشتی یا جہاز کا ستون، بادبان۔

مستولی (ص ۵۰) : غالب، چھائی ہوئی۔

مُسکّن (ص ۳۳) : تسکین دینے والا۔

مُسِن : عمر رسیدہ، بوڑھا۔

مَشّاطہ : وہ عورت جو عورتوں کا بناؤ سنگار، کنگھی چوٹی کرے۔

مَشام : دماغ۔

مُشتِ خاک : انسان۔

مشتری : خریدار۔ ایک ستارے کا نام جو چھٹے آسمان پر ہے اور بہت مبارک سمجھا جاتا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے : ذرا سے نمونے ہی سے کل چیز کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔

مشروع : ریشم اور سوت کا ملواں بنا ہوا اطلس کی قسم کا بیل بوٹے دار کپڑا۔ گجرات کا بنا ہوا مشروع مشہور تھا۔

مُشکِ اذفر : تیز خوشبو رکھنے والا مشک۔

مشکل کشا : حضرت علیؓ کا لقب۔

مصری کے کوزے : مصری (نبات) کا بنا ہوا (گول یا عمودی) ڈلا۔ پرانے زمانے میں جہیز کے سامان میں مصری کے کوزے بھی ہوتے تھے۔

مظلمہ : ظلم کرنا، انصاف چاہنا۔

معانقہ : گلے سے لگانا، بغل گیر ہونا۔

معجون (ص ۲۵۹) : وہ قوام جو شکر اور بھنگ سے بناتے ہیں۔

معدن : کان۔

معقول (ص ۱۴) : منطق، فلسفہ اور حکمت کے علوم۔

معمور ہونا : بھرنا، آباد ہونا۔

مغرّق (ص ۱۴۹) : سونے اور چاندی میں لپا ہوا، جگمگاتا ہوا۔

مغلانی : رئیسوں کے گھر کی وہ ملازمہ جس کے سپرد گھر کے کپڑے سینے کی خدمت ہو۔

مفتاح : کنجی۔

مفسدے (ص ۲۳۱) : وہ باتیں جو خلافِ مصلحت ہوں، جھگڑے فساد۔

مَقال : گفتگو۔

مقتضائے عادت (ص ۲۸) : عادت کے مطابق۔

مقدّمہ : مسئلہ، واقعہ، فریاد، دعوا۔

مقدّماتِ جہانِ گزراں : اِس دنیا کے معاملات و مسائل۔

مقدّمۂ تحریر ہے (ص ۲۸) : (یہ تو) لکھنے کی بات ہے۔

مقرّر (ص ۸۴) : یقیناً۔

مقرر ہوئی (ص ۳۷) : منتخب کی گئی۔

مقنعہ : باریک چادر جو عورتیں منہ چھپانے کے لیے چہرے پر ڈالتی ہیں۔ وہ باریک کپڑا جو دلھن کے سہرے کے نیچے باندھا جاتا تھا۔ مجازاً: نقاب، گھونگھٹ۔

مَکَر : آسمان کا دسواں برج، برجِ جدی۔

مکلّف ہوا (ص ۲۰۲) : اصرار کیا۔

مگس رانی : مکھیاں اُڑانے کی خدمت، چنور برداری۔

ملّت (ص ۲۳۰) : ملاپ، میل جول۔

مُمِدّ : مدد کرنے والا۔

منجنیق : بھاری پتھر کو دور تک پھینکنے والی کل، جسے ڈھینکلی بھی کہتے ہیں۔ اس سے عموماً لڑائی کے موقعے پر قلعے کی دیواروں کو گرانے کا کام لیا جاتا تھا۔

منجھولی : رتھ سے چھوٹی اور تانگے سے بڑی ہلکی پھلکی چھتری دار دو پہیا بیل گاڑی، جس میں تین چار سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی۔ اسے بہلی بھی کہتے تھے۔

مَنجیے (ص ۱۶) : دیکھیے ۱۸۶۲-۱۸۷۱ء، صفحہ ۲۲۵، حاشیہ ۱۴۔

منڈھی : وہ چھپر یا گنبد نما مکان جس میں جوگی رہتے ہیں۔ کُٹی، بڑھی۔

منصور حلّاج : حُسین نام تھا۔ منصور باپ کا نام تھا۔ مشہور شخص (درویش) جس نے "انا الحق" (میں خدا ہوں) کہا تھا، جس کی سزا میں سولی دے دی گئی تھی۔

مُنغّص : افسردہ، ملول، مکدّر۔

منقار : پرندے کی چونچ۔

منقار بستہ (ص ۳۱۲) : خاموش۔

مَنقبت : تعریف۔ اصطلاحاً: اہلِ بیت اور صحابہ (یا بزرگانِ دین) کی تعریف و توصیف۔

مَنقل : انگیٹھی۔

منقول (ص ۱۴) : معقول کی ضد، حدیث، فقہ وغیرہ۔ دیکھیے معقول۔

منکھ : آدمی۔

منہدی (ص ۱۴۰) : ساچق کے دوسرے دن دلھن کے گھر سے بڑے جلوس اور روشنی کے ساتھ منہدی جاتی تھی۔ اس میں دراصل دولھا کا وہ جوڑا ہوتا تھا جس کو پہن کر وہ بیاہنے کو آئے گا۔ اِس جوڑے میں قدیم مغلیہ عہد کا درباری وضع کا خلعت مع شملہ، جیغہ، سرپیچ، مرصّع کلغی کے ہوتا تھا۔ ساتھ میں دولھا کے لگانے کے لیے پسی ہوئی منہدی بھی بھیجی جاتی تھی، جس کو بہت سے طباقوں میں پھیلا کر رکھتے تھے اور اُن میں سبز و سرخ شمعوں کو نصب کرکے روشن کر دیتے تھے۔ ان طباقوں کے ساتھ، بہت سے طباقوں میں ملیدہ بھی ہوتا تھا جو خرموں کو کاٹ کر

بنایا جاتا تھا۔ جوڑے کے ساتھ دولھا کے لیے سہرا یا سہرے کا سہرا بھی بھیجا جاتا تھا۔

منہیات : وہ کام جن کا کرنا شریعت کے خلاف ہے۔ بُرے کام۔

موترا : گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں کی ایک بیماری، جس میں گھٹنوں کی رگیں پھول جاتی ہیں اور بڑھ جاتی ہیں اور گھوڑے کو چلنے پھرنے سے معذور کر دیتی ہیں۔

مودّت : محبت، دوستی۔

مورد : اُترنے کی جگہ، ٹھہرنے کی جگہ۔

موضوع ہیں (ص ۲۵) : (اِسی کام کے لیے) بنے ہیں۔

موکب (ص ۳۲۵) : فوج، لشکر، پیادے سوار۔

موم کی ناک : غیر مستقل مزاج، وہ شخص جسے جس طرف چاہو کر لو۔

مونڈنا (ص ۲۷۴) : کسی کو (شاگرد یا) مرید بنانا۔

موہن بھوگ : حلوا۔

مہا : بڑا۔

مہک پری : ایک طرح کا عطر۔

مہمیز : لوہے کا آنکڑا، جو سوار کے جوتے کی ایڑی پر لگا ہوتا ہے، گھوڑے کے پیٹ کو گدگدانے یا چبھونے کے لیے۔ یہ عمل گھوڑے کو تیز رفتار کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

میر شکار : وہ شاہی ملازم شکاری جانوروں کی نگرانی جس کے ذمے ہو۔

میسرہ : بائیں بازو کی فوج۔

مینکھ : آسمان کے پہلے برج کا نام۔

مینگھ ڈمبر : ہاتھی کی کمر پر باندھنے کا چھتری دار ہودا، جس کی چھتری برجی نما ہوتی ہے۔

میل کرنا (ص ۲۰۷) : رغبت کرنا، خواہش کرنا۔

میمنہ : دائیں بازو کی فوج۔

مین : آسمان کے بارھویں برج کا نام، برج حوت۔

مینا (ص ۸۷) : (رنگت مینے کی) وہ سبز کام جو شیشے اور چاندی سونے کے برتنوں پر بنایا جاتا ہے۔

مینا بازار (ص ۱۸۱) : زنانہ بازار۔ وہ بازار جو خاص کر بادشاہوں کے لیے سجایا جائے۔

مینو : بہشت۔

مینو سواد (ص ۳۲) : خوب صورت، جنت کی طرح۔

نادِ علی : ایک دعا کا نام، جو زبرجد، ہیرے یا چاندی کے پتر پر کندہ کرکے بطور تعویذ بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں۔

نارنول : "نارنول قدیم قصبہ ہے، دلّی سے پچاس کوس کے فاصلے پر ۔۔۔ مہندی وہاں کی بہت رنگین۔ کھیت اُس کے بستی کے قریب۔"

(شیر علی افسوس : آرائشِ محفل)

نافرمان : ایک پھول جو اودے رنگ کا ہوتا ہے۔

ناقہ : اونٹنی۔

ناکتخدا : جس کی شادی نہ ہوئی ہو۔

ناگن (ص ۱۰۸) : گردن کے بالوں کی بھونری، جو نحوس خیال کی جاتی ہے۔ دیکھیے بھونری۔

ناگوری : ایک قسم کا جوتا۔

ناگوری بیل : ناگور (مارواڑ) کے علاقے کا بیل جو

خوب صورتی، مضبوطی اور قد و قامت میں دوسرے
بیلوں سے اچھا اور تیز رفتار ہوتا ہے۔

نالکی : لمبی آرام کرسی کے طرز کی، کہاروں کے اٹھانے کی
تام جھام کی قسم کی سواری، جس میں ایک آدمی
پھیل کر لیٹ سکے۔

ناموسِ سلطاں (ص ۲۰۲) : بیگمات۔

نانِ نعمت : کنایۃً : لذیذ کھانے کی چیز۔

ناوک : تیر۔

نائرہ : شعلہ، لَو، لپٹ۔

نائک : وہ مغنّی جو علمِ موسیقی میں جس قدر کہ قواعد اور
مدارج ہیں، اُن سب پر حاوی ہو۔ ترتیب یہ
ہے : پنڈت، گُنی، گندھرب، گائن، نائک۔
(معدن الموسیقی)۔

نبات : مصری۔

نبرد : جنگ۔

نثّار : نثر لکھنے والا۔

نُجَبا : نجیب کی جمع۔ نجیب : شریف، اصیل۔

نجف : عراق میں ایک مشہور شہر کا نام جہاں حضرت علیؓ کا مزار ہے۔

نجیب الطّرفین : جو ماں اور باپ دونوں طرف
سے شریف اور صحیح النّسب ہو۔

نرسنگا : سینگ کا بنا ہوا بھونپو، جو بگل کی طرح بجایا
جاتا تھا۔

نرگسِ شہلا : وہ نرگس جس کے پھول میں زردی کے بجائے
سیاہی ہو اور انسان کی آنکھ سے مشابہ ہو۔

نریمان : زال کے باپ اور رستم کے دادا کا نام۔

نژاد : اصل، نسل، نسب۔

نسترن : سیوتی کا پھول، ایک طرح کا سفید
خوش بو دار گلاب۔

نستعلیق (ص ۹۵) : مہذب، متین، مراد ہے خدا سے۔

نسرین : سفید جنگلی گلاب۔

نَس کٹا (ص ۱۸۳) : ہیجڑا، خواجہ سرا۔

نشان بردار (ص ۲۵۶) : جھنڈا لے کر چلنے والا۔
علم بردار۔

نعمتِ غیر مترقّب : وہ نعمت جس کے ملنے کا سان گمان
نہ ہو۔ وہ نعمت جو محنت کے بغیر حاصل ہو جائے۔

نَغز : عمدہ، اعلا، اچھا، عجیب۔

نَفَس : سانس۔

نفسِ امّارہ : انسان کی وہ خواہش جو بُرے
کاموں کی طرف متوجہ کرتی ہے، رغبت دلاتی ہے۔

نقّاشِ ازل : خدا۔

نقش بر آب : جلد مٹ جانے والا، فانی۔

نقشِ دیوار ہونا : حیران رہ جانا۔ سکتے کے عالم میں
آ جانا، بے حس و حرکت ہو جانا۔

نُقل : وہ چیز (گزک، بادام وغیرہ) جو شراب یا افیون کے
ساتھ یا اس کے بعد کھائی جائے۔ ایک قسم کی مٹھائی۔

نقیب : وہ لوگ جو بادشاہ یا اُمرا کی سواری کے آگے آگے
آواز لگاتے جاتے ہیں یا دربار میں کسی کی باریابی
کے موقع پر بہ آوازِ بلند پکارتے ہیں۔

نکتہ چینی (ص ۲۸) : اصل معنی ہیں : عیب نکالنا۔
سرور نے یہاں مشکل الفاظ استعمال کرنے اور

عبارت کو مشکل بنانے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

نکیسا: مشہور گائک کا نام جو شاہِ ایران خسرو پرویز کے دربار کا مغنی تھا۔

نگوں بخت: بدنصیب۔

نل دمن کی مثنوی (ص ۱۰۲): مشہور ہندستانی شاعر فیضی کی لکھی ہوئی مثنوی، جس میں راجا نل اور اس کی محبوبہ دمن کا قصہ لکھا گیا ہے۔

نمش: دودھ کا جھاگ جس میں مصری ملا کر کھاتے ہیں۔

نمط: طرح، ڈھنگ۔

نموہی: کم سخن، بے زبان۔

نواب ناظر سرا پردۂ شاہی: زنانہ ڈیوڑھی کا مہتمم خواجہ سرا۔

نوبات (ص ۱۴۲): نبات کی بگڑی ہوئی صورت، مصری کی ڈلی۔ شادی کی ایک رسم تھی جس میں مشاطہ دلھن کے مختلف اعضا پر مصری کی ۹ ڈلیاں رکھتی تھی اور دولھا کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ان کو اپنے منہ سے بغیر ہاتھ لگائے اٹھائے اور کھائے۔

نو بادہ: نیا پودا۔ نیا میوہ۔

نود سالہ: نوّے برس کا۔ بہت بوڑھا۔

نو رُستہ: مراد ہے: نوعمر، نوجوان۔

نوشاہِ روز: سورج۔

نوک کی لینا (ص ۹۵): ڈینگیں مارنا، فخریہ دعوا کرنا۔

نہنگ: مگرمچھ۔

نہیب دی (ص ۲۵): پُرزور، کڑک دار اور دہلا دینے والی آوازیں نقیبوں نے کہنا شروع کیا۔

نیّرِ اعظم: سورج۔

نیساں: رومیوں کے ساتویں مہینے (اپریل کے مطابق) اور اسی مہینے کی بارش کا نام۔ پرانا خیال یہ تھا کہ اس مہینے کے مینہ کی بوندوں سے سیپ میں موتی پیدا ہوتے ہیں۔

نیستاں: وہ جنگل جہاں نرکل کے درخت بہ کثرت ہوں۔ عموماً شیر ایسے ہی مقامات پر آرام کرتا ہے۔

نیشِ فصل (ص ۶۲): جدائی کا غم۔

نیمچہ: چھوٹی تلوار، پیش قبض۔

نیم وا: آدھا کھلا۔

وا: کھلا ہوا۔

وا چھڑے (ص ۱۴۹): کیا کہنا، واہ واہ، کیا خوب۔

وارستگی (ص ۹۳): آزادی، بے تعلقی۔

واژدوں: اوندھا۔

والا تبار: عالی خاندان۔

والہ: عاشق، شیدا، فریفتہ۔

وامق: عرب کے ایک مشہور عاشق کا نام۔

وحش و طیر: جنگلی چوپایے اور پرندے۔

وَدود: محبت رکھنے والا۔ خدا کا ایک نام بھی ہے۔

ورے اِن باتوں کے (ص ۱۳۲): اِن باتوں کے سوا۔

ورطہ: ہلاکت کا مقام۔ مجازاً: بھنور۔

ورع: پرہیزگاری۔

ورغلانا (ص ۳۳۱): ورغلایا، بہکایا۔

وصلی (ص ۱۴۷) : دو کاغذوں کو جوڑ کر دبیز بنایا ہوا کاغذ، جس کو لیٹی لگا کر خشک اور مُہرہ کر کے چکنا کر لیا جاتا تھا۔ اس پر خوش نویس عموماً قطعے یا رباعیاں لکھا کرتے تھے۔

وضعی (ص ۶۰) : مصنوعی، دکھاوے کا۔

وغا : جنگ

ولا : محبّت، دوستی۔

ولدالزنا : حرام زادہ۔

ویرانی (ص ۳۲۲) جنگل میں رہنے والا۔

ہاروت، ماروت : دو فرشتوں کے نام، جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم شہر بابل کے ایک کنوئیں میں اُلٹے لٹکے ہوئے قہرِ خدا میں گرفتار ہیں اور خواہش مند لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے ہیں۔

ہالہ : حلقہ، گھیرا، دائرہ۔

ہاموں : بیابان، جنگل۔

ہتی (ص ۳۶) : دوست۔

ہڈّا : گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں کے گھٹنے کے جوڑ میں رگوں کے اندر جو ننھی ہڈی نکلتی ہے، اگر وہ نکیلی ہو تو گھوڑا چلنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

ہراول : وہ تھوڑی سی فوج جو لشکر کے آگے چلے۔

ہرنا : گھوڑے کی کاٹھی کا اگلا اُبھرا ہوا حصہ۔

ہزار داستان : بلبل کی ایک قسم۔ مجازاً ایسا شخص جو خوش گفتار اور خوش بیان ہو۔ طرح طرح کی دل چسپ باتیں کرنے والا۔

ہزبر : شیر۔

ہفت اقلیم (ص ۱۱۵) : پوری دُنیا۔

ہفت ہزاری : مغل دربار کا اعلا ترین منصب۔

ھَل اَتیٰ : یہ قرآن کی سورۂ دہر کی پہلی آیت کے شروع کے الفاظ ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ سورت اہلِ بیت کی شان میں نازل ہوئی تھی۔

ہم بستری اختیار کرو (ص ۸۲) : آکر پاس بیٹھو۔

ہم چشم : ساتھی، برابر والے۔

ہم خرما ہم ثواب (ص ۸) : چھوارے بھی اور ثواب بھی۔ ایسا کام جس میں لطف و لذّت بھی ہو اور وہ کارِ خیر بھی ہو۔

ہمقراں کیا (ص ۲۷) : نکاح کر دیا۔

ہم قرینِ غم : مصیبت میں مبتلا۔

ہندسہ : علمِ ریاضی کی ایک شاخ۔

ہندی کی چندی کرنا : خوب سمجھانا، خوب چھان بین کرنا۔ آسان بات کو اور آسان کر کے سمجھانا۔

ہَوا دار : پالکی کی قسم کی سواری، جو اوپر سے کھلی ہوئی یعنی چھت کے بغیر ہوتی تھی۔ اس میں ڈنڈے لگے ہوتے تھے اور کہار اس کو کاندھے پر اُٹھاتے تھے۔ کسی زمانے میں اُمرا شام کے وقت ہوا خوری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسی کو تام جھام بھی کہتے تھے۔

ہَوائی (ص ۶) : پستے اور بادام کے پتلے پتلے ورق جو عموماً فرنی پر جمائے جاتے ہیں۔

ہَوتڑ : ایک طرح کی چھوٹی کھلے منہ کی توپ، جو غبارے سے مشابہ ہوتی تھی۔

ہودج : پلنگ نما چوکھٹا، جو سواریوں کے لیے ہاتھی کی کمر پر باندھا جائے۔ عموماً گہوارے کی شکل کا ہوتا ہے اور اُس پر چھتری یا سایے کو کوئی آڑ نہیں ہوتی۔ کھلی ہوئی یعنی بغیر چھتری کی عماری۔

ہوکا کرنا : لالچ کرنا۔

ھُوَ ھُوَ (ص ۲۳۹) : سارا حال، جو کچھ گزرا تھا سب۔

ہیجا : جنگ

ہیچ میرز (ص ۲۰) : کسی قیمت کا نہیں، ناچیز، ناقابل۔

ہیرا کھانا (ص ۱۲) : رشک سے جان دے دینا۔

ہیرا کھانا (ص ۲۳۲) : مراد ہے دن رات جان کھپانے سے۔

ہیزم : جلانے کی لکڑی۔ سوکھی لکڑی۔

ہَیکل : گردن سے ناف تک لٹکتا ہوا لڑی کی وضع کا ہار، سونے، چاندی، موتی، جواہرات یا پھولوں کا بنا ہوا۔

ہین : مراد ہے: بے عزتی، توہین۔

یاقوت کی تحریر (ص ۱۰۶) : مراد ہے دیواروں میں یاقوت (مشہور قیمتی پتھر) کی پتلی سی پٹی لگی ہوئی تھی۔

یاقوتی (ص ۷) : ایک قسم کی مقوی معجون جس میں یاقوت خاص طور پر ڈالا جاتا ہے۔ ایک طرح کی مٹھائی، جو پتاشے میں قند اور زعفران ملا کر کھیر کی طرح پکاتے تھے اور جما کر اوپر سے چاندی کا ورق لگا دیتے تھے۔

یخ : کنایتاً : بہت سرد۔

یلہ : ہاتھ۔

یراق : ہتھیار، لڑائی کا سامان۔

یرغا : دُلکی چال، جس میں گھوڑا قدم پر قدم ڈالتا ہوا لمبا اور تیز قدم چلے۔ اس چال میں سوار کو بہت تکان ہوتی ہے لیکن گاڑی میں چلنے کے لیے یہ آرام دہ ہوتی ہے۔

یساولان : یساول کی جمع، نقیب، چوب دار۔

یشب : ایک قیمتی جواہر، جو سبزی مائل ہوتا ہے۔

یک نہ شد دو شد : ایک بلا تو تھی ہی اور دوسری اور پیچھے لگی۔

یکہ تاز : جو تنہا حریف پر حملہ کرے، مجازاً : بہادر۔

یکہ تازِ میدانِ لافتیٰ : حضرت علیؓ مراد ہیں۔

یکے : ایک قسم کے سپاہی جنھیں گھر بیٹھے وقت بے وقت کے لیے تنخواہ ملا کرتی تھی۔

یُمن : برکت۔

یہ گو یہ میدان ہے : آؤ ابھی مقابلہ ہو جائے۔

فرہنگ

(ب)

عربی فقرے اور عبارتیں

ص ۱۔ س ۲ : تمام تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے پانی (یعنی نطفے) سے آدمی کو پیدا کیا، پھر اُس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا۔ اور تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے [سورۂ الفرقان، آیت ۵۴]

[یہ صراحت ضروری ہے کہ قرآنِ پاک میں "وَھُوَ الَّذِیْ" سے یہ آیت شروع ہوتی ہے: وَھوالّذی خلق من المآءِ بشراً]۔

ص ۱۔ س ۱۵ : نہیں پہچانا ہم نے تجھ کو جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے۔

ص ۲۔ س ۱۰ : اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔

ص ۲۔ س ۱۲ : اللہ کی رحمت اور سلام ہو آپ پر اور آپ کی پاک اولاد پر اور آپ کے بلند مرتبہ اصحاب پر۔

ص ۳۔ س ۴ : تیرا گوشت، میرا گوشت ہے اور تیرا خون، میرا خون ہے۔ علی مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں (علی میرے ہیں اور میں اُن کا ہوں)۔

ص ۳۔ س ۵ : میرے اہلِ بیت (گھر والوں) کی مثال نوحؑ کی کشتی کی طرح ہے کہ جو شخص اُس میں سوار ہو گیا، اُس نے نجات پائی اور جو اُس سے پیچھے رہ گیا وہ ڈوب گیا اور گر گیا۔

ص ۳۔ س ۱۰ : تم اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور تم میں سے جو لوگ اہلِ حکومت ہیں، اُن کا بھی [سورۂ النسآء، آیت ۵۹]

ص ۴۔ س ۱ : ہمیشہ رکھے اللہ اُس کے ملک کو اور اُس کی سلطنت کو، اور تائید کرے اُس کی اللہ فتح اور کامیابی سے۔ بڑی ہے اُس کی شان۔

ص ۵ س ۱۶ : اللہ پاک ہے اور اُس کی حمد ہے۔ (میں اللہ کی تسبیح کرتا ہوں اور اُس کی حمد سے شروع کرتا ہوں)

[اُردو کے محاورے میں یہ ٹکڑا بطورِ کلمۂ استعجاب مستعمل ہے اور زیرِ بحث عبارت میں بھی اسی طور پر آیا ہے۔]

ص ۱۳۔ س ۸ : کھڑا ہو جا میرے حکم سے۔

ص ۱۹۔ س ۸ : حق بات (سچی بات) کڑوی ہوتی ہے۔

ص ۱۹۔ س ۱۵ : ہمیشہ رہے اُس کا ملک۔

ص ۲۲ ـ س ۱۶ : اللہ اُس کے سایے کو دراز کرے (ہمارے سر پر اُس کا سایہ قائم رکھے)۔

ص ۲۲ ـ س ۱۸ : عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔

ص ۲۳ ـ س ۸ : دکھا مجھے۔

ص ۲۳ ـ س ۹ : تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔

ص ۲۳ ـ س ۱۹ : ہمیشہ رہے اُن کی شان و شوکت۔

ص ۲۴ ـ س ۱۳ : تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ [سورۂ آلِ عمران، آیت ۲۶]

[قرآنِ پاک میں وَ تُعِزُّ ..... ہے]۔

ص ۲۹ ـ س ۴ : درود اور سلام ہو آپ پر اور آپ کی اولاد پر۔

ص ۳۱ ـ س ۵ : وہی شروع کرنے والا (پیدا کرنے والا) ہے اور اُسی کی طرف لوٹتا ہے۔

ص ۳۴ ـ س ۴ : اے میرے رب مجھے لاوارث مت رکھیو، اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔ [سورۂ الانبیاء، آیت ۸۹]

ص ۳۴ ـ س ۵ : تو مجھ کو خاص اپنے پاس سے ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دے دے۔ [سورۂ مریم، آیت ۵]

[اصلاً اِس آیت میں رَبِّ هَبْ لِي کی جگہ فَهَبْ لِي ہے]۔

ص ۳۶ ـ س ۱۴ : حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

ص ۳۷ ـ س ۶ : اُن دونوں پر سلام ہو۔

ص ۴۲ ـ س ۷ : ایک ہے، کوئی اُس کا شریک نہیں۔

ص ۴۴ ـ س ۹ : ہم نے بعض (لوگوں) کو بعض (لوگوں) پر فضیلت دی ہے۔

[قرآنِ پاک میں یہ آیت تین طرح آئی ہے: (۱) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (سورۂ النحل، آیت ۷۱)۔ (۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورۂ البقرۃ، آیت ۲۵۳)۔ (۳) اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۲۱)]

ص ۹۹ ـ س ۷ : اللہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو۔

[اصلاً قرآنِ پاک کی آیت اِس طرح ہے: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ سورۂ الحدید، آیت ۴]

ص ۱۰۸ ـ س ۱۲ : بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۶۵ نیز سورۂ البقرۃ، آیت ۲۰]

ص ۱۲۴ ـ س ۲ : میں نے اللہ پر بھروسا کیا۔

ص ۱۲۵ ـ س ۱۱ : ہاں اے ساقی، پیالے کو گردش میں لا اور اُس کو (ہمیں) دے۔

ص ۱۲۵ ـ س ۷ : جو کچھ ہوا، بھلائی اُسی میں ہے۔

ص ۱۸۹ــس ۱ : سب تعریف خدا کے لائق ہے ، خدا کا شکر ہے۔

ص ۱۹۰ــس ۹ : سخی جب وعدہ کرتا ہے تو اُسے پورا کرتا ہے۔

ص ۲۰۴ــس ۸ : ہم تو اللہ کی ملک ہیں اور ہم سب (دُنیا سے) اُسی کے پاس جانے والے ہیں۔ [سورۂ البقرہ، آیت ۱۵۶]

ص ۲۰۹ــس ۱۱ : کہہ ، زمین پر گھومو پھرو۔ [سورۂ النمل، آیت ۶۹]

ص ۲۱۴ــس ۵ : بڑی ہے اُس کی شان۔

ص ۲۱۴ــس ۱۸ : ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔

ص ۲۲۱ــس ۹ : جب اُن کی میعادِ معیّن (موت) آجائے گی تو اُس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ [سورۂ الاعراف، آیت ۳۴] (قرآن پاک میں فَاِذَا جَآءَ سے آیت شروع ہوتی ہے۔)

ص ۲۲۷ــس ۱۵ : دونوں جہان میں مُنہ کالا ہے۔

ص ۲۳۸ــس ۱۵ : بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (رہتا) ہے۔ [سورۂ البقرہ، آیت ۱۵۳]

ص ۲۵۷ــس ۳ : جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی۔ [سورۃ الزلزال، آیت ۱]

ص ۲۶۶ــس ۴ : اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔ [سورۂ ھود، آیت ۴۱]

ص ۲۷۸ــس ۱۷ : نیند، موت کا بھائی ہے۔

ص ۲۷۹ــس ۱۹ : بڑی ہے اُس کی شان۔

ص ۲۸۲ــس ۱۷ : اور اللہ بہتر طور پر جانتا ہے۔

ص ۲۸۳ــس ۱۰ : کیا خوشی کی بات ہے یہ تو لڑکا ہے۔ [سورۂ یوسف]

ص ۲۸۹ــس ۸ : سب لوگوں کے سامنے۔

ص ۲۹۳ــس ۱۸ : وہ جو کچھ چاہے (چاہتا ہے)۔ [قرآن پاک میں متعدد مقامات پر آیا ہے من جملہ اُن کے : سورۂ البقرہ، آیت ۲۵۳]

ص ۲۹۴ــس ۵ : وہ اکیلا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ [یہ دونوں ٹکڑے (وحدہ - لاشریک لہ) مختلف آیتوں میں الگ الگ آئے ہیں۔]

ص ۳۰۱ــس ۲ : میں نے اللہ پر بھروسا کیا۔ [سورۂ ھود، آیت ۵۶]

[اصلاً آیت میں اِنِّی تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ ہے]

ص ۳۰۸ــس ۷ : تھوڑی سی چیز اُلٹہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

ص ۳۱۴ــس ۱۰ : میں نے ایک مدّت تک تیری جدائی میں قیامت دیکھی۔

ص ۳۲۰ — س ۱۶ : خُدا کی پناہ۔

ص ۳۳۲ — س ۸ : میرے غلاموں میں کوئی اچھائی نہیں۔

ص ۳۳۲ — س ۱۲ : ہم راضی ہیں خُدا کے حکم پر۔

ص ۳۳۴ — س ۹ : خُدا تجھ کو معاف کرے۔

ص ۳۳۷ — س ۱۰ : اور اُس کی دونوں آنکھیں غم سے (روتے روتے) سفید پڑ گئیں اور وہ (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتا تھا۔ [سورۂ یوسف، آیت ۸۴]

ص ۳۴۱ — س ۹ : جتنے (ذی روح) روئے زمین پر موجود ہیں، سب فنا ہو جائیں گے اور (صرف) تیرے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت (والی) ہے، باقی رہ جائے گی۔ [سورۂ الرحمٰن، آیت ۲۷]

ص ۳۴۳ — س ۳ : رسول اللہ اور اُن کی باعظمت اولاد کے طفیل (جن کا باعظمت ہونا) نصِ قرآن سے ثابت ہے۔

فرہنگ

(ج)

فارسی اشعار اور فقروں کا ترجمہ

ص ۲ — س ۱۴ :

(اے رسول اللہؐ) آپ سب رسولوں سے پہلے عالمِ وجود میں آئے تھے ، اگرچہ اُن سب کے بعد اِس دنیا میں آپ کا ظہور ہوا۔ اے سب رسولوں کے بعد آنے والے رسول ! (خدا سے) آپ کے قُرب کا حال ہم کو معلوم ہوا ، (کہ) آپ اِس وجہ سے دیر سے (اِس دُنیا میں) تشریف لائے کہ دور سے آئے ہیں۔

ص ۴ — س ۹ : سردی کے موسم میں اِس قدر دوشالے عطا کیے کہ سارا بنگال گرم ہو گیا اور کشمیر کا علاقہ سرد رہ گیا۔

ص ۱۷ — س ۱۱ : دنیا کا کام کسی نے مکمل نہیں کیا ، (اس لیے) اپنے لیے کم سے کم سامان جمع کرو۔

ص ۱۷ — س ۱۷ : کوئی نہیں کہے گا کہ میرا دہی کھٹا ہے۔

ص ۲۴ — س ۱۲ : قبولِ عام اور کلام میں لطف (دراصل) خداداد چیزیں ہیں۔

ص ۲۷ — س ۷ : دوستوں کے ساتھ قید میں رہنا ، غیروں کے ساتھ باغ کی سیر کرنے سے بہتر ہے۔

ص ۲۷ — س ۱۸ : رونے کے لیے بھی دل کا اطمینان ضروری ہے۔

ص ۲۸ — س ۱ : دوست سے جو کچھ ملے ، وہ اچھا ہے۔

ص ۲۹ — س ۲ : لقمہ کھاتے وقت اے مسرّت ! میرے لبوں نے کہا کہ روزی (وہ چیز ہے جو) عزیز ترین ساتھیوں کو بھی جدا کر دیتی ہے۔

ص ۳۰ — س : مشک وہ ہے جو خود خوشبو دے ، نہ یہ کہ عطر فروش اُس کو بتائے (تعریف کرے)۔

ص ۳۵ — س ۲ : اِس (کے) ہاتھ سے بہت سے گریبان ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے۔

ص ۳۸ — س ۱۰ : مجھ کو آئینے کے پیچھے بٹھا دیا گیا ہے اور جو کچھ اُستادِ ازل (خدا) کہتا ہے ، میں وہی طوطی کی طرح دُہراتا ہوں۔

ص ۴۲ — س ۱۳ : وہ جھوٹ جو کسی مصلحت سے بولا جائے ، اُس سچ سے بہتر ہے جس سے فتنہ پیدا ہو۔

ص ۴۴ — س ۷ : عشق کے لیے دیکھنا شرط نہیں ، بارہا (ایسا ہوا ہے کہ) باتیں سُن کر ہی عشق پیدا ہو جاتا ہے۔
حُسن کا جلوہ کانوں کے راستے دل میں اُتر جاتا ہے اور آرام و ہوش کو تباہ کر دیتا ہے۔

(اور اِس عالم میں) دیکھنے کا (قدم) درمیان میں نہیں رہتا، غائبانہ ہی لوگوں کو عاشق بنا دیتا ہے۔

ص ۴۶ ــــ س ۴ : اُس چیز کا غم جان کو مُبتلائے آزار کرتا ہے جو کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں رہتی۔

ص ۵۱ ــــ س ۱۱ : اے سعدی نوبت بجانے والے نے آج صبح کی نوبت (اب تک) نہیں بجائی یا (یہ بات ہے کہ) ہجر کی رات کی صبح ہوتی ہی نہیں۔

ص ۵۵ ــــ س ۲ : میرا نہ کوئی رفیق ہے نہ دوست نہ غم گسار، میں اپنے دل کی بات کس سے کہوں؛ یہ بڑا عجیب غم ہے۔

ص ۵۹ ــــ س ۶ : افسوس ہے ہم پر اور ہماری گرفتاری پر۔

ص ۶۱ ــــ س ۲ : اگر شراب پیو تو ایک گھونٹ بھر شراب (پہلے) زمین پر گرا دو۔ [اُن لوگوں کی یاد میں جو زیرِ زمین ہیں] جس گناہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے، اُس میں کچھ بُرائی نہیں۔

ص ۶۱ ــــ س ۶ : شراب پیو کہ غموں کا زمانہ (ہمیشہ) نہیں رہے گا۔ جب وہ (خوشی کا زمانہ) نہیں رہا، تو یہ (غم کا زمانہ) بھی نہیں رہے گا۔

ص ۶۹ ــــ س ۴ : جس نے بھی تیر اندازی کا فن مجھ سے سیکھا، اُس نے آخر کار مجھی کو نشانہ بنایا۔

ص ۶۹ ــــ س ۱۹ : روز عید نہیں ہوتی جو حلوا کھانے کو ملے۔

ص ۸۲ ــــ س ۷ : دیکھو، راستے کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے (دو چیزوں میں فرق ظاہر کرنے کے لیے کہتے ہیں)۔

ص ۸۳ ــــ س ۶ : میں اپنا احوال کیا کہوں، ساری عمر ہو گئی ہے کہ کاکُل کی طرح سیاہ بخت (بدنصیب) ہوں، پریشان حال ہوں اور خانہ بردوش (آوارہ وطن) ہوں۔

ص ۸۵ ــــ س ۱۵ : مجھ جیسے (غم زدہ) شخص کو اپنی محفل میں مت آنے دو (کیوں کہ) ایک افسردہ دل (اور غم زدہ شخص) کی وجہ سے ساری محفل کی رونق بجھ جاتی ہے اور مسرت ختم ہو جاتی ہے۔

ص ۹۳ ــــ س ۱۱ : عجیب واقعہ اور عجیب تر ماجرا ہے۔

ص ۹۷ ــــ س ۴ : وصل کی رات شکوے شکایت نہ کرو (کیوں کہ) یہ رات بہت چھوٹی ہوتی ہے اور شکوے شکایت کی داستان بہت لمبی ہوتی ہے۔

ص ۹۸ ــــ س ۱۴ : دریا کا کنارہ گھاس کوڑے سے بچتا نہیں (ساحل پر گھاس کوڑا جمع ہوتا ہی ہے) اور پھول کو کانٹے کے ساتھ رہنے پر کبھی شرم نہیں آتی۔

ص ۹۹ ــــ س ۸ : سفر پر جانا تم کو مبارک ہو۔ (خدا کرے) سلامتی کے ساتھ جاؤ (سفر کرو) اور واپس آؤ۔

ص ۱۰۶ ــــ س ۱۰ : ملاقات کا وعدہ جب قریب ہوتا ہے تو شوق کی آگ زیادہ بھڑکنے لگتی ہے۔

ص ۱۱۴ ــــ س ۱۴ : میں جب تک سر نہیں دوں گا (جان نہیں دوں گا) اُس کی گلی سے اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا (اُس

کی گلی نہیں چھوڑوں گا) بہادری اور بزدلی میں بس ایک قدم ہی کا فاصلہ ہوتا ہے۔

ص ۱۲۰ ــــ س ا : آسمان نے کہا : بہت خوب! فرشتوں نے کہا : واہ واہ!

ص ۱۲۵ ــــ س ۱۰ : سعدی نے زلیخا میں کیا اچھا لکھا ہے کہ ہاں اے ساقی پیالے کو گردش میں لا اور اس کو ہمیں دے (ڈوبے جوڑ چیزوں کو جمع کرنے کے موقعے پر کہتے ہیں)۔

ص ۱۲۵ ــــ س ۱۴ : حلوا کھانے کے لیے مُنہ چاہیے۔

ص ۱۳۱ ــــ س ۱۳ : آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔

ص ۱۳۸ ــــ س ۱۶ : بہشت وہ جگہ ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو، اور کسی کو کسی سے کوئی مطلب غرض نہ ہو۔

ص ۱۴۷ ــــ س ۱۰ : اس طرح بار بار اندر سے گیا اور باہر لایا کہ پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی دایہ (اس کی) حسرت میں مر گئی (بے قرار ہوگئی)۔

ص ۱۵۲ ــــ س : جب میں نہیں رہوں گا تو پھر تو کس لیے آئے گا۔

ص ۱۵۳ ــــ س ا : کیا اچھا وہ دن ہوگا جب تو واپس آئے گا اور میں تیرے قدموں پر بوسہ دوں گا، سجدہ کروں گا اور تیرے قدموں کی خاک کو چوموں گا۔

جس جس جگہ تو کسی دن ذرا دیر بھی بیٹھا تھا، میں وہاں جاتا ہوں اور رو رو کر اس جگہ کو چومتا ہوں۔

تیرے رخساروں پر بوسہ دینے کی حسرت میں لالہ و گل کو میں چومتا ہوں اور یہ فرض کرلیتا ہوں کہ تیرے چہرے کے بوسے لے رہا ہوں۔

جہاں بھی کوئی ہرن نظر آجاتا ہے تو تیری نرگسی آنکھوں کے تصور میں مجنوں کی طرح میں اس کے سر اور آنکھوں پر بوسے دیتا ہوں۔

میں فقیر ایکی ہوں اور تو بادشاہ ہے۔ میں جس ہاتھ کو چومتا ہوں، تیرے ہاتھوں کے تصور میں چومتا ہوں۔

ص ۱۶۳ ــــ س ۱۴ : دوستوں سے ملاقات دراصل عمر کی بہار (حصولِ لطف و لذت) ہے۔ خضر تنہا رہتے ہیں تو پھر وہ اس عمرِ جاوید سے کیا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

ص ۱۶۴ ــــ س ۷ : لالچ، عقل مند آدمی کی آنکھوں کو سی دیا کرتی ہے (بھلے بُرے کی تمیز جاتی رہتی ہے)۔

ص ۱۶۵ ــــ س ۸ : آدم کی اولاد پر (آدمی پر) جو بھی (مصیبت) آتی ہے، وہ (آخر کار) گزر جاتی ہے (ختم ہی ہوجاتی ہے)۔

ص ۱۶۵ ــــ س ۱۴ : ملاقات کے دن اور معشوقوں کی دوستی (کو ایسا سمجھنا چاہیے) جیسے خواب میں احتلام ہوگیا اور بات ختم ہوگئی۔

ص ۱۶۶ ـــ س ۴ : عورت اُسی وقت تک تمھاری دوست رہے گی، جب تک تمھارے سوا کوئی اور دوست اُسے نہیں ملتا۔ جب وہ کسی دوسرے کی آغوش میں بیٹھ جائے گی تو پھر یہ چاہے گی کہ آیندہ تم کو کبھی نہ دیکھے۔

ص ۱۶۶ ـــ س ۶ : وفادار گھوڑا، وفادار عورت اور وفادار تلوار کس نے دیکھی ہے (یعنی یہ چیزیں ہمیشہ کسی ایک ہی کے پاس نہیں رہتیں۔)

ص ۱۷۰ ـــ س ۷ : دُنیا کے حادثات میں مجھ کو یہ بات پسند آئی کہ اچھائی ہو یا بُرائی (اور آرام ہو کہ تکلیف) سب کو چلتا پھرتا دیکھا (کوئی چیز اور حالت ایک جیسی ہمیشہ نہیں رہتی)۔

ص ۱۸۶ ـــ س ۹ : سفر کے سامان میں میرے پاس ایک غمگین دل ہے اور میرے ہاتھ میں میرے خالی دامن کے سوا اور کچھ نہیں۔

ص ۱۹۰ ـــ س ۱۱ : بادشاہ اگر فقیروں پر کرم فرمائیں تو کیا تعجب کی بات ہے۔

ص ۱۹۲ ـــ س ۶ : عشق نے اِس سے بڑھ کر بہت کچھ کیا ہے اور کرتا رہے گا۔ اُس نے تسبیح کو زنّار بنا دیا ہے اور (آیندہ بھی) بنائے گا۔

ص ۱۹۸ ـــ س ۲ : جو کچھ ہم پر (مصیبت پڑی) ہے، وہ ہماری ہی (غلطیوں کے) سبب سے ہے۔ اپنے کیے کا کچھ علاج نہیں۔

ص ۲۰۹ ـــ س ۱۲ : کہ یہ بڑھیا (دُنیا) ہزاروں آدمیوں کی دُلھن بن چکی ہے۔

ص ۲۱۰ ـــ س ۷ : محبوب کے چہرے کے لیے مشّاطہ (بناؤ سنگار کرنے والی عورت) کی ضرورت نہیں۔

ص ۲۱۷ ـــ س ۱۵ : (اپنے) وطن کی محبت، سلیمانؑ کی بادشاہت سے بڑھ کر ہے، اور (اپنے) وطن کے کانٹے (دوسرے باغوں کے) پھولوں سے کہیں بہتر ہیں۔ یوسفؑ جو مصر میں بادشاہت کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ (اپنے وطن) کنعاں میں فقیر بن کر رہنا (اِس غیر مُلک کی بادشاہت سے) بہتر ہے۔

ص ۲۲۲ ـــ س ۱ : میں (کچھ) کہوں تب مشکل ہے اور نہ کہوں تب مشکل ہے۔

ص ۲۲۵ ـــ س ۴ : فولاد (کی طرح سخت سے سخت آدمی) کے ہاتھ میں سونا رکھ دو، تو وہ بھی نرم ہو جائے گا۔

ص ۲۲۶ ـــ س ۵ : مَردوں کا قول جان کے ساتھ ہے۔

ص ۲۲۶ ـــ س ۶ : میرے مرنے کے بعد ایک نئی دُنیا بن جائے تو بن جائے، مجھے کیا (میرے کس کام کی)۔

ص ۲۳۱ ـــ س ۵ : آدھی رات کو ایک بوڑھی عورت جب (ظلم کی) فریاد کرتی ہے تو سو سال کی (قدیم اور مضبوط) سلطنت تباہ ہو جاتی ہے۔

ص ۲۳۲ ـــ س ۱۳ : میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ عربی گھوڑے کی پیٹھ پر تو گدھے والی موٹی جھول پڑی ہے جس سے اُس کی

پیٹھ زخمی ہوگئی ہے اور سونے کا طوق گدھے کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔

ص ۲۳۳ — س ۱۶ : دُنیا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر فنا ہے اور یہاں جوان ہو یا بوڑھا، سب موت کا شکار ہیں۔ اِس زمین کے اوپر بھی آبادی ہے اور اِس کے نیچے بھی۔ یہ زمین ایک ایسا ورق ہے جس پر دونوں طرف تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

ص ۲۳۴ — س ۶ : دیوانے بن جاؤ، تاکہ تمھاری فکر دوسرے کریں۔ جس کے پاس عقل جتنی زیادہ ہوتی ہے، اُس کو دُنیا کا غم بھی اُتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔

ص ۲۳۵ — س ۲ : ہاتھ سے گیا وقت اور کمان سے نکلا تیر پھر ہاتھ نہیں آتا۔

ص ۲۳۵ — س ۱۶ : ہر شخص دوسرے کے ظلم کی شکایت کرتا ہے لیکن سعدی (چوں کہ اپنے ہی سبب سے آفت میں مبتلا ہوا ہے، اس لیے وہ) اپنی ہی شکایت کرتا رہتا ہے۔

ص ۲۳۷ — س ۸ : اے میری طبیعت کی تیزی (ذہانت، اُمنگ) تو ہی میرے لیے مصیبت بن گئی۔

ص ۲۳۷ — س ۱۷ : تجھ سے محبت کرنے کے جرم میں مجھے قتل کیا جارہا ہے اور ایک شور برپا ہے۔ تو بھی چھت پر آجا (اور دیکھ لے) کہ یہ منظر دیکھنے کے لائق ہے۔

ص ۲۴۰ — س ۱۹ : جس نے بھی کسی کے ساتھ بُرائی کی، اُس نے اُس کا بدلا ضرور پایا۔

ص ۲۴۱ — س ۱ : ہر فرعون کے لیے ایک موسٰی ہوتا ہے (ہر ظالم سے بدلا لینے والا کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا ہے)۔

ص ۲۴۴ — س ۱۹ : زمانہ برابر نئے نئے غم دیے جاتا ہے۔ ایک زخم اچھا نہیں ہونے پاتا کہ دوسرا زخم لگ جاتا ہے۔

ص ۲۵۰ — س ۱۴ : (اے خدا) تیری توجہ سے مشکل بھی آسان ہوجاتی ہے اور اگر تو توجہ نہ کرے تو آسان کام بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

ص ۲۵۴ — س ۱۰ : آپ کا آنا ہماری آبادی (نجات اور فلاح) کا ذریعہ بنے گا۔

ص ۲۵۴ — س ۱۶ : دشمن اگر طاقت ور ہے تو حفاظت کرنے والا اُس سے زیادہ طاقت ور ہے۔

ص ۲۵۵ — س ۴ : سانپ کا کاٹا، رسّی سے (بھی) ڈرا کرتا ہے۔

ص ۲۵۵ — س ۱۶ : بہت سے لوگوں کا (ایک ساتھ) مرنا بھی (ایک طرح کا) جشن ہوتا ہے۔

ص ۲۶۵ — س ۹ : دریا میں (دریائی سفر میں) نفع کے سامان بہت ہیں۔

ص ۲۶۵ — س ۱۶ : اگر سلامتی چاہتے ہو تو وہ کنارے پر ہے۔

ص ۲۶۶ — س ۳ : اِس بڑے سمندر میں اور موجوں کے اِس طوفان میں ہم سفر کرنے کے لیے تیّار ہوگئے ہیں۔ اِس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔

ص ۲۶۷ ۔ س ۱۰ : میرا حال تو ایسا ہے دشمن جیسا چاہتے ہیں اور میری جان بس نکلنے ہی والی ہے ۔ میں اگر اپنی مصیبتوں کو بیان کردوں تو خدا کی قسم دشمن بھی (ترس کھاکر) مجھے زندہ رہنے کی دُعا دینے لگے گا ۔

ص ۲۶۹ ۔۔۔ س ۹ : ساتھی سب چھوٹ گئے، بس ہم رہ گئے ہیں اور چور تاک میں لگے ہوئے ہیں ۔ ملاح کا گھر چین میں ہے اور کشتی فرنگستان میں ہے ۔

ص ۲۶۹ ۔۔۔ س ۱۹ : جو لوگ مٹی پر نظر ڈال کر اُسے کیمیا بنا دیتے ہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ذرا سی توجہ ہم پر بھی کریں ۔

ص ۲۷۰ ۔۔۔ س ۱۱ : جب تک میرے دل میں طاقت تھی، میں نے صبر کیا لیکن اب جان پر بن گئی ہے، اب تو بس رُسوائی ہونے ہی والی ہے ۔

ص ۲۷۰ ۔۔۔ س ۱۲ : تجھ سے دور ایک گوشے میں ناکام محبت لوگوں کی طرح تنہا بیٹھا ہوا ہوں ۔ بس میں ہوں اور تنہائی کے غم سے آہ و فریاد ۔

ص ۲۷۱ ۔۔۔ س ۲ : راتیں آنسو بہاتے گزر جاتی ہیں اور خون کے آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا ہے ۔ محبت نے یہ ہنر مجھے عطا کیا ہے اگر تم اسے عیب نہ سمجھو ۔

ص ۲۷۱ ۔۔۔ س ۷ : اے راحتِ جان ! تجھ سے سیکڑوں غم مجھے مل رہے ہیں ۔ جو کچھ تو دکھائے گا وہ دیکھنا ہی ہوگا ۔

ص ۲۷۱ ۔۔۔ س ۱۲ : خسرو کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کے موتی برس رہے ہیں اور سمجھ بوجھ کا دامن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے ۔

ص ۲۷۵ ۔۔۔ س ۱۲ : جس کام میں دیر لگتی ہے، وہ (بہتر) اچھی طرح ہوتا ہے ۔

ص ۲۷۵ ۔۔۔ س ۱۷ : وہ حالات نہیں رہے تو یہ حالات بھی نہیں رہیں گے ۔ (جب آرام و مسرت کے دن نہیں رہے، تو یہ غم کے دن بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے) ۔

ص ۲۷۵ ۔۔۔ س ۱۹ : رونے کے بعد ہنسی ضرور ملتی ہے ۔

ص ۲۸۰ ۔۔۔ س ۲ : انسان تدبیریں کرتا ہے اور تقدیر اُس پر ہنستی ہے ۔

ص ۲۸۰ ۔۔۔ س ۳ : جو کچھ قسمت میں لکھا ہے، وہ ضرور ملے گا ۔ اگر تم (خوشی سے) اُسے نہیں لینا چاہو گے، تو مجبوراً اُسے قبول کرنا پڑے گا ۔

ص ۲۸۳ ۔۔۔ س ۱ : افسوس یہ گھومنے والا آسمان (کیسا بے رحم ہے) کہ روزانہ کسی نہ کسی چاند جیسے شخص کو کنویں میں گراتا رہتا ہے (مبتلائے مصیبت کرتا رہتا ہے) ۔

ص ۲۸۳ ۔۔۔ س ۱۲ : قسمت تو دیکھو کہ یہ طوطی پستے کی اُمید پر اُس کے لبوں کی طرف آیا تھا اور شکر مل گئی (اُمید کے

خلاف عمدہ چیز مل جانے پر کہتے ہیں)۔

ص ۲۸۵ — س ۲ : دشمن جو کچھ کہتا ہے وہ غلط ہے۔

ص ۲۸۷ — س ۶ : سچائی سے خدا کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی شخص سیدھے راستے پر چل کر راستہ بھول جائے۔

ص ۲۹۱ — س ۱۸ : ایسی کوئی مشکل نہیں جو آسان نہ ہوسکے۔ مرد (ہمت والے آدمی) کو گھبرانا نہیں چاہیے۔

ص ۲۹۳ — س ۱۰ : جاننے والے کی نظر میں ہرے بھرے درختوں کا ہر پتّا خدا کی معرفت کی ایک کتاب ہے۔

ص ۲۹۷ — س ۹ : ایک گھڑی، ایک ساعت اور ایک لمحے میں دُنیا کے حالات بدل جاتے ہیں۔

ص ۳۰۱ — س ۱۰ : عیش و عشرت کی اگر ایک رات ملی ہے تو اُسے غنیمت سمجھو اور اس کے ساتھ انصاف کرو (خوب عیش کرو) کیوں کہ اِس دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا۔

ص ۳۰۹ — س ۹ : بےکسی (اور تنہائی) نے مجھے پھونک دیا ہے ؛ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک لمحے کے لیے ہی، کوئی ہم زبان (اور غم گسار) مل جائے۔

ص ۳۱۴ — س ۹ : میں نے (سیاہی کے بجائے) دل کے خون سے دوست کو خط (میں) لکھا ہے کہ میں نے ایک مدت تک تیری جُدائی میں قیامت دیکھی۔

ص ۳۱۴ — س ۱۲ : میں نے اپنی آنکھوں کی سیاہی حل کرکے تجھے خط لکھا ہے، تاکہ جب تو اس خط کو پڑھے تو میری آنکھیں تیرے چہرے کو دیکھ لیں۔

ص ۳۱۷ — س ۲ : میں جانتا ہوں اور میرا دل جانتا ہے۔ میرا دل جانتا ہے اور میں جانتا ہوں۔

ص ۳۱۷ — س ۶ : افسوس! کہ بہت سی آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

ص ۳۲۴ — س ۳ : میں جیسا ہوں خوب جانتا ہوں (یعنی میں تو کسی لائق نہیں)۔

ص ۳۲۹ — س ۳ : اگر عورتوں کا احوال اچھا ہوتا تو پھر عورتوں کا نام "مرن" (مت مارو) ہوتا۔ "زن" (مارو) نہ ہوتا۔

ص ۳۳۵ — س ۹ : ہر عورت، عورت نہیں اور (اسی طرح) ہر مرد (بھی) مرد نہیں۔ خدا نے پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں بنائیں۔

ص ۳۴۴ — س ۴ : دوستوں کی خاطر جب سرور نے اِس قصّے کو تصنیف کیا تو میں نے اُس کا سالِ تاریخ تلاش کیا کہ آسمان نے یہ گلستانِ بےخزاں عطا کیا ہے۔

اشاریہ

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴	۱۲	برزن	ہرزن
۵۱	۳	عزرم	عزرم
۸۸	۲	سرّہٗ	سرّہٗ
۹۳	۱۵	ــہ	اِس نشان کو نکال دیا جائے۔
۱۲۵	۴		پہلے مصرعے پر ① بنالیا جائے
۱۲۷	۱	اگر پر تم	اگر تم پر
۱۴۹	۴	لَقا	لِقا
۱۷۵	۱۰	عزرم	عزرم
۲۵۰	۳	تعذیر	تعزیر
۲۵۲	۷	بے گرفتاریِ	بے گرفتاری
۲۶۶	۴	مجرّبھا	مجرّبہا
۲۷۳	۱۴	سرّہٗ	سرّہٗ
۲۸۶	۲	واجبُ التّعذیر	واجبُ التّعزیر
۳۳۱	۲	شیطانِ	شیطان
۳۳۶	۱۱	تمام	بتمام

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴۲	۱۴	قائم الّیل	قائم اللّیل
۵۶۹	کالم۲، سطر۲	بادشاہ کے	بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا۔
۵۶۹	کالم۲، سطر۴	حضور میں پیش کرتا تھا۔	اِسے قلم زد کر دیا جائے۔
۵۸۲	کالم۱، سطر۸		اِس لفظ کے تحت تشریحی عبارت کو قلم زد کرکے، اُس کی جگہ یہ عبارت لکھی جائے: دودھ کا مصنوعی جھاگ سردی کے موسم میں دودھ کو تھوڑی سی مصری کے ساتھ خوب گاڑھا پکا کر اور رات کو اُوس میں رکھ کر صبح تڑکے اچھال کر اس کو بنایا جاتا تھا۔ صبح کے وقت پھیری والے اسے بیچتے پھرتے تھے۔

رشید حسن خاں شاہ جہاں پور میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں فوجی ملازمت خاندانی روایت بن چکی تھی۔ تعلیمی اسناد کے مطابق اُن کی تاریخِ ولادت ۱۰ ؍جنوری ۱۹۲۳ء ہے۔ اُن کے والد امیر حسن خاں کٹّر قوم پرست تھے۔ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں اُنھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کرلی تھی اور اُس کے بعد سے سرکاری ملازمت کو مسلمانوں کے لیے ناجائز سمجھتے رہے۔ رشید حسن خاں نے سب سے پہلے درسِ نظامی کی تعلیم مدرسۂ بحر العلوم شاہ جہاں پور میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء تک وہ فیلڈ ورکر کی حیثیت سے مقامی ٹریڈ یونین سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۹ء کے وسط تک اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہ جہاں پور میں اُردو فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اُس کے بعد سے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔

ادبی تحقیق، لغت، املا، قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری، عروض اور تدوین اُن کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اُن کی کتاب اُردو املا اپنے موضوع پر سب سے مفصّل اور بہت وقیع تصنیف ہے۔ تلفّظ اور قواعدِ شاعری سے متعلق اُن کی مشہور کتاب زبان اور قواعد ہے، جو دو بار شائع ہوچکی ہے۔ اُن کا ایک تاریخی کام مقدمۂ کلامِ ناسخ ہے، جس میں پہلی بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ناسخ سے تحریکِ اصلاحِ زبان کا انتساب درست نہیں۔ جن قواعد کو ناسخ سے منسوب کیا گیا ہے، اُن کے وضع کرنے والے دراصل رشک [تلمیذِ ناسخ] تھے۔

اُن کی دوسری تصانیف میں اُردو کیسے لکھیں، تلاش و تعبیر [تنقیدی مضامین کا مجموعہ] اور ادبی تحقیق خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ تحقیق میں وہ قاضی عبدالودود کی روایت کے پیرو ہیں اور تدوین میں مولانا عرشی کو اپنا معنوی اُستاد مانتے ہیں۔ وہ ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ حق گو اور بے باک محقق ہیں، جن کے تبصروں نے احتساب کی روایت کو تسلسل بخشا ہے اور زندہ رکھا ہے۔

اُن کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا ہے، جن میں دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ [۱۹۷۷ء] اور غالب ایوارڈ [۱۹۷۹ء] شامل ہیں۔ وہ انجمن ترقیِ اُردو کی مجلسِ عاملہ، مجلّہ غالب نامہ کی مجلسِ ادارت اور ترقیِ اُردو بورڈ کی املا کمیٹی کے رُکن ہیں۔

ISBN-81-7160-079-4